مَن یُّرِدِ اللہُ خَیرًا یُّفَقِّھہُ فِی الدِّینِ

مجموعہ

العطایا الاحمدیہ فی فتاویٰ نعیمیہ

۱۳۹۶ھ و ۱۹۷۶ء

جلد-۲

مصنفہ

مفتی دار العلوم غوثیہ نعیمیہ و شیخ الحدیث

صاحبزادہ اقتدار احمد خان نعیمی قادری بدایونی

فہرست مضامین العطایا الاحمدیہ جلد دوم

نام کتاب : فتاویٰ نعیمیہ جلد دوم

مصنف : صاحبزادہ اقتدار احمد خاں بدایونی نعیمی قادری

اشاعت : ۲۰۰۲ء

تعداد : ۱۰۰۰

ہدیہ : -/800 روپے مکمل چار جلدیں

ناشر : مکتبہ رضویہ

510، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

کتاب الحظر والاباحت

انگریزی وضع کے کپڑے پہننے کا حکم اور عورتوں کو لکھنا سکھانے کا بیان

سوال نمبر ۱ :- حضرت والا محترم ایک استفتاء حاضر خدمت ہے۔ بعض لوگ عوام الناس آج کل نئی روشنی کے زیر اثر ہیں۔ ان کو سمجھانا ہم سب کے لیے اشد ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل ہر دو سوالات میں ان کو علماء اہلسنت سے اختلاف ہے۔ آپ کی تحریر بھی اُن کے سمجھانے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہو گی۔ دلائل اور مضمون کی طوالت کی چنداں ضرورت نہیں صرف آپ کے چند الفاظ ہی سند کے لیے کافی ہیں۔ اہلسنت کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ فقط والسّلام

منتظر جواب :- ابو داؤد محمد صادق غفر لہٗ، گوجرانوالہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں ۱ بکر کہتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ انگریزی وضع کے کپڑے پہننا سخت حرام اشد حرام ہے، ان کو پہن کر نماز مکروہ تحریمی۔ مگر زید کہتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا یہ ایک وقتی فتوےٰ تھا۔ ہمارے زمانے میں اس کی کیفیت بدل گئی ہے اور علت بھی بدل گئی ہے۔ اور ان کپڑوں کا عام رواج ہو گیا۔ اس لیے عموم بلویٰ کی وجہ سے کوٹ پتلون، ٹائی، ہیٹ وغیرہ کا پہننا جائز و مباح ہے۔ اور نماز ان کے ساتھ ہرگز ہرگز مکروہ تحریمی نہیں ہے۔ فرمایا جائے کہ زید کا یہ قول درست ہے یا نہیں۔ اور انگریزی لباس کوٹ پتلون ٹائی ہیٹ وغیرہ پہننے کا شرعی کیا حکم ہے۔؟ ۲ بکر کہتا ہے اعلیٰ حضرت کا قول ہے کہ عورتوں کو لکھنا سکھانا شرعاً ممنوع ہے۔ وسنتِ نصاریٰ و فتح باب ہزاراں فتنہ و مستانِ سرشعار کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔ جس کے مفاسد شدیدہ پر تجاربِ عدیدہ شاہد ہیں۔ متعدد حدیثیں اس سے ممانعت میں وارد ہیں۔ مگر زید کہتا ہے کہ لڑکیوں کو لکھنا سکھانا جائز ہے۔ حدیث لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ ضعیف موضوع ہے۔ اور تعلیم کتابت کی ممانعت پر مبنی اعلیٰ حضرت کا فتوےٰ محض احتیاط پر مبنی ہے۔ فرمایا جائے کہ کیا شرعاً زید کا قول درست ہے؟ اور لڑکیوں کو لکھنا سکھانا ممنوع ہے۔ یا غیر ممنوع۔

بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا

(جناب محترم قبلہ مفتی ابوداؤد محمد صادق خطیب زینت المساجد گوجرانوالہ، ۲ ۱۱/۲)

الجواب بعون العلام الوہاب

ع۱۔ قانون شریعت کے مطابق ہر مسلمان عورت و مرد کو ہر وہ چیز استعمال کرنی منع ہے جس سے اسلام کی کسی عبادت یا فروع و اصول کے ادا کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہو، یا کفار کی عبادت یا مذہبی مشابہت کا اظہار ہوتا ہو سامی طرح جو چیز کفار کی دینی نشانی بن چکی ہو اگرچہ وہ پہننے استعمال کرنے میں آتی ہو۔ مسلمان کو اس کا استعمال سخت مکروہ تحریمی ہے کیونکہ یہ مشابہت کفار و نصاریٰ ہے۔ اور کفار سے دینی مشابہت مکروہ تحریمی ہے۔ چنانچہ صاحب ردّ المحتار فرماتے ہیں۔ جلد اوّل ص۵۹۸ فَکَرَاھَتُہٗ لِلتَّشَبُّہِ بِاَھْلِ الْکِتَابِ فَھُوَ مَکْرُوْہٌ مُطْلَقًا۔ یعنی ہر حال میں یہود و نصاریٰ کی دینی مشابہت مکروہ تحریمی ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو شخص دنیا میں جس قوم کے ساتھ مشابہت رکھے گا۔ کل قیامت میں انہی میں شمار ہوگا۔ چنانچہ درِ منثرہ ص۲۰۴ پر امام جلال الدین سیوطی ابوداؤد کی حدیث نقل فرماتے ہیں:۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ۔ امام عبدالروف مناوی نے اس کو اپنی کتاب کنوز الحقائق میں حسن کہا ہے، بر ص۱۰۲۔ اس لیے انگریزی لباس میں سے ہیٹ۔ پتلون۔ ٹائی پہننا مکروہ تحریمی ہے۔ اس لیے کہ ہیٹ پہن کر مسلمان نماز نہیں پڑھ سکتا۔ تو یہ نماز کی رکاوٹ بنتا ہے اس لیے ناجائز ہوا کیونکہ ہیٹ پہننے والا مسلمان جب نماز پڑھے گا تو ہیٹ یا خود گر جائے گا یا بوقتِ سجدہ اتار نا پڑے گا اور ننگے سر نماز بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ عالمگیری جلد اوّل ص۱۰۶ پر ہے۔ وَتُکْرَہُ الصَّلٰوۃُ حَاسِرًا رَاْسَہٗ۔ پس چونکہ ہیٹ سجدے کی رکاوٹ ہے اس لیے ہر حال میں منع ہے۔ کیونکہ فقہاء عظام فرماتے ہیں کہ مسلمان کو ہر وقت ایسا لباس پہننا چاہیے جس سے باسانی نماز ادا ہو سکے۔ انگریز قوم ایسی خبیث اور متعصب اور دشمن اسلام ہے کہ اس نے ہر موقع پر اپنی اکثر بناوٹ اور ساخت میں اسلام دشمنی کا ظاہر و پوشیدہ ثبوت دیا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ اس کے وضع کردہ لباس میں کتنی اسلام دشمنی موجود ہے۔ اسلام کا واضح قانون ہے کہ نماز میں کپڑا لپیٹنا اور پائنچے یا آستین چڑھانا مکروہ ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ہندیہ وغیرہ میں ص۱۰۶ پر مرقوم ہے:۔ وَلَوْ صَلّٰی رَافِعًا کُمَّیْہِ اِلَی الْمِرْفَقَیْنِ کُرِہَ۔ علامہ شامی نے فرمایا وَکَفُّ الثَّوْبِ مَکْرُوْہٌ تَحْرِیْمًا۔ انگریز قوم نے مسلمانوں کی نماز خراب کرنے کے لیے پتلون ایجاد کی جس کے پائنچے اٹھے ہوتے ہیں۔ اسلام کا دوسرا قانون ہے کہ کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو۔ چنانچہ روایت ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رض نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبَوْلِ قَائِمًا مسلمان کو اس طریقے سے ہٹانے کے لیے پتلون ایجاد کی جس کو پہن کر پیشاب کرنا سخت ترین مشکل ہے۔ پس چونکہ پتلون پہن کر خلافِ اسلام کام سرزد ہوتے ہیں لہٰذا مسلمان کو پہننا مکروہ

اسلام کا تیسرا قانون حیات مسیح ہے۔ عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ کی سولی کی موت ہے۔ اس لیے صلیب کو انھوں نے اپنا دینی شعار بنالیا۔ ہر جگہ انگریزوں نے صلیب کا نشان برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ صلیب کو سجدہ کرتے ہیں سینے پر صلیب بنانا ان کی بہت بڑی عبادت ہے، ٹائی اسی مقصد کے لیے ایجاد کی۔ ٹائی صلیب کا نقشہ ہے ٹائی مثل بت کے ہے۔ جو مسلمان ٹائی باندھتا ہے وہ ظاہر ظہور اسلام کے اس قانون کی مخالفت، اور عیسائیت کی تائید کرتا ہے۔ اسی لیے ٹائی باندھنا اشد مکروہ تحریمی۔ مکروہ تحریمی حرام کے درجے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ شرح در مختار جلد اول میں ارشاد ہے بر ص۱۲۲ مَکْرُوْهُهٗ وَهُوَ ضِدُّ الْمَحْبُوْبِ قَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْحَرَامِ (الخ) وَعَلَى الْمَكْرُوْهِ تَحْرِيْمًا وَهُوَ مَا كَانَ إِلَى الْحَرَامِ أَقْرَبُ وَيُسَمِّيْهِ مُحَمَّدٌ حَرَامًا ظَنِّيًّا ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ ہیٹ ٹائی پتلون مسلمان کو پہننا مکروہ تحریمی ہے یعنی حرام ہے۔ اور مکروہ تحریمی کے ساتھ نماز پڑھنا واجب الاعادہ ہے۔ چنانچہ شامی شریف جلد اول صفحہ نمبر ص۴۲۵ میں ہے :۔ كُلُّ صَلٰوةٍ أُدِّيَتْ مَعَ كَرَاهَةِ التَّحْرِيْمِ تَجِبُ إِعَادَتُهَا اگرچہ اس سے گناہ صغیرہ لازم آتا ہے۔ لیکن پھر بھی تمام مسلمانوں کو اس سے بچنا لازم اشد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے مندرجہ بالا فتوے صادر فرمایا۔ زید کا قول قطعاً غلط ہے کہ اعلیٰ حضرت کا فتوے وقتی ہے۔ زید کا یہ قول بھی نری غلطی ہے کہ ہمارے زمانے میں اس کی کیفیت بدل گئی ہے۔ زید کا کونسا زمانہ ہے سب اعلیٰ حضرت کا زمانہ ہے کیونکہ اعلیٰ حضرت مجدد وقت ہیں عند الزید بھی مسلم ہے۔ اور علامہ شاذلی اپنی کتاب سیر السلوک ص۲۰۸ پر "دہر" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کا زمانہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس علاقے میں دوسرا نبی تشریف نہ لے آئے اگرچہ وصال ہو جائے اور مرسل کا زمانہ دوسرے مرسل کے آنے تک ہے اگرچہ مرسل کا انتقال ہو جائے۔ اسی لیے حضرت مسیح کا زمانہ نبی کریم کی ولادت تک وسیع ہے۔ اور نبی کریم کا زمانہ تا قیامت اور مجدد کا زمانہ دوسرے مجدد تک۔ پس ثابت ہوا کہ اب تک اعلیٰ حضرت ہی کا زمانہ ہے۔ ان حضرت کی وفات سے ان کا زمانہ نہیں بدلتا۔ چنانچہ علامہ شامی جلد سوم ص۲۲۷ میں فرماتے ہیں۔ اَنَّ رِسَالَتَهٗ بَاقِيَةٌ بَعْدَ مَوْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور ابقاء کی وجہ یہ بھی ہے کہ لَا رَسُوْلَ بَعْدَهٗ جس طرح ایک آن رسالت سے خالی نہیں۔ اسی طرح ایک آن مجدد سے خالی نہیں ہوتی۔ زید کس طرح کہہ سکتا ہے کہ پتلون وغیرہ کی کیفیت بدل گئی اب بھی وہی کیفیت گناہ ہیٹ ٹائی پتلون میں موجود ہے۔ لہٰذا اب بھی کراہت اسی طرح موجود ہے۔ عموم بلویٰ صرف ان چیزوں میں معتبر ہے جو ضروریات زندگی میں شامل ہو جائیں اور اس سے ضروریات دین پر بھی برا اثر نہ پڑے۔ چنانچہ عقود رسم المفتی ص۳۹ پر ہے۔ فَلَا تَغَيَّرَتْ أَحْكَامُهَا لِتَغَيُّرِ الزَّمَانِ إِمَّا لِلضَّرُوْرَةِ وَإِمَّا لِلْعُرْفِ وَإِمَّا لِقَرَائِنِ الْأَحْوَالِ۔ یعنی یہ ٹھیک ہے کہ مرور زمانہ سے بوجہ تغیر حالات فروعی احکام بدل جاتے ہیں۔ لیکن صرف ضروریات زندگی نہ کہ وہ احکام جو دین سے مخالف ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

فَهٰذَا كُلُّهُ صَرِيْحٌ فِيْمَا قُلْنَا مِنَ الْعَمَلِ بِالْعُرْفِ مَا لَمْ يُخَالِفِ الشَّرْعَ۔ فَلَا بُدَّ لِلْمُفْتِيْ وَالْقَاضِيْ بَلْ وَالْمُجْتَهِدِ مِنْ مَعْرِفَةِ اَحْوَالِ النَّاسِ وَقَدْ قَالُوْا مَنْ جَهِلَ بِاَهْلِ زَمَانِهٖ فَهُوَ جَاهِلٌ۔ یعنی جس کام سے کوئی شرعی قانون بدلتا ہو۔ اس کو کرنا خلاف شرع کام کہلائے گا جو گناہ ہے۔ لیکن جس کے کرنے سے شریعت کے اصول و فروع پر اثر نہیں پڑتا وہ حکم اگرچہ کسی صورت میں منع بھی ہو مگر زمانے کے تغیر سے بدل جائے گا جیسے ضرورۃً فوٹو کھنچوانا کہ اگرچہ منع تھا مگر اب ضرورۃً جائز ہے بلا ضرورت فوٹو بنوانا حرام ہیٹ پتلون کے استعمال میں صراحۃً شریعت کی مخالفت ہے۔ ان کی کراہت کی علت بھی یہی ہے۔ علت اب بھی موجود لہٰذا کراہت بھی موجود۔ کیا زید پسند کرتا ہے مسلمان پتلون کے لوازم کھڑے ہوکر پیشاب کریں اور ٹائی جیسی شرکیہ چیز کو مسلمانوں کے سینے پر لٹکایا جائے۔ اعلیٰ حضرت کا فتویٰ یہی حکم دے رہا ہے اور اسی علت کی بناء پر ہے لہٰذا اب بھی قابلِ اجراء ہے اور بحمداللہ تعالیٰ علمائے اہل سنت کے نزدیک جاری و ساری ہے کہ شرعاً ٹائی ہیٹ، پتلون قطعاً مکروہ تحریمی ہیں۔ زید اس کی مخالفت میں سخت غلطی پر ہے۔ ہاں انگریز کے بنے ہوئے کوٹ جیسٹر۔ گون۔ واسکٹ۔ جرسی وغیرہ باجود اس قسم کی اشیاء انگریزی ملکوں سے آئیں اُن کا استعمال بلا کراہت ہر مسلمان کو جائز ہے۔ کیونکہ ان میں وجہ کراہت کوئی نہیں۔ اور شرعی مسئلہ ہے کہ فساق کے کپڑے پہننے جائز ہیں چنانچہ دُرِّ مختار جلد اول صـ۲۲۴ پر ہے:۔ قَالَ بَعْضُ الْمَشَائِخِ تُكْرَهُ الصَّلٰوةُ فِيْ ثِيَابِ الْفَسَقَةِ۔ وَالْاَصَحُّ اَنَّهٗ لَا يُكْرَهُ لِاَنَّهٗ لَمْ يُكْرَهْ مِنْ ثِيَابِ اَهْلِ الذِّمَّةِ اِلَّا السَّرَاوِيْلُ مَعَ اِسْتِحْلَالِهِمُ الْخَمْرَ۔ فَهٰذَا اَوْلٰى۔ پس ثابت ہوا کہ کوٹ وغیرہ جائز ہیں اگرچہ اس کو پہن کر نصاریٰ سے مشابہت ہو جاتی ہے مگر یہ مشابہت مضر نہیں۔ مشابہت دو قسم کی ہے ۱ مشابہت فی الدین ۲ مشابہت فی الدنیا یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کافروں سے مشابہت فی الدین جیسی کہ اوپر بیان کی گئی منع ہے۔ چنانچہ شامی میں ہے۔ اَلتَّشَبُّهُ بِاَهْلِ الْكِتَابِ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ مُطْلَقًا۔ اسی تشبیہ کی برائی حدیث پاک میں ان الفاظ سے آئی ہے لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ:۔ مشکوٰۃ شریف صـ۴۶۵ کتاب الفتن۔ اسی مشابہت کو اعلیٰ حضرت نے حرام قرار دیتے ہوئے مذکورہ فی السوال فتوے صادر فرمایا اسی لیے اعلیٰ حضرت نے انگریزی لباس میں انگریزی وضع کی قید لگادی کیونکہ لفظ وضع سے مراد لباس ہے جس سے نصرانیت کا ظہور ہوتا ہے اور وہ ٹائی پتلون وغیرہ ہیں دوسری قسم مشابہت فی الدنیا یہ جائز ہے جس میں کفار کے دین کو کوئی دخل نہ ہو نہ ہی اسلامی مسائل کی خلاف ورزی ہو وہ مشابہت دنیاوی ہے۔ سب فقہائے کرام اس کو جائز مانتے ہیں۔ چنانچہ ردالمحتار جلد اول صـ۵۸۳ پر ہے:۔ فَاِنَّ التَّشَبُّهَ بِهِمْ لَا يُكْرَهُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ بَلْ فِي الْمَذْمُوْمِ اور صـ۶۰۶ پر ہے وَيُكْرَهُ التَّشَبُّهُ بِهِمْ فِي الْمَذْمُوْمِ وَاِنْ لَّمْ يُقْصَدْ۔ یعنی صرف شرعاً بری چیزوں میں انگریزوں یہودیوں سے مشابہت منع ہے

اسی لیئے علمائے متاخرین ہندوؤں کی ٹوپی دھوتی کو جائز مانتے ہیں اور سکھوں کی پگڑی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان گاندھی مار کہ کپڑے کی ٹوپی پہنے تو جائز ہے اور سکھوں جیسی پگڑی باندھے تو گناہ ہے خود نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ راہبوں جیسی جوتی پہنی۔ چنانچہ حضرت ہشام ابو یوسف سے روایت کرتے ہیں فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِيْ لَهَا شَعْرٌ مِنْ لِبَاسِ الرُّهْبَانِ؛ ثابت ہوا کہ عام حالات میں کفار سے دنیاوی مشابہت جائز ہے۔ ہاں ہنگامی حالات میں ہر قسم کی مخالفت حرام و نقصان دہ ہے۔ اسی طرح جہاں کافر و مسلم مخلوط رہتے ہوں۔ یہاں تک کہ روافض و دیگر فرقوں کی خصوصی مشابہت سے بچنا بھی مستحب ہے۔ چنانچہ شامی کا ارشاد ہے:۔ لَمَّا كَانُوْا مُخْتَلِطِيْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ فَلَا بُدَّ مِنْ تَمْيِيْزِهِمْ عَنَّا وَيُمَيَّزُ فِيْ لِبَاسِهِمْ وَهَيْئَتِهٖ جلد ثالث ص۲۷۷۔ جلد پنجم ص۲۱۶ پر اِلَّا اَنَّهٗ مِنْ شِعَارِ الرَّوَافِضِ فَيَجِبُ التَّحَرُّزُ عَنْهُ۔ مرزائی، وہابی، شیعہ کسی کے شعار کی مشابہت جائز نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہیٹ، ٹائی، پتلون کا استعمال مسلمان مرد و عورت کو سخت مکروہ تحریمی اور کوٹ وغیرہ بلا کراہت جائز ہیں۔ زید کو اپنی غلطی سے رجوع کرنا چاہیئے:۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

(ع۲) شریعتِ اسلامیہ کے قانون طیبہ طاہرہ ذی الحکمت کے مطابق علی العموم عورتوں کو کتابت سکھانا مکروہ تنزیہی ہے یعنی ہر زمانے کی ہر قسم کی عام عورتوں کو تعلیم کتابت مکروہ تنزیہی ہے چنانچہ بہشتی شریعت جلد چہارم میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح منقول ہے:۔ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُنْزِلُوْهُنَّ فِي الْغُرَفِ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ وَعَلِّمُوْهُنَّ الْغَزْلَ وَسُوْرَةَ النُّوْرِ۔ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ عورتوں کا لکھنا سیکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ اس لیئے کہ لفظ لَا تُعَلِّمُوْا اور لفظ عَلِّمُوْا بحث فعل نہی اور بحث امر کے صیغے ہیں۔ اور دونوں قواعد اصول کے مطابق مشترک فی الاحکام ہیں۔ چنانچہ علمائے اصول فرماتے ہیں کہ امر سولہ معنٰے کے لیئے آتا ہے ع۱ وجوب ع۲ ندب۔ ع۳ تادیب ع۴ ارشاد ع۵ اباحت ع۶ تہدید ع۷ امتنان ع۸ اکرام ع۹ تعجیز ع۱۰ تسخیر ع۱۱ اہانت ع۱۲ تسویتہ ع۱۳ دعا ع۱۴ تمنا ع۱۵ اعتقاد ع۱۶ تکوین۔ جس طرح امر مطلق مندرجہ سولہ قسم کا ہے اسی طرح نہی بھی آٹھ معنیٰ میں مشترک ہے ع۱ حرمت ع۲ کراہت ع۳ تنزیہ ع۴ تحقیر ع۵ بیانِ عاقبہ ع۶ ارشاد ع۷ سفقہ ع۸ یاس۔ امر کے اصلی معنیٰ وجوب اور نہی کے اصلی معنیٰ حرمت کے ہیں لیکن کوئی قرینہ دلالت کرے تو دوسرے معنیٰ ہی مراد لیئے جاتے ہیں۔ هٰكَذَا فِي التَّوْضِيْحِ عَلٰى صَحِيْفَةِ

ص۴۲ بِهٰذَا الْعِبَارَتِ - قَدْ يَكُوْنُ لِغَيْرِهٖ بِمَعُوْنَةِ الْقَرَائِنِ :- اور یہ قانون مشہور ہے کہ جب ایک عبارت میں امر و نہی استعمال ہوں گے تو ایک ہی درجے کے ہوں گے ھٰکَذَا فِیْ کُتُبِ الْاُصُوْلِ امر کا ادنیٰ درجہ مستحب ہے اور نہی کا ادنیٰ درجہ کراہت تنزیہی ہے - لہٰذا مندرجہ حدیث شریف میں چونکہ فقہائے اسلام کے نزدیک عَلِّمُوْهُنَّ کا لفظ استحباب کے لیئے ہے اس لیئے لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ بھی اپنے ادنیٰ درجے کراہت تنزیہی پر ہو گی - اس قاعدے سے ثابت ہوا کہ علی العموم ہر عورت کو کتابت سیکھنا مکروہ ہے - چنانچہ فتاوٰی حدیثیہ ص۶۲ پر ہے :- اَنَّ النَّهْيَ عَنْهُ تَنْزِيْهًا لِمَا تَقَرَّرَ مِنَ الْمَفَاسِدِ الْمُتَرَتِّبَةِ عَلَيْهِ - مکروہ تنزیہی اس لیئے ہے کہ پیش کردہ روایت کا قرینہ وجوب یا حرمت کو ثابت نہیں کر سکتا - کیونکہ قرینہ کراہت تنزیہی کو ثابت کر رہا ہے اس لیئے کہ حقوق تین قسم کے ہیں - ۱ حق العبد ۲ حق اللہ ۳ حق النفس - حق النفس میں امر اور نہی ادنیٰ درجے پر ہوتے ہیں - جیسا کہ شکار کھیلنے کا امر - اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان لَا تَمْشِ فِيْ نَعْلٍ وَّاحِدٍ :- پس حق النفس اور حق العبد کراہت تنزیہی کا قرینہ ہیں - چنانچہ کتاب التوضیح ص۲۲۸ پر ہے اِنَّ النَّدْبَ وَالْاِبَاحَةَ (الخ) اِنَّمَا شُرِعَ حَقًّا لِلْعَبْدِ کتابت سیکھنا حق النفس ہے کہ مردوں کے لیئے بالکل جائز ہے اور عورتوں کے لیئے مکروہ تنزیہی - چنانچہ فتاوٰی حدیثیہ ص۶۲ پر ہے :- عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ حَقِّ الْوَلَدِ عَلٰى وَالِدِهٖ اَنْ يُعَلِّمَهُ الْكِتَابَةَ :- ضمیر مذکر سے پتہ لگا کہ کتابت سیکھنا صرف مردوں کا کام ہے اور عورتوں کو منع کیوں کہ جس طرح مرد کو عورتوں جیسے کام منع ہیں اسی طرح عورتوں کو مردوں جیسے کام منع ہیں - چنانچہ شامی شریف نے ارشاد فرمایا - لَا يَجُوْزُ لِلنِّسَاءِ التَّشَبُّهُ بِالرِّجَالِ - اور چونکہ قاعدہ شرعی ہے کہ جس کام میں احتمال گناہ ہو وہ مکروہ تنزیہی اور جس میں گناہ صغیر لازم ہو وہ مکروہ تحریمی - چنانچہ شامی علی در مختار صفحہ نمبر ص۲۵ پر ہے :- بِاَنَّ كُلَّ مَكْرُوْهٍ تَحْرِيْمًا مِنَ الصَّغَائِرِ :- اور جس کام سے گناہِ کبیرہ لازم آتا ہے وہ حرام ہے پس کتابتِ زنان چونکہ گناہِ صغیرہ و کبیرہ کا احتمال رکھتی ہے لہٰذا تنزیہاً ممنوع - اس لیئے اعلیٰ حضرت نے اس کو ممنوع فرمایا - یہ ممانعت احتیاطاً نہیں بلکہ تمام عورتوں کو ہر وقت ہر دور میں مکروہ تنزیہی ہے - اس لیئے کہ امر مطلق اور نہی مطلق زمانے کے تغیر سے تبدیل نہیں ہوتی - ہاں امر موقت اور نہی موقت تبدیل ہو جاتے ہیں - چنانچہ اصول فقہ کی کتاب توضیح تلویح ص۲۲۶ پر ہے :- فَاِنْ كَانَ الْاَمْرُ مُطْلَقًا يَجِبُ فِيْهِ الْمُدَاوَمَةُ :- یہ ممانعت کتابت کی حدیث نہی مطلق ہے - پس جب تک وجہ کراہت باقی نہی باقی - زید کا یہ قول بھی غلط ہے کہ یہ حدیث لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ ضعیف ہے قطعاً غلط زید اس بارے میں بہت غیر محقق معلوم ہوتا ہے - یہ حدیث شریف بالکل صحیح ہے - چنانچہ میں نے بیہقی کی روایت کے الفاظ نقل کیئے ہیں وہاں یہ الفاظ بھی موجود ہیں هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ - اور فتاوٰی حدیثیہ

صفر نمبر ۶۲ پر ہے:۔ رَوَاہُ الْحَاکِمُ وَصَحَّحَہُ الْبَیْہَقِیُّ:۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب مراۃ حصہ ششم غیر مطبوعہ میں اس حدیث کو صحیح فرماتے ہیں۔ اور تمام محدثین ومفسرین ممانعتِ کتابتِ نسواں کی دلیل میں اسی حدیث پاک کو پیش کرتے ہیں۔ تفسیر صاوی جلد سوم ص۱۰۵ پر اور تفسیر روح البیان ص۱۱۳ پر، روح المعانی ص۱۴۲ پر اسی حدیث کو سند بناتے ہیں۔ کسی شخص نے اس کو ضعیف نہ کہا۔ نہ کسی نے اس کو موضوع کہا۔ زید کے پاس موضوع ہونے کی کیا دلیل ہے کیسے ہوسکتا ہے کہ جس حدیث سے فقہائے امت کراہتِ تنزیہی جیسا قانون مستنبط کریں وہ ضعیف ہو یا موضوع۔ صحیح روایت کا موضوع ہونا محال ہے لیکن اگر بفرض امکان ضعیف ہو بھی تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک ہی حدیث پاک بیک وقت مختلف اسناد سے صحیح وضعیف ہوسکتی ہے اور صحت کی وجہ سے قابلِ قبول ہے۔ اسی طرح شارحین فرماتے ہیں:۔ ھٰکَذَا قَالَ حَکِیْمُ الْاُمَّۃِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ فِیْ مُصَنَّفِہٖ جَآءَ الْحَقُّ:۔

پس ثابت ہوا کہ علی العموم مطلقاً عورتوں کو لکھنا سکھانا منع ہے۔ اور ممانعت کراہت تنزیہی ہے یہی مراد اعلیٰ حضرت کے فتوے کی ہے۔ کیونکہ لفظ ممنوع مشترک ہے ہر دو کراہیت کو مگر ممانعت تنزیہی۔ تَرْکُہٗ اَوْلٰی کے معنے میں مکروہ تنزیہی بھی صحیح مذہب میں ناجائز ہے۔ اسی لیے صاحب توضیح اُن لوگوں کے مسلک کو غیر صحیح قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے مکروہ تنزیہی کو جائز کے زمرے میں داخل مانا ہے۔ چنانچہ توضیح صفحہ نمبر ص۲۷ پر ہے:۔ وَھٰذَا لَا یَصِحُّ عَلٰی رَایِہِمَا وَھُوَ اَنَّ مَا یَکُوْنُ تَرْکُہٗ اَوْلٰی مِنْ فِعْلِہٖ (الخ) لٰکِنْ یُثَابُ تَارِکُہٗ اَدْنٰی ثَوَابٍ:۔ یہ ناجائز ادنےٰ درجہ کا ہے۔ اسی ادنےٰ ہونے کی وجہ سے بعض نے مکروہ تنزیہی کو جائز مانا ہے۔ جیسا کہ شامی میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ علی العموم عورت کو لکھنا سیکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ مگر علی الخصوص کتابتِ نساء جائز ہے یعنی وہ متقیہ زاہدہ عابدہ عورتیں جن کے گناہِ متصورہ کا احتمال نہیں اور جن کی کتابت سے گناہِ متصورہ محتملہ متوہمہ کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ان کے لیے یہ علمِ کتابت بالکل جائز ہے۔ چنانچہ طحاوی شریف ص۳۸۸ جلد دوم، ابوداؤد شریف صفحہ نمبر ص۵۴۲ جلد دوم مشکوٰۃ شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص۳۹۰ پر اس طرح حدیث پاک مرقوم ہے:۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاھِیْمُ (الخ) عَنْ شِفَاءَ بِنْتِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا عِنْدَ حَفْصَۃَ۔

فَقَالَ لِی اَلَا تُعَلِّمِیْنَ هٰذِهٖ رُقْیَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِیْهَا الْكِتَابَةَ :۔ یعنی حضرت شفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ فرماتی ہیں کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو میں کتابت سکھا رہی تھی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو علم تعویذ اور گھریلو طریقے سکھاؤ۔ علامہ خطابی نے فرمایا کہ عورت کو کتابت سیکھنا جائز ہے۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ شریف جلد چہارم صفحہ نمبر ۵۱۲ پر ہے :۔ قُلْتُ یُحْتَمَلُ اَنْ یَّكُوْنَ جَائِزًا لِلسَّلَفِ دُوْنَ الْخَلَفِ لِفَسَادِ النِّسْوَانِ فِیْ هٰذَا الزَّمَانِ :۔

اشعۃ اللمعات جلد سوم صفحہ نمبر ۶۵۶ :۔ پر ہے

وازیں حدیث جواز آں نیز مفہوم گردد

ونہی از کتابت محمول است بر نساء عامہ است

کہ خوف فتنہ در آنجا متصور است وا ینجا چنیں نیست

فتاوٰی حدیثیہ ص ۶۲ پر اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔ وَاِنَّمَا فِیْهِ دَلِیْلٌ عَلٰی جَوَازِ تَعْلِیْمِهِنَّ الْكِتَابَةَ :۔ ان تمام دلائل قاہرہ وبراہین باہرہ سے ثابت ہوا کہ علی الخصوص عورتوں کو کتابت جائز علی العموم مکروہ تنزیہی۔ مگر مکروہ تنزیہی بھی اس وقت تک رہے گا۔ جب تک صرف فتنہ وگناہ کا اندیشہ ہو۔ لیکن جس عورت یا جس تعلیم گاہ اسکول وکالج یا جس دور میں ارتکاب گناہ کا یقین یا تجربہ ہو تو قانون شرعیہ معینہ کے تحت مکروہ تنزیہی کا حکم بدل کر مکروہ تحریمی یا حرام ہو جائے گا۔ جیسا کہ آج کل بہت سی لڑکیاں صرف کتابت کے ذریعے نامۂ وپیام وعشق بازی وارتکاب افعال حرام وخبیثہ میں مبتلا ہیں۔ ہٰكَذَا قَالَ عَلَّامَةُ شَامِیُّ فِیْ كِتَابِهٖ عُقُوْدِ رَسْمِ الْمُفْتِیْ :۔

خلاصہ یہ کہ کتابت نسواں کے تین حکم اگر اندیشہ گناہ مطلق ہو تو منع تنزیہی اگر یقین یا صدور گناہ صغیرہ ہو تو مکروہ تحریمی۔ اگر گناہ کبیرہ سرزد ہونے کا یقین ہو تو کتابت سکھانا حرام۔ لہٰذا عام عورت کو کتابت سکھانا مکروہ تنزیہی سکھانے والا گنہگار۔ متقیہ عابدہ عالمہ زاہدہ کو کتابت سکھانا نا جائز اور فاحشہ بدکارہ بدچلن کو حرام۔ جس عورت کا ماحول خراب ہو، اس کو کتابت سکھانا مکروہ تحریمی

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ ـــــــــ

پیتل تانبے کی کلائی چین باندھنے کا حکم اور احکام شریعت کتب پر تحقیقی تبصرہ

سوال نمبر۲ ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ۱ گھڑی کا چین کلائی پر باندھنا لوہے، پیتل کی ہو یا تانبے کی جائز ہے یا حرام؟ زید کہتا ہے کہ رضوی مسلک میں چین باندھنا خواہ لوہے کی ہو یا پیتل کی یا تانبے کی حرام چنانچہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی اور صدر الشریعت مولانا امجد علی صاحب مصنف بہارِ شریعت، سید ابوالبرکات صاحب، مفتی اعجاز ولی صاحب وغیرہ علمائے کرام کلائی والی چین لوہے، پیتل، تانبے کی حرام جانتے ہیں۔ اس لیے زید کے نزدیک بھی کلائی پر اس طرح کا چین باندھنا بالکل حرام ہے اور اس کے ساتھ نماز پڑھنا حرام۔ فرمایا جائے کہ زید کا قول درست ہے یا غلط؟ نمبر۲ ۔ چند دن ہوئے ہم نے ایک رسالہ میں ایک مضمون پڑھا جس میں کوکب صاحب کی لکھی ہوئی کتاب حیاتِ سالک پر کچھ تنقیدیں تھیں۔ قابلِ فہم بات یہ ہے کہ کوکب صاحب حضرت حکیم الامت کی طرف ایک ایسی بات منسوب کرتے ہیں جس کا ذکر اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ فرمایا جائے کہ کوکب صاحب کا یہ قول درست ہے کہ احکام شریعت اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں ہیں۔ اور اس کے سب مسائل قابلِ غور ہیں۔ اور سب مسائل قابلِ عمل بغیر تحقیق نہیں ہیں۔ کیا واقعی یہ درست ہیں۔ جہاں تک حضرت حکیم الامت کے حکم کا تعلق ہے۔ کس شخص میں جرأت ہے جو دم مار سکے بڑے بڑے صاحب علم اور مخالفین آپ کے مقابلِ قلم اٹھاتے ہوئے تھرآتے ہیں۔ کس میں جرأت ہے کہ آپ کے فرمودات کی تردید کر سکے۔ حضرت حکیم الامت کی وہ شخصیت ہے کہ ایک دفعہ اُن کے بارے میں میرے پیر و مرشد امیرِ ملّت محدّث علی پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مجلس میں دورانِ گفتگو فرمایا تھا کہ مفتی احمد یار خاں کے علمی مقام کو کون پہچان سکتا ہے۔ مولانا احمد رضا خان کے بعد ہماری جماعت میں ان کا بھی کوئی مثل نہیں ہیں۔ اس لیے سوال صرف یہ ہے کہ کیا کوکب صاحب کی یہ بات درست ہے۔ کیا حضرت حکیم الامت نے احکام شریعت کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے اور کیا احکام شریعت میں یہ درج ہے کہ گھڑی کی چین لوہے وغیرہ دھات سے بنی ہوئی، کلائی پر باندھنا حرام ہے؟ اور کیا احکام شریعت کے بعض مسائل قابلِ عمل نہیں ہیں؟ اگر کچھ بعض ایسے مسائل ہیں تو ہمیں ان سے آگاہ کیا جائے اور یہ بھی فرمایا جائے کہ کوکب صاحب کی نسبت کرنا درست ہے یا نہیں۔ اگر حکیم الامت نے واقعی ارشاد فرمایا ہو تو اس کی وضاحت فرمائیں تاکہ پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ اور خاص طور پر امیرِ ملّت کے عقیدت مندوں کا عقیدہ حضرت حکیم الامت کے متعلق وہی ہے جو اعلیٰ حضرت کے متعلق ہے۔ حضرت حکیم الامت کی ذات بھی اہلِ سنت کا ایک عظیم سرمایہ تھا

میری طرف سے مؤدبانہ عاجزانہ سلامِ نیاز مندانہ مزارِ مقدس پر عرض کیا جائے اور استفتار کا جواب جلد از جلد ارسال فرمایا جائے۔

مؤرخہ ۱۱ ۱۰/۷۲ صوفی عبداللطیف جماعتی ملیرسٹی نزد ٹمینکی ۱۴

الجواب بعونِ العلّامِ الوھّاب

آپ کا استفتاءِ گرامی دو سوالوں پر مشتمل ہے جن کا علیحدہ علیحدہ جواب حاضر کیا جا رہا ہے۔

(۱) زید کا قول سراسر غلط ہے۔ ہرگز ہرگز رضوی مسلک یہ نہیں ہے بلکہ اعلیٰ حضرت نے بھی کسی جگہ گھڑی کی چین جو کلائی پر باندھی جاتی ہے کو حرام نہ فرمایا۔ نہ احکامِ شریعت میں اس کی حرمت ثابت ہے۔ حضرت قبلہ سید ابوالبرکات صاحب سے میری گفتگو اس مسئلہ پر ہوئی انھوں نے فرمایا کہ اب تک مجھ کو اس کی حرمت کی دلیل نہ ملی حضرت قبلہ مفتی اعجاز ولی خان صاحب سے بھی میری گفتگو ہوئی وہ اگرچہ اس کی حرمت کے قائل ہیں مگر اس مسئلہ میں مزید گفتگو یا مکالمہ کرنے کو تیار نہیں نہ انھوں نے میرے سامنے حرمت کی دلیل پیش کی۔ جس سے میں نے اندازہ لگالیا کہ ان کے پاس حرمت کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ ہاں بہارِ شریعت جلد ۱۶ صہ ۵۱ پر گھڑی چین کی حرمت لکھی ہے مگر وہ قول بھی مفتیٰ بہ نہیں اور کوئی محقق مفتی اسلام اس پر فتویٰ شرعی جاری نہیں کرسکتا۔ اس لیئے کہ صاحبِ بہارِ شریعت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اس قول پر کوئی دلیل یا حوالہ پیش نہ فرمایا نہ نقلاً نہ عقلاً نہ قیاساً نہ اجماعاً۔ فقہائے کرام کے نزدیک ہر وہ قول غیر مفتیٰ بہ ہے جو بغیر دلیل نقل کر دیا جائے ایسے قول پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک مفتیٔ دین خود اپنی تحقیق اس کی تائید میں حاصل نہ کرلے۔ چنانچہ کتاب عقود رسم المفتی صہ پر ہے۔ وَمِنَ الْکُتُبِ الْغَرِیْبَۃِ الخ۔ اَوْ لِنَقْلِ الْاَقْوَالِ الضَّعِیْفَۃِ (الخ) اَوْ لِاِخْتِصَارٍ۔ قَالَ شَیْخُنَا صَالِحٌ الْجِیْنِیْ اَنَّہٗ لَا یَجُوْزُ الْاِفْتَاءُ مِنْ ھٰذَا الْکُتُبِ اِلَّا اِذَا عُلِمَ الْمَنْقُوْلُ عَنْہُ وَالْاِطِّلَاعُ عَلٰی مَاخَذِھَا ھٰکَذَا سَمِعْتُہٗ مِنْہُ وَھُوَ عَلَّامَۃٌ فِی الْفِقْہِ مَشْھُوْرٌ

پس چونکہ بہارِ شریعت میں بلا دلیل حرام کہا گیا ہے۔ اس لئے محققین علماء کے نزدیک ہرگز معتبر نہیں۔ بعض رضوی علماء اس بہارِ شریعت کے قول کی بنا پر ہی کلائی کی لوہے پیتل تانبے والی چین کو حرام کہہ دیتے ہیں ورنہ حرمت کی دلیل آج تک انھوں نے بھی پیش نہ فرمائی۔ زید کا رضوی مسلک کی طرف اسبات کو منسوب کرنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ لفظِ مسلک کے معنیٰ ہیں راستہ۔ چنانچہ لغاتِ کشوری صہ ۵۹ ۴ پر ہے۔ مسالک جمع مسلک کی راستے راہیں اور صہ ۴۶۴ پر ہے مسلک، راہ، راستہ۔ اور لغۃ المنجد صہ ۳۵۸ پر ہے۔ السلک، الطریق۔ ج مسالک۔ لفظِ مسلک کا اصطلاحی و منقول شرعی معنیٰ ہیں شریعت و طریقت کا راستہ۔ اور مسالکِ شریعت و طریقت ہر دو صرف چار چار ہیں۔ اور چہار میں سے رضویت کوئی مسلک نہیں۔ ہاں رضویت صرف ایک نسبت ہو سکتی ہے۔ شرعی نسبت۔ استادی شاگردی اور روحانی نسبت،

پیری مریدی۔ شرعی نسبت کے لحاظ سے تمام شاگرد بالواسطہ یا بلاواسطہ رضوی ہیں، اور رُوحانی نسبت سے تمام مریدین بلاواسطہ یا بالواسطہ رضوی ہیں۔ اعلیٰ حضرت سے ایک نسبت عقیدتاً ہے۔ اس اعتبار سے ہر اہلسنت بریلوی ہے۔ لہٰذا کسی قول کو رضوی کہنا سراسر نادانی ہے۔ اور نیئے فساد کا دروازہ کھولنا ہے نسبت عقیدہ کے اعتبار سے تمام اہلسنت علماء بریلوی ہیں، باوجود اس کے پھر بھی بہت سے علماء اکابرین اور ہمعصر، گھڑی کی کلائی والی ہر قسم کی چین کو مطلق جائز سمجھتے ہیں خواہ لوہے کی ہو یا پیتل تانبے کی چنانچہ اکابرین علماء میں حضرت قبلہ مولٰینا نوراللہ صاحب نعیمی، حضرت قبلہ مفتی محمد حسین نعیمی، محقق اہلِ سنت مولٰینا عطا محمد صاحب بندیال، علامہ احمد حسن نوری۔ سید صاحب قبلہ، علامہ محمود رضوی، محقق عالمِ دین حضرت مولٰینا حافظ سید علی صاحب گجراتی، شیخ المشائخ حضرت حکیم الامت۔ غرضیکہ جمہور علماء گھڑی کی چین کی حلت کے قائل ہیں۔ اس کی حرمت پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔ ہاں اس کی حلت اور جواز پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ شریعت کے اصولی اور نقلی قواعد سے بھی اس کی حلت ہی ثابت ہے۔ **دلیل نمبر ۱** :- علمائے اصولِ فقہ فرماتے ہیں۔ اَلْاَصْلُ فِی الْاَشْیَاءِ الْاِبَاحَۃُ (از نور الانوار صـ ۱۱۲) یعنی ہر چیز اصل میں حلال ہے جائز ہے جبتک کہ اس پر حرمت کی دلیل نہ قائم ہو۔ اس قاعدہ کلیہ کی بناء پر حرمت کی دلیل پیش کرنی لازم ہے نہ کہ حلت کی۔ لہٰذا جو لوگ کلائی کی چین کو حرام کہتے ہیں وہ یا نصِ قطعی یا قیاس کی دلیل پیش کریں۔ وہ حضرات شاید اپنے قیاس میں یہ دلیل پیش کردیں کہ لوہے پیتل وغیرہ کی چین میں زینت ہے اور زینت مرد کو حرام ہے لہٰذا چین باندھنی حرام۔ یا شاید یہ کہہ دیں کہ پیتل لوہے تانبے کا زیور عورت و مرد کو حرام ہے۔ چونکہ چین بھی زیور میں داخل ہے۔ لہٰذا حرام۔ یا شاید یہ کہہ دیں کہ لوہے پیتل کی چین میں فضول خرچی ہے اور فضول خرچی حرام لہٰذا یہ چین بھی حرام۔ مگر یہ تینوں قیاس بالکل غلط ہیں۔ کیونکہ قیاس کرنا آسان نہیں۔ اور یہ تینوں قیاس مقیس علیہ سے کسی طرح بھی موافق نہیں۔ خیال رہے کہ اسلام میں دو چیزیں انتہائی مشکل ہیں ۱۔ کسی کو کافر ثابت کرنا ۲۔ حرام کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام و فقہائے عظام نے ان دونوں موقعوں پر بے شمار قیود ضوابط و شرائط و پابندیاں مرتب کیں چنانچہ شامی جلد سوم صـ ۲۹۳ پر ہے۔ اِذَا کَانَ فِی الْمَسْئَلَۃِ وُجُوْہٌ تُوْجِبُ الْکُفْرَ وَوَجْہٌ وَّاحِدٌ یَمْنَعُ فَعَلَی الْمُفْتِیْ اَنْ یَّمِیْلَ اِلَی الْوَجْہِ الَّذِیْ یَمْنَعُ التَّکْفِیْرَ۔

ترجمہ :- اگر کسی کے قول میں بہت صورتیں کفر کی ہوں فقط ایک اسلام کی تو اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگاؤ۔ مگر جسطرح کہ دیوبندیوں وہابیوں نے ہر مسلمان کو کافر کہنا بہت آسان سمجھ لیا ہے اسی طرح ہمارے بعض رضوی بھائیوں نے حرام کرنے کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے حالانکہ قیاساً کسی شئی کو حرام کرنے کیلئے مقیس اور مقیس علیہ میں گیارہ اشیاء کی مطابقت ضروری ہے جن میں چار شرطیں۔ چار رکن اور قیاس کی لغوی تفسیر اور شرعی تفسیر اور قیاس کا حکم۔ مگر مندرجہ بالا قیاسات میں ان میں سے کسی چیز کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ اور مزید تعجب یہ ہے کہ رضوی حضرات میں بھی بعض اسکو حرام کہتے ہیں۔ بعض مکروہ تحریمی بعض مکروہ تنزیہی۔ اور دلیل کسی کے پاس نہیں۔ پہلا قیاس اس لئے غلط ہے کہ مرد کو مطلقاً زینت

حرام نہیں بلکہ انسان مستعملہ اشیاء کا استعمال چار طریقوں پر ہوتا ہے ۱ برائے زینتِ محضہ یہ چیزیں صرف عورت کیلئے جائز ہیں مرد کے لئے ناجائز۔ اس کو زیور اور سنگھار کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی اپنی کتاب ردالمحتار جلد سوم ص ۳۰۹ پر فرماتے ہیں اَقُوْلُ فِيْهِ نَظَرٌ لِاَنَّ الْحُلِيَّ كَمَا فِي الْقَامُوْسِ مَا يُتَزَيَّنُ بِهٖ ۔ یعنی ہر وہ چیز جس سے زینتِ محضہ حاصل ہو وہ زیور ہے۔ لہٰذا ریشم سونا چاندی سے چونکہ صرف زینت مقصود ہے اس لئے مرد کو حرام۔ اگر یہی چیزیں ضرورت کے لئے استعمال ہوں تو مرد کے لئے جائز جیسے بوقتِ جنگ ریشم اور سونے کی ناک و دانت ضرورتاً لگائی گئی تو جائز جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث وارد ہے اسی لیئے عالمگیری میں ارشاد ہے کہ سیاہ سرمہ اور کاجل بلا ضرورت مرد کو لگانا جائز ہے۔ کہ زینتِ محضہ ہے چنانچہ ارشاد ص ۳۵۹ وَيُكْرَهُ الْكُحْلُ الْاَسْوَدُ بِالْاِتِّفَاقِ اِذَا قَصَدَ بِهِ الزِّيْنَةَ اسی طرح صاحب بہارِ شریعت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب جلد ۱۶ ص ۲۰۸ پر ارشاد فرمایا کاجل بقصدِ زینت مرد کو لگانا حرام ہے۔ زینت مقصود نہ ہو تو کراہت نہیں۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ زینتِ محضہ مرد کو حرام۔ زینتِ محضہ وہ ہے جہاں صرف زینت ہی مقصود ہو، ضرورت نہ ہو، استعمال کرنے کی دوسری قسم زینت مع ضرورت، یہ مرد و عورت دونوں کو شرعاً جائز ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ استعمال کرنے والا یا تو بوقتِ استعمال صرف ضرورت کا ارادہ کرے زینت خود بخود ہو جائے۔ جیسے آنکھوں کی گرمی دور کرنے کیلئے کاجل لگانا یا بوقتِ جہاد ریشم پہننا یا دانتوں کی بیماری دور کرنے کیلئے سونے کا دانت لگانا وغیرہ وغیرہ۔ یا مرد بوقتِ استعمال زینت اور ضرورت دونوں کا ارادہ کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الخ) پارہ ۸ ع۔ سرمہ، تیل، خوشبو، اچھا قیمتی لباس، خوبصورت جوتا، سونے کے بٹن، چاندی کی انگوٹھی، بہترین عمامہ، ٹوپی سب مرد کو جائز ہیں، کیونکہ زینت مع ضرورت ہیں اگرچہ ان میں زینت ہے مگر یہ چیزیں زیور نہیں۔ اس لیئے کہ زیور وہ ہوتا ہے جس میں ضرورت قطعاً نہ ہو محض زینت ہو۔ تیسری قسم استعمال کرنے کی ضرورتِ محضہ۔ یہ بھی مرد و زن ہر دو کو جائز ہیں۔ جیسے تمام ضروریاتِ زندگی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ربّ العزت ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ استعمال کی چوتھی قسم نہ زینت نہ ضرورت، یہ تمام مرد و زن کو بالاتفاق حرام ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ اور ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ جیسے تمام عیاشی کے سامان۔ پس ثابت ہوا کہ دنیاوی استعمال کے فقط چار طریقے ہی ہیں۔ ۱ زینتِ محضہ ۲ ضرورتِ محضہ ۳ زینت مع ضرورت ۴ نہ زینت نہ ضرورت۔ اسی طرح اعلیٰحضرت نے بھی عطایا قدیر ص ۲۳ پر استعمال کے چار درجے فرمائے۔ گھڑی کی چین مذکورہ نمبر ۲ میں شامل ہے۔ یعنی اس میں زینت بھی ہے اور یہ چین ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے کہ اس میں گھڑی کی حفاظت ہے۔ چمڑے اور کپڑے کی چین میں وہ بات نہیں۔ اُن کو گرہ کٹ کاٹ لیتا ہے۔

جیساکہ متعدد مسافروں کو سابقہ پڑا۔ گھڑی باندھنے میں آسانی ہے۔ دوسری چین کئی دفعہ باندھتے وقت گر جاتی ہے جس سے گھڑی کو شدید نقصان پہنچ کر سینکڑوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ خود گھڑی لوہے پیتل تانبے کی بالاتفاق جائز ہے (یاللعجب) اور جائز کی حفاظت واجب ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ فقہاء کرام ہے۔ يَجِبُ حِفَاظَتُ اَمْوَالِ الْحَلَالِ تفسیر کبیر زیر آیت لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بِالْبَاطِلِ اسی طرح مرقوم ہے۔ سونے چاندی کی گھڑی بالاتفاق مرد و زن پر حرام ہے۔ معلوم ہوا کہ گھڑی اور چین دونوں زیور نہیں ورنہ صرف گھڑی بھی مرد کو حرام ہوتی۔ جس طرح صرف ٹیکہ دھاگے سے پرو کر ماتھے پر باندھنا مرد کو مطلقاً دھات سے حرام اتفاقاً ہے۔ جب صرف لوہے کا ٹیکہ حرام ہے بوجہ زیور کے۔ تو صرف گھڑی بھی حرام ہونی چاہیئے۔ یہ کیا منطق ہے کہ چین حرام اور گھڑی جائز۔ اگر زیور ہے تو کُل زیور نہیں تو کُل۔ صرف ضد بازی سے کام نہیں چلے گا۔ دلیل سے منواؤ۔ ہم ماننے کیلئے تیار ہیں۔ ورنہ جانِ برادر شریعت تمہارے گھر کی چیز نہیں کہ جس طرح چاہو توڑ مروڑ لو۔ مرد کے لئے مطلق طور پر صرف سونا چاندی حرام ہے۔ وہ بھی خلافِ قیاس حرام۔ مطابق قیاس سونا و چاندی کا استعمال بھی حرام نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ اس آیت کے ماتحت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں۔ تفسیر کبیر جلد چہارم صـ۲۹۵ پر اِنَّهٗ يَتَنَاوَلُ جَمِيْعُ اَنْوَاعِ الزِّيْنَةِ فَيَدْخُلُ تَحْتَ الزِّيْنَةِ جَمِيْعُ اَنْوَاعِ التَّزْيِيْنِ صـ۲۹۶ پر ارشاد ہے۔ وَيَدْخُلُ تَحْتَهَا اَيْضًا اَنْوَاعُ الْحُلِيِّ لِاَنَّ كُلَّ ذٰلِكَ زِيْنَةٌ وَلَوْلَا النَّصُّ الْوَارِدُ فِيْ تَحْرِيْمِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْاِبْرِيْسَمِ عَلَى الرِّجَالِ لَكَانَ ذٰلِكَ دَاخِلًا تَحْتَ هٰذَا الْعُمُوْمِ حدیث پاک سنن دارمی میں مرقوم ہے کہ نبی کریم نے حضرت عثمانؓ کو تارکِ دنیا کے لباس میں دیکھ کر ایک دفعہ فرمایا اے عثمانؓ زینت ہماری سنت ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عُثْمَانُ لَا تَرْغَبْ عَنْ سُنَّتِيْ فَاِنَّ مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ وَمَاتَ قَبْلَ اَنْ يَتُوْبَ صَرَفَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ وَجْهَهٗ عَنْ حَوْضِيْ۔ اس کی شرح میں علامہ رازی فرماتے ہیں۔ وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ هٰذِهِ الشَّرِيْعَةَ الْكَامِلَةَ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ جَمِيْعَ اَنْوَاعِ الزِّيْنَةِ مُبَاحٌ مَاْذُوْنٌ فِيْهِ اِلَّا مَا خَصَّهُ الدَّلِيْلُ مُقْتَضٰى هٰذِهِ الْاٰيَةِ اَنَّ كُلَّ مَا تَزَيَّنَ الْاِنْسَانُ بِهٖ وَجَبَ اَنْ يَكُوْنَ حَلَالًا۔ وَحَلَّ كُلُّ الْمَنَافِعِ صـ۲۹۶

اِن دلائل سے ثابت ہوا کہ سونے چاندی کا زیور خلافِ قیاس حرام ہے۔ خلافِ قیاس کی تعریف یہ ہے کہ منصوص قطعی پر بتمام شرائط کسی غیر منصوص حکم کو ڈھالا جائے۔ اس غیر منصوص قیاسی حکم کے خلاف بھی کوئی اس کی حرمت یا جواز میں نص نہ آجائے۔ اسی طرح شامی جلد اوّل صـ۲۰۲ پر ہے اَلْاِسْتِحْسَانُ كَمَا قَالَ الْكَرْخِيُّ قَطْعُ الْمَسْئَلَةِ عَنْ نَظَائِرِهَا بِمَا هُوَ اَقْوٰى وَذٰلِكَ الْاَقْوٰى هُوَ دَلِيْلٌ يُقَابِلُ الْقِيَاسَ الْجَلِيَّ الَّذِيْ تَسْبِقُ اِلَيْهِ اَفْهَامُ الْمُجْتَهِدِيْنَ۔ یعنی خلافِ قیاس مسئلہ قیاسی مسئلے سے قوی ہوتا ہے قیاس جلی علمائے مجتہدین کے مفہومات کو کہتے ہیں۔ اس

کے خلاف جو سکہ بھی قرآن یا حدیث میں آئے گا وہ خلافِ قیاس ہوگا۔ مثلاً نور الانوار ص۲۴۷ پر مرقوم ہے جس طرح بیع سلم۔ قیاس چاہتا ہے کہ بیع سلم ناجائز ہونی چاہیئے۔ کیونکہ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ: عَنْ حَکِیْمِ ابْنِ حَزَامٍ رضی قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَبِیْعَ مَا لَیْسَ عِنْدِیْ۔ مشکوٰۃ شریف جلد اوّل ص۲۴۸ یعنی معدوم کی بیع منع ہے۔ اس پر قیاس کیا بیع سلم کو تو وہ بھی ناجائز ہونی چاہیئے۔ لیکن صراحتاً دوسری حدیث پاک میں بیع سلم کو جائز فرمایا لہٰذا قیاس کے خلاف جائز ہوئی۔ اسی طرح سونے چاندی کا زیور بوجہ زینت قیاس چاہتا ہے کہ مرد کو حلال ہو۔ کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ اور ارشاد ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ مگر چونکہ صراحتاً حدیث پاک سے حرمت ثابت ہے۔ لہٰذا خلافِ قیاس سونے چاندی کا زیور مرد کو حرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حرمت کی وجہ سے پیتل تانبہ، لوہا وغیرہ کے زیور مرد کو حرام نہیں ہوئے بلکہ ان زیوروں کی حرمت دیگر احادیث سے ہے۔ اسی لئے لوہے کی زرہ اور جنگی لباس پہننا جائز ہے۔ سونے چاندی کا منع کیونکہ خلافِ قیاس اپنے مورد پر ہی رہتا ہے۔ خلافِ قیاس شریعت میں چار قسم کا ہے۔ چنانچہ علماءِ اصول فرماتے ہیں وَالْاِسْتِحْسَانُ یَکُوْنُ بِالْاَثَرِ وَالْاِجْمَاعِ وَالضَّرُوْرَۃِ وَالْقِیَاسِ الْخَفِیِّ۔ نور الانوار ص۲۴۷۔ یہ سونے چاندی کی حرمت خلافِ قیاس اثری ہے۔ اس لئے اس پر گھڑی کی چین کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خلافِ قیاس پر کسی کو قیاس کرنا منع ہے۔ ھٰکَذَا قَالَ اَبِیْ حَکِیْمُ الْاُمَّتِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ فِیْ فَتَاوٰیہٗ۔ اس تمام گفتگو سے ثابت ہوا کہ پیتل تانبہ لوہے کی چین بالکل حرام نہیں۔ جو لوگ اس کو اندھا دھند حرام کہہ دیتے ہیں وہ بہت غلطی پر ہیں۔ عُقلاء کو چاہیئے کہ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ چین مذکورہ عورت و مرد دونوں کو بالکل جائز بلا کراہت ہے۔ ہاں سونے کی چین ہو، یا چاندی کی۔ عورت و مرد دونوں کو حرام ہے۔ اسی طرح سونے کی صرف گھڑی مرد و عورت دونوں کو حرام ہے۔ کیونکہ چین زیور نہیں بلکہ مستعملہ چیز ہے۔

جوازِ چین مذکورہ کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:۔

دلیل نمبر۱:۔ جمہور علمائے کرام کا عمل مبارک بھی اجماعِ امت میں شامل ہے۔ گھڑی کی چین کے متعلق سید ابو البرکات قبلۂ عالم پیرِ طریقت کا ارشاد قولی گزر گیا کہ آپ جواز کے قائل ہیں۔ ۱۹۶۰ء کو فخرِ اہلسنت غزالیٔ زمان حضرت قبلہ علامہ کاظمی صاحب سے میں نے سوال کیا جبکہ وہ گجرات تشریف لائے تھے تو آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ یہ لوگ خواہ مخواہ ضد باندھ لیتے ہیں۔ حقیقت دیکھی جائے تو پیتل لوہے کی چین کے حرام ہونے کی دلیل تو درکنار کراہت کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ حضرت حکیم الامت کو اخیر زمانے تک میں نے خود چھ دن لوہے کی چین باندھے دیکھا۔ محققین کے نزدیک عمل اور قول میں نسبت عام خاص مطلق ہے کہ ہر قول مثل عمل کے ہے مگر ہر عمل مثل قول کے نہیں۔ محدثین کا ارشاد ہے۔ اَلْقَوْلُ مِثْلُ الْعَمَلِ سند کے لئے ان تین علمائے عظام کا قول و عمل کافی ہے۔ کیونکہ یہ حضرات رأس العلماء ہیں۔ اِنَّا قَوْلُ قَوْلِیْ

جمہور ہے۔ جس طرح کے راس سے سارا جسم مراد ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمعصر علماء محققین کے اقوال وعمل ظاہر و باہر ہیں۔ میرے استادِ محترم اخی معظم قبلہ مفتی مختار احمد صاحب بھی جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ ان حضرات کا قول و عمل اہلِ اصول کے نزدیک شریعتِ پاک کی دلیل ہے۔ چنانچہ نور الانوار ص۹ پر ہے وَتَعَامُلُ النَّاسِ مُلْحَقٌ بِالْاِجْمَاعِ ۔ یعنی لوگوں کا کسی چیز پر عامل ہو جانا جواز کی دلیل ہے۔ اور اجماعِ امت میں شامل ہے۔ لوگوں سے کون سے لوگ مراد ہیں۔ اِسکی وضاحت خود مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ص۱۱۔ اِنَّ الْمُسْتَحَبَّ مَا اَحَبَّهُ الْعُلَمَاءُ یعنی علمائے کرام کا کسی کو محبوب رکھنا شئی کو مستحب بنا دیتا ہے۔ پس گھڑی کی چین مذکورہ بالا جمہور علماء کے نزدیک محبوب ہے، لہٰذا باندھنا مستحب ہوئی۔ دلیل ۲ ۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مصنفہ اَلطِّیْبُ الْوَجِیْز میں ارشاد فرماتے ہیں ص۱۲ مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔ "اگر پہننے کے مشابہ نہ ٹھہرے تو نہ اس میں حرج نہ نماز میں کراہت"۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اسی طرف ناظر کہ یہ پہننے کے مشابہ نہیں۔ مگر فقیر کو اس میں تامل ہے۔ اور وہ خود بھی اس پر جزم نہیں رکھتے اور اُسے لکھ کر تامل کا حکم فرماتے ہیں۔ تو بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ واللّٰہُ تعالیٰ اعلم۔ اس عبارت سے بالوضاحت ثابت ہوا کہ چین باندھنا نہ حرام نہ مکروہ تحریمی۔ بلکہ اعلیحضرت کے نزدیک خلاف بہتر ہے۔ بہتر بمعنی مندوب ہے۔ لفظ مندوب و مستحب مرادف میں پس مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کا یہ ارشاد کہ بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ یعنی مستحب اس سے احتراز ہی ہے اور

قانونِ شریعت میں ترکِ مندوب و مستحب مکروہ تنزیہی بھی نہیں چہ جائیکہ حرام ہو۔ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں وَاَمَّا الْمُسْتَحَبُّ وَالْمَنْدُوْبُ فَیَنْبَغِیْ اَنْ لَّا یُکْرَهَ تَرْکُهٗ اَصْلًا (الخ) فَلَمْ یَلْزَمْ مِنْ تَرْکِ الْمُسْتَحَبِّ ثُبُوْتُ الْکَرَاهَةِ۔ ردالمحتار جلد اول ص۱۱۶۔ ثابت ہوا کہ گھڑی کی چین باندھنا بلا کراہت اعلیٰ حضرت کے نزدیک جائز ہے۔ ہاں بوجہ گمانِ تشبہ احتراز بہتر ہے۔ بعض رضوی حضرات بہتر بمعنی اولیٰ کرتے ہیں اور اولیٰ بمعنی واجب لاتے ہیں۔ اور دلیل میں اعلیٰ حضرت مجدد ملت کا قولِ طیبہ پیش کرتے ہیں کہ آپ نے فتاویٰ رضویہ جلد اول ص۸۴۸ حاشیہ ف۲ پر فرمایا۔ قَدْ یُطْلَقُ الْاَوْلٰی عَلَی الْوَاجِبِ بَلْ عَلَی الْفَرْضِ۔ یہ دلیل انتہائی کمزور ہے۔ بلکہ اپنے پیش کنندہ کے غیر محقق ہونے پر دال ہے۔ اس کی وجہ کمزوری دو طریق پر ہے ۱۔ وجہ الزامی۔ اسی صفحہ پر حاشیہ ف۳ وجوب کے معنیٰ بھی دو کئے گئے ہیں۔ تاکید اور مجرد ثبوت۔ چنانچہ ارشاد ہے قَدْ یُطْلَقُ الْوُجُوْبُ بِمَعْنَی التَّاکِیْدِ بَلْ مُجَرَّدِ الثُّبُوْتِ ۔ تو کیا کوئی رضوی کسی واجب کو سنتِ مؤکدہ کہہ سکتا ہے۔ اور کیا اعلیٰ حضرت کے اس قول کے مطابق وتر یا عیدین کو بجائے واجب سنتِ مؤکدہ کہہ سکتا ہے۔ جس طرح واجب سے مؤکدہ مراد ہو سکتی ہے مگر کسی قرینے سے اسی طرح اولیٰ سے واجب مراد ہو سکتا ہے مگر کسی قرینے سے ۲۔ وجہ تحقیقی یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا قَدْ یُطْلَقُ اور حرف قَدْ عِنْدَ النُّحَاةِ لِلتَّقْلِیْلِ ۔ تو مطلب یہ ہوا کہ بہت کم ایسا ہوتا

ہے کہ لفظِ اولیٰ واجب یا فرض کے معنیٰ میں ہو۔ واضح رہے کہ لفظِ اولیٰ مشترک ہے اس کے چھ معنیٰ ہیں۔ ایک معنیٰ حقیقی باقی معنیٰ مجازی حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ اس کا ترک مکروہ تنزیہی ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ نے ارشاد فرمایا جلد اوّل ص۲۱۱ فَکُلُّ مَکْرُوْہٍ تَنْزِیْہًا خِلَافُ الْاَوْلٰی اِذَانٌ مِّنِّیْ مُرَاھِقٍ مَکْرُوْہٌ تَنْزِیْھًا لِاَنَّ غَیْرَھُمْ اَوْلٰی مِنْھُمْ ۔۔ اشارۃً ثابت ہوا کہ خلافِ اولیٰ مکروہ تنزیہی ہے عقود رسم المفتی ص۲۹ پر ارشاد ہے وَظَاھِرُ کَلَامِ فَخْرِ الْاِسْلَامِ اَنَّہٗ الْاَوْلَوِیَّۃُ حَتّٰی یَجُوْزُ الْعَمَلُ بِہٖ یعنی فخر الاسلام کے نزدیک قولِ راجح پر عمل کرنا اولیٰ مگر مرجوح پر عمل بھی جائز ہے یہاں اولیٰ بمعنی مستحب ثابت ہوئے اولیٰ کے تیسرے معنیٰ مندوب۔ چنانچہ شامی میں ہے وَلَا شَکَّ اَنَّ تَرْکَ الْمَنْدُوْبِ وَالْمُسْتَحَبِّ خِلَافُ الْاَوْلٰی ۔ اولیٰ کے چوتھے معنیٰ قریب چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ اور حدیثِ پاک میں آتا ہے۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ بخاری شریف جلد اوّل ص۴۹ اور مشکوٰۃ شریف ص۸۶ پر ہے عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلٰوۃً (رواہ الترمذی)۔ اُولیٰ کے پانچویں معنیٰ اور چھٹے معنیٰ وہ ہی ہیں جو اعلیٰ حضرت نے بلفظ قَدْ یُطْلَقُ سے ارشاد فرمائے۔ ثابت ہوا کہ اولیٰ لفظِ مشترک ہے۔ حقیقی معنیٰ ہوتے ہوئے بغیر قرینے مجازی معنیٰ مراد لینا اہلِ اصول کے نزدیک غلط ہے۔ پس کتنی جلد بازی ہے کہ بلا سوچے سمجھے اپنی بات رکھنے کیلئے اعلیٰحضرت کے کلام پاک کی تحریف کرتے ہوئے بہتر کے معنیٰ اولیٰ کیسے جائیں اور اولیٰ کو وجوب میں ڈھال دیا جائے۔ بہتر کا لفظ ہماری اصطلاح میں مستحب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ رضوی بزرگ نے اپنی اصطلاح پر بھی غور نہ فرمایا اِنَّا جَعَلْنَا عَنْ لِسَانِ قَوْمِکَ اصطلاحاً کلامِ امام علیہ الرحمۃ کا مفہوم وہی ہے جیسے فقہاء فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ کی صبح صاحب قربانی قبل قربانی کوئی چیز کھا سکتا ہے مگر بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ بعینہٖ یہی مقصود کلامِ امام سے ہے کہ گھڑی کی مذکورہ چین جائز ہے نہ حرام نہ مکروہ مگر بہتر اس سے احتراز ہی ہے فقط ایک شبہ کے گمان پر۔ واضح رہے کہ احتراز و ترک عند البعض مرادف ہیں۔ احتراز کی تین قسمیں ہیں ۱ احترازِ لازم ۲ احتراز بہتر ۳ احترازِ جائز۔ حرام چیز سے احتراز لازم ہے۔ چنانچہ خود اعلیٰ حضرت نے اپنے ملفوظ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کراچی جلد سوم ص۱۵ پر فرمایا۔ عرض، اگر وہابی سے نکاح پڑھا جائے تو ہو جائے گا یا نہیں۔ ارشاد، چونکہ وہابی سے پڑھوانے میں اس کی تعظیم ہوتی ہے جو حرام ہے لہٰذا احتراز لازم ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر گھڑی کی چین باندھنا حرام ہوتا تو اعلیٰحضرت بہتر اس سے احتراز نہ فرماتے بلکہ فرماتے کہ لازم اس سے احتراز ہی ہے۔ جس طرح صاحبِ قربانی بقرعید کا چاند دیکھ کر بال ناخن کٹا سکتا ہے مگر بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ فقط ایک مشابہت کے خیال کی بناء پر ۳ قانونِ شریعت کے مطابق ضرورتِ مطلقہ کے وقت وہ چیز بھی جائز ہو جاتی ہے جس کو قیاسِ مجتہدین و علمائے کرام نے حرام بل اشد حرام کیا ہو چنانچہ

نور الانوار صـ۲۴۷ پر ہے وَتَطْهِيْرُ الْاُوْلٰى مِثَالٌ لِلْاِسْتِحْسَانِ بِالضَّرُوْرَةِ فَاِنَّ الْقِيَاسَ يَقْتَضِيْ عَدَمَ تَطَهُّرِهَا اِذَا تَنَجَّسَتْ لِاَنَّهٗ لَا يُمْكِنُ عَصْرُهَا حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْهَا النَّجَاسَةُ - لٰكِنْ اِسْتَحْسَنَّا فِيْ تَطْهِيْرِهَا لِضَرُوْرَةِ الْاِبْتِلَاءِ بِهَا - وَالْحَرَجِ فِيْ تَنَجُّسِهَا - یعنی ناپاک برتن کا پانی سے دھل کر پاک ہوجانا قیاس کے خلاف ہے ۔کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ناپاک شئے سے پاک لگا تو خود ناپاک ہو گیا (کذ فی حاشیہ) اور برتن نچوڑا نہیں جا سکتا کہ اس سے پانی نکالا جائے تو برتن موصوف بجائے پاک ہونے کے بدرجۂ اتم ناپاک ہو گیا اور ناپاک شئے کا کھانے پینے وغیرہ کے لیئے استعمال کرنا اشد حرام ہے ۔مگر دنیوی حاجت کیلئے اتنے بڑے قیاس کو چھوڑ دیا گیا ۔ یہ قیاس نہ آیتِ قرآنی کی وجہ سے چھوڑا نہ حدیثِ پاک کی وجہ سے ۔ نہ قول مجتہد فی الاصول ۔ نہ قیاسِ خفی کی وجہ سے بلکہ محض دنیوی ضروریاتِ زندگی کی وجہ سے ۔ثابت ہوا کہ ضرورتِ دنیاوی کی وجہ سے قیاساً حرام چیز کا استعمال کرنا بھی جائز بلکہ لازم ہے اور قیاس یکسر چھوڑ دیا جائے گا ۔تو اعلیٰ حضرت کا قیاس فقط احتراز مستحب کا ہی ہے یہ بھی گھڑی کی حفاظت اور گرہ کٹوں کی زد سے بچانے کیلئے چھوڑا جائے گا بلکہ خود اعلیٰ حضرت بھی اگر اس کسمپرسی کے دور کو دیکھتے تو اپنے قیاسِ احتراز سے احتراز فرما لیتے ۔میں عالم اہلسنت ہونے کی حیثیت سے اعلیٰحضرت کا نائب ہوں ۔ نائب کا کام اصل کا ہی کام ہے ۔پس میرا ان دلائل کے ماتحت گھڑی کی چین از قسم تانبہ پیتل لوہا سٹیل رولڈ گولڈ کو جائز قرار دینا اعلیٰحضرت ہی کا جائز فرمانا ہے ۔ لہٰذا کسی رضوی بھائی کو حق نہیں پہنچتا کہ بغیر دلائل و تحقیق اس فتویٰ کی محض ضد سے تردید کرے ۔ ہاں اس سے زیادہ مضبوط دلائل و تحقیق کی بناء پر تردید جائز ہے کہ بحث اَلْحَقُّ تَحْقِيْقُهٗ۔

دلیل ۴: ۔علامہ سید محمد امین رحؒ معروف ابن عابدین شامی جو اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے روحانی استادِ محترم ہیں ۔جیسا کہ خود اعلیٰحضرت مولٰنا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے ثابت ہے چنانچہ ماہنامہ رضائے مصطفےٰ صـ۱۶ نمبر اعلیٰحضرت صفر کا مہینہ ۱۳۹۳ھ پر خود اعلیٰحضرت کا ارشاد منقول ہے ۔فرمایا کہ میں نے فقہ علامہ شامی سے سیکھا ۔بحمدہٖ تعالیٰ علامہ شامی کا مقام اس وقت فقہ میں بہت بلند ہے ۔ آپ کا درجہ مجتہدین فی التصحیح کی صف میں ہے ۔آپ کے نزدیک بھی گھڑی کی چین مذکورہ باندھنا حرام نہیں چنانچہ شامی جلد پنجم صـ۱۳۱ پر ارشاد ہے ۔بَقِيَ الْكَلَامُ فِيْ بَنْدِ السَّاعَةِ الَّذِيْ تُرْبَطُ بِهٖ وَيُعَلِّقُهُ الرَّجُلُ بِزِرِّ ثَوْبِهٖ وَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ كَبَنْدِ السُّبْحَةِ الَّذِيْ تُرْبَطُ بِهٖ فَتَاَمَّلْ ۔ یعنی وہ چین جس سے گھڑی باندھی جاتی ہے ۔ اور معلّق کی جاتی ہے ۔وہ چین مثل تسبیح کے ڈورے کے ہے ۔کہ جس طرح تسبیح کا ڈورا ریشمی ہو تو جائز ہے ۔اسی طرح اگر چین کلائی والی ریشم کی ہو تو وہ بھی جائز ہے ۔خیال رہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں ریشم صرف پہننا حرام ہے ۔ باقی ہر طرح استعمال جائز ہے ۔ریشم کے رومال میں مٹھائی رکھ کر کھا سکتا ہے ۔ اس کے مصلے پر نماز پڑھ سکتا ہے ۔تو اس کی چین بھی بدرجۂ اولیٰ باندھ سکتا ہے ۔اسی لیئے اس کو علامہ شامی نے تسبیح کی چین سے مشابہ کیا اور تسبیح کی ڈوری جیسی تو جائز ۔چنانچہ

شامی جلد پنجم صفحہ ۲۳۱ پر مرقوم ہے قُلْتُ وَمِنْهُ يُعْلَمُ حُكْمُ مَا كَثُرَ السُّوَالُ عَنْهُ مِنْ شَدِّ السُّبْحَةِ فَلْيُحْفَظْ ثابت ہوا کہ اگر وہی ریشم کی چین والی تسبیح اگر کوئی گلے میں ڈالے یا کلائی پر لپیٹے تو جائز ہوگا۔ اسی طرح پیتل تانبے کی چین بھی کلائی پر جائز ہوگی نہ حرام نہ مکروہ تحریمی۔ بعض حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ شامی اور اعلیٰحضرت کا فرمان گھڑی کی جیبی زنجیر کے متعلق ہے نہ کہ کلائی چین کے متعلق تو اُن کے اقوال کو حلت چین متنازعہ فیہ پر دلیل کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے دو طرح جواب ہو سکتے ہیں ۱ الزامی جواب تو یہ ہے کہ پھر تو آپ کا مدعا بھی حاصل نہ ہوا اور اعلیٰحضرت کے قولِ طیبہ کو حرمت پر بھی دلیل نہیں بنا سکتے اور کوئی رضوی ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ اعلیٰحضرت نے مذکورہ کلائی چین کو حرام کہا ہے۔ یا احتراز کا حکم دیا ہے۔ اور نہ ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت حصہ سوم صفحہ ۱۹ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کی کی عبارت پیش کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی جیبی چین کے متعلق ہے۔ پس اس طریقے پر کہیں ثابت نہیں کہ اعلیٰ حضرت نے کلائی کی چین کو حرام کہا ہو نہ ہی احکامِ شریعت حصہ دوم ملفوظہ ۶۲ کو سند میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی گھڑی کی زنجیر کے متعلق ہے نہ کہ چین کے۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ علامہ شامی کے اقوال طیبہ طاہرہ کا دار و مدار پہننے اور نہ پہننے پر ہے۔ لہٰذا جو چیز بھی پہننے میں آئے گی اس کی حرمت ظاہر ہوگی۔ اعلیٰحضرت کے اقوال بھی اسی پر دال ہیں اور آپ بھی چین کو پہننا نہیں مانتے بلکہ ایک شبہہ ہے تو چونکہ ہر دو بزرگ پہننے، نہ پہننے پر حرمت و حلت کا مدار رکھتے ہیں اور یہ پہننا ظاہر ہے کہ جیبی گھڑی کی زنجیر میں قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اس میں تامل بیکار۔ پس ثابت ہوا کہ چین ہی مراد ہے۔ اور وہی پہننے کے قریب ہو سکتی ہے۔ اسی میں تامل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الطیب الوجیز کے سوال میں گھڑی کی چین کے متعلق ہی گفتگو ہے۔ اور اعلیٰحضرت نے اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ شامی کی عبارت پیش کی ہے۔ جب سوال میں زنجیر کا ذکر نہیں تو جواب میں زنجیر کا ذکر کیوں۔ ثابت ہوا کہ ہر دو حکم میں برابر ہیں۔ اور تامل تحقیق کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اس سے حرمت ثابت نہیں ہو سکتی۔ پس اِن دلائلِ قاہرہ و براہینِ باہرہ سے ثابت ہوا کہ کلائی کی مذکورہ چین بالکل حلال و جائز ہے۔ علامہ شامی نے جائز قرار دیا اور اعلیٰحضرت نے کہیں حرام نہ فرمایا۔

سائل محترم کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے۔ آپ کے سوال کے بعد میں نے احکامِ شریعت مطبوعہ نعیمی کتب خانہ ہر حصص کا بغور مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ واقعتاً یہ کتاب اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں بلکہ از قسم ملفوظات ہیں جن کو ایک جگہ تحریر میں لایا گیا۔ لہٰذا اس کو ملفوظاتِ اعلیٰحضرت تو کہہ سکتے ہیں مگر اعلیٰ حضرت کی تصنیفات کی صف میں اس کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ عربی زبان میں کسی کلام کو لکھنے کیلئے سات الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ۱ تحریر ۲ تصنیف ۳ تالیف ۴ تشریح ۵ تفسیر ۶ کتابت ۷ ترقیم۔ یہ چھ سات الفاظ اگرچہ اردو میں ان سب کا ترجمہ لکھنا ہی کیا جائے گا مگر عربی لغت میں ان میں عظیم تفریق

ہیں۔ چنانچہ ۱۔ تحریر کے معنیٰ ہیں خوشخط لکھنا لکھنے والا خواہ عالم ہو یا غیر عالم سمجھ کر لکھے یا بغیر سمجھے اپنا کلام ہو یا غیر کا۔ چنانچہ لغات منجد ص ۱۱۹ پر ہے حَرَّرَ الْكِتَابَ حَسَّنَهُ وَاَصْلَحَهُ۔ هٰكَذَا فِيْ لُغَاتِ كشورى۔

ع ۲ تصنیف وہ عبارت جو ذہنی خیالات کو ترتیب دے کر زیر قلم لائی جائے خواہ اپنے ہاتھ سے لکھے یا لفظ بہ لفظ اپنے سامنے لکھوائے۔ چنانچہ لغات قاموس اور منجد ص ۴۵۲ پر ہے صَنَّفَ الْكِتَابَ اَلَّفَهُ وَرَتَّبَهُ

ع ۳ تالیف مختلف مضامین کو ایک جگہ جمع کر دینا۔ اپنے خیال کا یا اپنے الفاظ کا اس میں دخل نہ ہو دوسروں کی عبارات ایک جگہ ترتیب وار جمع کرنا یا کسی کے لفظ سن کر اسی ترتیب سے لکھنا جس طرح اس نے بولے تھے۔ اپنی ذہنی یادداشت سے اس کو ایک جگہ جمع کر دینا۔ اپنی عبارت کا اس میں دخل نہ ہو۔ دوسروں کی عبارات ایک جگہ جمع کر کے لکھنا چنانچہ لغات کشوری ص ۹۱ د پر المنجد ص ۱۳ پر اَلَّفَ الْكِتَابَ جَمَعَهُ وَصَلَ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ۔ لغات حمیری ص ۴ اَلْمُؤَلِّفُ رَجُلٌ اَلَّذِيْ جَمَعَ مَسَائِلَ الْكُتُبِ الْمُخْتَلِفَةِ اَوْ اَلْفَاظَ الرِّجَالِ الْمُخْتَلِفَةِ عَلَى التَّرْتِيْبِ :

ع ۴ تشریح۔ کوئی عالم کسی دوسرے شخص کے کلام کی پوری وضاحت کرے اور پوشیدہ مسئلہ اس طرح کھول کر صاف صاف لکھے کہ پوشیدگی دور ہو جائے۔ اور علم کے زور سے اپنے ہی لفظوں کو لکھے۔ چنانچہ منجد عربی ص ۳۹۳ پر ہے۔ شَرَحَ۔ شَرْحًا۔ اَلْمَسْئَلَةَ كَشَفَ غَامِضَهَا وَبَيَّنَهَا۔ اَلْكَلَامَ فَهَّمَهُ؟ د لغات کشوری ص ۱۰۱ پر ہے۔ تشریح عربی لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ شرح کرنا۔ کھولنا۔ کُل حال بیان کرنا۔

ع ۵ تفسیر۔ رب تعالیٰ کے کلام کے مطالب بیان کرنا اور مختلف قواعد عقلیہ و فرمودات نقلیہ کے مطابق کوئی عالم اپنے لفظوں میں حروف قرآن کریم کی وضاحت کرے۔ چنانچہ لغات کشوری ع ۹۱ پر ہے۔ تفسیر بیان کرنا۔ اور کلام خدا کی شرح کرنا۔ المنجد ص ۶۱۳ فَسَّرَ الْاَمْرَ اَوْضَحَهُ وَبَيَّنَهُ ع ۶ کتابت۔ کسی جگہ کوئی شخص اپنے ہاتھ یا قلم سے حروف ہجاء مفرد یا مرکب کے نقوش بنائے۔ چنانچہ المنجد ص ۱۱۷ اور تاج العروس ص ۱۰۰ پر ہے۔ كَتَبَ الْكِتَابَ صَوَّرَ فِيْهِ اللَّفْظَ بِحُرُوْفِ الْهِجَاءِ اس کے معنیٰ مضبوط نقش ڈالنا بھی جیسے پتھر پر یا کسی سیاہی سے کاغذ پر جو مٹ نہ سکے۔ اسی لئے فرض کو بھی مکتوب کہا گیا ہے کہ وہ حکم منسوخ نہیں ہو سکتا۔

ع ۷ ترقیم کے معنیٰ لکھنا۔ چنانچہ لغات کشوری ص ۹۸ پر ہے۔ ترقیم۔ ع۔ لکھنا۔ رقم کرنا۔ یعنی لکھنے میں زبان کی طرز کا خیال رکھنا۔ عربی لکھنی ہو تو مکمل زیر زبر پیش۔ شد۔ مد لگا کر خوبصورت بنا کر لکھا جائے۔ خواہ کسی کا مضمون ہو یا اپنا۔ چنانچہ منجد ص ۲۷۸ پر رَقَمَ كَتَبَ الْكِتَابَ بَيَّنَهُ وَاَعْجَمَهُ بِوَضْعِ النُّقَطِ وَالْحَرَكَاتِ وَغَيْرِ ذَالِكَ

صاحب تحریر محرّر کہلاتا ہے۔ اور صاحب تصنیف مصنّف کہلاتا ہے اور صاحب تالیف مؤلف کہلاتا ہے تشریح کرنے والا شارح کہلاتا ہے۔ تفسیر والے کو مفسّر کہا جاتا ہے۔ صاحب کتابت کو کاتب صاحب ترقیم کا نام راقم ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت اپنے تمام ملفوظات کے نہ محرّر ہیں نہ مصنّف نہ مؤلف ہو سکتے

ہیں نہ شارح نہ مفسر کہلا سکتے ہیں نہ کاتب نہ راقم الحروف۔ کیونکہ ان الفاظِ مذکورہ کی نسبتیں جداگانہ ہیں۔ چنانچہ لفظ تحریر، ترقیم، کتابت و تصنیف میں نسبت تساوی ہے۔ اور تصنیف تالیف، تشریح میں نسبت تباین ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی کلام کتابت بھی ہو تحریر بھی ترقیم۔ اور تصنیف بھی یا ایک ہی عبارت کا ایک شخص محرّر ہو، دوسرا کاتب تیسرا راقم۔ چوتھا مصنّف یا ایک ہی شخص محرّر بھی ہو، کاتب بھی، راقم بھی، مصنّف بھی۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی عبارت کا ایک ہی شخص مصنّف مؤلّف اور شارح بھی ہو۔ یا ایک شخص مصنّف ہو۔ اور دوسرا مؤلّف تیسرا شارح ہو۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب سمجھنا چاہیئے کہ اعلیٰحضرت کسی ملفوظات کے مصنّف و مؤلّف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ آپ محض لافظ ہیں خواہ وہ احکامِ شریعت ہو۔ یا مجموعۂ ملفوظات چار حصے بلکہ آپ تو محرر کاتب راقم بھی نہیں۔ جس طرح کہ تمام احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہ نبی کریم رؤف الرحیم کسی حدیث مبارک کے مصنّف، مؤلّف، شارح یا محرّر راقم وغیرہ نہیں اسی طرح احکام شریعت وغیرہ اعلیٰحضرت کی تالیف و تصنیف وغیرہ نہیں۔ بلکہ احکامِ شریعت کا مؤلّف سیّد شوکت علی ہے۔ اس کو مخالفوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ رسالہ فیض رضا ص۱۷ اکتوبر نومبر ۱۹۷۲ء پر اس طرح درج ہے۔ احکامِ شریعت ضرور امام اہلِ سنت اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ اس کے جامع سید شوکت علی صاحب ہیں (الخ) اور یہی رسالہ ماہ اگست ۱۹۷۲ء سیّد شوکت علی کو مؤلّف احکامِ شریعت کا لقب دیتا ہے۔ اسی طرح تمام مکتبوں کی فہرستیں بھی ان کو مؤلّفِ احکامِ شریعت کہتے ہیں۔ اور دیگر ملفوظات کے مؤلف مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب (مفتیٔ اعظم ہند) ہیں۔ شاید کوئی لاڈلا بیوقوف یہ بھی کہہ دے کہ احکام شریعت اس لئے اعلیٰحضرت کی تصنیف ہے کہ وہ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ فتویٰ بھی ملفوظ ہو سکتا ہے فتوے کیلئے تحریر یا تصنیف وغیرہ شرط نہیں۔ جس طرح کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ مندرجہ تمام دلائل سے بالوضاحت ثابت ہو گیا کہ احکام شریعت اور حضرت قبلۂ عالم مفتیٔ اعظم کی مذکورہ تالیف اعلیٰحضرت کے محض ملفوظات ہیں۔ اور ملفوظات کیلئے قاعدۂ کلیہ مسلّمہ ہے کہ جو ملفوظات اپنے کانوں سے نہ سنے ہوں بلکہ کسی واسطے سے مسموع ہوں۔ وہ تمام کلام محققین مجتہدین علماء فقہاء کے نزدیک قابلِ غور ہوتے ہیں اگرچہ وہ ملفوظ عالم کے ہوں۔ یا مجتہد کے یا ولی اللہ غوث قطب کے بلکہ صحابی بلکہ نبی۔ یا خود آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظ ہوں۔ چنانچہ دیکھئے علامہ ابن جوزی کی کتاب اصولِ حدیث ص۱۷۲۔ یہی وجہ ہے کہ محدّثین کرام۔ احادیث رسول اللہ میں خوب غور و خوض کر کے ملفوظاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اڑتیس ۳۸ اقسام فرماتے ہیں۔ اور خبرِ واحد کو ہر مقام پر اس حد تک قابل غور بناتے ہیں کہ قیاسِ مجتہد کے مقابل ترک کر دیتے ہیں۔ فرمایئے اگر ملفوظات قابلِ غور نہ ہوتے تو حدیث پاک کی اتنی قسمیں کیوں ہو جاتیں جب نبی کریم

کے ملفوظاتِ مقدسہ کو محدثین قابلِ غور فرماتے ہیں تو اعلیٰحضرت کے ملفوظ کیوں قابلِ غور نہ ہوں گے اور ان کو قابلِ غور کہنے سے کون سی قیامت ڈھ جائے گی حالانکہ احکامِ شریعت وغیرہ ملفوظات بھی کئی واسطوں سے مسموع ہیں۔ صحابہ کرام اور محدثین بھی اُن ہی احادیث میں جرح کرتے ہیں جو خود آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ طیبہ سے نہ سنیں ہوں۔ ورنہ جو ملفوظِ پاک خود پیارے آقا کی زبان مبارک سے سنے ہوں وہ تو قرآنِ پاک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُسی کو حدیثِ متواتر کہتے ہیں۔ بلا تشبیہ یوں ہی سمجھ لو کہ جو باتیں مولانا احمد رضا خاں علیہ رحمۃ کے دہانِ مبارک سے سنیں وہ بدرجۂ اتم قابلِ غور ہوں گی اور کوئی محقق اُن کے مطابق بغیر تحقیق فتوی نہیں دے سکتا۔ بلکہ جب کسی دوسرے مصنّف محقق کی کتاب یا علماء متبحر کے قیاس میں اُس کا خلاف ہو گا۔ تو تو ملفوظ کو ترک کر دیا جائے گا اور دیگر تصنیف یا قیاس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ یہ میرا ہی قول نہیں بلکہ خود ملفوظات اعلیٰحضرت کے مؤلّف مولانا مصطفیٰ رضا خان کا بھی یہ عمل ہے۔ چنانچہ اپنے مؤلّفہ میں بہت جگہ اصل ملفوظات کو غیر معتبر غیر معتابہ قرار دیتے ہوئے ملفوظ کی اشارۃً تردید کرتے ہیں یہ وہی ملفوظ ہیں جو خود اپنے کانوں سے مجلسِ اعلیٰحضرت میں نہ سنے۔ بلکہ کسی کی روایت نقل کی اور کسی کی زبانی یہ سُنا کہ اعلیٰحضرت نے اس طرح فرمایا تو اس پر مفتیٔ اعظم مؤلف نے غور کیا جب اس کو خلاف نقل پایا تو تردید کر دی جیسا کہ آگے بیان کروں گا واللہ اَعْلَمَ بِالصَّوَابْ۔ مسئلہ یہیں پر واضح ہو جاتا ہے مگر سائل کے سوال کے مطابق اُن مسائل کی نشاندہی ضروری ہے۔ جو قابلِ غور ہیں اور سائل نے اگرچہ صرف احکامِ شریعت کے متعلق سوال کیا ہے۔ مگر میری نظر میں چونکہ احکامِ شریعت اور دیگر ملفوظات ایک ہی درجے کے ہیں اس لئے سب پر نشان دہی کی جاتی ہے دیگر ملفوظات چونکہ مفتیٔ اعظم کی ہی تالیف ہے اور انھوں نے خود تالیف کرتے ہوئے تحقیق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اسلئے اِن میں خود حضرت مولّفؒ کی ہی تنقیدات پیش کروں گا۔ اور احکامِ شریعت کا مؤلّف سید شوکت علی ایک غیر عالم شخص تھا اس لیئے اس پر مَیں اپنی تنقید درج کروں گا۔ خیال رہے کہ ملفوظات ایک آدمی جمع نہیں کرتا بلکہ جب کسی کی باتیں تالیف کرنے کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ مرید بہت سے احباب کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ جب کبھی فلاں بزرگ کسی جگہ کوئی بات از قسم مسائل وغیرہ بات کریں تو وہ بات مجھ کو بتا دو۔ پس یہ احباب تمام گفتگو لکھ کر یا زبانی مؤلّف کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ مؤلف اگر خود عالِم ہو تو چھان بین اور تحقیق کر کے اپنے پاس گفتگو جمع کرتا رہتا ہے اگر غیر عالِم ہو تو بغیر تحقیق جمع کرتا رہتا ہے۔ اب مؤلّف کے پاس اس بزرگ کی کچھ خود مسموعی اور کچھ بالواسطہ مسموعی باتیں جمع ہو جاتی ہیں جن کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ شدہ بات ہے۔ اِسی طرح خود مَیں نے بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظ جمع کئے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ اور اسی طرح اعلیٰحضرت کے ملفوظات جمع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ملفوظات کو جمع کرنے والے بہت احباب ہیں۔ لے مفتیٔ اعظم مصطفیٰ رضا خان۔

ر۲ سید شوکت علی ۲ سید ایوب شاہ صاحب۔ ان کی زیارت سے میں بھی مشرف ہوا ہوں اور میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا بھی تھا کہ میں اعلیٰحضرت کے پیٹھ پیچھے بیٹھ کر آپ کی باتیں لکھا کرتا تھا۔ ادب کی وجہ سے۔ اور مجلس کی تمام گفتگو زیرِ تحریر لایا کرتا تھا۔ اور بھی بہت سے احباب جامع ملفوظ ہوں گے۔ یہ ملاقات لائلپور میں شیخ الحدیث کے اس آخری جلسے میں ہوئی تھی جس میں شیخ الحدیث علیہ الرحمۃ نے صاحبزادہ فضلِ رسول کے سر پر خلافت و کفالت و نیابت کی دستار باندھی تھی۔ مؤلف ملفوظ اگر عالم دین ہو اور عدل و انصاف سے محققانہ حیثیت سے تالیف کرے، تو اس کے مؤلفہ ملفوظات قابلِ غور نہیں رہتے کیونکہ یا تو مؤلف خود ہی بالواسطہ مسموع ناقابلِ عمل ملفوظ کاٹ دیتا ہے یا اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ جس طرح بہت جگہ مفتیٔ اعظم نے کیا۔ پس نتیجہ نکلا کہ قابلِ غور وہ مسائل ہوتے ہیں۔ جو غیر عالم نے اعلیٰحضرت وغیرہ سے سنے۔ کچھ بھولا کچھ یاد رکھا۔ کچھ کمی کچھ زیادتی سے درج کر دیا۔ اس چشم پوشی کی وجہ سے مسئلہ قابلِ غور اور بغیر تحقیق ناقابلِ عمل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ تحقیق بھی علماءِ متبحّرین کا کام ہے۔ نہ کہ عوام کا۔ عوام کو حق نہیں پہنچتا کہ بلا وجہ کسی کی تالیف کو ہدفِ تنقید بنائیں یا کسی علماء کے قول کے مقابل اس ہی ملفوظ پر اڑ جائیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ احکامِ شریعت کی وہ عبارت جو قابلِ غور ہے اعلیٰحضرت کی ہے ہی نہیں۔ یا تو خود ساختہ ہے یا کچھ زیادتی کمی ہوئی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کچھ عبارات ملفوظات درج کی جاتی ہیں۔ ۱ احکامِ شریعت دوم سوال ۸ کا وے پر لکھا ہے کہ نبی کریم کا عرشِ اعظم پر مع نعلین مبارک حاضری کے متعلق بلا دلائل انکار لکھا ہے۔ اگر یہ انکار اعلیٰحضرت کی تصنیف میں ہوتا تو یقیناً با دلائل ہوتا۔ پھر کسی کو غور کی حاجت نہ تھی۔ ملفوظی ہونے کی وجہ سے قابلِ غور ہے۔ بعد غور معلوم ہوا کہ تمام اکابرِ امت فرماتے ہیں۔ کہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر گئے تو مع نعلین گئے چنانچہ حضرت امیر خسرو جو مجدد الف ثانی کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اپنے قصیدۂ معراج میں فرماتے ہیں ؎

نعلین پائے اور ابر عرش گو نگاہ کن جاہل کہ در نیابد معنیٔ استوارا

۲ نادر المعراج ص۲۸ پر شیخ العالم اکبر آبادی فرماتے ہیں۔ لطیفۂ ششم — حضرت موسیٰ علیہ السلام را در وادیٔ مقدس امر فاخلع نعلیک شد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم را بر فوقِ عرش نہی آورکہ لا تخلع نعلیک ۳ تفسیر روح البیان ص۲۷ جلد پنجم میں ہے وَقِيلَ لِلْحَبِيبِ تَقَدَّمْ عَلَى بِسَاطِ الْعَرْشِ بِنَعْلَيْكَ لِيَتَشَرَّفَ الْعَرْشُ بِحَبِيبٍ نِعَالِ قَدَمَيْكَ (الخ) ۴ درۃ التاج ص۸۷ پر لکھا ہے کہ امام ابن ابی جمرہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرشِ اعظم پر مع نعلین پاک پہنے ہوئے پہنچے۔ ۵ جواہر البحار جلد سوم ص۴۳ پر خود مصنف شیخ یوسف بن اسماعیل نبہانی اسی مسلک کی تائید فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔ ؎

عَلیٰ رَاْسِ ھٰذَا الْکَوْنِ نَعْلُ مُحَمَّدٍ عَلَتْ فَجَمِیْعُ الْخَلْقِ تَحْتَ ظِلَالِہٖ

لَدَی الطُّوْرِ مُوْسیٰ نُوْدِیَ اِخْلَعْ وَاَحْمَدُ عَلَی الْعَرْشِ لَمْ یُؤْذَنْ بِخَلْعِ نِعَالِہٖ

اگرچہ شیخ نبہانی اِن صفحات پر اس واقعے سے متعلق بعض علماء کی کچھ تنقیدات پیش کرتے ہیں مگر اپنا مسلک تائید پر ہی راغب ہے۔ علاّمہ قزوینی اس کی تردید فرماتے ہیں مگر میرے نزدیک اُن کی تردید دو وجہ سے معتبر نہیں ایک یہ کہ علاّمہ قزوین عرشِ اعظم تک پہنچنے کا ہی سرے سے انکار کرتے ہیں حالانکہ تمام علمائے محققین بدلائلِ قاہرہ ثابت کرتے ہیں کہ نبی کریم عرشِ اعظم پر تشریف فرما ہوئے اور اس سے بھی آگے لامکان پر حاضر ہوئے۔ خود اعلیٰحضرت کا مسلک بھی یہی ہے۔ چنانچہ اپنے مشہورِ زمانہ بے مثال نعتیہ سلام میں ارشاد فرماتے ہیں ۔

عرش کی زیب و زینت پہ عرشی دُرود فرش کی طیب و نزہت پہ لاکھوں سلام

اور بھی بہت سے اشعار میں عرش اعظم تک پہنچنے کو ثابت فرماتے ہیں۔ علاّمہ قزوینی کی پہلی بات کو اگر صحیح کہا جائے تو دوسری کو بھی صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ وہ نعلین پاک کا بدیں وجہ انکار کرتے ہیں کہ آپ نبی کریم کے عرش تک پہنچنے کے ہی قائل نہیں جیسا کہ شیخ علی الجھوری اپنی کتاب نورالوہاج میں فرماتے ہیں۔ مگر علاّمہ قزوینی کی دوسری بات تو غلط لہٰذا پہلی بھی غلط۔ دوسری وجہ غیر معتبر ہونے کی یہ ہے۔ واقعہ معراج اسرارِ الٰہیہ میں ہے اور اسرار پر صوفیاء کو مطلع فرمایا جاتا ہے۔ تو جس طرح علم کی بات میں علماء کا اعتبار ہوگا۔ فقہ میں فقہاء، نحو میں نحوی، فلسفے میں فلاسفہ۔ حدیث کی صحت میں محدثین، منطق میں منطقی، سائنس میں سائنس دان کے اقوال قابلِ اعتبار و ترجیح ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسرارِ الٰہیہ میں صوفیاء کی بات معتبر ہوگی نہ کہ علاّمہ قزوینی و دیگر فلاسفہ کی۔ اسرارِ الٰہیہ میں علماء و محدثین کی بات بھی صوفیاء کے مقابل غیر معتبر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ میں تمام علمائے متقدمین کلمات سے مراد رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (الخ) لیتے ہیں مگر صوفیاء وسیلۂ نامِ اقدس مراد لیتے ہیں لہٰذا فتویٰ اسی پر ہے کہ وسیلۂ نامِ اقدس سے توبہ قبول ہوئی۔ کیونکہ یہ وسیلہ بھی اسرارِ الٰہیہ میں سے ہے جس کا علم بجز صوفیاء کے کسی کو نہیں۔ علماء و محدثین اس دریا کی لہروں سے بے خبر ہیں۔ پتہ لگا کہ اسرار میں صوفی کی بات معتبر ہے حالانکہ محدثین فرماتے ہیں کہ صوفی کی روایت معتبر نہیں۔ وجہ وہی جو اوپر بیان کی گئی۔ اسی طرح مفسرین والنجم کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ نبی کریم نے حضرت جبریل کو دیکھا مگر صوفیاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا اہلِ علم حضرات صوفیاء کی بات تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت جبریلؑ کو دیکھنا کیا کمال ہے۔ نبی کا امتی کو دیکھنا کمال نہیں بلکہ امتی کا نبی کی زیارت کمال ہے۔ حضرت جبریلؑ ہر وقت نبی کریم کے دیدار کے متمنی رہتے ہیں اور یہ ان کا کمال ہے۔ پس اگرچہ علاّمہ قزوینی جیسے فلسفی و منطقی عالِم۔ نعلین پاک پہن کر عرش اعظم پر جانے کا انکار کریں مگر محققین کے نزدیک صوفیاء کی بات معتبر ہوگی۔ اکابر علماء بھی مذکورہ حدیث لَا تَخْلَعْ نَعْلَیْکَ کا انکار

نہیں کرتے۔ بلکہ حدیث کو صحیح مانتے ہوئے نعلین میں تاویل کر لیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ نعلین سے مراد لباسِ بشری ہے۔ مگر یہ محض تاویل ہے۔ اصل یہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اصطلاحی عرفی نعلین پاک کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ احکامِ شریعت کی عبارت عقلاً بھی درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جب سفرِ معراج کی ابتداء ہوئی تو کیا نبی کریم ننگے پیر براق پر سوار ہوئے۔ اس کا بھی ثبوت ہونا چاہیئے۔ اخلاقی طور پر ظاہر ہے کہ نعلین پاک پہن کر ہی روانگی ہوئی ہوگی۔ پس سارے سفر میں کہیں بھی نعلین اتارنے کا ذکر نہیں۔ لَا تَخْلَعْ نَعْلَيْكَ تو کئی کتب معتبرہ سے منقول ہے۔ مگر فَاخْلَعْ والی حدیث کہیں بھی مرقوم نہیں منکرین بھی صرف انکار کرتے ہیں وجہ انکار نہیں بتاتے۔ ۱ ایک مرتبہ علامہ کاظمی صاحب اور حکیم الاُمت تشریف فرما تھے۔ میرے علاوہ اور بہت سے عوام حاضر تھے۔ علمِ دیابنہ و وہابیہ کی بات شروع تھی۔ دورانِ گفتگو حضرت قبلہ علامہ کاظمی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ فخر الشعراء محمد اعظم چشتی نے نعت پڑھی جلسہ مخلوط تھا بسلسلہ ختمِ نبوت پنجابی نعت کا پہلا شعر اس طرح تھا ؎

سنے جوڑے عرشاں تے چڑھ جان والا محمد پیارا بڑی شان والا

وہاں مولوی عنایت اللہ شاہ بخاری بھی جلسے میں موجود تھے۔ معترض ہوئے کہ یہ غلط ہے۔ محمد اعظم صاحب نے کہا کہ مع نعلین جانے کا تو میں نے ذکر کیا ہے اتارنے کا آپ ثبوت پیش کریں۔ اس پر ایسے خاموش ہوئے کہ اپنا منہ ہی پھیر لیا۔ پھر علامہ صاحب نے کہا کہ بحمد اللہ ہمارے تو نعت خوان بھی اکابر وہابیہ کی زبان بندی کر دیتے رہیں۔ قُلْتُ۔ اس واقعے سے دو باتیں معلوم ہوئیں ۱۔ علامہ کاظمی اور حکیم الامت جیسے محققین عرفاء نے واقعے کو بیان کر کے سن کر بھی تردید نہ کی نہ اعظم چشتی صاحب کی بات کو غلط کیا۔ ۲۔ وہابی حضرات جیسے منکرین کے پاس بھی اس واقعے کے انکار پر دلیل نہیں شرح بردہ۔ شیخ زادہ علی خر پوتی ص۲ پر ہے۔ اَنَّهٗ عليه السلام اَرَادَ اَنْ يَخْلَعَ نَعْلَيْكَ نَسمع مِنَ اَيْنِ الْعَرْشِ اَنْ لَا تَخْلَعْ يَا حَبِيْبَ اللهِ۔ (الخ)۔ ترجمہ وہی جو اوپر گذرا۔

احکامِ شریعت کا دوسرا قابلِ غور مسئلہ:۔ احکامِ شریعت جلد سوم مسئلہ ۱۳ کا جواب اس طرح لکھا ہے (۱) وتر ہو جانے میں شبہ نہیں۔ ہاں مکروہ ہے بقولِ شامی۔ اَمَّا لَوْ صَلَّاهَا جَمَاعَةً مَعَ غَيْرِهٖ ثُمَّ صَلَّى الْوِتْرَ مَعَهٗ لَا كَرَاهَةَ۔ سوال یہ تھا۔ ۱۔ جس نے فرض عشاء باجماعت نہیں پڑھی اور وتر کی جماعت میں شریک ہو گیا اس کے یہ وتر سرے سے ہوئے ہی نہیں یا ہوئے مگر مکروہ (الخ) جواب درست ہے مگر دلیل بے محل ہے۔ یعنی سوال وجواب گندم اور دلیل جو۔ سائل تو پوچھ رہا ہے کہ وتر ہوئے یا مکروہ ہوئے۔ جواب کی دلیل کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ اگر اس نے عشاء کی نماز غیر کے ساتھ پڑھی باجماعت۔ پھر وتر اس کے ساتھ باجماعت پڑھے تو کراہت نہیں ہوگی۔ بھلا اتنی بڑی بھول اعلیٰحضرت کر سکتے تھے۔ غالباً یہ بھول مولف سے ہوئی۔ اسی طرح ملفوظ ص۶ جلد سوم مطبوعہ مدینہ پبلشنگ پر ہے۔ ارشاد توریت مقدس سے بہت پیشتر کا ہے (الخ) یعنی

خضر علیہ السلام کا واقعہ نزولِ توریت سے بہت پہلے کا ہے۔ حالانکہ یہ قول احادیثِ صحیحہ تاریخ اور تفاسیر کے قطعاً خلاف ہے۔ کیا اتنی سخت غلطی اعلیحضرت کر سکتے تھے۔ حاشا ہرگز نہیں۔ مؤلف مصطفٰے رضا خان مدظلہ نے یہ قول کسی سے سنا تو فوراً اس پر زبردست تنقید کی۔ حاشیہ پر فرماتے ہیں ؎۱ میرے خیال میں پیشتر کی جگہ بعد ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث اِتَّکَمَ مُوْسٰی عَلَیْہِ۔ تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قَامَ مُوْسٰی خَطِیْبًا فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ الخ اور مفسرین فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے تمام تبلیغ و خطابات بعد توریت فرمائے۔ حضرت مفتیٔ اعظم نے کس طرح بلا جھجک ملفوظِ اعلیحضرت کی بادلائل تردید کر دی۔ اسلیئے کہ انھوں نے یہ خود اعلیحضرت سے نہ سنا بلکہ کسی نے سنایا تو یقیناً کچھ زیادتی کمی کر کے مسئلہ کو قابلِ غور بنا دیا۔ اسی طرح ملفوظ حصہ چہارم ص۹ پر ہے۔ عرض: عورت سے اگر کلمۂ کفر نکل جائے تو نکاح ٹوٹے گا یا نہیں (الخ) ارشاد: ہاں عملاً باصل المذہب یہی ہے کہ نکاح فی الحال فسخ ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ جمہور فقہا کے خلاف ہے۔ اس کے مطابق کوئی عالم فتویٰ نہیں دے سکتا۔ اگر اس قول کو کلیتہً ملفوظِ اعلیحضرت تسلیم کیا جائے تو اعلیحضرت کی توہین ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اعلیحضرت نے ایسے غیر مقبول مسئلے بتائے ہوں۔ یقیناً یہی کہنا پڑے گا کہ سنتے وقت سامع کو غلطی ہوئی جس سے یہ مسئلہ قابلِ غور ہو گیا۔ اور جب مفتیٔ اعظم نے اس پر غور فرمایا تو فوراً اس کی تردید کر دی چنانچہ حاشیہ ؎۱ پر ارشاد فرمایا۔ اور فتویٰ اس پر ہے کہ ارتدادِ زن سے عورت نکاح سے نہیں نکلتی (الخ) یعنی اوپر متن والا مسئلہ غیر مفتا بہ ہے۔ ثابت ہوا کہ تمام ملفوظات صرف میرے نزدیک ہی قابلِ غور نہیں بلکہ مفتیٔ اعظم ہند کے نزدیک بھی قابلِ غور۔ بعد غور جو غلط نظر آتا ہے اس کی تردید کر دیتے ہیں جو صحیح ہوتا ہے اس کی عدم تنقید بھی تائید ہے۔ ملفوظ حصہ چہارم ص۲۵ پر بہت زبردست چشم پوشی ہو گئی۔ عرض: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَتَمَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ تو بعض انبیاء شہید کیوں ہوئے۔ ارشاد: رسولوں میں سے کون شہید کیا گیا۔ انبیاء البتہ شہید کیے گئے۔ رسول کوئی شہید نہ ہوا یَقْتُلُوْنَ النَّبِیِّیْنَ۔ فرمایا گیا نہ کہ یَقْتُلُوْنَ الرَّسُوْلَ الخ۔ اس میں چند زبردست غلطیاں ہیں جو یقیناً اعلیحضرت کی جانب سے نہیں بلکہ ان جامعین کی طرف سے ہے جو مابین مؤلف و لافظ رابطہ ہیں۔ غلطی ۱: سائل نے جو آیت پیش کی وہ ہے اصل میں کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ۔ مگر سائل نے خَتَمَ اللّٰہُ کہا۔ اعلیحضرت نے یقیناً پہلے غلطی نکالی ہو گی لیکن سامع نے کوئی توجہ نہ دی۔ حضرت مؤلف نے بھی کوئی توجہ نہ کی اور اسی طرح اب تک غلط چھپتا رہا۔ غلطی ۲: لَاَغْلِبَنَّ کا معنیٰ وہ نہیں جو ملفوظ میں مرقوم کر دیئے گئے کہ یہ منشاءِ کلام کے خلاف ہے اور تمام تفاسیر کے بھی خلاف اور دیگر آیات کے بھی خلاف۔ کیونکہ بہت جگہ ایسی آیات موجود ہیں جن میں رسل کی شہادت کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓی اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۔ اسی طرح غائب کی ضمیر سے ایک آیت سورۃ

مائدہ میں بھی ہے۔ اب یہی کہنا پڑے گا کہ ملفوظات خواہ احکام شریعت کی شکل میں ہوں یا دیگر سب قابل غور ہیں۔ چنانچہ اِس ملفوظ کی تردید بھی خود حضرت مؤلف کی تحریر سے ثابت ہے۔ چنانچہ صـ۲۵ حاشیہ پر ارشاد ہے عـہ اور شہید ہو جانا مغلوبی نہیں غلبہ سے مراد غلبۂ حُجّت ہے۔ یہ چند اقتباسات صرف اس لئے کئے تاکہ لوگوں کی غلطیوں سے اعلیٰحضرت کی ذاتِ والاصفات کو ملوّث نہ کیا جائے۔ نہ کسی دیوبندی وہابی کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقعہ ملے۔ اگر معاذ اللہ احکامِ شریعت وغیرہ تمام ملفوظات کو اعلیٰحضرت کی تصنیف مانا جائے تو لازم آئے گا کہ اعلیٰحضرت نے غلطیاں کی ہیں اور کہنا پڑے گا کہ اعلیٰحضرت کو ان آیات کا مطلب نہ آتا تھا۔ مگر مفتیٔ اعظم جانتے تھے یہ سراسر گستاخی ہے۔ پس دلائلِ قاہرہ وبراہینِ باہرہ سے ثابت ہوا کہ احکامِ شریعت وغیرہ ملفوظات اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں۔ ملفوظات کے بعض مسائل اعلیٰ حضرت کے بہت سے مصنفہ مسائل کے بھی خلاف ہیں۔ مثلاً ملفوظات اوّل صـ۴۷ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ۔ عرض۔ اس شخص پر جو قصاص میں قتل کیا گیا نماز پڑھی جائے؟ ارشاد۔ ہاں خودکشی کرنے والے اور اپنے ماں باپ کو قتل کرنے والے اور باغی ڈاکو کہ ڈاکے کے دوران لڑائی میں مارا گیا۔ ان کے جنازے کی نماز نہیں۔ یہ کتنا غلط مسئلہ ہے۔ اس کی تردید فتاویٰ افریقہ صـ۵۲ سوال ۲۹ ایک شخص مرد یا عورت مسلمان ہے اور اُس نے اپنے ہاتھ سے گلا کاٹ دیا یا پھانسی کھا کر حرام موت مرگیا۔ اب اس صورت میں اس کے جنازے کی نماز پڑھنا اور مسلمان مقابر میں دفن کرنا جائز ہے یا نہیں۔ زید کہتا ہے نہیں (الخ) الجواب زید کا قول صحیح نہیں۔ فتویٰ اس پر ہے کہ اس کے جنازے کی نماز پڑھی جائے گی اور زید کا کہنا کہ مقابر مسلمین میں دفن نہ کیا جائے محض باطل ہے اور اپنے جی سے حکم گھڑنا ہے۔ درمختار میں ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ عَمْدًا يُغَسَّلُ وَيُصَلّٰى عَلَيْهِ وَبِهٖ الخ یہ تھیں بطورِ نمونہ چند چشم پوشیاں جنکی بناء پر احکامِ شریعت وغیرہ ملفوظات کی عبارات قابلِ غور ہوئیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

اقتدار احمد خاں

قوالی کا بیان

سوال ۳

کیا فرماتے ہیں: ۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اولیاء اللہ کے مزار پر کنجریوں اور بھانڈوں کا گانا بجانا اور ڈھول بجانا اور ناچنا کودنا۔ ریڈیو کا گیت گانا، فلمی گانے پڑھنے، اور قوالوں کا فحش گیت گانا یا ڈھول وغیرہ پر نعت خوانی کرنا سازوں کے ساتھ، کسی بھی جگہ عام لوگوں کے جلسوں میں قوالی کرنا یا عورتوں سے گیت سننا جائز ہے یا شرعًا حرام ہے؟ چند دن پیشتر ہمارے علاقے ڈیرہ نواب صاحب میں ملتان کے کسی شخص کی طرف سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ مفت تقسیم کیا جا رہا تھا جس کے پہلے صفحہ پر مصنف کے نام کی جگہ بہاولپور یونیورسٹی کے ہیڈ مولینا شیخ الحدیث علامہ کاظمی صاحب کا نام درج تھا۔ جس سے یہاں کے علمی حلقے میں بہت تشویش پائی جاتی ہے۔ کیونکہ سوائے چند صوفیوں کے کوئی بھی موجودہ قوالی کو جائز نہیں کہتا۔ اس کتاب سے بہت فتنہ پڑ گیا ہے یہاں کے تمام احباب نے آپ ہی کی طرف رجوع کیا ہے تاکہ اس پمفلٹ کے جھوٹ یا سچائی کا پتہ چلے پمفلٹ بھی حاضرِ خدمت کیا جا رہا ہے۔ بالوضاحت جواب ارشاد فرمایا جائے۔ کہ کیا قوالی سننا عبادت لازمہ ہے یا مستحب یا مکروہ و حرام وغیرہ ہے؟

السائل:۔ مولوی محبوب عالم، خطیب ڈیرہ نواب صاحب و دستخط اہالیانِ شہر

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

اَلْجَوَاب

گرامی نامہ تشریف لایا اور پمفلٹ بھی دستیاب ہوا۔ بغور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو کسی دلدادہ لہو و لعب نے حضرت غزالی زماں کا نام استعمال کیا ہے اور یا ان کے مکتوب میں کچھ خیانتیں کر کے مطبوعہ کا جامہ پہنایا ہے۔ میں نے اس پمفلٹ میں بہت سی علمی غلطیاں پائیں اور یہ غلطیاں نسیًا نہیں بلکہ عمدًا صرف اپنے مسلک کو بچانے کے لیے کی گئیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ ہر شخص کو اپنے مسلک کے اظہار و ثبوت کا پورا اختیار ہے لیکن اس کتاب میں اس اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے، پیش کردہ روایات کے خود ساختہ مطلب بیان کئے گئے، نحوی قاعدے بلا وجہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیے گئے۔ بہت جگہ بغیر دلیل مطلق کو مقید بنایا گیا ہے

اگرچہ اس کمزور کتاب کا جواب دینا کچھ ضروری نہ تھا، مگر آپکے پیہم اصرار پر کچھ نشان دہی ضرور کروں گا۔ اوّلاً یہ خیال رہے کہ ہمارے عرف میں گانا بجانا اگر فحش اور عریاں الفاظ سے ہو تو اس کو ناچ گانا کہا جاتا ہے، اگر گانا بجانا مہذب ہو، تو اس کو قوالی کہا جاتا ہے، اصطلاحِ شریعت میں عورت کا غیر مردوں کے سامنے کچھ گانا اگرچہ مہذب کلام ہو، عریاں کہلاتا ہے، اور اس کو غنا بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ فخرالدین زرّادی اپنی کتاب اصول سماع،، میں فرماتے ہیں :۔ وَالسَّمَاعُ دُوْنَ الْغِنَاءِ لِاَنَّهٗ اِسْتِمَاعُ الْاَشْعَارِ الَّتِیْ تَكُوْنُ فِیْ ذِكْرِ الْغَوَانِیْ مَعَ حُسْنِ الصَّوْتِ وَالْغَوَانِیْ هِیَ النِّسَاءُ اسی طرح قوۃ قلوب میں ابو طالب مکی فرماتے ہیں :۔ ان الاغانی ما تشبہت بہ النساء (محولہ اصول سماع اوّل ص۶) :۔ لیکن علامہ شامی غنا کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں :۔ وَالْوَجْهُ اَنَّ اِسْمَ مُغَنِّيَةٍ وَمُغَنٍّ اِنَّمَا هُوَ فِی الْعُرْفِ لِمَنْ كَانَ الْغِنَا حِرْفَتَهُ الَّتِیْ يَكْتَسِبُ بِهَا الْمَالَ وَهُوَ حَرَامٌ :۔ پس علامہ زرادی کی تعریف لغوی ہے اور یہ عرفی۔ یہ اسلام میں متفقاً حرام ہے۔ لیکن اس پمفلٹ کتاب مسمّٰی ,,رمز یلۃ النزاع اثبات السماع،، میں اگرچہ مصنف صرف مروّجہ قوالی کے ہی حلت کے درپے ہے مگر پیش کردہ مطلب ودلائل سے از خود کلام عریاں بھی جائز بلکہ عبارت ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیئے کہ جن روایات کے خود ساختہ مطلب بیان کرکے فاضل مصنف قوالی مروّجہ کو جائز ثابت کرتا ہے۔ ان سے قوالی تو بعد میں ثابت ہوگی، مگر پہلے عریاں کلام، ناچ گانا۔ بھانڈ، مراثی کے فحش کلام ثابت ہوں گے۔ اور سب اوباش لوگ اسی کتاب کو دلیل اور ڈھال بنائیں گے غرضیکہ اس کتاب سے مزید فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اگر یہ کتاب اس طرح برسرِعام شائع نہ ہوتی اور ہر کس و ناکس کو تحفۃً نہ دی جاتی جیساکہ آپکے استفتاء سے ظاہر ہے، تو میں اس پر قلم اٹھانا ضیاعِ وقت ہی سمجھتا، اور شاید آپکے اصرارِ پیہم کو بھی نظر انداز کردیتا۔ مگر مذکورہ حالات میں جب کہ اس کتاب کے ذریعہ صحابہ کرام کی توہین کی جارہی ہے اور عیسائیت ویہودیت کے شعار طبلہ، سارنگی کو سنتِ صحابہؓ کہا جارہا ہے :۔ (العیاذ باللہ) اور ہندوؤں مشرکوں کے مروّجہ جھانجھ ومزامیر کو اسلامی تہذیب ثابت کیا جارہا ہے اپنے نفسِ امّارہ کی خاطر اسلام کا تصور اغیار کے سامنے وہی پیش کیا جارہا ہے، جو نصاریٰ اور سکھوں، ہندوؤں نے اپنے دینوں کا پیش کیا فاضل مصنف نے شائع کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ اغیار کی نئی نسل کے سامنے جب یہ کتاب جائے گی تو اُن کے سامنے اسلام کا کیا نقشہ ابھرے گا۔ اور صحابہ کرام کے متعلق کیا تصور کریں گے۔ اگر حضرت مصنف اور لواحقین کا یہی عقیدہ تھا تو ہر شخص پر ٹھونسنے کی کیا ضرورت تھی، اور شائع کرنے کی کیا حاجت ؟ آپ کے حکم کی بنا پر ان وجوہ سے مکتوب گرامی کا جواب بشکلِ فتوٰے ارسال کررہا ہوں، پہلی سطور میں حرمتِ قوّالی کے دلائل، بعدہٗ اس پمفلٹ کے اغلاط کی نشان دہی۔

اَلْجَوَابُ بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

صوفیاء کی اصطلاح میں جس کو سماع کہا جاتا ہے۔ ہمارے عرف میں اس کی دو قسمیں ہیں:۔ پہلی قسم۔ نعت خوانی ۲۔ قوالی:۔ نعت خوانی کی تعریف یہ ہے کہ: بغیر طبلہ، سارنگی، مزامیر وغیرہ کسی محفل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم یا رب تعالیٰ یا اولیاء، علماء، فقہاء، یا صحابہ اہل بیت، اکابرین امت کا ذکر پاک بطریقہ نظم اشعار کیا جائے، خواہ اکیلا آدمی یا چند مل کر۔ قوالی کی تعریف یہ ہے کہ یہی سب کچھ ڈھول طبلہ سارنگی سے کی جائے۔ نعت خوانی میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں، سب جائز مانتے ہیں، قوالی میں اختلاف ہے، میری گفتگو قوالی کے بارے میں ہوگی کہ وہی متنازعہ فیہ ہے۔ سماع یعنی قوالی کا رواج مسلمانوں میں دور تبع تابعین کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت بھی صحیح اور غلط قسم کی قوالیاں تھیں، یہی وجہ ہے کہ بعض علماء صوفیاء نے اپنی مکتوبات میں جائز لکھا، اور بعض نے قطعًا ناجائز وحرام۔ جس نے حرام کہا وہ بھی صحیح، جس نے جائز کہا اس نے صحیح قوالی کو جائز کہا۔ اُس زمانے کے اختلاف سے ہم کسی کو برا نہیں کہہ سکتے۔ مگر آج کل سب قوالیاں غلط ہیں صحیح قوالی وہ ہے جس میں علماء کی بیان کردہ شرطیں موجود ہوں۔ غلط وہ ہے، جس میں ان شرائط سے ایک بھی نہ ہو۔ آج کل قوالی میں ساری شرطیں تو درکنار ایک شرط بھی نہیں ہے تو ان متقدمین کے حوالے موجودہ قوالی کے حق میں پیش کرنا سراسر نادانی ہے، پیش نظر سلسلہ مزیلۃ النزاع رسالے میں قوالی کی تقسیم کیئے بغیر مطلقًا قوالی کو جائز کہا ہے، جس سے اُن علماء فقہاء کی گستاخی ہے جنہوں نے قوالی کو ناجائز قرار دیا۔ اور صحیح قوالی کے جواز کے قائل متقدمین کے اقوال طیبہ کو آڑ بنانا بھی اُن کی توہین ہے کہ غلط کے یہ بھی خلاف تھے، ہمارے زمانے میں شریعت کے رو سے مطلقًا قوالی، گانا، بجانا، ڈھول، ناچنا کو دنا سب قطعًا حرام ہیں۔ قوالی خواہ نعت کی ہو یا فلمی گانوں کی، بلکہ طبلہ پر نعت پڑھنا زیادہ حرام ہے:۔ کیونکہ آقائے دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی ہے کہ آپ کا نام پاک ڈھول باجے کے ساتھ لیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ڈھول باجہ کھیل کود میں شمار ہے، اور اسلام میں بجز چند کھیلوں کے سب باطل وحرام ہیں، چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ كُلُّ لَهْوٍ بَاطِلٌ اِلَّا ثَلَاثٌ۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری لاہوری درکشف المحجوب ص ۳۱۷ پر فرماتے ہیں کہ:۔ طبلہ، مزامیر وغیرہ سب سے پہلے ابلیس لعین نے حضرت داؤد علیہ السلام کے مقابلے میں پیدا کیا اس سے پہلے کوئی ڈھول، طبلہ وغیرہ نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے:، ابلیس را اضطراب طبعی قوت گرفت (الخ)۔ ونائے وطنبور بساخت واندر برابر مجلس سماع داؤد علیہ السلام مجلسے فرو گسترانید (الخ) آن گروہ کہ ازاہل شقاوت بودند بمزامیر ابلیس مائل شدند۔ آقائے علی ہجویری کی اس عبارت مقدسہ سے دو باتیں ظاہر ہوئیں۔ ۱۔ ڈھول

باجے وغیرہ کی تاریخ۔ اور نمبر ۲: اس کا موجد ابلیس ہے۔ جس طرح سائل نے میرے پاس ایک عالم کا رسالہ جواز قوالی میں بھیجا ہے، اسی طرح ایک عالم نے داتا گنج بخش کی خدمتِ عالیہ میں بھی عرض کیا تھا: کہ میں حلت قوالی پر ایک کتاب لکھنے والا ہوں تو گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کو فرمایا تھا۔ کہ اے خواجہ! آپ ایسی چیز کو حلال کریں گے۔ جو تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ "کشف المحجوب ص۳۱۶ پر ارشاد ہے کہ: خواجہ امام لہوے راکہ اصل ہمہ فسقہا است حلال کرد ثابت ہوا کہ قوالی داتا صاحب کی نظر میں سب سے بڑا گناہ بلکہ اصل گناہ ہے، آپ متعدد جگہ قوالی کو حرام فرماتے ہیں: ۔

حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی قوالی کو حرام فرماتے ہیں، اور قوالی کو گناہ کبیرہ میں شمار فرماتے ہیں چنانچہ احیاء العلوم ص۱۵۱ پر امام غزالی رح قاضی ابو الطیب طبری کا قول نقل فرماتے ہیں۔ وَاَمَّا اَبُوْ حَنِیْفَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَاِنَّہٗ کَانَ یَکْرَہُ ذٰلِکَ وَیَجْعَلُ سِمَاعَ الْغِنَاءِ مِنَ الذُّنُوْبِ وَکَذٰلِکَ سَائِرُ اَہْلِ الْکُوْفَۃِ سُفْیَانُ الثَّوْرِیُّ وَحَمَّادٌ وَاِبْرَاہِیْمُ رح وَالشَّعْبِیُّ رح وَغَیْرُہُمْ (الخ) ثابت ہوا کہ حنفی مسلک میں مروجہ قوالی حرام ہے۔ اگرچہ امام مالک وغیرہ مجتہدین کرام کے نزدیک بھی قوالی مذکورہ حرام ہے، مگر چونکہ سائل و مدعا علیہ و مفتی و مستفتی سب حنفی ہیں اس لیے قولِ امام رح ہی حجت ہے، خود امام غزالی رح جس قوالی کے حق میں ہیں آج کل وہ قوالی نہیں۔ امام غزالی رح نے حلتِ قوالی میں بہت اقوال ذکر فرمائے ہیں، مگر امام اعظم رح کے بارے میں وہ بھی کوئی دلیلِ حلت پیش نہ کر سکے۔ اور علامہ امام غزالی رح کا قول امام اعظم کے قول کے مقابل غیر معتبر ہے لہٰذا عند الاحناف حجت نہیں ہے۔ مسلک حنفی کی کتاب فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم ص۳۵۲ پر ہے:۔ قَالَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلسَّمَاعُ وَالْقَوْلُ وَالرَّقْصُ اَلَّذِیْ یَفْعَلُہُ الْمُتَصَوِّفَۃُ فِیْ زَمَانِنَا حَرَامٌ لَا یَجُوْزُ الْقَصْدُ اِلَیْہِ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْہِ وَالْغِنَاءُ وَالْمَزَامِیْرُ سَوَاءٌ:۔ یعنی مروجہ قوالیاں حرام اور مزامیر وغیرہ بھی حرام ہیں، کچھ جاہل صوفی اس کو مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں:۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے۔ وَجَوَّزَہٗ اَہْلُ التَّصَوُّفِ" لیکن چونکہ حلت و حرمت قانونِ شرعی ہے، اربعۃ تفاسیر جلد سوم صفحہ نمبر ص۵۹۹ پر ہے:۔ اِنَّ مَذْہَبَ اَہْلِ السُّنَّۃِ اِنَّہٗ لَا یَثْبُتُ بِالْعَقْلِ ثَوَابٌ وَلَا عِقَابٌ وَلَا اِیْجَابٌ وَلَا تَحْرِیْمٌ وَلَا غَیْرُ ذٰلِکَ مِنْ اَنْوَاعِ التَّکْلِیْفِ وَلَا یَثْبُتُ ہٰذِہِ الْاَشْیَاءُ کُلُّہَا وَلَا غَیْرُہَا اِلَّا بِالشَّرْعِ:۔ اس لیے یہاں علماء فقہاء کی بات معتبر ہوگی نہ کہ صوفیاء کی۔ امام اعظم رح کا فتویٰ، فتاویٰ قاضیخان جلد سوم صفحہ نمبر ص۴۰۶ پر ہے۔

اَمَّا اِسْتِمَاعُ صَوْتِ الْمَلَاہِیْ کَالضَّرْبِ وَالْقَضِیْبِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ حَرَامٌ وَمَعْصِیَۃٌ لِقَوْلِہٖ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اِسْتِمَاعُ الْمَلَاہِیْ مَعْصِیَۃٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْہَا فِسْقٌ وَالتَّلَذُّذُ بِہَا مِنَ الْکُفْرِ (الخ) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ڈھول باجے کی آواز سننا حرام ہے۔ اور کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ اس حدیث پاک میں لفظ ملاہی کا ترجمہ مطلق طور پر علامہ قاضیخان نے

قوالی مروجہ کیا ہے، اب کس کو بولنے کی جرأت ہے، اسی طرح فتاوٰی بزازیہ جلد سوم صہ ۳۵۹ پر ہے، علامہ ابن بزاز فرماتے ہیں:۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قوالی سے متعلق یہ فرمانا وَالتَّلَذُّذُ بِهَا كُفْرٌ اس کا مطلب ہے ناشکری نعمت، یعنی قوالی سننے والا اور سنانے والا دونوں اس لیے فاسق ہیں۔ کہ انھوں نے اپنے اعضاء کو مقصد خلقت کے خلاف استعمال کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ فَصَرْفُ الْجَوَارِحِ إِلَى غَيْرِ مَا خُلِقَ لِأَجْلِهِ كُفْرٌ بِالنِّعْمَةِ۔ ثابت ہوا کہ ڈھول باجے کے لیے انسان پیدا نہ کیا گیا، لہٰذا گناہ ہے، کتنی زیادتی ہے کہ ایسے سخت ترین گناہ میں صحابہ و اہلبیت جیسی پاک ہستیوں کو ملوث کیا جائے۔ (نعوذ باللہ منہ) میں کہ یہ تمام پیش کردہ دلائل بالکل صاف ظاہر حرمت کو ثابت کرتے ہیں، کسی ایچ پیچ، یا منطقی فلسفی الجھنوں کی چنداں ضرورت نہیں۔ نہ عہد خارجی، عہد ذہنی کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت ہے، بخلاف ہمارے فاضل مصنف صاحب کے محررہ رسالے کے کہ اس میں حلت قوالی ثابت کرنے کے لیے بہت منطقی فلسفی تانے بانے بنانے پڑے، اور کشتیٔ استدلال کو نحوی صرفی پتوار پر چڑھانا پڑا، حالانکہ یہ سب کچھ تار عنکبوت سے زیادہ نہیں، جیسا کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب ردّالمحتار جلد پنجم صفحہ نمبر صہ ۲۲۵ پر ارشاد فرماتے ہیں۔ عَنِ الْقُرْطُبِيِّ إِجْمَاعُ الْأَئِمَّةِ عَلَى حُرْمَةِ هٰذَا الْغِنَاءِ وَضَرْبِ الْقَضِيْبِ وَالرَّقْصِ:۔ یعنی تمام امام مجتہدین متفقہ طور پر مروجہ قوالی کو حرام کہتے ہیں، غور تو کیجیے کہ علامہ شامی تو کہیں کہ قوالی متفقہ طور پر حرام مگر ہمارے یہ مصنف صاحب ائمہ کرام کو بھی اپنے ساتھ ملوث کرنے کی بیجا کوشش کر رہے ہیں۔ امام اعظم رح کی تصنیف فقہ اکبر کے شارح ملا علی قاری صہ ۲۰۵ پر فرماتے ہیں:۔ وَفِي الْخُلَاصَةِ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ عَلٰى ضَرْبِ الدُّفِّ وَالْقَضِيْبِ يَكْفُرُ وَيَقْرُبُ مِنْهُ ضَرْبُ الدُّفِّ وَالْقَضِيْبِ مَعَ ذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَنَعْتِ الْمُصْطَفٰى صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَذَا التَّصْفِيْقُ عَلَى الذِّكْرِ (الخ) اور درّمختار صہ ۲۹۲ پر علامہ علاؤالدین حصکفی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل فرماتے ہیں:۔ قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَصَوْتُ اللَّهْوِ وَالْغِنَاءِ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ النَّبَاتَ۔ یعنی صحابی رسول کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک کتنا شدید ہے۔ منافقت دو قسم کی ہے ۱ نفاق شرعی، جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے ۲ نفاق حکمی، جس کا بہت جگہ ذکر حدیث پاک میں ہے۔ یہاں نفاق حکمی مراد ہے۔ یہ بات واقعی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو شخص خواہ پیر ہو یا مرید قوالی سن سن کر منافقانہ عادات اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ زبان سے مسلمان اور متبع سنت ہونے کا دعوے دار ہوتا ہے۔ مگر دل میں کفار کے طور طریقوں سے شکل و صورت، ڈھول باجے سے محبت ہوتی ہے، اسی کا نام منافقت ہے۔ تاریخ انڈونیشیا صہ ۲۹ پر لکھا ہے کہ (۵) چونکہ ہندوؤں اور

بدھوؤں میں عام طور پر گانے بجانے کا رواج تھا بلکہ وہ اس کو اپنی ایک بڑی عبادت سمجھتے تھے، لہٰذا صوفیائے کرام نے بھی انہیں دعوتِ اسلامی دینے کے لیئے جمع کرنے کا اسی کو ایک کامیاب طریقہ سمجھا۔ اور ہندوستان کے موجودہ چشتیہ طریقے کے انداز سے قوالی شروع کر دی، ثابت ہوا کہ ڈھول باجے پر عوام کے سامنے قوالی ہندوؤں اور دیگر کفار کا طریقہ اور ان کی ایک عبادت ہے۔ کتنی بدنصیبی کا دور ہے کہ مسلمانوں کے علماء بھی اس کو عبادت اور سنتِ سلف ثابت کرنے کی خاطر خطرناک کوشش کر رہے ہیں، چشتیہ اکابرین نے تو اس کو فقط بطور حیلہ استعمال کیا۔ جس طرح کہ دوائی بیمار کو کھلائی جاتی ہے کہ اس سے شفا حاصل ہو۔ یا جال پرندے کے لیئے لگایا جاتا ہے کہ قریب آئے۔ یا بھاگے ہوئے جانور کو گھاس دکھایا جاتا ہے۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ قوالی حرام بلکہ فی زمانہ اشد حرام ہے۔ محققین کے نزدیک قوالی وہ حرام اور میٹھی دوائی ہے جو سخت مجبوری کے وقت مرشدِ برحق (جو دنیائے تصوف کا طبیب حاذق ہے) کے مشورے سے بیمارِ عشق کو دی جاتی ہے۔ اس بیمار کی تین نشانیاں ہیں ۱ تین دن بھوکا پیاسا رکھا جائے، پھر ایک طرف کھانا پانی اور دوسری طرف قوالی، تو کھانے کی پرواہ نہ کرے، قوالی کی طرف دوڑے ۲ وجد حقیقی ہو، کہ اگر زنانِ مصر کی طرح انگلیاں بھی کاٹ دی جائیں، تو معشوق سے دھیان نہ ہٹے۔ ۳ شریعت کے کسی کام سے غافل نہ ہو۔ جب ایسا بیمارِ عشق ہوگا تب اُسکو سماع کی دوائی دی جائے گی، تاکہ اُس کو لذتِ ذکرِ یار سے وصالِ یار کا مزہ آئے چنانچہ عرب کہتا ہے۔ ”ذِكْرُ الْمَحْبُوْبِ كَوَصْلِهٖ“ اور عشق کی تڑپ میں کچھ سکون ہو۔ مگر چونکہ میٹھی دوائی تندرست نادان بچے بھی پینا چاہتے ہیں، اور پینے کی ضد کرتے ہیں، اِسلیئے عقلمند ڈاکٹر اور طبیب دوائی کو بڑے خفیہ طریقے پر رکھتے ہیں اور عزیزوں، نااہلوں سے بچاتے ہیں، کیونکہ تندرست یا اس دوائی والی بیماری میں نہ مبتلا شخص جب اس دوائی کو استعمال کرتا ہے تو دیگر طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو شخص اپنی مرضی یا نیم حکیم کے مشورے سے دوائیاں کھاتا رہتا ہے۔ وہ ہزاروں بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بیمارِ عشقِ معرفت نہ ہو، اور قوالی سُنے تو منافقت، غفلت، فسق، گمراہی ہزاروں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہزاروں فسق اور بدمعاشیاں انہی قوالیوں کے ذریعے ہو رہے ہیں تو جو شخص علی الاعلان ہر شخص کو قوالی سننے کی دعوت دے رہا ہے، وہ درحقیقت بحیثیت نیم حکیم کے خطرۂ جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے قوالی کی حرمت تو بالکل صاف اور واضح الفاظ میں با دلائل بیان کی۔ مگر اس کی حلت بڑی قیود اور شرائط کے ساتھ صرف بیمارِ عشق جیسے حضرات کو بقدرِ ضرورت دی۔ جس طرح اسلام نے مردار شراب وغیرہ کی حرمت بڑے واضح اور بلند الفاظ میں بیان کی مگر بھوک سے مرتے ہوئے شخص کے لیئے بڑی قیود کے ساتھ استعمال کی اجازت دی۔ اسی لیئے علامہ شامی فرماتے ہیں۔ کہ قوالی سُننے کے لیئے چھ۶ شرطیں ہیں، وہ بھی اس لیئے کہ قوالی بطور دوائی ہے، چنانچہ شامی شریف جلد پنجم صفحہ ۲۵۶

پر ہے :۔ وَ اِحْتَاجَ اِلٰی ذٰلِکَ اِحْتِیَاجُ الْمَرِیْضِ اِلَی الدَّوَاءِ وَلَہٗ شَرَائِطُ سِتَّۃٌ (عا) اَنْ لَّا یَکُوْنَ فِیْھِمْ اَمْرَدٌ (ع۲) اَنْ تَکُوْنَ جَمَاعَتُھُمْ مِنْ جِنْسِھِمْ (ع۳) وَاَنْ تَکُوْنَ نِیَّۃُ الْقَوَّالِ الْاِخْلَاصَ لَا اَخْذَ الْاُجْرَۃِ وَالطَّعَامِ (ع۴) وَاَنْ لَّا یَجْتَمِعُوْا لِاَجْلِ الطَّعَامِ اَوْ فُتُوْحٍ (ع۵) وَاَنْ لَّا یَقُوْمُوْا اِلَّا مَغْلُوْبِیْنَ (ع۶) وَاَنْ لَّا یُظْھِرُوْا وَجْدًا اِلَّا صَادِقِیْنَ۔ وَالْحَاصِلُ اَنَّہٗ لَا رُخْصَۃَ فِی السَّمَاعِ فِیْ زَمَانِنَا لِاَنَّ الْجُنَیْدَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی تَابَ عَنِ السَّمَاعِ فِیْ زَمَانِہٖ :۔ یعنی حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سماع سے توبہ کر لی، اور اسی طرح شیخ سعدی رح گلستان میں اپنی توبہ کا ذکر فرماتے ہیں، ایک جگہ علامہ شامی جلد پنجم صفحہ ۲۰۶ پر فرماتے ہیں۔ وَ اِنْ کَانَ السَّمَاعُ غِنَاءً فَھُوَ حَرَامٌ بِاِجْمَاعِ الْعُلَمَاءِ وَمَنْ اَبَاحَہٗ مِنَ الصُّوْفِیَۃِ فَلِمَنْ تَخَلّٰی عَنِ اللَّھْوِ وَتَحَلّٰی بِالتَّقْوٰی۔ یہ تھے وہ دلائل جن سے قوالی کی حرمت مطلقاً ثابت ہوتی ہے، اب اس رسالے کی کمزوریاں ملاحظہ ہوں۔ اس کتاب کی غلطیاں بعض مقام پر قال۔ اَقُوْلُ سے بیان ہوں گی۔ آج تک میری نظر سے جتنے رسائل فی بیان حلتِ قوالی گزرے ہیں خواہ عربی خواہ اردو اس میں یہ کمزوری شدت سے موجود ہے، (عا) دلائل میں بالکل من گھڑت خود ساختہ احادیث پیش کرتے ہیں۔ اسکے ایسے حوالے بھی نہیں دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (ع۲) حلت میں کوئی صاف واضح روایت نہیں لاتے۔ ایچ پیچ کرتے ہیں۔ (ع۳) اول صفحات میں جس چیز کو اپنے ہی قلم سے حرام کہتے ہیں بعد میں اسی کو حلال اور عبادت کے درجہ پر پہنچا کر تائید میں قواعد علوم کے سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ یہ کمزوریاں صرف اسی پمفلٹ میں نہیں ہیں بلکہ اس سے پہلے علامہ زرّادی وغیرہ کے مصنّفات میں بھی ہیں۔ جس سے اس مسلک کی لغویت بدرجۂ اتم ثابت ہے۔ میں نے صرف ان ہی دلائل کو پیش کر کے حرمت ثابت کی ہے، جس میں تاویل یا اصطلاح یا اشارے کی حاجت نہیں، ورنہ ایسے دلائل حرمت کے میرے پاس قرآن و حدیث کے بیشمار ہیں، جن کے ذریعہ سچی تاویلات سے حرمت ثابت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی غلطی (عا) صفحہ نمبر ۱ اور صفحہ نمبر ۳ پر دو شعر لکھے ہیں :۔

شعر

واعظ بطعنِ بادہ پرستاں زباں کشاد

یارب تو ئی پناہِ من از شرِّ آں سفیہہ

ترجمہ :۔ عالم دین نے شراب کے پجاریوں کے طعنے میں زبان کھولی۔ اے رب اس ذلیل بے وقوف عالم سے مجھ کو پناہ میں رکھنا۔ اس شعر میں علمائے کرام کے لیئے وہی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قرآن کریم میں کافروں کے لیئے استعمال کیا گیا اور کافروں نے مومنوں کے لیئے بولا۔ دوسرا شعر :۔

منع سماع و نغمہ نے می کند فقیہہ ؛
بیچارہ پے نہ برد بر سر نغمت فیہ ؛

ترجمہ :- فقیہ اسلام سماع اور طبلے کی آواز سے منع کرتا ہے بے وقوف نادان نغمت فیہ کے راز تک نہ پہنچا :- لفظ بے چارہ اردو زبان میں، کم عقل، مجبور اور بے وقوف کو کہتے ہیں۔ دیکھئے لغات المنجم (ص ۱۵۴) یہ شعر کسی عارف جامی نقشبندی کی طرف منسوب ہے۔ حالانکہ نقشبندی حضرات (آدام اللہ فیوضہم) تو قوالی کی لغویت سے سخت متنفر ہیں۔ اور اُن کے جدِ اعلیٰ خواجہ صاحب ہی سماع و نغمہ سے منع فرماتے ہیں۔ اگر یہ شعر کسی نقشبندی کا ہی ہے تو گویا اُس نے اپنے خواجہ صاحب کو ہی برا بھلا کہا۔ (العیاذ باللہ) ان دونوں شعروں میں ایک شرعی مسئلہ بتانے پر علماء فقہاء کی توہین و گستاخی کی، گویا کہ فاضل مصنف کے نزدیک ڈوم، مراثی، طبلچی اور بازاری بھانڈ تو ذی علم اور صاحبِ عقل ہیں۔ اور نغمت فیہ کے اسرار سے واقف ہیں، مگر علماء کرام جو شانِ اسلام ہیں، وہ اُن سے بھی گھٹیا درجہ کیا ایسا بیہودہ رسالہ "مزیلۃ النزاع" ہو سکتا ہے، بلکہ "مزیدۃ النزاع والفتن" علماء کی گستاخی کفر ہے۔ چنانچہ شرح فقہ اکبر ص ۲۱۳ پر ہے مَنْ اَبْغَضَ عَالِمًا مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِيفَ عَلَيْهِ الْكُفْرُ (اَیْ بِسَبَبٍ دُنْيَوِيٍّ) فَيَكُونُ بُغْضُهُ لِعِلْمِ الشَّرِيعَةِ لِاَنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ۔ اور واعظ بھی علماء ہی ہیں۔ چنانچہ شرح فقہ اکبر ص ۲۱۴ پر ہے۔ لِاَنَّ الْمُذَكِّرَ وَاعِظٌ وَهُوَ مِنْ جُمْلَةِ الْعُلَمَاءِ وَخَلِيفَةُ الْاَنْبِيَاءِ۔ اپنی کتاب "مقال العرفا" میں اعلیٰحضرت کے والدِ معظم قبلۂ عالم امیرِ ملت مولانا نقی علی خان اپنی کتاب فضل العلم میں، امام بغوی معالم التنزیل میں۔ امام جلال الدین سیوطی اپنی تالیف جامع الصغیر جلد دوم (ص ۷۷) پر حدیث پاک فرماتے ہیں۔ عَنْ اَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ (هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ)۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فقہائے کرام کی تعریف فرمائیں، اور یہ مصنف اُن کو بے وقوف و بے چارہ کہے، صَدَقَ الْعَرَبُ ذَمُّ الشَّيْءِ مَدْحُ ضِدِّهٖ۔ علم کی ضد جہالت ہے تو عالِم کی ضد ابلیس ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے اسرارِ الٰہیہ ہیں جو بھانڈ مراثیوں کے طبلے سارنگیوں سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور بے علم، جاہل قوال کی طبلے کی تھاپ کون سے نغمت فیہ کے بھید ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان قوالیوں سے کتنے غوث و قطب بنتے ہیں، حالانکہ غوثِ اعظم پیرِ پیران فرماتے ہیں "دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰى صِرْتُ قُطْبًا" ولایت تو علم کے دروازے سے عطا ہوتی ہے چشتیہ اکابرین بھی قوالی کو اتنی اہمیت کا درجہ نہیں دیتے جتنی فاضل مصنف نے دی۔ دیدہ دلیری تو دیکھئے سیدنا ابن مسعودؓ امام اعظمؒ علامہ شامی جیسے تمام فقہاء اسلام کو سفیہہ کہہ دیا۔ (نعوذ باللہ من ذلک)۔ اسی ص ۳ پر حضرت کاظمی صاحب قبلہ کا نام استعمال کرتے ہوئے بمع القاب لکھتے ہیں۔ **مَظْهَرِ اعلیٰ حضرت** :- یہ لقب علامہ صاحب قبلہ کے لیئے میرے

نزدیک مسلّم ہے، اور حقیقت بھی ہے مگر اعلیٰحضرت اپنے ملفوظات اور اپنی کتاب مسائل سماع میں قوالی مروجہ کو حرام فرماتے ہیں۔ چنانچہ ملفوظات مطبوعات اوّل صفحہ ۱ پر ہے، عرض کیا یہ روایت صحیح ہے کہ حضرت محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبر شریف میں ننگے سر کھڑے ہوئے گانے والوں پر لعنت فرما رہے تھے۔ ارشاد۔ یہ واقعہ حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ (الخ) اب تو لوگوں نے بہت اختراع کرلیے ہیں۔ (الخ) حالانکہ اس وقت بارگاہوں میں مزامیر بھی نہ تھے (الخ) اور ملفوظات سوم صفحہ ۶ پر ہے، عرض۔ گراموفون کا کیا حکم ہے:۔ ارشاد۔ بعض باتوں میں اصل کا حکم ہے بعض میں نہیں، (الخ) اور گانے میں اصل کا حکم ہے، اگر اصل جائز یہ بھی جائز، اگر اصل حرام یہ بھی حرام، مثلاً عورت وامرد کی آواز نہ ہو مزامیر کی آواز نہ ہو، اشعار خلاف شرع نہ ہوں تو جائز ہے ورنہ (ان میں سے ایک چیز بھی ہوئی تو) نہیں۔ غور فرمایئے کہ اعلیٰ حضرت کے نزدیک تو مزامیر حرام ہیں، تو بھلا مظہر اعلیٰحضرت کے نزدیک کیسے جائز بلکہ عبادت ضروریہ ہوسکتی ہے، ورنہ مظہریت کیسے ہوسکتی ہے، کہ یہ اسم ظرف کا صیغہ ہے۔ مظہر میں ظاہر ہی کا تسلّط ہوتا ہے۔ مظہر کا اپنا نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے صفحہ ۹ پر لکھا ہے:۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ۔ اقول فاضل مصنّف نے اس حدیث سے گانا باجا ثابت کیا ہے، یہ بہت بڑی چشم پوشی ہے، اس لیئے کہ لفظ غنا مشترک اور مشترک کے لیئے تعیّنِ معنٰے بغیر قرینہ جائز نہیں یہی وجہ ہے کہ شارحین نے اس میں بہت تاویلیں کی ہیں بعض فرماتے ہیں، اس کا معنٰے اچھی آواز، بعض کہتے ہیں اس کا معنٰے تجوید، بعض فرماتے ہیں اس کا معنٰے مخلوق سے بے نیازی۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد دوم صفحہ ۶۰۹ پر ہے مَعْنَاهُ الْاِسْتِغْنَاءُ عَنِ النَّاسِ۔ قاعدہ کلیّہ ہے کہ جب کسی روایت کے معنیٰ میں بہت سے قول ہوں۔ تو ترجیح قرینے کو ہوتی ہے۔ یہاں قرینہ میں مِنَّا والی سخت وعید ہے۔ ہمیشہ وعید اس چیز پر وارد ہوتی ہے، جس میں موعود لہٗ کو فعل یا ترک کا اختیار ہو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سریلی آواز انسانی اختیار سے باہر ہے۔ حالانکہ غناءِ صوفیانہ سُریلی آواز سے ہوتا ہے۔ جب یہ کسی کے اختیار میں ہی نہیں تو اتنی سخت وعید کیسے ہوسکتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہاں استغناء مراد ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت بھی اسی کو ثابت کر رہی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ آخر میں اسی جواب کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ (قال) مفسّرین کے نزدیک غناءِ صوفیہ مراد نہیں۔ (اقول) غلط ہے، مفسرین وفقہاء کے نزدیک صوفیانہ غنا جو مزامیر کے ساتھ ہو وہی حرام ہے، جس طرح کہ پہلے فتاوٰے عالمگیری جلد پنجم صفحہ ۳۵۲ کا قول نقل کر دیا گیا۔ اور اشعۃ اللمعات جلد دوم صفحہ ۲ پر اس طرح فرماتے ہیں کہ جو شخص مذکورہ بالا حدیث سے موسیقی ثابت کرے یا اس کا جواز مانے، وہ مکروہ کا مرتکب ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ اَمَّا التَّكَلُّفُ بِرِعَايَةِ الْمُوْسِيْقِىْ فَمَكْرُوْهٌ:۔ پس واضح ثابت ہوا کہ اس حدیث پاک سے دلیل جواز پیدا کرنا

فعل مکروہ ہے، اور فقہائے کرام جب کبھی مطلق مکروہ فرماتے ہیں، تو مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے، جس طرح کہ فتاویٰ فتح القدیر اور شامی میں ہے، اور مکروہ تحریمی حرام کے درجہ میں ہے، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں (جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۲۲) وَعَلَى الْمَكْرُوهِ تَحْرِيمًا وَهُوَ مَا كَانَ إِلَى الْحَرَامِ أَقْرَبُ وَيُسَمِّيهِ مُحَمَّدٌ حَرَامًا ظَنِّيًّا۔ جب تغنّا کی تاویل موسیقی سے حرام ہے تو خود موسیقی کیوں نہ حرام ہوگی۔ فاضل مصنف اسی ص ۹ پر ایک حدیث پاک نقل فرماتے ہیں۔ يَا عَائِشَةُ أَلَا تُغَنِّيْنَ فَإِنَّ هٰذَا الْحَيَّ مِنَ الْأَنْصَارِ يُحِبُّوْنَ الْغِنَاءَ اس سے بھی تمام چشتی حضرات اور یہ مصنف ڈھول باجے قوّالی مروجہ کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اقول۔ اس حدیث پاک میں محدثین کرام بہت احتمال بیان فرماتے ہیں اور ان تمام احتمالات میں کسی جگہ بھی قوّالی اور ڈھول باجے کا ثبوت ظاہر نہیں ہوتا۔ صاحبِ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد سوم صفحہ نمبر ۴۲۶ پر اسی کی شرح میں فرماتے ہیں۔ قَالَ التُّوْرِبِشْتِيُّ يُحْتَمَلُ أَنْ يَّكُوْنَ عَلَى خِطَابِ الْغَيْبَةِ بِجَمَاعَةِ النِّسَاءِ وَالْمُرَادُ مِنْهُنَّ مَنْ تَبِعَهَا فِيْ ذٰلِكَ مِنَ الْإِمَاءِ وَالسَّفَلَةِ فَإِنَّ الْحَرَائِرَ يَسْتَنْكِفْنَ مِنْ ذٰلِكَ یعنی یہ کام لونڈیوں اور کمینوں کا ہے

۲ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں صرف غنا کی نفیاً اجازت ہے، نہ ڈھول وغیرہ کی تیسرا احتمال یہ ہے، جو سب سے صحیح بھی ہے، کہ یہ لفظ اَلَا تُغَنِّيْنَ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی کہیں تم نے گانے والیوں کو برات کے ساتھ تو نہیں بھیج دیا۔ یا ترجمہ یہ ہے کہ اے عائشہ صدیقہ انصار کے رواج کے مطابق اس بارات میں عورتوں نے نغمہ بازی تو نہیں کی، اس سے ثابت ہوا کہ یہ نفرت کے لیے ہے نہ کہ اجازت یا اباحت کے لیے عقلاء کے نزدیک یہی احتمال زیادہ صحیح ہوگا، ورنہ اگر مصنف کا مطلب ہی کو صحیح تسلیم کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رنڈیوں کنجریوں غیر عورتوں مراثیوں خسروں کے ناچ گانے کی مکمل اجازت دے دی۔ (معاذ اللہ) بتائیے کیا اتنے احتمالات والی حدیث شریف سے حرام قوالی کا جواز ثابت ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دلیل ظنی سے حلت حرمت قطعی ثابت نہیں ہو سکتی، اصول حدیث کے نزدیک زیادہ احتمالات ظنی بنا دیتے ہیں۔ دیکھو خطبہ بخاری جلد اوّل۔ اس حدیث پاک کے توصیغے میں بھی احتمال ہیں۔ فاضلِ مصنف کے نزدیک اس کا فاعل تو عائشہ صدیقہ ہیں مگر یہ ٹھیک نہیں، کیونکہ تمام شارحین اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت عائشہ نغمہ سازی نہیں جانتی تھیں۔ نہ ان کو کسی نے سکھایا۔ حالانکہ نغمہ، گانا بڑی محنت اور سیکھنے سکھانے اور مشق کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے کام کا حکم کیوں دیا۔ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ ہر شخص کا کام نغمہ گانا نہیں۔ اگر میری اس بات کا انکار ہے تو ثابت کرو کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی کسی محفل میں معاذ اللہ عائشہ صدیقہ نے گانا گایا ہو۔ آگے چل کر لکھا ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ مطلق غنا حرام نہیں ہا۔

اقول ۔ جی ہاں مگر یہ بھی ثابت ہوا کہ مطلق جائز بھی نہیں اور وہ بھی صرف غنا ۔ قوالی اس سے بالکل ثابت نہیں ہوتی ۔ فاضل مصنف صفحہ ۱ پر فرماتے ہیں، لَهْوَ الْحَدِيْثِ کی لفظی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لھو کھیل کو کہتے ہیں اور حدیث بات کو (الخ) **اقول** ۔ یہ ایسی بیہودہ بات ہے کہ کوئی بھی عقل اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ۔ قواعد قرآنیہ کے مطابق لہوالحدیث بہر حال باطل محضہ ہے اور اس نسبت سے باطل ہوئے انفرادی طور پر ہر حدیث باطل نہیں ۔ مگر لہو باطل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم اِلّا سے استثناء نہ فرماتے تو وہ تین بھی کُل کے تحت داخل تھے ۔ استثناء سے صرف تین لہو خارج ہوئے ۔ پس باقی تمام بطلان میں شامل ۔ واضح رہے کہ یہ اِلّا نسخ یا فسخ نہیں ۔ جو کچھ اُڑ جائے ، بلکہ استثناء ہے ۔ اب مدعی کے لیئے کچھ گنجائش باقی نہ رہی ، پس آیت میں لہوالحدیث مطلق ہے ۔ لِيُضِلَّ اس کی قید یا صفت نہیں بلکہ علتِ اشترا ہے ، اور خریدار کے خریدنے کی وجہ جیسے کوئی کہے ، زید نے شراب خریدی ۔ تاکہ بیچے تو بیچنا شراب کی قید یا صفت نہیں بلکہ علتِ غائی ہے ۔ اسی طرح لِيُضِلَّ بھی لہوالحدیث کے خریدنے کی علت اور وجہ ہے ، نہ کہ لہوالحدیث کی قید ۔ جیسا کہ مصنف نے دھوکا دیا ہے :۔ نحوی قاعدے سے بھی لِيُضِلَّ قید نہیں بن سکتا ، کیونکہ قید دو قسم کی ہے ، ع۱ اضافت ، جیسے زید کا گھر ۔ ع۲ صفتیت جیسے شریف آدمی ۔ یہاں لِيُضِلَّ میں یہ دونوں باتیں نہیں لہٰذا ثابت ہوا ۔ کہ لہوالحدیث مطلق حرام ہیں ۔ اس لیئے کہ حلال کی نسبت حرام کی طرف کُل کو حرام بنا دیتی ہے ۔ لہو کُل حرام اور اور حدیث کل حرام نہیں ۔ لیکن جب اس حلال کی نسبت ہوئی لہو کی طرف تو وہ بھی کُل حرام ، جہاں جہاں نسبت باقی ۔ وہاں حرمت باقی ۔ صفحہ ۱۱ پر جواب ع۶ میں لکھتے ہیں کہ جو شئی موجود مرئی اور مال شرعی نہ ہو اس کی خرید و فروخت کسی طرح معقول و مقصود نہیں ہو سکتی ۔ **اقول** ۔ یہ قاعدہ اصطلاحاتِ قرآنیہ کے خلاف ہے ۔ باری تعالیٰ فرماتا ہے :۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ (الخ) یعنی یہ لوگ ایسے ہیں ۔ کہ انہوں نے گمراہی کو خرید لیا ۔ تفسیر صاوی میں ہے :۔ اَلْمُرَادُ بِالضَّلَالَةِ اَلْكُفْرُ :۔ گمراہی سے مراد کفر ہے ، حالانکہ کفر نہ مرئی شئی ہے نہ مال شرعی ۔ مگر پھر بھی اشترا کا لفظ اس کے لیئے استعمال ہوا ۔ فقہاء کی اصطلاح میں اشترا کے لیئے تین چیزیں ہونی ضروری ہیں ، ع۱ دکھائی دینے والی چیز ۔ ع۲ ، مال ۔ ع۳ ، غیر کی ملکیت ۔ لیکن رب تعالیٰ فرماتا ہے ۔ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ (الخ) ۔ حالانکہ رب تعالیٰ خود ہی ہر چیز کا مالک ہے ۔ قانون کے مطابق مالک مشتری نہیں ہو سکتا ۔ پتہ لگا کہ قرآن کریم بہت موقعوں پر لغت کے معنیٰ پر حکم جاری فرماتا ہے ۔ اسی طرح لہوالحدیث میں ۔ اسی لیئے مفسرین نے یہاں غناء لہو مراد لیا

اور موجودہ قوالیاں چونکہ غنا پر ہوتی ہیں، اس لیے حرام۔ مصنف کا جواب ۶ بالکل غلط ہے، حرمت کے لیے یہ قاعدہ بھی کلیہ نہیں ہے، نہی کی یہ تعریف بھی اس جگہ درست نہیں، کیونکہ یہ نحوی تعریف اور یہ لفظی تعریف ہے۔ نہ یہ منحصر ہے، نہ معنوی۔ دیکھیے لہو الحدیث کا خریدنا اس آیت سے حرام ثابت ہو رہا ہے مگر لفظی نہی لَا تَفْعَلْ کی شکل کہیں نہیں آئی۔ مصنف کا یہ استدلال صرف ناسمجھی کی بنا پر ہے، ورنہ کل کو کوئی کہہ دے گا کہ زنا حرام نہیں، کیونکہ قرآن کریم میں لَا تَزْنُوْا کا صیغہ نہیں آیا۔ کوئی دوسرا کہتا پھرے گا، خون، خنزیر، کتا، بلا حرام نہیں، کہ اس کے لیے بھی لَا تَفْعَلْ کی نہی نہیں آئی۔ **جواب:** ۵ بھی احمقانہ ہے، کیونکہ خود لہوِ حدیث کو حرام مانتے ہو یا نہیں، مراد خواہ کچھ بھی ہو۔ اس کی حرمت سے انکار مجال نہیں، اگر تسلیم ہے تو ظنیت کہاں گئی۔ مفسرین کا اختلاف اگرچہ الفاظ و اشیاء میں ہے مگر مقصود میں نہیں، مقصود سب کا ایک ہی ہے، اللہ سے غافل کرے، اور موجودہ قوالیاں، ڈھول باجہ بدرجۂ اتم غافل کرتی ہیں۔ ورنہ شیطان کافر کو یہ نہ بتاتا، اور کفار یہ راستہ اختیار نہ کرتے۔ صـ۱۶ پر ارشاد ہے۔ **اعتراض:** ـ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اَلْغِنَاءُ۔ **اقول۔** یہاں مصنف نے الفاظِ روایت میں غلطی کی۔ صحیح روایت اس طرح ہے:۔ صَوْتُ اللَّهْوِ وَالْغِنَاءِ (الخ) آگے لکھا ہے، **جواب۔** حدیث پاک میں ہے:۔ اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ وَلَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ۔ ثابت ہوا کہ ہر پانی مراد نہیں۔ اسی طرح الغنا سے ہر غنا مراد نہیں، بلکہ وہ غنا جو لہو و لعب پہ ہو، وہ صوتِ شیطان ہے، ایسی غنا کو ہم بھی ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔ پس مطلق غنا کی حرمت ثابت نہ ہوئی۔ **اقول:** مصنف صاحب نے یہاں خوب دھوکا کھایا ہے، اور سخت ترین نحوی غلطی کی ہے اس جواب میں آپ نے عجیب قیاس فرمایا ہے۔ آپ کا مقیس الغنا کا لفظ ہے۔ اور مقیس علیہ الماء کا لفظ حالانکہ یہ قیاس بالکل غلط ہے۔ مصنف کا قیاس الف لام کی وجہ سے ہے، وہ سمجھے شاید دونو جگہ الف لام عہدی ہے۔ یہ ان کی کج فہمی ہے۔ کیونکہ الف لام کے تعین کے لیے بھی کوئی قرینہ یا دلیل چاہیئے میری تحقیق کے نزدیک لفظ اَلْغِنَا میں الف لام استغراقی ہے کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ غنا کو تشبیہ دے رہے ہیں سُنْبُلُ مُرْسے، یعنی جس طرح پانی گھاس اگاتا ہے اس طرح غنا کی نغمہ بازی نفاق اگاتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر قسم کا پانی گھاس اگاتا ہے، اور یہاں لفظ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ میں الف لام استغراقی ہے۔ اور نحوی قانون ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ لفظاً بھی ایک طرح کا ہونا چاہیئے۔ تو جس طرح کا الف لام الماء میں اسی طرح الغناء میں بھی ہونا ضروری ہے۔ مصنف نے اس کو قیاس دوسری حدیث پر کیا، وہاں واقعی الف لام عہدی ہے، کیونکہ وہاں پہلے بیرِ بضاعہ کا ذکر موجود ہے اسی پانی کے متعلق سوال ہے۔ جیسا کہ ترمذی شریف کی پوری حدیث پاک سے ثابت ہے۔ حدیث

کے سوال نے پانی کو مخصوص کر دیا۔ یہاں لفظ الغنا میں کس چیز نے غنا کو مخصوص کیا۔ پس ثابت ہوا کہ قیاس غلط ہے اور عام غنا کی صفت ہے کہ نفاق پیدا کرتا ہے، لہٰذا عام غنا حرام، ہاں خاص غنا جس میں فقہاء کے قیود موجود ہوں، صرف وہی جائز ہیں۔ بغیر دلیل یہ کہہ دینا کہ یہاں الف لام فلاں ہے قابل قبول نہیں۔ الف لام کے تعین کے لیے قانونی دلیل دینی چاہیے۔ مصنف نے بہت جگہ آگے چل کر بھی اس طرح زیادتیاں کی ہیں ص۱۶ کے دوسرے اعتراض کا جواب بھی بہت غلط ہے، اعتراض کی حدیث پاک یہ ہے:۔ عَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِي طَرِيقٍ فَسَمِعَ مِزْمَارًا فَوَضَعَ أُصْبُعَيْهِ فِي أُذُنَيْهِ وَنَاءَ عَنِ الطَّرِيقِ إِلَى الْجَانِبِ الْآخَرِ ثُمَّ قَالَ لِي بَعْدَ يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا۔ قُلْتُ لَا فَرَفَعَ أُصْبُعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ۔ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ يَرَاعٍ فَصَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ قَالَ نَافِعٌ وَكُنْتُ إِذْ ذَاكَ صَغِيرًا رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاؤُدَ (مشکوٰۃ شریف ص۴۱۱)

دیکھیے کتنی صاف اور واضح دلیل ہے، کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر کے ساتھ حضرت نافع کسی راستے پر جا رہے تھے، ایک شخص (یقیناً کوئی یہودی ہوگا) ڈھول وغیرہ بجا رہا تھا، تو آپ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور وہ راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار فرمایا۔ جب بہت دور چلے گئے تو نافع سے پوچھا، کہ کیا آواز آ رہی ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ تو آپ نے کانوں سے انگلیاں نکالیں اور فرمایا میں بھی اسی طرح ایک دفعہ آقائے دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، تو آپ نے بانسری بجنے کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، اور راستے سے دور جا کر مجھ سے پوچھا، کہ کیا آواز آ رہی ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں، تو آپ نے انگلیاں مبارکہ نکال لیں۔ حضرت نافع فرماتے ہیں۔ کہ مجھ کو اس کام کا حکم نہ دیا۔ کیونکہ میں اس وقت بچہ تھا۔ (مکلّف نہ تھا) یہ ایسی حدیث ہے کہ جس کا ہر لفظ واضح اور ظاہر ہے، کسی تاویل، تحریف، ایچ پیچ کی ضرورت نہیں۔ مگر شیطان ابلیس کی خباثت کو کیا کہیں، کہ بے چارے مصنف کو کس راستے پر ڈال دیا۔ اور ایسی ایسی تحریفیں اور خود ساختہ باتیں کرائیں کہ (الامان الحفیظ)۔ مصنّف نے اس کے جواب میں اوّلاً دو خیانتیں کی ہیں۔ نمبر۱ عربی عبارت درج نہ کی بلکہ میں نے لکھی ہے۔ نمبر۲ حدیث پاک کے آخری الفاظ کا ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ ان ہی لفظوں میں مصنّف کے تمام خودساختہ بیہودہ احتمالات کا مکمل جواب ہے۔ پھر جواب دیتے ہوئے کیسی قلابازیاں کھاتے ہیں، اور قادیانی مار کہ تاویلیں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ شاید اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے کان بند کر لیئے تھے کہ آپ پر اس وقت وحی نازل ہو رہی تھی ؟ **اقول** :۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ، وحی کے نزول کا خاص طریقہ ہوتا تھا۔ جس کا ذکر حدیث پاک میں موجود ہے۔ کہ آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی، اور آپ خلوت میں تشریف لے جاتے تھے، اور بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے تھے۔ چنانچہ دیکھیئے مشکوٰۃ شریف باب بدء الوحی ص۵۲۲ ابن ہشام کی روایت۔ اور پھر یہ آواز تو مخل تھی خود نبی کریم کا اپنا کلام سوال حضرت عبداللہ سے اور حضرت عبداللہ کا جواب، اور راستہ چلتے دوسرے لوگوں کا شور و غل کیا مخل نہ ہوا، حالانکہ جب کوئی شخص کسی چیز کے متعلق سوچ رہا ہو، تو اپنا کلام اور بازاری شور بھی مخل ہو جاتا ہے، اور وحی کے نزول کے ثبوت میں بھی مصنف کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ بہت ممکن ہے کے لفظ سے اپنا اختراع ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ مصنف دوسری دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر مزمار کی آواز حرام تھی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے بجانے والے کو کیوں نہ روکا، اور ابن عمر کو کان بند کرنے کا حکم کیوں نہ دیا۔ ثابت ہوا کہ مزمار کی آواز سننا حلال ہے :۔ **اقول** :۔ بلکہ بجانا اور ڈوم، مراثی، بھانڈ بننا بھی حلال و سنتِ اسلام ہوا۔ مصنف کو چاہیئے کہ خود بھی گلے میں ڈھول ڈال لے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عمدًا ایسی کچی باتیں کر رہا ہے :۔ ورنہ ایسی صاف حدیث میں اس طرح کی غلطیاں کرنا کیا معنی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا بجانے والے کو نہ روکنا یقیناً اس لیئے ہے کہ وہ مراثی کافر تھا۔ اور کافر اگر شراب بھی پیئے، تو نہ روکا جائے گا۔ لہذا نہ روکنے سے حلت ثابت نہ ہوئی۔ اور حضرت ابن عمر کو حکم نہ دینا اس کی وجہ خود حضرت نافع نے بتا دی، جس سے عمدًا کترا کر مصنف صاحب گذر گئے، کہ ابن عمر نے مجھ کو کان بند کرنے کا حکم میری نابالغی کی وجہ سے نہ دیا۔ یہی وجہ اُس وقت تھی کہ ابن عمر بھی اس وقت چھوٹے تھے۔ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ کا لفظ اشارۃً بتا رہا ہے کہ جس طرح نافع کو بوجہ بچپن حکم نہ دیا اسی طرح ابن عمر کو بھی نابالغی کی وجہ سے حکم نہ دیا۔ یہی وجہ صاحبِ مرقات نے بیان فرمائی، چنانچہ دیکھیئے مرقاۃ جلد چہارم ص۴۲ پر۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس لیئے کہ لڑکے کی مدت بلوغ پندرہ سال ہے، جب کہ حضرتِ ابن عمر جنگِ احد کے وقت چودہ سال کے تھے۔ چنانچہ اکمال لصاحب مشکوٰۃ شریف ص۲۱ پر ہے :۔ اَنَّہٗ اِسْتُصْغِرَ یَوْمَ بَدْرٍ۔ وَیُرْوٰی اَنَّہٗ رَدَّہٗ یَوْمَ اُحُدٍ لِاَنَّہٗ کَانَ لَہٗ اَرْبَعَ عَشَرَۃَ سَنَۃً :۔ اسی طرح تفسیر معانی التنزیل ص۱۲ علی اربع تفاسیر جلد دوم ص۱۲ پر صحیحین کی روایت میں خود ابن عمر کا قول نقل فرما رہے ہیں (الخ) پس واضح ثابت ہوا کہ قوالی، مزمار، ڈھول، باجہ سب حرام ہیں۔ ورنہ کیا بات ہے کہ اس وقت ابن عمر کانوں میں انگلیاں نہیں ڈالتے، مگر آج اپنے کان بند کر رہے ہیں، کیا معاذ اللہ ان پر بھی وحی ہو رہی تھی۔ ص۱۸ پر اَلْغِنَاءُ حَرَامٌ وَتَلَذُّذٌ بِہَا کُفْرٌ (الخ) :۔ والی حدیث کی صحت کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حدیث مرقاۃ جلد چہارم ص۴۲ پر، اور فتاوٰی قاضیخان جلد سوم ص۴۶ پر، اور فتاوٰی بزازیہ جلد سوم ص۳۵۹ پر بلا تنقید نقل فرما کر حرمتِ قوالی پر استدلال کرتے ہیں۔ کیا یہ تمام شارحین و فقہاء غلط ہیں اور اکیلا مصنف صحیح ہے الفاظ حدیث میں تغایر ہو سکتا ہے۔ مگر معنیٰ ومضمون بالکل درست ہے۔ یہاں تک

کرابو داؤد کے محشی اور ہدایہ شریف کے محشی علیہما الرحمۃ نے بھی اسی حدیث سے حرمت قوالی پر دلیل لی ہے، مصنف کے نزدیک یہ حدیث پاک دو وجہ سے غیر صحیح ہے۔ ع۱ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث :۔ قَالَ اَنْکَحَتْ عَائِشَۃُ ذَاتَ قَرَابَتِہٖ (الخ) **اقول** :۔ اس حدیث پاک سے بھی موجودہ قوالیاں حلال ثابت نہیں ہوتیں، نہ مطلقاً غناء کی حلت ثابت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ حدیث مفصل نہیں بلکہ مجمل، کہ لفظ "لو" کا جواب پوشیدہ ہے۔ اور مجمل حدیث سے حلت ثابت نہیں ہو سکتی۔ دوسری جرح یہ بھی اس حدیث پر ہو سکتی ہے، کہ "اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فَحَیَّانَا وَحَیَّاکُمْ" اس نغمے میں عورتوں کا اور کنواری لڑکیوں کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ اس گانے کا اگلا شعر ہے۔ لَوْلَا الْحِنْطَۃُ الْحَمْرَاءُ لَمْ تَسْمَنْ عَذَارَاکُمْ۔ (ترجمہ) :۔ کہ اگر سرخ گندم نہ ہوتی، تو تمہاری کنواری لڑکیاں موٹی تازی سرخ سفید نہ ہوتیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے نفسانی ہیجان کے شعر ہیں۔ یہ گانا زمانہ جاہلیت کے گانوں میں سے ایک گانا ہے۔ آج کل کے فلمی گانوں اور اس میں کچھ فرق نہیں۔ کیا مصنف نے اس حدیث کو مرفوع کہہ دیا، حالانکہ شارحین اس کو موضوع کہتے ہیں، ورنہ کوئی فلمی گانا بھی حرام نہ رہے گا۔ **دوسری وجہ** مصنف کے نزدیک اَلْغِنَاءُ حَرَامٌ والی روایت اس وجہ سے بھی غلط ہے، کہ اس میں پہلے یہ ہے :۔ وَالتَّلَذُّذُ بِہَا کُفْرٌ اور بعد میں ہے وَالْجُلُوْسُ عَلَیْہَا فِسْقٌ۔ مصنف کی عقل نے جوش مارا کہ کفر پہلے اور فسق بعد میں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فسق پہلے ہوتا ہے کفر بعد میں، لہٰذا روایت غلط :۔ **اقول** :۔ کیسی افسوسناک جرأت ہے جو عالم کی شان کے خلاف ہے، اسی گھمنڈ پر علامہ کاظمی جیسے محقق و مفکر اسلام کا نام استعمال کیا ہے :۔ میں قبلہ کاظمی صاحب کی شخصیت علیہ سے باخبر ہوں، ایسی بچگانہ حرکتیں وہ نہیں کر سکتے۔ مصنف نے نیچریوں کی طرح حدیث پاک کی گستاخی کی، اور الفاظ طیبہ طاہرہ کو بے ڈھنگی کہا۔ مصنف کو توبہ کرنی چاہیئے، مصنف نے کفر اور فسق کی جو بحث کی ہے، اس طریقے سے مصنف کی کم عقلی بے تحقیقی ثابت ہوتی ہے :۔ ع۱ مصنف نے کہا چونکہ کُفْرٌ پہلے ہے اور فِسْقٌ بعد میں اس لیئے یہ حدیث غلط ہے۔ (معاذ اللہ) حالانکہ اصول فقہ کا اوّل طالب علم شاگرد بھی جانتا ہے کہ واؤ ترتیب کے لیئے نہیں آتی، بلکہ صرف جمع کے لیئے آتی ہے۔ اس لیئے حنفی فقہاء وضو میں ترتیب واجب نہیں مانتے، جب کہ شافعی حضرات روش کلام سے وجوب ترتیب کے قائل ہیں۔ ان کے جواب میں ہم اسی قانون کو پیش کرتے ہیں کہ واؤ ترتیب کے لیئے نہیں۔ اگر مصنف علام کے نزدیک تردید حدیث کا یہی استدلال ہے۔ اور اسی کج فہمی کی بنا پر حدیث پاک کی عبارت کو بے ڈھنگا کہہ کر سوء ادبی کے مرتکب ہوئے تو کل قرآن مجید کی عبارت کا بھی انکار کر دینا۔ اور آیت کریمہ کو بھی غیر صحیح قرار دیتے ہوئے، بے ڈھنگا کہہ دینا۔ (معاذ اللہ) دیکھو قرآن کریم پارہ سوم میں ارشاد ہوتا ہے :۔ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ :۔ اللہ تعالیٰ

نے سجدہ کا ذکر پہلے فرمایا، رکوع کا بعد میں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ رکوع پہلے ہوتا ہے سجدہ بعد میں۔ دیکھئے ہمارے مصنف صاحب کیا فتوے لگاتے ہیں اس آیت پر تمام مفسرین اس آیت کے تحت یہی فرماتے ہیں کہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں اگرچہ بعض مفسرین نے صرف اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ شاید بنی اسرائیل میں سجدہ پہلے ہوگا، مگر میری تحقیق کے نزدیک یہ اندیشہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام کی نمازیں بطریقہ ترتیب بالکل ایک جیسی تھیں، صرف الفاظ اور سجدہ کے اعضا کا فرق تھا۔ اسی لیے تفسیر روح البیان اور تفسیر نعیمی پارہ اوّل اور تفسیر صاوی شریف نے فرمایا کہ یہ پانچ نمازیں پانچ پیغمبروں کی یادگاریں ہیں۔ چنانچہ نمازِ مغرب حضرت ایوب علیہ السلام اور نمازِ فجر حضرت آدم علیہ السلام کی نماز ہے۔ اسی لیے نمازِ اسراء میں سب انبیاء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، مگر کسی کو ترتیبِ نماز سکھانی نہیں پڑی۔ معراج کی روانگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحالتِ قیام نماز پڑھتے دیکھا، ثابت ہوا کہ سابقہ انبیاء کی نمازوں کی ترتیب قیام وغیرہ بالکل اسلامی موجودہ نماز کی طرح تھا۔ اور رکوع پہلے ہی تھا، سجدہ بعد میں، مگر آیت میں سجدہ کا ذکر پہلے رکوع کا بعد میں۔ پس جب یہ آیت قابلِ اعتراض نہیں، تو مذکورہ حدیث پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ اور جو آیت کا جواب ہوگا، وہی یہاں بھی۔ ہاں ہمارے سجدے اور سابقہ دینوں کے سجدے کے اعضا اور طریقہ ادا میں قدرے فرق تھا۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَعْظُمٍ۔ (الخ ایمانیات اعضا پر سجدے کا حکم صرف مجھ کو دیا گیا ہے، (نہ کہ پہلے دینوں میں۔))۔ اگر اس کے باوجود ہمارے مصنف اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے حدیث کا انکار ہی کیے جائیں، تو میں عرض کروں گا کہ کفر کا معنیٰ وہ نہیں جو آپ نے سمجھا۔ بلکہ کفر بمعنے ناشکری ہے، جیسے کہ فتاوے بزازیہ جلد سوم ص۲۵۹ کی عبارت پہلے ذکر کی گئی، اور ناشکری بھی گناہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف صاحب فتاوی بزازیہ کی بات نہ مانیں، تو ہم عرض کریں گے کہ فسق دو قسم کا ہے ۱ فسق عملی، ۲ فسق اعتقادی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ تمام مفسرین کے نزدیک اس آیت میں فاسق اعتقادی مراد ہے نہ کہ عملی۔ تو اسی طرح مذکورہ حدیث پاک کے آخری جملے وَالْجُلُوْسُ عَلَیْھَا فِسْقٌ میں بھی فسق اعتقادی مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ قوالی کو اچھا سمجھتے ہوئے اس میں بیٹھنا فسق اعتقادی یعنی کفر ہے۔ مندرجہ بالا آیت کریمہ میں فسق اعتقادی مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اسی قسم کی دو آیتیں اسی رکوع میں ایک ہی موقعے پہ نازل ہوئیں۔ وہاں بھی ایک ہی حکم سناتے ہوئے پہلے کفر کا ذکر کیا، پھر ظلم کا، پھر فسق کا۔ مصنف کو چاہیے کہ وہاں بھی کہہ دیں کہ معاذ اللہ یہ ترتیب بے ڈھنگی ہے کہ پہلے کفر کا ذکر بعد میں فسق کا۔ آیات اس طرح ہیں۔ ۱:۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ۲ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ایک ہی بات ایک ہی حکم، مگر جزا میں تین لفظ، ۱ کفر، ۲ ظلم، ۳ فسق۔ اگر مصنف کی ناسمجھی کی طرح تینوں میں فرق کیا جائے، کتنا بڑا اعتراض پڑ جائے گا۔ مگر ذی عقل محقق اُن کو ایک ہی درجہ کفر میں رکھتے ہیں۔ تاکہ کلام الٰہی پر اعتراض نہ پڑے، اسی طرح یہاں حدیث میں بھی فسق اور کفر ایک ہی درجے میں ہے یہ تمام گفتگو اس صورت میں تھی، جب حدیث پاک کی عبارت اس طرح ہو کہ:- اَلْغِنَاءُ حَرَامٌ وَالتَّلَذُّذُ بِهَا كُفْرٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَيْهَا فِسْقٌ، جیسا کہ مصنف کتاب ہذا نے لکھا، مگر فتاویٰ قاضی خان جلد سوم ص۴۰۶ اور ابوداؤد کے حاشیے ص۶۷۴ کا اور ہدایہ آخرین ص۴۵۳ پر حدیث پاک اس طرح ہے:- اِسْتِمَاعُ الْمَلَاهِيْ مَعْصِيَةٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَيْهَا فِسْقٌ وَالتَّلَذُّذُ بِهَا مِنَ الْكُفْرِ:- بروایت ابی ہریرۃ۔ اب کوئی اندیشہ ہی نہیں رہتا۔ اور مصنف کی عذرداری بھی ختم ہو جاتی ہے، ص۲۰ پر ایک حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ یہ روایت:- عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَيْتُكُمْ عَنْ صَوْتَيْنِ اَحْمَقَيْنِ (الخ) غلط ہے۔ بے چارے مصنف شاید کتب پر بھی نظر نہیں رکھتے، یہ حدیث صاحب تفسیر درِ منثور نے اپنے استدلال میں نقل فرمائی ہے، مگر کچھ لفظوں کے تغیر سے۔ چنانچہ تفسیر درِ منثور جلد پنجم صفحہ نمبر ص۱۶۰ پر ہے:- وَاَخْرَجَ ابْنُ اَبِي الدُّنْيَا عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا نُهِيْتُ عَنْ صَوْتَيْنِ اَحْمَقَيْنِ فَاجِرَيْنِ صَوْتٌ عِنْدَ نَغْمَةٍ لَهْوٍ وَلَعِبٍ وَمَزَامِيْرَ وَصَوْتٌ عِنْدَ مُصِيْبَةٍ:- ظاہر بات ہے کہ ہمارے مصنف صاحب سے صاحب درِ منثور زیادہ محقق ہے پھر حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اس مذکورہ روایت کی تردید میں ایک ایسی لایعنی اور بیہودہ بات فرما رہے ہیں۔ جس کا کسی قانون کی کتاب میں ثبوت نہیں فرماتے ہیں کہ یہاں نَهَيْتُكُمْ کا لفظ ہے، جو ماضی کا صیغہ ہے۔ اور ماضی کے صیغہ سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے، کہ ایک چیز سے ماضی کے زمانے میں منع فرمایا ہو، اور مستقبل میں اس کی اجازت دے دی ہو۔ **اقول**:- مصنف نے اپنی ضد پالنے کے لیے کیسا عجیب قاعدہ گھر بیٹھے بنا لیا، اور سمجھا کہ شاید شریعت کے قاعدے ان کے گھر کے غلام ہیں کہ جس طرح چاہو، توڑ مروڑ لو (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ) مصنف کی اس بات پر چار طرح تنقید ہے۔ ۱:- یہ قانون کہاں لکھا ہے کہ ماضی کے صیغہ سے حرمت ثابت نہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں حلت و حرمت کے حکم بیشتر ماضی کے صیغہ سے ہی ہیں، خواہ ماضی مجہول ہو، جیسے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (الخ):- خواہ ماضی استمراری ہو۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم ص۱۱۴ پر ہے، طبرانی کی صحیح حدیث منقول ہے:- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ يَنْهٰى عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْيًا شَدِيْدًا:- دیکھو جل ماضی کے صیغے سے

حرام ہوا۔ اور اب تک حرام ہے، کرفرمایا۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ ۔ خواہ ماضی معروف کے صیغے سے ہو۔ مثلاً اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ اور تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ۶۷ پر ہے:۔ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْتِ الْمُغَنِّيَاتِ:۔ اور جامع صغیر جلال الدین سیوطی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۹۳ پر ہے:۔ نَهٰى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْفِطْرِ وَالنَّحْرِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ عَنْ عُمَرَ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ:۔ یہاں بھی ماضی کا صیغہ ہے اور عید کے دن کے روزے کو حرام کر رہا ہے۔ اور اس کا نسخ محال ہے۔ تفسیر روح المعانی گیارہویں جلد ص ۷۹ پر ہے۔ وَمَا تَرَكْتُ شَيْئًا يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ عَنِ الْجَنَّةِ اِلَّا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ۔ یعنی جنت سے دُور کرنے والی اور جہنم کے قریب لانے والی تمام باتوں سے میں نے تم کو منع کردیا۔ یہاں نهيتكم ماضی کا صیغہ ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جو چیز جہنم کے قریب کرے وہ حرام ہے۔ اور حرمت ثابت ہوئی:۔ نهيتكم کے صیغے سے مصنف کو کس نے اختیار دیا ہے کہ دل سے حرمت و حلت کے قاعدے بناتے رہیں:۔

دوسری تنقید:۔ یہ قاعدہ تو پھر حلت پر بھی جاری ہو جائے گا، کہ جس طرح بہت سی چیزیں پہلے حرام ہوئیں، پھر حلال ہوگئیں، اسی طرح بہت سی پہلے حلال ہوئیں، پھر حرام۔ تو چاہیئے کہ مصنف کے نزدیک ماضی صیغے سے نہ کوئی چیز حلال ہو، نہ فرض نہ واجب۔ اور جتنی چیزیں بصیغہٴ ماضی قرآن و حدیث میں حلال اور فرض وواجب ہیں، سب کا انکار کردو۔ اسی طرح قوالی کے علاوہ جتنی چیزیں ماضی کے صیغے سے حرام ہوئی ہیں۔ اُن کا بھی انکار کردو۔ **تیسری تنقید**:۔ مصنف صاحب نے بصیغہٴ ماضی حرمت کا انکار اس لیئے کیا ہے کہ ہو سکتا ہے، مستقبل میں یہ حکم یہ ہی منسوخ ہو گیا ہو۔ جیسا کہ ان کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے:۔ **اقول**۔ ہو سکتا ہے، یہ احتمال تو فعل حال کے صیغے میں بھی ہے، اس لیئے کہ وہ حرمتیں جو فعل حال کے صیغے سے ہوئیں وہ بھی کئی مرتبہ منسوخ ہوگئیں۔ پس لازم آیا کہ مصنف کے نزدیک نہ ماضی کے صیغہ سے حرمت ثابت نہ حال کے، رہ گیا مستقبل تو وہ خبر ہے، حکم بن سکتا ہی نہیں۔ اور حلت و حرمت حکم ہیں نہ کہ خبر۔ چلو چھٹی ملی نہ کوئی حلال، نہ کوئی حرام۔ واضح رہے کہ اسلام میں پانچ طرح حلت و حرمت ماضی کے ہی صیغے سے ثابت ہوتی ہے، جیسے اوپر ثابت ہوا ۔ ۲ جیسے کہ يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ ۔ ۳ امر جیسے:۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْتَنِبُوا الْكَبَائِرَ ۔ ۴ نہی جیسے لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا ۔ ۵ اِيَّاكَ وَاِيَّاكُمْ وغیرہ جیسے اِيَّاكَ وَاَنْ تَظُنَّ:۔ اس رسالے کا یہ بیہودہ قاعدہ ناقابل قبول ہے، اسی ص ۲۰ پر دوسرے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ **قال**:۔ اس حدیث میں تین چیزیں بیان فرمائیں۔ حر۔ والحریر۔ معازف، جو لغت

عربی میں مطلق شرم گاہ یا عورت کی شرم گاہ کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو المنجد ص ۵۲۵ العزف، صَوْتُ الدَّفِ۔ اقول بعض کے نزدیک پیش سے ہے۔ دُف۔ مگر صحیح یہ ہے، استعمال دونوں طرح ہے، اور بہتر ہے کہ دَف بالفتح استعمال کیا جائے۔ کیونکہ بزرگانِ دین اور علماء ادبا کے نزدیک کثرتِ استعمال بالفتح ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی گلستان شریف میں ص ۱۰۱ پر قوالی کی برائی میں ہی فرماتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ورمے درکفّ بنودہ است وقراضہ دردَف لفظِ کَفّ متفقاً مفتوحُ الکاف، اسی مناسبت سے لفظِ دَف بھی یہاں مفتوحُ الدّال ہے۔ ثمّ اقول: ہمارے مصنف صاحب نے پہلی دفعہ اپنے دعوے پر حوالہ پیش کرنے کی جرأت فرمائی، مگر ایسا اوندھا کر اپنے ہی دعوے کو چکنا چور کردیا۔ نہ معلوم آنکھیں بند کرکے تحریر کی ہے، یا شاید کسی قوالی سے حالتِ سکر پیدا ہو گئی ہو گی۔ دعوے تو ہے کہ معازف شرم گاہ کو کہتے ہیں، مگر دلیل لی ہے کہ معازف دَف کی آواز کو کہتے ہیں۔ یہ تو اسی طرح ہے، کہ ہمارا ایک طالب علم جب پہلی دفعہ تقریر کرنے لگا، تو کہتا ہے، کہ مسلمانو! نماز پڑھو۔ کیونکہ رب فرماتا ہے:۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ کیسی عجیب دلیل ہے۔ شاید ہمارے مصنف بھی پہلی دفعہ تصنیف کررہے ہیں۔ ص ۲۱ ص ۲۲ ص ۲۳ پر حلّتِ غنا پر استدلال کرتے ہوئے پانچ روایتیں نقل فرماتے ہیں، اور غلط تشریح کرکے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ پہلی حدیث یہ ہے:۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ اَبَا بَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ تَغَنِّيَانِ فِي اَيَّامِ مِنًى تُدَفِّفَانِ وَتَغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ وَالنَّبِيُّ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْ بَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ یہ ہے ان کی مایۂ ناز دلیل جس پر فخر کرتے ہوئے ہر ڈھول ہر قوالی، ہر کنجر بازی، بھانڈ، مراثی، طبلے، سارنگی اور ہر بد معاشی کو جائز کہتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث پاک سے موجودہ قوالیوں پر دلیل لینا سخت گمراہی ہے:۔ اس کی شرح میں شارحین فرماتے ہیں کہ یہ کام چھوٹی بچیوں کا تھا، جو شرعی احکام کی مکلّف نہیں ہوتیں کیونکہ شریعت اسلامیہ میں نابالغ یا نابالغہ پر کوئی حکم جاری نہیں ہوتا دیکھو بڑی عورتوں کو گڑیاں کھیلنا حرام ہے، مگر بچیوں کے لیے جائز ہے۔ بڑی عورتوں بڑوں کے لیے ترک نماز حرام مگر نابالغوں کے لیے جائز۔ اس حدیث پاک میں لفظِ جاریتان موجود ہے کہ یہ کام جاریتان کر رہی تھیں نہ کہ بڑی عورتیں۔ کیونکہ جاریہ عربی لغت میں نابالغہ کو کہتے ہیں چنانچہ لغت کی مشہور کتاب مجمع البحار جلد اول ص ۱۹۰ پر طیبی شرح مشکوٰۃ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ اَلْجَارِيَةُ مِنَ النِّسَاءِ مَنْ لَمْ تَبْلُغْ۔ اور المنجد ص ۸۶ پر ہے:۔ اَلْجَارِيَةُ (مُؤَنَّث) اَلْجَارِيْ (الصَّبِيَّةُ) (الخ) لغات کشوری ص ۱۲۷، جاریہ، چھوٹی بیٹی غرضیکہ ہر کتب لغت میں جاریہ نابالغہ کو کہتے ہیں۔ اور نابالغہ کو جاریہ کہتے بھی اس لیے ہیں، کہ اس پر کوئی شرعی پابندی نہیں ہوتی، بلکہ کسی کام سے گناہ گار نہیں ہوتی۔ یہی مسئلہ سمجھانے کے لیے حضرت صدیق اکبر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ اس حدیث پاک کو صحیح سمجھنے کے لیے تین باتیں

قابلِ غور ہیں۔ ع۱ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھ کر کیوں لیٹے ع۲ صدیق اکبر نے منع کیوں فرمایا وہ خود تو صاحبِ شرع تھے نہیں، نہ اپنے پاس سے کوئی شرعی قانون بنا سکتے تھے۔ ع۳ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کیوں روکا۔ اور کیوں فرمایا:۔ دَعْهُمَا :۔ اگر انسان کی عقل درست ہو اور صحیح عقل سے سوچا جائے، تو اس حدیث پاک سے حرمتِ قوالی ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ ع۱ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اس لیئے اوڑھی، تاکہ یہ مسئلہ ثابت ہو جائے کہ اس سے بے رغبتی ہی کرنی بہتر ہے، اگرچہ بصورتِ جائز بھی ہو اور کسی بالغ کو اس سے دلچسپی نہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ روح المعانی۔ ج ۱۱ ص۷۰ پر ہے :۔ وَمَعَ هٰذَا اَشَارَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْتِفَافِهٖ بِثَوْبِهٖ وَتَحْوِيْلِ وَجْهِهِ الشَّرِيْفِ اِلٰى اَنَّ الْاِعْرَاضَ عَنْ ذٰلِكَ اَوْلٰى۔ ان بچیوں کا ڈھول بجانا اور گانا لذت آمیز نہ تھا، بلکہ محض دل بہلاوا تھا۔ چنانچہ ام المومنین۔ حضرت عائشہ صدیقہ خود فرماتی ہیں :۔ قَالَتْ لَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ (هٰكذا فی تفسیر روح المعانی جلد ۲ صفحہ نمبر ص۷) اور غنا اونچی آواز اور ترنم کو کہتے ہیں، جو بہت مشق اور شاگردی سے حاصل ہوتی ہے :۔ چنانچہ روح المعانی جلد ۱۲ میں ہے :۔ لِاَنَّ الْغِنَاءَ يُطْلَقُ عَلٰى رَفْعِ الصَّوْتِ وَعَلَى التَّرَنُّمِ (الخ) بچیوں کی آواز میں ترنم نہیں۔ اور لذت ترنم سے پیدا ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہ عرفی غنا نہیں، حضرت صدیقہ کا سننا توجہ سے نہ تھا، نہ لذت لینا تھا، بخلاف موجودہ قوالی کے کہ وہ صرف لذتِ نفسانی کے لیے سنی جاتی ہے۔ اس لیئے حرام ہے۔ ع۲ :۔ حضرت صدیق اکبر کا منع کرنا اس لیئے تھا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ پاک سے بہت دفعہ سنا تھا، کہ، ڈھول، باجہ، طبلہ، سارنگی، مزمار، جلاجل دف وغیرہ مردوں، عورتوں کے لیئے حرام ہے اور متعدد احادیث اُن کے کانوں نے اس بارے میں سنی تھیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے سُنا، کہ :۔ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِيْ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ وَاَمَرَنِيْ بِمَحْوِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيْرِ (الخ) :۔ اور کبھی اس زبانِ الہیہ سے یہ کلام بھی سُنا :۔ بُعِثْتُ لِكَسْرِ الْمَزَامِيْرِ وَقَتْلِ الْخِنْزِيْرِ۔ (از تفسیر روح البیان جلد ھفتم ص۶۷) ان فرمودات کی وجہ سے آپ نے بچیوں کے گانے بجانے کو بھی حرام سمجھا۔ اسی لیئے اس کو مزمار شیطان بھی فرمایا۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے، (از روح المعانی جلد اوّل صفحہ نمبر ص۸) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی تھی، صدیق اکبر سمجھے کہ حضورِ اقدس نیند میں ہیں، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوتے تو ابو بکر صدیق کبھی نہ روکتے اور قیامت تک یہ مسئلہ ہم کو معلوم نہ ہوتا، کہ بچیوں کا ونڈھا سیدھا گانا غنا اور قوالی نہیں، بلکہ دل بہلاوا ہے جس سے بڑوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ حرام نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فرمان :۔ جَارِيَتَانِ تُغَنِّيَانِ بمعنی عرفی غنا نہیں، بلکہ لغوی غنا یعنی اشعار پڑھنا ورنہ لَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ نہ فرماتیں۔

ع۳ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا، کہ اے ابو بکر چھوڑ دو کہ یہ عید کا دن ہے، اس نے واضح کر دیا، کہ عید کا دن بچوں کے دل بہلاوے کا دن ہوتا ہے۔ ان کو اپنا دل بہلانے دو، ان پر شرعی احکام نہیں کہ یہ حرام ہو، تم اس سے بے رغبت ہو جاؤ، جس طرح میں بے رغبت ہوں۔ یہ تھی اس حدیث پاک کی سچی باحوالہ تشریح۔ مگر کتنی افسوسناک جہالت ہے کہ اس کو دلیل بنا کر ہر بھانڈ، مراثی، طبلچی قوال کو قوالی جیسے فعل حرام کے لیے کھلی چھٹی دی جائے:۔

دوسری روایت:۔ عَنِ الرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ قَالَتْ جَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ حِيْنَ بُنِيَ عَلَيَّ فَجَلَسَ عَلٰى فِرَاشِي كَمَجْلِسِكَ مِنِّي فَجَعَلَتْ جُوَيْرِيَاتٌ لَنَا يَضْرِبْنَ بِالدُّفِّ۔ (الخ)۔ اس پر بھی مصنف صاحب نے بہت بے پر کی ہانکی ہیں، اور قوالیِ زنان و مرداں پر دلیل لی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی لفظ جویریات موجود ہے۔ جو بتارہا ہے کہ یہ بھی بچیوں کا فعل ہے، جو شریعت کی مکلف نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سننا نغموں کی یا ترنم کی لذت کی وجہ سے نہیں، بلکہ بچوں کی زبان سے ہر چیز پیاری لگتی ہے۔ یہاں تک کہ بچہ گالی دے تو بھی اس کو مارا پیٹا نہیں جاتا۔ بلکہ بڑے بوڑھے ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ حالانکہ یہی گالی بڑے کے لیئے بولنا حرام ہے، گالی پر شرعی تعزیر واجب ہوتی ہے، دیکھو کتب فقہ۔ بچے مرفوع القلم ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ ایک دفعہ انوار العلوم کے جلسے میں، میں نے اپنے والد محترم کے ہمراہ شرکت کی، علامہ کاظمی صاحب قبلہ ہم کو اپنے گھر لے گئے۔ دوران مجلس علامہ صاحب کا پوتا، یا نواسہ مردانے میں تشریف لایا۔ غالباً کسی نے اس کو چھیڑ دیا۔ جس پر اس نے سخت ترین گالی دی، توتلی زبان سے گالی تھی۔ سب علماء ہنس پڑے، غالباً گالی کھانے کے لیئے ہی چھیڑا ہوگا۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ گالی دینا سب کے لیئے جائز ہے۔ کسی عالم نے اس بچے پر حرام کا فتویٰ نہ لگایا۔ بچوں کی حرکتیں نہ حرام ہوتی ہیں نہ گناہ۔ بچکانہ فعل کو نہ روکنا دلیلِ قوالی نہیں بن سکتی۔ یہی ڈھول جب بچیاں بجاتی ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں کہتے۔ لیکن اسی ڈھول کی آواز جب کسی بڑے آدمی سے سنتے ہیں، تو کان مبارک بند کر لیتے ہیں۔ یہ فرق کیوں؟ صرف اسی لیئے کہ ڈھول مطلقاً حرام ہے۔ خواہ کافر بجائے یا مسلمان۔ عورت بجائے یا مرد، جب کہ ترنم سے بجائے مگر بچہ غیر مکلف، اسکا وہ فعل بھی حرام نہیں۔ جو دوسروں کے لیئے ہر حالت میں حرام۔ مصنف صاحب افسوس ہے کہ بچوں کی حرکات پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے ہو۔ کسی بڑے کی سند پیش کرو۔ مصنف کی پیش کردہ تیسری **حدیث:۔** عَنْ عَائِشَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلِنُوْا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ (مشکوٰۃ شریف ص۲۷۱)

اس حدیث پر بھی مصنف نے دلیل لی ہے، کہ مطلقاً قوالی جائز ہے۔ اقول :۔ یہ محض مصنف علامہ مد ظلہ کی نادانی کم تحقیقی ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اس حدیث سے دف بجانے کا ثبوت، اور قوالی کی حلت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس روایت سے بھی پچھلی روایات کی طرح حرمتِ قوالی ہی ثابت ہوتی ہے، اس کی تین وجوہ ہیں، ۱ اس حدیثِ پاک کا پہلا جملہ بالکل درست ہے، اور سنداً، گویا حدیث پاک کے الفاظ صرف اتنے ہیں، اَعْلِنُوا النِّکَاحَ۔ اور ایک روایت میں پوری حدیث اس طرح صحیح ہے :۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْلِنُوا النِّکَاحَ ۔ وَاجْعَلُوْہُ فِی الْمَسَاجِدِ :۔ لیکن اگلا جملہ وَاضْرِبُوْا عَلَیْہِ بِالدُّفُوْفِ یہ ضعیف ہے اس کو نبی کریم کا حکم کہنا ہرگز درست نہیں۔ چنانچہ بلوغ المرام ص۲۰۴ پر ہے :۔ وَعَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ اَبِیْہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَعْلِنُوا النِّکَاحَ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَصَحَّحَہُ الْحَاکِمُ :۔ اور اس کے حاشیہ پر ہے وَرَوَاہُ اِبْنُ مَاجَۃَ عَنْ عَائِشَۃَ وَفِیْہِ زِیَادَۃٌ وَاضْرِبُوْا عَلَیْہِ بِالْغِرْبَالِ وَھُوَ عِنْدَ التِّرْمِذِیْ بِلَفْظِ بِالدُّفِّ۔ قَالَ الْحَافِظُ فِی الْفَتْحِ سَنَدُہٗ ضَعِیْفٌ :۔ ثابت ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے، اور اس کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے، کہ اس کی سند میں ایک راوی عیسٰی بن میمون ہیں، جو ضعیف ہے۔ اور بیہقی نے فرمایا کہ اس کا ایک راوی خالد بن ایاس منکر الحدیث ہے فرمایا، وَاجْعَلُوْہُ فِی الْمَسَاجِدِ والی روایت بھی غریب ہے۔ احمد نے فرمایا اس قسم کی روایات بہت سی مرقوم ہیں جس سے دف کے بجانے کی اجازت ملتی ہے، مگر سب کی سب غیر صحیح ہیں، اور سب میں کچھ نہ کچھ گفتگو ہے، یہ سب عبارت شرح الحدیث کی مشہور کتاب سبل السلام جلد سوم ص۱۴۱ سے نقل ہے، چنانچہ ارشاد ہے :۔ وَفِیْ رِوَایَتِہٖ عِیْسَی ابْنُ مَیْمُوْنٍ ضَعِیْفٌ کَمَا قَالَ التِّرْمِذِیُّ وَاَخْرَجَہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْہَقِیُّ وَفِیْ اَسْنَادِہٖ خَالِدُ بْنُ اِیَاسٍ مُنْکَرُ الْحَدِیْثِ (الخ) ۲ اس حدیث میں ارشاد ہے، وَاضْرِبُوْا عَلَیْھِمْ بِالدُّفُوْفِ لفظ اَضْرِبُوْا مطرد کے باب دوم ضَرَبَ یَضْرِبُ کا امر نہیں، بلکہ باب افعال کا امر ہے اور ضَرْبٌ بمعنیٰ اِضْرَابٌ اور اس میں مذکر مردوں کو بجانے کا حکم نہیں، بلکہ چھوٹی بچیوں سے بجوانے کا اختیار ہے۔ اور یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اَعْلِنُوْ یعنی نکاح کا اعلان ہونے دو، خود اعلان نہ کرو، بلکہ کرواؤ۔ یعنی خوب شور و غل جو بچے ایسے موقعوں پر مچاتے ہیں، مچانے دو۔ اور بچیاں اگر دف ٹھیکریا پیپا پے کر بجانے بیٹھ جائیں، تو اُن کو نہ روکو، بلکہ کہو خوب بجاؤ۔ تاکہ

نکاح میں کبھی کوئی جھگڑا پیدا ہو، تو بستی کے لوگ گواہی دے سکیں۔ چنانچہ بلوغ المرام صہ ۲۰۴ پر ہے:۔ وَهٰذَا اِنَّمَا هُوَ لَهْوُ الْفَتَيَاتِ وَغِنَاءُ صُوَيْحِبَاتِ الْعَرُوْسِ لَا مَا عَلَيْهِ عَامَّةُ الْيَوْمَ مِنْ اِحْضَارِ نِسَاءٍ فَاجِرَاتٍ مُحْتَرِفَاتِ اللَّهْوِ وَالْفُسُوْقِ:۔ یعنی حدیث پاک میں دلہن کی سہیلیوں اور چھوٹی بچیوں کا دف بجانا اور گیت گانا مراد ہے، نہ کہ قوالوں، بھانڈ، مراثیوں اور رنڈیوں کے گانے باجے۔ تاکہ کوئی شخص حرام کا مرتکب بھی نہ ہو، اور اعلان بھی ہو جائے۔ مقصود اعلان ہے نہ کہ دف۔ لہٰذا اگر کسی اور طریقے سے اعلان اچھی طرح ہو سکے تو دف کی حاجت نہ رہے گی۔ میرے نزدیک فی زمانہ سب سے اچھا اور مؤثر اعلان دولہا کا سہرا ہے کہ اس کو باندھ کر پوچھنے کی بھی حاجت نہیں ہوتی، کہ یہ کیا ہو رہا ہے، پھولوں کے ہار، ڈھول، دف وغیرہ ایسا اعلان نہیں ہوتا، جیسا کہ سہرے میں۔ کیونکہ ہار وغیرہ تو نکاح کے علاوہ اور دولہا کے علاوہ بھی پہن لیے جاتے ہیں اور ڈھول باجہ نکاح کے علاوہ بھی بجا لیے جاتے ہیں، مگر سہرا صرف نکاح اور دولہا کے لیے مخصوص ہے۔ ہر شخص گواہی دے سکتا ہے کہ ہم نے اس کو فلاں دن سہرا باندھے دیکھا ہے۔ اس لیے بجائے ڈھول باجہ بجانے کے سہرے کو رواج دیا جائے تو بہتر ہے، پھولوں کا سہرا حرام بھی نہیں، اور اعلان بھی بہترین ہے۔ وہابیوں کو اس سے منع نہ کرنا چاہیے:۔ بہر حال اِس حدیث میں قوالی کا ثبوت نہیں، بلکہ بچیوں کا گانا بجانا مراد ہے، اگر یہاں:۔ فَاضْرِبُوْا بمعنے ضرب ہی ہے، اور اس میں مذکر مردوں کو خطاب ہے جیسا کہ مصنف نے اس رسالے کے صہ ۲۵ پر لکھا ہے، تو اوّلاً لازم آتا ہے کہ ہر نکاح کے موقعہ پر دولہا اور دولہا کا باپ، بھائی چچا، تایا، خود ڈھول باجہ، طبلہ، وغیرہ لے کر بجائیں، اور مصنف صاحب کے صاحبزادے کی اگر شادی نکاح ہو، تو مصنف صاحب خود طبلہ ڈھول اپنے گلے میں ڈالیں، اور مسجد کے محراب ممبر میں کھڑے ہو کر (العیاذ باللہ)۔ خوب بجائیں:۔ **دوم**:۔ اس حدیث کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف قوالی ہی جائز نہ ہو بلکہ تمام رنڈیوں کا بلانا، مراثیوں کا آنا مروجہ برات بجانے والے جو سڑکوں پر بجاتے پھرتے ہیں، سب جائز بلکہ مصنف کے نزدیک واجب ہونے چاہئیں۔ کیسی عقل ماری گئی ہے۔ حالانکہ سب علمائے کرام آج تک اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ پس ماننا پڑے گا کہ یہ روایت بالکل موضوع ہے، صرف اتنی روایت درست ہے:۔ اَعْلِنُوْا النِّكَاحَ باقی لفظ کسی نفس پرست نے اپنے پاس سے ملائے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہوا، اگر فرضاً تصور بھی کرو تو مطلب یہی ہوگا کہ یہاں بچیوں کا گانا باجا مراد۔ کیونکہ لفظِ فَاضْرِبُوْا باب افعال کا امر ہے اور باب افعال کی آٹھ خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت لازم کو متعدی کرنا۔ چنانچہ مجموعہ پنج گنج صہ ۳۷ پر ہے، و خاصیت باب افعال ہشت چیز است (عـ۱) تعدیہ (الخ)، اور متعدی میں کام کا کروانا پایا جاتا ہے۔ تو ترجمہ یہ ہوا کہ تم دف بجواؤ

جس کے بجانے سے حرمت لازم نہ آئے۔ وہ کون ہیں، بالغ مرد و عورت نہیں بلکہ بچیاں۔ ورنہ ان احادیث کا تعارض پیدا ہوگا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دف سے منع فرمایا۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم صـ۱۹۳ پر ہے:۔ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضَرْبِ الدَّفِّ وَلَعِبِ الصَّنْجِ وَضَرْبِ الزَّمَّارَةِ۔ اور کتاب کنوز الحقائق جلد دوم صفحہ نمبر صـ۱۴۲ پر ہے:۔ نَهٰى عَنْ ضَرْبِ الدَّفِّ وَلَعِبِ الصَّنْجِ (الخ) رواہ الخطیب:۔ اور تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر صـ۶۷ پر ہے:۔ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْتِ الْمُغَنِّيَةِ:۔ جب احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہو، تو ذی عقل علماء کا کام ہے کہ اس طرح شرح کریں جس سے ہر دو پر عمل ہوسکے۔ چنانچہ یہاں اسی طرح کرنا لازم ہے، کہ پہلی روایت میں اگر درست ثابت ہو جائے، تو مطلب ہے بچیوں کا دف بجانا اور ان روایات میں ممانعت ہے بالغوں کو۔ مصنف کی پیش کردہ چوتھی روایت:۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَاطِبِ الْجُمَحِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْفَصْلُ مَا بَيْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ الصَّوْتُ وَالدَّفُّ فِي النِّكَاحِ (مشکوٰۃ شریف) ظاہری نگاہ سے اس کا جواب یہی ہے، کہ یہ دف بھی وہی ہے، جو پہلے بیان کر دیا، یعنی بچیوں کا شور و غل اور دف اسی لیے یہاں لفظِ صوت ارشاد ہوا۔ مگر مصنف کو ان تفکرات کی ضرورت کیا ہے۔ وہ تو بس بیہودہ قوالیوں کی حلت کے پیچھے لگے ہیں دلیل بنے نہ بنے اُن کو کیا۔ یہ تو اس روایت کے بارے میں سرسری گفتگو تھی۔ لیکن اگر ذرا تحقیق کی گہرائیوں میں جاکر دیکھو، تو واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث بھی مصنف کی دلیل نہیں بن سکتی نہ ہی حلت و حرمت کے درمیان تمیز ہے نہ ہی حلت کو ظاہر کرنے والی، بلکہ اگر یہ روایت اسناداً صحیح بھی ہو تب بھی فقط یہ ایک مشابہت رواجیہ ہے، یعنی اکثر غلط اور حرام نکاح خفیہ ہوتا ہے، جائز نکاح دھوم دھام سے تو یہ روایت بطور جملہ خبریہ ہے نہ کہ انشائیہ۔ اور علم اصول کے مطابق جملہ خبریہ سے اصلاً حکم یا قانون یا وجوب یا تمیز ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض جملہ خبریہ سے بوقتِ قرینہ حکم بھی ثابت ہو جاتا ہے جسکی امثلہ متعددہ قرآن مجید میں بھی موجود ہیں، مگر اصلیت کے خلاف۔ یہ تھی اس روایت کی تشریح۔ اب ذرا محدثانہ جرح بھی ملاحظہ ہو:۔ چنانچہ شرح اربعہ ترمذی جلد دوم صـ۳۵۲ پر ہے:۔ وَفِي الْبَابِ عَنْ عَائِشَةَ اَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِيْهِ رَاوٍ ضَعِيْفٌ۔ یعنی یہ روایت ضعیف ہے کہ اس میں بھی ایک راوی ضعیف ہے۔ جامع صغیر جلد دوم صـ۷۵ پر اس کو صحیح کہا ہے، احمد نے اس کو حسن کہا ہے، مگر ان تمام اقوال کے باوجود یہ قابلِ حکم نہیں کہ اس کے راوی محمد بن حاطب بن حارث بن معمر جمحی، نابالغ صحابی ہیں۔ صـ۳۵۲ شرح اربعہ ترمذی جلد دوم میں ہے۔ محمد بن حاطب (الخ) اختلاف است در کینتِ وے صحابی صغیر است

اور صـ۲۵۳ پر ہے۔ وَمُحَمَّدُ بْنُ حَاطِبٍ قَدْ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ غُلَامٌ صَغِيْرٌ : اسی طرح ترمذی شریف صـ۱۲۹ جلد اوّل میں ہے۔ اور اصولِ حدیث کے مطابق جس طرح کافر کی روایت عدم تقابل کے وقت معتبر ہے۔ اور جب صحابی کی روایت سے مقابلہ ہو جائے۔ تو مردود۔ اسی طرح نابالغ کی روایت جب کسی بالغ ثقہ کی روایت کے مقابل نہ ہو۔ تو معتبر جیسے امام حسن اور امام حسین ابن عباس وغیرہم کی روایات کیونکہ یہ بھی نابالغ صحابی تھے اور ان کی روایات معتبر لیکن جب کسی نابالغ کی روایت بالغ کی روایت کے مقابل ہو جائے۔ تو غیر معتبر جیسے کہ تمام محققین کے نزدیک عدمِ رویت باری تعالٰی اور معراج میں دیدارِ الٰہی نہ ہونے کی روایت صرف اس لیے ناقابل قبول ہے۔ کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا روایت کرتی ہیں۔ جو معراج کے وقت نابالغ تھیں، اور تمام صحابہ بالغین کے مقابل ہے۔ هٰكَذَا قَالَ أُسْتَاذِي سَيِّدِي سَنَدِي حَكِيْمُ الْاُمَّتِ اَبِي مُفْتِي اَحْمَدْ يَارْ خَان فِي شَرْحِهٖ مِرْاٰة چونکہ محمد بن حاطب بھی نابالغ راوی ہیں اور تمام اکابر صحابہ دف کی ممانعت کی روایت فرماتے ہیں جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ حیرت ہے کہ مصنف صاحب نے اپنے رسالے میں حضرت عائشہ صدیقہ کی، بچیوں والی روایت تو پیش کر دی، مگر انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا کی وہ روایت پیش نہ کی جو دُرِّ منثور جلد پنجم صفحہ نمبر ۱۵۹ پر درج ہے۔ عَنْ اِبْنِ مَرْدَوِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ الْقَيْنَةَ وَ بَيْعَهَا وَ ثَمَنَهَا :۔ یعنی اللہ تعالٰی نے گانے والیوں کے گانے کو حرام کر دیا (الخ) اب واضح ہو گیا کہ ان احادیث سے حلتِ قوالی کی دلیل لینا سخت غلطی ہے چنانچہ مصنف کی اسی پیش کردہ روایت کے متعلق علامہ محدث بیہقی فرماتے ہیں ،۔ قَالَ بَيْهَقِي فِي سُنَنِهٖ ذَهَبَ بَعْضُ النَّاسِ بِهٖ اَنَّ السَّمَاعَ وَهُوَ خَطَاءٌ (شرح الرابعہ ترمذی جلد دوم صـ۲۵۲) حیرت ہے کہ مصنف نے اس روایت سے دف اور طبلے، سارنگی کو حرام اور حلال کے لیے تمیز سمجھ لیا۔ کتنی خطرناک حماقت ہے، اگر اس کو حقیقت سمجھ لیا جائے، تو لازم آئے گا۔ کہ جس نکاح میں دف نہ ہو وہ حرام ہو، اگرچہ شریعت کی ساری باتیں ہوں۔ اور پھر آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے تمام نکاح مبارکہ میں اور حضرت فاطمہ زہرا کے نکاح پاک میں قطعاً دف کا ثبوت نہیں ملتا۔ مصنف ان پر کیا فتویٰ لگائے گا۔ کیا قوالی کی خاطر دین سے بھی ہاتھ دھونا ہے، مصنف کو میرا مشورہ ہے کہ ایسے غلط رسالے اور عقیدے سے جلد از جلد توبہ کریں۔ مصنف نے لفظ فصل پر بھی غور نہ کیا، اور آنکھیں بند کر کے دلیل بنا ڈالی۔ (اللہ تعالٰی ہدایت عطا فرمائے) آمین۔ پانچویں پیش کردہ روایت :۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِمَا فَقَالَ مَا هٰذَانِ الْيَوْمَانِ قَالُوْا كُنَّا نَلْعَبُ فِيْهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اَبْدَلَکُمُ اللّٰہُ بِھِمَا خَیْرًا مِنْھُمَا یَوْمَ الْاَضْحٰی وَیَوْمَ الْفِطْرِ۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۱۲۶) قوالی کے رسالے میں مصنف کا اس حدیث کو پیش کرنا مصنف کی نیت کا پتہ دیتا ہے کہ قوالی کی آڑ میں مصنف مذکور ہر فحاشی ہندوانہ رسومات سینما، جوئے بازی ہولی، دیوالی، آتش بازی، بھنگڑا، ڈھول، رنڈی، تمام جہالت کی باتوں کو عوام میں جاری کرنے کے خواہشمند ہیں، کہ لکھتے ہیں۔ کہ اس حدیث میں صراحت ہے کہ حضور نے اہل مدینہ کو لہو ولعب سے منع نہیں فرمایا، بلکہ اس کا وقت بدل دیا۔ **اقول**۔ حالانکہ روایت مذکورہ میں ہے، کہ ہم زمانہ جاہلیت میں کھیلا کرتے تھے، اور جاہلیت کے کھیل وہی تھے جو چند اوپر مذکور ہوئے۔ ھٰکَذَا قَالَ حَکِیْمُ الْاُمَّۃِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ اِمَامُ الْاَئِمَّۃِ فِیْ مُصَنَّفِہٖ م۱۳ جلد اوّل فی شرح ھذا الحدیث۔ دور جاہلیت دور کفر تھا۔ اب بھی عیسائی اور ہندو اپنی خوشیوں اور عیدوں بڑے دنوں میں یہی کام کرتے ہیں۔ تو گویا مصنف کے نزدیک معاذاللہ ان سب کاموں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی صرف وقت بدلا۔ استغفراللہ کتنی کم نظری ہے مصنف کے مذہب میں سب ہندوانہ کافرانہ رسومات جائز ہیں، اور مصنف چاہتے ہیں، اسلام کی پاکیزہ عبادات چھوڑ کر اپنی خوشیوں کو ہندوؤں، عیسائیوں کی طرح مناؤ۔ یہ ہندو نوازی نہیں، تو اور کیا ہے یہ سچ فرمایا نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آخر زمانے میں علم اٹھ جائے گا۔ جاہل مفتی ہوں گے، جہالت کے فتوے دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے، اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ حیرت اس بات کی ہے، کہ ص۲۱ پر خود یہ حضرت لہو ولعب کو مطلق طور پر حرام بھی لکھ رہے ہیں، مگر یہاں اس روایت کی تحریف کرتے ہوئے اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مصنف کا یہ مذکورہ احتمال اگرچہ کتاب سبیل السلام جلد دوم ص۷ پر بھی لکھا ہے مگر یہ سب بالکل غلط گمراہ کن حدیث رسول اللہ کی تحریف اور مقاصد فرمان نبوت کو فوت کرنا ہے۔ اس کی صحیح اور سچا عین منشد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق شرح ملاحظہ ہو:۔ **اقول**:۔ اسلام نے وہی چیزیں تبدیل کی ہیں، جو معاشرے یا عقائد کے لحاظ سے بری تھیں۔ اس صحیح روایت میں ایک لفظ ہے:۔ قَدْ اَبْدَلَکُمُ اللّٰہُ بِھِمَا خَیْرًا۔ جس کا ترجمہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں دنوں کو خیر سے تبدیل کر دیا۔ ہر ذی عقل جانتا ہے کہ وقت اور دن بنفسہٖ نہ اچھے ہیں، نہ برے۔ ان کو تبدیل کرنے کی وجہ کیا ہے۔ بنظر عمیق سے یہی ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ لہو ولعب جو کافر لوگ ان دنوں میں کیا کرتے تھے۔ وہ برے ہیں۔ کیونکہ لہو ولعب حرام یقینیہ ہیں، جیساکہ مصنف مذکور کو خود بھی آگے چل کر تسلیم ہے، خود دنوں میں کوئی عیب نہیں۔ ان دنوں کی کسی کافر سے نسبت نہیں۔ اہل عقائد کے نزدیک دنوں کی اچھائی برائی دو وجہ سے ہے، ۱: اس میں کوئی اچھا یا برا کام مروج ہو جائے۔ ۲: اسی

کسی اچھے یا بُرے شخص سے نسبت ہو جائے۔ جن دو دنوں کا اس حدیث پاک میں ذکر ہے، وہ تمام شارحین کے نزدیک نیروز و مہرجان ہیں۔ ان میں کافر لوگ عید مناتے ہیں، یہ دو موسموں کے ابتدائی دن ہیں۔ بذاتِ خود یہ دن بُرے نہیں، بلکہ کافروں کے لہو و لعب سے مروّج ہیں، اس لیے ان کو منانا یعنی ان میں خوشی منانا، اور اچھے اچھے کھانے پکانا، اور بوجہ دن کے تحفے بھیجنے کفر کی حد تک بُرے ہیں۔ اور یہ کام اگرچہ ویسے جائز ہیں۔ مگر اس دن کی نیت سے حرام وغیرہ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد دوم صفحہ ۲۵۲ پر ہے :۔ مَنْ اَهْدٰى فِي النَّيْرُوْزِ بَيْضَةً اِلٰى مُشْرِكٍ تَعْظِيْمًا لِلْيَوْمِ فَقَدْ كَفَرَ بِاللّٰهِ تَعَالٰى۔ (الخ) مقام غور ہے کہ یہ دن کافروں کی عید کیوں بنیں، نہ اس دن میں کوئی پیغمبر، پادری گرد پیدا ہوا، نہ کوئی دیوتا آیا، صرف یہی وجہ ہے کہ اس دن نیا سال کی ابتدا ہوئی، تو کافروں نے اس کو عید بنا لیا اور نام ہوا نیروز، موسم بہار شروع ہوا، تو کفار نے اس کو خوشی کا دن بنا لیا، نام ہو گیا مہرجان۔ اور کافروں کی عید بجز کھیل کود کے کچھ نہیں۔ اور کھیل کود تو شریعت مطہرہ میں حرام۔ لہٰذا یہ دن منانے حرام، پس ثابت ہوا کہ لہو و لعب حرام لعینہٖ اور یہ دن منانے حرام لغیرہٖ۔ اسی لیے حدیث پاک مذکورہ میں ہے :۔ اَبْدَلَكُمُ اللّٰهُ بِهِمَا خَيْرًا :۔ لفظِ خیر مشترک ہے، اس کے تیرہ معنے مجمع البحار جلد دوم صفحہ ۲۷ پر مذکور ہیں اصول کے مطابق ہر مشترک میں ایک حقیقی معنی ہوتا ہے، باقی عارضی۔ خیر کے اصلی معنے ہیں نیکی۔ اور نیکی وہ ہوتی ہے۔ جو خدا تک پہنچا دے اور شارحین و مفسرین کے نزدیک لہو و لعب وہ ہے، جو خدا تعالیٰ سے غفلت پیدا کرے۔ اللہ سے غافل کر دے۔ چنانچہ۔ اس ترتیب سے خیر کا ضد لہو و لعب ہوا، اور تبدیل کا معنے ہوا کہ اللہ نے لہو و لعب کو حرام کر کے خیر یعنی نیکی کو جائز اور محبوب رکھا۔ اور دن اس لیے تبدیل ہوئے کہ ذریعہ گناہ بنائے گئے۔ جس طرح شراب کو حرام کیا گیا اصلاً مگر اس کے مستعمل برتن بھی حرام کر دیے گئے، کہ وہ ذریعہ تھے، اس لیے لفظ خیر کے بعد اس روایت صحیحہ میں مِنْهُمَا آیا۔ صاحب مرقاۃ نے یہاں مِنْ بمعنی فی کیا ہے۔ صفحہ ۲۵۲ جلد دوم پر ارشاد ہے :۔ (منهما) اى فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ :۔ دنیا و آخرت میں صرف نیکی ہی فائدہ مند ہے۔ لہو و لعب میں آخرت کا بالکل فائدہ نہیں، چنانچہ اہل لغت کی کتاب مجمع البحار جلد دوم صفحہ ۱۲ پر ہے۔ اَللَّعِبُ مَا لَا نَفْعَ فِيْهِ۔ اور ان دو دنوں میں سوائے کھیل کود کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، اس لیے شارحین فرماتے ہیں کہ یہ خیر بمعنی اسم تفضیل نہیں۔ اِذْ لَا خَيْرِيَّةَ فِي هٰذَيْنِ يَوْمَيْنِ :۔ تو منشاءِ حدیث یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تمہارا کام لہو و لعب نہیں، بلکہ نیکیاں کرنا کھیل کود تو دورِ جاہلیت اور کفار کا کام ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کام تبدیل کر دیے، اور ان کی وجہ سے دن تک تبدیل کر دیے۔ کیونکہ جو چیز اشد حرام ہیں، تو ان کے مروّجہ دن بھی حرام ہو گئے۔ تاکہ مثل شراب شدّتِ حرمت ثابت ہو۔ مگر محض لہو پر حدِ شرعی نہیں، ہاں تعزیر ہے، جس طرح آکلِ سود پر حدِّ شرعی نہیں تعزیر ہے۔ لہٰذا یہ روایت

تولہو ولعب پر حرمت کی دلیل ہے، جیساکہ اشعۃ اللمعات جلد اول صہ ۶۴۲ پر ہے اور حاشیہ ابوداؤد صہ ۱۶۱ پر ہے مگر ہمارے مصنف کی عقل نے الٹا ہی فیصلہ کیا۔ ورنہ بتاؤ کس صحابی نے کس عید پر کونسا کھیل کھیلا، اور کیا اسلام میں ہر عید پر نماز اور ذکر اللہ واجب نہیں، اور اگر معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دن تبدیل کیا۔ اور دورِ جاہلیت کے کافرانہ کھیلوں کو جائز رکھا، تو کافر اور مسلمان کی عید میں کیا فرق، اور خیر کے کیا معنیٰ۔ پھر معاذ اللہ صحابہ کرام کی زندگی اور دورِ جاہلیت کی زندگی میں کیا فرق۔ اور کیا آریوں کا یہ اعتراض مصنف کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کے نبی کو اپنی جماعت کے علاوہ دوسرے لوگوں سے صرف ضد تھی۔ اور دوسرے لوگوں کی چیزوں اور لوگوں سے صرف ذاتی نفرت تھی۔ (معاذ اللہ) اور کیا یہ سوال مصنف کی مکتوبہ تحریر سے وارد نہیں ہوتا۔ حاشا حاشا میرے آقا میرے مولا نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو دورِ جاہلیت کی سیہ کاریوں سے بچاکر اللہ کی رضا پر چلانے والے تھے۔ اور لہو ولعب جیسے فتنے اور عارضی لغو خوشی اور دل مردہ کرنے والے افعال سے بچاکر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے سچی فرحت وخوشی وحیاتِ قلبی عطا فرمانے والے۔ خیال رہے کہ کتا گوشت کھاکر ہی پلتا ہے، اور بکری گھاس کھاکر ہی۔ اس کے عکس میں موت ہے۔ اسی طرح کافر لہو ولعب سے پرورش پاتا ہے، مومن ذکر اللہ سے۔ ریل گاڑی لائن پر دوڑ سکتی ہے، اور ٹرک وغیرہ سڑک پر ہی۔ اس کے عکس میں ہلاکت ہے اسی طرح مومن اللہ کے راستے پر چل سکتا ہے جو ذکر اللہ اور عباداتِ اسلامیہ ہیں اور کافر شیطان کے ہی راستے پر چل سکتا ہے، جو لہو ولعب، طبلہ، سارنگی وغیرہ ہے۔ مصنف چاہتے ہیں، کہ بکری کو کتے کی خوراک کھلائی جائے، ریل کو سڑک پر دوڑایا جائے، اور مومن کو لہو ولعب، طبلہ، سارنگی میں مشغول کرکے دین وایمان برباد کیا جائے (خدا مصنف کو ہدایت دے)۔ اسی صہ ۳۲ پر لکھتے ہیں۔ کہ سیاہ رنگ کی حبشی لڑکی نے منت مانی تھی۔ کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ سے واپسی ہوگی تو دف بجاؤں گی۔ نبی کریم نے منت پوری کرنے کی اجازت دے دی، تو اس نے نبی کریم کے سامنے دف بجایا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ قوالی اور دف جائز ہے۔

اقول:۔ مصنف نے اس حدیث کے الفاظ تحریر نہ فرمائے، اس کے الفاظ اس طرح ہیں (مشکوٰۃ صہ ۵۵۰)،

وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ مَغَازِيْهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ جَاءَتْ جَارِيَةٌ سَوْدَاءُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ كُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّكَ اللّٰهُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَيْنَ يَدَيْكَ بِالدُّفِّ وَاَتَغَنّٰى فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِيْ وَاِلَّا فَلَا (الخ) بالکل اسی واقعہ کو صاحب مشکوٰۃ شریف باب النذر صفحہ نمبر صہ ۲۹۸ پر بھی نقل فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي نَذَرْتُ أَنْ أَضْرِبَ عَلَى رَأْسِكَ بِالدُّفِّ قَالَ أَوْفِي بِنَذْرِكِ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ۔ اس روایت کو ہمارے مصنّف صاحب نے بھی مذکورہ رسالے کے صـ۳۲ پر بالفاظ اردو نقل کیا ہے اور لفظ امرأۃ سے بالغہ عورتوں کی قوالی کرنے پر استدلال کیا ہے۔ یہ مصنف مذکور کی عظیم نادانی ہے۔ گویا کہ مصنف ان دو روایت کو دو علیحدہ واقعے تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ باطل محض ہے۔ حق یہ ہے کہ ایک ہی دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک حبشی بچی نے دف بجانے کی منت مانی تھی، مگر ایک راوی نے جاریۃ فرما دیا۔ اور ایک راوی نے اِمْرَأَۃٌ میرے نزدیک یہی متحقق اور درست ہے، اس کی چند وجہیں ہیں:۔ عـ۱ میری تحقیق کی کسی شارح نے تردید نہیں کی، بلکہ بایں الفاظ تائید فرماتے ہیں۔ کہ ہر دو روایات کی شرح میں یہی کہتے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوے میں تشریف لے گئے تھے۔ تو سلامتی سے واپسی کے لیے منت مانی تھی۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ابو داؤد صـ۴۲۹۔ اور مرقات شرح مشکوٰۃ باب النذور در باب مناقب عمرؓ ان ہی روایتوں کی شرح، اور تمام شارحین ہر دو روایات میں فرماتے ہیں، کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ غزوہ کونسا تھا۔ دیکھو مرآۃ شرح، مشکوٰۃ باب النذر۔ دوسری روایت کی شرح۔ عـ۲:۔ مصنف کے پاس یہ ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ دونوں نذریں علیحدہ واقعے ہیں۔ اور کہ یہ دو عورتوں نے یکے بعد دیگرے علیحدہ علیحدہ منت مانی تھی۔ اگر کوئی دلیل ہوتی۔ تو ضرور رسالہ ہذا میں درج ہوتی۔ عـ۳:۔ اگر یہ دو واقعے ہوتے تو صاحب مشکوٰۃ مناقب عمرؓ والی مذکورہ روایت کو باب النذر میں بھی ذکر فرماتے، کیونکہ اس میں بھی منت کا ذکر ہے۔ چونکہ واقعہ ایک ہی ہے صرف راویوں کے اختلاف کے ساتھ دونوں بابوں میں ذکر کر دیا عـ۴:۔ مشکوٰۃ شریف نے دوسری روایت کا حوالہ ابو داؤد سے دیا۔ حالانکہ مشکوٰۃ اور ابو داؤد کے الفاظ میں بہت تغیر ہے مشکوٰۃ شریف میں یہ عبارت نہیں:۔ اَنَّ اِمْرَأَۃً اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ مگر یہ عبارت ابو داؤد میں ہے۔ اسی طرح صاحب مشکوٰۃ نے اپنی روایت کو اَوْفِی بِنَذْرِکِ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ:۔ پر ختم کر دیا۔ اور زیادتی کو رزین کی طرف منسوب کیا۔ مگر ابو داؤد شریف نے آگے دراز روایت فرمائی۔ جب دو کتابوں میں اتنا تغیر ہو سکتا ہے۔ تو دو روایوں کی عبارت میں لفظ جاریۃ اور امرأۃ کا تبدل ہو گیا تو کیا مضائقہ۔ اور جب دو کتابوں کے تغیر کے باوجود روایت ایک ہی رہی، جیسا کہ رواہ ابو داؤد کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے۔ تو اِمْرَأَۃٌ اور جَارِیَۃٌ کی تبدیلی کے باوجود بھی واقعہ اور منت ماننے والی ایک ہی روایت ہے۔ عـ۵:۔ یہی حدیث پاک کتاب جمع الفوائد جلد اوّل صـ۲۱۴ پر اس طرح نقل فرمائی

(عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ) عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ نَذَرْتُ اِذَا انْصَرَفْتَ مِنْ غَزْوَتِكَ هٰذِهٖ سَالِمًا غَانِمًا اَنْ اَضْرِبَ عَلٰی رَأْسِكَ بِالدُّفِّ فَقَالَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاَوْفِیْ بِنَذْرِكِ وَاِلَّا فَلَا ھِیَ لِاَبِیْ دَاوٗدَ - دیکھئے اس روایت کے راوی عمرو بن شعیب ہی ہیں، یہاں بھی اِمْرَأَةٌ ہے۔ مگر اس کے الفاظ جارِیَۃٌ والی مناقب عمرؓ کی حدیث سے کتنے موافق ہیں۔ ان پانچوں دلائل سے ثابت ہوا، کہ روایتیں اگرچہ مختلف ہیں۔ مگر واقعہ ایک ہی ہے۔ اور منت ماننے والی وہی نابالغہ بچی ہے۔ نہ کہ جوان عورت۔ اب یہ سمجھنے کی بات ہے کہ حضرت بریدہ نے لفظِ جاریہ کیوں کہا۔ اور حضرت عمرو بن شعیب نے امرأۃ کیوں کہا۔ اور ہم لوگ کیا مراد لیں۔ تو یاد رکھیئے، کہ اصل منت ماننے والی چھوٹی بچی ہی تھی، جو قریب بلوغ تو ہو سکتی ہے لیکن بالغہ، جوان یا بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ لفظِ جاریۃٌ صرف نابالغہ کو ہی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کتب لغت مجمع البحار وغیرہ کے حوالے سے پہلے ثابت کر دیا۔ مگر لفظ امرأۃٌ ہر مونث انسان کے لیئے عام ہے۔ مصنف کا یہ قول غلط ہے کہ امرأۃ صرف بالغہ کو کہتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے یلا دلائل صـ۳۲ پر لکھا ہے۔ اسی طرح لفظِ نِسْوَۃٌ بھی ہر مونث کے لیئے عام ہے۔ اور شریعت کی اصطلاح میں امرأۃٌ اور نِسْوَۃٌ ہر عورت پر بول سکتے ہیں، کیونکہ عربی زبان میں مونث انسانی کے لیئے کل سترہ الفاظ ہیں:-

(۱) صَبِیَّۃٌ (۲) صَغِیْرَۃٌ (۳) جَارِیَۃٌ (۴) مُرَاهِقَۃٌ (۵) طِفْلَۃٌ (۶) وَلِیْدَۃٌ (۷) كَاعِبٌ (۸) نَاهِدٌ (۹) مُعْصِرَۃٌ (۱۰) شَابَّۃٌ (۱۱) سَلْفَۃٌ (۱۲) عَجُوْزَۃٌ (۱۳) عَوَانٌ (۱۴) نَصَفَۃٌ (۱۵) اِمْرَأَۃٌ (۱۶) نِسْوَۃٌ (۱۷) كَبِیْرَۃٌ۔ لفظِ اِمْرَأَۃٌ اور نِسْوَۃٌ عام ہے، ہر عورت کو کہا جا سکتا ہے، چھوٹی ہو یا بڑی۔ بالغہ ہو یا نابالغہ، اور لفظِ کبیرہ ہر بالغہ عورت کو کہا جاتا ہے، باقی لفظ عمر کے لحاظ سے علی الترتیب ہیں۔ امرأۃٌ واحد ہے، اس کی جمع نِسَائٌ (دیکھو تفسیر نعیمی جلد چہارم صـ۴۴۴ اور المعجم اردو عربی مؤلفہ و مرتبہ خلیل الرحمٰن، نعمانی بریلوی صـ۴۸۳) تمام تفاسیر و کتب فقہ سے ثابت ہے کہ لفظ اِمْرَأَۃٌ وَنِسَاءٌ چھوٹی بچی کو کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد اول صـ۱۷۸ پر ہے (قولہٗ یَتٰمَی النِّسَآءِ) ای الیتامٰی۔ یہاں نساء سے یتیمہ بچیاں مراد لی ہیں۔ اور یتیمی بلوغت سے پہلے ہوتی ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد چہارم صفحہ نمبر صـ۱۷ پر ہے:- لٰكِنَّ الشَّارِعَ وَكَذَا الْعُرْفَ خَصَّصَهٗ بِالصِّغَارِ:- اسی طرح المنجد صـ۱۰۲۶ پر ہے اور اسی طرح اربعہ تفاسیر جلد دوم صـ۵ پر ہے۔ ثابت ہوا کہ لفظِ نساء چھوٹی بچیوں کو کہہ سکتے ہیں۔ جب جمع عام ہے تو اس کا واحد لفظ اِمْرَأَۃٌ بھی عام ہے۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد سوم صـ۱۷ پر ہے:- وَاِنْ عَلِمْتَ بِاَنَّ الصَّغِیْرَۃَ اِمْرَأَتُہٗ۔ یہاں بھی لفظِ امرأۃ چھوٹی بچی کو کہا گیا ہے شرح عنایہ

علی ہدایہ جلد دوم ص۱۷ پر ہے :۔ رَاجِعٌ اِلَی الْبَرَّۃِ الْکَبِیْرَۃِ دُوْنَ مَرْاَۃِ الصَّغِیْرَۃِ :۔ یہاں بھی لفظِ امرأۃ چھوٹی نا بالغہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ فقہاءِ کرام کے نزدیک نا بالغ بیوی کو مَرْاَۃٌ صَغِیْرَۃٌ کہتے ہیں۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اوّل ص۲۴۵ پر ہے :۔ وَاِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ صَغِیْرَۃً وَکَبِیْرَۃً فَاَرْضَعَتِ الْکَبِیْرَۃُ اِمْرَاَۃٌ صَغِیْرَۃٌ حَرُمَتَا عَلَی الزَّوْجِ۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ چھوٹی نا بالغہ بچی کو امرأۃ کہہ سکتے ہیں۔ امرأۃ نیمۃ کا لفظ تو عام مستعمل ہے بخلاف لفظ جاریۃ کہ وہ صرف نا بالغہ کو ہی کہتے ہیں، جیسے کہ پہلے مجمع البحار کے حوالے سے ثابت کیا گیا۔ پس لازم آیا کہ امرأۃ کہہ کر جاریۃ مراد لے سکتے ہیں مگر جاریۃ کہہ کر امرأۃ مراد نہیں لے سکتے ان ہر دو روایات میں سے اول میں جاریۃ ہے دوم میں امرأۃ تو یہی کہا جائے گا کہ روایت ثانیہ کے راوی عمرو بن شعیب کی مراد چھوٹی بچی ہی ہے نہ کہ کبیرہ، مگر لفظ عمومی، استعمال فرمایا۔ اور نتیجہ نکلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹی بچی کو ہی دف بجانے کی اجازت دی تھی۔ کیونکہ بوجہ نا بالغی اس کے لیے جائز تھا۔ مصنف کی کتنی چشم پوشی ہے، کہ صرف اپنا غلط عقیدہ بچانے کے لیے مفسرین اہل لغت، فقہاءِ اسلام کے خلاف توڑ موڑ کر رہے ہیں :۔

ص۲۵ پر فرماتے ہیں کہ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ صرف حضرت عمرؓ کی شان میں ہے، کیسی عجیب لغزش ہے، کہ تمام مفسرین فرماتے ہیں۔ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ تمام صحابہؓ کی شان میں ہے جن میں صدیق اکبر علیؓ مرتضٰے وغیرہ سب شامل ہیں۔ مصنف نے لفظ کفار نہ دیکھا، کیا وہ بھی معاذ اللہ کافر تھے۔ کیا مصنف نے لفظ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ نہ دیکھا۔ خیال رہے کہ اس روایت اور اس جیسی دوسری روایات میں جہاں بھی لفظ شیطان آیا ہے، وہاں گنہگار یا کافر مراد نہیں، بلکہ شریر اور شرارتی مراد ہیں۔ بچوں کو شیطان کہنا بھی اسی معنے میں ہوتا ہے، جن فقہاء نے کسی کو شیطان کہنے سے منع فرمایا ہے، وہاں بمعنی فسادی، فتنہ پرور اور ملعون ہوتا ہے۔ غصے والے لوگوں سے بچے گھبراتے ہیں، نہ کہ حلیم الطبع سے۔ ص۲۸ پر فرماتے ہیں، کہ ایک حبشی عورت ناچتی گاتی ہے۔ یہ ناچ گانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دیکھا، اور عائشہ صدیقہؓ کو بھی دکھایا۔ ثابت ہوا کہ قوالی جائز ہے :۔

اقول :۔ سُبْحَانَ اللّٰہ! کیا اچھا استدلال ہے، واہ ری کوتاہ بینی و کم نظری اس روایت میں مصنف صاحب نے عورت کا لفظ اپنے پاس سے شامل کر لیا ہے، حالانکہ حدیث پاک میں عورت کا لفظ موجود نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث پاک ص۵۵۸ پر اس طرح مرقوم ہے :۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

جَالِسًا فَسَمِعْنَا لَغَطًا وَصَوْتَ صِبْيَانٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا حَبْشِيَّةٌ تَزْفِنُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهَا (الخ) ترجمہ:۔ روایت ہے ام المومنین عائشہ صدیقہ سے کہ نبی کریم علیہ السلام گھر تشریف فرما تھے، کہ ہم نے گلی میں بچوں کی آوازیں اور شور و غل سنا:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ایک حبشیہ اچھل کود کر رہی ہے، اور بچوں نے تماشا بنایا ہوا ہے، (الخ) اس روایت میں تین لفظ قابل غور ہیں، عا لغطًا۔ عا صبیان۔ عا حبشیہ۔ یعنی یہ کوئی بڑوں کا کام نہ تھا، بلکہ بچے شور و غل اور اچھل کود کر رہے تھے، لفظ حبشیہ کی مراد مشکوٰۃ شریف میں اسی جگہ بین السطور جاریہ لی گئی ہے، اور حوالہ مرقات شرح مشکوٰۃ کا ہے۔ پتہ لگا، کہ وہ ناچنے کودنے والی بھی بچی تھی، اور بچوں پر شرعی احکام نافذ نہیں ہوتے۔ مصنف چاہتے ہیں کہ بڑی بالغ عورتوں کا ناچنا بھی جائز ثابت ہو۔ اور اپنے اس گمراہ کن عقیدے کے لیے صحابیات کو ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ (معاذ اللہ) مصنف نے آنکھیں بند کر کے لکھ دیا، اور ذرا غور نہ کیا کہ یہ کہاں تک گستاخی ہے۔ اگر مصنف بالغہ عورت ہی مراد لینا چاہتے ہیں، اور بطور جواز یہ روایت پیش کی ہے تو کیا مصنف اب خود اپنے گھر سے کسی شریف زادی بالغہ کو بازار میں اس کام کی اجازت دے دیں گے۔ مصنف صاحب کا حافظہ بھی کمزور معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں۔ کہ لہو و لعب ہر وقت جائز ہے۔ یہاں مطلقًا لہو و لعب (کھیل تماشہ) کو جائز مانا۔ صفحہ ۳۱ پر لکھتے ہیں کہ لہو و لعب ہی نفس امارہ کی حرکت کا باعث اور وہی حرام۔ صوفیائے کرام کے غنا۔ نہ وہ حقیقتًا لہو و لعب میں داخل نہ حرام۔ صَدَقَ الشَّيْخُ السَّعْدِي:۔

"دروغ گو را حافظہ نہ باشد"

صفحہ ۳۲ پر ایک اعتراض بایں الفاظ نقل فرماتے ہیں:۔ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَبِيْعُوا الْمُغَنِّيَاتِ (الخ)۔ یہ ترمذی شریف کی روایت ہے اس کا جواب دیتے ہیں:۔ اَلْمُغَنِّيَاتُ پر الف لام عہد کا ہے جس سے مراد خاص مغنیات ہیں

اقول:۔ معلوم ہوتا ہے مصنف صاحب کو نحوی قاعدے بھی بھول رہے ہیں:۔ نحوی قاعدہ ہے کہ الف لام عہد ذہنی ہو یا خارجی، قرینے سے ثابت ہوتے ہیں، اگر قرینہ ہو تو مراد ہوں گے اگر الف لام عہدی کے لیے قرینہ نہ ہو تو الف لام استغراقی ہی مراد ہوتا ہے:۔ چنانچہ فتاوٰے فتح القدیر جلد ہشتم صفحہ نمبر ۸۹ پر ہے:۔ اِذْ قَدْ تَقَرَّرَ فِيْ عِلْمِ الْاُصُوْلِ اَنَّ الْمُعَرَّفَ بِاللَّامِ اِذَا لَمْ تَكُنْ لِلْعَهْدِ الْخَارِجِيِّ فَهُوَ لِلْاِسْتِغْرَاقِ

یعنی اصولِ نحو کا قاعدہ ہے جب الف لام عہد خارجی نہ ہو تو استغراقی ہوتا ہے اور یہ نہ ہونا بھی قرینہ ظاہری نہ ہونے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی صفحہ پر آگے فرماتے ہیں۔ وَلَمْ يَظْهَرْ هُنَاكَ مَعْهُودٌ خَارِجِيٌّ فَهِيَ لِلْاِسْتِغْرَاقِ :۔ یعنی چونکہ یہاں الف لام عہدی کا قرینہ ثابت نہ ہوا اس لیئے استغراقی ہے پس ثابت ہوا کہ الف لام عہدی بغیر قرینے کے مراد نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر استغراقی کے لیئے اتنا ہی کافی ہے کہ عہدی نہ ہو۔ مصنف صاحب کی اپنی اختراع ہے جو یہاں بلا قرینہ اپنی بات پلٹنے کے لیئے الف لام عہدی بنا رہے ہیں اور مصنف صاحب کا اس حدیثِ پاک کو ضعیف کہنا بھی درست نہیں۔ دو وجہ سے :۔ (۱) اس روایت کو لفظاً تو بوجہ راوی مذکور کے ضعیف کہا جا سکتا ہے مگر معنیً یہ حدیث ضعیف نہیں کیونکہ الفاظ کے کچھ تغیر سے یہی روایت درِ منثور نے بھی نقل کی ہے۔ چنانچہ تفسیر درِ منثور جلد پنجم صفحہ نمبر ص ۱۵۹ پر ہے :۔ عَنِ ابْنِ مَرْدَوَيْهِ عَنْ عَائِشَةَ رض قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ الْقَيْنَةَ وَبَيْعَهَا وَثَمَنَهَا (الخ) ترمذی شریف میں بھی روایت اس طرح شروع کی ہے :۔ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَبِيْعُوا الْقَيْنَاتِ (الخ) مصنف نے بحوالہ ترمذی اس روایت میں بجائے اس لفظ کے، بلا وجہ لا تَبِيْعُوا الْمُغَنِّيَاتِ کر دیا۔ یہ مصنف کی غلطی ہے۔ درِ منثور کی روایت میں علی بن یزید راوی نہیں۔ معنیً یہ دونوں روایات ایک ہیں۔ اور محدثین کے نزدیک لفظی ضعف حکم نہیں بدلتا۔ (۲) مصنف مذکور کے نزدیک اس روایت کے ضعف کی دلیل محض یہ ہے کہ علی بن یزید راوی ضعیف ہے۔ حالانکہ علامہ ترمذی بذاتِ خود اس کے ضعف پر جزم نہیں رکھتے بلکہ فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم نے ایسا کہا ہے کہ علی راوی ضعیف ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اوّل ص ۱۵۴ پر ہے :۔ وَقَدْ تَكَلَّمَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ فِيْ عَلِيِّ بْنِ يَزِيْدَ وَضَعَّفَهُ :۔ قواعدِ حدیث و اصطلاحاتِ محدثین کے لحاظ سے لفظِ بعض اور قَالَ بَعْضٌ۔ قِيْلَ۔ يُقَالُ۔ بَعْضُهُمْ وَغَيْرُهُمْ سب الفاظ تمریض ہیں۔ اور لفظِ تمریض سے ضعف ثابت نہیں ہوتا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رح نے اپنی کتاب تقریب التہذیب میں ص ۱۸۷ پر علی بن یزید راوی کو مستور لکھا ہے۔ پس ضعف حتماً ثابت نہیں ہوتا۔ ثابت ہوا کہ گانا بجانا ہر طرح کی قوالی حرام ہے۔ اگر فرضاً علی بن یزید کو ضعیف بھی مان لو تو فرق صرف اتنا پڑتا ہے کہ الفاظ میں کچھ تبدیلی ہو گئی۔ مگر مقصد نہیں بدلا۔ اس ضعف کا کچھ حرج نہیں۔ ص ۲۴ پر لکھا ہے کہ يَا عَائِشَةُ اَمَا تُغَنِّيْنَ اے عائشہ رض تم گاتی نہیں؟ سرکار نے حضرت عائشہ رض کو غنا کا حکم دیا۔ **اقول** :۔ بالکل غلط ہے۔ یہ صیغہ واحد مونث حاضر نہیں۔ نہ ہی اس کا فاعل حضرت عائشہ صدیقہ رض ہیں۔ جیسا کہ میں

نے پہلے تشریح کر دی صفحہ ۳۵ پر بھی مصنف نے بحوالہ عوارف المعارف وہی حدیث نقل کی جو ایک بچی کے منت ماننے اور دف بجانے کی ہے۔ اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ یہ بچوں کا کام ہے بوجہ غیر مکلف کے جائز ہے۔ صفحہ ۲۶ پر اسی عوارف المعارف کے حوالے سے روایت نقل فرماتے ہیں عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ دَخَلَ عَلٰی اَخِیْہِ بَرَاءِ بْنِ مَالِكٍ هُوَ كَانَ يَتَغَنّٰى۔ مصنف صاحب اس روایت کو بھی قوالی کی دلیل بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی دلیل نہیں بن سکتی دو وجہ سے :۔ (۱) یہ روایت مجہول ہے کہ کسی نے اس کی اسناد کا ذکر نہیں کیا۔ فقہائے کرام کے نزدیک روایت مجہولہ کسی دعوے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ (۲) اس سے نعت خوانی کا ثبوت تو ہو سکتا ہے مگر قوالی کا نہیں اس لیے کہ كَانَ يَتَغَنّٰى واحد کا صیغہ ہے اور مزامیر کا ذکر نہیں بس وہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی نعت خوانی اور یہ بالکل متفق علیہ جائز ہے۔ آگے چل کر اسی صفحہ پر مصنف بیان الفقہ کے حوالے سے تفسیر کبیر کی ایک روایت پیش کرتے ہیں :۔ عَنْ عُثْمَانَ كَانَتَا عِنْدَهٗ جَارِيَتَانِ تَغَنِّيَانِ فَلَمَّا كَانَ وَقْتَ السَّحَرِ قَالَ دَعِيْنَ هٰذَا وَقْتُ الْاِسْتِغْفَارِ خود ہی اس کا ترجمہ کرتے ہیں بے شک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس دو لڑکیاں تھیں جو گاتی تھیں پس جب سحر کا وقت ہوتا تو آپ فرماتے اب گانا بند کر دو یہ وقت استغفار کا ہے۔ **اقول** :۔ مصنف اس سے بھی۔ قوالی کی حلت ثابت کر رہے ہیں کتنی زیادتی ہے۔ حالانکہ یہ روایت بھی پانچ وجہ سے ناقابلِ قبول ہے،

نمبر ۱ تفسیر کبیر میں یہ روایت نہیں ہے۔ (۲) اس روایت میں عن عثمان کہا ہے۔ علم اسماء الرجال کے مطابق دیگر کتبِ احادیث کا تو ذکر ہی نہیں۔ صرف صحیحین میں تیرہ آدمی عثمان نامی ہیں۔ پتہ نہیں یہاں کون سا شخص مراد ہے جو گانے کا اتنا شوقین تھا کہ روز رات کو ساری رات عورتوں کے گانے سنتا رہتا تھا۔ بھلا حضرت عثمان ابن عفان ایسا کر سکتے تھے جن کی ساری رات تہجد اور استغفار میں گزرتی تھی۔ جو دن کے صائم رات کے عابد زاہد۔ چنانچہ تاریخ طبری صفحہ ۲۰۳ پر ہے :۔ فَصْلٌ فِیْ زُهْدِهٖ۔ كَانَ يَبِيْتُ فِی الصَّلٰوةِ وَكَثْرَةً كَانَ يَخْتِمُ قُرْاٰنًا فِیْ رَكْعَةٍ وَّاحِدٍ وَكَانَ يَصُوْمُ فِی الْاَيَّامِ۔ کسی تاریخ نے مصنف کی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔ (۳) یہ حضرت عثمان پر بہت بڑا بہتان اور جناب کی شانِ اقدس میں گستاخی ہے :۔ کیونکہ خود حضرت عثمان غنی کا فرمان ہے کہ میں گانے سے نفرت کرتا ہوں۔ اور نہ کبھی تمنا کی اور نہ دایاں ہاتھ ذکر کو لگایا جب سے بیعت کی۔ چنانچہ تفسیرات احمدیہ جلد اول صفحہ نمبر صفحہ ۲۲۴ پر ہے :۔ وَهٰهُنَا قَوْلُ الصَّحَابَةِ دَالَّةٌ عَلٰی حُرْمَةٍ مُطْلَقًا قَالَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ

مَا تَغَنَّيْتُ وَ لَا تَمَنَّيْتُ وَلَا مَسَسْتُ ذَكَرِي بِيَمِينِي مُنْذُ بَايَعْتُ رَسُولَ اللهِ۔ یہاں بَايَعْتُ کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ یہ عثمان غنی ہیں۔ یہ حدیث مشہور ہے مگر مصنف کی روایت میں لفظِ عثمان سے عثمانِ غنی ثابت کرنا مصنف کی ذمہ داری ہے (۴) اس روایت میں لفظ کَانَ ہے جو ماضی استمراری بناتا ہے اور ماضی استمراری۔ دوام واستمرار کو چاہتا ہے اور مطلب یہ بنتا ہے کہ ہمیشہ ہی ایسا گانا رہتا تھا۔ یہ سراسر عثمانِ غنی کے بارے میں جھوٹ اور گستاخی ہے (۵) اس روایت میں لفظ دَعِيْنَ جمع مؤنث غائب ہے۔ حالانکہ عورتیں دو تھیں۔ دو کے لیے جمع غائب کا استعمال خلافِ قانون ہے۔ اگر بحث فعل امر ہو تب بھی دعین جمع نہ چاہیئے بلکہ تثنیہ حاضر مؤنث ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ روایت غلط ہے۔ یہاں تک مصنف نے احادیث سے استدلال کیا جس کا جواب دے دیا گیا۔ اگلے صفحات میں مصنف فقہاء کرام کو بھی اس برے کام میں ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ فقہائے اسلام جو زینتِ ایمان ہیں سب کے سب متفقہ طور پر قوالی کے منکر ہیں۔ چنانچہ مدارج النبوت جلد اوّل ص۴۴۳ پر ہے

درینجا سہ طریق است یکی مذہب فقہاء است وایشاں انکار میکنند

اور کیوں نہ انکار کریں جب کہ آئمہ اربعہ اجماعی طور پر قوالی کو حرام کہتے ہیں اور انہیں مجتہدین کا اتفاق اجماعِ امت ہے۔ چنانچہ توضیح تلویح علم اصول۔ عقود رسم المفتی۔ اور تفسیرات احمدیہ جلد اول ص۱۸۳ پر ہے:۔ وَ اَهْلُ الْاِجْمَاعِ مَنْ كَانَ مُجْتَهِدًا (الخ) اور اجماعِ امت حُجَّةً قَطْعِيَّةً ہے۔ جس کا انکار کفر ہے۔ چنانچہ تفسیراتِ احمدیہ میں ارشاد ہے:۔ فَيَكُوْنُ الْاِجْمَاعُ حُجَّةً قَطْعِيَّةً يَكْفُرُ جَاحِدُهٗ (الخ) امام اعظم کا مسلک قاضی طبری نے ارشاد فرمایا کہ اَمَّا اَبُوْ حَنِيْفَةَ فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْرَهُ ذَالِكَ وَيَجْعَلُ سَمَاعَ الْغِنَاءِ مِنَ الذُّنُوْبِ یہ پہلے بیان کر دی گئی۔ ثابت ہوا کہ امام اعظم کے نزدیک قوالی حرام ہے۔ ۲ ہدایہ جلد چہارم صفحہ نمبر ص۴۵۲ پر ارشاد ہے:۔ قَالَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ اُبْتُلِيْتُ بِهٰذَا مَرَّةً فَصَبَرْتُ:۔ یعنی امام اعظم فرماتے ہیں کہ اسی طرح ایک دفعہ میں ایک ایسے کھانے کی دعوت میں پھنس گیا جس میں قوالی اور گانے باجے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مصنف نے بھی اس عبارت کو بطورِ اعتراض ذکر کرکے عجیب نادانی سے ص۳۶ پر جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت امام ابو حنیفہ دعوتِ ولیمہ میں کہ غیر بلائے ہوئے تشریف لے گئے۔ اتفاق سے وہاں سرود یعنی گانا ہو رہا تھا (الخ) استغفراللہ مصنف نے امام اعظم کی کتنی گستاخی کی ہے۔ صحیح واقعہ یہ ہے کہ امام اعظم سے کسی نے گانے کے متعلق سوال کیا کہ اگر کوئی دعوت میں مدعو ہو تو کیا کرے۔ جب کہ وہاں قوالی جیسے گناہ یا

ڈھول باجے کا بھی صاحبِ دعوت نے انتظام کیا ہو تو امام صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ایسی ہی دعوت میں ایک دفعہ میں بھی مدعو تھا۔ میں پھنس گیا تھا تو میں واپس نہ آیا بلکہ صبر کیا۔ تمام فقہاء فرماتے ہیں کہ وہاں گانا باجا ہو نہیں رہا تھا بلکہ صاحبِ خانہ نے باہر کہیں یہ انتظام کیا تھا اس لیے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے گناہ گار ہوئے اسی لیے امام اعظمؒ نے لفظ اُبْتُلِیْتُ فرمایا نہ کہ اُسْمِعْتُ اور قیامت تک کے لیے مسئلہ بتا دیا کہ اگر کسی دعوت میں مدعو ہو اور وہاں گانا۔ باجا ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر گانا دسترخوان پر ہو اور وہ شخص منع کرنے پر قادر نہ ہو تو اٹھ کر چلا آئے اور دعوت چھوڑ دے ورنہ منع کرے اور اگر دسترخوان پر یہ گناہ نہ ہو تو صبر کرے اور دعوت کھالے۔ یہی صورت امام اعظمؒ کے ساتھ پیش آئی۔ چنانچہ ہدایہ شریف جلد چہارم ص۴۵۲ پر ہے :۔ وَالْمُحْكِيُّ عَنْ أَبِي حَنِيْفَةَ فِي الْكِتَابِ كَانَ قَبْلَ أَنْ يَّصِيْرَ مُقْتَدِىً وَلَوْ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى الْمَائِدَةِ لَا يَنْبَغِيْ أَنْ يَّقْعُدَ وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ مُقْتَدِىً اگر ہدایہ کا یہ قول مصنف صاحب تسلیم نہ کریں تو اس کا کیا جواب ہے کہ سائل کے سوال میں لعب و غنا دونوں کا ذکر ہے اور دونوں کا جواب امام اعظم نے دیا ہے حالانکہ مصنف صاحب کے نزدیک بھی لعب حرام ہے۔ جیسے کہ اسی رسالے کے ص۳۱ پر درج کیا تو مصنف نے ہدایہ شریف یاد نہ رکھا اور یا غفلت برتی جا رہی ہے مصنف تو کہتے ہیں کہ اس جوابِ امام سے تو غناء کا جواز ثابت ہوتا ہے مگر صاحبِ ہدایہ علامہ اپنی تصنیف ہدایہ جلد چہارم ص۴۵۲ پر فرماتے ہیں :۔ وَدَلَّتِ الْمَسْأَلَةُ عَلٰى أَنَّ الْمَلَاهِيَ كُلَّهَا حَرَامٌ حَتَّى التَّغَنِّيْ بِضَرْبِ الْقَضِيْبِ وَكَذَا قَوْلُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رح اُبْتُلِيْتُ لِأَنَّ الْاِبْتِلَاءَ بِالْمُحَرَّمِ يَكُوْنُ۔ **ترجمہ** :۔ امام اعظمؒ کے اس مسئلے نے ثابت کر دیا کہ ہر وہ غناء حرام ہے جو قوالی کی طرح طبلے سارنگی وغیرہ سے ہو۔ اور اسی طرح امام صاحبؒ کا لفظ اُبْتُلِیْتُ بھی حرمتِ قوالی بتا رہا ہے کیونکہ ابتلاء حرام ہی میں ہوتا ہے نہ کہ حلال میں۔ دیکھا آپ نے صاحبِ ہدایہ نے مصنف کے عقیدۂ باطلہ کی کس طرح دھجیاں بکھیر دیں۔ اور صاحبِ ہدایہ وہ شخصیت ہیں کہ مصنف صاحب بیچارے کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ خود علامہ کاظمی جیسے بزرگ اکابرِ دین بھی ان کے دروازے کے خوشہ چین ہیں۔ اور ان کے ٹکڑوں کے گدا کی حیثیت میں۔ مصنف صاحب ص۳۷ پر فرماتے ہیں۔ لفظِ ابتلاء سے حرمت پر استدلال منع ہے۔ کیونکہ امام اعظمؒ نے قاضی بننے کے لیے بھی ابتلاء کا لفظ فرمایا تو کیا قاضی بننا حرام ہے :۔

اقول :۔ ہاں حرام ہے۔ جب کہ حکومت ظالم ہو۔ چنانچہ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ظالم بادشاہ کا قاضی بننا حرام ہے کہ اگر فیصلہ بادشاہ کے خلاف کرے تو جان کی

ہلاکت اور اگر اسلام کے خلاف کرے تو ایمان کی ہلاکت۔ اور جان کر بلا فائدہ اپنے کو ہلاکت میں دینا حرام ہے۔ اس لیے حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ امارت کی تمنا نہ کرو۔ وہاں یہ ہی قضاء مراد ہے جو حرام اور امام اعظم کا لفظِ ابتلاء قضا کے لیے فرماتا۔ حرام قضاء کی طرف ہی اشارہ ہے لیکن عادل بادشاہ کا قاضی بننا بالکل جائز ہے بلکہ کئی موقعوں پر واجب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے خود حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست پیش کی۔ حدیث پاک اور امام اعظم کے قول میں حرام قضاء کا ذکر ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمود میں حلال کا۔ بعض موقعوں پر تو مرد کے لیے نکاح بھی حرام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بلغۃ السالک صـ۳٧۲ جلد اوّل میں ہے:۔ وَقَدْ يَحْرُمُ اِنْ لَمْ يَخْشَ الزِّنَا وَاَدّٰى اِلٰى حَرَامٍ مِنْ نَفْقَةٍ اَوْ اِضْرَارٍ اَوْ اِلٰى تَرْكِ وَاجِبٍ (الخ) (۱) پس ثابت ہوا کہ امام اعظم کے نزدیک قوالی حرام ہے اور ابتلاء کے الفاظ فعل حرام کے لیے مستعمل ہیں۔ (۲) امام مالک کے نزدیک بھی قوالی حرام ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صـ٦٧ پر ہے:۔ قَالَ الْاِمَامُ الْمَالِكُ اِذَا اشْتَرٰى جَارِيَةً فَوَجَدَهَا مُغَنِّيَةً فَلَهٗ اَنْ يَّرُدَّهَا بِهٰذَا الْعَيْبِ۔ قَالَ فِيْ فِقْهِهٖ۔ وَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الرَّجُلِ الْمُغَنِّيْ۔ (الخ) اور فتاوٰے مالکیہ بلغۃ السالک جلد دوم صـ۵۳ باب خیار عیب اوخصائل) بِالْمُدِّ فَهُوَ عَيْبٌ وَاِنْ زَادَ فِيْ ثَمَنِ الرَّقِيْقِ لِاَنَّهٗ مَنْفَعَةٌ غَيْرُ شَرْعِيَّةٍ كَغِنَاءِ الْاَمَةِ۔ یعنی غلام کا خصی ہونا شریعت کے خلاف اس طرح عیب ہے جیسے لونڈی کا گانا بجانا شریعتِ پاک کے خلاف عیب ہے۔ کتنا واضح ثابت ہوا کہ امام مالک کے نزدیک قوالی حرام ہے۔ (۳) امام شافعی کے نزدیک بھی قوالی حرام ہے۔ چنانچہ فتاوٰے شافعی حاشیہ ابراہیم بیجوری جلد صـ۲۹٧ پر ہے:۔ فَيَخْرُجُ بِهٖ غَيْرُ الْمُبَاحَةِ كَمَنْفَعَةِ اٰلَةِ الْمَلَاهِيْ۔ فقہائے کرام کی اصطلاح میں ہمیشہ آلاتِ ملاہی اور آلاتِ لہو سے یہی ڈھول باجے مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی ہدایہ کے حوالے جلد پنجم صـ۳۰۵ پر فرماتے ہیں:۔ اٰلَاتُ اللَّهْوِ كَالطُّنْبُوْرِ قَالَ فِي الْبَحْرِ هُوَ يَقْتَضِيْ اَنْ يُّفْتٰى بِقَوْلِهِمَا لِاَنَّ الْفَتْوٰى عَلٰى قَوْلِهِمَا فِيْ عَدَمِ الضَّمَانِ بِكَسْرِ الْمَعَازِفِ باجہ مزامیر چونکہ حرام شے ہیں اس لیے توڑنے پر شرعی ضمان نہیں۔ (ای المزامیر) یعنی مزامیر وغیرہ غیر مباح چیزیں ہیں۔ (۴) یہی مسلک امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے۔ (فَانْظُرْ فِيْ فَتَاوَاہُ) ثابت ہوا کہ اجماعِ امت سے حرمتِ قوالی ثابت ہے۔ اور مزامیر وغیرہ لغویات پر اجماع امت ہو چکا ہے کہ حرام قطعی ہیں۔ یہ صرف میں ہی نہیں کہتا بلکہ علامہ شامی اپنے فتاوٰے صـ۴۲۵ اور صـ۳۰٦ جلد پنجم میں بھی فرماتے ہیں کہ اس کی حرمت پر اجماع امت ہے۔ جیسا کہ پہلے ہم نے

شامی کی عبارت پیش کر دی۔ مسلم شریف جلد اوّل ص۲۹۱ پر ارشاد ہے۔ وَحَرَّمَهُ أَبُوْحَنِيْفَةَ وَأَهْلُ الْعِرَاقِ وَمَذْهَبُ الشَّافِعِيْ كَرَاهَتُهُ وَهُوَ الْمَشْهُوْرُ مِنْ مَذْهَبِ مَالِكٍ۔ یعنی امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک قوالی مکروہ ہے۔ اور عند الفقہاء جب مکروہ مطلق ہو تو کراہت تحریمی ہی مراد ہوتی ہے چنانچہ فتاوٰے فتح القدیر اور کبیری شرح منیہ ص۵۵۵ پر ہے۔ فَإِنَّ إِطْلَاقَ الْكَرَاهَةِ يُفِيْدُ كَرَاهَةَ التَّحْرِيْمِ اور مکروہ تحریمی بدرجۂ حرام ہے۔ مدارج النبوت میں بھی یہی اشارہ ہے اور قانون اسلامیہ کے مطابق۔ اجماعِ امت حجتِ قطعیہ ہے، جیسا کہ ابھی تفسیرات احمدیہ کی عبارت پیش کی۔ اور حجتِ قطعیہ سے حرمتِ قطعیہ ثابت ہو جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ قوالی حرام قطعی ہے۔ مصنف صاحب بھی احیاء العلوم کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں کہ امام شافعی کی روایت میں دف مع جلاجل بجانا جائز ہے۔ احیاء العلوم کی یہ عبارت میری نظر سے نہ گزری۔ مصنف ص۳۷ پر فرماتے ہیں۔ سُئِلَ أَبُوْحَنِيْفَةَ رح وَسُفْيَانُ ثَوْرِي رح عَنِ الْغِنَاءِ فَقَالَا لَيْسَ مِنَ كَبَائِرِ وَلَا مِنَ الصَّغَائِرِ (بحوالہ تذکرۂ حمدونیہ) ہم پہلے صفحات پر طبری کی عبارت پیش کر چکے ہیں کہ أَمَّا أَبُوْحَنِيْفَةَ رض كَانَ يَكْرَهُ ذَالِكَ وَيَجْعَلُ سِمَاعَ الْغِنَاءِ مِنَ الذُّنُوْبِ وَكَذَالِكَ سَائِرُ أَهْلِ الْكُوْفَةِ سُفْيَانُ ثَوْرِي وَحَمَّادُ وَإِبْرَاهِيْمُ (الخ) دیکھیے! دونوں عبارات میں کتنا تعارض۔ تفسیرات احمدیہ ص۲۳۵ پر ارشاد ہے۔ کہ حلّت اور حرمت کی دو طرفہ دلیلیں ملتی ہوں تو حرمت کی دلیل معتبر ہو گی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔ وَإِذَا نَظَرْتَ إِلَى مَا بَطْنِ الْأُصُوْلِ يُوْجِبُ حُرْمَتَهُ أَحَدُهُمَا أَنَّهُ إِذَا تَعَارَضَ الْمُبِيْحُ وَالْمُحَرِّمُ كَانَ الْعَمَلُ بِالْمُحَرِّمِ أَوْلٰى۔ آگے چل کر مصنف صاحب اقوالِ صوفیاء ذکر فرماتے ہیں جس میں مصنف بہت جگہ زیادتی بھی کر جاتے ہیں اللہ ہدایت دے) چنانچہ ص۳۷ پر فرماتے ہیں کہ مدارج النبوت باب التغنی جلد اوّل میں ہے۔ "امام اعظم کے ہمسایہ میں ایک (مراثی) عمر نامی تھا۔ وہ ہر رات کو آلات کے ساتھ غنا کرتا تھا۔

اقول یہ مصنف کی زیادتی ہے۔ مدارج النبوت باب التغنی میں آلات کا ذکر نہیں صرف جلد اوّل ص۲۴۵ پر یہ ہے کہ وہ ہر رات غناء کرتا تھا۔ چنانچہ عبارت اس طرح ہے۔

"و نقل کردہ اند کہ امام ابوحنیفہ را ہمسایہ بود کہ ہر شب بر میخاست و تغنّی میکرد (الخ)

یہاں کہیں بھی مزامیر کا نام تک نہیں۔ **ترجمہ**۔ یہ کہ امام صاحب کا ایک ہمسایہ تھا جو کہ ہر رات گانے گایا کرتا تھا۔ مصنف نے اپنے پاس سے آلات کا نام لے کر کتنی بڑی خیانت کی ہے واضح رہے کہ مدارج کے مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی نہ فقہاء میں شامل نہ صوفیاء میں

بلکہ آپ محدثین میں ہیں۔ شریعت کی دلیل نہ صوفی کا قول ہے نہ محدث کا۔ بلکہ اسرار میں صوفی کی بات معتبر احادیث میں محدث کی احکام میں فقہاء کی اس تقسیم کو قائم رکھو گے تو فتنہ ختم ہو گا اور پھر حضرت محدث دہلوی نے قوالی کے بارے اپنا کوئی حکم نافذ نہیں کیا بلکہ جس طرح دو بیٹے جھگڑا کریں تو باپ اپنی حکمتِ عملی سے کچھ ایک کی کچھ دوسرے کی تائید کر کے صلح کرا دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت شیخ نے فقہاء اور صوفیاء میں اس طرح صلح کرائی کہ فقہاء کو کچھ سختی سے منع فرمایا اور صوفیاء کو حکم دیا کہ تم اپنی قوالیاں درست کر لو۔ جو حکایت و دلائل و عبارات شیخ علیہ الرحمتہ نے نقل فرمائے وہ سب ایک کتاب غیر معتبر سے نقل فرما دئے۔ خود تحقیق نہیں کی اس کتاب کا نام (تذکرہ) ہے اور شیخ نے مصنف کو صاحبِ تذکرہ کے لقب سے متعدد جگہ یاد کیا۔ اور یہ کتاب محققین کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں۔ خود حضرت شیخ بھی اس پر کامل جزم نہیں رکھتے۔ خود بعض جگہ فرماتے ہیں کہ ایں روایت بے توثیق قبول نتواں کرد چہ از حدِ خود تجاوز نمودہ است۔ ثابت ہوا کہ جاہل صوفیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ اپنی بات منوانے کے لیے خیانتیں بھی کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ اس رسالے کے مصنف نے کیا اور جھوٹی من گھڑت حکایات بھی بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ مدارج نے ثابت کیا۔ اس لیئے محدثین کے نزدیک صوفی روایت معتبر نہیں۔ دیکھو اصولِ حدیث کی کتاب مصنف صاحب

ص۱۴۱ پر لکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ ابو یوسف سے منقول ہے کہ وہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد تھے۔ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حسن علیہ السلام کہنا یا تو کاتب کی غلطی ہے یا مصنف نے خود لکھا ہے اگر خود لکھا تو ثابت ہوا کہ مصنف اس بات سے بےخبر ہیں کہ یہ رافضیوں شیعوں کا ہی طریقہ ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک بجز انبیاء و ملائکہ کسی کو علیہ السلام کہنا جائز نہیں۔ چنانچہ مسلم شریف جلد اوّل ص۱۸ وَكَذٰلِكَ يُكْتَبُ عِنْدَ ذِكْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَذٰلِكَ يَتَرَضّٰى۔ قَالَ۔ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ۔ یعنی صحابہ کرام کو صرف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا جائے۔ درّ مختار جلد پنجم ص۳۴۹ پر فرماتے ہیں:۔ وَكَذَا لَا يُصَلِّيْ عَلٰى اَحَدٍ اِلَّا عَلَى النَّبِيِّ۔ اَيْ اِسْتِقْلَالًا۔ یعنی انبیاءِ کرام کے سواء کسی اور پر درود بھیجنا منع ہے۔ لفظ عَلَيْهِ السَّلَامُ بھی دورد شریعت کے درجے میں ہے۔ اسی لیئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سن کر صرف علیہ السّلام کہہ دینا وجوب کو ادا کر دیتا ہے۔ بہت جگہ صرف فرشتوں کے لیئے اور انبیاءِ کرام کے لیئے علیہ السلام کہنا کافی ہوتا ہے۔ کیونکہ علیہ السّلام کا لفظ حقیقتًا درود شریف کے لیئے مختص ہے چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۲۲۸ پر ہے:۔ وَاَمَّا السَّلَامُ فَهُوَ رَفِيْ

مَعْنَی الصَّلَاۃِ۔ صحابہ کرام کو رحمۃ اللہ علیہ بھی نہ کہا جائے۔ چنانچہ نسیم الریاض جلد سوم صفحہ نمبر ص۴۹۲ پر ہے:۔ لَا یُقَالُ لِلصَّحَابَۃِ رَحِمَہُ اللّٰہُ بَلْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ :۔ امام حسنؓ بھی صحابی ہیں ان کو بھی علیہ السلام کہنا جائز نہیں۔ یہ رافضیوں کا طریقہ ہے کہ وہ انبیاء کے مخصوص لفظ بھی صحابہ و اہلِ بیت کے لیے استعمال کر دیتے ہیں اور شیعوں کی علامات سے بچنا لازم ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۲۲۸ پر ہے:۔ لَا یُقَالُ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ۔ لِتَادِیَتِہٖ اِلَی اتِّھَامٍ بِالرَّفْضِ۔ یعنی غیر نبی کو اَللّٰھُمَّ صَلِّ وغیرہ نہ کہو۔ تاکہ تم کو شیعہ ہونے کی تہمت نہ دی جائے۔ آگے فرمایا وَ قَدْ نُھِیْنَا عَنْ شِعَارِھِمْ یہی وجہ ہے:۔ کہ علیہ السلام بھی کسی غیر نبی غیر ملک کو کہنا منع ہے۔ چنانچہ شیخ اسماعیل حقی فرماتے ہیں صفحہ نمبر ص۲۲۸ پر:۔ وَ اَمَّا السَّلَامُ فَھُوَ فِیْ مَعْنَی الصَّلَاۃِ فَلَا یُسْتَعْمَلُ لِلْغَائِبِ وَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ فَلَا یُقَالُ عَلِیٌّ علیہ السلام کَمَا تَقُوْلُ الرَّوَافِضُ وَ تَکْتُبُہٗ۔ اسی طرح فتاوےٰ کبیری شرح منیہ ص۲ پر ہے مدلل اور بالتحقیق ثابت ہو گیا کہ اہل سنت کے نزدیک حسن علیہ السلام کہنا سخت ناجائز ہے۔ مصنف یا تو درپردہ شیعہ ہے اور یا غیر عالم ہے اور یا کاتب کی غلطی ہے۔ مصنف نے اسی ص۴۱ پر جنید بغدادیؒ کی توبہ از قوالی کا جواب دیتے ہوئے خواجہ ابو یوسف کا ایک قول نقل کیا ہے کہ جنید بغدادی نے اس لیے توبہ کی کہ قوالی سے اُن کو وجد آتا تھا اور سخت صدمات آتے تھے۔ اس لیے توبہ تھی نہ کہ قوالی کی حرمت کی وجہ سے۔ اقول۔ مصنف صاحب یا خواجہ یوسف کا منسوب ابو بکر شبلی کا اپنا اختراعی احتمال ہے۔ اس طرح تو ہر شخص اپنا اپنا خیال ظاہر کر سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ نے ردالمحتار جلد پنجم ص۳۰۹ پر معصیت اور حرمت ہی احتمال ظاہر کیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہی حق ہے تین وجہ سے۔

نمبر ۱:۔ کیونکہ روایت ہے:۔ تَابَ جُنَیْدٌ عَنِ السَّمَاعِ۔ حضرت جنید نے قوالی سے توبہ کی۔ اور باعتبار منقول عرفی کے توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے: ۲۔ ابو بکر شبلی کا احتمال غلط ہے اس لیے کہ صدمات دو قسم کے ہو سکتے ہیں یا دینی کہ اس وجد سے فرائض میں کوتاہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مصنف نے خود بھی شک ظاہر کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وجد حرام اور غیر شرعی ہے:۔ کیا معاذ اللہ جنید بغدادی توبہ سے پہلے اتنے عرصے حرام کام میں مبتلا رہے اور فرائض میں کوتاہی کرتے رہے جو اشد حرام ہے۔ صوفیاء عظام کے نزدیک سچا وجد وہ ہے: جو نماز کو نہ روکے جیسا کہ اعلیحضرت نے ملفوظات میں اور خود مصنف نے ص۴۳ پر بیان کیا تو کیا مصنف کے نزدیک حضرت جنید کا وجد جھوٹا تھا جو دیگر عبادات میں فرق کرتا اور یا یہ صدمہ دنیوی تھا کہ وجد سے ہاتھ پیر میں چوٹ آ جاتی تھی۔ زخم آتے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو معاذ اللہ مصنف نے

حضرت جنیدؒ کی گستاخی کی۔ کہ حضرت جنید جیسے ولی کامل کو بزدلوں کے زمرے میں شامل کر رہے ہیں کہ جب عشقِ الٰہیہ میں منصورؒ نے پتھر برداشت کیے سولی قبول کی۔ عشق کی لذت سے دست بردار نہ ہوئے۔ شمس تبریزی نے کھال کھنچوالی مگر پیچھے نہ ہٹے بڑے بڑے اولیاء تو درکنار مبتدی حضرات کو بھی جب لذتِ عشق کا سرور آتا ہے تو ہاتھ پیر بھی اگر ٹوٹ جائیں پھر بھی اس لذت سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ اگر قوالیوں سے وجد اور عشقِ الٰہی حاصل ہونا تھا تو کیا جنید علیہ الرحمت نے عشقِ الٰہیہ کے راستے سے توبہ کر لی۔ حضرت جنیدؒ کی بارگاہ میں ابوبکر شبلی یا مصنف کی کتنی بڑی زیادتی اور گستاخی ہے، بلکہ توبہ کا مقصد یہ ہے۔ کہ شروع ہی سے حضرت جنیدؒ نے قوالی کو برا سمجھا۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا اَنَا اَوَّلُ التَّائِبِیْن ؛ مقصد یہ ہے کہ شروع سے پرہیز۔ یا مراد ہے۔ کہ حضرتِ جنیدؒ نے اسرارِ الٰہیہ کے جس مقصد کے لیئے ایک دو دفعہ قوالی سنی وہ تو حاصل نہ ہوا بخلاف اس کے اغیار نے حضرت جنیدؒ کے قوالی سننے سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حرام قوالیوں میں مشغول ہو گئے اور اپنے اِس فعل حرام کے لیئے دلیل حضرت جنید کو بنا لیتے تھے۔ جیسا کہ مصنف مذکور اپنی حرام قوالیوں کے لیئے، امام غزالی محدث دہلوی جیسے اکابرین کو دلیل بنا رہے ہیں۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ بھی۔ موجودہ قوالیاں اور موجودہ قوالوں کو دیکھ لیتے تو جنید بغدادیؒ کی طرح توبہ کر لیتے۔ مصنف مذکور صـ۲۴ پر سفینۃ الاولیاء کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ لکھتے ہیں کہ آپ ہمیشہ وجد و سماع کا وعظ فرمایا کرتے۔

اقول: مصنف صاحب کی دلیری دیکھئے کہ سفینۃ الاولیاء صـ۱۲۲ پر ہے۔ حضرت شیخ کی مجالس میں وعظ و تلقین کے سلسلے بجا تھے۔ صاحبِ سفینۃ الاولیاء پھر لکھتے ہیں کہ سماع کے جملہ آداب کیا تھے۔ وہی جس کا ذکر اعلیحضرت رحمتہ اللہ تعالےٰ علیہ ملفوظات حصہ اول صـ۱۰۱ پر فرماتے ہیں (عرض) کیا یہ روایت صحیح ہے۔ کہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قبر شریف میں ننگے سر کھڑے گانے والوں پر لعنت فرما رہے تھے (ارشاد) یہ واقعہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ہے۔ اب تو لوگوں نے بہت اختراع کر لیے ہیں۔ اس وقت تو بارگاہوں پر مزامیر بھی نہ تھے۔ سبحان اللہ یہ ہیں جملہ آداب۔ یعنی بغیر مزامیر سماع کو ہماری اصطلاح میں نعت خوانی کہا جاتا ہے۔ مصنف صـ۴۲ پر حضرت مودود چشتیؒ کا خود ساختہ واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے جب مودود صاحب بخارا تشریف لائے تو حاسدین علماءِ بخارا مسئلہ سماع میں بحث کے لیئے جمع ہو گئے۔

اقول :- مصنف کو ذرا خیال نہیں کہ علمائے اسلام۔ جو اسلام کے نیر تاباں بلکہ رونق اسلام ہیں۔ ان کو صرف ایک مسئلے کی تحقیق و بحث کرنے کی بنا پر۔ حسد جیسی حرام چیز کی تہمت لگا کر گستاخی کا ارتکاب کر رہے ہیں مصنف مذکور کو معلوم ہونا چاہیئے علمائے کرام کے دم سے ہی اسلام کی بہاریں ہیں بلکہ صوفیاء کا وجود بھی علمائے اہل سنت کے دم قدم سے ہے جہاں کے عالم گمراہ ہو گئے وہاں کی عورتوں نے صوفی جننے چھوڑ دیئے۔ دیکھو دیوبند وہاں کوئی صوفی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں کے عالم بگڑ گئے۔ اور شرعی مسئلے کے مقابل کرامت دکھانا بڑی جہالت ہے خواجہ صاحب کو حلت کی دلیل دینی چاہیئے تھی۔ ثابت ہوا کہ یہ سب مصنف کی اپنی اختراع ہے ورنہ یاد رکھو اولیاء اللہ کو کرامات اس لیئے نہیں دی جاتی کہ وہ شعبدے دکھا کر اپنا قائل کرتا پھرے اور مسائل شرعیہ کا مقابلہ کرے ہاں اس لیئے کہ جادو اور کفر کا مقابلہ کرے۔ اور پھر یہ حکایت خزینۃ الاولیاء میں ہے بھی نہیں مصنف صاحب اپنے رسالہ مزیلۃ النزاع صـ۴۳ پر فرماتے ہیں کہ شیخ ابو احمد نامی کسی من گھڑت شخص کے ساتھ علماء حاسدین نے مسئلہ غناء پر مناظرہ شروع کیا۔ تو آپ نے اپنی کرامت سے اپنے جاہل خادم کو علماء کا علم سلب کر کے دے دیا اور جاہل خادم کو تمام علوم کا عالم بنا دیا۔

اقول :- مصنف نے اس کا کوئی حوالہ نہ دیا۔ کتنی لغو اور واہیات بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی عقل ماری گئی ہے۔ اگر کرامت سے علم آیا کرتا تو امام اعظم، غوث پاک اور شیخ سعدی، امام غزالیؒ وغیرہ اولیائے کاملین کو استادوں کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ غوث پاک جیسی سردار اولیاء ہستی مدرسہ نظامیہ میں علمائے کرام سے درس لیتی۔ اور پھر ابو احمد کو خود تو علم آیا نہیں خادم کو علم دیدیا۔ گویا کہ خود جاہل رہا۔ خادم عالم بن گیا۔ اور یہاں تو صرف ایک بحث کا معاملہ ہے۔ حضرت منصور کو تو علمائے حق نے سولی پر چڑھا دیا۔ انھوں نے اپنی کرامت سے کیوں نہ علم سلب کیا اور خود مصنف نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ کہاں سے حاصل کیا ان کو کسی صوفی نے آن کی آن میں کیوں نہ عالم بنا دیا۔ دنیا بھر کے تمام علماء نے بھی اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی علم حاصل کیا۔ سب علمائے کرام اسی طرح عمریں صرف کر کے ماریں کھا کر ایڑیاں رگڑ کر ہی عالم بنتے ہیں۔ کسی کو ابو احمد جیسا صوفی نہیں ملتا بڑے بڑے اولیاء اللہ کے صاحبزادگان بھی علماء کرام کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی علم کی دولت حاصل کرتے ہیں ان کو کرامت سے کیوں نہیں عالم بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ حکایات بالکل جھوٹ ہیں صـ۴۵ پر خواجہ نقشبند کے متعلق یہ منقولہ منسوب کیا ہے کہ "نہ انکار میکنم و نہ اقرار میکنم۔ حالانکہ یہ مجدد صاحب کا فرمودہ ہے۔ مصنف نے صـ۴۷ پر ایسی بات لکھی جو ایک جنتی مسلمان عالم کے لیئے قطعاً جائز نہیں :-

حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے، حضرت خضر کو غیر نبی ولی تصور کرتے ہوئے۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام کا علم کم اور حضرت خضر علیہ السلام کا علم زیادہ مانتے ہیں۔ اور معاذ اللہ

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شاگردوں کا درجہ دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ "اہل اللہ کے رازوں کو سمجھنا انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ کے لیے مشکل ہے"۔ (استغفر اللہ، نعوذ باللہ من ھذا القول المردود والملعون) ایسی ہی جہالت کی باتیں ہیں جن سے نئے نئے فرقے جنم لیتے ہیں۔ قاسم نانوتوی دیوبندی نے خاتم النبیین کا ترجمہ غلط کیا تو مرزائیت نے جنم لیا۔ اور جب جاہل صوفیوں نے ایسے فقرے لکھنے اور چھاپنے شروع کر دیئے تو نہ معلوم کون سا بے دین فرقہ سر ابھارے جو معاذ اللہ صاف طور پر اولیاء اللہ کو یا بے دین صوفیوں کو انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ درجہ دے دیں خدارا کچھ تو خیال کرو قوم پہلے ہی ایسے فقروں سے بہت گمراہ ہو چکی ہے۔ مزید لغو بیہودہ رسائل کو چھاپ کر ان کو جہنمی نہ بناؤ نہ خود جہنمی بنو۔ مسلمانوں حاشا حاشا کسی اہلسنت کا یہ عقیدہ نہیں نہ یہ قول اہلسنت کے علماء کا ہے۔ یہ کسی جاہل صوفی کا ہے۔ اہلسنت کا مسلک واضح ہے کوئی امتی خواہ کسی نبی کا ہو۔ غوث ہو یا قطب، عالم یا مجتہد کسی نبی محترم سے کسی علم میں زیادہ نہیں ہو سکتا بلکہ گردِ راہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ اولیاء تو انبیاء کرام کے گردِ راہ کے ذرے ہیں۔ اللہ کریم کی بارگاہ میں جو شان انبیاءِ کرام کا ہے کسی کا نہیں۔ انبیاء کرام گویا آفتاب ہیں تو اولیاء سے عظام ان کے چمکتے دمکتے ذرے۔ ولیوں عالموں کو جو کچھ ملتا ہے انبیاء کے در کی گدا ہوتی ہے خواہ جنید بغدادی ہوں یا ان کے مرید اولیاء کے سردار حضور غوث پاک ہوں۔ اہل اللہ کون ہے؟ اہل اللہ تو یہی انبیاء کرام ہیں مصنف جن کو اہل اللہ سمجھتا ہے وہ انبیاء کرام جیسی اہل اللہ ہستیوں کے غلاموں کے غلام ہیں۔ اولیاء اللہ تو خدا تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک انبیاء سے عظام کے قدم سے وابستہ نہ ہوں۔ رب تعالیٰ اپنے سب راز انبیاء کرام کو درجہ بدرجہ بتاتا ہے۔ پھر انبیاء کی خوشہ چینی سے اولیاء اللہ کو اس بحر بیکنار کا قطرہ میسر ہوتا ہے۔ مصنف حضرت خضر علیہ السلام کے جس واقعے سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ انبیاءِ کرام کا آپس کا ایک مخصوص واقعہ ہے۔ یاد رکھو کہ حق یہ ہے کہ خضر علیہ السلام بھی نبی ہیں جن لوگوں نے آپ کو ولی کہا ہے وہ بالکل غلط اور لغو ہے۔ ان کے دلائل بیہودہ ہیں مصنف صاحب ایک باطل قول کا سہارا لے کر صرف جاہل صوفیوں کو حضرت خضر کی صف میں شامل کر کے نبوت سے ٹکرانا چاہتے ہیں اور پیری کی دکانداری کے لیے ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں مصنف کی انہیں باتوں کا سہارا لے کر پیر پرست فقراء کا ٹولہ قرآن و حدیث شریعت و علماء کرام کے متعلق بڑی بڑی گستاخی آمیز باتیں کہہ دیتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا مقام تو بہت بلند ہے۔ حضرت خضر کا علم تو حضرت ہارون علیہ السلام کے برابر بھی نہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی رسول اور مرسل ہیں حضرت ہارون نبی اور رسول ہیں اور حضرت خضر صرف نبی ہیں۔ قرآن مجید کا یہ واقعہ محض ایک مخصوص چیز کا اظہار کرنے کے لیئے ہے ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم حضرت خضر سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ علامہ شیخ احمد اپنی تفسیر صاوی جلد سوم ص۱۸ پر فرماتے ہیں وَھٰذَا مِنْ بَابِ عِتَابِ الْاَحْبَابِ تَادِیْبًا لِمُوْسٰی وَاِلَّا فَالْوَاقِعُ اَنَّ مُوْسٰی اَعْلَمُ مِنَ الْخِضْرِ یعنی

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو محبت کا عتاب فرمایا صرف اس چیز کا ادب دینے کیلئے آپ نے علم کی زیادتی کو آنا کہہ کر اپنی طرف کیوں منسوب کیا چاہیئے تھا کر رب تعالیٰ کی طرف منسوب فرماتے۔ ایک آزمائش تھی کہ حضرت خضر کے پاس بھیجا۔ ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُنسے بہت زیادہ عالم ہیں یہ ایک امتحان تھا اسی لیئے حضرت موسیٰ باوجود نبی (غیب داں) ہونے کے مچھلی کا ڈوبنا بھی اپنے علم غیب سے اُس وقت نہ جان سکے اور پھر حضرت خضر کے چل کر تو بہت سی غیب کی خبریں دے رہے ہیں مگر یہاں حضرت موسیٰ کو پہچانا بھی نہیں۔ جیسا کہ روایتوں سے ثابت ہے حالانکہ حضرت موسیٰ نے بغیر پہلے دیکھے ہوئے باوجود اجنبیت کے اپنے علم غیب سے حضرت خضر کو پہچان لیا مگر آگے کے مکاشفات محو کر دیئے گئے صرف امتحان کیلئے اور جو باتیں حضرتِ خضر نے بتائیں وہ کوئی اسرارِ طریقت یا معرفت کے راز نہ تھے جس کو اہل اللہ سے راز کہہ کر حضرت کلیم کی گستاخی کی جائے، بلکہ غیب اور کشف کی چند خبریں تھیں منشاء باری تعالیٰ یہ تھا کہ اے میرے پیارے کلیم اگرچہ آپ کو علم غیب و کشف دیئے گئے مگر اتنے علم کو انتہائے علم نہ سمجھنا۔ بلکہ بہت کشف اور غیب ایسے بھی ہیں جو آپ کو نہیں دیئے گئے اسی طرح بہت سے وہ غیب جو موسیٰ علیہ السلام کو ملے۔ وہ حضرت خضر علیہ السلام کو نہ ملے۔ جب یہ بات ذہن نشین کرا دی تو حضرت موسےٰ علیہ السلام کو واپس بلا لیا۔ نہ کچھ مزید دیکھا نہ کچھ سیکھا۔ نہ شاگردی کی نہ استادی۔ مصنف مذکور اس واقعے سے اور ہی ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ صفحہ ۲۴ پر لکھتے ہیں اس لیئے آخر میں کے سے خائف ہو کر اہلِ تصوف کی شان میں بے ادبی سے بچنا چاہیئے۔ اقول۔ یعنی صحابہ کی گستاخی ہو تو کوئی بات نہیں۔ حضرتِ موسیٰ کی بے ادبی ہوتی ہے تو ہو قرآن و حدیث کی تحریف بیشک ہوتی ہے مگر اہل تصوف کی شان میں بے ادبی نہ ہونے پائے واہ ری پیر پرستی و باطل نوازی اور واہ ری قوالی کی چمک۔ آگے فرماتے ہیں یعنی جن حضرات کیلیئے غنا کو جائز لکھا ہے وہ وہی ہیں جو صحیح معنیٰ میں اس کے اہل ہوں الخ (اقول) مصنف صاحب اب آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اہل اور نااہل کی قیدیں لگائیں۔ جبکہ پہلے اپنے استدلال میں قرآن و سنت کو توڑ مروڑ کر مطلقاً قوالی ہر شخص کے لیئے بر سر عام سڑکوں اور گلیوں پر جائز کر دی۔ صفحہ ۵۴ پر مصنف صاحب، غالباً خود اپنے استدلالات کی کمزوری بھانپ گئے اسلیئے فرماتے ہیں کہ کہیں کوئی میری اس کمزوری کو تحریر میں لا کر شائع نہ کر دے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ قال۔ اگر کسی صاحب کو میرے خیالات کے ساتھ اختلاف ہو تو وہ قبل اس کے کہ میرے جواب میں نوکِ قلم کو جنبش دیں۔ اپنے تمام اعتراضات اور جملہ شکوک و شبہات سے مجھ کو مطلع فرمادیں:۔ اقول:۔ کیوں صاحب جب آپ نے یہ رسالہ لکھا اور احادیث کو توڑ مروڑ اور غلط حوالے تحریر کرنے کے لیئے نوکِ قلم کو جنبش دینے کی نیت فرمائی تو کیا کسی ذی علم یا علماء اہلسنت ذی فضل حضرات سے اپنے شکوک و شبہات بیان کرنے کی زحمت گوارہ فرمائی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ اگر آپ ایسا کرتے تو وہ ہی آپ کی پوری تسلی کر دیتے اور ایسی فتنہ انگیز تحریر کی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ بعد میں جو آپ خفیہ رجوع کرنے کا ارادہ فرما رہے ہیں۔

تو پہلے ہی مصرعہ "چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"! حضرتِ مصنف اپنے رسالے مزیلۃ النزاع کے صفحہ ۲۸-۲۹ پر لکھتے ہیں تکملہ بحر الرائق کا حوالہ دیتے ہوئے:۔ اَلْغِنَاءُ وَالرَّقْصُ وَسَمَاعُ الْقَصَبِ لِلشَّرْعِيَّةِ لَا اللَّهْوِ فَلَيْسَ فِيْهِ اِخْتِلَافُ الْفُقَهَاءِ وَهٰكَذَا الْاُجْرَةُ الْمُغَنِّيْ بِلَا شَرْطٍ حَلَالٌ۔ (تکملہ بحر الرائق وفتاوٰے ابی اللیث) یہ عبارت تکملہ بحر الرائق میں قطعاً نہیں ہے۔ بلکہ صفحہ ۲۰۸ تکملہ بحر جلد ہشتم میں وَيُكْرَهُ اِسْتِمَاعُ صَوْتِ اللَّهْوِ وَالضَّرْبِ بِهٖ وَالْوَاجِبُ عَلَى الْاِنْسَانِ اَنْ يَّجْتَهِدَ مَا اَمْكَنَ حَتّٰى لَا يَسْمَعَ۔ مصنف نے کتنی زیادتی سے کام لیا۔ اور بحر الرائق کا غلط نام استعمال کر کے کوئی ایمانی کام نہیں کیا

فتاوی ابی اللیث میں فرضِ محال اگر یہ عبارت ہو بھی تو غلط ہے۔ اس لیئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ناچ گانے کی حلت میں اختلاف نہیں۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ ابھی تحقیق سے ثابت کر چکا ہوں کہ اختلاف ہے، بلکہ اکثریت اس کی حرمت پر ہے جیسا کہ مدارج اور شامی کے حوالے درج کر دیئے گئے۔ مصنف مذکور کی یہ زیادتیاں تھیں جس میں کسی قسم کی گنجائش نہیں ورنہ حقیقت دیکھی جائے تو سب کتاب مذکور ہی غلط ہے۔ در قابلِ توبہ و رجوع اگر اب بھی مصنف صاحب رجوع نہ کریں تو الی اللہ المشتکیٰ

خلاصۂ کلام :۔

قوالی نہ سنتِ نبی کریم ہے نہ سنتِ صحابہ نہ تابعین۔ نہ شعارِ اسلام نہ عبادتِ لعینہ نہ ریاضتِ عمومیہ نہ زہد نہ تقوای۔ بلکہ قوالی بدعت ہے جو اہل کے لیئے حسنہ ہے اور نااہل کے لیئے بدعتِ سیئہ۔ اہل وہی ہے جو فقہاء کی بیان کردہ چھ شرطیں اپنے میں پیدا کرے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ۔ میں ابھی اسی رسالے کی تردید میں مشغول تھا کہ مجھ کو ایک صاحب نے حضرتِ قبلۂ عالم جناب علاّمہ مولانا عطا محمد صاحب بندیالوی کا رسالہ مسئلے قوالی کی شرعی حیثیت پیش کیا اور مجھے جواب کے لیئے کہا۔ میں نے سرسری طور پر مطالعہ کیا کہ شاید کوئی دلیل کارآمد نظر آئے مگر اس میں بھی وہی چشم پوشیاں ہیں جن کی وضاحت و تردید کر دی گئی۔ زبانی طور پر سمجھا دیا گیا۔ تحریری جواب کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ وقت کا ضیاع ہے۔ علامہ بندیالوی مدظلہ اگرچہ منطق کے بحرِ بیکراں کے عظیم تیراک ہیں۔ اور دریاءِ فلسفہ کے شناور ہیں۔ اگر آپ کو معقولات کا استادِ کامل یا فلسفے کا امام کہا جائے تو بے جا نہ کہا جائے گا۔ بلکہ یہ حقیقتِ مسلّم ہے۔ ہم جیسے اصاغر علامہ بندیالوی کے گلستانِ منطق کے خوشہ چین ہیں اور فلسفے میں بڑے بڑے استاد ان ہی کے کاسہ لیس ہیں۔ مگر فقہ اسلامیہ میں پیرِ طریقت سیّد قبلہ ابوالبرکات اور شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب کا ہی مقام ہے۔ امامِ فقہ کا لقب تو امام اہلسنت اعلیٰحضرت اور صدرالافاضل مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو ہی زیبا ہے۔ علامہ بندیالوی کا قول منطق اور فلسفہ میں تو حجت ہو سکتا ہے مگر فقہ میں ان کا قول قابلِ حجت نہیں۔ حضرت قبلہ بندیالوی مدظلہ کے رسالے کی صرف دو باتوں کا ذکر کرتا ہوں جس سے رسالے کی کمزوریوں کا بخوبی علم ہو جائے گا۔

نمبر ۱ :۔ رسالہ ہٰذا کی ابتداء ۱۵ سے ہوتی ہے۔ اسی صـ۱۵ پر چار مقدمے درج ہیں پہلا مقدمہ میں فرماتے ہیں۔ حرمت کے لیئے دلیل قطعی ضروری ہے۔ دلیل ظنی سے ثابت نہیں ہوتی۔ اور خبرِ واحدِ مفیدِ ظن ہے یہ ہے پہلا مقدمہ۔ جواب۔ کاش مصنف محترم لکھتے وقت فقہ اور اصولِ فقہ کی کتاب پڑھ لیتے۔ کم از کم اس مقدمے کو لکھنے سے پہلے علامہ شامی کی کُتُب اور تلویح توضیح کا ہی مطالعہ فرما لیتے تو ایسی خطاءِ مطلقہ کا صدور نہ ہوتا۔ قانون شریعت کے مطابق حرام دو قسم کا ہے ۱ حرام قطعی ۲ حرام ظنی۔ حرام قطعی جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ حرام ظنی جو دلیل ظنی سے ثابت ہو اسی کو مکروہ تحریمی بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی ردّالمحتار جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۲۲

پر فرماتے ہیں۔ وَعَلَی الْمَکْرُوْہِ تَحْرِیْمًا وَھُوَمَا کَانَ اِلَی الْحَرَامِ اَقْرَبُ وَیُسَمِّیْہِ مُحَمَّدٌ حَرَامًا ظَنِّیًّا۔ تلویح توضیح ص۲؎ پر ہے۔ وَالتَّحْرِیْمُ عِنْدَہٗ قِسْمٌ مِّنَ الْحَرَامِ (الخ) (حاشیہ) اور حرام ظنی دلیل ظنی سے ثابت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تلویح شرح توضیح ص۲؎ پر ہے:۔ وَبِدَلِیْلٍ ظَنِّیٍ مَکْرُوْہٌ کَرَاھَۃَ التَّحْرِیْمِ اور چونکہ خبرِ واحد ظن کو مفید جیسا کہ مصنف محترم کو تسلیم۔ لہٰذا خبرِ واحد دلیل ظنی ہوئی جس سے حرمت ثابت ہے۔ پس خبرِ واحد سے بھی حرمتِ قوالی ثابت ہو جاتی ہے۔ حالانکہ قوالی کی حرمت میں تو دلائلِ قطعیہ بھی بیان کر دیئے گئے،

دوسرا مقلالطہ:۔ فرماتے ہیں ’’کسی چیز کے شرائط مقرر کرنا شارع جَلَّ جَلَالُہٗ یا شارع عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا حق ہے‘‘ ہم اپنے طور پر حلال اور حرام شرائط مقرر کرنے کا ہرگز حق نہیں رکھتے۔ شرائط دو قسم کی ہے ۱ شرائط اولویۃ ۲ شرائطِ جواز۔ کتبِ فقہاء کی شرائط: شرائطِ اولویت ہیں:۔ نہ کہ شرائطِ جواز۔ **جواب:۔** علامہ صاحب کی یہ تینوں باتیں خود ساختہ اور لغو ہیں۔ پہلی بات ’’کسی چیز کے شرائط مقرر کرنا (الخ) شارع جَلَّ جَلَالُہٗ‘‘ یہ اصطلاح فقہاء علماء کے خلاف ہے سب آئمہ۔ لفظ شارع حضور علیہ السلام کے لیئے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شارع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے۔ آئمہ مجتہدین بھی حلت و حرمت کی شرطیں لگا سکتے ہیں اس لیئے فقہائے کرام نے خاوند کے لیئے نکاح میں بھی چند شرطیں لگائیں اور فرمایا کہ اگر وہ شرطیں۔ نہ پائی جائیں تو نکاح کرنا بھی حرام ہو جائے جیسا کہ پہلے سبل السلام شرح بلوغ المرام کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اور جس طرح شریعت کی دلیل قرآن و حدیث ہے اسی طرح اجماعِ امت اور قیاس بھی۔ مجتہد اپنے قیاس سے حلت و حرمت کے لیئے شرطیں لگا سکتا ہے۔ ہاں ماوشما واقعی اس چیز کے مجاز نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ نکاح کے لیئے تو کسی نہ کسی آیت سے اشارہ ملتا ہوگا اُس اشارہ سے شرطیں لگیں۔ تو میں کہوں گا کہ فقہائے امت جو کچھ بھی فرماتے ہیں اپنی طرف سے بالکل کچھ نہیں ہوتا ہر جگہ کسی اشارۃ النص یا عبارت النص یا دلالۃ النص یا اقتضاء النص سے ہی بات کرتے ہیں۔ اسی طرح حرمتِ قوالی عام ہے مگر حلت کے لیئے شرائط کسی نص سے ہی ہے۔ یہ مذکورہ قاعدہ مصنف نے اپنے گھر سے بنا لیا۔ دوسری بات بھی غلط ہے کیونکہ در باب قوالی منقول شرائط میں سے کوئی شرطِ اولویت نہیں۔ تیسری بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ علامہ شامی حلتِ قوالی کی شرائط بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں۔ شامی جلد پنجم ص۳۰۶ وَالْحَاصِلُ اَنَّہٗ لَا رُخْصَۃَ فِی السَّمَاعِ فِیْ زَمَانِنَا یعنی ان شرطوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قوالی کرنے اور سننے کی اجازت ہی نہیں۔ ثابت ہوا کہ شرائطِ جواز ہیں نہ کہ اولویت۔ یہ تھیں علامہ بندیالوی کے رسالے کی کچھ چشم پوشیاں۔ مجھ کو حیرانگی اور افسوس ہے کہ میرے اکابر کو کیا ہو گیا جو ایسی کچی باتیں کرتے ہیں

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

فال نکالنے کا بیان اور شرعی حکم

سوال نمبر ۲۰ :- فال نکالنا اور نکلوانا کیسا ہے۔ جائز ہے یا نہیں اور علم جفر اور علم ابجد کی کیا حقیقت ہے اور ہر ایک کا کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں اور اُن کا ثبوت قرآن حدیث میں ہے یا نہیں قرآنی آیت کا متن نقل کیا جائے۔ ۲- :خواب کی کیا حقیقت ہے کیا دن میں جو انسان خیالات اور تصوارت کرتا ہے خواب میں وہی آجاتے ہیں۔ اور کیا انسان کی روح نکل جاتی ہے۔ سیر کے لیے۔ اور کیا قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ہے۔ وہ آیت یا حدیث کا متن نقل کیا جائے :۔ (فقط والسلام نور محمد ٹنڈو الہ یار حیدر آباد سندھ) :-

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ ؕ

الجواب

ا :- شریعت میں فال نکلوانا قطعاً حرام ہے۔ اس کو عربی میں کہانت کہتے ہیں اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ والہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہانت کرنے والا اور کروانے والا دونوں ملعون ہیں۔ اور کاہن کی اجرت حرام ہے چنانچہ ارشاد ہوا :- اَلْکَاهِنُ وَالْمَكْهُوْنُ وَالْوَاشِمَةُ وَالْمُتَوَشِّمَةُ مَلْعُوْنٌ ایک جگہ پر ارشاد فرمایا۔ کہ کاہنوں کے پاس مت جاؤ۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے :- صفحہ نمبر ۳۹۲ پر ا عَنْ مُعٰوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُمُوْرٌ كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ :-) فال نکالنے اور فال لینے میں فرق ہے۔ فال نکالنا مطلقاً حرام ہے اور ناجائز ہے۔ جیسے کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ فال لینا جس کو عربی میں فال ہی کہتے ہیں۔ یہ اچھی باتوں میں جائز ہے اور بری باتوں میں ناجائز چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ارشاد ہوا۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَالُ قَالُوْا وَمَا الْفَالُ قَالَ الْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ؕ علم نجوم دو قسم کا ہے۔ ایک جائز اور دوسرا ناجائز۔ اگر حساب و کتاب کے لیے علم نجوم سیکھا جائے۔ جیسے تاریخ بتانا یا جنتری بنانا تو جائز ہے۔ اور اگر خفیہ باتیں یا پیشین گوئی والا نجوم سیکھا۔ تو ناجائز ہے۔ کیونکہ ایسے نجومیوں کی اکثر باتیں جھوٹی ہوتی

ہیں۔ اور جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ اسی نجوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو سے تشبیہ دیتے ہوئے گناہ فرمایا :۔
چنانچہ مشکوۃ شریف میں ارشاد ہوا۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ اِقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ ؎ علم جفر سیکھنا بالکل جائز ہے۔ اس کے موجد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف اور مشکوۃ شریف صفحہ نمبر ۳۹۲ میں ہے۔ عَنْ مُعَاوِيَةَ ابْنِ الْحَكَمِ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطُّهٗ بِذَالِكَ ہَاوَ اَلَا مُسْلِمٌ ؎
علم ابجد کوئی مستقل علم نہیں ہے۔ بلکہ آٹھ لفظ ہیں۔ کہ جن سے ہر حرف کے نمبر ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ اور ان کے عدد علم جفر۔ وظائف۔ تعویز۔ علم حساب اور تاریخ نکالنے کے علم میں کام آتے ہیں :۔ (۲) بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ
علمائے محققین کے نزدیک خواب چند قسم کے ہیں (۱) خواب الہامی (۲) خواب وحی (۳) خواب اضطرابی (۴) خواب تخیلی (۵) خواب وہمی (۶) خواب تحقیقی۔ پہلی خواب صرف اولیاء اللہ کو نظر آتی ہے :۔ دوسری خواب انبیاء کرام کو مشاہدہ ہوتا ہے۔ تیسری خواب ہر پریشانی والے شخص کو ہیبت ناک شکل میں نظر آتی ہے۔ چوتھی خواب دن کے پراگندہ خیالات نظر آتے ہیں۔ جن کا اثر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پانچویں خواب اکثر اُن لوگوں کو آتی ہے۔ جو غلط وظائف کرتے ہیں۔ یا جن کو مالیخولیا والی بیماری ہو یا بچہ ڈرنے والا ہو۔ یا حاملہ عورت کو چھٹی خواب ہر شخص کو آئندہ گذشتہ کے واقعات کے بتانے کے لیے آتی ہیں۔ علماء تعبیر انہی خوابوں تعبیر بتاتے ہیں۔ انسان کے جسم میں اللہ رب العزت نے ۲ دو قسم کی روحیں پیدا فرمائی ہیں۔ (۱) روحِ سلطانی (۲) روحِ سیلانی ،، پہلی روح جب نکلتی ہے۔ تو انسان مرجاتا ہے۔ دوسری روح جب نکلتی ہے۔ تو خواب میں نکلتی ہے۔ مگر جسم سے تعلق پورا پورا رکھتی ہے۔ اسی لیے جب جگایا جاتا ہے۔ تو فوراً جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ روح سریانی یا سیلانی نکل کر بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہو جائے تو خواب وحی ہے۔ اگر بھٹکتی پھرے۔ تو خواب تخیلی نظر آتی ہے۔ اگر جنات کے پاس پہنچ جائے۔ تو وہمی ہے۔ اگر کسی چیز میں مبتلا ہو جائے۔ تو خواب تحقیقی نظر آتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بدن میں دو روحیں پیدا فرمائیں۔ ایک روح کو نکال کر موت دیتا ہے۔ اور دوسری کو خواب میں نکالتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؎ (پارہ ۲۴ آیت ۴۲ رکوع پہلا) ؛ واللہ ورسولہ اعلم

کتبہ

٭ ٭ ٭ ٭

اِمامِ مسجد کو نامردی کا علاج حکیم بن کر کرنے کا حکم

سوال نمبر ۵ : نامردی وغیرہ مرضوں کا علاج کرنے والے کو امام بنانے کا کیا حکم ہے۔

کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اِس مسئلہ میں کہ ایک مسجد کے خطیب اور امام فنِ حکمت سے واقف ہیں۔ کبھی کبھی اپنی ڈیوٹی کے علاوہ حسبِ ضرورت حکمت کا کام کر لیا کرتے ہیں۔ اور اکثر ان کے پاس نامردی کے مریض آتے ہیں۔ یہ حکیم صاحب کمزوریِ عضوِ تناسل کے مریض کو اس کے علاج کے لیے عضوِ تناسل کو برانگیختہ کر کے منی کا اخراج کر کے اس کا مناسب علاج کیا کرتے ہیں۔ بروئے شہادتِ مخالفین یہ کام عادتاً یا علتاً کیا۔ اب اس نے شکایت ہونے پر اپنے مرشد کے سامنے اس فعل کی مکمل توبہ کر لی۔ کہ آئندہ ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ فرمایا جائے اگر کیا ایسے شخص کو امام یا خطیب جانا شرعاً جائز ہے یا ناجائز ہے۔ اس کے مرشد صاحب نے اس کی توبہ کے بعد اس کی امامت جائز قرار دی ہے۔ مگر بستی والوں نے اس اجازت کو منظور نہ کیا۔ اور آپ کے فتوے پر ہی عمل کیا جائے گا۔ لہٰذا بہت جلد فتوے عطا فرمایا جائے۔ اگر حضرت حکیم الامت جواب فرمائیں۔ تو کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف آپ کی مہر اور دستخط ہی کافی ہیں :۔

سائل :۔ مولوی ملک قاسم مدرس کراڑی کوٹ۔ ضلع گجرات

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

الجواب

ایسے شخص کو امامت سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ اس کے پیچھے اس وقت تک نماز نہ پڑھی جائے جب تک یہ شخص صرف لِوَجْهِ اللّٰه سچی توبہ نہ کرے۔ ابھی اس نے صرف اس لیے توبہ کی ہے۔ کہ امامت باقی رہے۔ جو شخص قانونِ شریعت کے مطابق امام بننا چاہتا ہے۔ اس کو شرعی پابندیوں کا پورا پورا خیال رکھنا لازم ہے۔ امام کی امامت و خطابت اسلام کا بہت اونچا عہدہ ہے۔ کہ جس کے لیے شریعت میں چند بہت ضروری شرطیں ہیں۔ جن کا موجود ہونا ہر امام میں ضروری ہیں :۔ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور فقہاء کی تشریحات سے مندرجہ ذیل شرطوں کا ہر امام میں ہونا لازمی ہیں :۔

نمبر ۱: وہ شخص جس کو قوم اپنا امام بنانا چاہتی ہے۔ سب سے زیادہ عالم ہو (۲) قاری ہو۔ (۳) خاندان میں سب سے اونچا ہو (۴) سب سے زیادہ بزرگ ہو (۵) متقی ہو۔ (۶) وجیہ ہو (۷) ہر ایسے کام سے بچے جس سے وہ قوم میں ذلیل تصور کیا جائے (۸) بداخلاق نہ ہو (۹) بازاری آدمی نہ ہو (۱۰) امام کے خیالات و توجہ الی اللہ زیادہ ہونی چاہیے۔ نہ کہ الی الدنیا (۱۱) وہ شخص بدمعاش نہ ہو۔ (۱۲) حرامی نہ ہو۔ (۱۳) فاسق اور فاجر نہ ہو۔ (۱۴) کسی کا نوکر، خادم، ملازم، کمی نہ ہو۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۸۳ پر ہے کہ اَلْاَوْلٰی بِالْاِمَامَةِ اَعْلَمُهُمْ بِاَحْكَامِ الصَّلٰوةِ وَيَجْتَنِبُ الْفَوَاحِشَ الظَّاهِرَةَ۔ فَاِنْ تَسَاوُوْا فَاَوْرَعُهُمْ الخ تمام شرائط جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ وہ ظاہراً، کنایتاً عالمگیری میں اس جگہ موجود ہے ان میں سے بعض کام اگرچہ عوام کے لیے جائز ہیں۔ لیکن علماء کے لیے منع ہیں۔ شریعت میں بعض کھیل جائز ہیں مگر علماء اور داڑھی والے حضرات کو وہ بھی منع ہیں۔ کیونکہ اس سے خصوصیات اور رعب شریعت جاتا رہتا ہے چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب احکام القرآن صفحہ نمبر ۴۲۸ پر جلد اول میں لکھا کہ: وَاِنَّهٗ يَنْبَغِيْ لِذِي الْعَقْلِ اَنْ تَنْهَاهُ اللِّحْيَةُ وَالشَّيْبُ عَنِ الْبَاطِلِ۔ وَقَدْ قَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ لِاَسْلَمَ فِيْ شَيْءٍ اَمَا تَنْهَاكَ لِحْيَتُكَ هٰذِهٖ قَالَ اَسْلَمُ فَمَكَثْتُ نَمَا نَامَهُ (ترجمہ): ۔ اور بے شک لائق ہے۔ علماء و عقلاء کے لیے یہ کہ منع رکھے اُن کو داڑھی اور بڑھاپا باطل کاموں سے اور حضرت فاروق نے ایک شخص حضرت اسلم سے فرمایا۔ کسی باطل کھیل میں مشغول دیکھ کر کیا تم کو تمہاری داڑھی نے اس کام سے منع نہ کیا۔ اسلم فرماتے ہیں۔ کہ پھر میں اس سے بالکل ترک گیا۔ تمام عمر۔ ثابت ہوا۔ کہ بعض کام اگرچہ عوام الناس کے لیے بھی جائز ہوں۔ مگر قوم کے پیر و مرشد اور امام کے لیے ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ جیسے مردے نہلانا اگرچہ جائز بلکہ سنت صحابہ ہے۔ مگر پنجاب کے علاقے میں یہ کام علماء اور امام کے لیے جائز نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص مردے نہلاتا ہوگا۔ تو اس کو امام مقرر کرنا منع ہے یہ سب کام کیوں ہیں۔ تاکہ قوم کے دل میں امام کا سب سے زیادہ اونچا اور باعزت مقام رہے۔ اور امام کا دل ہر چیز سے ہٹ کر فقط نماز اور مسائل نماز میں لگا رہے۔ اور اللہ کی ذات میں مشغول رہے۔ نامردی کا علاج کرنا اگرچہ بہت بڑی نیکی اور خدمت خلق ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک بیماری ہے اور بیماری کا علاج کار ثواب ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کتاب الطب فصل ثانی میں ہے۔ کہ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ قَالُوْا۔ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَنَتَدَاوٰى۔ قَالَ نَعَمْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ دَوَاءً الخ نامردی بھی ایک سخت ترین بیماری ہے۔ اس کا علاج کرانا بھی واجب ہے۔ اسی طرح عالمگیری جلد اول

صفحہ نمبر ۲۰۵ پر ہے۔ اب اگر مسلمان حکیم یہ علاج نہ کرے۔ تو ہم غیروں کے محتاج ہوئے اور اس علاج کے لیئے جو ہمدردی ایک مسلمان ڈاکٹر کو ہو سکتی ہے۔ وہ غیر مسلم کو قطعاً نہیں ہو سکتی۔ بلکہ غیر مسلم تو نسلِ مسلمانی کے ختم ہونے سے خوش ہیں۔ وہ کب چاہیں گے۔ کہ ایک نامرد مسلمان علاج سے مرد بن کر مسلمانوں کی نسل کو بڑھائے۔ نامرد کو مرد بنانا اور نسلِ مسلمانی کو بڑھانا اگرچہ بہت عظیم خدمت ہے خود آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ ط (روح البیان جلد ۴ صفحہ نمبر ۶۷)

بیشک میں تمہاری وجہ سے امتوں پر کثرت لے جانے والا ہوں۔ اس روائیت سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے مسلمان کو صاحب اولاد ہونا واجب ہے۔ پس جو اس بیماری میں مبتلا ہو۔ وہ ضرور کسی مسلمان طبیب سے علاج کرائے۔ لیکن نماز کے امام کے لیئے یہ کام جائز نہیں۔ دیکھو گھوڑی کو گدھے سے وطی کرانا جائز ہے۔ چنانچہ فتاوے درِ مختار جلد پنجم صفحہ ۲۴۲ پر ہے:۔ وَجَازَ خِصَاءُ الْبَهَائِمِ وَاِنْزَاءُ الْحَمِيْرِ عَلَى الْخَيْلِ كَعَكْسِهٖ (الخ) ط یعنی جانوروں کو خصی کرانا اور گھوڑی پر گھوڑے کی بجائے گدھا چڑھانا۔ تاکہ خچر پیدا ہو۔ شرعاً یہ کام بالکل جائز ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن پاک نے خچر کی تعریف کی ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر سواری کی ہے۔ مگر علماءِ کرام اور صلحاء کے لیئے جائز نہیں۔ کہ یہ کام کرائیں یا نزدیک کھڑے ہوں۔ کیونکہ یہ کام فحش ہے۔ بہت سے فحاشی کے کام عوام کے لیئے جائز ہوتے ہیں۔ لیکن علماء کے لیئے منع، جیسے کہ جانوروں کو نیا کرانا، اسی لیئے آقائے دو عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ نے خود اپنے اور اہل بیت کے لیئے اس کام سے خصوصی طور پر ممانعت فرمائی۔ چنانچہ ترمذی شریف صفحہ نمبر ۲۰۳ پر ہے۔ اور مشکوٰۃ شریف کتاب الجہاد صفحہ ۲۳۳ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ كُرَيْبٍ ثَنَا اِسْمٰعِيْلُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ ثَنَا مُوْسٰى بْنُ سَالِمٍ اَبُوْ جَهْضَمٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَبْدًا مَامُوْرًا مَا اخْتَصَّنَا دُوْنَ النَّاسِ بِشَيْءٍ اِلَّا بِثَلٰثٍ اَمَرَنَا اَنْ نُسْبِغَ الْوُضُوْءَ وَاَنْ لَّا نَاْكُلَ الصَّدَقَةَ وَاَنْ لَّا نُنْزِيَ حِمَارًا عَلٰى فَرَسٍ ط (ترجمہ):۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ کہ آقاء دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکموں کے امین بندے تھے۔ نبی کریم نے عام لوگوں کے سوا ہم کو کسی خاص چیز کا حکم نہ دیا۔ بجز تین چیزوں کے۔ کہ حکم دیا نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ہم اہل بیت کو ایک یہ کہ اچھی طرح اور پورا وضو کریں۔ اور یہ کہ صدقہ نہ کھائیں۔ اور یہ کہ ہم اہل بیت گدھوں کو نہ چڑھائیں گھوڑیوں پر۔ اس کو نسائی نے بھی روایت کیا۔ یہی روایت حضرت علی سے بھی مروی ہے۔ اس حدیثِ پاک سے ثابت ہوا۔ کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں۔ جو عوام کو جائز ہوتے ہیں۔ مگر معززینِ اسلام کو منع ہیں۔ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ

معزز اور قابلِ تعظیم حضرات علمائے کرام اور مساجد کے امام ہیں۔ کہ انہیں سے دین کی عزت ہے ۔ حضرت حکیم الامت نے تو ایک امام مسجد کو اس کی امامت سے صرف اور صرف اس لیئے علیحدہ فرما دیا۔ کہ ترازو سے تولنے والے سودے کی دکان ڈالی تھی۔ موجودہ دور میں، دکان دار خیانت کرنے سے نہیں بچتا۔ اور بیہودہ عوامی آدمی بن جاتا ہے۔ شانِ امامت باقی نہیں رہتی۔ علماءِ امت ہی کے لیئے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمِ (جامع الصغیر جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۰) ترجمہ تہمت کی جگہوں سے بھی بچو۔ یعنی جس کام یا جس جگہ سے عزت اور وقار میں فرق پڑتا ہو۔ اس سے بچو۔ لہٰذا کیسی بری بات ہے۔ کہ لوگ اور مقتدی تو معززین اور معاشرے میں باعزت اور اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اور امام جس کو سرداری کے لیئے منتخب کیا وہ قوم کا نیچ یا کمّی یا قوم کا مزدور ہو۔ اس میں پیارے آقا رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے مصلے کی توہین ہے۔ نفسیاتی بات ہے۔ کہ انسان جو کام کرتا ہوگا۔ ہر وقت یا اکثر وقت اسی کے خیالات میں منہمک اور مشغول رہے گا۔ تو کیسی بری بات ہے۔ کہ نماز کے مصلّیٰ پر کھڑا ہو کر امام نامردوں کو مردمی طاقت کے خیالات میں اور لوگوں کے آلاتِ تناسل کے تصورات میں ہی مشغول ہو لہٰذا اس فتوےٰ شرعی کے بموجب فوراً اس حکیم شخص کو امامت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اللہ کے نزدیک وہ شخص بہت پیارا ہے۔ جو دنیا و آخرت میں وجیہہ ہو۔ وجیہہ وہ شخص ہے۔ جو ہر ظاہری باطنی بات سے پاک اور صاف ہو۔ اور جس کی رب تعالیٰ کی بارگاہِ کریمہ میں بات مانی جاتی ہو۔ اسی لیئے حضرتِ مسیح علیہ السلام کی شان میں باری تعالیٰ ربّ العزت نے ایک جگہ فرمایا:۔ اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ؕ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:۔ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ؕ یعنی اللہ کی بارگاہ میں اُن کی بات مانی جاتی ہے اور ہر برے کام سے بچنے والے۔ اگرچہ سب انبیاء کی شان یہی ہے۔ مگر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ اور آن کی اس معجزانہ پیدائش پر طعن کرتے تھے۔ اس لیئے خصوصی طور پر آن کے لیئے یہ لفظ ارشاد ہوا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ آخر زمانہ امتِ مصطفےٰ کے امام و پیشوا بننے والے تھے۔ اور پیشوا کا وجیہہ ہونا ضروری ہے۔ اس لیئے یہ فرمایا گیا۔ اور قانون بنایا گیا۔ کہ ہر امام کو وجیہہ ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اور ذلیل کاموں سے بچنا ضروری ہے اسی لیئے قوم کے سامنے مسجد کی صفائی کرنا یا وضوگاہ کی نالی صاف کرنا امام مسجد کو جائز نہیں۔ حالانکہ مسجد کی صفائی عین عبادت ہے۔ یہ تمام گفتگو مقرر شدہ امام میں ہے۔ لیکن وقتی طور پر ہر وہ شخص امامِ نماز ہو سکتا ہے۔ جو داڑھی والا ہو۔ اور چار انگل پوری داڑھی ہو۔ نہ کم ہو اور نہ اس سے زیادہ اور ظاہراً کوئی گناہ نماز میں اس کے ساتھ نہ ہو۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

سلام بھیجنے کے کتنے طریقے اور علی علیہ السّلام کہنا سخت منع ہے۔

سوال نمبر ۶ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے دربارِ رسالت میں سلام کا ہدیہ پیش کیا۔ لیکن آخر میں یہ شعر بھی پڑھا۔

یعنی وہ اعلٰے حضرت بریلی کے شاہ ”
اُس مجدّدِ ملت پہ لاکھوں سلام ؎

تو بکر جو خود کو اہلسنت نقشبندی کہلاتا ہے۔ کہنے لگا۔ کہ کسی اُمتی پر سلام و درُود پڑھنا شرعًا منع ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ زید کہتا ہے۔ کہ اکابر دیوبند کی تکفیر کرنا لازم ہے۔ خود بھی خاص دیوبندیوں کو کافر کہتا ہے مگر یہی بکر کہتا ہے۔ کہ دیوبندی بھی آخر کلمہ گو ہیں مسلمان ہیں۔ اُن کو کافر نہیں کہنا چاہیئے۔ زید کہتا ہے۔ کہ دیوبندی کے پیچھے اہل سنت کی نماز جائز نہیں۔ بکر کہتا ہے۔ جائز ہے۔ چند دنوں سے یہاں ان تین چار باتوں میں جھگڑا اچل رہا ہے۔ تمام بستی والوں کی متفقہ رائے سے آپ کو استفتا حاضر کیا جا رہا ہے براہِ کرم جلد از جلد اپنی رائے عالیہ سے نوازا جائے۔ تاکہ مسئلہ صاف ہو۔

سائل :- فقیر محمد نقشبندی مجددی پنڈی بھٹیاں ضلع گوجرانوالہ۔ مورخہ: ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ ط

الجواب

سوال مذکورہ میں بکر کا قول قطعًا غلط ہے۔ دراصل بکر وہابی ہے۔ اور اپنے بڑوں کی طرح خود کو چھپا رہا ہے۔ محض اہلِ سنت کو دھوکا دینے کے لیئے اُس کو اعلیٰ حضرت کے سلام پر اعتراض سوجھا مگر اکابر دیوبند کی بے ادب عبارات کیوں نہ نظر آئیں۔ وہابی حضرات نے رب تعالیٰ کو جھوٹ کا الزام لگایا (براہین قاطعہ بلغۃ الحیران کے ص۵ پر حسین علی دیوبندی نے معتزلہ کی طرف نسبت کرکے اللہ تعالیٰ کو بے علم کہا اور اس عقیدے کی مضبوطی بیان کرکے تائید کی حالانکہ معتزلہ کا یہ عقیدہ نہیں خود عقیدہ بنا لیا اور تائید کر دی معاذ اللہ وہ یاد نہیں آتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت خوانی کے یہ دشمن۔ یارسول اللہ کے نعرے سے ان کو تکلیف ختمِ نبوت جلسوں میں تاجدارِ ختمِ نبوت زندہ باد کے نعرے سے ان کو درد پڑتا ہے۔ سنیوں کے اس

نعرے کے مقابل انھوں نے تاج و تختِ ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ مقرر کیا۔ گویا کہ تاج و تخت کو زندہ باد کہہ لو مگر نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلّم کو زندہ نہ کہنے دو۔ نہ کہو۔ یہ ہیں ان بدنصیبوں کی حرکتیں سلام پڑھنے سے جلتے ہیں یہ گستاخیاں نجد کو یاد نہیں۔ صرف کلمہ گوئی کو کیا کرے گا۔ جب کلمے والے اللہ اور رسول سے ہی محبت نہیں۔ یہاں تو نجد نے صرف مذکورہ شعر کا انکار کیا ہے۔ اور امتی کو سلام کرنے سے انکار کیا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے وہابی ساتھی تو نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلّم پر سلام پڑھنے سے بھی منکر ہیں۔ نجد کا خود کو اہل سنت نقشبندی کہنا مزید اس کی وہابیت پر دال ہے۔ کیونکہ آج کل وہابی زیادہ تر نقشبندی بن جاتے ہیں۔ اس بہانے سے وہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کی نعت خوانی اور جہراً درود شریف سے منع کرتے ہیں۔ اور اس گستاخی کا ان کو موقع مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ طریقت کا پہلا راستہ نقشبندیت ہے۔ وہ ذکرِ خفی سے مدارج طے کراتے ہیں اس راستے کے سالک کو ذکرِ جہری سے منع کرتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا طریقۂ تدریس ہے۔ اور تصوف کے طالب کو وہ اس طرح باطنی طور پر درسِ معرفت سے نوازتے ہیں۔ وہابی لوگ نعتِ حبیب و ذکرِ رسولِ کریم کے دشمن ہیں وہ جب غلامانِ حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مساجد میں جوشِ عشقِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلّم میں نعت خوانی کرتے دیکھتے۔ تو جل جاتے ہیں منع کرتے ہیں تو دُر کارے جاتے۔ وہابیت کا خطاب پاتے۔ کسی جگہ زیادہ جوش دکھاتے تو اہل سنت کے شہابِ ثاقب سے رجیم ہوتے۔ آخر بے چارے تھکے ہارے فریب کاری کے دھندے میں مشغول ہوئے۔ تو کوئی لبادہ ہاتھ نہ آیا۔ جستجوئے بسیار کے بعد لبادۂ نقشبندیت ہی ہاتھ لگا۔ کہ اسی میں ذکرِ جہری کی ممانعت ہے۔ وہ عرفاء کرام تو صرف مبتدیوں کو ذکرِ جہری سے روکتے ہیں۔ مگر ان روسیاؤں کو تو بہانہ کی تلاش تھی ایک باڑ کی آڑ تھی۔ ہر شخص کو ذکرِ جہری بھی صرف وہ منع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ ورنہ اپنے مولوی کی گلا پھاڑ تقریر جائز اور ٹکے کے مولوی کو زندہ باد کہنا جائز ہے۔ بس نعت خوانی روکنے کے لیے یہ لوگ نقشبندی بنے۔ اور اس جال کا تانا۔ بانا سب سے پہلے اشرف علی تھانوی صاحب نے تیار کیا۔ اور دیوبند فیکٹری میں بنا جاتا رہا۔ لہٰذا اس کے نقشبندی ہونے سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اس لیے حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے ہیں۔ کہ قادری، چشتی، سہروردی مشائخ کی چھان بین نہ کرو۔ مگر جب کوئی نقشبندی کا دعوے دار ہو۔ تو فوراً اس کی نسبت اور سلسلہ دیکھو۔ اشرف علی وغیرہ کے گستاخانہ کلام کی بابت گفتگو چھیڑ دو۔ اور اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمت کا تذکرہ شروع کر دو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ فوراً کھوٹا اور کھرا نکھر جائے گا۔ گویا کہ اعلیٰ حضرت کا ذکر مثلِ تیزاب ہے۔ جو ملمع زمانہ کھوٹے کھرے سونے کو ایک دم ظاہر کر دیتا ہے سوالِ مذکورہ

یوں جس شعر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بالکل جائز ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں سلام پانچ طریقے سے ہیں:۔
پہلا:۔ یہ کہ کسی کو حاضر کے صیغے سے سلام کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی کو دور سے سلام پہنچایا جائے جیسے کہ میرا فلاں کو سلام کہہ دینا۔ پہلے کی مثال جیسے کہ السلام علیکم۔ (۳) اپنے آپ کو سلام کرنا۔ جیسے کہ السلام علینا (۴) طریقہ یہ ہے۔ کہ کسی غائب کا نام لے کر اس کو سلام کرنا جیسے فلاں شخص پر سلام ہو۔ مثلاً زید کو سلام ہو، ان چار صورتوں سے ہر شخص کو سلام کرنا جائز ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ قرآن و حدیث اور اقوالِ فقہا سے اس کے بے شمار ثبوت ہیں۔ پہلی صورت کا سلام کرنا اس کا حکم حدیث پاک نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے مسلمانوں جب تم ایک دوسرے سے ملو۔ تو آپس میں سلام کرو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب السلام ص۳۹۷ پر ہے:۔ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيْرِ وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ ط (ترجمہ:۔ حضرت ابی ہریرہ سے روایت ہے فرمایا انہوں نے کہ فرمایا آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرے اور اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے لوگ بہت لوگوں کو سلام کریں (بخاری) ہم دن رات ایک دوسرے کو سلام بوقتِ ملاقات کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں السلام علیکم التحیات میں دن میں کئی مرتبہ کہا جاتا ہے:۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ ط جنت میں فرشتے جنتیوں کو سلام کریں گے:۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ ط (ترجمہ) اے جنتیو تم پر سلام ہو۔ مبارک ہو تمہیں۔ ہمیشہ جنت میں داخل رہو۔ میدان محشر میں بعد حساب کتاب جنتیوں سے کہا جائے گا:۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ ط تم پر سلام ہو جنت میں داخل ہو جاؤ۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ جب کوئی شخص قبرستان میں جائے۔ تو ان الفاظ سے قبر والوں کو سلام کرے۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ ط (ترجمہ):۔ اے مومنوں مسلمانوں تم پر سلام ہو۔ خود آقائے دو عالم نبی حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کو رب کریم نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب تمہارے پاس مومن حاضر ہوں قیامت تک تو اے پیارے حبیب ان کو سلام فرماؤ۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ سورت انعام آیت نمبر ۵۴:۔ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ط (ترجمہ):۔ جب آئیں آپ کے پاس وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ ہماری آیتوں پر تو انسے فرمایئے:۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ۔ اس آیتِ مطلقہ سے ثابت ہوا۔ کہ قیامت تک

کوئی بھی کہیں سے مومن میرے آقا کی بارگاہِ عالیہ میں ادب واحترام سے حاضر ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ والہ وسلم اس کو جانتے اور اس پر سلام بھیجتے ہیں۔ ان تمام دلائل سے ہر مسلمان کو سلام کرنا ثابت ہوا۔ پس لازم آیا۔ کہ ضمیر حاضر سے نبی غیر نبی ہر ایک پر سلام پڑھنا جائز ہے تو جس طرح یَا نَبِیّ سَلَامٌ عَلَیْکَ کہنا درست ہے۔ اسی طرح ابا جی سلام علیکم کہنا بھی جائز ہے۔ سلام کا دوسرا طریقہ بھی عام مروّج ہے۔ درست ہے شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ ہم دن رات خطوں میں لکھتے رہتے ہیں۔ کہ ہمارا سلام تمام بزرگوں کو عرض کرنا۔ اور تیسری نوعیت کا سلام ہم ہر نماز میں اَلتَّحِیَّاتُ پڑھتے وقت پڑھتے ہیں۔ چنانچہ التحیات کے الفاظ ہیں۔: اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ ؕ (ترجمہ) :۔ ہم پر سلام ہو۔ اور اللہ تعالٰی کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ حضرت عیسٰی نے فرمایا تھا۔: وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ ؕ (ترجمہ) مجھ پر سلام ہو۔ جس دن میں پیدا کیا گیا۔ یہاں بھی نبی غیر نبی سب پر اس طریقہ سے سلام کرنا جائز ثابت ہوا۔ چوتھا طریقہ کہ بندوں کا نام ذاتی یا صفاتی لے کر ان کو سلام کیا جائے۔ یہ بھی شرعًا جائز بلکہ قرآن سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالٰی ہے سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۴۷ میں ہے :۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی (ترجمہ)۔ اور تمام ہدایت کے متبعوں پر سلام ہو۔ لفظ متبع ہدایت۔ مسلمانوں کا صفاتی نام ہے۔ جو صرف مومنوں کی خصوصیت ہے۔ یہاں صفاتی نام لے کر بطریقہ غائب سلام بھیجا گیا۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ غیر نبی مسلمانوں کو بحالتِ غیر موجودگی اُس کا نام لے کر سلام بھیجنا جائز ہے۔ دوسری آیت پاک میں اِس سے بھی زیادہ وضاحت فرمائی گئی۔ چنانچہ سورۃ نمل آیت نمبر ۵۹ میں ہے۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ؕ اے پیارے نبی فرمادو حمدیں اللہ تعالٰی کے لیے ہیں۔ اور سلام اُن لوگوں پر ہے۔ جو اُس کے وہ بندے ہیں۔ جن کو اس نے چن لیا۔ جس طرح کہ حدیث قرآن نے مسلمانوں کو عملی اور اعتقادی صفاتی دو نام عطا فرمائے۔ ایک مومن اور دوسرا نام اہل سنت والجماعت اسی طرح لفظ عِبَادُ اللّٰہِ یا عَبْدٌ بھی تمام مسلمانوں کے صفاتی نام ہیں۔ تو یہاں آیت میں مسلمانوں کا صفاتی نام لے کر اُن پر سلام بھیجا جا رہا ہے اس سے بھی ثابت ہوا۔ کہ نام لے کر سلام پڑھنا شرعًا بالکل جائز ہے مذکورہ فی السوال شعر میں سلام بھیجنے کا یہ ہی چوتھا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ جو بحکم قرآنی بالکل جائز ہے۔ پس جس طرح یہ جائز ہے۔ کہ عبداللہ پر سلام ہو یہ بھی جائز ہے۔ کہ کہا جائے :۔ زینہ پر سلام ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ کہا جائے والد پر سلام اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ کہا جائے۔ اعلیٰ حضرت پر سلام ہو۔ اور جب ایک سلام جائز ہوا۔ تو

شرعاً لاکھوں سلام بھیجنے بھی جائز ہیں۔ اِن تمام دلائل سے ثابت ہوا۔ کہ مذکورہ شعر بالکل جائز ہے۔ اور پڑھنا کارِ ثواب ہے۔ بکر کا اِس پر اعتراض اس کی نادانی ہے۔ سلام کرنے کا پانچواں طریقہ یہ ہے۔ کہ غائب کی ضمیر سے کسی کو سلام کیا جائے۔ اور اس کا نام پہلے لیا جائے۔ جیسے کہ یہ کہنا۔ کہ زید اِس پر سلام ہو۔ یا یہ کہنا کہ مولانا ان پر سلام ہو۔ یا زبان عربی میں کہنا۔ کہ زید علیہ السلام۔ یا مولوی علیہ السلام جیسا کہ شیعہ روافض حضرت علی اور امامین کریمین امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو علیہ السلام کہتے۔ اور اُن کی ضد میں خارجی لوگ یا بیوقوف سنی مسلمان کہہ دیتے ہیں۔ صدیق علیہ السلام، عمر علیہ السلام، علی علیہ السلام، حسین علیہ السلام۔ یہ سب منع ہیں۔ بلکہ ناجائز و حرام ہیں۔ اس لیے کہ لفظِ علیہ السلام عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ: صرف معصومین کے لیے خاص ہیں۔ اگرچہ ترجمے کے لحاظ سے اُن میں عمومیت ہے۔ مگر منقول شرعی سے یہ مخصوص ہو گئے۔ جیسے کہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم نبی کریم کے لیے اور جَلَّ جَلَالُہٗ اللہ کریم کے لیے مخصوص ہیں:۔ بطورِ منقول شرعی اور معصوم متفقہ طور پر صرف انبیاء کرام اور ملائکہ عظام ہیں۔ اِس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں بجز روافض کے کہ وہ اہل بیت اور پنجتن اور بارہ ائمہ کو بھی معصوم مانتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ کیونکہ خود ان کی معتبر کتب میں بھی اِس کا ثبوت نہیں ملتا۔ قانونِ شریعت میں مستقل طور پر کسی انسان کو علیہ السلام کہنا منع ہے۔ بجز انبیاء کرام۔ ہاں بالتبع جائز ہے۔ چنانچہ شرح شفاء جلد سوم صفحہ نمبر ص۵۰۹ پر ہے:۔ کہ یَجِبُ تَخْصِیْصُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَسَائِرِ الْاَنْبِیَآءِ بِالصَّلٰوۃِ وَالتَّسْلِیْمِ وَلَا یُشَارِکُ فِیْہِ سِوَاھُمْ ہ (ترجمہ)۔ واجب ہے:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کو صلوٰۃ و سلام سے خاص کرنا اور نہ شریک کیا جائے اس علیہ السلام میں بجز انبیاء کسی کو۔ امام نووی شرح مسلم جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۷۶ اور ص۳۴۶ پر فرماتے ہیں۔ کہ قَالَ الشَّیْخُ اَبُوْ مُحَمَّدِ الْجُوَیْنِیُّ۔ وَالسَّلَامُ فِیْ مَعْنَی الصَّلٰوۃِ فَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَرَنَ بَیْنَہُمَا فَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَائِبٌ۔ غَیْرُ الْاَنْبِیَآءِ۔ فَلَا یُقَالُ ذٰلِکَ اَبُوْ بَکْرٍ وَعُمَرُ وَعَلِیٌّ عَلَیْہِمُ السَّلَامُ وَاِنَّمَا یُقَالُ ذٰلِکَ خِطَابًا لِلْاَحْیَآءِ وَالْاَمْوَاتِ فَیُقَالُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ ہ شیخ ابو جوینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ کہ سلام مثل درود شریف کے ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ درود میں۔ سلام کو درود سے ملایا ہے۔ پس بجز انبیاءِ کرام کسی غائب پر غائب ضمیر سے سلام نہیں پڑھ سکتے۔ تو نہ کہا جائے۔ ابوبکر اور عمر و علی علیہم السلام ہاں۔ حاضر کی ضمیر سے زندہ مردہ کو سلام کرنا جائز ہے۔ اس لیے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ شامی جلد پنجم ص۵۲۳ پر ہے:۔ وَ اَمَّا السَّلَامُ فَنَقَلَ اللَّقَانِیْ

فِي شَرْحِ جَوْهَرَةِ التَّوْحِيْدِ - عَنِ الْاِمَامِ اَنَّهُ فِي مَعْنَى الصَّلٰوةِ فَلَا يُسْتَعْمَلُ فِي الْغَائِبِ وَلَا يُفْرَدُ بِهٖ غَيْرُ الْاَنْبِيَاءِ فَلَا يُقَالُ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ - وَسَوَاءٌ فِي هٰذَا الْاَحْيَاءُ وَالْاَمْوَاتُ اِلَّا فِي الْحَاضِرِ ۔ (ترجمہ) :- امام لقانی اپنی شرح جوہر توحید میں نقل کرتے ہیں۔ امام جوینی سے کہ سلام مثل صلوٰۃ کے ہے۔ لہٰذا غیر نبی کے لیئے غائب کی ضمیر سے سلام کو استعمال نہ کرو۔ خواہ غائب زندہ ہو۔ یا فوت شدہ۔ ہاں۔ حاضر کی ضمیر سے سلام کرنا زندہ مردہ غیر نبی کو بھی جائز ہے۔ اسی طرح حضرت حکیم الامت مدظلہ العالی نے اپنی شان حبیب الرحمٰن کتاب میں حوالہ عالمگیری کتاب الکراہیۃ صفحہ نمبر ص ۱۹۱ پر ارشاد فرمایا۔ مستقلاً کسی غیر نبی پر درود شریف یا صرف سلام بھیجنا بصیغہ غائب منع ہے۔ نہ امام حسین علیہ السلام کہنا جائز ہے۔ نہ امام حسین صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کہنا جائز۔ اسی طرح علامہ اسمٰعیل حقی صاحب روح البیان اپنی تفسیر جلد ہشتم ص ۲۲۸ پر فرماتے ہیں :- وَاَمَّا السَّلَامُ فَهُوَ فِي مَعْنَى الصَّلٰوةِ فَلَا تُسْتَعْمَلُ لِلْغَائِبِ فَلَا يُفْرَدُ بِهٖ غَيْرُ الْاَنْبِيَاءِ فَلَا يُقَالُ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَمَا تَقُوْلُ الرَّوَافِضُ وَتَكْتُبُهُ وَسَوَاءٌ فِي هٰذَا الْاَحْيَاءُ وَالْاَمْوَاتُ ۔ (ترجمہ) اور لیکن سلام پس وہ صلوٰت کے ہم معنیٰ ہے۔ پس نہ استعمال کیا جائے غائب کے لیئے نہ اکیلے غیر نبی کے لیئے بضمیر غائب بولا جائے۔ پس نہ کہا جائے۔ علی علیہ السلام جس طرح رافضی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں اور اس حکم میں زندہ مردہ برابر ہے۔ اشعۃ اللمعات جلد اوّل صفحہ نمبر ص ۴۲۴ پر ہے :- مختار نزدِ جمہور آنست کہ صلوٰۃ وسلام مخصوص است با نبیاءِ کرام و مشارکت نیست با ایشاں جز ایشاں دراں۔ بلکہ ذکر کردہ شود بمغفرت ورحمت ورضوان ونقل کردہ است۔ طیبی کہ آں خلافِ اولیٰ است وبعض گفتہ اند حرام است۔ یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی ۔ ترجمہ :- جمہور علماء کے نزدیک یہ ہی حق ہے۔ کہ صلوٰۃ وسلام انبیاء سے خاص ہے۔ کسی اور کے لیئے جائز نہیں۔ بلکہ اُن کے لیئے صرف غُفِرَ لَهٗ اور رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ کا لفظ ہی منقول ہے۔ علامہ طیبی نے فرمایا۔ کہ غیر نبی کو علیہ السلام کہنا خلافِ اولیٰ ہے۔ اور بعض محققین نے فرمایا۔ کہ حرام ہے۔ بعض نے مکروہ تحریمی اور بعض نے تنزیہی کا حکم لگایا۔ مرقات شرح مشکوٰۃ جلد دوم صفحہ نمبر ص ۵ پر ہے :- اَلصَّحِيْحُ اَنَّ الصَّلٰوةَ عَلٰى غَيْرِ الْاَنْبِيَاءِ اِبْتِدَاءً مَكْرُوْهَةٌ كَرَاهَةً تَنْزِيْهِيَّةً ۔ (ترجمہ) :- صحیح یہ ہے کہ بے شک درود شریف غیر انبیاء پر ابتداءً مکروہ تنزیہی ہے۔ اور چونکہ سلام بھی مثل درود ہے۔ جیسا کہ پہلے ثابت کر دیا گیا۔ اور خود مرقات نے بھی آگے یہی لکھا ہے۔ لہٰذا دونوں مکروہ۔ اِن دلائل

اور حوالوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ انبیاءِ کرام کے سوا کسی اور انسانوں کو علیہ السلام وغیرہ کہنا سخت حرام ہے یا مکروہ ہے۔ لیکن فرشتے اگرچہ نبی نہیں۔ مگر اُن کو علیہ السلام کہنا جائز ہے۔ جن بزرگوں نے یہ فرمایا۔ کہ لَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَآءِ ط یا فرمایا۔ مخصوص است با نبیاء۔ یعنی علیہ السلام کہنا انبیاءِ کرام سے مخصوص ہے۔ یہ خصوصیت حصرِ اضافی ہے۔ اِس لیئے کہ یہاں صرف دیگر انسانوں کو نکالنا مقصود ہے لہٰذا ملائکہ اس سے خارج نہ ہوں گے ورنہ اُن پہلی عبارات سے تقابل و تعارض لازم آئے گا۔ جن میں انبیاءِ کرام کے ساتھ فرشتوں کا ذکر بھی ہے۔ جیساکہ مُلّا علی قاری مرقات دوم صفحہ نمبر ص۵ پر فرماتے ہیں۔ اَلسَّلَامُ کَالصَّلٰوۃِ یَعْنِیْ لَا یَجُوْزُ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ اِلَّا تَبَعًا ط (ترجمہ):۔ سلام مثل صلوٰۃ کے ہے۔ یعنی غیر انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ پر سلام جائز نہیں۔ مگر ساتھ ملاکر۔ اور بہارِ شریعت حصہ شانزدہم صفحہ نمبر ص۹۳ پر ہے۔ مسئلہ کسی کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہنا۔ یہ انبیاء و ملائکہ کے ساتھ خاص ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام و جبرائیل علیہ السلام۔ کسی دوسرے کے نام کے ساتھ نہ کہا جائے۔ (الخ) اِن تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام کہنا تو جائز ہوا۔ لیکن علی علیہ السلام۔ صدیق اکبر علیہ السلام کہنا منع ہے۔ ہمارے بعض بزرگوں نے اِس بات سے یہ دلیل بھی لی ہے۔ کہ اس بنا پر حضرت جبرائیل کا درجہ حضرت صدیق اکبر سے زیادہ ہے۔ مگر یہ دلیل کمزور ہے۔ کیونکہ پھر تو تمام ملائکہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت جبرائیل کی تخصیص نہ رہے گی۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ نہ ہی وہ صاحب خود۔ اِن عباراتِ مندرجہ سے بطریقِ احسن ثابت ہوگیا کہ علیحدہ اور مستقل طور پر کسی کو علیہ السلام کہنا ناجائز ہے۔ ہاں انبیاءِ کرام کے ساتھ ملاکر غیر نبی کو بھی درود شریف یا سلام میں شامل کر سکتے ہیں چنانچہ قاضی ثناء اللہ عثمانی مظہری۔ سورۃ احزاب کی تفسیر میں صفحہ نمبر ص۳۴۱ پر لکھتے ہیں:۔ هَلْ یَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَآءِ وَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ یَجُوْزُ تَبَعًا وَیُکْرَہُ اِسْتِقْلَالًا لِاِخْتِصَاصِہٖ بِالْاَنْبِیَآءِ عُرْفًا ط (ترجمہ):۔ کیا جائز ہے نبی پر درود یا سلام بھیجنا؟ اور صحیح یہ ہے۔ کہ بے شک ساتھ ملاکر جائز ہے۔ علیحدہ مکروہ ہے۔ بوجہ صلوٰۃ و سلام کے خاص ہونے کے انبیاءِ کرام سے منقول عرفی میں۔ اسی طرح نبراس علی شرح عقائد صفحہ نمبر صـ پر ہے:۔ لَا یَجُوْزُ التَّصْلِیَۃُ وَالتَّسْلِیْمُ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَآءِ اِسْتِقْلَالًا عِنْدَ الْمُحَقِّقِیْنَ مِنْ اَھْلِ السُّنَّۃِ خِلَافًا لِلرَّوَافِضِ (ترجمہ):۔ انبیاءِ کرام کے علاوہ کسی بھی مسلمان پر علیحدہ مستقل طور پر درود شریف

یا سلام بھیجنا منع ہے۔ محقق علماء اہلِ سنت کے نزدیک بخلاف شیعوں کے۔ قبلہ عالم حضرت حکیم الامت کے فرمودہ میں لفظِ مستقل اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لفظ تبعًا میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل کرنا جائز ہے۔ دیکھو نماز میں اور ہر درود شریف میں وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ پڑھا جاتا ہے۔ یہ جائز ہے۔ کیونکہ تبعًا ہے۔ حالانکہ اہل بیت اور صحابہ کرام سب غیر نبی ہیں۔ اِن تمام دلائل سے بخوبی واضح ہوگیا۔ کہ درود شریف میں بھی تبعًا ہر امتی کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ تو سلام میں بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام میں اعلیٰ حضرت پر بھی تبعًا سلام جائز ہوا۔ اگرچہ آپ غلام اور امتی ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہوگیا۔ کہ لفظ علیہ السلام کسی صحابی یا اہل بیت کے لیے استعمال کرنا قطعًا جائز نہیں۔ اس کی بیماری عام طور پر شیعوں کو ہے۔ اور جاہل سنی مقررین میں بھی پائی جاتی ہے۔ عقلًا بھی یہ چیز منع ہونی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن حدیث کے علاوہ عام رواج میں بھی بعض الفاظ ایسے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ جن کا ترجمہ اگرچہ عام ہو مگر ہر ایک کے لیے مستعمل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلی شریف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ المعتمد والمستند صفحہ نمبر ۱۴۹ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔ اَلْعُرْفُ یَخُصُّ بَعْضَ الْمُکَلِمَاتِ بِبَعْضِ الْحَالَاتِ وَالتَّجَاوُزُ عَنْہُ یُعَدُّ سُوْءَ الْاَدَبِ فَلَا یُقَالُ اَبُوْبَکْرٍ غُفِرَلَہٗ اَوْ عَلِیٌّ الْمُرْتَضٰی عَفَا اللّٰہُ عَنْہُ بَلْ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کَمَا لَا یُقَالُ مُوْسٰی وَعِیْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ بَلْ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی وَسَلَّمَ عَلَیْہِمَا کَمَا لَا یُقَالُ نَبِیُّنَا عَزَّوَجَلَّ وَاِنْ کَانَ قَطْعًا عَزِیْزًا (الخ) ترجمہ:۔ عرفِ عام۔ بعض الفاظ کو بعض حالات میں اس طرح خاص کر دیتا ہے کہ اس کو چھوڑنا اور یا اِس عرف و رواج سے ہٹنا بے ادبی شمار ہوتا ہے۔ پس نہیں کہا جا سکتا۔ ابوبکر غُفِرَلَہٗ یا علی مرتضٰے عَفَا اللّٰہُ عَنْہُ بلکہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔ کہنا چاہیئے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ و عیسٰے کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ ہی کہا جائے گا۔ اور یہ بھی کہنا گناہ ہے۔ کہ ہمارے نبی عزوجل اگرچہ تمام انبیاء کرام عزت و جلال والے ہیں۔ اس دلیل عقلی سے بھی ثابت ہوا۔ کہ کسی غیر نبی شخص کو عَلَیْہِ السَّلَامُ کہنا منع ہے اب اس بارے اختلاف ہے۔ کہ یہ ممانعت حرام ہے۔ یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی میرے نزدیک مکروہ تحریمی ہے اور کہنے والا گنہگار ہوگا۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

(۲) وہ دیوبندی جو ظاہر ظہور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرتے ہیں:۔ جیسے اشرف علی تھانوی اور خلیل احمد انبیٹھوی اور حسین علی واں بھچراں اور جو سب کچھ سمجھتے ہوئے پھر آن

اچھا سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے پیچھے نماز قطعاً منع ہے۔ ان کی تکفیر واجب ہے۔ کہ دورِ صحابہ سے لے کر آج تک کسی زمانے میں بھی صرف کلمہ گوئی کافی نہیں سمجھی گئی۔ بارگاہِ رب العزت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کو ہر موقعہ پر زیادہ اہمیت دی گئی۔ دیکھو منافق لوگ کلمہ پڑھتے تھے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ اور غیب کے منکر تھے۔ تو رب نے قرآن کریم میں فرمایا۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ؕ۔ آج بھی مرزائی قادیانی، چکڑالوی وَغَيْرُهُمْ فِرَقِ باطل۔ سب ہی کلمہ گوئی کر رہے ہیں۔ مگر متفقہ کافر ہیں۔

وَاللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ؕ

کتبـــــــــــــــــــــــہ

غلام یٰسین نام رکھنے کا حکم اور مسلمانوں کو کون سے نام رکھنے جائز ہیں اور کون سے منع؟

سوال نمبر ۷:۔ کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقے کامونکی ضلع گوجرانوالہ پاکستان کی جامع مسجد میں ایک خطیب مقررہ نے بروز سابقہ جمعہ دورانِ تقریر یہ مسئلہ بیان فرمایا۔ کہ غلام یٰسین نام رکھنا منع اور ناجائز ہے۔ کیونکہ لفظِ یٰسین خدا تعالیٰ کے اسماء میں سے بھی ہے۔ اور غلام کا عربی ترجمہ بیٹا بھی ہے۔ اس طرح غلام یٰسین کا ترجمہ ہو گا۔ خدا کا بیٹا۔ اور یہ کفر ہے۔ اس لیے یہ نام رکھنا ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں کفر کا شبہ ہے۔ یہ مسئلہ اس سے پہلے کسی نے بیان نہ کیا۔ خود میرا نام بھی غلام یٰسین ہے۔ ہم کو آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ براہِ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوےٰ عطا فرمایا جائے۔ کہ کیا خطیب صاحب کی بات درست ہے یا نہیں اگر واقعتہً یہ نام رکھنا غلط ہو۔ تو نام تبدیل کر لیا جائے۔ بَيِّنُوْا وَتُؤْجَرُوْا ؕ

سائل:۔ شیخ غلام یٰسین معرفت چشتی اینڈ کمپنی کامونکی ضلع گوجرانوالہ مورخہ:۔ ۸۰-۸-۱۸

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

عزیزِ گرامی ابھی ابھی آپ کا خط وصول ہوا۔ اگرچہ جوابات استفتاء دارالافتاء مدرسہ غوثیہ نعیمیہ

سے علی الترتیب جاری کیئے جاتے ہیں۔ اور دو دن میں ایک فتوےٰ مکمّل کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا نمبر دو ماہ بعد تھا۔ مگر قبلہ محترم عبداللطیف صاحب مالکِ چشتی اینڈ کمپنی کی معرفت کا وجوباً احترام کرتے ہوئے ترتیب قانونی کو بوجہ الفت و محبت توڑ کر فوری طور پر آپ کو جواب دیا جا رہا ہے کیونکہ قانون کو محبوبوں کی خاطر توڑ دینا بھی سنتِ الٰہیہ ہے۔ اللہ کریم اپنے انبیاء کی خوشنودی کے لیئے موت و حیات جیسے اٹل قانونِ قدرت بھی توڑ دیتا ہے۔ حالانکہ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۵ کی آیتِ کریمہ قانون کی اہمیت کو بخوبی اُجاگر فرما رہی ہے۔ بہر حال معرفت و نسبت، دنیا و آخرت میں بڑی عظیم نعمت ہے خدا جس کو نصیب کرے۔ اگر یہ معرفت نہ ہوتی۔ تو آپ کو یقیناً دو ماہ تک کلفتِ انتظار، برداشت کرنا پڑتی۔ آپ کا استفتاء وصول ہوتے ہی جو تحقیق میرے ذہن میں تھی۔ وہ فتوے میں درج کی جا رہی ہے۔ امید ہے۔ زیادہ تحقیق کی ضرورت محسوس نہ فرمائیں گے۔ اگر زیادہ وضاحت اور تحقیق درکار ہوئی تو کچھ وقت خرچ کر کے کتب بینی کی جائیگی۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ استفتاء آنے کی صورت میں۔ مکمّل فتوای جاری کیا جائے گا۔

جواب ملاحظہ فرمائیے:

قانونِ شریعت کے مطابق۔ اللہ اور رسول کے اَسماءِ طیبہ سے اپنے نام رکھنا بلحاظ جائز و ناجائز ہونے کی چند صورتوں پر مشتمل ہے۔

پہلی صورت: یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام بغیر اضافت رکھنے قطعاً ناجائز اور گناہ ہے لہٰذا کسی کو جائز نہیں کہ اپنا نام اللہ رکھے یا اللہ تعالیٰ۔ یا کسی اپنے بیٹے کا نام الٰہ یا معبود رکھ دے۔ ہاں اضافت کے ساتھ یہ نام رکھنا بالکل جائز ہیں۔ مثلاً عبداللہ یا عبدالمعبود نام رکھنا بالکل جائز ہیں۔

دوسری صورت: یہ ہے۔ کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے مادۂ استقاق یا مصدر کی طرف اضافت یا بلا اضافت سے نام رکھنا بھی بالکل ناجائز اور گناہ کبیرہ ہے۔ مثلاً کسی شخص کا نام عبدالتوحید یا عبدالکرم یا عبدالرزق رکھنا بھی حرام ہے۔ **تیسری صورت:**۔ باری تعالیٰ ربّ العزت کی صفاتِ خصوصیہ میں سے بغیر اضافت نام رکھنا بھی قطعاً منع ہے۔ مثلاً کسی کا نام رب تعالیٰ یا ربُّ العالمین۔ خالق، باری تعالیٰ وغیرہ رکھنا حرام ہے۔ ہاں اضافتِ عبدیّت سے جائز ہے۔ مثلاً عبدالرب عبدالرحمٰن یا عبدالخالق یا شاکر باری اسی طرح رازق بغیر اضافت جائز ہے۔ مگر رزّاق کسی بندے کا نام بغیر اضافت رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ لفظِ رزّاق اللہ کریم کی خصوصی صفت ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ۲۵۱ پر ہے:۔ فَعُلِمَ اَنَّ الْعَبْدَ یُقَالُ لَہُ الرَّازِقُ بِھٰذَا وَلَا یُقَالُ رَزَّاقٌ

لِاَنَّہٗ مِنْ اَسْمَآءٍ مُخْتَصَّۃٍ بِہٖ تَعَالٰی ؎ (ترجمہ): بندے کو رازق کہنا جائز ہے۔ لیکن رزّاق کہنا گناہ ہے۔ کیونکہ یہ لفظِ رزّاق اللہ تعالٰے کی خصوصی صفات میں سے ہے۔ **چوتھی صورت**:۔ یہ کہ اللہ تعالٰی کی صفاتِ غیر خصوصی کو بلا اضافت یا اضافت سے نام رکھنا۔ یہ بالکل جائز ہے۔ مثلاً عبدالکریم نام رکھنا بھی جائز اور کریم نام رکھنا بھی شرعاً بالکل جائز۔ **پانچویں صورت**:۔ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالٰے کی طرف اضافت میں عبدیت اور شاکریت کی نسبت چھوڑ کر۔ ایسے لفظ کی اضافت کی جائے۔ جو یا تو بذاتِ خود گستاخی ہو یا اس میں گستاخی کا شائبہ ہو۔ مثلاً کسی کا نام ابن اللہ یا ابن الرّبیا صاحبۃ اللہ یا بنت اللہ رکھنا، حرام قطعی ہے۔ کہ اس میں صراحتاً گستاخی ہے۔ اور اللہ و رسول کی گستاخی کفرِ حقیقی ہے۔ اسی طرح کسی کا نام غلام اللہ یا امراۃ اللہ یا نساء اللہ رکھنا گناہِ کبیرہ ہے۔ کہ یہ الفاظ مشترک المعانی ہیں۔ ان میں گستاخی کا احتمال نکلتا ہے۔ اس لیئے کہ غلام کا ایک معنٰی ہے۔ بیٹا اور لفظِ نساءٌ اور امرأۃٌ بیوی کو بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ۲۲۷ پر ہے۔ غلام، لڑکا مجازاً، نوکر، بندہ یعنی حقیقی ترجمہ ہے، لڑکا، مجازاً نوکر۔ عبد کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں۔ مجمع البحار جلد سوم صفحہ نمبر ۳۶ پر ہے:۔ اَلْغُلَامُ یُقَالُ لِلصَّبِیِّ مِنْ حِیْنِ الْوِلَادَۃِ اِلَی الْبُلُوْغِ ؎ (ترجمہ)۔ لفظِ غلام ہر بچے کو بلوغ تک کہا جاتا ہے۔ فقہاءِ کرام بابُ النسب میں فرماتے ہیں:۔ اِمْرَأَۃُ الرَّجُلِ تَلِدُ غُلَامَہٗ اِنْ لَمْ یُنْکِرْ (ترجمہ) اگر خاوند منکر نہ ہو۔ تو بیوی اپنے خاوند ہی کا بیٹا جنتی ہے۔ یعنی نسب ثابت ہو جاتا ہے قرآنِ کریم میں ارشاد ہے لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا ؎ ہر مسلک کا مترجم اس کا ترجمہ یہی کرتا ہے کہ جبرائیل نے کہا۔ میں بخشوں گا۔ اے مریم تجھ کو پاک بیٹا۔ ثابت ہوا۔ کہ غلام کا معنے بیٹا بھی ہے:۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے۔ یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ ؎ (ترجمہ):۔ اے نبی کی بیویو۔ فقہاءِ کرام کتابُ الطلاق بابُ المحرمات میں بہت جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔ اِمْرَأَۃُ الصَّغِیْرِ ؎ (ترجمہ):۔ یعنی نابالغ کی بیوی لہٰذا ان مشترک الفاظ کی نسبتِ اضافت اسمِ باری تعالٰے کی طرف سخت ترین گناہ ہے یہ پانچ صورتیں وہ تھیں۔ جو اسماءِ ربُّ العزت سے متعلق تھیں ان میں بعض جائز اور بعض ناجائز مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ نام رکھتے وقت ان احتیاطوں کو مدِ نظر رکھیں:۔ **چھٹی صورت**:۔ یہ ہے۔ کہ بغیر اضافت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسمِ پاک ذاتی سے۔ اپنایا۔ اپنے بیٹے کا نام رکھا جائے۔ بالکل جائز ہے۔ بلکہ باعثِ برکت ہے۔ گو یا کہ اللہ تعالٰی کا ذاتی نام بلا اضافت رکھنا منع ہے۔ مگر نبی پاک کا ذاتی نام اپنے لیئے رکھنا جائز ہے۔ مثلاً لفظِ احمد یا لفظِ محمد ہر مسلمان اپنا نام رکھ سکتا ہے۔ اضافت ہو یا نہ ہو۔ یہاں بھی اضافت میں یہ شرط ہے۔ کہ گستاخی ظاہری

یا معنوی نہ ہو۔ اسی لیئے محمد آلِ حسن نام رکھنا منع ہے۔ کہ لفظِ آل میں صغریت ہے۔ اس کی نسبت لفظِ محمد کی طرف کرنا گناہِ عظیم ہے۔ فقط آلِ حسن نام رکھنا جائز ہے۔ لہٰذا غلام محمد، احمد بخش، عبدالمصطفٰے نام رکھنے بالکل جائز ہیں۔ کیونکہ لفظِ عبد بمعنٰے مطیع ہے۔ **ساتویں صورت**:۔ یہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی صفت سے بغیر اضافت نام رکھا جائے۔ مثلاً نبی رسول نام رکھنا یا ذاتی اسم مبارک اور صفتِ خصوصی کو ملاکر نام رکھا جائے۔ مثلاً محمد نبی یا نبی احمد یہ سب گناہ ہے کیونکہ لفظِ نبی وغیرہ نبی کریم کی خصوصی صفات ہیں۔ اسی طرح نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء کی خصوصی صفت کو اللہ کریم کے ذاتی یا خصوصی نام سے ملاکر نام رکھنا بھی ناجائز ہے۔ مثلاً کسی کا نام نبی اللہ رکھنا۔ یا رسول الرحمٰن رکھنا قطعاً گناہ کبیرہ ہے:۔ **آٹھویں صورت**:۔ یہ ہے۔ کہ آقائے دو عالم حضور اقدس صَلَّی اللہُ تعالٰی عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَ سَلَّمَ کی صفاتِ غیر خصوصیہ سے بلا اضافت نام رکھنا بالکل درست ہے۔ مثلاً کسی کا نام رحیم و رؤف، رحمت، نور وغیرہ رکھنا بالکل جائز ہے۔ اسی طرح ذاتی نام کے ساتھ غیر خصوصی صفت لگاکر نام رکھنا بھی ٹھیک ہے۔ جیسے کہ رؤف احمد، محمد کریم۔ ایسے ہی غیر خصوصی صفت کو باری تعالٰی کے ذاتی نام سے ملاکر لکھنا بھی جائز ہے۔ مثلاً **حبیب اللہ**، کریم اللہ، شفیق الرحمٰن۔ یہ نام شرعاً جائز ہیں۔ یہ تھیں آٹھ صورتیں جن سے معلوم ہو گیا۔ کہ مسلمان کو اللہ اور رسول کے ناموں سے کون سا نام منتخب کرنا جائز ہے۔ کونسا اپنے لیئے وضع کرنا حرام اور نا جائز ہے۔ ان تمام شقوں کو سمجھنے کے بعد مسئلہ مذکورہ کا جواب ملاحظہ ہو۔ قانونِ شرعی کے مطابق غلام یٰسین نام رکھنا بالکل جائز ہے۔ اس لئے کہ صحیح تو یہ ہے کہ لفظِ یٰسین آقائے دو عالم صلے اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کا اسم خصوصی ہے۔ چنانچہ تفسیر معانی التنزیل خازن جلد پنجم صفحہ نمبر ص۱۹۴ پر سورۃ یٰسین کو شروع ہی اس طرح کیا گیا ہے (سُوْرَۃُ یٰسٓ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ۔ مَکِّیَّۃٌ) ترجمہ :۔ یٰسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت مکی ہے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ یہ آقائے کائنات محمد مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام خصوصی ہے۔ تفسیر مدارک علی اربع تفاسیر جلد پنجم صفحہ نمبر ص۱۹۵ پر ہے :۔ (یٰسٓ) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا مَعْنَاہُ یَا اِنْسَانُ فِیْ لُغَۃِ طَیٍّ وَعَنْ اِبْنِ الْحَنَفِیَّۃِ یَا مُحَمَّدُ لِحَدِیْثٍ اِنَّ اللہَ تَعَالٰی سَمَّانِیْ فِی الْقُرْاٰنِ بِسَبْعَۃِ اَسْمَاءٍ۔

نمبر ۱ مُحَمَّدٌ ۲ اَحْمَدُ ۳ طٰہٰ ۴ یٰسٓ ۵ اَلْمُزَّمِّلُ ۶ وَ الْمُدَّثِّرُ ۷ عَبْدُ اللہِ ۔ (ترجمہ) :۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ اور ضحاک اور حسن اور سفیان بن عیینہ سب اَجِلّہ فرماتے ہیں۔ کہ یٰسین کے معنٰی ہیں۔ یا انسان سعید بن جبیر نے فرمایا۔ کہ اسی طرح

مشہور لغت حبشہ میں ہے۔ اور لفظِ انسان سے قرآن کریم میں نبی کریم ہی خطاباً مراد ہوتے ہیں۔ جیسے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ میں لفظِ انسان سے کثیر مفسرین کے نزدیک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم ہی مراد ہیں۔

اُن عبارات صحابہ سے بھی ثابت ہوا کہ یٰسٓ۔ پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصی صفت ہے۔

علماء متقدمین میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ اپنے ترجمۂ قرآن میں فرماتے ہیں۔ یٰسٓ ترجمہ۔ اے سید۔ بوستان صفحہ نمبر ۵ پر فرماتے ہیں شعر

ترا عزِ لولاک تمکین بس است — ثنائے تو طٰہٰ و یٰسٓ بس است

علماء متاخرین میں سے حضرت مولانا اسرار احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:۔ شعر

ہو کس زباں سے شکر ادا تیرا اے خدا — اپنے حبیبِ پاک کو قرآں میں جا بجا
یٰسٓ کہیں پکارا تو طٰہٰ کہیں کہا — حٰمٓ، نٓ اور کہیں وَالشَّمْسِ وَالضُّحٰی

میں کیا ہوں جو ثنا و صفت آپ کی کروں
تم سب پڑھو درود میں نعتِ نبی کروں

اِن فرمودات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ لفظِ یٰسٓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک ہے:۔ دلائل الخیرات،، شریف میں صوفی اکمل وَلیِ کامل علامہ محمد جزولی صفحہ نمبر ۱۱ پر آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسماءِ حسنہ میں فرماتے ہیں۔: طٰہٰ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ۵ یٰسٓ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ۵ حتماً واضح ہوا۔ کہ یہ لفظ مبارک رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسم مبارک ہے۔ بعض نے کہا۔ کہ یہ لفظ متشابہات سے ہے۔ مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیئے کہ یہ لفظِ یٰسٓ بقولِ اَجلّہ صحابہ و تابعین مرکب ندائی ہے۔ جس کو لفظ متصل بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ابنِ کثیر کی عبارت سے ثابت کیا گیا۔ اس کا پہلا حرف یا ہے۔ دوسرا سین ہے۔ قبیلہ طے کی عربی لغت میں سین کے معنیٰ ہیں۔ انسان۔ متشابہات وہ حروف ہوتے ہیں۔ جو کسی زبان میں کسی بھی معنیٰ میں مستعمل نہ ہوتے ہوں۔ اور پھر اگر یہ لفظ متشابہات سے ہوتا۔ تو صحابہ کرام کو اس کا معنیٰ و مطلب نکالنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ متشابہات کے پیچھے پڑنا جہلا کا کام ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے۔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۵ (ترجمہ) متشابہات کا ذاتی علم بجز پروردگارِ عالم کے کسی کو نہیں بڑے بڑے علم والے یہی کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہم ایمان لے آئے۔ اس کے اس منشاء و مقاصد پر۔ مسلک احناف میں وَالرّٰسِخُوْنَ علیحدہ جملہ ہے۔ مگر روافض شیعہ کے نزدیک

اِلَّا اللّٰہُ وَالرَّاسِخُوْنَ کا عطف ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اگر دونوں کا عطف تسلیم کیا جائے تو یَقُوْلُوْنَ سے دونوں کا تعلقِ فاعلی لازم آئے گا۔ جو صریحاً کفر کی طرف راجع ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ ذاتی طور پر متشابہات کا علم کسی کو نہیں۔ جیسا کہ روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۳۶۵ پر ہے۔ وَذَھَبَ قَوْمٌ اِلٰی اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَجْعَلْ لِاَحَدٍ سَبِیْلًا اِلٰی اِدْرَاکِ مَعَانِی الْحُرُوْفِ الْمُقَطَّعَۃِ مِنْ اَوَائِلِ السُّوَرِ ہ:۔ (ترجمہ) وہی جو اوپر گزرا:۔

اور علمِ عطائی صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اگر لفظِ یٰسٓ بھی متشابہ ہوتا۔ تو کسی کو ہمت نہ تھی۔ کہ اس کا مطلب بیان کرتا۔ شوافع بھی اسی عطف کے قائل ہیں بہر حال یہ غلط ہے۔ صاف ظاہر ہوا۔ کہ لفظ یٰسٓ نبی کریم رؤف رحیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مبارک ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ لفظ یٰسٓ قرآنِ کریم کا نام ہے۔ اور بعض کا قول ہے۔ کہ یہ لفظ اللہ تعالےٰ کا نام ہے۔ اسی کو ہمارے خطیب صاحب مذکور نے اپنا مسلک بنایا۔ مگر یہ دونوں قول بھی غلط ہیں۔ اور یہ بات شعورِ ایمانی کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اگلی عبارت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہی خطاب ہے۔ اور خطاب سے پہلے ندا فصاحت کے عین مطابق ہے۔ باعتبار لغت یٰسٓ۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام مبارک ہے۔ جیسا کہ لغاتِ کشوری میں صفحہ نمبر ص۷۰۵ پر ہے:۔ اب رہا یہ سوال۔ کہ لفظِ یاسین کا ترجمہ کیا ہے۔ تو لغتِ قبیلہ طے میں اس کا ترجمہ ہے:۔ یا انسان۔ جیسے کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا بیان ہوا مگر اہلِ تحقیق کے نزدیک یہاں اس کا ترجمہ ہے۔ اے کائنات کے سردار۔ چنانچہ تفسیر حسینی پارہ ۲۲ میں یہی لکھا ہے۔ کہ یٰسٓ کے معنی ہیں اے سردار۔ تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص۳۶۵ پر ہے۔ حَرْفُ سِیْنٍ اِشَارَۃٌ بِکَلِمَۃِ یَا سَیِّدَ الْبَشَرِ اَوْ یَا سَیِّدَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ہ (ترجمہ):۔ حرفِ سین سے اس طرف اشارہ ہے۔ کہ اے سید البشر یا اے اولین و آخرین کے سردار۔ خود حدیثِ رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آپ ہی کائنات باری عزاسمہٗ کے سردار معظم ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۵۱۱ پر ہے۔ اور جامع صغیر جلد اوّل صفحہ نمبر ص۱۰۸ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ

اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۵ (ترجمہ) آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ میں اولادِ آدم یعنی انسانوں کا سردار ہوں۔ قیامت کے دن۔ صرف انسانوں کا ذکر اس لیئے ہے۔ کہ انسان سب مخلوق کے سردار قیامت کا ذکر صرف اظہارِ شان کے لیئے ہے۔ کہ اس دن سرداری عجب آب و تاب سے ظاہر ہوگی۔ ورنہ آج بھی سب مخلوق کی سرداری کا سہرا سرورِ کائنات علیہ السلام کے سر پر ہی ہے۔ اس لیئے ربّ العزت نے ارشاد فرمایا۔ یٰسٓ۔ اے کائنات کے سردار۔ پس اُن دلائلِ متعدّدہ سے ثابت ہوا۔ کہ یٰسٓ کا ترجمہ ہے۔ اے سردار۔ اور یہ لفظ آپ کا عظیم صفاتی خصوصی نام ہے۔ روح البیان کے نزدیک لفظِ یٰسٓ مفرد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ؎۔ وَیُؤَیِّدُہٗ اَنَّہٗ یُقَالُ لِاَهْلِ بَیْتِہٖ اٰلِ یٰسٓ ۵ (ترجمہ) ؎۔ اور تائید کرتا ہے۔ اس کی یہ قول کہ کہا جاتا ہے۔ اہلِ بیت کو آلِ یٰسٓ۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ لفظِ یٰسٓ مفرد ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وَ اٰلِہٖ وَسلم کا نام خصوصی ہے۔ تو جس طرح غلام محمد اور غلام نبی نام رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح غلام یٰسین بھی نام رکھنا جائز ہے۔ وہ جن خطیب صاحب نے غلام یٰسین نام رکھنا ناجائز بتایا ہے۔ وہ کم فہم معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایسے ناموں سے منع کرنا چاہیئے۔ جو یا تو منحوس ہوں۔ اور یا مشابہ کفر ہوں۔ یا بے معنیٰ ہوں۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے نام تبدیل فرما دیا کرتے تھے۔ غلام یٰسین بہت پیارا اور شاندار نام ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمان انگریزوں کی مثل، سویٹی، کیٹی، پرویز، لبو، ڈبو نام رکھیں۔ بہتر یہ ہے۔ کہ پیارے آقا کی نسبت سے مسلمان بچوں کے نام رکھیں۔ تاکہ نام کی نسبت سے کام و عمل میں برکتیں ہوں۔ لہٰذا غلام یٰسٓ نام رکھنا جائز ہے۔ ہاں چونکہ لفظِ یٰسین نبی کریم کا ذاتی نام نہیں اور نہ ہی غیر خصوصی صفت ہے۔ بلکہ یہ لفظ آپ کی خصوصی صفت ہے۔ اس لیئے صرف یٰسٓ نام نہ رکھا جائے۔ جیسے کہ پہلے بتادیا۔ کہ کوئی شخص اپنا نام صفتِ خصوصی سے نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً نبی یا رسول نام رکھنا منع ہے۔ اسی طرح فقط یٰسین نام رکھنا بھی منع ہے۔ کیونکہ نبی بھی خصوصی صفت اور یٰسٓ بھی خصوصی صفت۔ اور جیسے کہ محمد، نبی یا نبی احمد نام رکھنا منع ہے۔ اور ایسے ہی محمد یٰسٓ نام رکھنا بھی منع ہے۔ صرف غلام یٰسین نام رکھنا جائز ہے ؎۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ۵

کتبہ

داڑھی مبارک اسلام کا عظیم الشان شعار ہے

سوال ۸۰: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ دین اسلام میں داڑھی کا کیا مقام ہے۔ اور داڑھی مبارک کی شرعی حد کیا ہے۔ کیا شریعت کی رو سے داڑھی کترانا گناہ ہے یا نہیں۔ اور داڑھی مونڈنا یا منڈانا اچھا ہے یا برا۔ داڑھی کترانے والا۔ شریعت میں کیا اچھا مقام رکھتا ہے؟ یا مجرمانہ حیثیت۔ احادیث و قرآن میں یا فقہ اسلامی میں داڑھی شریف کے متعلق کیا حکم ہے۔ سنت ہے یا فرض یا واجب۔ ہمارے علاقے میں جماعتِ اسلامی والے بالکل خشخاش کے برابر داڑھی رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض وہ لوگ جنہوں نے پہلے مودودی صاحب کی دیکھا دیکھی بڑی داڑھی رکھی تھی۔ اب انہوں نے بھی بالکل چھوٹی کرادی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے مودودی صاحب نے پوری تحقیق کرلی ہے اور ثابت کردیا ہے۔ کہ داڑھی کی شریعت میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ کوئی رکھے نہ رکھے۔ چھوٹی سے چھوٹی داڑھی بھی اسلامی داڑھی ہے۔ اسلام نے داڑھی کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ مودودی صاحب کی کتاب رسائل و مسائل کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں مسلمان بزرگوں میں اس بات سے کافی تشویش ہے ہم نے بہت سے نوجوانوں کی داڑھیاں رکھائی ہیں مگر اب مودودی اور ان کی پارٹی کے لوگ ایسی زہریلی باتیں کرکے ان نوجوانوں کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی یہ لوگ مصریوں عربیوں کی داڑھی کا حوالہ دیتے ہیں۔ کبھی کسی طرف کی باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے ہم کو باہمی مکالمے یا مناظرے کا اس موضوع پر چیلنج دیا ہے۔ آٹھ دن بعد میں نے اُن سے داڑھی کے مسئلے پر مناظرہ کرنا ہے۔ میں سخت فکرمند ہوں۔ میرے پاس فی الحال ٹھوس دلائل نہیں۔ میں آپ سے پورا واقف نہیں۔ البتہ مجھ کو یہاں کے سب بزرگوں نے آپ ہی کا پتہ بتایا۔ لہٰذا آپ جناب کی خدمتِ اقدس میں یہ سوال نامہ بھیج رہا ہوں۔ مع جوابی لفافہ۔ جلد از جلد جواب ارسال فرما کر شکریے کا موقعہ دیں۔ میری فتح آپ کی فتح ہوگی۔ بَیِّنُوْا وَتُوجَرُوْا

سائل:۔ آپ کا خادم:۔ اقبال احمد جعفری بہاولپور شہر طالب علم کالج ایم اے اسلامیات

مورخہ: ۱۹۷۳-۹-۱۱

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

عزیزِ گرامی مجاہدِ اہلِ سنّت پیاری تحریر وصول ہوئی۔ داڑھی شریف کے متعلق ہمارے مقتدا محسنِ مسلمین تاجدارِ سنیّت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی علیہ الرحمۃ نے ایک بسوط

کتاب لکھی، جو آپ کو بہت مفید تھی۔ مگر سوئے اتفاق سے وہ اس وقت ہمارے کتب خانہ میں نہیں ورنہ وہی بھیج دی جاتی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی تحریر کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن آپ کو جلدی کے پیش نظر مختصر اُدلائل لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ آپ کے خط کے بعد بحیثیت مفتیٔ اسلام ہونے کے اور فتویٰ نویسی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے میں نے خود رسائل و مسائل کا مطالعہ کیا۔ اور مذکورہ فی السوال منقلات کو بغور دیکھا سوال کی مختصر عبارت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نکلیں۔ داڑھی شریف کے متعلق مودودی صاحب کی عبارات موجودہ دور میں نوجوان طبقے کے لیئے بہت خطرناک پائیں۔ مودودی صاحب کی اپنی صورت اور پھر ان کی عبارات داڑھی شریف کی مخالفت میں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ مزید کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مودودی اور ان کی پارٹی عقیدۃً ایک وہابی ٹولہ ہے۔ اور عملاً آزاد خیالی ہے۔ جو سراسر منزلِ گمراہی ہے۔ جناب مودودی صاحب کی اپنی داڑھی بالکل شریعت مطہرہ کے مطابق ہے۔ مگر اپنی اس تحریر کے آئینے میں سرسیّد علی گڑھی کی داڑھی کی طرح محض ایک بہروپ نظر آتا ہے۔ مودودی صاحب کا رسائل و مسائل جلد اول میں یہ کہنا کہ شریعت میں داڑھی کا کوئی مقام یا مقدار نہیں۔ عجیب لاعلمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ شریعت تو قرآن و حدیث اور اجماعِ امت و قیاس کا نام ہے۔ حالانکہ ان تمام میں داڑھی کا پورا مقام و درجہ واضح ہے۔ کیا مودودی صاحب اور ان کا ٹولہ بھی ان ہی اصول اربعہ کو شریعت مانتا ہے۔ اگر ایسا ہی واقعہ ہے تو داڑھی کے متعلق ایسی غیر ذمہ دارانہ تحریر سے ہم سوائے غفلت یا زمانہ سازی کے کیا اندازے لگا سکتے ہیں قانونِ شریعت میں بے شمار آیات و احادیث اور فقہ ائمہ اربعہ سے اور عقلاً نقلاً داڑھی کا ہر طرح ثبوت ملتا ہے۔ جہاں تک دلائلِ لحیہ کا تعلق ہے۔ تو ایک مومن کامل عاشقِ رسول الفت احمد مجتبیٰ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم میں سرسبز و شاداب کے لیئے تو شمائلِ ترمذی اور مسلم شریف کی دو روائتیں ہی کافی ہیں۔

چنانچہ شمائلِ ترمذی صفحہ نمبر ۲ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ ابْنُ وَكِيْعٍ (الخ) عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ خَالِيْ هِنْدَ ابْنَ اَبِيْ هَالَةَ وَكَانَ وَصَّافًا عَنْ حِلْيَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (الخ)، فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُفَخَّمًا يَتَلَأْلَأُ وَجْهُهٗ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ (الخ) كَثُّ اللِّحْيَةِ:۔ (الخ)۔ ترجمہ:۔ امام عالی مقام حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں یعنی نبی کریم کے متبنّٰی حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کے متعلق سوال کیا۔ اور آپ کا کام بھی یہی تھا۔ کہ لوگوں کے سامنے آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی شکلِ پاک کے اوصاف ہی بیان کرتے رہتے (کیسی پیاری عبادت ہے جسے اللہ تعالیٰ نصیب کرے) تو میرے پوچھنے پر آپ نے فرمایا

کہ پیارے آقا علیہ التحیۃ والثناء بھرے چہرے والے پارئیب جسم شریف والے تھے۔ آپ کا چہرہ مقدسہ اس طرح نور بکھیرتا تھا۔ جس طرح چودھویں رات کا چاند ساری کائنات کو منور کرتا ہے۔ اور گھنی داڑھی شریف تھی۔ مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۵۸ پر اس طرح الفاظ ہیں:۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔ قَالَ۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَثِیْرُ شَعْرِ اللِّحْیَۃِ۔ (ترجمہ)

:۔ حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا۔ کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی پاک کے بال مبارک بہت بھرے ہوئے تھے۔ محبِّ صادق کے لیئے یہ دو حدیثیں ہی دلائل کثیرہ و براہین عدیدہ ہیں۔ اس لیئے کہ حبیب کو محبوب کی ہر ادا پیاری ہوتی ہے۔ اور مومن کے لیئے سراپا ایمان فخر الاسلام احمد مجتبٰی کی اداؤں کی نقل ہی عبادتِ عظمٰی ہے اسی لیئے ربّ کریم نے ارشاد فرمایا:۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ پارہ ۲۱ نمبر آیت ۲۱۔ ترجمہ:۔ اے دنیا بھر کے مسلمانوں بے شک تمہارے لیئے اللہ کے رسول کے طور طریقوں میں اچھا نمونہ ہے۔ تمام انبیاء کرام خصوصاً آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم، علیہم اجمعین وعلیہم السلام کا کوئی فعل، کوئی عمل، کوئی طریقہ، کسی عادت یا رواج کی بناء پر نہیں ہوتا۔ نہ محض قومی فیشن کی وجہ سے بلکہ حضراتِ انبیاء کے تمام افعالِ طیبہ طاہرہ قانونِ شریعت ہوتا ہے۔ بلکہ نبی کریم کی عادتِ مبارکہ بھی رواجی نہیں شرعی ہے۔ اسی لیئے آپ کے وہ افعال جو محض عادتِ کریمہ سے ظاہر ہوئے۔ مثلاً کدو، شہد اور دودھ پسند فرمانا، ان کو اختیار کرنا بھی ہر مسلمان کے لیئے مستحب ہے۔ اور جو افعال عادتِ کریمہ سے نہیں اُن پر عمل کرنا ہر مومن پر واجب ہے۔ داڑھی انہی میں سے ہے، جیسا کہ آگے ثابت ہوگا۔ توضیح صفحہ نمبر ۱۳۷ پر ہے۔ یَجِبُ عَلَیْنَا اِتِّبَاعُ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ فِیْ اَفْعَالِہِ الَّتِیْ لَیْسَتْ بِسَہْوٍ وَلَا طَبْعٍ وَلَا مُخْتَصَّۃٍ بِہٖ۔ اور یہ کہنا عین مناسب ہے کہ محمد مصطفٰی علیہ الصلٰوۃ والسلام کے تمام عمل یہاں تک کہ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا، سونا، جاگنا ہی اصل دینِ اسلام ہے۔ اگر دین و شریعت سے کردارِ احمد مجتبٰی کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تو دین بے پتوں اور بے جڑ والا درخت ہے۔ احادیث و سنتِ رسول اللہ سے ہی دین کی بہار ہے۔ حدیثوں کو چھوڑ کر دین کچھ بھی نہیں۔ یہ اس لیئے ہے۔ کہ انبیاء کرام صرف وہی کام ادا فرماتے ہیں جو اللہ تعالٰی کا حکم ہو۔ کیونکہ مقصد بعثتِ انبیاء کرام معاشرے کو درست کرنا اور قومی رواجوں اور فیشنوں کو ختم کرنا ہے۔ دین اور شریعت صرف نماز، روزہ نہیں بلکہ دینِ اسلام، حیاتِ دنیا کے ہر کام پر بالادستی رکھتا ہے۔ نبیِ کریم رؤف و رحیم سب کو اپنے نقشِ قدم پر چلانے کے لیئے تشریف لائے۔ کسی رسم و رواج کو اپنانا شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ غارِ حرا کی نمازیں اور عبادات اور ریاضات کس رواج کے مطابق تھیں۔ اُس ظالم دور میں دُرِیتیم صلی اللہ علیہ وسلم کا

یتیم کا ملجا و ماویٰ دادرس، فریادرس، مشکل کشا ہونا، صادق الوعد وامین ہونا کس معاشرے سے متعلق تھا۔ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معاشرے کا لباس تک اختیار نہ فرمایا۔ بلکہ اپنے اور مسلمان کے لیئے شریعت پاک کا علیحدہ لباس مرتب فرمایا (دیکھو کتب احادیث میں باب لباس النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ پس ثابت ہوا کہ انبیاء ومرسلین کے تمام افعالِ طیبہ اعمالِ طاہرہ تو امت کے لیئے نمونہ ہے۔ نبی کریم کے عادات وخصائل بھی عبادتِ اسلامیہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اہمیت ومدارج کے اعتبار سے بعض فرض بعض واجب، بعض سنتِ مؤکدہ اور غیر مؤکدہ ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا کی نقل ہی ایمان بخش قانون ہے۔ وہی مومن کامل ہے۔ جو صورتاً، سیرۃً، ظاہراً، باطناً، اولاً، آخراً، سرکارِ اولین وآخرین کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرے۔ اور نبی کریم کے ہر عمل اور ہر حکم کو خدائے برتر وقہار کا حکم جانے۔ اور یہ سب کچھ عشقِ مصطفےٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی پیاری سمجھ والے کے لیئے تو بس یہ دو روایتیں ہی کافی ہیں مگر فی زمانہ اس طرح بیہودہ گستاخانہ ابن الوقت قسم کی تحریروں نے قوم کے اوباشوں کو گمراہی کی حد تک بے باک کر دیا۔ دینی شرم وحیا مفقود، ایمانی ادب واحترام ختم۔ یہیں پر بس نہیں۔ بلکہ مودودی قسم کے لوگوں کی تحریریں پڑھ کر بعض لوگ اسلام پر دلیر بن گئے۔ کبھی نماز کا مذاق کرتا۔ کبھی نمازیوں کو برا سمجھنا۔ کبھی مسجد کی تضحیک۔ کبھی علماء اور امام مساجد پر پھبتیاں کستا۔ کبھی داڑھی کو نشانہ بنانا۔ گویا سیاسی پریکٹس ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا۔ کہ ہندو مشرک بھی مسجدوں کا اِس طرح ادب کرتے تھے۔ کہ جب کسی گلی، محلّے، میں ڈھول باجے کے ساتھ گذرتے تو مسجد کے پاس خاموش ہو جاتے۔ مگر اس زمانے کا مسلمان دل میں اتنا ادب بھی قائم نہیں رکھتا۔ یہ سب ایسی صحبتوں اور ایسے رسائل کی تربیت کا ہی اثر ہے۔ جہلاء نے اسلامی باتوں کو نقصان دِہ کہنا شروع کر دیا۔ ایسی باتیں اسی دَور میں سننے میں آئیں۔ کہ (معاذ اللہ) داڑھی نقصان دِہ ہے۔ اور لڑائی کے وقت مار پڑواتی ہے۔ کہ دشمن اسی کو پکڑ کر مارتا ہے۔ پوچھو بیوقوفوں سے کس نے کہا ہے۔ کہ داڑھی رکھ کر تم لوگوں سے مار کھاتے رہو۔ کیوں ایسے بیہودہ کام کرو۔ کہ لوگ تم کو ماریں۔ اور پھر داڑھی منڈانے والوں کو لوگ ہاتھ پکڑ کر مارتے ہیں۔ تو چاہیئے کہ سارے داڑھی منڈے لوگ اپنے اپنے ہاتھ بھی کٹا دیں کہ یہ بھی نقصان دِہ ہیں۔ یاد رکھو کہ داڑھی پکڑ کر کوئی نہیں مارتا کیونکہ داڑھی رکھ کر قدرتاً خود بخود اکثر لوگ مہذب ہو جاتے ہیں بدتہذیبی تو آوارہ مزاجی آزاد خیالی سے آتی ہے۔ مار تو پڑتی ہے ان ریچھ نما سروں اور سر کے ریچھ نما بالوں سے۔ جو اب ایک فیشن بنتا جا رہا ہے۔ ہر مہذّب چیز میں نکتہ چینیاں کرنا۔ اور از راہِ دلگی ہر بات میں ثبوت مانگنا فی زمانہ ایک رواج بن چکا ہے۔ حالانکہ جو زیادہ ثبوت مانگتے پھرتے ہیں۔ وہ عمل بالکل نہیں کرتے۔ لیکن اتمامِ حجت کے لیئے مندرجہ ذیل عبارت میں داڑھی سے متعلق پورے دلائل پیش کیئے جاتے ہیں:۔

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَرَءُوْفِ الرَّحِیْمِ۔ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ:۔
جاننا چاہیئے کہ مسلمان کی داڑھی اسلام کا نشانِ اعظم ہے۔ از آدم علیہ السّلام تا سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر تا حضرت اویس قرنی۔ اسی طرح از حضرتِ امامِ اعظم ابوحنیفہ تا ایں زمانہ تمام ہادی بزرگ اکابرِ اسلام نے اِس نشانِ اعظم کو اپنے مُقدّس چہروں سے وابستہ رکھا۔ یہ وابستگی بھی داڑھی شریف کی بلندی مقام کی بہت بڑی دلیل ہے قرآن کریم فرماتا ہے:۔ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ط (پ۱۷ آیت نمبر ۳۲ سورۃ حج) :۔ ترجمہ:۔ اور کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کی تعظیم اور ادب کرے کیونکہ تعظیم دلوں کا تقوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نشانات مثل ممنوعہ علاقوں کے ہیں۔ ان میں عقل وخرد کی دست درازیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ کسی شخص کو اجازت نہیں کہ اللہ اور رسول کے ان شعائر میں اپنی ناقص عقل سے کتر وبیونت کو حلال جانے۔ چنانچہ قرآنِ مجید پارہ نمبر ۶ سورۂ مائدہ آیت نمبر ۲ میں ارشاد باری ہے:۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ ۔ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! نہ حلال کر لینا تم اللہ کے نشانات کو (اپنی دست درازیوں کے لیئے) اسلام ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے تمام اصول وفروع بالکل مقرّر ومعیّن ہیں۔ بخلاف دیگر ادیانِ باطلہ کے ان کا کوئی طریقہ دینی معیّن نہ ہوا۔ ہر دور میں کچھ مدّت معیّنہ کے بعد ان کے بنائے ہوئے دینی اصول تبدیل ہو جاتے ہیں یہی ان کے بطلان کی ایک بڑی نشانی ہے۔ اسلام کے تمام قوانین کی طرح داڑھی کا حکم بھی بالکل معیّن ومحدود ہے۔ حکمِ شریعت مطہّرہ کے مطابق داڑھی رکھنا فرضِ عین ہے۔ اس لیئے کہ نصِّ قطعی سے ثابت ہے۔ حدیث پاک کی عبارتُ النّص اور قرآن کریم کی اقتضاءُ النّص اور دلالتَ النّص واشارۃُ النّص جیسی نصوصِ عدیدہ داڑھی رکھنے کا بالوضاحت حکم دے رہی ہے۔ قرآن وحدیث کے بحرِ ذخّار میں غوطہ لگانے کے لیئے صرف عقلِ سلیم کی ضرورت ہے۔ حدیث پاک کی کتاب موطا امام مالک جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳۱ پر ہے۔ حَدَّثَنِیْ عَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِاِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَاِعْفَاءِ اللُّحٰی ط
ترجمہ:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ پاک صاحب لولاک نے حکم دیا کہ مونچھیں پست کرو اور داڑھیاں بڑھاؤ۔ اس حدیثِ پاک کو مسلم شریف جلدِ اوّل صفحہ نمبر ۱۲۹ پر ان الفاظ سے روائیت کیا ہے:۔ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰی ط:۔
ترجمہ:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مونچھیں گھٹاؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ۔ اس حدیث سے فرضیتِ داڑھی ثابت ہوئی کیونکہ اَعْفُوْا امر حاضر کا صیغہ ہے اور امر حقیقۃً واصلاً وجوب کے لیئے ہوتا ہے کسی اور معنیٰ میں لینے کے لیئے قرینہ شرط ہے۔ چنانچہ تلویح علی توضیح صفحہ نمبر ۲۱۴ پر ہے لِاَنَّ الْاَمْرَ عَلٰی

اَنَّ الْاَمْرَ الْمُطْلَقَ لِلْوُجُوْبِ وَلَا نِزَاعَ فِیْ اَنَّهٗ قَدْ یَکُوْنُ لِغَیْرِهٖ مَجَازًا بِمَعُوْنَةِ الْقَرَائِنِ (ترجمہ):- مقصود یہ ہے کہ صیغۂ امر مطلق طور پر وجوب کے ہوتا ہے۔ مجازی معنیٰ میں کسی علامت اور قرینے کی مدد سے ہوگا۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ پس چونکہ اس حدیث میں حقیقی معنیٰ یعنی وجوب کو چھوڑنے اور مجازی مراد لینے کا کوئی قرینہ نہیں لہٰذا یہاں وجوب ہی ثابت ہوگا۔ نیز ترکِ داڑھی پر احادیث میں بہت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ جس سے بھی داڑھی رکھنے کی فرضیت ہی ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ابھی آئندہ بیان ہوگا۔ کیونکہ نفرت اور وعید صرف ترکِ فرض پر ہوتا ہے۔ نوافل اور مستحبات کا چھوڑنا لائقِ وعید نہیں۔ جیسا کہ ہم نے حرمتِ قوّالی کے بیان میں ثابت کر دیا۔ مزید براں۔ شریعتِ مطہرہ نے داڑھی کی حد بیان فرمائی جیسا کہ ابھی آئندہ بیان ہوگا۔ اور حد صرف فرائض کی ہوتی ہے نوافل وغیرہ کی نہیں نہ استحبابی عبادت کی۔ جیسا کہ آگے ثابت کیا جائے گا۔ اور اصولِ فقہ کا قانون ہے کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے جن افعالِ پاک پر حکم کے دلائل قائم ہو جائیں وہ امّت پر بھی واجب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ توضیح صفحہ نمبر ۳۱۴ پر ہے:- یَجِبُ عَلَیْنَا اِتِّبَاعُ النَّبِیِّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِیْ اَفْعَالِهِ الَّتِیْ لَیْسَتْ بِسَهْوٍ وَلَا طَبْعٍ وَلَا مُخْتَصَّةٍ بِهٖ لِلدَّلَائِلِ الدَّالَّةِ عَلٰی ذَالِکَ:- ترجمہ: ہم تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ نبی کریم رؤف و رحیم کے ان افعالِ مبارکہ کی اتّباع جو نہ آپ سے خاص ہیں۔ نہ سہوًا ہوئے نہ عادتاً۔ ان دلائل کی بنا پر جو ان فعلوں پر قائم ہوئے۔ خیال رہے کہ لفظ واجب، فرض و واجب دونوں حکموں کو شامل ہے۔ اِن وجوہ کی بنا پر اس مندرجہ بالا حدیث مبارکہ سے داڑھی رکھنے کی فرضیت بالکل عیاں ہو گئی اور یہ حدیث پاک نصِّ قطعی ہے کیونکہ کثرتِ روایات کی بناء پر متواتر کے درجہ میں ہے۔ چنانچہ بیس[۲] کتبِ مشہورہ نے کچھ تغیرِ لفظی کے ساتھ مختلف اسناد سے اسی حدیث کو روایت کیا۔ ۱ مسلم شریف ۲ موطا امام مالک ۳ مسند امام اعظم ۴ مسند احمد بن حنبل ۵ بخاری شریف ۶ ابو داؤد ۷ ترمذی شریف ۸ نسائی شریف ۹ ابن ماجہ شریف ۱۰ طحاوی شریف ۱۱ ابن عدی کامل ۱۲ طبرانی اوسط ۱۳ بیہقی فی شعب الایمان ۱۴ ضیاء صحیحہ ۱۵ ابو نعیم فی الحلیہ ۱۶ طبرانی کبیر ۱۷ خطیب بغدادی ۱۸ ابن سعد ۱۹ جامع الرضوی ۲۰ جامع صغیر۔ ان کتب کے اخراج نے اس حدیث کو متواتر معنوی بنا دیا۔ چنانچہ تدریب الراوی صفحہ نمبر ۳۷۳ پر ہے:- کَوْنُ الْمُتَوَاتِرِ مَوْجُوْدًا وُجُوْدَ کَثِیْرَةٍ فِی الْاَحَادِیْثِ اَنَّ الْکُتُبَ الْمَشْهُوْرَةَ الْمُتَدَاوِلَةَ بِاَیْدِیْ اَهْلِ الْعِلْمِ شَرْقًا غَرْبًا۔ اِذَا اجْتَمَعَتْ عَلٰی اِخْرَاجِ حَدِیْثٍ وَتَعَدَّدَتْ طُرُقُهٗ تَعَدُّدًا تُحِیْلُ الْعَادَةُ تَوَاطُؤَهُمْ عَلَی الْکِذْبِ:- ترجمہ: وہ حدیث بھی متواتر ہے جس کو اتنی زیادہ کتبِ مشہورہ نے مختلف طریقوں سے روایت کیا ہے۔ اس معتبرہ متواترہ حدیث

کے عبارت النص سے ثابت ہوا کہ داڑھی رکھنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ داڑھی کی مطلق فرضیت کو اجماع سے بھی ثابت کیا جائے گا اور فرض مطلق کا منکر شرعاً کافر ہوتا ہے۔ ہاں فرض مقید جو اجتہاد سے ثابت ہوتا ہے اس کا منکر کافر نہ ہوگا (کبیری ص۲۰) یہ تھی عبارت النص جس سے داڑھی رکھنا فرض ثابت ہوا۔ اب دلالۃ النص اشارۃ النص اور اقتضاء النص میں آیاتِ قرآنیہ جن سے داڑھی رکھنے کا واضح ثبوت مل رہا ہے، چنانچہ پہلی آیت یہ ہے:۔ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۔ ترجمہ:۔ مردود ہونے کے وقت شیطان نے کہا کہ میں اُن بندوں کو گمراہ کروں گا۔ اور اُن کو دنیوی امیدوں میں پھنساؤں گا اور ان کو حکم کروں گا۔ کہ جانوروں کے کان کاٹیں۔ اور حکم دوں گا ان کو کہ اللہ کی پیدائش کو بگاڑیں۔ اس آیت کریمہ نے دلالۃً داڑھی کی فضیلت اور فرضیت کو بیان فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کی پیدا کی ہوئی اشیا کو بدلنے اور بگاڑنے میں عقلاً و نقلاً داڑھی منڈانا اور کترانا بھی شامل ہے۔ نقلاً تو اس طرح کہ بہت مفسرین داڑھی منڈانے یا کم کرنے کو تغیر خلق اللہ میں شمار کرتے ہیں، چنانچہ تفسیر روح المعانی پارہ ۵ سورۃ نساء اسی آیت نمبر ص۱۲ صفحہ نمبر ۱۵۰ پر فرماتے ہیں:۔ وَخُصَّ مِنْ تَغْيِيرِ خَلْقِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ الْخِتَانُ وَالْوَشْمُ لِحَاجَةٍ وَخَضْبُ اللِّحْيَةِ وَقَصُّ مَا زَادَ مِنْهَا عَلَى السُّنَّةِ ۔ (ترجمہ) ترجمہ:۔ تغیر خلق اللہ تعالیٰ (جو شیطانی کام ہے) اسی میں خصی کرانا، اور چہرہ گدھوانا کسی بھی ضرورت کے تحت ہو۔ اور داڑھی کو سیاہ خضاب لگانا، داڑھی کو کم کرنا اس سے جو سنت کے مطابق زائد ہو۔ اسی طرح تفسیر نعیمی جلد پنجم صفحہ نمبر ۴۳۳ پر اور تفسیر حقانی اردو اسی آیت کے تحت ہے، ثابت ہوا کہ داڑھی منڈانا یا کترانا حرام اور شیطانی امر ہے۔ تغیر خلق اللہ کی ایک صورت مثلہ کرنا ہے۔ اور اس آیت سے اس کی حرمت بھی ثابت ہے۔ فقہاءِ امت کے نزدیک داڑھی کٹانا بھی مثلہ ہے۔ چنانچہ ہدایہ شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۳۶ پر ہے:۔ وَلِاَنَّ حَلْقَ الشَّعْرِ فِيْ حَقِّهَا مُثْلَةٌ كَحَلْقِ اللِّحْيَةِ فِيْ حَقِّ الرِّجَالِ ۔ (ترجمہ) ترجمہ:۔ احرام سے کھلتے وقت عورتیں اپنے سر نہ منڈائیں کیونکہ جس طرح کہ مردوں کی داڑھی منڈانا مثلہ ہے اسی طرح عورتوں کا سر مونڈنا بھی مثلہ ہے۔ مثلے کی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں۔ مثلہ کہتے ہیں کسی کے چہرے بگاڑنے کو۔ اس لئے کہ جمال چہرے میں ہی ہوتا ہے۔ اور صحیح تر یہ ہے کہ چہرے کے اعضاء کے علاوہ جسم کے دوسرے اعضاء کا کاٹنا مثلہ نہیں۔ ورنہ چور کے ہاتھ کاٹنے اور ڈاکو کے ہاتھ پیر کاٹنے کی شرعی اسلامی سزا نہ ہوتی حالانکہ مثلہ اسلامی شریعت نے ہی حرام کیا ہے چنانچہ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۳۰ پر ہے:۔ ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَغَيْرِهِمَا النَّهْيُ عَنِ الْمُثْلَةِ ۔ ترجمہ:۔ بخاری و مسلم اور ان کے علاوہ کتب حدیث کی روایات سے مثلے کی ممانعت ثابت ہے۔ چہرے کے اعضاء میں سے داڑھی بھی ایک عضو ہے

اس لیئے اس کا کاٹنا بھی شرعاً مثلہ ہی بنے گا۔ بخلاف جسم کے دوسرے بالوں کے کہ ان کا کاٹنا مثلہ نہیں کہلاتا نہ کسی حدیث سے ثابت ہے۔ حالانکہ داڑھی کاٹنے کو حدیثِ پاک میں مثلہ فرمایا گیا۔ چنانچہ مجمع البحار جلد سوم نے صفحہ نمبر ۲۷۹ پر نہایہ لابنِ اثیر کے حوالے سے اور جامع صغیر جلد دوم نے صفحہ نمبر ۱۸۲ پر طبرانی کے حوالے سے اور کنوز الحقائق لِامام عبد الرؤف مناوی جلد دوم نے صفحہ نمبر ۱۲۱ پر ابو داؤد کے حوالے سے ایک حدیث نقل فرمائی۔ الفاظ جامع صغیر اور مجمع البحار کے یہ ہیں:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَثَّلَ بِالشَّعْرِ فَلَيْسَ لَهُ عِنْدَ اللّٰهِ خَلَاقٌ۔ مُثْلَةُ الشَّعْرِ حَلْقُهُ مِنَ الْخُدُوْدِ ترجمہ:۔ روایت ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ فرمایا۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جو شخص بالوں کا مثلہ کرے۔ اس کے لیئے اللہ کے پاس اجر و ثواب کا کچھ حصہ نہیں۔ اور بالوں کا مثلہ چہرے کے بال مونڈنے ہیں۔ رخساروں کے بال داڑھی ہی ہوتی ہے۔ ان ہر سہ کتب مشہورہ کی روایات نے صاف بتادیا کہ داڑھی کا کاٹنا مثلہ ہے اور مثلہ اسلام میں حرام ہے؛ دوسری آیتِ کریمہ جس سے داڑھی رکھنے کا ہر مسلمان کو ثبوت مل رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ:۔ ترجمہ: اور جب رب العزت نے حضرت ابراہیم کو آزمایا کچھ کلمات سے۔ تو آپ نے ان سب کو پورا کر دکھایا (پارہ دوم سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۲۳) اس آیتِ پاک نے بھی دلالۃً داڑھی کی فرضیت کو بیان فرمایا۔ ملتِ ابراہیمی کی پیروی واجب ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ۔ ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرو۔ یہاں اِتَّبِعْ صیغۂ امر بھی وجوب کے معنی میں ہے۔ کیونکہ یہاں کلمات سے مراد مفسرین کرام کے نزدیک وہ دس فطرتیں بھی ہیں جن کا ذکر حدیث شریف میں مذکور ہے۔ ان میں داڑھی رکھنا بھی ایک فطرت ہے۔ ایسا ہی تفسیر روح المعانی نے اس آیت کے ماتحت صفحہ نمبر ۳۷۵ پر فرمایا۔ اس آیت نے دلالۃً ثابت کیا۔ کہ داڑھی فرض ہے۔ کیونکہ کلمات میں داڑھی شامل ہے جس سے پتہ لگا کہ داڑھی ملتِ ابراہیمی ہے۔ اور ہم مسلمانوں پر ملتِ ابراہیمی کی پیروی واجب ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا۔ پھر کسی پیغمبر۔ رسول۔ مرسل علیہم السلام سے داڑھی کم کرانا ثابت نہیں لہٰذا ظاہر ہوا کہ داڑھی رکھنا بھی ایک فطرتِ انبیاء ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں باب المسواک میں صفحہ نمبر ۴۴ پر ہے:۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ۔ (الخ) ترجمہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ فرمایا سرورِ دو جہان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے دس چیزیں انسانی فطرت یعنی جبلی عادت میں سے ہیں۔ ان میں سے ایک مونچھیں ہلکی کرانی، دوسری داڑھی بڑھانی، سوم مسواک کرنی وغیرہ وغیرہ ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ شریعت کے حکم کے علاوہ انسانی شرافت کے لیئے بھی داڑھی رکھنا ضروری ہے۔
گویا کہ ان دس خصلتوں کے بغیر مسلمانی تو درکنار انسانیت بھی مکمل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان خصائلِ عشرہ کا تمام شریعتوں نے حکم دیا۔ خود قرآنِ کریم، انبیاءِ کرام کی ان ہی جیسی خصائل حمیدہ کا ذکر فرما کر تمام اُمتِ مسلمہ کو عمل کرنے کا حکم فرما رہا ہے۔ چنانچہ پارہ ہفتم سورۂ انعام آیت نمبر ۹۰ میں ارشاد ہے:۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ ۔ ترجمہ:۔ یہی وہ انبیاء کرام ہیں جن کو خصوصی طور پر ان تمام خصائل کی اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی۔ تو اے پیارے حبیب میری بات (ہدایت) کو ان انبیائے کرام کے پاس ہے آپ بھی اختیار فرمائے رکھو۔ اور یہ پہلے بتا دیا گیا ہے کہ نبی کریم کے تمام افعالِ طیبہ و اعمالِ طاہرہ محض امت کے لیئے ہیں۔ کیونکہ رب کریم نے آپ کو نمونۂ قدرت بنا کر معلمِ کائنات بنایا۔ پس جس طرح اساتذہ کے افعال تعلیمِ تلامذہ ہوتے ہیں۔ بلا تشبیہ یوں ہی سمجھیئے۔ کہ درس گاہ کائنات میں سرورِ کائنات کے افعالِ مقدس تعلیمِ امت کے لیئے ہی ہیں۔ داڑھی مبارک کا تو بہت ہی اہم حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تو ہاں اور نہ میں اسلام کی حلت و حرمت پوشیدہ ہے۔ دیکھو ترمذی کتاب الحج صفحہ نمبر ۲۰۲ پر ہے۔ اب کسی شخص کا یہ کہنا کہ داڑھی معاذ اللہ نبی کریم نے عربی رواج کے مطابق رکھی۔ اس لیئے یہ شرعی حکم نہیں۔ اسی بچے کی بیوقوفی کی بات کے مثل ہو گا۔ جو استاد کو تختۂ سیاہ پر لکھتا دیکھ کر اپنی کاپی یا تختی پر صرف اسلیئے نہ لکھے اور اپنے دل میں یہ سمجھ لے کہ استاد کا یہ لکھنا ایک اسکولی رواج یا اس کی اپنی عادت یا ذاتی مذاق ہے جو میرے یا کسی بھی شاگرد کے لیئے ضروری نہیں۔ ایسا شاگرد یقیناً قابلِ سزا ہے۔
تو سمجھ لو کہ داڑھی رکھنے کے متعلق ایسا کہنے والا بھی اُخروی تعزیر کا مستحق ہے۔ خیال رہے کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ کے ترجمہ کا مطلب وہ نہیں جیسا کہ مولوی ابن تیمیہ وہابی نجدی کے شاگرد ملا علی قاری نے مرقات جلد اول صفحہ نمبر ۱۵۱ پر لکھا ترجمہ وہی مشہور اور منشاءِ کلام کے مطابق ہے جو ہم نے کیا کہ یہاں
نبی کریم کو انبیاءِ سابقین کی اِتّباع کا حکم نہیں۔ وہ تو خود نبی کریم کے مقتدی تھے۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اقتداء کا حکم ہے اور وہ بھی اقتدا پر قائم رہنے کا کہ قائم ہونے کا کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کے نزول سے پہلے بھی اِن خصائلِ عشرہ داڑھی وغیرہ پر عامل تھے۔ چنانچہ روح المعانی پارہ ہفتم صفحہ نمبر ۱۷۱ پر ہے:۔ بِاَنَّ الْاَخْذَ بِاُصُوْلِ الدِّیْنِ حَاصِلٌ لَهٗ قَبْلَ نُزُوْلِ الْاٰیَةِ فَلَا مَعْنٰى لِلْاَمْرِ بِاَخْذِ مَا قَدْ اَخَذَ۔ قُبِلَ۔ اَللّٰهُمَّ اِلَّا اَنْ یُّحْمَلَ عَلَى الْاَمْرِ بِالثَّبَاتِ عَلَیْهِ ؕ۔
ترجمہ: اعتراض اس طرح سے بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اصولِ دین نماز، روزہ، صبر، شکر، سیرت، صورت، داڑھی وغیرہ پر تو آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پہلے سے ہی عامل تھے۔ تو اس قول کا کیا مطلب ہو گا۔

جو پہلے آیت سے لیا گیا۔ پس اس جواب کے سوا چارہ نہیں کہ اس آیت کے امر کا مطلب یہ کیا جائے۔ کہ اے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم اس اقتداء پر قائم رہئے۔ یہ تو دیگر مفسرین کا قول تھا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہو سکتا ہے۔ اے پیارے نبی۔ انبیاء عظام کی اس خدائی ہدایت کی اقتداء پر اپنی امتِ مسلمہ کو قائم رکھئے کیونکہ باب افتعال متعدی بھی ہوتا ہے اِس مطلب سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ داڑھی کا حکم قرآن کریم کی رو سے ہر مسلمان کے لیئے ضروری ہدایت ہے۔ تیسری آیت پاک جو داڑھی کی فرضیت کے حق میں اشارۃ النص ہے قرآن کریم پارہ نمبر۳ آیت نمبر۳۱ سورتِ آلِ عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۝ ترجمہ: اے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تمام مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس آیت کریمہ سے تمام امت کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اتباع افعال کی ہی ہوتی ہے۔ داڑھی مبارک رکھنا بھی افعالِ مقدسہ میں شامل ہے۔ اس لیئے اس میں بھی اتباع نبی کریم رؤف ورحیم شرطِ محبت ہے۔ خیال رہے کہ اتباع اور اقتداء میں بہت طرح فرق ہے۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ اتباع کہتے ہیں کسی کی فرمانبرداری کرتے ہوئے بالکل اس کے نقش قدم پر چلنا۔ نہ ذرہ آگے نہ ذرہ پیچھے نہ دائیں نہ بائیں۔ مگر اقتداء کہتے ہیں وہ راستہ اختیار کرنا جس پر کوئی کبھی چلا تھا۔ یا کسی کا حکم ماننا۔ اسی کو اطاعت بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں پر اتباع صرف نبی کریم رؤف الرحیم کی واجب ہے۔ نہ کہ کسی اور کی۔ اگر کسی نبی کی اتباع کا حکم دیا بھی گیا ہے تو وہ مجازاً ہے۔ یعنی احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۝ (سورۃ نحل آیت نمبر۱۲۳ پارہ ۱۴) ترجمہ: ہم نے بذریعہ اپنے حبیب تیری طرف قرآنی وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیمی کی پیروی کر۔ بعض بزرگوں نے اتّبع کا فاعل نبی کریم کو ہی سمجھا ہے۔ اور ترجیح بھی اسی کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ان کے نزدیک اتباع سے مراد موافقت ہے۔ اس لیئے کہ سب کائنات نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تابع فرمان اور اقتداء میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ عزوجل نے صرف متبوع ہی بنا کر بھیجا۔ لہٰذا یہ آیت بھی اشارۃً داڑھی وغیرہ شعارِ اسلامی کی فرضیت ہی ثابت کر رہی ہے۔ کیونکہ آپ کے افعالِ مبارکہ کی اتباع شرعاً واجب ہے۔ جیسا کہ تلویح کی عبارت نے تصریح کر دی۔ چوتھی آیتِ طیبہ جو داڑھی کے حق میں اقتضاء النص کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ آیت ۹۴ ارشادِ باری، حضرتِ ہارون نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ۝ ترجمہ: اے ماں جائے میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑ اس آیتِ کریمہ نے سب انبیاء کرام کی شکل مبارک کا نقشہ کھینچ دیا کہ اللہ کے نیک بندے اور انبیاء

ومرسلین نے داڑھی مبارک رکھی۔ اور انبیاء کرام کی نقل سیرتاً وصورتاً امت پر واجب ہے۔ اقتضاء ثابت ہُوا کہ ہر مسلمان کے لیئے داڑھی لازمی وضروری ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی دراز ریش مبارک ثابت کرتی ہے کہ آپ نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اور دیگر انبیاء کرام کے متعلق یہ کہیں ثابت نہیں، کہ کسی نے کسی وقت ایک آن کے لیئے داڑھی کٹائی ہو۔ بلکہ حدیث پاک کی دس فطرتوں سے یہی ثابت ہوا کہ سب انبیاء کرام باریش ہی رہے۔ خلاصہ: یہ کہ بیس کتب مشہورہ والی متواتر احادیث اور قرآن کریم کی چار آیات مبارکہ سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر داڑھی رکھنا فرض ہے۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ داڑھی سنت ہے۔ یہ قول ہمارے موقف کے خلاف نہیں عام مشہور بھی یہی ہے۔ اس لیئے داڑھی کو سنت کہہ دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ داڑھی کو فرض بھی کہتے ہیں اور سنت بھی۔ اس لیے کہ سنت کا لفظ پانچ معنیٰ میں مشترک ہے ۱؎ سنت بمعنیٰ حدیث کی کتاب، مثلاً یہ مسئلہ کتاب وسنت کا ہے ۲؎ سنّت بمعنیٰ عمل جیسے فرض، واجب، سنت ۳؎ سنّت بمعنیٰ عادت ہے مثلاً سنت اللہ ۴؎ سنت بمعنیٰ طریقہ ہے۔ جیسے سنتِ خلیل ۵؎ سنتِ بمعنیٰ رسم۔ جیسے حدیث پاک میں سنّتِ حسنہ اور سنتِ سیئہ کے الفاظ آتے ہیں۔ داڑھی کو سنتِ کہنا پہلے معنیٰ کے لحاظ سے ہے یعنی سنت سے ثابت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کتنی لمبی داڑھی رکھنی فرض ہے۔ تو یاد رکھو کہ اسلامی قانون کے مطابق صرف ایک مٹھی یعنی چار انگل داڑھی رکھنا فرض ہے۔ نہ اس سے کم جائز اور نہ اس سے زیادہ جائز۔ ایک مٹھی سے کم داڑھی حرام ہے۔ اور ایک مٹھی سے زیادہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔ اس قانون کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔ پہلی دلیل:۔ یَابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ﴿۔ ترجمہ۔ اے میری ماں جائے میری داڑھی اور سر نہ پکڑ۔ پکڑی وہ چیز جاتی ہے جو مٹھی کے برابر ہو۔ مٹھی سے کم چیز مٹھی میں نہیں آسکتی: ثابت ہوا کہ مٹھی سے کم داڑھی رکھنی سنتِ انبیاء کے خلاف ہے:۔ دوسری دلیل:۔ خود آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک صرف مٹھی برابر ہوتی رہی۔ چنانچہ فتاویٰ درمختار جلد اول صفحہ نمبر ۱۵۵ پر ہے اَللِّحْیَةُ اِذَا کَانَتْ بِقَدْرِ الْمَسْنُوْنِ وَھُوَ الْقُبْضَةُ وَصَرَّحَ فِی النِّھَایَةِ بِوُجُوْبِ قَطْعِ مَازَادَ عَلَی الْقُبْضَةِ ﴿:۔ ترجمہ:۔ داڑھی جبکہ ہو سنّتِ کے برابر اور وہ مقدارِ مسنونہ ایک مٹھی ہے۔ اور شرح نہایا علیٰ ہدایہ نے وضاحت فرمائی۔ کہ واجب ہے۔ مٹھی سے زیادہ داڑھی کے بال کاٹ دینا۔ اس کی شرح شامی میں ہے:۔ حَیْثُ قَالَ وَمَا وَرَآءَ ذَالِکَ یَجِبُ قَطْعُهٗ هٰکَذَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ کَانَ یَاْخُذُ مِنَ اللِّحْیَةِ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا اَوْرَدَهٗ اَبُوْعِیْسٰی یَعْنِیْ تِرْمَذِیْ وَمُقْتَضَاهُ الْاِثْمُ بِتَرْکِهٖ ﴿:۔ ترجمہ: نہایہ نے اس طرح تصریح فرمائی ہے۔ کہ مٹھی بھر داڑھی کے علاوہ بال کاٹنا واجب ہیں۔ اسی طرح نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

سے ثابت ہے کہ آپ اپنی داڑھی مبارک سے لمبائی اور چوڑائی کے بال علیحدہ فرما دیتے تھے۔ اس حدیث کو ابو عیسیٰ ترمذی نے بھی نقل فرمایا۔ اور اس حدیثِ مطہرہ سے اقتضاءً ثابت ہوا کہ مٹھی بھر داڑھی سے زائد بال نہ کاٹنا چھوڑے رکھنا سخت گناہ ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۰۰ پر یہی محولہ حدیث اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ نَا۔ عُمَرُ بْنُ هٰرُوْنَ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهٖ مِنْ عَرْضِهَا وَطُوْلِهَا هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ ؕ۔ ترجمہ: ہم سے حدیث بیان کی ہناد نے ان سے عمر بن ہارون نے کہ روایت ہے اسامہ بن زید سے وہ عمرو بن شعیب سے وہ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے کہ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بال لے لیتے تھے اپنی داڑھی مبارک کی لمبائی اور چوڑائی کے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ لفظِ غریب سے کسی شخص کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا تین وجہ سے۔ پہلی وجہ۔ یہ کہ غریب حدیث صحیح حدیث ہی کی قسم ہے چنانچہ مقدمہ مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۵ پر ہے اَلْحَدِيْثُ الصَّحِيْحُ اِنْ كَانَ رَاوِيْهِ وَاحِدًا يُسَمّٰى غَرِيْبًا ؕ ترجمہ: اگر صحیح حدیث کی اسناد میں ایک راوی ہے تو اس کا نام غریب ہوگا۔ قانونِ اصولِ حدیث کے مطابق صحیح حدیث کی چار قسمیں ہیں ۱۔ غریب ۲۔ عزیز ۳۔ مشہور ۴۔ متواتر دوسری وجہ۔ یہ کہ اس حدیث شریف کو بطورِ سند دوسری کتب نے بھی قبول کیا ہے جو اس کی قوت پر دال ہے۔ چنانچہ صاحبِ مرقات نے مرقات جلد چہارم صفحہ نمبر ۴۴۲ پر اسی حدیث کو دلیل پکڑ کر یہ حکم لکھا کہ:۔ اَللِّحْيَةُ عِنْدَنَا طُوْلُهَا بِقَدْرِ الْقُبْضَةِ وَمَا وَرَاءَ ذٰلِكَ يَجِبُ قَطْعُهٗ ؕ (ترجمہ) ہمارے نزدیک داڑھی صرف وہ ہے کہ جس کی لمبائی فقط مٹھی بھر ہو۔ اور جو زیادہ ہو اس کا کاٹنا واجب ہے۔ اگرچہ آگے چل کر ملا علی قاری صاحب نے واجب کو بمعنی سنتِ موکدہ کہا ہے۔ مگر یہ غلط اور غیر مضبوط دلیل کے بغیر ہے۔ لہٰذا مجھے تسلیم نہیں۔ کیونکہ اس سے بہت سے فتنوں کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ مشکوٰۃ شریف نے بھی اس حدیث کو صفحہ نمبر ۳۸۱ پر نقل فرمایا۔ بابُ الترجل فصلِ ثانی حدیث نمبر ۳۔ تیسری وجہ یہ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسی فعل طیبہ طاہرہ کی بنا پر تمام صحابہ کرام اپنی اپنی داڑھی مقدس کو درازی میں نہ جانے دیتے تھے بلکہ بڑے اہتمام سے ہاتھ کے ذریعہ چار انگل داڑھی ناپ کر زائد بال کاٹ دیتے تھے۔ جیسا کہ دلیلِ سوم میں ثابت ہوگا۔ اس عمل صحابہ سے بھی اس حدیث پاک کی صحت و قوت کا پتہ لگ گیا۔ بہرحال ثابت ہو گیا کہ حدِ شرع مٹھی بھر داڑھی ہے۔ اس سے زیادہ لمبی داڑھی گناہِ کبیرہ ہے۔ تیسری دلیل۔ بخاری شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۸۷۵ بابِ تقلیم الاظفار آخری حدیث میں ہے۔ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا حَجَّ اَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضَلَ اَخَذَهٗ ؕ۔ ترجمہ: اَجَل فقیہ صحابی حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب حج یا عمرہ فرماتے تھے تو اپنی داڑھی

مبارک اپنی مٹھی شریف سے ناپتے تھے تو جو بال زائد از قبضہ ہوتے ان کو کاٹ لیتے تھے۔ ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک بھی داڑھی کی شرعی حیثیت صرف چار انگل تھی۔ لمبی داڑھی کو وہ بھی گناہ سمجھتے تھے۔ یہ تصرف عبداللہ بن عمر کا فعل ثابت ہوا۔ دیگر صحابہ کرام بھی اسی طرح کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف کے اسی صفحہ نمبر ۸۷۵ پر فتح الباری کا حاشیہ اس طرح ہے ۵ قَوْلُهٗ فَمَا فَضَلَ اَیْ زَادَ عَلَی الْقُبْضَةِ اَخَذَهٗ بِالْمِقَصِّ اَوْنَحْوِهٖ وَرُوِیَ مِثْلُ ذَالِكَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَفَعَلَهٗ عُمَرُ بِرَجُلٍ وَعَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِیِّ یُؤْخَذُ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا مَا لَمْ یَفْحُشْ ؎ ۔ ترجمہ: حدیث پاک میں راوی کا قول فما فضل کا معنیٰ ہے فمازاد یعنی جو بال زائد ہوتے تھے۔ ان کو کاٹتے تھے۔ قینچی یا اس کی ہم مثل چیز سے۔ اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہی داڑھی مبارک کے زائد بال کاٹنا مروی ہے۔ اور حضرت فاروق اعظم نے تو اپنے دست اقدس سے ایک لمبی داڑھی والے شخص کے مٹھی بھر سے زائد بال کاٹ دیئے تھے۔ اور حضرت علی کے خاص تربیت یافتہ خواجہ حسن بصری سے روایت ہے کہ داڑھی کو لمبائی چوڑائی سے کاٹتے رہنا چاہیئے تاکہ حد سے نہ بڑھے۔ اسی حاشیہ کے اگلے الفاظ ہیں۔ فرمانِ رسول علیہ السلام اُعْفُوا اللُّحٰی اس کاٹنے کے خلاف نہیں۔ کیونکہ یہاں داڑھی کو چھوڑ دینے کا مطلب ہے حد تک چھوڑ دو۔ اور حد کیا ہے یہی مٹھی بھر۔ مطلقاً چھوڑنا مراد نہیں۔ ورنہ نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا اور صحابہ کرام کا وہ عمل شریف جو ابھی بیان کیا گیا۔ اس کے خلاف نہ ہوتا اور حضرت ابن عمر کے اس فعل شریف میں راوی کا حج یا عمرے کی قید لگانا اس کے اپنے دیکھنے کی بنا پر ہے۔ ورنہ ابن عمر رضی اللہ عنہ یا صحابہ کرام میں سے کسی کا مٹھی بھر سے زائد کاٹنا حج یا عمرے سے خاص نہیں۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح میں فتح باری نے کہا ہے۔ قُلْتُ اَلَّذِیْ یَظْهَرُ لِیْ اِبْنَ عُمَرَ کَانَ لَا یَخُصُّ هٰذَا لِلتَّخْصِیْصِ بِالنُّسُكِ (الخ) ؎ ۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس روائت کا مطلب یہ ہے کہ ابن عمر اس فعل کو حج سے خاص نہیں فرماتے ہیں۔ پھر اسی حدیث کو فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۷۷ پر ابوداؤد اور نسائی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ وہاں حج یا عمرے کا ذکر نہیں۔ چنانچہ کتاب الصوم صفحہ نمبر ۷۷ پر ہے وَرَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِیُّ فِیْ کِتَابِ الصَّوْمِ۔ عَنْ عَلِیِّ بْنِ الْحَسَنِ (الخ) عَنْ مَرْوَانَ بْنِ سَالِمٍ قَالَ رَاَیْتُ اِبْنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ یَقْبِضُ عَلٰی لِحْیَتِهٖ ۔ (الخ)۔ ترجمہ وہی ہے جو اوپر حدیث میں گذرا۔ یہاں مطلقاً فعل کا ذکر ہے۔ یہی ہمیشہ ہوتا تھا حج کی قید نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے بھی ایسا ہی ثابت ہے۔ چنانچہ فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۷۷ پر مسند ابی شیبہ کے حوالے سے ہے۔ عن ابی زرعۃ قَالَ کَانَ اَبُوْهُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ یَقْبِضُ عَلٰی لِحْیَتِهٖ فَیَاْخُذُ مَا فَضَلَ عَنِ الْقُبْضَةِ ؎ ترجمہ: پوری سند کے بعد ابی زرعۃ تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

فرمایا انہوں نے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی داڑھی شریف پکڑتے تھے تو جو مٹھی سے زائد ہوتی تھی وہ کاٹ دیتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ صرف ایک مٹھی داڑھی شریعت میں جائز ہے۔ زائد بالوں کو کاٹنا واجب ہے جیسے کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ چوتھی دلیل یہ کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کے علاوہ تمام تابعین کا طریقہ بھی یہی رہا۔ چنانچہ شرح العنایہ جلد دوم صفحہ نمبر ۲۷۷ پر ہے۔ وَيُقْطَعُ مَا وَرَاءَ الْقَبْضَةِ۔ وَبِهٖ اَخَذَ اَبُو حَنِيْفَةَ وَاَبُوْ يُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ۔ ترجمہ اور مٹھی سے زیادہ داڑھی کاٹی جائے اور اسکو اختیار کیا، امام اعظم تابعی اور امام یوسف تبع تابعی اور امام محمد تبع تابعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے۔ اور مرقات شرح مشکوٰۃ لملا علی قاری نے بحوالہ احیاء العلوم جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۲۶ پر فرمایا۔ اِنَّ قَبْضَ الرَّجُلِ عَلٰى لِحْيَتِهٖ وَاَخْذُ مَا تَحْتَ الْقُبْضَةِ فَلَا بَاْسَ بِهٖ وَقَدْ فَعَلَهُ ابْنُ عُمَرَ وَجَمَاعَةٌ مِّنَ التَّابِعِيْنَ وَاسْتَحْسَنَهُ الشَّعْبِيُّ وَابْنُ سِيْرِيْنَ (الخ)۔ ترجمہ اگر مسلمان نے اپنی داڑھی کو ناپا اور مٹھی سے نیچے والے بال کاٹ دیئے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور بے شک حضرت ابن عمر اور تابعین کے بڑے گروہ نے ایسا ہی کیا، اور اس کاٹنے کو شعبی اور ابن سیرین نے اچھا جانا۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ اسلامی داڑھی ایک مٹھی بھر ہے نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ پانچویں دلیل عقلی ہم سب بحیثیت مسلمان ہونے کے فرض ہے کہ صرف اور صرف آقائے دوعالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کریں۔ نبی کریم رؤف ورحیم کے اقوال وافعال سے ہٹ کر کسی پیر، فقیر، استاد، عالم، مولوی یا ماں باپ دادوں کا راستہ اختیار کرنا۔ سراسر بے دینی وگمراہی ہے۔ خواہ اقوال میں ہو یا کردار میں معاشرے میں ہو یا تہذیب میں۔ شکل وصورت میں ہو یا سیرت واخلاق میں۔ ہمیں صرف اسوۂ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہی کو مشعل راہ بنانا چاہیئے۔ چونکہ نبی کریم علیہ التحیۃ والسلام نے صرف ایک مٹھی داڑھی رکھی۔ نہ کبھی کم کی اور نہ کبھی زیادہ ہونے دی۔ اسی کی اتباع عام صحابہ کرام اور تابعین، تبع تابعین بلکہ آج تک تمام بزرگان اسلام کرتے چلے آئے۔ کسی تاریخ یا روایت سے ثابت نہیں کہ کسی بزرگ کی داڑھی مقدس حد شرع سے کم یا زیادہ ہو۔ بلکہ ظاہر کلام سے جس طرح یہ ثابت ہوا کہ لمبی داڑھی کو مٹھی تک کم کرنا واجب ہے۔ اسی طرح ایک مٹھی سے کم کرانا بھی حرام ہے۔ چنانچہ شرح قوت المغتذی بر حاشیہ ترمذی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۰۰ پر ہے
قَالَ الشَّيْخُ فِي اللُّمْعَاتِ وَالظَّاهِرُ مِنْ كَلَامِهِمْ حُرْمَةُ حَلْقِ اللِّحْيَةِ۔ ترجمہ۔ روایات مطہرات کے ظاہر کلام سے داڑھی منڈانے کی حرمت ہی ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنے پیر یا استاد یا کسی مجذوب فقیر کی دیکھا دیکھی داڑھی مونچھ یا فقط داڑھی لمبی کر لیتے ہیں وہ سخت فاجر فاسق ہیں۔ اسی طرح داڑھی کترانے یا منڈانے والے بھی فاسق معلن ہیں۔ چھٹی دلیل عقلی۔ دیگر قوانین اسلامیہ کے علاوہ ایک اہم اور ضروری قانون یہ بھی ہے۔ کہ معاشرے کے ہر پہلو میں مسلمان کو کافر مشرک کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ خاص کر علامتی نشانات میں تو

بہت ہی ضروری ہے۔ کہ مسلمان کافر سے ممتاز و متفرق رہے۔ اسی لیئے اکثر احادیث میں خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ کے کلماتِ طیبات ملتے ہیں۔ مدنی تاجدار شہنشاہ عرب و عجم سلطانِ ارض و سما کی پیاری تعلیمات کو بغور دیکھنے سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شکل و شباہت، سیرت و صورت، عبادت و ریاضت، لباس و گفتگو، رہن سہن غرض کہ تمام شعبۂ حیات میں، مسلمانوں کو کفار و مشرکین سے یکسر علیحدہ رہنے کے سبق سکھائے گئے۔ کہ اس میں قوم کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ تو چونکہ داڑھی بھی بہت بڑا نشان تھا۔ اس لیئے اس میں بھی حد بندی اتنی ہی ضروری تھی، جتنی دیگر فرائض میں، عالمِ کفر کی تہذیب پر جب نگاہ ڈالی جائے تو دیگر رسموں کی طرح داڑھی کی بھی ہر قوم میں مختلف رسم ہے۔ چنانچہ مجوسی بالکل داڑھی مونچھ پر استرا پھیرتے ہیں۔ پارسی دو انگل داڑھی رکھتے ہیں۔ یہودی بہت لمبی داڑھی اور مونچھیں بالکل چھوٹی رکھتے ہیں۔ ہمارے علاقے کے مرزائی برش مار کر صرف ٹھوڑی پر مختصر۔ اکثر مذہبی عیسائی بالکل چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھتے ہیں۔ انگریز، کفار اور ہندو داڑھی منڈاتے ہیں اور مونچھیں ہندو بڑی رکھتے ہیں انگریز بالکل چھوٹی مختلف نمونوں کی مونچھیں رکھتے۔ اور بدہ مذہب والے کافر بالکل فارغ البال ہونے کا طریقہ اپنائے ہوئے۔ اور سکھ مونچھیں اور داڑھی دونوں بہت زیادہ لمبی رکھنے کے قائل ہیں۔ ان رسومات کے ہوتے ہوئے لازمی بات تھی کہ مسلمان کی داڑھی ایسے شاندار اور نرالے طریقے سے ہوتی۔ کہ قوم بلحاظ داڑھی بھی سب سے ممتاز نظر آتی۔ اس پیارے غیب دان آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قیامت تک کے سارے حالات سے خبردار ہوتے ہوئے مسلمان کی داڑھی کا ایسا پیارا نقشہ کھینچا۔ کہ حسنِ کائنات سارا اسی میں سمٹا معلوم ہوا اور ملائکہ عرشِ بریں پکار اٹھے۔ سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللِّحَاءِ وَالنِّسَاءَ بِالْقُرُوْنِ ؂ یہ حدیث کنوز الحقائق حاشیہ جامع صغیر جلد اول بحوالہ مستدرک حاکم صفحہ نمبر ۱۴۹ اور ۳ ہدایہ چہارم صفحہ نمبر ۱۹۷ پر ہے۔ ترجمہ۔ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو زینت دی داڑھی مبارک سے اور عورتوں کو سر کے بالوں سے اور چٹیا سے۔ یہ کونسی داڑھی تھی جس سے جمالِ انسانی حاصل ہوا یہ کون سا نقشہ تھا جس سے تسبیح ملائکہ کا شور بلند ہوا۔ یہ وہی اور بس وہی نقشۂ جمال تھا جو وَالضُّحٰی کی وجاہت والے مَا زَاغَ کی پھبن والے نورانی چہرۂ وَالشَّمْسِ پر ابھار کر اَلَمْ نَشْرَحْ کے سینے پہ مزین فرما کر پکارا۔ کہ آؤ اے کائنات والو کدھر بھاگے جاتے ہو کس کے نقشِ قدم کے متلاشی ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (الخ) ترجمہ۔ اگر تم اپنے خالق مالک اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میرے نقشِ قدم پر چلو۔ میری سیرت اور میری اسوۂ حسنہ اختیار کرو۔ یہی وہ نقشہ ہے جس میں نہ افراط جائز اور نہ تفریط اسی نقشۂ ریشِ پاک کے ذریعے مسلمان عالمِ کفر و شرک سے فی البدیہہ جدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی برابر داڑھی شریف خود بھی اختیار فرمائی اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا۔ ساتویں دلیل۔ جتنا گناہ اور عذاب داڑھی منڈانے پر ہے اتنا ہی گناہ اور عذاب داڑھی

کترانے پر ہے۔ چنانچہ ہدایہ جلد اول صفحہ نمبر ۲۲ پر ہے:۔ وَلَا یَقُصُّ لِحْیَتَہٗ لِاَنَّہٗ فِیْ مَعْنَی الْحَلْقِ ۔ ط
ترجمہ۔ کوئی مسلمان داڑھی نہ کترائے اس لیئے کہ داڑھی کترانا بھی منڈانے کی مثل ہے: آٹھویں دلیل۔ چونکہ داڑھی فرائضِ اسلامیہ میں شامل ہے اور ہر فرض ہر لحاظ سے معین و مقرر ہوتا ہے۔ اس لیئے داڑھی کو بھی چار انگل کی طوالت پر مقرر کر دیا۔ اب جس طرح پنج وقتہ رکعات فرائض میں کسی مسلمان، عالم، جاہل، پیر، مرید کو نہ کمی بیشی کا اختیار ہے اور نہ نہ پڑھنے کا۔ بلکہ کمی بیشی کرنے والا بھی عذاب کا مستحق اور نہ پڑھنے والا بھی۔ اسی طرح داڑھی کی حدِ شرعی میں بھی نہ کمی بیشی کا کسی کو اختیار ہے اور نہ نہ رکھنے کا۔ بلکہ تارکِ لحیہ بھی فاسق اور گناہگار اور مٹھی بھر سے کم رکھنے والا بھی فاسق۔ بس ایک مٹھی داڑھی حدِ شرعی ہے۔ خیال رہے کہ مٹھی اور چار انگلیوں کی پیمائش ٹھوڑی کے نیچے سے شروع ہو گی نہ کہ ہونٹ سے، جیسا کہ بعض قاصرِ لحیہ شرارتی لوگ نیچے کے ہونٹ سے ناپ کر دو انگلیوں کو چار انگلی بنا دیتے ہیں چنانچہ فتح الباری شرح بخاری جلد دوم اسی کَانَ ابْنُ عُمَرَ والی سابقہ مذکورہ حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:۔ کَانَ ابْنُ عُمَرَ یُمْسِکُ مِنْ اَسْفَلِ ذَقْنِہٖ بِاَصَابِعِہِ الْاَرْبَعَۃِ (الخ) ط
ترجمہ۔ حضرت ابن عمر اپنی داڑھی مبارک کو ٹھوڑی کے نیچے سے چار انگل کے ذریعے ناپتے تھے۔ اور فتاویٰ فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے:۔ وَمِنْ لِحْیَتِہٖ مَا ھُوَ اَسْفَلُ مِنَ الذَّقْنِ ط ترجمہ اور داڑھی ذقن کے نیچے سے شروع ہے۔ دلیل نہم۔ داڑھی کے منڈانے اور کترانے پر قرآن و حدیث اور فقہ میں عذاب و سزا کی بہت سی دینی، دنیاوی وعیدیں آئی ہیں، حالانکہ وعید مستحب یا سنت فعل و حکم پر نہیں آتی۔ چنانچہ فتاویٰ فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ہشتم صفحہ نمبر ۵ پر ہے:۔ فَاِنَّ تَارِکَ الْوَاجِبِ یَسْتَحِقُّ الْعُقُوْبَۃَ بِالنَّارِ وَتَارِکَ السُّنَّۃِ لَا یَسْتَحِقُّھَا بَلْ یَسْتَحِقُّ حِرْمَانَ الشَّفَاعَۃِ ط ترجمہ۔ اور بے شک واجب کا تارک اخروی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اور سنت کا تارک عذاب کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ محرومیٔ شفاعت کا مستحق ہے۔ پہلی وعید جو داڑھی منڈانے اور بے تحاشا بڑھانے والے کے لیئے قرآن کریم میں وارد ہوئی سورۂ نساء آیت نمبر ۱۱۵ پارہ نمبر ۵ پر ہے وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ط ترجمہ۔ اور کائنات میں جو بھی ہمارے رسول کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ ہدایت اس کے لیئے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل سے بالکل ظاہر ہو گئی، اور اتباع کرے مومنوں کے راستے کے علاوہ کی۔ تو دنیاوی عذاب یہ ہے کہ ہم اس کو آزاد چھوڑ دیں گے۔ اور آخروی عذاب یہ کہ ہم اس کو جہنم میں ڈالیں گے وہ برا ٹھکانہ ہے۔ اس وعید اور جبر ملک میں غلط قسم کی داڑھی والے بھی شامل ہیں، دو وجہ سے ۱ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ط والی آیت میں ثابت کیا گیا۔ کہ داڑھی رکھنا بھی ہدایت انبیا ہے اور یہاں بھی تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی۔ کا ہی جملہ ہے اِقْتَدِہْ والی آیت مکی ہے پہلے نازل ہوئی۔

اور بے دینی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہاں ہدایت سے مراد ہے وہی ہدایت جس کا وہاں ذکر ہوا۔ اور اس میں تو داڑھی شامل۔ لہٰذا یہاں وعید میں بھی داڑھی غلط کرنے والا شامل ہے۔ داڑھی منڈانا تغیرِ خلق اللہ ہے اور شیطانی امر ہے۔ اسی لیے یہ آیت اور فَلَيُغَيِّرُنَّ والی آیت ایک دم نازل ہوئیں۔ یہ آیت نمبر ۱۱۵ ہے اور وہ آیت نمبر ۱۱۹ ہے۔ جب تغیر میں داڑھی منڈانا شامل ہے تو مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ۔ والی آیت میں بھی داڑھی منڈانے والا شامل ہے: دوسری وعید جو حدیث پاک میں وارد ہوئی۔ چنانچہ طبرانی شریف اور جامع صغیر صفحہ نمبر ۱۸۲ پر ہے۔ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَثَّلَ بِالشَّعْرِ فَلَيْسَ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ خَلَاقٍ۔

ترجمہ۔ جو مسلمان بالوں کا مثلہ کرے، تو اللہ ربّ العزّت کی بارگاہ میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔ یعنی اس کے لیے جنّت کا انعام نہیں ہے۔ پہلے مجمع البحار کے حوالے سے ثابت کر دیا گیا۔ کہ بالوں کا مثلہ کیا ہے۔ مزید وضاحت سنیئے۔ حاشیہ سراج المنیر جلد سوم صفحہ نمبر ۳۶۲ پر ہے:۔ مَثَّلَ بِالشَّعْرِ اَيْ جَعَلَهٗ مُثْلَةً بِاَنْ نَتَفَهٗ اَوْ حَلَقَهٗ مِنْ نَحْوِ خَدِّهٖ وَالْمُرَادُ اِنْ لَّمْ شَعْرًا لِحْيَتِهٖ (ترجمہ) ترجمہ۔ بالوں کا مثلہ یہ ہے۔ کہ رخساروں کے بال نوچے یا مونڈے اور مراد اپنی داڑھی کے بالوں کو ختم کرنا ہے۔ قانونِ زینت کے اعتبار سے مثلہ انتہائی ذِلّت کا سبب ہے۔ اگر کسی کو کانا یا اندھا یا نکٹا کر کے چھوڑ دیا جائے تو یہ اس کی کتنی ذلّت ہے۔ اسی طرح پہلے زمانے میں داڑھی مونڈ دینا انتہائی ذلّت سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب یہی ذِلّت فیشن بن گئی۔ آئندہ نہ معلوم کیا کیا ہونے والا ہے۔ اگر کسی زمانے میں ناک کٹنا فیشن بن جائے، یا اندھا، کانا ہونا زینت میں شمار ہونے لگے۔ تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے ایسے مفکّرین و مصنّفین اگر پیدا ہوتے رہے۔ تو یہ دن بھی دور نہیں۔ خدا سب کو عقلِ سلیم اور سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ بخاری شریف جلد دوم ص۸۷۴ پر ایک اور حدیث پاک اس طرح ہے وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ ؀

ترجمہ: نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لعنت فرماتا ہے۔ ان مردوں پر جو خود کو عورتوں سے مشابہہ کریں۔ اور داڑھی منڈانا بھی مشابہتِ زناں ہے: تیسری وعید جو قانونِ فقہاءِ کرام میں وارد ہے وہ یہ ہے کہ داڑھی منڈانے یا کترانے یا مٹھی بھر سے زیادہ لمبی رکھنے والے کو قوم کا امام بنانا ناجائز ہے۔ اگر ایسا شخص مصلّٰۂ امامت پر کھڑا ہو تو اس کو فوراً ہٹا دیا جائے۔ اور اگر اس کے پیچھے کسی نے نماز پڑھ لی ہو تو اس کو لوٹانا واجب ہے۔ یہ حکم اور مصلّٰی سے ہٹایا جانا انتہائی ذلّت ہے۔ کیونکہ امامتِ اسلامی دین و دنیا کی انتہائی عزّت کا نشان ہے۔ جس سے داڑھی منڈانے والا یکسر محروم ہے۔ اگرچہ عالمِ وقت یا علّامۂ زماں یا پیرِ طریقت ہو۔ اس لیئے بے تحاشہ لمبی داڑھی اور چھوٹی داڑھی والا شرعاً فاسق ہے اور فاسق کو ذلیل کرنا واجب ہے۔ اس کو دینی لحاظ سے کوئی درجہ دینا گناہ ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد دوم صفحہ ۶۶ پر ہے۔ بِخِلَافِ الْفَاسِقِ فَاِنَّهٗ

اِسْتَظْهَرَ فِیْ شَرْحِ الْمُنْیَةِ اَنَّهَا کَرَاهِیَةٌ لِقَوْلِهِمْ وَاَنَّ فِیْ تَقْدِیْمِهٖ لِلْاِمَامَةِ تَعْظِیْمَهٗ وَقَدْ وَجَبَ عَلَیْنَا اِهَانَتُهٗ ۔ بَلْ عِنْدَ مَالِكٍ وَرِوَایَةٌ عَنْ اَحْمَدَ لَا تَصِحُّ الصَّلَاةُ خَلْفَهٗ ؕ ۔ (ترجمہ) :۔ بخلاف فاسق گنہگار کے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہی شرح منیہ میں ظاہر کیا۔ تمام فقہاء اسلام کے فرمان کی وجہ سے۔ کیونکہ بے شک فاسق فاجر کو امام بنانے اور مصلیٰ پر آگے کرنے میں اُسکی عزت افزائی ہے۔ حالانکہ ہم مسلمانوں پر واجب ہے اس کی ذِلّت کرنا۔ بلکہ امام مالک کے نزدیک بھی اور ایک روایت امام احمد سے ہے کہ فاسق کے پیچھے بالکل نماز جائز نہیں۔

یہ تھے وہ دلائل جن سے بطریقہ احسن واتم داڑھی کی فرضیت اور حدِ شرعی ثابت ہوئی محض اتمام حجت اور آپ کی تسکین خاطر کے لیے یہ مختصر فتوٰی ارسال خدمت ہے۔ ورنہ اس کے دلائل اور بھی ہیں۔ یہ شیطانی فعل سب سے پہلے شیطان ابلیس نے قوم لوط کے بدکاروں کو سکھایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بچہ اور امرد ثابت کرنے کے لیے داڑھی اور مونچھ کی صفائی کرانی شروع کی۔ بعض بڑوں سے سنا گیا ہے کہ بال صفا پاؤڈر بھی انہوں نے ہی ایجاد کیا ہے۔ اور اپنی مونچھوں اور داڑھیوں کے لیے طرح طرح کی دوائیوں کو ایجاد کیا۔ پھر بعض لوطیوں نے مونچھوں کو کٹانا چھوڑ دیا اور داڑھی بدستور منڈتی رہی۔ ان سے مجوسیوں اور پارسیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا، پھر ان سے ہندوؤں اور ہندوؤں سے مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد نہم پارہ نمبر ۱۷ صفحہ نمبر ۷۲ سورۃ انبیاء آیت نمبر ۷۵ پر ہے:۔ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَشْرُ خِصَالٍ عَمِلَتْهَا قَوْمُ لُوْطٍ بِهَا اُهْلِكُوْا اِتْیَانُ الرِّجَالِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا الخ۔ وَضَرْبُ الدُّفُوْفِ وَشُرْبُ الْخُمُوْرِ وَقَصُّ اللِّحْیَةِ وَطُوْلُ الشَّارِبِ ط

ترجمہ۔ حسن سے روایت ہے کہ فرمایا سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دس خصلتیں جو قوم لوط نے کیں اور جن کی وجہ سے وہ ہلاک کیئے گئے وہ یہ ہیں۔ ۱ لواطت کرنا وغیرہ وغیرہ ۲ ڈھول باجہ بجاتے رہنا مثلاً قوالی وغیرہ اور شرابیں پینا۔ ۳ داڑھیاں منڈانا ۴ مونچھیں لمبی کرنا ۵ ریشم مردوں کو پہننا ۶ کبوتر بازی۔ بہر حال دلائل کثیرہ سے واضح اور ثابت ہو گیا کہ داڑھی مشت بھر رکھنی فرض ہے۔ اور کٹوا کر کم کرنا یا بالکل منڈوانا کفار کا طریقہ اور باعث عذاب۔ قرآن وحدیث کے ان دلائل واحکام اور فقہاء امت کے فرمودات کو دیکھ کر اور میرے اس فتوے کو پڑھ کر اگر اب بھی اے مسلمانوں عبرت نہ پکڑو اور عمل نہ کرو۔ تو بتاؤ اب کس چیز کا انتظار ہے۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ؕ ترجمہ :۔ قرآن پاک جیسے آخری کلام کے بعد اب کس بات پر ایمان لاؤ گے :۔ مسئلہ۔ امام مسجد پر امامت کیلئے اشد لازم ہے کہ چار انگل داڑھی ہو کٹی ہوئی نہ ہو بعض فاسق امام اور حافظ لوگ ماہ رمضان میں توبہ کرلیتے ہیں کہ ہم آئندہ داڑھی نہ کٹائیں گے اور تراویح پڑھا دیتے ہیں عوام انکی توبہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں یہ توبہ غلط ہے اگر سچی توبہ بھی ہو تب بھی جب تک پوری داڑھی نظر نہ آئے امامت نہیں کراسکتا۔ کیونکہ فسق ظاہر ہے اور توبہ پوشیدہ۔ فاسق کی امامت اسلیئے منع ہے کہ فسق سے اللہ رسول کو ایذا ہے مشکوٰۃ شریف صلا پر ہے کہ نبی کریم نے ایک ایسے امام کو امامت سے

ہٹا دیا جس نے کعبے کی طرف منہ کر کے تھوکا تھا اور نبی کریم کو اس فعل سے دکھ پہنچا تھا تو داڑھی منڈانا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

سید اور بنی ہاشم کون ہیں، بلوچ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اولاد نہیں کیونکہ حمزہ رضی اللہ عنہ کی نسل نہیں چلی، کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ سید ہیں

سوال نمبر ۹: ۔کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے ہیں کہ ہماری بستی میں دو شخصوں کا اس مسئلہ پر جھگڑا ہوا کہ زید کہتا ہے کہ حضرت علی سید ہیں اور آپ کی ساری اولاد جو فاطمہ زہرا کے علاوہ دوسری چار بیویوں سے پیدا ہوئی وہ ساری اولاد بھی سید ہے جن کو ہماری اصطلاح میں علوی کہا جاتا ہے :۔ خالد کہتا ہے کہ حضرت علی سید نہیں اور حضرت علی کی علوی اولاد جو امام محمد بن حنفیہ وغیرہ سے چلی وہ بھی سید نہیں سید صرف حضرت امام حسن اور امام حسین کی اولاد کو کہتے ہیں۔ زید بھی اہلسنت ہے اور پیری مریدی کرتا مگر شیعوں سے بھی صحبت رکھتا ہے ہمیں فتوے عطا فرمایا جائے کہ کس کی بات درست ہے :۔ کیا حضرت علی اور آپ کی علوی اولاد کو سید مانا جائے یا نہیں براہِ کرم مدلل فتوائے عطا فرمایا جائے ہم سب بستی والوں نے متفقہ طور پر آپ کے فتوای کے مطابق فیصلہ کرنا ہے ۔ ۲ کیا بلوچ لوگ حضرت حمزہ کی اولاد ہیں

المستفتی محمد اکبر علی نزد گورنمنٹ سکول دولت نگر ضلع گجرات

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابُ

صورتِ مسئولہ میں قانون شریعت کے مطابق زید کا قول غلط ہے خالد صحیح کہتا ہے۔ موجودہ شرعی اصطلاح میں سید صرف حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کو اور اُن کی تا قیامت اولاد کو کہا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ کسی صحابی کی اولاد کو سید نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ صدیق اکبر کی اولاد ہو یا فاروق اعظم کی ۔ عثمانِ غنی کی اولاد ہو یا مولا علی مشکل کشا کی رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین۔ زید کا یہ کہنا کہ حضرت علی سید ہیں اور آپ کی اولاد علوی سید ہے۔ قطعاً غلط اور خلافِ حقیقت و درایت و روایت ہے عقلاً نقلاً بھی یہ بات کہیں ثابت نہیں۔ خالد کی یہ بات کہ سادات کی نسل امامین کریمین طیبین طاہرین سے چلی، بالکل درست ہے

اور اس کے بہت سے دلائل ہیں۔ ہم فقط اہلسنت کے عقائد کو ظاہر و ثابت کرنے کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں میری اس ساری تحریر کا روئے سخن فقط وہ سنی دانشور ہیں جو مزاجِ فہمیدہ رکھتے ہیں۔ یا وہ لوگ ہیں جو ظاہراً تو سنی ہیں مگر مائل بر رفض ہو چکے ہیں۔ لیکن شیعہ حضرات۔ تو اُن سے خطاب نہیں کہ وہ تو اگر حضرتِ علی کو خدا بھی کہہ دیں تو کیا بعید ہے بلکہ اُن کا ایک فرقہ نصیریہ موجودہ بارہ امامیہ تو علی الاعلان علی رب کا نعرہ لگاتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق کوئی علوی سیّد نہیں ہے۔ نسلِ سادات صرف حسنؓ و حسینؓ سے چلی رضی اللہ تعالٰے عنہما۔ اس مسلک پر گیارہؔ دلائل ہیں:۔

دلیلِ اوّل:۔ یہ باتِ اظہر من الشمس ہے کہ علومِ معقولات علمِ لغت سب پر مقدم ہے۔ بدیں وجہ الفاظِ مشترکہ میں اوّل معنٰے لغوی ہوگا اسی لحاظ و اعتبار پر باقی معنٰی کا دار و مدار ہے:۔ عربی کے الفاظِ مشترکۃ المعانی اپنے رواج و اصطلاحات و ضروریات کے تحت بنتے چلے جاتے ہیں مگر بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ لغوی معنٰے کی حیثیت بدرجہ اتم قائم ہے اگر تمام جگہ لغت کی جلوہ گری نہ ہو تو الفاظِ مشترکہ سب غلط ہو جائیں لغوی معنٰے کی اسی اصلیت کی وجہ ہے کہ اندھا دھند کوئی شخص بھی مشترک لفظ نہیں بنا سکتا۔ دیکھو عربی میں لفظ عین کا لغوی معنٰے اصل حقیقت ہے مگر ضرورت کے مطابق اس کو مشترک بنا لیا گیا اور یہ لفظ چار معنٰے میں مشترک ہو گیا ع۱ سورج ع۲ گھٹنا پیر کا۔ ع۳ چشمہ پانی کا ع۴ آنکھ۔ لیکن سب جگہ لغوی ترجمے کا لحاظ قائم ہے چنانچہ سورج کو عین اس لیئے کہا گیا کہ فلکیات میں سب کا نور عارضی عطائی بالواسطہ ہے مگر اس کا نور اصلی ذاتی بلاواسطہ ہے۔ پیر کے گھٹنے کو عین اس لیے کہا گیا کہ پیر کی قوت اور رگوں کا اصلی مرکزی مقام یعنی ہیڈ آفس یہی ہے ع۳ چشمے کو عین اس لیئے کہا گیا کہ پانی کا اصل مقام یہی ہے نہر بحر اسی سے بنتی ہیں ع۴ آنکھ کو عین اس لیئے کہا گیا کہ جسم کی معلوماتی قوتوں کا اندرونی بیرونی اصلی مقام یہی ہے کہ جو علم باہر سے اندر جاتا ہے وہ اسی کے ذریعے جاتا ہے۔ کسی شی کی اصلیت دیکھنے کو معائنہ کرنا کہا جاتا ہے۔ اصل کے مشابہ کو بعینہٖ کہا جاتا ہے۔ غرضیکہ ہر جگہ لفظوں پر لغت کی حکومت ہے۔ جب یہ سمجھ لیا تو جان لو کہ لفظِ سیّد کے لغوی معنٰے ہیں۔ مَالِکٌ۔ سَوْدٌ سے بنا ہے۔ بروزنِ فَیْعَلٌ۔ سَیْوِدٌ تھا۔ واؤ کو یاء بنایا اور یاء کا یاء میں ادغام کر دیا۔ ہو گیا سیّد۔ ضرورتِ کثیرہ کے تحت اس کو بھی مشترک بنا یا گیا۔ پس یہ دس معنٰے میں مشترک ہوا۔ چنانچہ لغت کی مشہور کتاب مجمع البحار جلد دوم صفحہ نمبر ۱۵۱ پر ہے:۔ وَالسَّیِّدُ یُطْلَقُ عَلَى الرَّبِّ وَالْمَالِکِ وَالشَّرِیْفِ وَالْفَاضِلِ وَالْکَرِیْمِ وَالْحَلِیْمِ وَمُتَحَمِّلِ اَذٰى قَوْمِهٖ وَالزَّوْجِ وَالرَّئِیْسِ وَالْمُقَدَّمِ:۔ (ترجمہ):۔ اور لفظ سیّد بولا جاتا ہے۔ ع۱ مربی کے لیئے ع۲ مالک کے لیئے:۔ ع۳

شریف آدمی کے لیئے ۴ لائق کے لیئے ۵ سردار کے لیئے ۶ بردبار شخص کے لیئے ۷ قوم کے وزیر کے لیئے ۸ خاوند کے لیئے ۹ کریم وسخی کے لیئے ۱۰ مقدم شخص یعنی آگے والے شخص کے لیئے :۔ ان دس ۱۰ معنوں میں پہلا لغوی معنیٰ ہے مالک ۔ باقی نو معنے اسی مالکیت کی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے مشترک ہو گئے ۔ کیونکہ مربی پرورشی انتظام اور مربوب کا مالک زمانۂ تربیت میں مالک ہوتا ہے ۔ شریف شرافت کا ۔ فاضل فضیلت کا ۔ سردار یعنی رئیس قوم ۔ اپنی قوم کے قانون کا ۔ حلیم حلم کا ۔ وزیر رعایہ کا ۔ خاوند بیوی کا ۔ کریم کرم کا ۔ پیشرو مقتدیوں کا مختلف حیثیتوں سے مالک ہوتا ہے ۔ ثابت ہوا کہ لفظ سید اہل عرب کے نزدیک مفرد المعنیٰ نہیں بلکہ مشترک المعنیٰ ہے ۔ لہٰذا جب کبھی یہ لفظ سید ذات باری تعالیٰ کے لیئے استعمال ہوگا تو وہاں لغوی معنے مراد ہوں گے یعنی مالک چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص ۴۱۸ پر ہے باب الفخر فصل ثانی :۔
عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ قَالَ اِنْطَلَقْتُ فِیْ وَفْدِ بَنِیْ عَامِرٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَنْتَ سَیِّدُنَا فَقَالَ اَلسَّیِّدُ اللّٰہُ (الخ) ترجمہ :۔ روایت ہے مطرف بن عبد اللہ بن شخیر سے ۔ انھوں نے فرمایا کہ بنی عامر کے ساتھ میں بھی آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا کہ تم ہم سب نے عرض کیا کہ آپ ہمارے سید ہیں تو نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔ سید اللہ ہے ۔ یہاں سید بمعنیٰ مالک ہے چنانچہ مجمع البحار جلد دوم ص ۱۵۱ پر اسی حدیث مطہرہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔ فَقَالَ اَلسَّیِّدُ ھُوَ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَوَاصِیَ الْخَلْقِ :۔ (ترجمہ) آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو سید کہا اس مقصد سے کہ وہی ہے تمام خلق کی پیشانیوں کا مالک یعنی سب کی گردنوں میں اسی کی ملکیت کی رسی ہے ۔ جب لفظ سید کی نسبت بیوی کی طرف ہوگی یا بیوی کے ساتھ لفظ سید کا ذکر ہوگا تو وہاں سید کے معنیٰ خاوند ہوں گے :۔ چنانچہ حضرت زلیخا کے پہلے خاوند عزیز مصر کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے :۔ وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَا الْبَابِ :۔ ترجمہ :۔ اور پایا ان دونوں نے اس زلیخا کے خاوند کو دروازے کے قریب ۔ یہاں سید بمعنیٰ خاوند ہے ۔ کیونکہ اضافت بیوی کے ساتھ ہے ۔ لیکن جب لفظ سید کی نسبت اور اضافت کسی قوم یا گروہ یا جماعت کی طرف ہو تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے ۔ سردار ۔ جیسے کہ آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ کہ ابو بکر اور عمر جنتی بوڑھوں کے سردار ہیں ۔ یعنی جو دنیا میں بڑھاپے کی عمر میں فوت ہوئے ۔ سوائے انبیاء کرام کے ۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص ۵۶۰ پر ہے
وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :۔ اَبُوْ بَکْرٍ وَ عُمَرُ سَیِّدَا کُھُوْلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اِلَّا النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ رَوَاہُ التِّرْمِذِیْ

وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنْ عَلِیٍّ :- (ترجمہ) - حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پیارے آقا نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بجز انبیاء و مرسلین کے باقی تمام اولین و آخرین کے سردار ہیں۔ اور جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مشکوٰۃ شریف ص ۵۷۰ باب مناقب اہل بیت فصل ثانی ب۔ بِاَنَّ فَاطِمَۃَ سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ۔ ترجمہ بے شک فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جنتی عورتوں کی سردار ہیں اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما جنتی جوانوں کے سردار ہیں یا جیسے کہ فرمایا سرور کائنات نے۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ (ترجمہ) :- قوم کا سردار قوم کا خدمت گار ہوتا ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں ان تمام جگہ سید بمعنیٰ سردار ہے۔ قیامت تک ہر قوم کے ہر پیشوا کو سید کہا جا سکتا ہے مگر نسبت اور اضافت کے ساتھ مثلاً۔ سیدالقوم۔ سیدالقریش وغیرہ اور جب لفظِ سیّد کسی مُلک کی طرف منسوب ہو تو وہاں حاکم یا بادشاہ یا امیر و منتظم مراد ہوتا ہے۔ مثلاً اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کو سیدالہند کہا جاتا تھا بحوالہ اورنگ زیب کے خطوط ص ۱۳۱ فارسی) حاکم شہر کو سیدالبلد کہا جاتا رہا۔ اور جب لفظِ سید کو ایک یا دو آدمیوں کی طرف نسبت کیا جائے۔ تو مراد ہوتا ہے۔ محترم اور کریم۔ مثلاً یا سَیِّدِیْ۔ ترجمہ۔ اے میرے کریم یا اے میرے محترم۔ یہاں بمعنے سردار نہیں ہو سکتا کیونکہ سرداری ایک شخص کے لیے نہیں ہوتی بلکہ قوم یا گروہ کے لیے ہوتی ہے۔ اور جب لفظِ سید کی نسبت کسی وقت یا زمانے۔ یا جمادات کی طرف کی جائے تو سید کا معنیٰ ہوتا ہے۔ فاضل یا افضل۔ مثلاً جامع صغیر لامام جلال الدین جلد دوم ص ۲۵ پر آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چند احادیث مروی ہیں :- ع۱ سَیِّدُ الْاَدْھَانِ الْبَنَفْسَجُ ع۲ سَیِّدُ الْاِسْتِغْفَارِ اَنْ تَقُوْلَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ ع۳ سَیِّدُ الْاَیَّامِ عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ ع۴ سَیِّدُ الْجِبَالِ الطُّوْرُ سِیْنَاءُ ع۵ :- سَیِّدُ الشَّجَرِ السِّدْرُ ع۶ سَیِّدُ الْکَلَامِ الْقُرْاٰنُ - ع۷ سَیِّدُ اِدَامِکُمُ الْمِلْحُ - ع۸ سَیِّدُ الطَّعَامِ اللَّحْمُ۔ ترجمہ :- ع۱ تیلوں کا سید بنفشہ ہے ع۲ استغفار کا سید لا الٰہ الا انت ہے ع۳ دنوں کا سید جمعہ ہے ع۴ پہاڑوں کا سید طور ہے ع۵ درختوں کا سید بیری ہے ع۶ کلاموں کا سید قرآن مجید ہے :- ع۷ سالنوں کا سید نمک ہے ع۸ کھانوں کا سید گوشت ہے ان تمام جگہ سید بمعنیٰ افضل ہے۔ چونکہ یہ لفظِ سید کثیر معنیٰ میں مشترک ہے اس لیے اس کے استعمال کے لیے نسبت اضافی بمناسب حال شرط ہے۔ اور جب کسی شخص کو سیّد کہا جائے کسی اضافت سے تو وہاں سرداری یا احترام یا افضلیت مراد ہوتی ہے۔ لیکن جب بلا اضافت یا اضافتِ کلیتہً سے سید کہا جائے تو وہاں نسلی و ذاتی سید مراد ہوتا ہے۔ اور آپ کی نسل سیّد کہلائے گی جس کو اللہ تعالیٰ

یا اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً سید کہا ہو گا۔ **دلیل دوم**۔ مندرجہ بالا قواعد شرعیہ کے تحت یہ ثابت ہو گیا کہ جب سید کا لفظ مضاف ہو کر کسی کے لیے مستعمل ہو تو وہ نسلی سید نہیں ہو گا بلکہ فقط اعزازی سید ہو گا اور اس اعزاز کی بنا پر اس کی اولاد کو سید نہیں کہا جائے گا۔ لیکن جب لفظ سید مطلق بولا جائے تو منسوب الیہ نسلاً سید ہو گا یعنی وہ اس کی ذات بن جائے گا اور اس بنا پر اس کی آل اولاد کو بھی سید کہا جائے گا۔ اسلامی شریعت میں تمام خلقتِ انسانی میں ذاتاً و نسلاً سید صرف دو پیغمبران عظام ہیں ایک ہمارے آقا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دوسرے پیغمبر حضرت یحییٰ علیہ السلام۔ حضرت یحییٰ تو اس لیے کہ قرآن کریم نے ان کو مطلق طور پر سید فرمایا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران آیت ۳۹ پارہ سوم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (ترجمہ):۔ (اے زکریا علیہ السلام) بے شک اللہ تم کو بشارت فرماتا ہے یحییٰ (بیٹے) کی جو اللہ تعالیٰ کے ایک کلمے کی تصدیق کریں گے۔ اور وہ سید ہوں گے۔ اور دائمی عورتوں سے دور رہیں گے اور نیک خاندان میں سے نبی ہوں گے۔ یہاں سیّد ہونے کا مطلب ہے ذاتی نسلی سید۔ اگر حضرت یحییٰ کی اولاد ہوتی تو نسلی سید ہوتے۔ ہمارے اردو مترجمین نے یہاں سید بمعنی سردار لکھا ہے وہ صرف اصطلاحی ترجمے کے لحاظ سے۔ ترجمے کے لیے اس کے سوا کوئی لفظ اردو میں دستیاب نہیں ورنہ سردار کے لیے اضافت شرط ہے۔ اور پھر اگر عقلِ حقیقی اور عشقِ ثباتی کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر نبی ولی دنیا کا سردار ہے پھر یہاں خصوصیت سے حضرت یحییٰ کو فقط سیّد کیوں فرمایا گیا؟ ماننا پڑے گا کہ حضرت یحییٰ کو ذاتی اور نسلی سید بنایا گیا۔ اور چونکہ ہمارے کریم و رحیم آقا ہمہ صفت موصوف نبی ہیں تو جب آپ صفی اللہ کی صفت سے مصطفیٰ ہوئے۔ سدرہ پر پہنچ کر کلیم ہوئے۔ عرش پر پہنچ کر خلیل ہوئے۔ لِيْ مَعَ اللّٰهِ فرما کر روح اللہ ہوئے:۔ غار حرا میں کلمۃ اللہ۔ تو۔ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ فرما کر۔ ذاتاً و نسلاً سید ہوئے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۵۱۳ پر ہے:۔ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الخ) رَوَاهُ مُسْلِمٌ اور مشکوٰۃ ص۵۱۳ پر یہی حدیث پاک ابو سعید رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے بروایت ترمذی شریف۔ ترجمہ۔ آقائے عالمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ قیامت کے دن اس کا ظہور ہو گا۔ اس حدیثِ مبارک میں اگرچہ لفظِ سید مضاف ہے مگر چونکہ اضافتِ کلیہ ہے لہٰذا اس سے بھی سیادتِ ذاتی و نسلی ثابت ہوئی۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ کی قید کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں اِلٰی پوشیدہ ہے۔ دراصل تھا۔ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ یعنی میں قیامت تک

سید ہوں۔ اس طرح کہ میری نسل بھی سید ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ ملا علی قاری لکھتے ہیں مرقات جلد پنجم ص ۲۵ پر ہے۔ وَالتَّقْیِیْدُ بِیَوْمِ الْقِیَامَۃِ مَعَ اَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَیِّدُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ مَعْنَاہُ اَنَّہٗ یَظْھَرُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ سُوْدَدُہٗ بِلَا مُنَازِعٍ۔ (ترجمہ) یوم قیامت کی قید کیوں لگائی باوجود اس کے کہ آپ دنیا و آخرت میں تمام انسانوں کے لیے سید ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کا سید ہونا ظاہر ظہور ہوگا بغیر کسی جھگڑے کے۔ گویا کہ بقول مرقات یہاں یُظْھَرُ فعل پوشیدہ ہے اور دراصل تھا۔ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَظْھَرُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ لہٰذا بات صاف ہوگئی۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نسلاً سید ہیں اور آپ کی ہی اولاد سید ہے۔ کیونکہ آپ نے خود فرمایا۔ اَنَا سَیِّدٌ میں سید ہوں۔ اور آپ نے کیوں فرمایا۔ اس لیے کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا:۔ یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ۔ اکثر مفسرین کے نزدیک لفظِ یٰسٓ کا ترجمہ ہے اے سید۔ چنانچہ تراجم خمسہ میں۔ وَلِیٌّ مِنْ اولیاء اللہ حضرت شیخ سعدی شیرازی اپنے ترجمۂ قرآن پاک میں لکھتے ہیں:۔ ای سید بقرآن حکیم۔ ترجمہ اے سید قرآن حکیم کی قسم تم مرسلوں سے ہو۔ تفسیر خازن علی اربعہ تفاسیر جلد پنجم ص ۱۹۰ پر ہے:۔ (یٰسٓ) قیل یا سید البشر۔ (ترجمہ):۔ کہا گیا ہے کہ لفظِ یٰسٓ کا ترجمہ ہے اے سب انسانوں کے سید۔ تفسیر مدارک کے ص ۱۹۵ پر ہے:۔ وَقِیْلَ یَا سَیِّدُ۔ ترجمہ۔ فرمایا گیا ہے کہ یٰسٓ کا ترجمہ ہے اے سید۔ تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص ۲۶۵ پر ہے۔ حرف یٰسٓ اشارت بکلمۂ یا سَیِّدَ الْبَشَرِ یا سَیِّدَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ وَحدیثِ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ تفسیر ایں حرف بود۔ ترجمہ۔ حرفِ یٰسٓ نے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ اے تمام بشر اور اولین و آخرین تمام کے سید۔ وہ حدیث اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ اسی لفظ کی تفسیر ہے۔ ثابت ہوا کہ رب کریم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سید بنایا۔ اور کائنات میں آپ کا نام سید ہے خود حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیث پاک میں فرمایا کہ یٰسٓ ہمارا نام ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص ۲۶۵ پر اور تفسیر مدارک علی اربع جلد پنجم صفحہ نمبر ص ۱۹۵ پر ہے:۔ وَفِی الْحَدِیْثِ اِنَّ اللّٰہَ سَمَّانِیْ بِسَبْعَۃِ اَسْمَاءٍ مُحَمَّدٌ وَّاَحْمَدُ وَطٰہٰ وَیٰسٓ وَالْمُزَّمِّلُ (الخ) ترجمہ۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ فرمایا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں میرے سات نام رکھے۔ ۱ محمد۔ ۲ احمد۔ ۳ طٰہٰ۔ ۴ یٰسٓ۔ ۵ مزمل۔ ۶ مدثر۔ ۷ عبد اللہ

ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام کا نام یٰسٓ ہے اور یٰسٓ کا معنےٰ ہے سید۔ اور چونکہ یہاں لفظِ سید مطلق بغیر اضافت آیا لہٰذا آپ بدلیلِ قرآنیہ نسلاً سید ہوئے۔ چونکہ لفظِ یٰسٓ نبی کریم رؤف و رحیم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اسم پاک ہے اس لیے آپ کی جملہ اولاد کو آلِ یٰسٓ بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان

جلد ہفتم صد ۲۶۵ اسی طرح لکھا ہے۔ اور تفسیر روح المعانی جلد گیارہویں پارہ بائیس ۲۲ صفحہ نمبر صد ۲۱۱ پر ہے:۔
وَهُوَ ظَاهِرُ قَوْلِ السَّيِّدِ الْحِمْيَرِي۔ شعر

يَا نَفْسُ لَا تَمْحَضِيْ بِالْوُدِّ جَاهِدَةً
عَلَى الْمَوَدَّةِ إِلَّا آلَ يَاسِيْنَا۔

(ترجمہ) اے میرے دل کسی کی محبت میں اتنی محنت مشقت نہ کر سوائے آلِ یٰس کی محبت کے۔ یعنی دنیا میں صرف سیدوں سے پر خلوص محبت لگا۔ کیونکہ وہی محبت کا کام ہے۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات میں فقط نبی اکرم ہی اصل سید ہیں۔ اور نسلاً سید آپ ہی ہیں لہٰذا فقط آپ کی نسل ہی سید ہو سکتی ہے:۔

دلیل سوم:۔ جب یہ بات بدلائل ثابت ہو گئی کہ حضور اقدس ہی نسلاً سید ہیں تو یہ بات بھی لازمی ثابت ہے کہ صرف نبی اکرم علیہ التحیۃ والثناء کی اولاد ہی سید ہو سکتی ہے۔ اور آپ کی اولاد ہی قانونِ شریعت میں سید کہلا سکتی ہے۔ شرعی طور پر نبی کریم علیہ السلام کی اولاد حضرتِ امام حسن اور حضرت امام حسین سے چلی اور چونکہ یہ دونوں امامین کریمین طیبین طاہرین حضرتِ فاطمہ بتول الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مذکر اولاد ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد پاک خاتون جنت سے چلی۔ چنانچہ۔ خود آقاء کل صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہماری نسل فاطمۃ الزہرا سے چلی۔ چنانچہ مستدرک حاکم جلد سوم صد ۱۶۰ پر ہے:۔ عَنْ مَوْلَى عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ أَنَا الشَّجَرَةُ وَفَاطِمَةُ فَرْعُهَا وَعَلِيٌّ لِقَاحُهَا وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ ثَمَرَتُهَا وَشِيْعَتُنَا وَرَقُهَا (الخ) ! حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے آزاد شدہ غلام روایت کرتے ہیں کہ میں نے خود سنا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ فرماتے ہیں۔ میں درخت ہوں اور فاطمہ زہرا اس کی شاخ ہیں اور علی مرتضٰے اس کی پیوندکاری والی شاخ ہیں (جس کو پنجابی میں داب اردو میں قلم کہتے ہیں:۔) اور حسن وحسین اس کے پھل اور ہماری نسل کے تا قیامت گروہ اس کے پتے۔ یہاں شیعہ سے مراد یہ آج کل کے نائی تیلی مراثی نہیں بلکہ نسلِ پاک سادات۔ اگرچہ اس حدیث کا متن شاذ ہے اور اس کے ایک راوی اسحاق زُہری صدوق ہیں جو ضعیف ہوتا ہے۔ مگر معناً حدیث صحیح کے درجہ میں ہے۔ اس روایت سے تین چیزیں ثابت ہوئیں ۱۔ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسل پاک حضرتِ حسن وحسین سے چلی اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سید اس لیے آپ کی ہی نسل تا قیامت سید۔ اب ابد تک جو انسان مسلمان امام حسن یا امام حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی اولاد سے ہوگا فقط وہ ہی سید ہوگا۔ ۲۔ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت سے ہے کہ فاطمہ زہرا کو یہ اعزاز نصیب ہوا کہ آپ نسل پاکِ جنابِ مصطفیٰ کی

ایمن نہیں آپ بھی سیدہ ہیں۔ کیونکہ والد سید ہو تو بیٹی بیٹا سید ہو۔ لیکن فاطمہ زہرا کی بیٹی حضرت زینب سیدانی نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و الہٖ وسلم نے صرف حسن و حسین کو پھل فرمایا۔ ع ۳ یہ کہ خاتونِ جنت فاطمہ بتول الزہرا کو جتنے بھی خصوصی فضائل ملے وہ اسی وجہ سے ملے کہ آپ کے بیٹے حسن و حسین ہوئے۔ جو نسلِ نبی اور آلِ نبی کے ابتدائی پھول و پھل ہیں مثلاً حضرتِ سیدہ کے ماتھے پاک سے جنت کی خوشبو ع ۲ تمام جانوں کو حضرتِ عزرائیل قبض کرتے ہیں مگر حضرتِ سیدہ کی روحِ مقدسہ کو خود جنابِ باری نے قبض فرمایا۔ (روح البیان جلد سوم صہ ۴۵) ع ۳ میدانِ محشر میں جنابِ سیدہ طاہرہ کا بصد اہتمام گزر جیسا کہ احادیث و تفاسیر میں مذکور ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار فضائل و مراتب کی وجہ یہی ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہ فضائل۔ آقائے موجودات صلے اللہ علیہ وسلم کی دیگر تین صاحبزادیوں کو یہ مراتب حاصل نہ ہوئے۔ حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت کلثوم کے تذکرہ میں یہ فضائل منقول نہیں۔ بس وجہ وہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ اگر حضرت فاطمہ کی مذکر اولاد نہ ہوتی تو نہ آپ کی اولاد سید ہوتی نہ آپ کو یہ خصوصی فضائل ملتے۔ اسی طرح اگر دوسری کسی صاحبزادی کی بھی مذکر اولاد ہوتی تو وہ بھی سید ہوتی اور اُن کی اولاد جب تک عالمِ اجسام میں رہتی نسلی سید ہوتی۔ اور اگر فاطمہ زہرا کے دس بیٹے ہوتے تو دس سے ہی سید نسل چلتی۔ مگر چونکہ شجر نبوت کے صرف دو ہی پھل ہوئے اس لیئے۔ عالمِ دنیا میں صرف حسنی و حسینی ہی سید ہوئے۔ ہاں البتہ جس طرح فاطمہ زہرا نسلاً سادات ہیں اپنے والد مقدس کی وجہ سے اسی طرح جنابِ سیدہ زینب۔ جناب سیدہ رقیہ۔ جناب سیدہ کلثوم بھی نسلاً سادات ہیں۔ کیونکہ بناتِ رسول ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنھن اجمعین۔ اسی قانون کے تحت۔ حضرت زینب کی اولاد چونکہ بیٹی ہے اس لیئے وہ سید نہیں حضرت زینب کے خاوند اور نبی اکرم کے تیسرے داماد حضرت ابوالعاص۔ اُن کی اولاد میں ایک بیٹا علی بن ابوالعاص بچپن میں فوت ہو گئے۔ اسی طرح۔ حضرتِ سیدہ ام کلثوم زوجہ عثمان غنی کا ایک بیٹا عبداللہ بن عثمان بھی کنوارے فوت ہوئے غرضکہ نواسہ رسول میں صرف حسن و حسین ہی صاحب نسل کثیرہ ہیں کیونکہ۔ آقائے کائنات غیب دان کل صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ارشاد فرما دیا کہ میرے پھل صرف حسن و حسین ہیں۔ لہٰذا وہ ہی نسل سادات کے نخلِ اولین ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی شخص سید نسلی نہیں ہاں سید بمعنے سردار پیشوا امام۔ سب ہی صحابہ کرام ہیں۔ حضرتِ علی شیر خدا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خاتونِ جنت کے وصال کے بعد۔ نواسیٔ رسولِ پاک جناب حضرت امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔ جن کے بطن سے حضرتِ علی کے چار بیٹے ہوئے ع ۱ عثمان رضی اللہ عنہ ع ۲ ابوبکر رضی اللہ عنہ ع ۳ عمر رضی اللہ عنہ یہ سب کربلا میں شہید ہوئے۔ اُن کی نسل نہ چلی۔ حضرتِ علی کی چوتھی بیوی حضرت خولہ کے چوتھے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ بن حنفیہ یعنی بن علی رضی اللہ عنہ خنفیہ

ان سے حضرت علی کی نسل چلی جس کو علوی کہتے ہیں۔ خلافتِ صدیقی کے دور میں مسیلمہ کے قبیلے یمامہ سے جنگ ہوئی۔ اس میں ایک قوم بنی حنفیہ تھی اُن کے قیدیوں میں حضرتِ خولہ بنت جعفر بن قیس گرفتار ہو کر آئیں حبشی النسل تھیں حضرتِ علی کو ملیں آپ نے آزاد کر کے ان کو بیوی بنایا یہ بی بی صاحبہ حضرت علی کی چوتھی بیوی ہیں اُن سے چار بیٹے ہوئے سب سے بڑے بیٹے محمد بن حنفیہ ہیں باقی تین کنوارے فوت ہوئے۔ محمد بن حنفی اپنے چھوٹے نانا حنیف کی طرف نسبت رکھتے ہیں (از مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۵۶۵ مراۃ ھشتم ۵۰۳ اشعۃ اللمعات جلد چہارم ۶۷۵ اور تاریخ اسلام) حضرت علی کی کل نو بیویاں ہوئی ہیں (اسماء الرجال مشکوٰۃ شریف) - مرقات شرح جلد دوم صفحہ نمبر ۳۲ پرھے:۔ وَاُمَامَۃُ هِيَ اِبْنَۃُ زَیْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِنْتِ اَبِی الْعَاصِ۔ تَزَوَّجَھَا عَلِیٌّ بَعْدَ فَاطِمَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ (ترجمہ):۔ امامہؓ بیٹی ہیں سیدہ زینب بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ نے فاطمہ زہرا کے وصال کے بعد امامہؓ سے نکاح فرمایا:۔

دلیل چہارم:۔ دلائل سابقہ سے یہ تو ثابت ہوا کہ اصلِ سید صرف آقائے کائنات ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن آپ کی نسل میں کون سید ہیں تو خود سرکار مقدس کا ارشاد ہے مشکوٰۃ شریف ۵۶۹ بروایت بخاری شریف۔ عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ اِلٰی جَنْبِہٖ وَھُوَ یُقْبِلُ عَلَی النَّاسِ مَرَّۃً وَّعَلَیْہِ اُخْرٰی وَیَقُوْلُ اِنَّ اِبْنِیْ ھٰذَا سَیِّدٌ۔ (الخ) ترجمہ ابی بکرہ سے روایت فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ممبر پر تشریف فرما تھے اور حضرت امام حسن آپ کی گود میں تھے۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے کبھی پیار سے حسنؓ کو دیکھتے اور فرماتے کہ بے شک میرا یہ بیٹا سید ہے۔ اس روایت میں حضرتِ حسن کو بلا قید و اضافت سید کہا گیا ثابت ہوا کہ آپ نسلاً سید ہیں ع۲ یعلی بن مرہ سے روایت ہے بروایت ترمذی شریف (مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۵۷۱) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حُسَیْنٌ مِّنِّیْ وَاَنَا مِنْ حُسَیْنٍ اَحَبَّ اللّٰہُ مَنْ اَحَبَّ حُسَیْنًا۔ حُسَیْنٌ سِبْطٌ مِّنَ الْاَسْبَاطِ:۔ (ترجمہ):۔ یعلیؓ نے کہا کہ فرمایا حبیبِ کردگار صلی اللہ علیہ وسلم نے حسینؓ میری نسل سے اور میں حسینؓ کی اصل سے ہوں جو حسینؓ سے محبت کرے وہ اللہ کا پیارا ہو۔ حسینؓ نسلوں میں سے بڑی عظیم نسل والا ہے۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ امام عالی مقام کو سبط فرمایا۔ سبط کا لغوی ترجمہ ہے۔ بہت شاخوں والا درخت۔ (لمعات ۲ شرح مشکوٰۃ) سبطٌ کی تنوین عوضی ہے۔ دراصل تھا سبطی یعنی یہ حسین میری عظیم نسل کا سبط ہے درخت ہے اور جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سید تو حسین بھی سید اور آپ کی تمام اولاد بھی سید۔ کیونکہ سید باپ کی اولاد سید ہے۔ تفسیر خازن علیؓ۔

اربع جلد اول صفحہ ۲۰۶ پر ہے:۔ قِیْلَ لِلْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا سِبْطَا رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:۔ تفسیر روح المعانی جلد اوّل صفحہ ۲۹۵ پر ہے:۔ قِیْلَ لِلْحَسَنَیْنِ سِبْطَا رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:۔ ہر دو عبارات کا ترجمہ۔ امامین کریمین طیبین امام حسنؓ امام حسین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل پاک کا سبط کہا گیا۔ بات واضح ہو گئی۔ نبی پاک صاحب لولاک علیہ التحیۃ و الصلوٰۃ کی نسل صرف ان ہی دو سے چلی۔ حضور اقدس کی بڑی صاحبزادی زینب تھیں ان کا نکاح حضرت ابو العاص سے ان سے چھوٹی۔ حضرت رقیہؓ ان کا نکاح حضرت عثمان غنیؓ سے ان کی وفات کے بعد ان کی چھوٹی بہن بنت رسول پاک سیدہ ام کلثوم کا نکاح حضرت ذو النورین سے۔ ان سے چھوٹی حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے ہوا مگر بجز حسن و حسین کسی دختر پاک سے نسل نہ چلی۔ اس لیئے سبط رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہی ہیں۔ لہٰذا یہی سیّد ہیں۔ اور نواسے سے نسل چلنا خصوصیت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور پھر دوسری خصوصیت یہ ہوئی کہ حضرت علی کی نسل امامین کریمین سے نہیں چلی کہ بیک وقت ایک شخص سے دو کی نسل محال ہے۔ بدین وجہ آقائے کل صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو سیّد فرمایا۔ ان کے علاوہ خلفاء راشدین عشرہ مبشرہ کسی صحابی کو مطلقاً بلا اضافت سیّد نہ فرمایا۔ رہا یہ کہنا کہ سَیِّدَا کُہُوْلِ اَہْلِ الْجَنَّۃِ۔ صدیق و فاروق۔ جنتی بوڑھوں کے سیّد وہاں بمعنے سردار ہے جیسے کہ پہلے ثابت کیا۔ اس طرح سے سیادت نسل ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے۔ کہ سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَہْلِ الْجَنَّۃِ اور سَیِّدَا شَبَابِ اَہْلِ الْجَنَّۃِ سے بھی سیادت نسلیہ ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہاں بھی بوجہ اضافت جزئیہ سیّد بمعنے سردار ہے۔ چاروں صاحبزادیاں امام حسن و حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کی سیادت یعنی سیّد ہونا آل نبی ہونے کی بنا پر ہے۔ کیونکہ آل نبی صرف تین صاحبزادے چار صاحبزادیاں اور حسن و حسین ہیں۔ چنانچہ نسیم الریاض جلد سوم صفحہ ۵۵ پر ہے

اَللّٰہُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اَزْوَاجِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ۔ وَہُمْ نَسْلُہٗ وَاَوْلَادُہٗ (الخ)

وَقِیْلَ اٰلُ الرَّجُلِ وُلْدُہٗ اَیْ نَسْلُہٗ مُطْلَقًا:۔ ہاں البتہ اہل بیت میں ان کے ساتھ امہات المومنین اور حضرت علی بھی شامل ہیں گویا کہ حضرت علی اہل بیت میں ہیں آل میں نہیں:۔

دلیل پنجم

:۔ مواہب کی شرح زرقانی جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۸۴ پر ہے:۔ وَکُلُّ وُلْدِ اٰدَمَ فَاِنَّ عَصَبَتَہُمْ لِاَبِیْہِمْ مَاخَلَا وُلْدَ فَاطِمَۃَ فَاِنِّیْ اَنَا اَبُوْہُمْ وَعَصَبَتُہُمْ رَوَاہُ اَبُوْ نُعَیْمٍ عَنْ عُمَرَ بِرِجَالٍ ثِقَاتٍ:۔ ترجمہ:۔ ہر انسان کا اصل نسب اُن کے باپ سے ہوتا ہے۔ سوائے فاطمہ زہرا کے۔ کیونکہ اولاد فاطمہ کا باپ میں ہوں اور یہ میری نسل ہے اور میں ہی ان کا اصل ہوں ان ہی الفاظ کی ایک حدیث شریف فقہ کی کتاب جامع جلد اول صفحہ نمبر

صفحہ ۲۶۷ پر ہے :۔ اس سے ثابت ہوا کہ صرف فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد یعنی امام حسن رضی اللہ عنہ و امام حسین رضی اللہ عنہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی اولاد ہیں جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی نسلِ پاک چلی۔ اور چونکہ کائنات میں صرف نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نسلی و ذاتی سید ہیں اس لیے آپ کی اولاد کی ذات ہی سید ہوگی۔ اسی طرح ینابیع جلد اوّل صفحہ ۲۶۶ پر ہے۔

وَعَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ جَعَلَ ذُرِّیَّۃَ کُلِّ نَبِیٍّ فِیْ صُلْبِہٖ وَجَعَلَ ذُرِّیَّتِیْ فِیْ صُلْبِ عَلِیٍّ :۔ (ترجمہ)

روایت ہے حضرت جابر سے انہوں نے فرمایا کہ فرمایا۔ آقاءِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی ذرّیت (اولاد) اُن کی اپنی پشت میں رکھی۔ لیکن میری ذرّیت۔ (اولاد) حضرتِ علی کی پشت میں رکھی۔ گویا کہ وہ قانون ہے یہ قدرت ہے۔ اور یہ صلبی ذرّیت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنتِ رضی اللہ عنہا فاطمہ اور امام حسن رضی اللہ عنہ حسین رضی اللہ عنہ کی شکل میں صلبِ علی سے منتقل ہو کر بواسطۂ فاطمۃ الزاہرا عالَمِ شہود پر جلوہ افروز ہوئی حیاتِ طیبہ میں ہی ظاہر ہوئی۔ باقی ذرّیت جو بعد وفاتِ فاطمۃ الزہرا صلبِ علی رضی اللہ عنہ مرتضےٰ سے عالَمِ ظہور میں آئی۔ وہ اولادِ علی رضی اللہ عنہ ہے۔ جس سے نسلِ علی رضی اللہ عنہ چلی۔ اُس اولاد کا نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے نسباً کوئی تعلق نہیں۔ اِس لیے اُن کو سید کہنا گناہ ہے۔ کیونکہ یہ نسل تبدیل کرنا ہے اس طرح کہ کسی بھی علوی کو سید کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علوی والد سے ہٹا کر کسی حسنی یا حسینی شخص کو اس کا باپ قرار دینا ہے۔ یہ سخت گناہ ہے۔ پس جس طرح کوئی غیر سید شخص اپنے کو سید کہہ کر یا کہلوا کر مجرم و گناہ گار ہے۔ اسی طرح علوی شخص اپنے کو سید کہہ کر گناہ گار ہے۔ چنانچہ مسلم شریف جلد اوّل کتاب الایمان باب ۲۷ صفحہ ۵۷ پر ہے

عَنْ سَعْدٍ وَ اَبِیْ بَکْرَۃَ کِلَاھُمَا یَقُوْلُ سَمِعَتْہُ اُذُنَایَ وَوَعَاہُ قَلْبِیْ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ یَقُوْلُ مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ غَیْرُ اَبِیْہِ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ (ترجمہ)

حضرات ابی بکرہ رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ دونوں فرماتے ہیں کہ میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے تصدیق کی کہ پیارے رسول پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص جانتے بوجھتے اپنے کو دوسرے باپ کی طرف نسبت کرے تو اس پر جنت حرام۔ اسی کے اوپر ایک روایت ہے جس میں ہے کہ وہ کافر ہو گیا۔ اندازہ لگاؤ کہ نسل و نسبت بدلنا کتنا سخت شرعی جرم اور اس کا کتنا بڑا نقصان ہے۔ مگر ہمارے نادان دوست اس کو نہیں سمجھتے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک شخص کو خدا نے علوی بنا دیا ہے۔ تو تم اس کو سید بنانے کے پیچھے کیوں پڑ گئے اور کیوں گناہ مول لیا۔ حقیقت تو متغیر ہو نہیں سکتی مگر تم نے اپنا ایمان گڑبڑ کر دیا۔ **دلیل ششم** :۔ ! قادر و قیوم باری تعالیٰ جَلَّ مَجْدُہٗ۔ ہر طرح مختارِ کل ہے۔

جس طرح چاہے اپنی مخلوق کو پیدا فرمائے ۔جیسے چاہے قانون بنائے ۔جس کو چاہے قانون کے تحت لائے ۔جس کو چاہے قدرت سے نوازے ۔ جہاں چاہے نشانِ قدرت کا اظہار فرمائے ۔ قانون یہ ہے کہ ہمیشہ باپ سے نسل چلے ۔مگر قدرت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم کی ذریت بنائے ۔ آپ کی خاندانی بیٹی حضرتِ مریمؑ کی طرف سے ۔چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے ۔ سورت انعام پ آیت نمبر ۸۴-۸۵ میں ہے

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۸۴) وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۸۵)

:- ترجمہ :- اور تحفہ دیا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق اور یعقوب کا ہم نے سب کو قربِ تجلیات کی ہدایت دی اور نوح علیہ السلام کو ابراہیم سے بھی پہلے ہدایت دی تھی ۔اور حضرتِ ابراہیم کی ذریت میں سے داؤد اور سلیمٰن اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو راہِ قرب کی ہدایت دی ہم اسی طرح نیکوں کو بدلا دیتے ہیں ۔ اور ابراہیم کی ذریت (اولاد) میں سے یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو قرب کی ہدایت دی یہ تمام ہی برگزیدہ تھے علیہم السلام ۔یہاں حضرت عیسیٰ کو ذریت ابراہیم فرمایا ۔حالانکہ آپ کا والد کوئی نہیں والدہ سے نسل چلی ۔ثابت ہوا کہ قدرتِ الٰہی میں والدہ سے بھی نسل چل سکتی ہے ۔ اور حضرت ابراہیم کی اولاد میں بیٹی کی وجہ سے شامل فرمایا ۔ تو جب ذریتِ ابراہیم اور نسل پاک خلیل بیٹی سے چل سکتی ہے ۔پیارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام شانوں سے ہمہ صفت موصوف ہیں آپ کی نسلِ طیبہ طاہرہ بھی بیٹی سے چل سکتی ہے ۔بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ۔ دخترِ پاک سے نسلِ مصطفیٰ چلا کر شانِ قدرت کا اظہار کیا ہی اس لیئے گیا ہے تاکہ محبوبِ کل وسیلۂ کل ختم الرسل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام انبیاءِ کرام کے معجزات و خصوصیات سے متصف ہو کر تشریف لائے ۔حضرت عیسیٰ کی یہ خصوصیت بھی یہاں آ جائے کہ جس طرح خلیل اللہ کی نسل کا ایک حصہ بیٹی سے چلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل بھی آپ کی بیٹی سے چلے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قدرتِ الٰہی کا نشان نہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم کی نسل اور اولاد کی متحملہ مریمؑ کی شرافت علیٰ نساءِ الثقلین ہو گئی ۔فاطمہ طیبہ کی شرافت علیٰ نساء العالمین اس سے زیادہ ہو ۔کہ مریمؑ ذریتِ خلیل کی امینہ اور فاطمہؓ ذریتِ حبیب جنابِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امینہ علیہم الصلوٰۃ والسلام اس آیت نے بھی بتایا کہ نسلِ پاک نبی علیہ التحیۃ والثنا صرف خاتونِ جنت سے ہے لہٰذا وہی سید ہے ۔نہ کہ علی و اولادِ علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ۔**دلیل ہفتم** ۔امام ابنِ حجر مکی کے مشہور فتاویٰ کبریٰ جلد چہارم صفحہ ۲۸ پہ ہے :- لِاَنَّ مِنْ خَصَائِصِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَوْلَادَ بَنَاتِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَسِبُوْنَ اِلَيْهِ ۔لَا يُكَافِئُهُمْ اَحَدٌ فَلَا يُكَافِئُ لِمَنِ انْتَسَبَ اِلَيْهِ غَيْرُهُمْ

وَ الْعَلَوِیُّ مَثَلًا لَیْسَ کُفُوًا لِلشَّرِیْفَۃِ وَ اِنْ کَانَ مِنْ بَنِیْ ھَاشِمٍ ۔ ترجمہ :- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے کہ آپکی بیٹیوں کی اولاد ہی آپ کی اولاد ہے۔ لہٰذا جب کوئی کائنات میں آپ کا ہم کفو یعنی برابر خاندان نہیں تو تا قیامت آپ کی نسل کا بھی کوئی کفو (برابر کا خاندان) نہیں۔ بجز اس کے کہ سید کا کفو سید ہی ہو۔ پس عبّاسی خاندان اور علوی خاندان بھی سید کا کفو نہیں اگرچہ ہاشمی سب ہیں۔ امام حجر کی عبارت کے اس مسئلۂ کفو میں اگرچہ مجھ کو کچھ کلام ہے اور اس سے متّفق ہونا میرے نزدیک کچھ ضروری نہیں تاہم بتانا یہ مقصود ہے کہ امام ابن حجر علیہ الرحمۃ بھی سادات کو علویوں سے علیحدہ کر رہے ہیں، اور اقتضاء ثابت کر رہے ہیں علوی حضرات سید نہیں۔ اسی طرح مولا علی مشکل کشا بھی اگرچہ ہاشمی مطلبی ہیں مگر سید نہیں۔

حیران کن بات۔ یہ ہے کہ یہاں تو ہم صرف مولا علی مشکل کشا کے سید ہونے نہ ہونے کی گفتگو میں ہیں یہ بھی بحمدہٖ تعالیٰ مخالفوں سے ثابت نہیں ہو رہا۔ لیکن حیرانی تو اس بات کی ہے کہ رافضی شیعہ لوگ اور شیعہ نواز لوگ مولیٰ علی کے لیئے جو عقیدہ بھی بتاتے ہیں قرآن و حدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ حضرت علی بکعبہ ولادت ہیں مگر کہیں ثابت نہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ علی مرتضیٰ بمسجد شہادت ہیں مگر کہیں ثابت نہیں۔ ولادت ہوتی ہے تو اس طرح کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بحالت طواف درد شروع ہوا تو آپ فوراً اپنے گھر آ گئیں۔ وہاں ولادت ہوئی۔ اور شہادت پاک کوفے کی جامع مسجد کے دروازے پر ہوئی۔ امامت علی مرتضیٰ پر تو یہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں یہاں تک کہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں کہ امامتِ علی کو نبوت سے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ عقیدۃً و حقیقۃً تو ہم اہلسنت بھی مولیٰ علی مشکل کشا کے امام الاولیاء ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اس عقیدت سے قطعِ نظر اگر تحقیق کے میدان میں اگر دیکھا جائے تو قرآن و حدیث سے کہیں بھی امامتِ علی ثابت نہیں۔ بلکہ نا معلوم اس میں حکمت کیا ہے۔ کہ اللہ رسول نے ہمیشہ علیِّ مرتضیٰ کو امامت سے دور رکھا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر مولیٰ علی کو مدینہ منورہ میں کمزور مسلمانوں کی حفاظت کیلئے چھوڑا۔ امامت عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی کے سپرد فرمائی اور اثناء عرصہ علی مرتضیٰ کو مقتدی بنایا۔ خود علی مرتضیٰ بھی ہمیشہ امامت سے اس طرح دور رہے کہ اب حضرت علی کے ساتھ لفظِ امام سجتا بھی نہیں۔ جیسے کہ حضرات حسن و حسین کے ساتھ یہ لفظ بالکل سج گیا ہے۔ مثلاً امام حسن رض وغیرہ۔ اگر کوئی شخص امام علی کہہ بھی دے تو اجنبی سا لگتا ہے۔ قانون شریعت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے تین طرح تعلق ہیں۔ ۱۔ نسباً ۲۔ سبباً ۳۔ حسباً۔ نسباً یعنی اولاد ہونے کا رشتہ وہ صرف اب تا قیامت امام حسن و حسین کو ہے۔ لہٰذا دنیا میں دو قسم کے ہی سادات ہیں یا حسنی سید مگر یہ بہت کم ہیں۔ یا حسینی سید یہ ما شاء اللہ بہت زیادہ ہیں۔ بعض بزرگ والد اور والدہ ہر دو کی طرف حسنی و حسینی سید ہوتے ہیں اُن کو نجیب الطرفین سید کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت غوث پاک جیلانی رحمۃ اللہ علیہ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد گیارھویں پارہ نمبر ۲۲

صفحہ نمبر ۳۰۵ پر ہے :۔ فَقَدْ کَانَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ مِنْ اَجِلَّۃِ اَھْلِ الْبَیْتِ حَسَنِیًّا مِنْ جِھَۃِ الْاَبِ وَ حُسَیْنِیًّا مِنْ جِھَۃِ الْاُمِّ (ترجمہ) یہی ہے کہ غوث پاک جیلانی والد سے حسنی سید ہیں اور والدہ سے حسینی سید ہیں۔ سببی رشتہ سسرالی تعلق کو کہتے ہیں امامین حسنین کا رشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی ہے اور یہ نسبی اہل بیت ہیں۔ مولا علی شیر خدا کا رشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سببی ہے اور آپ سببی اہل بیت ہیں۔ تیسرا رشتہ نبی کریم سے حسبی ہے حسبی رشتہ مذہبی تعلق کو کہتے ہیں۔ یہ رشتہ ہر سچے مخلص مسلمان کو آپ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے تاقیامت قائم وجاری وساری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس رشتے کو قائم ودائم فرمادے۔ آمین یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ عَدَدَ عَرْشِہٖ وَزِیْنَۃِ فَرْشِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَ عِتْرَتِہٖ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ ؕ۔ دلیل ہشتم۔ جس طرح لفظ سید بلا اضافت قرآن اور حدیث میں سرور کل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور امام حسن۔ فاطمہ زہرا اور امام حسین کے لیئے ثابت ہے۔ اور جس بنا پر ان آقاؤں کا نسلاً سید ہونا ثابت ہوا۔ اس طرح کی ایک حدیث بھی حضرت علی شیر خدا کے لیئے وارد نہیں۔ ہاں بعض بناوٹی روائتیں روافض نے وضع کرلیں جن کا سہارا لے کر نام نہاد سنی ظاہراً اہلسنت درحقیقت تفضیلی شیعہ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سید کہنے لگ گئے اور اس کے بعد علویوں کو سید کہنے کا دروازہ کھولا۔ آخری سطور میں ان روائتوں کی وضاحت کی جائے گی۔ مذکورہ فی سوال پیر صاحب بھی یا تو تفضیلی شیعہ رافضی ہیں یا اُن ہی موضوع روایات کو دیکھ کر دھوکا کھائے ہوئے ہیں۔ بہر حال مخالف کی ان کمزور دلائل کی مکمل تردید بھی ضروری ہے۔ دلیل نہم۔ تمام علماءِ اہلسنت کا متفقہ عقیدہ ومسلک ہے کہ علوی حضرات سید نہیں اس لیئے کہ جب والد ہی سید نہیں تو اولاد کس طرح سید ہوگی۔ ذات بنانا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے کہ بلا دلائل بنانے لگیں۔ پیشواءِ اہل سنت ہمارے مقتدا اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمۃ اپنے فتاویٰ رضویہ جلد دوم باب کفو صفحہ نمبر ۴۱۸ پر فرماتے ہیں کہ سید یعنی آلِ نبی۔ ثابت ہوا کہ سید صرف آل نبی ہی مشہور ومتعارف ہے۔ اور اسی کتاب النکاح بابِ کفایت فتاویٰ رضویہ صفحہ نمبر ۱۲۷ پر ایک مسئلے کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ امیر المومنین مولا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے اپنی صاحبزادی حضرت اُمِ کلثوم کو بطنِ پاک حضرتِ بتول زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہیں امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں دیں اور ان سے حضرت زید بن عمر پیدا ہوئے اور امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نسباً سادات سے نہیں۔ (۲) سیدہ عاقلہ بالغہ اگر ولی رکھتی ہے تو جس کفو سے نکاح کرے گی ہو جائے گا اگرچہ سید نہ ہو۔ مثلاً شیخ صدیقی یا فاروقی یا عثمانی یا علوی یا عباسی (الخ)۔ اعلیٰ حضرت پیشواءِ اہل سنت کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہوا کہ علوی سید نہیں اور جب علوی سید نہیں تو حضرت علی بھی سید نہیں یہ دلیل اِنّی ہے۔ کسی بھی اہلِ سنت عالِم نے حضرت علی یا اولادِ علی کو سید نہیں کہا۔ دلیل دہم۔ امام اہلسنت حضرت حکیم الامت مفتی اسلام

حضرت مفتی احمد یار خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب الکلام المقبول صفحہ نمبر ۱۸ پر فرماتے ہیں ۔
حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ اولاد جو حضرت خاتون جنت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے ہے اسے سید کہتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ اولاد جو دوسری بیویوں کے بطن سے ہے اسے علوی کہتے ہیں۔ سید نہیں کہتے ہیں۔ جیسے محمد بن حنفیہ وغیرہ ہم (الخ) اس عبارت سے مسلک اہلسنت صاف ظاہر ہوا کہ علوی حضرات نسلاً سید نہیں۔ دلیل یازدہم : مسلکِ رفض سے کلام نہیں اُن کی اندھی عقیدت میں تو مولیٰ علی کو رب اور الٰہ بھی کہہ دیا گیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک الکفریات) جہاں تک مذہبِ اہلسنت کا تعلق ہے عقل کا بھی تقاضہ ہے کہ بجز اولادِ فاطمہ زہرا طیبہ طاہرہ کوئی بھی سید نہیں چند وجوہ سے ع۱ ایک تو یہی قرآن و حدیث کے دلائل جو اوپر بیان ہوئے۔ دوم یہ کہ اگر علوی حضرات بھی نسلی سید ہوں تو آلِ نبی کا امتیازی نشان کیا ہوگا اور اُن کی افضلیت کس طرح ثابت ہوگی۔ اگر مخالف فضیلت نہ مانے برابری مانے تو مولا علی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ماننا پڑے گا۔ حالانکہ یہ کفر صریح ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت علی اور ان کی غیر فاطمی اولاد سید نہیں۔ اور جو لوگ حضرت علی کو نسلی سیّد مانتے ہیں وہ بلا دلیل ہیں۔ صرف جوشِ عقیدت کے تحت ایسی بے مذہبی غلطیاں کرتے ہیں۔ مذکورہ فی السوال پیر صاحب کو چاہیئے کہ ایسے عقیدے سے توبہ و رجوع کریں اور صحیح اہلسنت ہونے کا ثبوت اور عقیدہ اپنائیں۔ کیسا خطرناک وقت آگیا ہے کہ جن مشائخ عظام پر سنیت کو ناز تھا۔ وہ پیشوائی کے بجائے بے راہ روی اختیار کر بیٹھے۔ کھاتے سنیوں کا ہیں۔ چندے اور نذرانے اہلسنت سے چھینتے ہیں پلتے ہیں اہل سنت کے دروازوں سے مگر کوئی صاحبزادہ دیوبندیت کی تبلیغ اور دیوبندیت پھیلانے میں لگ گیا۔ کوئی اپنے مریدوں کو رافضی شیعہ کا گرویدہ بنانے لگ گیا۔ اور نام پیر سنی کا سنی۔ شعر

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ہم محبت وناز سے بھیر دیوں۔ بغویوں۔ علی پوریوں کا چرچہ کیا کرتے تھے۔ مگر اب یہ عشق رسول کے مراکز بھی۔ رامپور دیوبند بنا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ہمارے ہیں کسی سے کیا شکایت۔ بس دست بدعا ہوں کہ ان اندھی عقل والوں کو چراغِ ہدایت نصیب ہو کر اپنے اکابر کو دیکھیں۔ دیا اللہ دینِ سنیت کو قائم و مضبوط فرما دامِ تذویر سے بچا۔ وہ روایات جن سے سیادتِ علوی غیر فاطمی کے ثبوت کا دھوکہ کھایا جاسکتا ہے۔ ان کا جواب دینا بھی اشد ضروری ہے کہ اتمامِ حجت ہو۔ پہلی روائت۔ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ نمبر ۱۶۷ پر ہے۔ اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَبُوْھُمَا خَیْرٌ مِّنْھُمَا ۔ ترجمہ۔ امام حسن وامام حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ اور اُن کے والد اُن سے افضل ہیں۔ مخالف اس روایت سے دلیل لے سکتا ہے کہ حضرت علی سیّد ہیں سید سے افضل سید ہی ہو سکتا ہے۔
جواب۔ یہ توجیہہ بالکل غلط ہے چند وجوہ سے اولاً اس لئے کہ اس ساری روایت میں سیادتِ فضیلت

ہی کا ذکر ہے نہ کہ سیادت خاندانی کا۔ کیونکہ یہاں لفظ سید کو مخصوص گروہ جزئی اضافی کی طرف نسبت کیا گیا ہے۔ اس روایت سے تو سیادتِ نسبی امامین کے لیئے بھی ثابت نہیں حالانکہ لفظِ سید اُن کے لیئے صاف مستعمل ہے چہ جائیکہ مولیٰ علی کی نسبی سیادت ثابت ہو۔ دوم اس لیئے کہ یہاں صرف افضلیت کا ذکر ہے یعنی امامین کریمین کی فضیلت یہ ہے کہ وہ جنّتی جوانوں کے سردار ہیں اور اُن کے والد کی فضیلت یہ ہے کہ وہ امامین سے افضل ہیں۔ سوم اِس لیئے کہ اس روایت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کوئی جاہل یہ سمجھ جائے کہ سید سے کوئی افضل نہیں ہو سکتا تو غلط ہے۔ کیونکہ نسبی سیّد ہونا یعنی آلِ رسول ہونا جہان بھر کے خاندانوں پر خاندانی شرافت ضرور ہے مگر افضلیت محض سید ہونے سے وابستہ نہیں۔ اس لیے کہ اسلام میں فضیلت اعمال اور قربِ خداوندی سے ہے۔ پس فرمایا جا رہا ہے کہ علی شیرِ خدا حسن وحسین سے افضل ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں نسبی سید ہیں۔ مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نسبی سیّد نہیں۔ نسبی سید ہونا صرف شرافت کی دلیل ہے۔ خیر اور فضیلت کی دلیل نہیں۔ مسلکِ اہلسنت میں صدیق وفاروق سب سے افضل ہیں اگرچہ نسبی شرافت میں امام حسن وحسین سے کم ہیں۔ اسی طرح ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فضیلت میں تمام صحابیات سے زیادہ ہیں اگرچہ بلحاظ نسبی شرافت کے فاطمہ زہرا سیّدہ رقیہ سیّدہ زینب۔ سیّدہ امِ کلثوم سے کم ہیں۔ ایسے ہی تاقیامت علماء اولیاء غوث وقطب۔ امام اعظم وغیرہ غیر سیّد اکابر۔ فضیلت میں عام نسبی سادات سے زیادہ ہیں مگر نسبی شرافت میں کم ہیں۔ مثلاً ایک سید نسبی بے عمل بلکہ بدعمل جاہل ہو وہ بھی نسبی شرافت میں غیر سید عالم وزاہد اور عبادت گزار سے اشرف ہے۔ مگر فضیلت میں عالم وزاہد ہی برتر ہے۔ ہاں البتہ اس شرافتِ نسبی وفضیلتِ علمی وکرامتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ نسبی سیّد اگرچہ بدعمل ہو مگر اُس کی گستاخی بے ادبی شرعاً جائز نہ ہوگی۔ جس طرح کہ عالِم اگرچہ بے عمل ہو مگر اس کی گستاخی ناجائز۔ اسی طرح عابد وزاہد اگرچہ بے علم ہو مگر کسی موقعہ پر بھی اس کی گستاخی جائز نہیں۔ فقہاء کرام کا یہ فرمان کہ "قَدْ وَجَبَ عَلَیْنَا اِہَانَتُہٗ"۔ (شامی جلد اول صفحہ ۲۶۶) یعنی فاسق کی اھانت واجب ہے۔ وہاں فاسق کے معنیٰ فاسق معلن ہے اور اہانت سے مراد عزت نہ کرنا ہے۔ بہرحال اس روایت کا مقصد اظہارِ افضلیت ہے۔ اس بنا پر "وَاَبُوْہُمَا خَیْرٌ مِّنْہُمَا" کہنا بالکل درست ہے۔ مگر نسبی سیادت کے لیئے یہ دلیل نہیں بن سکتی۔ رہی فضیلت تو شرعی طور پر یہ کہنا بھی جائز ہے۔ وَاَبُوْ بَکْرٍ خَیْرٌ مِّنْہُمَا وَعُمَرُ خَیْرٌ مِّنْہُمَا۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ اَجْمَعِیْنَ۔

چوتھی وجہ یہ کہ خود حاکم نے لکھا کہ صحیحین نے اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ ہٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ وَّ بِھٰذِہِ الزِّیَادَۃِ۔ ترجمہ۔ یہ حدیث پاک صحیح ہے مگر اس میں زیادتی ہے اِن الفاظ کی یعنی اَبُوْہُمَا خَیْرٌ مِّنْہُمَا۔ کے الفاظ زیادتی اور ملاوٹ ہے۔ لیکن مستدرک حاکم کی اس محدثانہ جرح کے باوجود میں الفاظ کی صحت کا قائل ہوں۔ دوسری روایت کتاب الاصابہ کے حاشیہ پر مشہور احادیث کی کتاب الاستیعاب جلد سوم

صفحہ نمبر ۳۶ پر ہے شَكَتْ فَاطِمَةُ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهَا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ فَقَالَ لَهَا سَيِّدٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ زَوْجُكِ (ترجمہ) حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے خاوند علی مرتضیٰ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ شکایت کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا حضرت سیدہ کو کہ علی سید ہیں دنیا اور آخرت میں تمہارے خاوند۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ حضرت علی سید ہیں اور آپ کی اولاد علوی بھی سید ہیں۔ مخالف اپنے گمان میں یہ استدلال کر سکتا ہے۔ جواب۔ مگر یہ گمان قطعاً فاسد ہے۔ اس لیے کہ پہلے ہی قرآن مجید سے ثابت کر دیا ہے کہ جب لفظِ سید کا استعمال بیوی کے ساتھ ہو تو وہاں سید بمعنیٰ خاوند ہے۔ پس چونکہ فاطمہ زہرا کے لئے حضرت علی کو سید کہا گیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ روایت مقدسہ کا مقصد یہ ہے کہ اے فاطمہ تم علی کی شکایت کر رہی ہو۔ حالانکہ یہ علی دنیا و آخرت میں تمہارے خاوند ہیں۔ یہاں سید بمعنیٰ خاوند ہے۔ اس لیئے اس روایت سے بھی مخالف کا مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔ تیسری روایت۔ مستدرک حاکم میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ يَا عَلِيُّ اَنْتَ سَيِّدُ الْعَرَبِ :۔ یعنی اے علی تم عرب کے سید ہو۔ یہاں بھی مخالف استدلال کر سکتا ہے کہ ثابت ہوا کہ حضرت علی نسبی سید ہیں۔ جواب۔ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ہم نے پہلے بتا دیا کہ جب لفظِ سید اضافت جزئیہ سے مستعمل ہو تو نسبی سیادت ثابت نہیں ہو سکتی۔ پس چونکہ یہاں لفظِ سید کو ایک ملک کی طرف منسوب کیا گیا اس لیئے یہاں سید بمعنیٰ حاکم ہے۔ یعنی اے علی تم عرب کے حاکم ہو۔ معلوم ہو گیا کہ اس روایت مبارکہ سے بھی خاندانی سیادت ثابت نہیں ہوتی۔ اور پھر اگر اسی طرح مولا علی کا سید ہونا اور ان کی غیر فاطمی علوی اولاد کا سید ہونا بتاؤ گے۔ تو صدیق اکبر۔ فاروق اعظم۔ اور ان کی صدیقی۔ فاروقی اولاد تا قیامت کو بھی نسبی سید ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان کے بارے میں ارشادِ مقدسہ ہے۔ سَيِّدَا كُهُوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ ۔ یہ حضرات جنتی اکابر کے سید ہیں)۔ جب یہاں نہیں مانتے حالانکہ یہ حدیث ہر طرح صحیح و خبر مشہور اور مسلم بخاری میں ہے۔ تو سید العرب والی روایت جو کہ محدثین کی جرح میں ضعیف ثابت ہو چکی ہے۔ کا غلط مطلب نکال کر صرف حضرت علی کو سید کس طرح کہہ سکتے ہو چنانچہ اس روایت کے بارے موضوعاتِ کبیر صفحہ نمبر ۳۴۲ کا فیصلہ اس طرح ہے۔ حَدِيْثُ سَيِّدُ الْعَرَبِ عَلِيٌّ (الخ) كُلُّهَا ضَعِيْفَةٌ بَلْ جَنَحَ الذَّهَبِيُّ اِلَى الْحَاكِمِ بِحُكْمِهَا بِالْوَضْعِ ۔ ترجمہ۔ اس قسم کی روائتیں تمام ضعیف ہیں۔ ذہبی نے حاکم کے متعلق پر زور کہا کہ انہوں نے ایسی روائتیں بنالی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ان کو صحیح مان کر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سید ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے چوتھی روایت دیلمی کی پیش کی جا سکتی ہے۔ اَنَّ الدَّيْلَمِيَّ رَوَاهُ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ عَلِيٌّ

قَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ اَنَا یَعْسُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَرَفَعَہٗ اِلَی النَّبِیِّ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اَنَّہٗ قَالَ یَا عَلِیُّ اِنَّکَ لَسَیِّدُ الْمُسْلِمِیْنَ وَیَعْسُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (ترجمہ)۔ امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ فرمایا مولیٰ علی نے میں یعسوب المومنین ہوں۔ اور اس روایت کو مرفوع کیا نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف کہ بے شک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی یقیناً تم مسلمانوں کے سید اور مومنوں کے یعسوب ہو۔ جواب:۔ یہ روایت اگرچہ اصول حدیث کے لحاظ سے درست ہے۔ مگر مخالف کا منشا حل نہیں ہوتا۔ اس لیئے کہ لفظ سید کو مطلق نہیں فرمایا گیا بلکہ اضافت کیا گیا۔ لفظِ مُسْلِمِیْنَ کی طرف اور اس طرح نسبی سیادت ثابت نہیں ہوتی ورنہ ہر مسلمان اپنے اپنے گروہ کا سیّد ہوتا ہے تو وہ بھی نسباً سیّد کہلانے کا حقدار بن جائے گا۔ اور اس لیئے کہ اس روایت میں لفظِ یعسوب شرح کر رہا ہے لفظِ سید کی۔ یعنی یہاں سیّد بمعنیٰ یعسوب ہے کیونکہ حضرت علی نے خود کو یعسوب کہا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سیّد المومنین و یعسوب کہا علی مرتضیٰ نے دونوں الفاظِ القابی کو جمع کر کے اپنے کو یعسوب کہا۔ شیرِ خدا علی مرتضیٰ کی اس طرز کلامی سے پتہ لگا کہ آپ کے نزدیک یہاں سید بمعنیٰ یعسوب ہے۔ اور لفظ یعسوب کا معنیٰ ہے لشکر کش امیر۔ اس لیئے شہد کی مکھیوں کے سردار کو بھی یعسوب کہا جاتا ہے۔ کہ وہ بھی لشکرِ نحل کو مفید مقام تک ہانکتا ہے۔ پس اس روایت کا مقصد یہ ہے کہ اے علی تم مسلمانوں کو صحیح چلانے والے امیرِ قافلہ اور لشکرِ مومنین کے قائدِ اعلیٰ ہو۔ خلاصہ یہ کہ حضرت نسلی سید نہیں اسلئے آپ کی اولاد علوی نسلاً سیّد نہیں۔ ہاں دنیائے اسلام میں اوّل مقام تمام اقوامِ عالم پر سیّدوں کا ہے۔ پھر صدیقی۔ پھر فاروقی۔ پھر عثمانی پھر علوی حضرات سب پر بلند مقام رکھتے ہیں۔ اور ان کا بہرصورت سب مسلمانوں پر احترام واجب ہے۔ ہمارے بعض بزرگوں نے فرمایا کہ علویوں کا درجہ بوجہ بنی ہاشم ہو کر قربِ نبوت حاصل کرنے کے صدیقی و فاروقی سے برتر ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ مگر نسبی سیّد ہونے کے لیئے شرط اول ہے۔ کہ قرآن مجید میں یا حدیث پاک میں صاف صاف بلا اضافت بلا قید سیّد کہا گیا ہو۔ حضرت علی کے لیئے کہیں بھی ایسی کوئی صحیح معتبر مسترادفتراً روایت نہ ملی۔ رہا روایت مقیّدہ کا معتبر ہونا تو یہ کوئی دلیلِ نسب نہیں۔ دن رات اہلِ عرب یَا سَیِّدِیْ، سَیِّدُنَا استعمال کرتے ہیں۔ مخالفین نے اپنے مقصد کے حصول کے لیئے یہاں تک دیدہ دلیری کی کہ بناوٹی روایات بھی بنانے سے خوفِ خدا نہ کیا۔ چنانچہ ایسی ہی ایک خود ساختہ عبارت بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر ابن مردویہ روایت کرتے ہیں۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَلِیُّ اَنْتَ سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ۔ ترجمہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی تم تمام اولادِ آدم کے سیّد ہو۔ اور گستاخ رافضی اس سے دلیل لاتا ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیّدِ وُلدِ آدم ہو کر خاندانی اور نسبی سیّد ہوئے تو علی بھی خاندانی سیّد ہوئے

جواب۔ یہ روایت کسی سخت غالی شیعہ نے اپنے گھر سے بنالی ہے۔ کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اور یہ عبارت چند وجوہ سے قابلِ نفرت ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ کسی محدّث نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس میں کوئی سند نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ اس میں دو طریقے سے گستاخی ہے۔ ایک یہ کہ اولادِ آدم علیہ السلام میں انبیاء کرام بھی ہیں۔ تو کیا علیِ مرتضیٰ ان کے بھی سیّد ہیں (معاذ اللہ) اور کیا علی رضی اللہ عنہ کا درجہ رسولانِ عظام سے بڑھاتے کا کفر بر فوق ہے۔ دوم یہ کہ اس عبارت سے نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت علی کا درجہ (نعوذ باللہ) نبیِّ پاک سے بھی زیادہ ہو جائے۔ اور یہی عقیدہ بہت سے مردودِ دین کا ہے۔ بدبخت ہے وہ پیر یا مرید جو سنّی کہلا کر پھر ایسی گستاخ عبارتوں سے دلیل پکڑے اور اندھا دھند بلا سوچے ان عبارتوں کو سینے سے لگائے اور نہ سوچے کہ یہ شیعہ رافضیوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ وہی رافضی نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حضرت علی کو درجہ دیتے ہیں۔ اور اسی کفریہ عقیدے کو پالنے کے لیئے ایسی عبارتیں بناتے رہتے ہیں۔ اہلِ سنّت کو ایسی عبارتوں اور ایسوں سے بچنا چاہیئے۔ چوتھی وجہ یہ کہ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ نمبر ۱۲۴ پر ہے: حَدَّثَنَا اَبُوالْعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ اَحْمَدَ الْمَحْبُوْبِیْ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُعَاذٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبُوْحَفْصٍ عُمَرُ بْنُ حَسَنٍ حَدَّثَنَا اَبُوْعَوَانَةَ عَنْ اَبِیْ بِشْرٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ جُبَیْرٍ۔ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیْنَ سَیِّدَ الْعَرَبِ فَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا۔ اَلَسْتَ سَیِّدُ الْعَرَبِ قَالَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَعَلِیٌّ سَیِّدُ الْعَرَبِ۔ (ترجمہ) مذکورہ بالا سند سے ابو العباس فرماتے ہیں کہ فرمایا آقائے دوجہاں نے ایک مجلس میں کہ کہاں ہیں عرب کے سردار۔ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیا آپ عرب کے سردار نہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں اولادِ آدم کا سیّد ہوں یعنی تمام جہان کا۔ اور علی ملکِ عرب کے حاکم ہیں۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں لہٰذا یہ حدیث مقدسہ بالکل ہر لحاظ سے صحیح ہے۔ اس نے صاف بتایا کہ علیِ مرتضیٰ سیّد ولدِ آدم نہیں ہو سکتے۔ ان چار وجوہ سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل بناوٹی ہے۔ ورنہ صحیح حدیث کے ساتھ تعارض لازم آئے گا۔ مخالف یہ بھی دلیل دے سکتا ہے کہ چونکہ اہلِ لغت کی بات بھی قابلِ سند ہوتی ہے۔ اس لیئے لغت کی مشہور کتاب لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ۲۲۶ پر ہے۔ کہ علوی وہ سیّد جو مولا علی علیہ السلام سے سوائے بطنِ اطہر حضرت فاطمہ علیہا السلام کے۔ اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ علوی حضرات سیّد ہیں۔ اور بھی کتبِ مشہورہ میں بہت سے علوی بزرگوں کے نام کے ساتھ سیّد کا لفظ لکھا ہوتا ہے۔ مثلاً۔ ایک مشہور بزرگ ہیں جن کا نام سیّد احمد علوی ہے۔ جواب۔ یہ سب کمزور دلیلیں اور لایعنی باتیں ہیں۔ دینِ اسلام کا قانون۔ قرآن حدیث ہے۔ اس کے بعد اجماعِ امت اور قیاس و اقوالِ فقہاء ہیں۔ جب ان سے

ثابت نہیں ہوا تو ادھر اُدھر ہاتھ مارنا بے کار ہے۔ دیگر اقوال تائید میں تو پیش کیے جا سکتے ہیں مگر مقابلے میں نہیں۔ رہا لغاتِ کشوری کا حوالہ تو دو وجہ سے ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اہلِ لغت کی کتب میں سے نہیں۔ اہلِ لغت اہلِ زبان کو کہتے ہیں۔ یہ عجمی لوگ تو اہلِ لسان کے ریزہ چین ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر کی عربی کتب سے لقمہ چینی کر کے کچھ الفاظ جمع کر لیے اور اپنی کتاب بنا بیٹھے۔ جہاں دل چاہا اپنی مرضی کا مطلب ٹھونس دیا۔ دوم یہ کہ اس کتاب کا مولّف تصدق حسین رضوی خود غالی شیعہ بلکہ ہندو نواز ہے اس کا شیعہ ہونا تو اُس کی سوانح کے علاوہ اُس کی اس ہی پیش کردہ عبارت سے بخوبی عیاں ہے اور ہندو نواز اور کاسہ لیسی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ ایک ہندو مشرک کو اپنے اسی کتاب کے دیباچہ میں۔ آقاء نامدار۔ آقا ممدوح جیسے پُرعظمت لفظ لکھ کر خود کو سید آلِ رسول بناتے ہوئے ایک ہندو مشرک کی گلی کا کتا اور گدھا کہہ رہا ہے اور اپنی اسی کتاب کا نام تیمناً و تبرکاً آقاءِ نامدار ہندو کے نام نامی سے منسوب کرتا ہے۔ یعنی خبیث ہندو کے نام سے یمن و برکت کے حصول کا دعویدار ہے۔ ایسی بیہودہ حرکات ایک رافضی ہی کر سکتا ہے جن کے دین میں تقیہ جیسے حرکات ہوں۔ رہا یہ کہنا کہ مشہور علوی بزرگوں کے لیے سید کا لفظ استعمال کیا گیا تو یہ غلط ہے۔ علوی بزرگ خود اپنے کو ہمیشہ علوی ہی لکھتے رہے۔ اگر کوئی دوسرا اُن کو شاہ یا سید کہہ دے تو اس کی اپنی بات ہے جو سند نہیں ہو سکتی۔ اور سید احمد علوی غیر معروف شخصیت ہیں۔ لہٰذا ایسی باتیں دلیل نہیں بن سکتیں۔ پانچویں روایت۔ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ نمبر ۱۲۸ پر اس طرح ایک روایت منقول ہے۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْفَضْلِ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ الْمُزَكِّيْ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ سَلَمٍ حَدَّثَنِيْ حُسَيْنُ بْنُ قَتْبَانِيْ عَنْ اَبِي الْحَسَنِ اَحْمَدُ بْنُ خِضْرٍ شَافِعِيّ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحَاقِ عَنْ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ ابْنِ اُمَيَّةَ قرشي بِالسَّاقِه۔ عَنْ اَحْمَدَ بْنِ يَحْيٰى بْنِ اِسْحَاقَ حَلْوَانِيّ عَنْ اَبِي الْاَزْهَرِ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَلِيْ مُزَكِّيْ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ زُهْرِيْ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ۔ قَالَ نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عَلِيٍّ فَقَالَ يَا عَلِيُّ اَنْتَ سَيِّدٌ فِي الدُّنْيَا سَيِّدٌ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (ترجمہ) چودہ نفر کی سند والی اس روایت کے راوی حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ اے علی تم دنیا اور آخرت میں سید ہو۔ اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ مولا علی اور آپ کی اولاد نسبی سید ہے۔ جواب۔ یہ روایت دو وجہ سے قابلِ استدلال نہیں ہے پہلی وجہ یہ کہ یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ اس کے بارہویں راوی مُعَمَّر ہیں۔ اسماء الرجال میں ان کا پورا نام معمر بن محمد ہے۔ اور محدثین کے نزدیک غیر ثقہ راوی ہیں۔ چنانچہ تقریب التہذیب صفحہ نمبر ۳۴۴ پر ہے۔

ترجمہ۔ معمر بن محمد بن علیہ السلام منکر حدیث ہے۔ دسویں درجہ کے کبا ئر سے ہے۔
دسویں مرتبے کے راوی قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی تقریب کے صفحہ نمبر ۱۰ پر ہے۔
دسویں مرتبے کا راوی وہ
ہے جس پر علمِ حدیث میں بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ضعف بھی ہوتا ہے۔ اس جرح سے ثابت ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے اور ضعیف روایت پر اعتماد نہیں ہوتا۔ نہ اُن سے دلیل پکڑنی جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ۔ اگر اس روایت کو ہر طرح سے درست اور صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مخالف کا مدّعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ روایت کا یہ جملہ
بقانون نحو و منطق مرکّب تقییدی ہے۔ کیونکہ فی ظرفیہ تقیید کے لئے آتا ہے۔ اور جہاں حرفِ جرّ فی ہو تو وہاں اسم ظرف اپنے مظروف کی قید ہوتی ہے۔ چنانچہ منطق کی مشہور کتاب مرقات کے صفحہ نمبر ۱۱ پر ہے

ترجمہ۔ مرکب ناقص چند قسم پر ہے۔ ایک مرکب اضافی اور ایک توصیفی اور ان میں سے تیسری مرکّب تقییدی ہے۔ اس کی مثال جیسے کہ فی الدار۔ یعنی زید گھر میں ہے۔ ثابت ہوا کہ حرفِ فی کی وجہ سے ظرفیہ ثابت ہو جاتی ہے۔ اور ظرف ہمیشہ مظروف کی قید ہوتا ہے۔ جہاں ظرف مظروف ہو وہاں مرکّب تقییدی ہوتا ہے۔ مذکورہ روایت میں بالکل اسی طرح حرف جار نے مظروف اور ظرف کو مرکب تقییدی بنا دیا۔ پس یہاں لفظ اَنْتَ اور لفظِ سَیِّد کا تعلق۔ دنیا اور آخرت سے ہے۔ اور لفظِ سید مظروف ہے فِی الدُّنیا اور فِی الآخرت کا۔ اور یہ جملے ناقصے ایک ہی جملہ تامّہ کی خبر بن گئے۔ لہٰذا سب جملے کا حکم اور معنیٰ مقصد ایک ہوا۔ جو مقصد دوسرے کا ہوگا وہی پہلے کا۔ حکم میں تغیّر محال ہے۔ آخرت میں سید ہونے کا مطلب نسبی سیادت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آخرت میں نسب نہیں چلتا نہ اولاد بڑھتی ہے۔ پس لازمی ہے۔ کہ سیّدٌ فی الاخرت کا مطلب یہی ہے کہ اے علی تم آخرت میں سردار ہو۔ سیادت اُخروی صرف سرداری ہو سکتی ہے۔ اور روایت کے جامع مانع الفاظ نے سیادتِ اُخروی کے ساتھ ہی سیادت دنیوی کو جوڑا۔ پس یہاں وہی معنیٰ ہو سکتے ہیں یعنی سرداری۔ مطلب یہ ہوا کہ اے علی تم دنیا و آخرت میں سردار ہو۔ لہٰذا مسئلہ صاف ہو گیا۔ اس روایت سے بھی سیادتِ نسبی مراد نہیں ہو سکتی۔ اور مخالف کے ترکش کے تیر سارے خالی ہو گئے۔ اب بحمدہٖ تعالیٰ مخالف کے پاس ایسی کوئی دلیل باقی نہ رہی جس سے علوی بزرگوں کی سیادتِ نسبی ثابت ہو سکے۔ اس فتوئے شرعی کی رد سے علوی حضرات کو نسبی سید ماننا ناجائز ثابت ہُوا

کیونکہ جس طرح سادات کو سادات نہ ماننا گناہ ہے اسی طرح غیر سید کو سید ماننا اور کہنا بھی گناہ ہے۔ کہ خاندان بدلنا شریعت میں سخت بدترین جرم ہے۔ یہ بات بحمدہٖ تعالیٰ روز روشن کی طرح ہے کہ اہل سنت و جماعت کے پاس ہر مسلک و عقیدے پر کثیر دلائل ہیں۔ مگر مخالفِ اہل سنت اکثر اپنے استدلال میں ضعیف اقوال موضوع روائتیں اور غلط تاویلیں پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ یہ انصاف کا تقاضہ نہیں کہ پہلے گھر بیٹھے نفسِ امارہ کے حکم پر ایک عقیدہ بنا لیا۔ پھر اُس کے لیئے دلائل ڈھونڈتے ہوئے غلط روائتیں بنانا شروع کر دیں۔ اور بلا سوچے سمجھے صحیح احادیثِ مقدسہ کے مطلب و معنیٰ غلط سمجھ لیئے۔ حدیثِ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھنا کوئی آسان نہیں کہ ہر عالم جاہل اِس کو پیٹے پھرے اور جس طرح چاہے اپنا مقصود پورا کر لے۔ یہی وہ روایات جس کو مخالف اپنا سہارا بنا سکتا تھا، ہم نے اصول و فقہ کے قواعد کے مطابق اِن کا صحیح مطلب بیان کر دیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ نہ حضرت علی نسبی سیّد ہیں نہ اُن کی علوی اولاد سید ہو سکتی ہے۔ اگر میری اس تحقیق کو نہ مانو گے تو فی زمانہ فاروقی۔ صدیقی۔ نسل کو سیادت سے کیسے روک سکتے ہو۔ کہ جن روایات کی بنا پر تم حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علوی خاندان کو نسبی سید کہتے ہو ان سے زیادہ مستند اور صحیح احادیثِ مبارکہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سیّد ہونے پر وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا اندھی عقیدت میں یہ غلط رواج مت ڈالو ورنہ کل ہر شخص خود کو نسبی سیّد کہنے کا دعویدار ہوگا اور تم اس کو کسی دلیل سے روک نہ سکو گے۔ کیونکہ سیّد بمعنی سردار تو تمام صحابہ ہیں۔ اور دنیا و آخرت کے سید تو حضرت آدم علیہ السلام و نوح علیہ السلام وغیرہ جملہ انبیاء علیہم السّلام ہیں۔ اس بنا پر ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ میں سید تا حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں۔ لہٰذا میں بھی سید ہوں۔ دین کو کھیل نہ بناؤ۔ اسلام بہت باضابطہ اور بااصول مذہب ہے۔ یہاں کسی کو مُن مانی کرنے کی اجازت نہیں۔ کہ جس وقت چاہا جو چاہا بنا دیا۔ آج تک کسی نے حضرت علی کو نسبی سیّد نہیں کہا نہ علویوں کو ساداتِ نسلی میں شامل مانا یہ اب چودھویں صدی کی شیعہ روافض کی طرف سے پھیلائی ہوئی بیماری ہے جو ظاہری سنیوں کے دلوں میں بھی آگئی۔ اللہ ہم سب کو دین کی سچی سمجھ عطا فرمائے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

حضرت حمزہ کی نسل کا بیان

سوال نمبر ۱: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بلوچی کہتے ہیں ہم حضرت حمزہ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ہم بنی ہاشم اور سید ہیں۔ فرمایا جائے کیا یہ درست ہے۔ اور حضرت حمزہ

کی نسل کون سی ہے ۔ بینوا و توجروا ۔ سائل محمد خالد پنجابی کوئٹہ ۔ بلوچستان مورخہ ۲۲ ۶/۱۹۶۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قانون شریعت کے مطابق ہر شخص کی نسل بیٹے سے چلتی ہے ۔ بجز نبی کریم کے کہ آپ کی نسل سادات کرام حضرت فاطمۃ الزہرا بتول خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے چلی ۔ اور ہر بیٹا اپنے باپ کی نسل ہوتا ہے تاریخ اسلام میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولادِ پاک میں روایات صحیحہ کی رو سے آپ کی ایک صاحبزادی حضرت درّہ بنت صحرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر آتا ہے ۔ تاریخ اسلام نے مختصراً اس کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن اس کو اولاد حمزہ کا تو لقب دیا جا سکتا ہے ۔ مگر اُن کو بنی ہاشم نہیں کہا جا سکتا ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ شریعت اور فطرت کے قانون میں ہر بچے کو باپ کی نسل اور ماں کی اولاد کہا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ اگر کوئی شخص لونڈی سے نکاح کرے ۔ اور اولاد پیدا ہو ۔ تو وہ اولاد باپ کی نسبت سے اس کی ہم قوم ہو گی ۔ اور والدہ کی نسبت بوجہ اولادیت وہ لونڈی غلام ہو کر مولیٰ کی ملکیت ہو گی ۔ چنانچہ فتاویٰ درِّ مختار جلد سوم صفحہ نمبر ۱۸۸ پر ہے :۔ وَلَا فِي نَسَبٍ حَتّٰى لَوْ نَكَحَ هَاشِمِيٌّ اَمَةً فَوَلَدُهَا هَاشِمِيٌّ كَاَبِيْهِ رَقِيْقٌ كَاُمِّهٖ ۔ (ترجمہ) :۔ بچہ والدہ کے تابع نہیں ہوتا ۔ نسب میں یہاں تک کہ اگر ہاشمی سید مرد کسی لونڈی سے نکاح کرے ۔ تو اسی لونڈی کی اولاد باپ کی وجہ سے ہاشمی سید کہلائے گی ۔ اور ماں کی وجہ سے غلام بنے گی ۔ اسلامی قانون میں صرف بارہ چیزوں میں حمل ماں کے تابع ہوتا ہے ۔ اور دس چیزوں میں والد کے تابع ہوتا ہے ۔ پس ثابت ہوا ۔ کہ حضرتِ حمزہ کی نسل نہ چلی ۔ اِس لیئے فقہاء کرام سادات ہاشمی کی فہرستِ سلسلہ میں بنی ۔ ابی لہب اور بنی حمزہ کا ذکر نہیں کرتے ۔ بنی ابی لہب تو بوجہ کفر و عناد کے سادات سے خارج ہے ۔ اور بنی حمزہ کا وجود ہی نہیں ۔ چنانچہ فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۲۵ پر ہے :۔ وَلَا يُدْفَعُ اِلٰى بَنِيْ هَاشِمٍ وَهُمْ اٰلُ عَلِيٍّ وَاٰلُ عَبَّاسٍ وَاٰلُ جَعْفَرٍ وَاٰلُ عَقِيْلٍ وَاٰلُ حَارِثِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ وَمَوَالِيْهِمْ ۔ (ترجمہ) :۔ زکوٰۃ نہ دی جاوے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم آلِ علی ۔ آلِ عباس ۔ آلِ جعفر ۔ آلِ عقیل اور آلِ حارث بن عبد المطلب اور ان کے موالی ہیں ۔ اِس فہرست میں آلِ حمزہ کا ذکر تک نہیں ۔ پس ثابت ہوا ۔ کہ بلوچیوں کا یہ کہنا کہ ہم ہاشمی ہیں ۔ کیونکہ حضرتِ حمزہ کی اولاد ہیں ۔ یہ غلط ہے ۔ اگر یہ حضرتِ درّہ ہی کی اولاد ہیں تو بھی ہاشمی نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ خاندان بیٹے سے چلتا ہے نہ کہ بیٹی سے ۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مقتدی کو سورت فاتحہ پڑھنی منع ہے

سوال ۱۲ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں۔ ہمارے بستی کا ایک وہابی غیر مقلد دیوبندی مولوی یہ کہتا ہے کہ سورت فاتحہ مقتدی بھی ضرور پڑھے۔ اور کہتا ہے وہ حدیث مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَأَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَأَۃٌ۔ اس لفظ میں لَہٗ کی ہٗ ضمیر سے امام مراد ہے نہ کہ لفظ مَنْ مقتدی کیوں کہ ضمیر ہمیشہ قریب کے مرجع کی طرف لوٹتی ہے۔ بعید کی طرف لوٹانا غلط ہے۔ لہٰذا عرض ہے کہ اپنی تحقیق سے فتویٰ عطا فرمایا جائے:

سائل:۔ محمد خالد مقام کوئٹہ بلوچستان۔ مورخہ:۔ ۲۲-۶-۱۹۷۲

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

مذکورہ فی السوال دیوبندی صاحب نحوی قواعد سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ ایسی بات نہ کہتے جو عقلاً نقلاً ہر طرح سے غلط ہے۔ سوال کی مشہور روایت مبارکہ۔ مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَأَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَأَۃٌ ط۔ (ترجمہ) وہ نمازی جس کا نماز میں کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس نمازی کی قرأت بن جائے گی۔ اس کو علیحدہ قرأت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس حدیث پاک میں دو دفعہ لفظ لَہٗ مستعمل ہے۔ دونوں میں ضمیر واحد غائب کا مرجع مَنْ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اور لفظ ہٗ سے مراد مقتدی ہے۔ اور یہی منشاءِ کلام ہے اور محدثین و شارحین کے نزدیک بھی یہی مراد ہے۔ چنانچہ طحاوی شریف جلد اول میں صفحہ نمبر ۱۲۷ پر اس حدیث پاک کی شرح اس طرح مذکور ہے:۔ اَخْرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْمَاْمُوْمَ لِقَوْلِہٖ مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَأَتُہُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَأَۃٌ۔ فَجَعَلَ الْمَاْمُوْمَ فِیْ حُکْمِ مَنْ یَّقْرَءُ بِقِرَاءَۃِ اِمَامِہٖ فَکَانَ الْمَاْمُوْمُ بِذٰلِكَ خَارِجًا ط۔ (ترجمہ) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز میں قرأت کرنے سے مقتدی کو علیحدہ کر دیا۔ اپنے اس فرمان پاک سے کہ وہ شخص جس کا امام ہو پس امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے پس مقتدی اس بنا پر خارج ہو گیا قرأت سے۔ اسی حدیث پاک کی شرح میں امام محمد رحمتہ اللہ علیہ اپنے مؤطا کے صفحہ نمبر ۹۳ پر فرماتے ہیں:۔ قَالَ مُحَمَّدٌ اَخْبَرَنَا عُبَیْدُ اللّٰہِ ابْنُ عُمَرَ بْنِ حَفْصِ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ

نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنْ صَلّٰی خَلْفَ الْاِمَامِ كَفَتْهُ قِرَاءَتُهٗ ۔

ترجمہ:۔ فرمایا امام محمد نے خبر دی ہم کو عبید اللہ ابن عمر ابن حفص ابن عاصم ابن فاروق اعظم نے۔ انہوں نے حضرت نافع سے انہوں نے ابن عمر سے کہ فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے۔ ان محدثین کی شرح سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ روایت مذکورہ کا لفظ ہٗ دونوں جگہ مَنْ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ قواعد نحویہ اور علم اصولِ فقہ کے مطابق بھی یہ ہر دو ضمیر مَنْ کی طرف ہی رجوع کر سکتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر لہٗ کی ضمیر لفظِ مَنْ کی طرف نہ لوٹائی جائے تو الفاظِ روایت و مفہوم روایت بالکل ہی غلط ہو جائیں گے۔ اگر پہلے لہٗ کو امام کی طرف پھیرا جائے تو اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل منع ہے۔ کیونکہ ضمیر کبھی پہلے نہیں آ سکتی۔ جیسے کہ کوئی شخص آپ سے کہے کہ وہ آیا تھا۔ اور وہ یہ کہتا تھا۔ کسی کا پہلے نام نہ لے تو آپ کو خاک سمجھ نہ آئے گا۔ اور اس کا یہ سب کلام غلط اور فضول ہو گا۔ اسی طرح اگر حدیث پاک کے پہلے لفظ لہٗ کی ہٗ ضمیر سے امام مراد لو۔ تو کلام لغو ماننا پڑے گا۔ جو حدیث پاک کے شان میں بڑی گستاخی ہے۔ اور ترجمہ بھی غلط ہو گا۔ کیونکہ ترجمہ یہ ہو گا۔ مَنْ کَانَ لَهٗ اِمَامٌ وہ شخص جو کہ ہو اس امام کا امام۔ کیسا غلط ترجمہ ہوا یہ غلط ترجمہ اس لیے کرنا پڑے گا۔ کہ بقول وہابی ہٗ سے مراد امام ہے۔ اور لفظِ امام اس کے بعد آ رہا ہے اور لہٗ کا لام اضافت کے معنیٰ میں ہے۔ نحوی لحاظ سے امام کو مضاف اور ہٗ ضمیر کو مضاف الیہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ حالانکہ ہمیشہ مضاف پہلے ہوتا ہے۔ اور مضاف الیہ بعد میں۔ یہاں اضافتِ مقلوبی بھی ضمیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے لیے دونوں اسم تام ظاہر ہونے شرط ہیں۔ اضافت مقلوبی میں ضمیر نہیں آ سکتی۔ جیسے لفظ محمد دین یعنی محمد کا دین۔ یہاں لفظِ محمد مضاف الیہ ہے اور لفظِ دین مضاف ہے اور یہ اضافت مقلوبی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ مقصد اضافت عام مضاف کو خاص کرنا ہے۔ لفظِ محمد تو پہلے ہی خاص ہے کیونکہ کائنات میں بجز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی محمد نہیں ہاں دین عام ہے کہ دنیا میں بے شمار دین ہیں۔ پس اس مرکب اضافی کو اضافت مقلوبی کر کے دین کو خاص کرنا مقصود ہے۔ اگر یہاں مقلوبی اضافت نہ مانی جائے تو عبارت غلط۔ بلکہ ضمناً گستاخی ہو گی۔ اور ترجمہ ہو گا دین کا محمد۔ تو گویا کہ اور بھی محمد تسلیم ہیں۔ اور یہ وہابیانہ گستاخی ہو گی۔ جیسا کہ مولوی عبد الحی وہابی اپنے فتاوی عبد الحی کے صفحہ نمبر ۵۲ پر لکھتا ہے۔ کہ جہان بہت سے ہیں اور ہر جہان کا نبی علیحدہ ہے۔ آدم علیحدہ موسیٰ علیحدہ ہر جہان کا محمد علیحدہ (معاذ اللہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ) اور دلیل پکڑتا ہے یہودیوں کی ایک موضوع اسرائیلی روایت سے کہ جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں:۔ اٰدَمُ كَاٰدَمِنَا وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ پس ثابت ہوا کہ لہٗ کی پہلی ضمیر مَنْ کی طرف لوٹ رہی ہے اسی طرح دوسرے لہٗ کی ضمیر بھی اسی مَنْ کی طرف مرجوع ہے کیونکہ اگر دوسرے لہٗ کی ضمیر ہٗ کو بقولِ

دیوبندی مذکور۔ امام کی طرف لوٹائی جائے تو دو خرابیاں لازم آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس طریقے سے دوسرے لہٗ کو حصر کرنا پڑے گا۔ اور اگلی عبادت کا ترجمہ یہ کرنا پڑے گا کہ پس امام کی قرأت امام ہی کی قرأت ہے حالانکہ یہاں حصر جائز نہیں۔ اس لیئے کہ حصر کی عربی میں چند صورتیں ہیں ع۱ تکرارِ ضمائر جیسے :۔ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ۃ ترجمہ بے شک وہ ہی فسادی ہیں۔ اور اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ط (ترجمہ) بے شک تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔ ع۲ ماخذ لفظ کو مقدم کرنے سے بھی حصر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اِيَّاكَ نَعْبُدُ ط (ترجمہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ع۳ حروفِ استثناء سے جیسے مَا قَامَ اِلَّا زَيْدٌ ترجمہ۔ نہ کھڑا ہوا مگر زید۔ یعنی زید ہی کھڑا ہوا۔ ان تمام اقسام میں سے کوئی قسم بھی یہاں نہیں ہے۔ نہ حصرِ اضافی اور نہ حصرِ حقیقی۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ روایتِ مبارکہ کے دوسرے لفظ لہٗ کی ضمیر امام کی طرف مرجوع ہو۔ اصولِ فقہ اور علمِ نحو کے اعتبار سے بھی یہ بات قطعاً غلط ہے کہ ہٗ ضمیرِ واحد مذکر غائب کو امام کی طرف لوٹائی جائے۔ اس لیے کہ اس حدیث پاک کی تمام عبارت جملہ شرطیہ ہے۔ اس کی پہلی جز یعنی مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ ط یہ شرط ہے۔ اور فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ ط یہ جزا ہے۔ حرف فاء جزائیہ ہے۔ قواعد کے مطابق جملہ شرطیہ میں تعلیق شرط ہے۔ یعنی جزا کا شرط پر موقوف ہونا۔ کہ شرط ہو تو جزا ہو۔ اگر شرط نہ ہو تو جزا بھی نہ ہو۔ چنانچہ علم اصول کی کتاب نور الانوار صفحہ ۱۳۶ پر ہے۔ فَالْمُرَادُ بِالشَّرْطِ اَنْ لَّا يَصِحَّ الْمَامُوْرُ بِهٖ قَبْلَ وُجُوْدِهٖ وَيَفُوْتُ بِفَوْتِهٖ ط (ترجمہ)۔ اور مراد شرط سے یہ ہے کہ نہ درست ہو حکم دی ہوئی جزاء شرط کے وجود سے پہلے اور جزا ختم ہو جائے شرط کے ختم ہونے سے۔ اس قاعدے کے مطابق اگر لفظ لہٗ کی ضمیر امام کی طرف لوٹے تو مطلب یہ ہوگا۔ اگر مقتدی لہے تو امام کی ہو جائے۔ ورنہ امام کے قرأت کرنے کے باوجود اس کی قرأت نہ ہو۔ یعنی اگر اکیلے منفرد نماز پڑھ رہا ہے۔ تو کسی بھی نمازی کی قرأت نہ بنے۔ حالانکہ یہ سخت غلط ہے اور سب کے خلاف ہے۔ اس طرح تو لازم آتا ہے کہ صرف امام کی قرأت درست ہے۔ باقی کسی نمازی کی قرأت صحیح نہ ہو۔ نہ مقتدی کی نہ منفرد کی۔ نیز لازم آیا کہ مقتدی کی قرأت کوئی شی نہ بنے تو یہ ہماری دلیل ہی بن جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ یہ ہٗ ضمیر بھی مقتدی یعنی لفظِ مَنْ کی طرف ہی لوٹ رہی ہے۔ نہ کہ امام کی طرف جیسا کہ وہابی مذکور نے سمجھا۔ اور حدیث پاک کا صحیح مطلب یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو وہ خود قرأت نہ کرے کیونکہ قِرَاءَةُ الْاِمَامِ قِرَاءَةٌ لَّهٗ ط (یہ طحاوی شریف کے الفاظ) امام کی قرأت اس (مقتدی) کی قرأت بن جاتی ہے۔ مگر جو اکیلا نماز پڑھے۔ وہ خود قرأت کرے۔ اور پھر اس حدیث پاک میں لفظ قرأت مطلق ہے۔ جو سورت فاتحہ اور دیگر سورت ہر دو کو شامل ہے۔ حالانکہ غیر مقلد دیوبندی صرف سورت فاتحہ کے پڑھنے کا

مقتدی کو حکم دیتے ہیں۔ دیگر سورت کو وہ بھی منع کرتے ہیں۔ تو پوچھو نادانوں سے کہ قرأت امام میں کیا صرف فاتحہ ہی امام کی بنے گی۔ باقی قرأت امام کی نہ بنے گی۔ وہ مقتدی کی بن جائے گی۔ بہرحال یہ سب کم عقلی کی باتیں ہیں۔ غیر مقلد وہابی کا یہ کہنا بھی غلط ہے۔ کہ ضمیر ہمیشہ قریب کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ بلکہ نحوی قاعدے کے مطابق ضمیر کا مرجع قریب و بعید ہر طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شرح جامی باب تنازع الفعلین صفحہ نمبر ۹۱ پر ہے وَاَمَّا الضَّمِیْرُ الْمُنْفَصِلُ الْوَاقِعُ بَعْدَ هُمَا نَحْوُ مَا ضَرَبَ وَاَکْرَمَ اِلَّا اَنَا۔ فَفِیْهِ تَنَازُعٌ (الخ)۔ ترجمہ اور لیکن ضمیر منفصل جو واقع ہو۔ دو فعلوں کے بعد جیسے کہ نہیں مارا مجھ کو اور تعظیم کی اس نے۔ اس عبارتِ مثل میں دو فعلوں کے بعد ضمیر اَنَا آ رہی ہے۔ نحویوں کے نزدیک یہ دور کے فعل مَا ضَرَبَ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور قریب کی طرف بھی۔ چنانچہ فرّاء نحوی کا مذہب ہے۔ وَاَمَّا عَلٰی مَذْهَبِ الْفَرَّاءِ فَیَعْمَلَانِ مَعًا ؕ (ترجمہ)۔ اور لیکن فرّاء نحوی کے نزدیک دونوں فعل اس ضمیر پر عمل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر بقول دیوبندی ضمیر ہمیشہ قریب کی طرف ہی لوٹتی۔ تو یہاں لفظ اَنَا مَا ضَرَبَ کی طرف ہرگز نہ جا سکتا۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ پہلا پارہ آیت نمبر ۱۱۳۔ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ؕ (ترجمہ) یہودی بولے عیسائی کچھ نہیں۔ اور عیسائی بولے یہودی کچھ نہیں۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس طرح تو ان لوگوں نے جھگڑے ڈالے۔ تھے۔ جو بالکل کتاب اللہ کو نہیں جانتے۔ اور اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے گا۔ ان یہودیوں و نصاریٰ کے درمیان قیامت کے دن اس بارے میں کہ جس میں وہ جھگڑا کرتے تھے۔ یہاں دو قول ہیں:۔ نمبر ۱:۔ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۲) وَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ ؕ ان دونوں جگہ هُمْ ضمیر جمع غائب ہے۔ اور یہ دونوں دور کے مرجع کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ پہلی ضمیر هُمْ اگرچہ قریب کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ مگر تمام مفسرین نے اس کو دور کی طرف لوٹایا ہے۔ اس کا پہلا قریبی مرجع اَلَّذِیْنَ ہو سکتا ہے۔ دوسرا دور کا مرجع یہود و نصاریٰ ہے۔ لیکن علماءِ محققین نے اس ضمیر کو دور کے مرجع کی طرف لوٹایا۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد اول صفحہ نمبر ۳۶۲ پر ہے:۔ اِیْ بَیْنَ الْیَهُوْدِ وَالنَّصٰرٰی لَا بَیْنَ الطَّوَائِفِ الثَّلَاثَةِ ؕ ترجمہ ۔۔ یعنی فیصلہ فرمائے گا اللہ جلّ شانہٗ قیامت کے دن یہود و نصاریٰ کے درمیان۔ اس سے ثابت ہوا کہ ضمیر دور کے مرجع کی طرف جا سکتی ہے۔ اور دیوبندی صاحب نے صرف اپنے مذہب کو بچانے کے لیئے آنکھیں بند کر کے اپنے پاس سے ایک قاعدہ بنا لیا۔

تیسری دلیل میں اگر دیوبندی صاحب ضمیر کو قریبی مرجع کی طرف لوٹائیں تو خود اپنے مذہب کے مطابق مشرک ہو جائیں

دیکھو قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ۔ (الخ)۔ اس آیت کریمہ میں لفظ یُحْیِی میں ہٗ واحد مذکر غائب پوشیدہ ہے۔ جو اس کا فاعل بن رہی ہے۔ اور ہٗ سے مراد یا لفظِ مَا ہو سکتا ہے۔ یا لفظِ رسول یا لفظِ اللّٰہ۔ قریبی مرجع مَا ہے بعیدی اللّٰہ ہے۔ اگر وہابی صاحب اپنے قاعدے سے قریبی مرجع کی طرف یُحْیِی کی ضمیر ہٗ کو لوٹاتیں۔ تو وہابیوں کا شرک ہوگا۔ کیونکہ اب ترجمہ پوری آیت کا اس طرح ہوگا۔ کہ اے ایمان والو فوراً بات مانو اللّٰہ کی اور رسول پاک کی۔ کہ جب بلائیں تم کو اس چیز کے لیے جو تم کو زندہ کرے۔ اور وہابیوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی بخش صرف اللّٰہ ہے۔ مگر یہاں ضمیر کا قریبی مرجع اُس چیز کو زندگی بخش بتا رہا ہے۔ لہٰذا وہابی صاحب اگر ضمیر کو اللّٰہ کی طرف پھیرتے ہیں تو یہ قاعدہ خود ساختہ ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ ضمیر کا مرجع دور رہ جاتا ہے۔ اور اگر قریبی مرجع بناتے ہیں تو شرکِ وہابیت لازم آتا ہے۔ دونوں طرف موت ہے۔ لیکن بحمدہٖ تعالیٰ اہل سنت والجماعت بریلویوں کا عقیدہ مضبوط ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے ثابت کر دیا۔ کہ قرآن و حدیث اور نبی کریم کے بلانے اور کلمات طیبہ بھی زندگی بخش ہیں۔ جب ان آیات اور اس کے علاوہ اور بہت آیات میں ضمیریں دور کے مرجع کی طرف جا سکتی ہیں۔ تو حدیث پاک میں فَقِرَاءَتُہٗ لَہٗ کی ضمیر بھی مَنْ کی طرف لوٹ سکتی ہے وہابیوں کو چاہیئے کہ اس قریبی مرجع والے قاعدے پر کوئی حدیث سے دلیل پیش کریں۔ اگرچہ نحوی قواعد سے بھی کوئی مضبوط و مرجوع دلیل میسّر نہیں۔ مگر یہ لوگ جو ہماری تقلیدِ ائمہ مجتہدین پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ تو ان کی نحوی تقلید کیونکر گوارا کی جائے گی۔ اگر یہ لوگ نحو سے دلائل پیش کریں۔ تو نحویوں کے مقلّد ہو کر بقولِ خود شرک فی الرسالت میں مبتلا ہو جائیں۔ خیال رہے کہ شرک فی الرسالت ان لوگوں کا نیا تیار کردہ ماڈل ہے۔ قرآن و حدیث میں اس لفظ کا بھی وجود نہیں ملتا۔ گویا کہ ان کے نزدیک نبی بھی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ اللّٰہ تعالیٰ رب کریم کی خصوصی صفت ہے۔ شعر

ترسم کہ بکعبہ نرسیدی اے وہابی
کین راہ کہ تو روی بشرکستان است

خلاصۂ کلام یہ کہ مقتدی کو مطلقاً قرأت منع ہے۔ دیگر دلائل عقلیہ و نقلیہ کے علاوہ یہ حکم اس مذکورہ حدیث سے بھی بالوضاحت ثابت ہوگیا۔ اس کے رد میں جو بات بھی وہابی کہتے ہیں وہ محض نادانی سے کہتے ہیں

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

سوال ۱۲: بیعت کرنیکا صحیح اور غلط رواج۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقہ میں ایک پیر صاحب جو غوث پاک کی اولاد بنتے ہیں کہتے ہیں تجدید بیعت مرشد کی وفات کے بعد ضروری ہے۔ اور ایسے مریدوں کو پکڑ کر اپنی بیعت کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو خوشامد یا جبر سے بیعت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میں چاروں سلسلوں میں بیعت کرسکتا ہوں لہذا جس نے جس سلسلے میں بیعت ہونا ہے وہ میری بیعت کرے بیعت کیکے بعد ہر مرید سے گیارہ روپیہ نذرانہ وصول کرتے ہیں۔ ہماری بستی کے ایک پیر صاحب انکے معاون ہیں۔ فرمایا جائے کہ یہ کام جائز ہے۔ دستخط سائل محمد صدیق بخی گگر زدو زرش برات

الجواب ــــــــــ بعون العلام الوهاب

قانون شریعت کے مطابق مذکورہ پیر کے تمام اقوال غلط اور خلاف شریعت وطریقت بلکہ تہذیب کے خلاف ہے۔ تجدید بیعت صرف اسوقت جائز ہے جب کسی غیر شرع فاسق جاہل یا بدعقیدہ انسان کی بیعت کی جائے ورنہ کامل اور عالم دین متقی کی بیعت تا قیامت قائم رہتی ہے کیونکہ اولیاء اللہ مرتے نہیں بلکہ بعد وفات انکی قوت امداد زیادہ ہو جاتی ہے یہ قرآن حدیث سے ثابت ہے۔ اور ایک شخص کا چار سلسلوں میں بیعت کرنا قطعًا باطل اور گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت وطریقت کے چار چار سلسلے بنائے ہر راستہ جدا ہے۔ ایک شخص بیک وقت دو راستوں پر نہ چل سکتا ہے نہ چلا سکتا ہے۔ پیر مرید کی مثال ملاح اور مسافر کی ہے جس طرح ملاح ومسافر بیک وقت ایک کشتی اور ایک ہی راہ چل سکتے ہیں اسی طرح ایک پیر ایک ہی سلسلے میں بیعت کرسکتا ہے۔ جب ایک شخص حنفی شافعی نہیں ہو سکتا تو قادری چشتی میں بیعت بھی نہیں کرسکتا۔ ہاں البتہ ایک مرید اپنے پیر کی اجازت سے صرف حصول فیض کیلئے بیعت کسب وبیعت طلب کرسکتا ہے اس لحاظ سے خود کو چشتی قادری کہہ سکتا ہے۔ مگر ایک پیر دو بیعتیں نہیں کرسکتا۔ اس کا کہیں ثبوت نہیں۔ اگر اس طرح بیعت جائز ہوتی تو چار سلسلے کے بزرگوں کی کیا ضرورت رہتی ثابت ہوا کہ یہ اس کی اپنی بناوٹی بات ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیر طریقت کی منزلوں سے بالکل بے خبر ہے اور چار سلسلوں کے فرق کو بالکل نہیں جانتا صرف ہوس زر اور پیری مریدی کا شوق ہے۔ اللہ ہدایت دے۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب	۷۹-۲-۲

کتبہ ــــــــــ

نطفہ ولادت کا ٹیکہ لگانے کا حکم

سوال نمبر ۱۳: محترم جناب واجب الاحترام مولانا مفتی صاحبزادہ اقتدار احمد خان صاحب السلام علیکم خیریت موجود خیریت مطلوب بعدہٗ گزارش ہے کہ میں ایک مسئلہ آپکی خدمتِ عالیہ میں ارسال کر رہا ہوں آپ براہِ کرم اس مسئلہ کا تفصیلاً جواب لکھیں مع دلائل شرعیہ تحریر فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں عین نوازش۔ کیونکہ بجز آپ کے مجھے اس مسئلے کا حل نہیں مل سکا۔ اور نہ ہی امید ہے۔ کہ کسی سے ملے۔ اس لیے امید واثق کرکے بحکم خدا تعالیٰ فَاسْئَلُوْا

اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ کے تحت آپ کی خدمت میں ارسال ہے آپ انشاء اللہ ذرا جلدی وقت نکال کر جواباً مطلع فرمائیں گے، فقط والسلام۔

آپ کی دعاؤں کا خواستگار قاضی نور حسین معرفت صوفی فضل حسین زمیندار ٹی سٹال نزد ڈاک خانہ سکھو (مندرہ) تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج کل اس ترقی یافتہ دور میں سائنسی اصول کے ماتحت مادہ جانوروں کو ٹیکہ لگاتے ہیں جس سے مادہ حاملہ ہوتی ہے اور بچے پیدا ہوتے ہیں۔ نامعلوم وہ انجکشن جو لگایا جاتا ہے وہ سائنس کے ذریعے سے کوئی دوائی ایجاد ہوئی ہے یا کہ وہ نر جانور کا نطفہ ہے۔ اگر ڈاکٹروں نے یہی ایجادات کی ہوں کہ کسی طرح سے جانور نذکر کا نطفہ نکال کر محفوظ کر لیں اور پھر وہ انجکشن لگائیں تو کیا از روئے شریعت یہ طریقہ کار جائز ہے یا ناجائز۔ آپ مکمل فتویٰ عطا فرمائیں عین کرم نوازی ہو گی۔ بَيِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانون شریعت کے مطابق سوال مذکورہ میں جس وطی اور نطفے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالکل جائز اور مباح ہے۔ ایسے مادہ جانور کا دودھ بالکل پاک و طیب و حلال ہے اس کا اور اس کے مولودہ بچے کا گوشت بھی بالکل طیب و حلال ہے۔ اس لیے کہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ نطفہ نر جانور ہی سے لیا جاتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ نر جانور کے آلہ تناسل سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹیوب اچھی طرح باندھ دی جاتی ہے اور بولی ہوئی مادہ پر اس نر کو چھوڑا جاتا ہے، جب نر مادہ پر کودتا ہے تو اس کا آلہ تناسل ٹیوب کی وجہ سے فرج مادہ میں نہیں جاتا بلکہ نرم ٹیوب ہی مثل فرج ہو جاتی ہے اور انزال اُسی کے اندر ہوتا ہے۔ جس سے سارا نطفہ ٹیوب میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس ٹیوب کو اتار لیا جاتا ہے۔ پھر لیبارٹری میں لے جا کر اس نطفہ میں اسی نسل کا دو تولہ دودھ ایک مرغی کا انڈا (صرف زردی یا صرف سفیدی) ایک تولہ گلوکوز انگوری علیحدہ اچھی طرح حل کر کے شامل کیا جاتا ہے جس سے مادہ تولید کے جرثومے میدان وسیع پا کر کھل جاتے ہیں اور ان کے گننے میں آسانی رہتی ہے اور یہ انڈے کی زردی (بعض میں صرف سفیدی) ان جرثوموں کی خوراک کا کام بھی دیتی ہے۔ پھر خوردبین کے ذریعے نسلی جرثوموں کی گنتی کے حساب سے اتنی ہی دوسری چھوٹی ٹیوبیں مہیا کر کے ہر ٹیوب میں ایک جرثومہ اور تھوڑا دودھ ملا نطفہ ڈال کر ٹیوب بند کر دی جاتی ہے۔ گویا کہ ایک نطفہ سے چالیس کے قریب جرثومے حاصل کیے جاتے ہیں اور دودھ انڈا نطفے میں شامل کر کے چالیس نطفے بنا لیے جاتے ہیں اور چالیس ٹیوبوں میں بند کر لیے یہ چالیس ٹیکے بن گئے۔ یہاں اتنی بات ضرور خیال میں رہے کہ نطفہ خواہ کسی مقام

پر ہواس کی بقا کے لیے ایک مخصوص مقدار کی ٹھنڈک لازمی ہے۔ صنّاعِ کائنات نے نطفے کی حفاظت و بقاو حیات کے لیے مقام و مسکنِ نطفہ کو عجیب نظام برودت سے مبیت کر دیا ہے کہ جسمانی حرارت اور تغیر ازمنہ کا اس پر اثر نہیں گویا کہ حفاظتِ نطفہ کے لیئے جسم انسانی و حیوانی میں ربّ قدیر نے رفیر یجیٹر اور فرج سسٹم قائم فرمایا ہے۔ اس چیز کے تجربات سے موجودہ ڈاکٹروں نے کم سے کم درجہ حرارت قائم کر کے نطفے کے ان ٹیکوں کا حفاظتی انتظام کیا ہے۔ اور وہ نسلی ٹیکے ان سرد ڈبوں میں ایک سال یا اس سے زیادہ عرصے تک صحیح سالم پڑے رہتے ہیں، جب کہ جسم حیوانی میں سال ہا سال زندہ قائم رہتے ہیں۔ تولید کا یہ نظام صرف جانوروں میں شرعاً جائز ہے۔ انسانوں میں حرام کیونکہ نسلِ حیوانی ماں یعنی والدہ سے قائم و منسوب ہوتی ہے۔ اور نسلِ انسانی باپ سے۔ جانوروں میں کوئی باپ ہو بچہ حلالی ہوگا کیونکہ والدہ ایک ہے۔ مگر نسلِ انسانی میں ایک معیّن والد ہونا شرط اگر باپ غیر معیّن ہو تو بچہ حرامی ہوگا۔ مذہبی تقرر و تعین صرف انسانی باپ کے لیئے اشد لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں یتیم وہ نابالغ ہے جس کا باپ یعنی والد مر جائے اور حیوانوں میں وہ یتیم ہے جس کی والدہ مر جائے چنانچہ تفسیر صاوی جلد اول صفحہ نمبر ۳۹ اور تفسیر روح المعانی اوّل صفحہ نمبر ۳۰۸ پارہ اوّل اور روح البیان جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۲ پر ہے۔ وَالْیَتَامٰی جَمْعُ یَتِیْمٍ وَّھُوَ الصَّغِیْرُ الَّذِیْ مَاتَ اَبُوْہُ قَبْلَ الْبُلُوْغِ وَمِنَ الْحَیْوَانَاتِ الصَّغِیْرُ الَّذِیْ مَاتَتْ اُمُّہٗ۔ ترجمہ اور لفظِ یتامیٰ یتیم کی جمع ہے اور وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مر گیا ہو اور حیوانات میں وہ چھوٹا بچہ جس کی والدہ مر جائے۔ اسی طرح شرح قصیدہ بردہ صفحہ نمبر ۱۹۴ پر ہے۔ پس چونکہ جانوروں میں بچے کا نسب صرف ماں سے چلتا ہے اس لیئے کسی جانور کا نطفہ کسی طریقے سے ڈال دیا جائے وہ جانور مولودہ حلالی مانا جائے گا۔ اور اس کا حکم بالکل دوسرے جانوروں کی طرح ہوگا۔ مگر انسانیت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فلاسفۂ اسلامی کی تحقیق کے مطابق انسانی اور حیوانی نطفے میں چند طرح امتیازی فرق ہیں پہلا فرق یہ ہے تمام جاندار مخلوق میں نر انسان کا نطفہ شدید ترین قوّت والا ہے جو سب نطفوں پر قوی ہے۔ اور حیوانات میں مادہ حیوان کا نطفہ شدید تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں وطی کی رغبت مرد کی جانب سے ہوتی ہے پہلے مرد راغب ہوتا ہے تب عورت آمادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی وقت مقرر نہیں جب چاہتا ہے صحبت کرتا ہے اور حمل ٹھہر جاتا ہے لیکن جانوروں میں مادہ کی طرف سے رغبت ہوتی ہے۔ اگر مادہ جانوروں میں وہ رغبت ظاہر ہو تب نر جانور آمادہ ہوتا ہے۔ اگر مادہ میں رغبت پیدا نہ ہو تو نر جانور اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور نہ پیچھا کرتا ہے نہ آمادگی ظاہر کرتا ہے بخلاف انسانوں کے۔ چنانچہ مشہور اسلامی فلسفی اور سائنسدان علامہ زکریا بن محمود قزوینی علیہ الرحمۃ اپنی تصنیف عرائب الموجودات جلد دوم صفحہ نمبر ۹۲ پر لکھتے ہیں۔ (اَلنُّطْفَۃُ الثَّالِثُ فِیْ تَوَلُّدِ الْاِنْسَانِ)

وَمَا فَضَلَ مِنَ الْغِذَاءِ فِي الْهَضْمِ الْاٰخِيْرِ يَبْعَثُ اِلَى النُّخَاعِ اِلَى الْاُنْثَيَيْنِ فَيَسْتَحِيْلُ فِيْهِمَا اِلٰى طَبِيْعَةِ الْمَنِيِّ يَدْغَدِغُ وَيَهِيْجُ اِضْطِرَابَ الْقَدَمِ فَلَا يَسْكُنُ اِلَّا بِنَفْضِ تِلْكَ الْمَادَّةِ فَيَكُوْنُ ذَالِكَ سَبَبَ اِجْتِمَاعِ الذَّكَرِ وَالْاُنْثٰی۔ ترجمہ۔ جب انسان غذا کھاتا ہے تو غذا کلیجی میں تقسیم ہو کر جو باقی بچتی ہے اور آخری ہاضمے سے گزرتی ہے تو بلغمی شکل اختیار کرکے انسانی فوطوں میں چلی جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر منی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہاں وہ منی جوش کھاتی رہتی ہے۔ اور آلۂ تناسل بلکہ سارے جسم میں ہیجان اور آگے بڑھنے کا اضطراب پیدا کر دیتی ہے پس انسان سکون نہیں پاتا مگر اس مادے کے جھڑنے سے پس وہ اضطرابی کیفیت جو مرد میں اس مادے نے پیدا کی سبب بنتی ہے عورت و مرد کی وطی کا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ انسانی مرد کا نطفہ جس رحم میں بھی جائے گا نسل انسانی ہی پیدا کرے گا خواہ عورت کے جسم میں جائے یا بکری گائے بھینس کے رحم میں بخلاف جانور کے کہ جب نر جانور کسی مادہ جانور سے وطی کرے تو نر یا مادہ نر مادہ کی جنس پیدا ہوتی ہے۔ فطرت کا یہ قانون بہت تجربوں سے مشاہدوں میں آچکا ہے۔ ان ہی تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر ہمارے فقہاء کرام و مجتہدینِ عظام نے شرعی قوانین مرتب فرمائے۔ چنانچہ قانونِ شرعی کے مطابق اگر کوئی آدمی مرد کسی بھی جانور مادہ سے صحبت کرے تو جانور کو زائیدگی سے پہلے ہی ذبح کرکے دفن یا آگ میں جلا دیا جائے گا نہ اس کا گوشت کھایا جائے نہ اس کو زندہ باقی رکھا جائے گا۔ چنانچہ فتاویٰ درِ مختار جلد سوم صفحہ نمبر ۲۱۳ پر ہے

وَلَا يُحَدُّ بِوَطْئِهِ بَهِيْمَةً بَلْ يُعَزَّرُ وَتُذْبَحُ ثُمَّ تُحْرَقُ وَيُكْرَهُ الْاِنْتِفَاعُ بِهَا حَيَّةً وَمَيِّتَةً۔

فتاویٰ عالمگیری جلد سوم صفحہ نمبر ۳۶۱ پر ایسا ہی ہے۔ یعنی جو انسان جانور سے وطی کرے خواہ جانور حلالی ہو یا حرامی وطی کرنے والے کو حد نہ لگے گی بلکہ شرعی تعزیر کی سزا دی جائے گی اور جانور ذبح کرکے جلا ڈالا جائے گا اس کا نفع حاصل کرنا زندہ یا مردہ کا مکروہ تحریمی ہے۔ امام اعظم نے فرمایا کہ حلالی جانور ہے تو ذبح کرکے گوشت کھانا جائز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ مادہ جانور زندہ نہ رہے۔ اس لیے کہ اگر زندہ رہے گا تو ہو سکتا ہے حمل ٹھیر جائے اور اس سے انسانی بچہ پیدا ہو جو خالصتاً حرامی نسل ہوگا۔ اور یہ ذبح مادہ جانور سے وطی کرنے میں ہے کیونکہ وطی میں لفظ بہیمۃ ارشاد ہوا تاءِ تانیث سے مادہ ہونا ثابت ہوا۔ اگرچہ جمہور کے نزدیک تاءِ وحدت کی ہے۔ میرے نزدیک صحیح تر یہ ہے کہ تاء تانیث ہے اور قرآن مجید میں تاء تانیث بول کر سب مذکر و مونث اس لیے مراد لیئے گئے ہیں کہ اصل جانوروں میں مونث ہی ہوتا ہے۔ حلت و حرمت کا بھی مونث ہی سے پتہ لگتا ہے۔ مذکر کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کی زندگی میں اس کے حلالی ہونے کو ثابت کرے بخلاف مونث جانور کے کہ اس کا دودھ اس کی حلت و حرمت ثابت کر رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے لفظ بہیمۃ مونث ارشاد فرما کر یہ بتا دیا کہ جانوروں میں اصل مادہ جانور ہے اس لیے بچہ ماں کا ہوتا ہے۔ ثابت ہوا کہ

مرد اگر جانور سے بھی وطی کرے تو حمل ٹھیرنے کی صورت میں اولاد انسانی ہی ہوتی ہے مشاہدہ بھی سننے میں اسی طرح آیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء ۲ جولائی ۲۵ رجب ۱۳۹۸ھ جنگ اخبار راولپنڈی صہ ۲ پر اس طرح خبر تھی بکری نے انسانی بچے کو جنم دیا۔ ہیلی کا مقام بھارت یکم جولائی یہاں سے ۳۰ میل دور موضع پڈ پور ضلع دھارڈار میں ایک بکری نے انسانی بچے کو جنم دیا ہے جس کے تمام اعضا حتی کہ انگلیاں بھی بالکل انسانوں کی طرح پیشانی سینہ ہاتھ پاؤں بالکل انسانی بچے جیسے ہیں۔ یہ خبر سب نے پڑھی۔ یہ اس لیئے ہوا کہ اس سے کسی آدمی نے وطی کی ہوگی نہ پکڑا گیا حمل بن گیا اور پیدا ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پہلے ہی جانور کے ذبح کر کے نیست و نابود کر دینے کا حکم دے دیا تاکہ نسلِ انسانی خراب نہ ہو۔ بخلاف اس کے کہ اگر کوئی دوسرا جانور مثلاً کتا یا ہرن یا بھیڑیا بکری وغیرہ سے وطی کرے تو بکری کو ذبح نہ کیا جائے گا بلکہ اس کے حمل کو باقی رکھا جائے گا۔ اور وہ اکثر بکری ہی کی نسل سے ہوتا ہے لہٰذا اس کو کھانا جائز ہے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری جلد پنجم صفحہ نمبر صہ ۲۹۷ پر ہے

فَإِنْ كَانَ مُتَوَلِّدًا مِنَ الْوَحْشِيِّ وَالْإِنْسِيِّ فَالْعِبْرَةُ لِلْأُمِّ ۔ وَقِيْلَ إِذَا نَزَى ظَبْيٌ عَلَى شَاةٍ أَهْلِيَّةٍ فَإِنْ وَلَدَتْ شَاةٌ تَجُوْزُ التَّضْحِيَةُ (ترجمہ)۔ جب بچہ مولود وحشی اور گھریلو جانور کے ملاپ سے پیدا ہو تو اعتبار ماں کا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جب بھیڑیا گھریلو بکری سے وطی کرے اور بچہ بکری نسل ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ حیوانات میں چوپایہ جانور مادہ میں شہوت زیادہ ہوتی ہے اور نر میں کم۔ لیکن نسلِ انسانی میں عورت میں شہوت کم ہوتی ہے نر مذکر میں زیادہ۔ چنانچہ مشہور طبی کتاب ضیاء الابصار فی حد الباہ مصنف حکیم محمود دہلوی صفحہ نمبر صہ ۱۵ پر ہے۔ لِأَنَّ مِزَاجَ الذُّكُوْرِ حَارٌّ يَابِسٌ وَمِزَاجَ الْإِنَاثِ بَارِدٌ رَطْبٌ ۔ وَالْبُرُوْدَةُ يُمِيْتُ الْقُوَى وَالرُّطُوْبَةُ مُسْتَرْخِيٌّ لَهَا فَلِهٰذَا الْوَجْهِ تَقِلُّ الشَّهْوَةُ۔ ترجمہ اس لیئے کہ مرد کا مزاج گرم وخشک ہوتا ہے اور عورتوں کا مزاج ٹھنڈا اور تر ہوتا ہے۔ اور ٹھنڈک قوتِ شہوانیہ کو مردہ کرتی ہے اور تری سست کرتی ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں میں شہوت کم ہوتی ہے۔ اور مردوں کی اس شہوانی قوت کا نتیجہ ہے کہ ان کی مونچھیں اور داڑھی ہوتی ہے عورتوں کی نہیں۔ ہمارے فقہاءِ کرام فرماتے ہیں جو مرد داڑھی رکھے اس کی اولاد داڑھی منڈانے والے مرد کی اولاد سے زیادہ اور مضبوط تر ہوتی ہے۔ قوتِ مردمی انسانی جوہر ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جنتیوں کو یہ قوت بہت زیادہ عطا ہوگی جس کا ذکر قرآن کریم اور احادیث پاک میں متعدد جگہ کنایۃً وعبارۃً موجود ہے۔ انبیاءِ کرام کو بھی اس قوت کا سب سے زیادہ تحفہ عطا فرمایا گیا۔ اس قوت کے بل بوتے پر مسلمان مومن مقامِ معرفت کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خنثیٰ مقامِ علیا پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مونچھیں منڈانی بدعت ہیں اور داڑھی منڈانا گناہِ کبیرہ کیونکہ اس سے قوتِ مردمی کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ درمختار جلد پنجم صفحہ نمبر صہ ۳۵۸ پر درج ہے۔

وَفِيهِ حَلْقُ الشَّارِبِ بِدْعَةٌ (ترجمہ)۔ اور اسی فتاویٰ مجتبیٰ میں ہے کہ مونچھوں کا مونڈنا بدعت ہے تجربے سے ثابت ہے کہ جس عورت کی مونچھیں نکل آتی ہیں اس کی شہوت دوسری عورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ نسلِ انسانی میں مرد کا نطفہ ریڑھ کی ہڈی میں ہوتا ہے اور عورت کا نطفہ پستانوں کے درمیان۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اول صفحہ نمبر ص ۱۴۸ پر ہے۔ عِنْدَ خُرُوْجِ الْمَنِيِّ مُنْفَصِلٍ عَنْ مَقَرِّهٖ وَهُوَ صُلْبُ الرَّجُلِ وَتَرَائِبِ الْمَرْأَةِ اَيْ عِظَامُ صَدْرِهَا كَمَا فِي الْكَشَّافِ (ترجمہ) منی کے نکلنے کے وقت جدا ہو کر اپنے ٹھکانے سے اور وہ مرد کی پشت ہے اور عورت کی سینے کی ہڈیاں ہیں اسی طرح کشاف میں ہے۔ جانوروں میں مادہ کی پشت میں نطفہ ہوتا ہے۔ پشت ریڑھ کی ہڈی کا نام ہے ریڑھ کی ہڈی جڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعد موت قریبِ قیامت انہیں ذرات سے انسانی نشوونما ہوگی جو ریڑھ کی ہڈی میں ہوتے ہیں تمام جسم فنا ہو جاتا ہے مگر ان کو نہ مٹی فنا کرے نہ آگ نہ پانی۔ پس جس کا نطفہ اس ہڈی میں ہوگا اسی سے نسل آگے چلے گی۔ مذکر انسان سے انسانی نسل چلتی ہے کہ اس کا نطفہ ریڑھ کی ہڈی میں۔ اور جانوروں میں یہ نطفہ مادہ کی ریڑھ میں ہے اس لیے حیوانات میں نسل مادہ سے چلتی ہے نہ کہ نر سے۔ خلاصہ یہ کہ جس کی ریڑھ کا نطفہ ہوگا اسی کی نسل مانی جائے گی۔ مذکر حیوانات میں نطفہ ریڑھ میں نہیں ہوتا بلکہ بعض مذکر حیوانات میں نطفہ ہوتا ہی نہیں۔ بعض میں نطفہ مثل ہوا کے بعض جانور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو مذکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد نہم صفحہ نمبر ص ۲۵۵ پر ہے۔ اَنَّ كُلَّ حَيْوَانٍ لَا يُخْلَقُ مِنَ النُّطْفَةِ بَلْ بَعْضُهٗ مِنَ الرِّيْحِ كَالطَّيْرِ فَاِنَّ الْبَيْضَةَ الْمَخْلُوْقَةَ مِنْهَا۔ اَلدَّجَاجَةُ مَخْلُوْقَةٌ مِنْ رِيْحِ الدِّيْكِ (ترجمہ)۔ بے شک ہر حیوان نہیں پیدا کیا جاتا نطفے سے بلکہ بعض جانور ہوا سے پیدا ہوتے ہیں پس بیشک انڈا اسی ہوا سے پیدا ہوتا ہے۔ مرغی پیدا ہوئی ہے مرغے کی ہوا سے۔ یعنی مرغا یا کوئی بھی پرندہ جب صحبت کرتا ہے تو مادہ جانور میں صرف ہوا جاتی جس سے ایک حرکت پیدا ہوتی ہے اور حرکت کے ذریعے مادہ کی ریڑھ سے بذریعہ اندرونی نالی نطفہ اسی کے رحم میں چلا جاتا ہے۔ سوائے بطخ کے سب جانوروں کا یہی حال ہے۔ کئی دفعہ اس ہوا کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرغی مرغے کے بغیر بھی انڈے دیتی رہتی ہے۔ جس کا ہم نے تجربہ کیا ہے کہ بعض مرغیوں کو مرغ سے بالکل جدا رکھا گیا اور اچھی گرم خوراک دی گئی تو اس نے انڈے شروع کر دیئے۔ اسی طرح برساتی کیڑے کیچوے اس کے اندر مذکر مؤنث دونوں کی قوت ہوتی ہے اس کا علیحدہ مذکر کوئی نہیں ہوتا نہ اس کو مذکر کی حاجت۔ روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ص ۳۹۸ پر فرمایا کہ چونکہ مرد کا نطفہ پیٹھ سے آتا ہے عورت کا سینے سے اس لیے مرد والد اولاد کے لیے مشقت کرتا ہے اور ماں شفقت کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَمِنْ ذٰلِكَ يَتَحَمَّلُ الْوَالِدُ مَعُوْنَةَ الْوَلَدِ وَتَشْتَدُّ فِي الْوَالِدَةِ وَمَحَبَّتُهَا لِلْوَلَدِ۔ (ترجمہ) ۔۔

ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزرا۔ مگر چوپایہ مذکر جانور میں چونکہ نطفہ نہ سینے سے آتا ہے نہ ریڑھ سے اس لیے مذکر حیوان بچے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس تمام گفتگو سے یہ ثابت ہوا کہ جانوروں میں اصل والدہ ہے۔ انسانوں میں اصل والد ہے۔ اس لیئے ایک مادہ میں جتنے بھی مذکر نطفے جائیں اولاد حلالی اور پاک رہے گی بخلاف انسان کے۔ خیال رہے کہ جسم انسان میں پیدائش کے نظام کی تکمیل کے لیے مرد مذکر میں تین چیزیں ہوتی ہیں ع۱ نطفہ ع۲ منی ع۳ مذی۔ ان تینوں کا مقام علیحدہ علیحدہ ہے۔ نطفے کا مقام ریڑھ کی ہڈی ہے اور اس کی ایک باریک نالی دو منہ والی منی کی نالی کے ساتھ جڑی ہوئی آلۂ تناسل تک آتی ہے۔ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو کر آلے کے دائیں بائیں منتقل ہوتی ہے ایک حصہ میں نر جراثیم اور دوسرے حصے سے مادہ جراثیم نکلتے ہیں۔ منی کی نالی اس سے علیحدہ ہو کر ذکر کے بالکل نیچے ہوتی یہ بہت نازک ہوتی اس کے ساتھ بالکل مذی کی نالی ہوتی ہے اور اس سے اوپر پیشاب کی نالی ہوتی منی کی نالی کے ساتھ تین پٹھے ہوتے ہیں جس میں نرمی سختی پیدا ہوتی ہے۔ گویا آلۂ تناسل چار نالیوں اور تین پٹھوں کا مجموعہ ہے۔ اگر دائیں بائیں کی رگیں کاٹ دی جائیں تو پیدائشی جراثیم جس کو نطفہ کہا جاتا ہے بند ہو جاتا ہے۔ پھر اس مرد کی اولاد نہیں ہوتی لیکن منی نکلتی رہتی ہے۔ انسانی عورت کا نطفہ اس کے پستانوں میں ہوتا ہے، اسکی بھی دو نالیاں ہوتی ہیں وہ دونوں فرج داخلی سے لوٹ کر پھر رحم میں چلی جاتی ہیں۔ اگر یہ دونوں نالیاں بھی کاٹ دی جائیں تب عورت کے اولاد نہیں ہوتی۔ مرد کا نطفہ لمبے کیڑے کی شکل ہوتا ہے جس کو سائنسی زبان میں جرثومہ کہا جاتا ہے۔ اسی شکل پر مذکر حیوان کا نطفہ ہوتا ہے۔ مادہ خواہ عورت ہو یا گائے بھینس بکری یا کوئی پرندہ یا کیڑے مکوڑے ان کا نطفہ مثل انڈے کے گول ہوتا ہے۔ ہاں مسکن اور جائے رہائش علیحدہ ہوتا ہے کہ عورتوں کے پستانوں کے درمیان پرندہ مونث کی ریڑھ کی درمیانی مقام جہاں انڈوں کا گچھا ہوتا ہے۔ چوپایہ مونث میں ریڑھ کے آخری سرے دم کے پاس۔ مذکر چوپایہ میں مخزنِ منی میں ہی اس کا نطفہ ہوتا ہے ایک صحبت سے مذکر کے نطفے ہزاروں کی تعداد میں نکل آتے ہیں۔ جن میں سے ایک رحم میں چلا جاتا ہے اور باقی ضائع ہو جاتے ہیں۔ مونث کا نطفہ ایک صحبت میں ایک ہی انڈا نکل کر رحم میں آجاتا ہے۔ انسانی عورت کا صحبت کے وقت آتا ہے لیکن دیگر جانوروں کا اس گرمی کی وجہ سے صحبتِ نر سے پہلے ہی رحم میں آجاتا ہے۔ جو گرمی مقررہ وقت میں مادہ حیوان کو پہنچتی ہے۔ جس کو پنجابی میں ہرن کہا جاتا ہے۔ اسی فرق کی بنا پر انسانوں میں بیک دم انزال قیام حمل کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جانوروں میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ بدیں وجہ جانوروں میں مصنوعی نسل کشی کارگر ثابت ہوئی کیونکہ مادہ کا نطفہ تو اس کے رحم میں پہلے ہی جا چکا ہے اب صرف مذکر نطفے کی ضرورت ہے خواہ وہ کسی طرح بھی ڈال دیا جائے۔ بخلاف عورت کے کہ اس کو مرد کی صحبت نے گرمی پہنچائی ہے جس سے اس عورت کا نطفہ پستانوں سے منتقل ہو کر رحم میں آئے گا۔ چونکہ طبی ڈاکٹری تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے

کرنے کے ملاپ کے بغیر بھی ٹیکے کے ذریعے مذکر نطفہ رحم میں ڈالنے سے حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے سورۃ نجم۔ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ (ترجمہ) پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے جوڑا نر و مادہ نطفے سے جب وہ نطفہ منی کے ساتھ رحم کے اندر ڈالا جائے۔ لفظِ تُمنیٰ بتا رہا ہے کہ صرف وطی ہی سے نطفہ رحم میں نہیں جاتا بلکہ اور بھی بہت سے طریقوں پر نطفہ اندر ڈالا جا سکتا ہے۔ اگر صرف مذکر کی وطی سے ہی نطفہ اندر جاتا ہوتا تو لفظِ تُمنیٰ اور دوسری جگہ مِن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ نہ فرمایا جاتا بلکہ وطی فرمایا جاتا۔ اور میری ذاتی تحقیق کے مطابق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کسی مصنوعی گرمی کے ذریعے عورت کو گرم کر دیا جائے پھر خاوند کا نطفہ روئی میں لپیٹ کر بیوی کے رحم میں رکھ دیا جائے تو حمل ثابت ہو جائے گا اور بچہ حلالی ہوگا۔ مگر فی الحال یہ بات تجربوں سے عاری ہے اور عبث بھی۔ اگر کسی اور مرد کا یا جانور کا نطفہ عورت کے رحم میں رکھا گیا تو بچہ حرامی ہوگا خواہ انسانی بچہ ہو یا مسخ شدہ۔ دوسری چیز منی ہے۔ منی کا مخزن مذکر انسان یا حیوان کے فوتوں میں ہوتا ہے۔ مونث حیوان کی اور تمام پرندوں کی منی نہیں ہوتی۔ عورت کی منی اس کی فرج داخلی کے پاس ہوتی ہے فم رحم کے قریب۔ منی غذاؤں سے بنتی ہے۔ جب طبی دنیا میں پہنچ کر انسان ذی عقل اپنے نفس میں غور کرتا ہے تو قدرت کے شاہکار دریاؤں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور ورطۂ حیرت میں عاجز رہ جاتا ہے کہ خلاقِ کائنات نے جسم انسانی میں کتنا عظیم کارخانہ قائم فرمایا۔ خود انسان جس نے آسمانوں پر پروازیں شروع کر دیں اپنے اندر نہیں جانتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی لیے عقلاءِ کائنات کو حکم دیا جا رہا ہے۔

اے لوگو اپنی ذات میں کیوں غور نہیں کرتے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

عشق و معرفت کی تو وادی ہی جدا ہے۔ خود طلسمِ عقل سے انسان کو اپنے اندر سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ جب انسان غذا کھاتا ہے تو چار مرتبہ نظام ہضم کا ورود ہوتا ہے۔ پہلا مرتبہ ہضم فضلہ۔ دوسرا مرتبہ ہضم معدہ۔ تیسرا مرتبہ ہضم کبدی۔ چوتھا مرتبہ ہضم دموی۔ جب غذا کھائی جاتی ہے تو سیدھی معدہ میں جاتی ہے جہاں اس کے تین حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک حصہ فضلہ بن کر دبر سے نکلتا ہے۔ ایک حصہ گردوں کے راستے مثانے میں چلا جاتا ہے جس سے کچھ پیشاب بنتا ہے اور کچھ ودی بن جاتا ہے۔ اور تیسرا حصہ عمدہ کہلاتا ہے یہ عمدہ حصہ کلیجی میں آجاتا ہے جہاں یہ تین حصوں میں پھر تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ ریشہ بن جاتا ہے ایک پانی اور ایک خون۔ خیال رہے کہ غذاءِ انسانی حیوانی میں چار عنصر موجود ہوتے ہیں۔ آگ ہوا مٹی پانی۔ پس جس غذا میں جس عنصر کی زیادتی ہوتی ہے وہ غذا اسی نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اور اسی عنصر کا اثر جسم انسانی پر خاص طور سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں ترکاری بادی ہے فلاں سرد۔ فلاں خشک فلاں معتدل وغیرہ۔ یہ انہیں عناصر کے غلبے کے نام ہیں۔ پھر اس غذا سے حاصل شدہ پانی گوشت سے لگ جاتا ہے اور ریشہ ہڈیوں سے اور خون دل میں۔ پھر خون کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ خالص خون جو جسمانی رگوں میں

جاکر جسم کی پرورش کرتا ہے۔ اسی کی صحت پر جسمانی صحت اور موت و حیات وابستہ ہے۔ دوسرا حصہ بلغم جو سینے پر جمع ہوتا ہے اور دماغی ہڈیوں کو پرورش دیتا ہے۔ تیسرا حصہ منی مخزنِ منی میں جاکر آئندہ نسلی جراثیم کی ڈیوٹی سنبھالتی ہے۔ غذا کی ساری گرمی اسی میں آجاتی ہے۔ اس کی حدت کی بھاپ سے پسینہ آتا ہے۔ اس کو مذی کہا جاتا ہے۔ یہ ہے قدرت کے کارخانے کا وہ کام جو ہماری غذا سے باری تعالیٰ نے ہمارے اندر تیار فرمائے۔ کون ہے جو اس کے اس شاہکار اور صنعاتِ ہشت کا مقابلہ تو درکنار کماحقہٗ سمجھ ہی سکے۔ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ پاک ہے وہ ذات جس کے قبضے میں ملک ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے یہ ہی وہ غذائیں ہیں جن سے نسلوں کی حفاظت کے لیئے جسمِ انسانی کے باطن کو کارخانۂ قدرت بنا دیا۔ اور اسی حفاظتِ غذا کے لیئے ظاہر میں چار ڈاکٹر مقرر فرمائے۔ پہلا ڈاکٹر ہاتھ کہ جو سرد گرم معلوم کرکے قابلِ برداشت بنا کر آگے روانہ کرتا ہے۔ اِس لیئے اسلام نے ہاتھ سے کھانے کا حکم دیا ہے۔ اور ہاتھوں کو دھونے کا حکم دیا کہ دستی غلاظت سے غذا ملوث نہ ہو۔ دوسرا ڈاکٹر ناک ہے جو سڑے بھسے بدبو خوشبو کا تھرامیٹر ہے۔ اور آگے جانے سے پہلے بتا دیتا ہے کہ یہ کھانا کیسا ہے صحت مند ہے یا مضر۔ تیسرا ڈاکٹر دانت ہے جو منہ میں جاتے ہی فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ نوالہ کنکر مٹی والا ہے یا صاف ستھرا۔ پھر آگے بڑھاتا ہے تو چوتھا ڈاکٹر زبان سامنے آجاتی ہے جو کڑواہٹ کھٹاس بدمزگی ظاہر کرکے اندر جانے کی اجازت یا رکاوٹ کرتی ہے۔ قربان جاؤ اس اَحْسَنُ الْخَالِقِيْن رب کریم کے جس نے بلا عوض صرف نطفۂ انسانی اور بقاءِ آدمیت کے لیئے بیرون اتنے ڈاکٹر اور اندرون میں ایسا کارخانہ بنایا۔ یہ تو انسانی تحقیق تھی کہ یہاں عقلِ انسانی کی پہنچ ہے۔ مگر اصل نطفہ کی حقیقت نے تو سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہوا ہے۔ نہ فلسفی جان سکا نہ سائنسدان نہ طبیب کی فہم میں آسکا نہ ڈاکٹر کی عقل پہنچ سکی نہ اِدراک۔ سب عقلیں دوڑا کر تھک چکے۔ کسی نے کہا کہ نطفہ کاربن کیلشیم اور سوڈیم ان مادوں سے مل کر بنتا ہے یہ موجودہ بے وقوف سائنس والوں کی بات ہے۔ بعض قدیم سائنس دانوں نے کہا کہ نطفہ ایک کیمیاوی گیس سے پیدا ہوا۔ متقدمین فلاسفہ نے کہا کہ نطفہ ہماری خورد و غذاؤں اور ماکولات سے بنتا ہے۔ مگر یہ سب اختراعی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہی ہے کہ هٰذَا شَيْءٌ لَا يَصِلُ إِلَيْهِ فَهْمُ الْعُقَلَاءِ وَلَا يَعْلَمُوْنَهٗ وَإِنَّمَا هُوَ يَقْدُرُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَخَلْقُهٗ لَا بِفِعْلِ الطَّبِيْعَةِ (اربعہ تفاسیر جلد ششم ص۱۱) یہ نطفہ ایسی چیز ہے کہ جس کی حقیقت میں عقلاء کا فہم نہیں پہنچ سکتا نہ وہ اس کو جانیں، یہ تو اللہ خالق مالک کی عجیب قدرت سے ہی ہے اور اس کی پیدائش ہی ہے نہ کہ طبعی افعال سے۔ منی مذی ودی تو غذاؤں سے بن جاتی ہے مگر نطفہ اصلیہ تو مولود بچے کے ساتھ ہی اس کی ریڑھ وغیرہ مسکنوں میں کروڑوں کی تعداد میں اول ہی ودیعت رکھا ہوتا ہے، گویا کہ ہر نومولود بچہ پیدا ہوتے ہی باطنی طور پر کروڑوں بچوں کا باپ اور ماں بنا ہوتا ہے۔ اب جب کہ رحمِ مادر میں دونوں

نطفے والدہ والد کا جمع ہو گئے۔ مذکر کے جراثیم نے مادہ کے بیضہ کو پکڑنے کی کوشش کی اگر وہ مونث کا انڈا چھوٹا ہو تو یہ توڑ کر کھا جائے گا۔ اس طرح لڑکا یعنی نر حمل بنے گا اور اگر انڈا بڑا ہوا تو یہ مذکر جرثومہ اس انڈے میں داخل ہو گا اور حمل مونث پیدا ہو گا۔ تفسیر صاوی جلد چہارم صفحہ نمبر ص۲۳ پر ہے۔ فَمَاءُ الرَّجُلِ غَلِيْظٌ اَبْيَضُ وَمَاءُ الْمَرْاَةِ رَقِيْقٌ اَصْفَرُ فَاَيُّهُمَا عَلَا كَانَ الشِّبْهُ لَهٗ وَاِنْ سَبَقَ مَاءُ الرَّجُلِ كَانَ الْوَلَدُ ذَكَرًا وَعَكْسُهٗ اُنْثٰى وَاِنِ اسْتَوَيَا فَخُنْثٰى مُشْكِلٌ یہ لڑائی چالیس گھنٹے یعنی دو دن اور تین راتیں ہوتی رہتی ہے۔ پھر جس کو میرا رب غلبہ عطا فرمائے یہاں تک کہ لوتھڑا بن جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا پھر باپ کے نطفے سے ہڈی پٹھے اور ماں کے نطفے سے گوشت بال وغیرہ (روح البیان جلد دہم ص۲۶) مگر حیوانات میں اس کا عکس ہوتا ہے۔ نطفہ چونکہ ابتدائی جزئیات میں سے ہے اس لیئے ماں باپ کی نسلیت کا اس پر بہت اثر ہوتا ہے کہ گویے کا بیٹا پیدائشی گویا ہوتا ہے۔ عالم کا بیٹا علم کی طرف راغب ہوتا ہے اور اس کے خیالات بھی عاقلانہ ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی اولاد بادشاہی طبیعت ہی رکھتی ہے ذاکر والدین کے نطفے بھی ذاکر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض پیدائشی اولیاء اللہ کے نطفوں میں ذکر الٰہی کی خوشبو رچ بس گئی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد پنجم صفحہ نمبر ص۔ پر ہے۔ يُحْكٰى اَنَّ بَعْضَ اَهْلِ الرِّيَاضَةِ مِنَ الْمُحَقِّقِيْنَ مِنْ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ الْحَقَّانِيِّ كَانَ يُشَمُّ مِنْ فَضَلَاتِهٖ رَائِحَةُ الْمِسْكِ (الخ) فَهُمْ مِنَ النُّطْفَةِ صُوْرَةً وَمِنَ النُّوْرِ مَعْنًى۔ ترجمہ حکایت ہے کہ بعض اولیاء اللہ کے فضلات یعنی نطفوں میں مشک کی خوشبو آتی تھی (الخ) پس وہ ظاہر میں نطفہ ہے باطن میں نور ہوتا ہے۔ علامہ قزوینی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب عجائب مخلوقات دوم میں صفحہ نمبر ص۹۲ پر بقراط فلسفی کی تحقیق درج کی ہے۔ اِنْ جَرَتْ مِنْ يَمِيْنِهَا اِلٰى يَمِيْنِهَا كَانَ الْوَلَدُ ذَكَرًا تَامًّا الذُّكُوْرَةِ وَاِنْ جَرَتْ مِنْ يَسَارِهَا اِلٰى يَسَارِهَا كَانَ الْوَلَدُ اُنْثٰى تَامَّ الْاُنُوْثَةِ (الخ) ترجمہ اگر مذکر نطفہ مونث نطفہ کے دائیں سمت سے ملاپ کرے اور اس کو توڑے تو نر پیدا ہوتا ہے۔ مکمل طور پر اور اگر بائیں سمت سے ملاپ کرے تو حمل مونث پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سب قدرت کی صناعی ہے جس کو حقیقتاً کوئی نہیں جان سکا۔ کرشمۂ قدرت تو دیکھئے کہ باری تعالیٰ نے رحم کی تھیلی ایسی پیدا فرمائی کہ اس کی حقیقت کو آج اس تحقیقاتی دور میں کوئی نہیں جان سکا۔ ایکسرے سکرین میں انسانی حیوانی جسم کی تمام جزئیات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مگر رحم کے اندر کا حال سکرین بھی نہیں بتا سکتی۔ چنانچہ خود باری تعالیٰ اپنی خصوصیات میں ارشاد فرماتا ہے۔ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ترجمہ وہ اللہ رحم کے اندر کی چیز کو بھی جانتا ہے۔ خصوصیت سے اسی لیئے ذکر فرمایا کہ اس کی حقیقت کو بھی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ انسانی عقل تو صرف اتنی تجرباتی تحقیق کر سکتی ہے کہ مصنوعی طریقے سے مذکر کا نطفہ رحم میں ڈال دے۔ اور دیگر بہت سی ایجادات کی طرح یہ ایجاد بھی مسلمان عربوں کی ہے۔ جس کا اعتراف خود عیسائی انگریزوں کو ہے۔ چنانچہ دو مشہور انگریز ڈاکٹر ملر اینڈ

ویسٹ اپنی ڈکشنری بلیکس ویٹرنری پانچویں ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۶۰۵ دوسرے کالم تیسری سطر میں لکھتا ہے کہ آج سے پانچ سو سال پیشتر مصر کے عرب سائنس دان نے روئی کے ذریعے عربی گھوڑوں کا نطفہ دوسرے ملک بھیجا اور اس کے ذریعے عربی گھوڑوں کی نسل برآمد کی۔ ان سے انگریز ڈاکٹروں نے یہ طریقہ سیکھا اور مزید تحقیق کی۔ یہاں تک کہ آج قریہ قریہ مصنوعی طریقوں سے نسل کشی کی جارہی ہے۔ اور حیوانات میں یہ طریقہ قانونِ شرعیہ کے مطابق بالکل جائز ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا۔ بلکہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر فی زمانہ مفید ہے۔ ہاں انسانوں کو یہ کام قطعاً حرام ہے۔ اگر غیر مرد دیگر انسانوں سے ہو۔ یہ حرمت کافر و مسلمان پر یکساں جاری ہوگی۔ اگر کسی کافرہ عورت کے رحم میں بھی غیر خاوند کا نطفہ گیا تو بچہ قانوناً حرامی متصور ہوگا۔ اور خاوند سے نسب ثابت نہ ہوگا نہ وارث بنے گا نہ مورث۔ جانوروں میں جائز ہے۔ خواہ جانور ماکول ہو یا غیر ماکول۔ اس کے چند فائدے۔ پہلا فائدہ اس عمل مصنوعی سے ایک دفعہ میں حاصل کردہ نطفے سے ایک سال تک کئی مادہ جانوروں سے بچے لیئے جاسکتے ہیں۔ جس سے بہت سا خرچ بچنے کے ساتھ بلا مشقت بہت سے مویشی پیدا کیئے جاسکتے ہیں۔ جبکہ مذکر کی وطی سے ایک دفعہ کے نطفے سے صرف ایک بچہ حاصل ہوا باقی نطفہ بیکار دوسرا فائدہ اس نسل کشی سے ایک غریب چرواہا بھی بے شمار جانوروں کا مالک بن سکتا ہے۔ تیسرا فائدہ اس عمل سے غیر ملکی اعلیٰ نسل کے حیوانات گھر بیٹھے حاصل ہوجاتے ہیں۔ جیسے کہ عربی گھوڑے۔ ولایت کی گائیں جو اپنے بیشمار دودھ کی وجہ سے پاکستانی فارموں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ چوتھا فائدہ مذکر کے مرجانے یا بیمار ہوجانے کے بعد بھی اس کا نطفہ جمع شدہ لے کر اسکی اعلیٰ نسل حاصل کی جاسکتی ہے۔ پانچواں فائدہ لنگڑے اور بوڑھے مذکر حیوان جو وطی پر قادر نہ ہو اس کی اچھی نسل بھی لی جاسکتی ہے۔ غرضیکہ اگر ذرا سی احتیاط کرکے خالص طریقے سے نطفہ حاصل ہوجائے تو دنیوی لحاظ سے بہت فوائد ہیں اور شریعت کے قانون کے مطابق ہر وہ دنیوی فائدہ جو شریعت اسلامیہ سے نہ ٹکرائے وہ شرعاً بالکل جائز ہے۔ لہٰذا دلائل مندرجہ بالا کے تحت چونکہ اس مصنوعی نسل کشی میں شریعت کی کسی طرح مخالفت نہیں ہوتی بدیں وجہ یہ عمل جائز اور فائدہ مند ہے۔

خلاصہ یہ کہ:۔ قانون شریعت کے مطابق سوال مذکورہ میں جس نطفے اور نسل کشی کے جدید طریقے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالکل جائز اور مباح بلکہ مفید ہے۔ ایسے مادہ جانور کا دودھ بالکل جائز پاک و حلال ہے اور اس کے مولودہ بچے کا گوشت حلال و طیب ہے۔ ہاں اس طرح نسل کشی انسانوں میں شرعاً قطعاً جائز نہیں۔ بلکہ فعل حرام اور اولاد حرامی ہوگی۔ بجز خود خاوند کے نطفے کے کہ اگر خاوند کا نطفہ روئی یا کپڑے میں لپیٹ کر بیوی کے رحم میں رکھ دیا جائے اور حمل ٹھہر جائے تو نسب ثابت ہوگا اور حمل نومولودہ بچہ حلالی متصور ہوگا۔ حیوانات و انسانات کی یہ تفریق اس لیئے ہے کہ جانوروں اور انسانوں میں خلقتاً اور شرعاً پانچ طرح فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ انسانوں میں نسل واصل باپ سے چلتی ہے حیوانوں میں ماں سے۔ اسی لیے انسانوں میں یتیم وہ بچہ ہے جس کا باپ مرجائے۔ جانوروں میں یتیم وہ بچہ ہے جس کی ماں مرجائے۔ اور حیوانوں میں بچہ اور حمل والدہ کا اور والدہ کے مالک کا ہوتا ہے۔ مگر انسانوں میں بچہ اور حمل باپ اور باپ والوں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح تفسیر صاوی جلد اول ص۳۰۹ تفسیر روح البیان جلد اول ص۱۲۷ روح المعانی جلد اول ص۳۰۶ پ اول پر ہے دوسرا فرق یہ ہے کہ تمام جاندار مخلوق میں انسان میں زاور حیوانات میں مادہ کا نطفہ شدید ترقوت والا ہے اور دوسری طرف عورت کا نطفہ اور مذکر حیوان کا نطفہ غیر قوت والا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں وطی کی رغبت مرد کی جانب سے ہوتی ہے اور عورت میں شہوت کم ہے اور مرد میں زیادہ ہے۔ مرد جب چاہتا ہے وطی کر لیتا ہے اور حمل ٹھہر جاتا ہے عورت کو مرد مائل کرتا ہے بخلاف حیوانات کے کہ ان میں مادہ جانور وقت مقررہ پر خود رغبت اور خواہش رکھتی ہے۔ تب مذکر حیوان مائل بصحبت ہوتا ہے، اگر مادہ جانور کو خواہش نہ ہو تو مذکر حیوان کبھی بھی وطی نہیں کرسکتا، چنانچہ تجربات نے بھی ثابت کیا ہے اور کتاب فیہما عبرۃ لاولی الابصار فی حد البہائم ص۱۵ پر ہے۔ تیسرا فرق یہ کہ انسانی نطفہ جس رحم میں بھی جائے گا انسانی نسل ہی پیدا ہوگی۔ عورت کے رحم میں جائے یا گائے بھینس، بکری کے رحم میں۔ بخلاف جانوروں کے کہ ان کے مذکر کا نطفہ اپنا اثر کم دکھاتا ہے وہاں مادہ کا اثر زیادہ نمودار ہوتا ہے اور اگرچہ کتا یا بھیڑیا بکری سے وطی کرے مگر اکثر بکری کی نسل ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح کتب فقہا میں لکھا ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی یہی ہے چنانچہ ۲۷ جولائی ۱۹۷۶ء جنگ اخبار راولپنڈی ص۲ کالم ۳ پر اسی طرح خبر تھی کہ ہندوستان کے ایک شہر پڈپور ضلع دھار دار میں ایک بکری نے بالکل انسانی بچہ جنم دیا یہ کسی انسانی وطی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ پہاڑی علاقوں میں اکثر بھیڑیئے اور کتے بھی بکریوں سے صحبتیں کر لیتے ہیں مگر بچہ مولود بکری کی ہی نسل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انسان مرد کسی جانور سے وطی کرے تو فوراً جانور مادہ کو ذبح کر کے دفن کر دو۔ یا جلا کر ختم کر دو تاکہ نسل انسانی حیوان سے پیدا نہ ہو مگر ایک حیوان مذکر دوسری نسل حیوان مادہ سے صحبت کرے تو کوئی سزا نہیں نہ مادہ ذبح کی جائے نہ اس کا بچہ حرام ہو۔ جیسا کہ فتاوی شامی اور دیگر کتب فقہا نے لکھا ہے۔ اسی طرح فتاوی عالمگیری جلد پنجم صفحہ نمبر ص۲۹۷ پر ہے۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ نسل انسانی میں نطفہ ریڑھ کی ہڈی میں ہے۔ عورت کا نطفہ پستانوں کے پاس سینے کی ہڈیوں میں ہے۔ جانوروں میں مذکر کا نطفہ خصیتین میں مادہ کا نطفہ پشت میں۔ جس کا دوسرا نام ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اسی وجہ سے نسل حیوانی مونث والدہ سے چلتی ہے اور انسانی نسل باپ سے چلتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے انسانی بچہ بغیر باپ کے نطفے کے ہرگز نہیں پیدا ہو سکتا۔ بخلاف جانوروں کے کہ بہت سے جانور بغیر مذکر کے پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ تمام پرندوں کے نطفے فقط ہوا کی مثل ہوتے ہیں۔ نہ مادہ منویہ ہوتا ہے نہ تذکیری جراثیم نہ جرثومے نہ جینز۔ اور بہت دفعہ مرغی بغیر اپنے مذکر کے انڈے دینا شروع ہو جاتی ہے۔ پانچواں فرق یہ ہے کہ عورت کا نطفہ جو انڈے کی شکل کا بے جان

باریک ترین ذرہ ہوتا ہے وہ مرد کی صحبت اور رگڑ سے اپنے مسکن سے منتقل ہو کر رحم میں آتا ہے۔ صحبت سے پہلے نہیں آتا۔ مگر حیوان مادہ کا جو نطفہ باریک انڈے کی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ مونث حیوان کی اپنی گرمی اور شدت سے رحم میں وقت مقررہ پر آجاتا ہے تب مادہ جانور کو خواہش ملاپ پیدا ہوتی ہے اسی لیے حیوانی نسل کشی خواہ مذکر حیوان کی وطی کے ذریعے ہو یا نطفہ نکال کر ٹیکے کے ذریعے یا مسلمانوں کے پرانے طریقے کے مطابق جیسا کہ مصنوعی نسل کشی کا طریقہ سب سے پہلے رب مسلمانوں نے عربی گھوڑوں کی نسل کشی برآمد کرنے کے لیے مذکر گھوڑے کا نطفہ روئی میں محفوظ کر کے ولایت کی گھوڑیوں میں داخل کیا جس کے نتیجے میں عربی گھوڑے اور گھوڑیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انگریز ملر اینڈ ویبسٹ اپنی ڈکشنری بیکس ریٹرزی کے پانچویں اڈیشن صفحہ نمبر ۵۲۵ کالم نمبر ۲ سطر ۳ میں لکھتا ہے کہ آج سے پانچ سو سال پیشتر مصر عرب کے مشہور سائنس دان نے روئی کے ذریعے گھوڑے کا نطفہ گھوڑی کے رحم میں ہاتھ سے داخل کیا جس سے حمل ٹھہر گیا۔ مسلمانوں کی اسی ایجاد کو دیکھ کر عیسائیوں نے نئے تجربات کیے اور آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دفعہ کا نطفہ کشید کر کے تقریباً چالیس پچاس ٹیکے بنا کر ایک سال تک کم ترین درجہ حرارت کی فریج میں محفوظ کر کے بوقت ضرورت مادہ گائے بھینس بکری کو لگا کر حاملہ کر دیتے ہیں۔ اور انڈے کی صرف سفیدی تھوڑا گلوکوز تھوڑا اسی نطفے کی نسل کا دودھ ملا کر نطفے کے ہزارہا نسلی جراثیموں کو تقسیم کر کے ایک نطفے سے پچاس ٹیکے بنا لیتے ہیں جو پچاس مؤنثوں کے کام آتے ہیں۔ نطفہ مذکر حیوان کا ہی ہوتا ہے۔ کسی مصنوعی طریقے سے نہیں بنایا جاتا۔ صرف اسی نطفے مندرجہ بالا انڈے کی سفیدی وغیرہ ملا کر مصنوعی منی بنالی جاتی ہے تاکہ نطفے کے جراثیم بڑھ کر خوراک حاصل کرتے رہیں۔ اور سال بھر تک ٹیکے میں زندہ رہیں۔ ٹیکہ ایک ربڑ کی چھوٹی ٹیوب کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب مادہ جانور بھینس یا گائے بولتی ہے تو اس پر مذکر حیوان اسی نسل کا اسی طرح چھوڑا جاتا ہے کہ اس کے آلہ تناسل پر فرج کی طرح کی ٹیوب باندھ دیتے ہیں۔ جب مذکر حیوان چڑھتا ہے تو اس کا آلہ تناسل مادہ کی فرج میں نہیں جاتا کیونکہ ٹیوب رکاوٹ بنتی ہے۔ وہ سارا نطفہ آلہ تناسل سے نکل کر ٹیوب میں جمع ہو جاتا ہے۔ پھر ٹیوب اتار کر لیبارٹری میں جا کر تقسیم کر کے بہت سے ٹیکے بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا قانونِ شرعی کے مطابق حرمت کی کوئی وجہ نہیں۔ پس یہ مصنوعی نسل کشی موجودہ مذکورہ بالا طریقے سے بالکل جائز ہے۔

اور چونکہ اس کے بہت سے فائدے ہیں اس لیے بھی جائز ہے۔ کیونکہ شریعت مطہرہ میں ہر وہ چیز جائز ہے جو مفید ہو اور شریعت کے مخالف نہ ہو۔ پس چونکہ یہ طریقۂ نسل کشی شریعت اسلامیہ کے کسی طرح مخالف نہیں بلکہ بالکل مطابق ہیں اس لیے بالکل جائز ہے۔ واللّٰہ و رسولہ اعلم

کتبہ

کتاب الایمان

درود خضری کیا ہے انبیاء کرام اور ملائکہ کا درود شریف

سوال نمبر ۱۴ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ۱۔ سیدنا حضرت آدم علیہم السلام نے "بارِ شادِ اللہ جَلَّ مَجْدُہٗ" برائے حق مہر سیدتنا حضرت حوا رضی اللہ عنہا جو درود شریف پڑھا تھا وہ کیا تھا۔ ۲۔ درود شریف خضری کو خضری درود کیوں کہتے ہیں؟ ۳۔ مقدمین و موخرین حضرات کے زمانہ کی ابتداء وانتہا نیز ان کی وجہ تسمیہ کی حکمت سے آگاہ فرمایئے۔

محمد یعقوب خطیب جامع مسجد فیضِ مدینہ کاموں کے ضلع گوجرانوالہ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

(۱) مفسرین کرام اس بارے میں اختلاف فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا وہ مہر کیا تھا جو آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت حوا کو عطا فرمایا بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ مہر سونا چاندی تھا جو آپ جنت سے لے کر آئے۔ اور حضرت حوا کو عطا فرمایا۔ حضرت حوا نے اس کو زمین میں دفن کر دیا۔ وہاں سے اللہ تعالٰے نے اسی سونے چاندی کو اتنا بڑھایا کہ سونے چاندی کی کانیں بن گئیں۔ دنیا میں اس سے پہلے سونا نہیں تھا اسی سونے سے دنیا میں سونے چاندی کی ریل پیل ہو گئی چنانچہ تفسیر درِ منثور جلد اول صـ ۵۶ پر علامہ جلال الدین سیوطی عبدالرحمن بن ابی بکر مطبوعہ مصر فرماتے ہیں۔ وَاَخْرَجَ ابْنُ عَسَاكِرٍ رح مِنْ طَرِيْقِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَّا خَلَقَ الدُّنْيَا لَمْ يَخْلُقْ فِيْهَا ذَهَبًا وَّلَا فِضَّةً فَلَكَّهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ مَنْفَعَةً لِاَوْلَادِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا وَجَعَلَ ذٰلِكَ صِدَاقَ اٰدَمَ لِحَوَّاءَ فَلَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّتَزَوَّجَ بِلَا صِدَاقٍ۔ اس روایت کی بنا پر بعض مفسرین حضرتِ حوا کا مہر جنت کا سونا چاندی بتاتے ہیں اور اسی بناء پر مندرجہ ذیل چند لطائف

مستنبط ہیں:۔

نمبر(۱) سب سے پہلے حضرت حوّا نے خزانہ جمع کیا۔ نمبر(۲) سونا چاندی جنّت کی دولت ہے اسی لیے قیمتی ہے اور اس کو فنا نہیں۔ (۳) دنیا میں صرف عورت کے لیے سونا چاندی آیا اسی لیے دنیا میں مرد پر حرام ہے (۴) جنت اصل مقام مرد کا ہے عورت صرف اس کے دل بہلاوے کے لیے ہے اس لیے جنت میں مرد پر جنّتی دولت سونا چاندی حلال ہے۔ جیسے کہ سب فقہاء اسلام فرماتے ہیں (۵):۔ جنت سے بہت سی چیزیں حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ لے کر زمین پر تشریف لائے جس میں حجرِ اسود تمام غذاؤں کے بیج۔ اور خوشبوؤں کے بیج بھی شامل تھے۔ مگر سونا چاندی حضرتِ حوّا ہی لے کر آئیں۔ جیساکہ مندرجہ بالا اشارۃُ النص سے ثابت ہے۔ اسی لیے عورتوں کو سونے سے زیادہ پیار ہے۔ (۶):۔ چونکہ حضرتِ حوّا سرزمینِ عرب میں نازل ہوئیں۔ اس لیے سونے چاندی اُسی اطراف میں زیادہ ہیں۔ اور حضرت آدم ہندوستان کی سرزمین میں تشریف لائے اس لیے خوشبویات غذائی پیداوار وغیرہ انہی کشمیر وغیرہ کے علاقے میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام علماءِ کرام ومحققین ومدققین کے بیان کردہ لطائف تھے۔ اس مندرجہ روایت کی بناء پر۔ مگر جمہور فقہاءِ ومحققین فرماتے ہیں کہ حضرتِ حوّا کا مہر درود شریف تھا۔ اسی مسلک کی بناء پر بعض علماء نے تفسیر درِّ منثور کی بالا روایت کو ضعیف قرار دیا اور ضعف کی دلیل میں فرماتے ہیں کہ ابن عساکر اس روایت کی سند میں ہے۔ حالانکہ ابن عساکر ضابطہ اور حافظہ کے اعتبار سے تمام محدثین کے نزدیک کمزور ہیں اس لیے یہ مذکورہ روایت ضعیف ہے۔ درِّ منثور کی یہ روایت مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں اسی لیے کسی مفسر نے اس روایت کو اپنی کتب میں نہ لکھا۔ مگر مسلکِ جمہور بہت سی کتب میں مرقوم ہے۔ چنانچہ حضرت محقق عالم صوفی باصفا علامہ یوسف بن اسماعیل نبھانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب سعادۃ دارین صـ۸۸ پر فرماتے ہیں کہ حضرتِ آدم علیہ السلام جب نیند سے بیدار ہوئے تو حضرت حوّا کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ قَالَ یَا رَبِّ مَا ھِیَ قَالَ حَوَّآءُ قَالَ یَا رَبِّ زَوِّجْنِیْ مِنْھَا قَالَ ھَاتِ مِھْرَھَا قَالَ یَا رَبِّ مَا مِھْرُھَا قَالَ تُصَلِّیْ عَلٰی صَاحِبِ ھٰذَا الْاِسْمِ عَشْرَ مَرَّاتٍ قَالَ یَا رَبِّ اِنْ فَعَلْتُ اَتُزَوِّجُنِیْھَا قَالَ نَعَمْ فَصَلّٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ عَشْرَ مَرَّاتٍ فَکَانَ مِھْرُھَا:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دس مرتبہ آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود شریف پڑھوایا۔ تفسیر عزیزی جلد اوّل صـ۲۲۷ پر ہے حکم رسید کر دست باو مرساں تا وقتیکہ مہر اُو را ادا نکنی (حضرت آدم علیہ السلام) عرض کرد کہ محمد کیست حکم شد (الخ) پس حضرت آدم علیہ السلام

دہ بار محمد و آلِ محمد :۔ اسی طرح نزہتہ المجالس جلد دوم ص۱۸۶ پر ہے مگر وہاں تین مرتبہ درود شریف کا ذکر ہے، چنانچہ ارشاد ہے :۔ فَقِیْلَ لَہٗ حَتّٰی اَنْ تُوَدِّیَ مَھْرَھَا قَالَ وَمَا ھُوَ قَالَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ۔ مشہور کتاب طہارت القلوب جلد دوم ص۱۱۳ فَقَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ مَہْ یَا اٰدَمُ فَقَالَ لِمَ وَقَدْ خَلَقَھَا اللّٰہُ تَعَالٰی لِیْ فَقَالُوْا حَتّٰی تُوَدِّیَ مَھْرَھَا قَالَ مَا مَھْرُھَا قَالُوْا اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ کتاب مواہب اللدنیہ جلد اول ص۱۰ پر بھی اسی طرح تین مرتبہ درود شریف مہر حوا کا ذکر ہے۔ لیکن ابن جوزی اپنی کتاب سَلْوَۃُ الْاَحْزَانِ میں دس مرتبہ درود شریف کا ذکر فرماتے ہیں۔ تفسیر صاوی پہلی جلد ص۲۲ پر بھی تین مرتبہ آدم علیہ السلام کے درود شریف پڑھنے کا ذکر ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہوگیا کہ جمہور یعنی کثیر فقہاء و محدثین مفسرین محققین کا یہی مسلک ہے کہ حضرتِ حوّا کا مہر درود شریف ہی بنا تھا۔ رہا یہ سوال کہ وہ کونسا درود شریف تھا۔ تو اس کے بارے میں کوئی حتمی تعین ثابت نہیں۔ تین قسم کے درود شریف حضرت آدمؑ کی طرف منسوب ہیں۔ ایک درود وہ جو سب سے پہلے حضرتِ آدمؑ نے زندہ ہوتے ہی پڑھا۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص۲۲۳ پر ہے :۔ وَاَیْضًا لَمَّا خُلِقَ اٰدَمُ رَاٰی اَنْوَارَ مُحَمَّدٍ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَلٰی جَبِیْنِہٖ فَصَلُّوْا عَلَیْہِ۔ وَقْتَئِذٍ۔ اور کتب عملیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ یہ تھے وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الدَّاعِیْ اِلَی اللّٰہِ الْقَادِرِ الْفَتَّاحِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ ذَوِی الْفَلَاحِ وَالنَّجَاحِ :۔ وقتِ نکاح بطور مہر بھی آپ نے یہی درود شریف پڑھا۔ اس لیے حکم ہے کہ نکاح کے خطبے میں یہ درود شریف ضرور پڑھا جائے۔ چنانچہ روح البیان جلد ہفتم ص۲۲۲ پر اسی طرح درج ہے۔ بعض محققین نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام وہی درود شریف پڑھا کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کو سکھایا حضرت جبریل امینؑ کے درود شریف کے یہ الفاظ ہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَوَّلُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اٰخِرُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ظَاھِرُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا بَاطِنُ :۔ یہ درود شریف خود حضرت جبریل امینؑ نے نبی کریم رؤف الرحیم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سنایا۔ چنانچہ سعادۃ دارین فی صلاۃ سید الکونین علامہ نبہانی جلد اول صفحہ نمبر ص۲۲۷ پر ہے :۔ قَالَ جِبْرَئِیْلُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَمَرَنِیْ اَنْ اُصَلِّیَ عَلَیْکَ ھٰکَذَا الخ اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ حضرت جبرائیل کا درود شریف یہ ہے اور سابقہ قول سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم بھی یہی پڑھتے تھے۔ مگر بعض کا قول یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کا ایک ہی درود شریف ہے۔ از حضرت آدم تا حضرت مسیح۔ اور خود پروردگار عالم تعلیم فرماتا رہا۔ سعادۃ دارین فی صلاۃ سید الکونین کے ص۲۳۶ پر لکھا ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ میں کونسا درود شریف پڑھوں تب اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ تعلیم فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَمَعْدَنِ الْاَسْرَارِ

وَمَنْبَعِ الْاَنْوَارِ وَجَمَالِ الْکَوْنَیْنِ۔ وَشَرَفِ الْحَرَمَیْنِ وَسَیِّدِ الثَّقَلَیْنِ الْمَخْصُوْصِ بِقَابَ قَوْسَیْنِ۔
یہ تین درود شریف بعض اقوال سے حضرت آدمؑ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ مگر پہلا درود شریف مہر والا درود شریف ہے۔ اور دوسرے دو کا نام حسب ترتیب صلوٰۃ جبرئیلی، صلوات موسوی ہے:۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(۲) درود خضری حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے تمام انبیاء کا درود شریف ایک ہے مگر چار نبیوں کا صلوٰۃ علیحدہ ہے۔ ؏ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درود شریف چوتھے آسمان پر۔ ؏۲ ادریس علیہ السلام کا جنت میں قیامت تک علیحدہ درود شریف ہے۔ ؏۳ الیاس علیہ السلام کا دنیا میں۔ ؏۴ حضرت خضر علیہ السلام کا۔ کیونکہ یہ چار حضرات قیامت تک اپنے اپنے مقامات پر زندہ ہیں۔ قریب قیامت وفات ہوگی، اس لیئے ان کے درود مختلف ہیں۔ درود خضری علا کے الفاظ یہ ہیں۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ (۳) چونکہ سائل نے اس سوال میں اپنے مسئولہ کا تعین نہیں کیا اس لیئے میں پورے مسئلے کی وضاحت کرتا ہوں۔ دینی مدارس میں جتنے علوم عام مروج ہیں، ان میں سے ہر علم کے علماء کی تقسیم اسی طرح ہے کہ بعض علماء کو متقدمین اور بعض کو متاخرین۔ اور ایک عالم جس نے اس علم میں کوئی بہترین ایجاد یا چھانٹ کی ہو وہ اس تقسیم کا حدِ مرکزی بن جاتا ہے۔ تو جو علماء اس حدِ مرکزی سے پہلے ہوں۔ وہ متقدمین کہلاتے ہیں اور جو بعد میں یا ہم زمانہ ہوں وہ متاخرین کہلاتے ہیں۔ یہی اس تقسیم کی وجہ اور وجہ تسمیہ اور ابتداء و انتہا ہے۔ مگر علوم کے مختلف ہونے کی وجہ سے۔ متقدمین و متاخرین و حدِ مرکزی بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ چنانچہ علم منطق میں امام رازی نے منطق کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر علمائے منطق کے نزدیک مرکزی حیثیت قائم کی اس لیئے امام رازی منطق کے حدِ مرکزی کی حیثیت سے ہیں۔ پس جو اس سے پہلے حکماء اور منطقی ہیں ان کو متقدمین کہتے ہیں جو ان کے بعد میں وہ متاخرین۔ اسی لیئے شرح تہذیب صٹ پر ہے۔ کَمَا زَعَمَہُ الْاِمَامُ الرَّازِیُّ وَاخْتَارَ مَذْھَبَ الْقُدَمَاءِ۔ علم نحو کے حدِ مرکزی امام ابن حاجب صاحب کافیہ ہیں۔ اِن سے پہلے علمائے نحو سیبویہ، اخفش وغیرہ نحو کے متقدمین میں ہیں۔ اسی طرح فلسفہ کی چھانٹ امام غزالی نے اس طرح کی کہ فلسفہ جس کو اہل اسلام جہل مرکب اور زندیقی سے تصور کرتے تھے اور اس کے ورق کو گندگی لگانا جائز سمجھتے تھے۔ اس کو امام غزالی نے اسلام کا آئینہ بنا دیا۔ اس لیئے امام شافعی کو اس مسئلہ کی تردید کرنا پڑی اور کہنا پڑا کہ منطق اور فلسفہ لکھے ہوئے کاغذ سے استنجا کرنا ناجائز ہے۔ اس لیئے امام غزالی فلسفی علماء کی نظر میں حدِ مرکزی ہیں۔ لہٰذا ان سے پہلے فلسفی ارسطو فارابی، بو علی سینا، جالینوس وغیرہ

فلسفہ کے متقدمین ہیں اور ان کے بعد مولانا روم وغیرہ متاخرین ہیں تصوف میں ابوالحسن علی بن ابراہیم خضری جنھوں نے تصوف کی دقیق گتھیوں کو سلجھایا اور متاخرین کے لیے تصوف کا سخت گیر راستہ آسان کیا اور فلسفے کو تصوف سے روشناس کرایا۔ اس وجہ سے صوفیائی نظر میں آپ کی ذات حدِ مرکزی ہے۔ اُن سے پہلے ابوحفص حداد نیشاپوری اور ابوالحسن نوری وغیرہما متقدمین کہلاتے ہیں۔ اور ان کے بعد داتا گنج بخش، ابوالقاسم قشیری، غوثِ پاک عبدالقادر جیلانی متاخرین کہلاتے ہیں۔ ایسا ہی کشف المحجوب ص۱۶۱ پر ہے۔ علم فقہ حنفی میں صاحب ہدایہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدِ مرکزی ہیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

موجودہ طریقے پر صلوٰۃ وسلام کب سے شروع ہوا؟

سوال ۱۵: کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل میں کہ آج کل مساجد میں مروجہ صلوٰۃ وسلام پر اختلاف رائے پیدا ہوکر مسلمانوں میں تفریق اور نفرت کا باعث بن رہا ہے ایسے افسوس ناک حالات کو دیکھتے ہوئے خود کو مطمئن کرنے صحابہ کرام وائمہ مجتہدین کی ہدایات کی روشنی میں اپنے لیے صحیح راستہ معین کرنے کی غرض سے چند سوالات مندرجہ ذیل کی شرعی وضاحت چاہتا ہوں۔ جو قرآن و حدیث اور فقہہ حنفیہ کی مستند ومعتبر کتب سے مرحمت فرماکر مشکور فرماویں: (۱) حنبلی، شافعی، مالکی مذاہب کے علاوہ حنفی مذہب کا ایک گروہ مروجہ صلوٰۃ وسلام (جو چند سالوں سے مساجد میں اجتماعی طور پر کھڑے ہوکر بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے) کے خلاف ہیں۔ اسے دین میں زیادتی اور بدعت کہتے ہیں۔ جس کی دلیل میں احادیث وفقہہ حنفیہ سے وَالسَّلَامُ کَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ اور وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ قَدْ عَلِمْنَا کَیْفَ ھُوَ وغیرہ الفاظ پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ درود وسلام اسی طریقہ سے پڑھنا جائز اور ثواب ہے۔ جیساکہ صحابہ کرام نے پڑھا۔ اور آئمہ مجتہدین نے بھی عمل کیا۔ اُن کے خلاف بدعت وناجائز ہے کہ صحابہ کے خلاف عمل سے خود شارع علیہ السلام نے منع کیا۔ اور پھر اسی طریقہ سے مسلمانوں کی بقیہ نماز قضاء صلوٰۃ التسبیح دیگر نوافل اور تلاوت قرآن پاک وتسبیحات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ جس کی حدیث میں سختی سے یہاں تک ممانعت کی گئی۔ کہ باآواز بلند تلاوت قرآن پاک بھی نہ کی جائے (۲) دوسرا گروہ اسے جائز وضروری سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ قرآن و حدیث کے مطابق یہ جائز ہے اور یہ ضروری ہے:۔ لہٰذا

قرآن و حدیث اور فقہ حنفیہ کی مستند و معتبر کتابوں سے مدلل جواب دے کر دینی اور منصبی فرض ادا کریں:۔
الف:۔ یہ کہ مروجہ صلوٰۃ وسلام مساجد میں کھڑے ہو کر اجتماعی طور پر بلند آواز سے پڑھنا جب کہ دیگر مسلمان اپنی بقیہ نماز، سنت، نوافل یا قضاء نماز، تلاوت قرآن پاک اور تسبیحات میں مشغول ہیں۔ اور ان کے ان مندرجہ بالا امور میں خلل بھی واقع ہو۔ جائز ہے یا نہیں۔ (ب):۔ اس مروجہ سلام کا پڑھنا فرض ہے یا کہ واجب۔ (ج):۔ اس کا پڑھنا سنت ہے یا کہ مستحب؟ (د):۔ اس مروجہ سلام کو ایسی مساجد میں بھی پڑھنا چاہیئے۔ جو کسی ایسے مکتب فکر کے انتظام میں ہوں۔ اور خطیب بھی اسی مکتب فکر کا ہو۔ جو کہ مروجہ صلوٰۃ وسلام کو بدعت و ناجائز سمجھتے ہوں۔ اور اس کے پڑھنے سے انتشار پیدا ہوتا ہو۔ اور نمازیوں میں گروہ بندی کی نوبت آجائے۔ جب کہ یہ طریقہ صحابۂ کرام اور بزرگان سے قرون اولیٰ میں ثابت نہیں۔ (۴) کیا اپنے مکتب فکر کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کسی دوسرے مکتب فکر کی مسجد پر ناجائز و جبراً قبضہ کرنے کی کوشش کرنا شرعاً جائز ہے۔ جواب قرآن و حدیث اور فقہ حنفیہ کی مستند اور معتبر کتابوں سے دے کر ممنون فرماویں:۔
والسلام مع اکرام۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؕ

سائل:۔ عبد القیوم ملک سندھ مرکنٹائل بنک ٹنڈو آدم حیدر آباد سندھ　　　جے ۳

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

الجواب

جوابات:۔ (۱) مذکورہ فی السوال فرقے کو حنفی کہنا ہی غلط ہے۔ یہ اپنے آپ کو اسی طرح حنفی کہتے ہیں۔ جس طرح یہودی اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے تھے۔ حالانکہ یہودی سابقہ انبیاء کے گستاخ ہیں کہ وَ فَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ؕ اور یہ فرقہ دیوبندی وہابی اللہ اور رسول اور اولیاء اللہ کے گستاخ ہیں۔ یہودی لوگ حضرت ابراہیم کے عقیدوں کے مخالف تھے۔ اسی طرح یہ فرقہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقیدوں کے خلاف ہے۔ ان کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے۔ کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ دیکھو براہین قاطعہ حالانکہ امام اعظم کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ ان کا دوسرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ حضور پاک کے بعد اور نبی آسکتے ہیں۔ اور ختم نبوت کا معنٰے اصلی نبی ہے۔ دیکھو مولوی قاسم نانوتوی کی کتاب تحذیر الناس۔ حالانکہ امام اعظم ابو حنیفہ ختم نبوت کے قائل ہیں۔ ان کا تیسرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ شیطان کا علم حضور علیہ السلام سے زیادہ ہے۔ دیکھو خلیل احمد کی کتاب براہین قاطعہ حالانکہ حنفی مذہب کی شفا شریف میں لکھا ہے کہ جو شخص نبی پاک سے کسی مخلوق کا علم زیادہ مانے وہ کافر ہے۔ یہ تھے ان کے چند گستاخانہ حنفی مذہب اور مسلک کے خلاف عقیدے، ایسے اور بھی کئی عقیدے ان

کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس لیئے اُن کو حنفی کہنا غلط ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی پاک کو دُور سے پکارنا حرام ہے۔ حالانکہ امام اعظم اپنے قصیدہ نعمان میں نبی پاک کو دور سے پکار رہے ہیں۔ چنانچہ عرض کرتے ہیں یَا سَیِّدَ السَّادَاتِ جِئْتُکَ قَاصِدًا الخ بتائیے کہ یہ لوگ حنفی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ جب کہ امام اعظم ابو حنیفہ حضور کو دُور سے حاضر و ناظر سمجھ کر ندا کر رہے ہیں۔ سائل لکھتا ہے۔ کہ مروّجہ مشہور صلوٰۃ و سلام چند سالوں سے ہے، لفظ چند اردو زبان میں جمع قلت ہے۔ جس سے آٹھ نو سال مراد ہوتے ہیں۔ اگر سائل کی بھی یہی مراد ہے۔ اور مسجد وں سے پاکستان کی مسجدیں مراد ہیں۔ تب افسوس ہے اور افسوس سے لکھنا پڑتا ہے۔ کہ سائل یا تو جان بُوجھ کر ایسی جہالت کی بات کر رہا ہے۔ اور پھر یا سائل بھی اُسی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ سائل نجو بی جانتا ہے۔ کہ یہ صلوٰۃ و سلام پاکستان بھر میں سائل کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی رائج اور مشہور تھا۔ پھر سائل کا بلا سوچے اور سمجھے یہ کہہ دینا۔ کہ چند سالوں سے مروّج ہے۔ جہالت اور تعصب نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور اگر لفظ چند سے سائل کی مراد سو ڈیڑھ سو سال ہو۔ تو بجا ہے۔ کیونکہ یہ مروّجہ سلام ہندوستان میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے رائج کیا۔ لاہور اور پنجاب میں تکیہ سادھوان مسجد لاہور سے شاہ مولانا عبدالغفار کشمیری نے آج سے نوّے سال پہلے جاری کیا۔ اور ان علاقوں میں صلوٰۃ و سلام کا اُن چند سالوں سے مروّج ہونا تعجب خیز یا قابل ترک نہیں۔ کیونکہ اُن علاقوں میں تو مذہب اِسلام بھی چند سالوں سے آیا ہے۔ اگر یہ گستاخ دیوبندی صرف اِس لیئے سلام کا انکار کریں۔ کہ یہ مذکورہ چند سالوں سے مروّج ہے۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ آئندہ یہ لوگ اسلام و قرآن کو اس لیئے چھوڑ دیں۔ کہ یہ چیزیں بھی ہمارے علاقوں میں چند سالوں سے مروّج ہیں۔ حالانکہ جس طرح اسلام اور قرآن چودہ سو سال سے دنیا میں موجود ہے اسی طرح صلوٰۃ و سلام بھی نبیِ پاک کی ذات گرامی پر پڑھا گیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد مزار مقدس کے پاس صلوٰۃ و سلام مروّجہ مشہور طریقے پر پڑھا جاتا ہے۔ اور آج بھی تمام حاجی صاحبان اسی طرح مل کر اور کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں۔ فرداً فرداً سب سے پہلے یہ سلام صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھا۔ بہت سے لوگوں کو جمع کر کے سب سے پہلے یہ سلام حضرت امام حسین اور اُن کے قافلوں والوں نے کربلا جاتے ہوئے روضۂ پاک پر پڑھا۔ دیکھو شہادت امام حسین کی کتابیں اور ملاں کاشفی تبریزی کی کتاب سیر اہل بیت عربی پھر یہ سلام شام کے بادشاہ ناصر صلاح الدین نے اپنے ملک کی تمام مسجدوں میں سن ۷۸۱ھ میں ہر اذان کے بعد جاری کیا۔ جس کا شہرہ ساری دنیا میں ہوگیا اور یہاں تک کہ مسجد نبوی میں بھی ہر نماز کے بعد اسی طریقے سے مل کر پڑھا جانے لگا۔ جو آج تک جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ جاری رکھے۔ اور منکرین کو ہدایت نصیب ہو۔ چنانچہ فتاویٰ

شامی جلد اول صفحہ نمبر ۳۶۲ پر ہے :۔ اَلتَّسْلِیْمُ بعد الاذان حَدِیْثٌ فِیْ رَبِیْعِ الْاٰخِرِ سَنَۃَ سَبْعٍ مَا ئَتَیْنِ وَاحِدٍ وَّثَمَانِیْنَ فِیْ عِشَاءِ لَیْلَۃِ الْاِثْنَیْنِ (الخ) اور ردالمحتار جلد اول صفحہ نمبر ۲۶۲ پر ھے :۔ اِنَّ اِبْتِدَاءَہٗ اَیْ اِبْتِدَاءَ تَسْلِیْمٍ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ اَیَّامِ السُّلْطَانِ النَّاصِرِ صَلَاحِ الدِّیْنِ بِاَمْرِہٖ ط (ترجمہ) :۔ یعنی مروّجہ طریقے سے سلام پڑھنے کی ابتداء سلطان ناصر صلاح الدین کے حکم سے ۷۸۱ھ میں ہوئی۔ ثابت ہوا کہ کھڑے ہوکر سب لوگوں کا مل کر سلام پڑھنا جائز ہے۔ حضرت امام حسین نے لوگوں کے ساتھ مل کر اور صدیق اکبر نے علیحدہ سلام کھڑے ہوکر پڑھا۔ جیساکہ کتب معتبرہ سے ثابت ہے اب بھی جب روضۂ مطہرہ کے پاس سلام ہوتا ہے۔ وہاں کوئی وہابی منع نہیں کرتا۔ (۲) فقہ حنفی کی معتبر کتب فتاوٰی درِمختار۔ شامی۔ اور فتاوٰی ردالمختار وغیرہ مدلل ثبوت دیئے گئے۔

الف :۔ سلام کو مسجد میں ہی پڑھنا زیادہ ثواب ہے۔ کیونکہ مسجدیں اسی لیے بنی ہیں۔ مسجد اس لیئے نہیں بنی۔ کہ اس میں چیخ چیخ کر دیوبندی مولوی زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ یہ مساجد اللہ کے ذکر کے لیئے ہیں۔ چنانچہ رب کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے :۔ وَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ ط ع سورہ نساء پ ۵ (ترجمہ) :۔ جب تم نماز پڑھ چکو۔ تو فوراً کھڑے ہوکر اللہ کا ذکر کیا کرو۔ اور پھر اس کے بعد بیٹھ کر اور لیٹ کر بھی جس طرح موقع ہو ذکر کرو۔ اس آیت میں صاف صاف سلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ کھڑے ہوکر نماز کے بعد سلام ہی پڑھا کرتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ چنانچہ باری تعالٰے ارشاد فرماتا ہے :۔ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا ط (ترجمہ) :۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ذکر بناکر نازل کیا۔ تم سب کائنات کی طرف۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ تعالیٰ کا ہی ذکر ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا ذکر اللہ ہیں۔ یہ کہنا کہ سلام سے نماز و تسبیح میں فرق پڑتا ہے یہ صرف عداوت سے عداوتِ رسول کی بناپر بہانے بازیاں ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں۔ کہ جب وعظ و تقریر کے لیئے۔ مسجدوں میں گنجائش نکل آتی ہے جو چار چار گھنٹے ہوتے رہتے ہیں۔ اور کسی دیوبندی وہابی کی نماز و تسبیح خراب نہیں ہوتی۔ تو دس منٹ کے سلام سے کیا پہاڑ گر پڑے گا۔ اللہ کے ذکر بہت سی قسم کے ہیں۔ شریعت نے ہر ذکر کے وقت کو معین کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب نماز ہوتی ہے تو تسبیح نہ پڑھو۔ جب سلام ہوتا ہو۔ تو نماز نہ پڑھو۔ ہر چیز کا

وقت معین کرو۔ اب جو شخص دیر سے نماز میں آیا۔ تو شرعًا وہ مجرم ہے۔ اس شرعی مجرم کی وجہ سے۔ سلام جیسی بہترین عبادت نہیں چھوڑی جائے گی۔ اور پھر بلند آواز سے ہرگز ہرگز نماز خراب نہیں ہوتی۔ دیکھو بازار کی مسجد میں ہر وقت سخت شور پڑا رہتا ہے۔ مگر کوئی بولتا نہیں۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں شور مچا رہتا ہے۔ کوئی وہابی شرک بدعت کا فتویٰ نہیں لگاتا۔ خود باری تعالیٰ رب العزت نے ایام تشریق میں بلند آواز سے فرائض کے فورًا بعد تکبیر پڑھنے کا حکم دیا۔ حالانکہ اس وقت بھی بعد میں ملنے والے اپنی نماز ادا کرتے ہیں۔ کیا رب تعالیٰ کو نمازوں کے خراب ہونے کا خیال نہ تھا۔ ان وہابیوں کے دلوں میں لوگوں کی نمازوں کا زیادہ درد ہے۔ فقط ان کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی ہے۔ اس لیے جب ان بدنصیبوں کی نماز خراب ہوتی ہے۔ تو سلام سے ہوتی ہے۔ نہ بازار کے شور و غل سے نماز خراب ہو۔ نہ تکبیرات تشریق سے۔ نہ دیوبندیوں کے مولویوں کے جلسوں اور نعروں اور خرافات سے نماز خراب ہو۔ (ب):۔ اس مروجہ مبارک ایمان افروز وہابیت سوز صلوٰۃ وسلام کا پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔ یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝:۔ (ترجمہ):۔ اے ایمان والو! میرے نبی پر درود پڑھو۔ اور ذوق شوق وجوش وخروش سے سلام بھی پڑھو جس طرح آیت مبارکہ میں لفظ صَلُّوْا امر کا صیغہ ہے۔ اسی طرح لفظِ سَلِّمُوْا بھی امر ہے۔ علمِ اصول کے مطابق امر وجوب کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ کتاب اصول فقہ ص۹ پر ہے:۔ اَلْاَصْلُ فِی الْاَمْرِ الْوُجُوْبُ ۝ (ترجمہ):۔ یعنی امر کا صیغہ اصل میں ہر چیز کو واجب کرتا ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ سلام پڑھنا بھی واجب اور قانونِ شریعت کے مطابق سلام کا وہی طریقہ ہے۔ جو مروج اصول پر نبی پاک کو حاضر و ناظر سمجھ کر لفظ یا سے پڑھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کریمہ میں درود اور سلام کا علیحدہ علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ بندوں کو نہ درود شریف پڑھنے کا طریقہ آتا تھا۔ نہ سلام کا درود بھیجنا رب کا فعل ہے اور سلام پڑھنا صرف مسلمانوں کا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے نبی کا سلام بہت پیارا ہے۔ اس لیے اس کا طریقہ رب تعالیٰ نے خود بتایا۔ کہ التشہد میں۔ حاضر و ناظر کے صیغہ سے تمام مسلمانوں کو قیامت تک پانچوں وقت اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ کے لفظ سے سلام پڑھوایا گویا یہ رب نے سلام پڑھنے کا طریقہ سکھایا۔ مگر درود شریف پڑھنے کا طریقہ رب تعالیٰ نے نہ بتایا۔ تب صحابہ کرام نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم (سلام پڑھنے کا طریقہ تو آگیا) ہم درود شریف آپ پر کیوں کر اور کیسے پڑھیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درود ابراہیمی سنا کر بتایا۔ پس صرف سلام کا طریقہ رب نے بتایا۔ اور صرف

درود کا طریقہ نبی پاک نے بتایا۔ لہٰذا جو شخص صرف درود پڑھنا چاہتا ہو۔ تو وہ درود ابراہیمی پڑھے۔ اور جو صرف سلام پڑھنا چاہے۔ وہ یا نَبِیُّ سَلَامٌ عَلَیْکَ وغیرہ الفاظ سے پڑھے۔ اور جو دونوں ملا کر پڑھنا چاہے۔ اس کے لیئے فقہاء کرام نے اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللہِ جیسے الفاظ مقرر فرما دیئے پس ثابت ہوا کہ موجودہ مروجہ سلام رب کا بتایا ہوا طریقہ ہے جو اس کے خلاف ہے۔ وہ رب کے خلاف ہے۔ اگر سائل یا کسی وہابی کو میری اس تحقیق پر کوئی اعتراض ہو۔ تو میں اُس سے یہ ضرور سوال کروں گا۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ آیت میں تو درود و سلام دونوں کا ذکر ہے۔ کیا وَسَلِّمُوْا کا صیغہ صحابہ کو یاد نہ تھا۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بھی صرف درود شریف کا ہی طریقہ بتا رہے ہیں۔ حالانکہ رب نے دونوں کا حکم دیا ہے۔ ثابت ہوا کہ سلام پڑھنے کا اصلی طریقہ حاضر ناظر کے صیغہ سے ہی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے یہی طریقہ بتایا۔ اگر کسی وہابی کو میری یہ بات تسلیم نہ ہو۔ تو میں اُن سے پوچھتا ہوں۔ کہ آپ لوگ آیت کریمہ کے لفظ وَسَلِّمُوْا پر کس طرح عمل کرو گے۔ جب کہ وہابی یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ صرف درود ابراہیمی پڑھنا چاہیئے۔ حالانکہ وہاں سلام کا لفظ تک نہیں۔ اور اگر کوئی وہابی گھبرا کر اپنے مذہب کو توڑتا ہوا یہ کہہ دے۔ کہ ہم اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ پڑھیں گے۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ طریقہ رب نے تو نہیں بتایا۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے۔ پھر تم یہ طریقہ کہاں سے لے آئے۔ میرے یہ سوالات دنیا بھر کے وہابیوں سے ہیں۔ خوب سوچ کر مدلل جواب دیں۔ بہر حال مجبوراً سب دیوبندیوں اور وہابیوں کو ماننا پڑے گا۔ کہ مروجہ سلام کا طریقہ لفظ یا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا سکھایا ہوا۔ اور پرانا شروع اسلام سے ہے نہ کہ چند سالوں سے اگر اپنی جاہلانہ پرانی عادت کے مطابق ضد اور ہٹ دھرمی کریں۔ تو دوسری بات ہے۔ مگر ذی عقل کو میری یہ تحقیق ماننے بغیر چارہ بھی نہیں۔ (ج) بلکہ واجب ہے۔ جیسا کہ ابھی اوپر قرآن پاک اور صحابہ کرام کے اقوال سے ثابت کیا گیا۔ (د) تمام مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللہِ اَحَدًا ۝ (ترجمہ) تمام مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ اور کوئی سجدہ نہ کرو۔ منتظم لوگ مسجدوں کے مالک نہیں ہیں۔ مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر محلے والے کا اپنے محلے کی مسجد پر پورا حق ہے جس طرح چاہے وہ عبادت کرے۔ ذکر اور اذکار کرے۔ جو لوگ ذکر اللہ کو روکیں۔ وہ کسی مسجد کے منتظم ہونے کے حق دار نہیں۔ بلکہ حکم قرآن کے مطابق وہ ظالم ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا (یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

کہ سب سے بڑا ظالم وہ ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں ذکر اذکار سے روکے۔ سلام بھی اللہ اور رسول کا ذکر ہے۔ لہٰذا منع کرنے والا وہابی ظالم ہے۔ صرف نماز پڑھنا ہی اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں۔ بلکہ اصطلاحِ قرآنیہ میں تو نماز کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ نہ کہ ذکر قرآن پاک کے نزدیک ذکر اللہ نماز کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ اور یہی وہ سلام پڑھنا تسبیح اور تحلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ الخ ؕ یعنی نماز کے بعد ذکر کیا کرو۔ پس ثابت ہوا۔ کہ سلام بھی ذکر اللہ ہے۔ ہر اہلِ محلہ مسلمان کو حق پہنچتا ہے۔ کہ ہر قسم کا ذکر کرسکتا ہے۔ روکنے کو منع کیا جائے گا۔ اگر کوئی منتظم منع کرے۔ تو اس کو مسجد کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے۔ منتظم کا کام مسجد کی خدمت اور آبادی کرنا ہے۔ نہ کہ ذکر اللہ سے روکنا۔ اور بربادی کرنا، جب ملک کی منتظم حکومت ملک کو خراب کرنے لگے۔ تو عوام اس کو نکال کر حکومت کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ تو مسجد کے ویران کرنے والے کا بھی تختہ اُلٹ دیا جائے۔ جس مسجد میں رسولِ کریم کا نام نہ ہو۔ وہ مسجد ویران ہوتی ہے (۷) انتشار اور فساد ڈالنا تو شریعتِ اسلامیہ میں سخت ترین گناہ ہے۔ مگر یہ دیکھنا ہے کہ فسادی ہے کون۔ اگر کسی شخص کے مکان کو ڈاکو چور ویران کرنا چاہیں۔ اور پولیس ڈاکوؤں سے لڑے۔ ڈاکو پولیس پر حملہ کریں۔ دونوں طرف سے سخت ترین لڑائی ہو۔ تو قانون کس کو مجرم، فسادی کہتا ہے۔ پولیس کو یا چوروں کو مسجدیں سب قانون اسلامیہ کے مطابق اللہ کی ہیں۔ کچھ مخصوص لوگ چور دروازے سے آکر اللہ کا ذکر سلام وغیرہ سے روک کر مسجد اللہ کے گھر کو ویران کرنا چاہیں۔ تو اگر اللہ کے سپاہی اُن کو مسجدوں سے نکال دیں۔ تو قانوناً وہ فسادی نہ ہوں گے۔ بلکہ سلام سے روکنے والے فسادی ہوں گے۔ اسی لیے اسلام میں کفار سے جہاد کو عبادت قرار دیا گیا۔ اور کافروں کے لڑنے کو فساد چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ؕ بلکہ اگر پولیس چوروں کو نہ نکالے۔ تو مجرم اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے سپاہی اہلِ سنت حضرات ان روکنے والوں کو نہ نکالیں۔ تو مجرم خلاصہ یہ کہ سلام پڑھنا بہت شاندار عبادت اور اللہ کی فرمانبرداری ہے۔ اور شروعِ اسلام سے مروّج ہے۔ ہاں زمانہ کے اعتبار سے الفاظ اور طریقوں میں تبدیلیاں ترقیاں ہوتی چلی آئی ہیں۔ کیونکہ اسلام مثل ایک درخت کے ہے درخت میں ایک ہی وقت سب کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی صرف جڑ ہوتی ہے۔ کبھی صرف چھوٹی شاخیں کبھی صرف پتے، کبھی صرف پھول کبھی پھل، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درختِ اسلام کی جڑ لگائی صحابہ کرام کے زمانے میں چند شاخیں، اللہ کریم کا کرم ہے۔ کہ یہ درخت دن بدن پھل پھول رہا ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ میری اُمت مثل بارش کے ہے۔ کہا نہیں جاتا۔ کہ اس کا اوّل اچھا ہے۔ یا آخر چنانچہ مشکوٰۃ شریف نے صفحہ نمبر ۵۸۳ پر ترمذی کی روایت نقل فرمائی۔ عَنْ اَنَسٍ

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ مَثَلُ اُمَّتِیْ مَثَلُ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُہٗ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ ط ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ کی روایت ہے۔ کہ حضور اقدس صلے اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ میری اُمّت کی مثال بارش کی طرح ہے۔ (الخ) کتنا بیوقوف ہے۔ وہ شخص جو درخت کی تازہ کونپلوں کو دیکھ کر صرف اس لیے نہ مانے کہ یہ کل اس درخت میں نہ تھیں۔ اسی طرح نادان ہیں وہ لوگ جو ہر بات میں یہ حوالہ مانگتے ہیں۔ کہ بعینہ ان ہی الفاظ کا ثبوت صحابہ کے زمانے سے پیش کرو۔ حالانکہ صحابہ کے سامنے تو نبی کریم جڑ لگانے والے تھے۔ پھر تعجب اور افسوس صرف اس بات کا ہے۔ کہ یہ بدنصیب لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام اور نعت خوانی کے لیے ہم سے ثبوت مانگتے ہیں۔ اپنے کسی کام پر حوالہ پیش نہیں کرتے۔ مثلاً جو قرآن مجید آج زیب و زینت کا ہے۔ وہ تبع تابعین کے زمانے میں نہ تھا۔ اور جس حالت میں تبع تابعین کے پاس پہنچا۔ وہ حالت تابعین کے زمانے میں نہ تھی۔ اور جس حالت میں تابعین کو ملا۔ وہ صحابہ کے زمانے میں نہ تھی اور جس طرح صحابہ کرام نے قرآن مجید کو تدوین کیا۔ نبی پاک نے نہ کیا۔ مگر اس کو کوئی بدعت نہیں کہتا۔ اسی طرح اگر ہم اذان سے بعد یا پھر اذان سے پہلے درود شریف پڑھیں۔ تو حوالہ مانگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ یہ بدعت و اذان میں زیادتی و گناہ ہے۔ حالانکہ یہ دیوبندی ہر وقت تلاوت کے موقعہ پر آخر میں بالکل قرآن کریم سے ملا کر کہتے ہیں: (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ) بناییے۔ کس صحابی یا تابعی نے تلاوت کے بعد یہ لفظ کہے۔ کیا یہ قرآن مجید میں زیادتی نہیں۔ بدعت نہیں؟ اذان کے تمام الفاظ مختصر اور مشہور ہو چکے ہیں۔ ان الفاظ کی زیادتی کمی سے عوام دھوکا نہیں کھا سکتے۔ مگر الفاظِ قرآن عوام کے لیے غیر متعارف ہیں۔ صَدَقَ اللّٰہُ کا لفظ بڑھانے سے زیادتی کا زیادہ احتمال ہے۔ اکثر عوام کا گمان ہو سکتا ہے۔ کہ شاید یہ الفاظ بھی آیتِ قرآنی ہیں مگر ان لوگوں کو یہاں کوئی فکر اندیشہ نہیں۔ کیونکہ اپنی ایجاد ہے۔ پھر اذان وحی الٰہی نہیں اس میں زیادتی بعد میں ہوئی بھی ہے یہاں زیادتی اتنی خطرناک نہیں جتنی کہ قرآن میں جتنی چاہیں ملاوٹ کر لیں۔ دشمنی ہے۔ تو درود شریف سے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے یا پھر دشمنی صلوٰۃ و سلام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام چودہ سو سال سے آج تک ہر دور میں جاری رہا۔ مگر آج جس شاندار طریقے سے ہو رہا ہے قبل ازیں نہ ہو سکا۔ لہٰذا آج کل اسی طرح سلام پڑھنا واجب و ضروری ہے۔ اس لیئے کہ یہ لوگ اسی سلام کے دشمن ہیں۔ اور دین کے دشمن کو پریشان کرنا بھی واجب ہے۔ دیکھو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے اَدوارِ مبارکہ سے آج تک قربانی والی عید کو عیدُ الاَضْحٰی کہا جاتا ہے۔ مگر دیوبند اور بریلی ہندوستان پاکستان ہر جگہ اس عید کو ان علاقوں میں بقرعید کا نام دیا گیا۔ دیوبندی وہابی بھی اس کو بقرعید کہتے ہیں۔ علماء

اولیاء کرام نے اس کو جائز رکھنا شروع کر دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ لفظ قرونِ ثلاثہ کتبِ فقہاء عرب، فارسی کہیں موجود نہیں۔ بلکہ علماءِ ہند کی اپنی ایجاد ہے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس اسلامی دن کے نام خود ساختہ کو بدعت یا گناہ نہ کہا۔ بلکہ اس نام (بقر عید) کو اتنا جاری اور مشہور کیا۔ کہ بہت سے لوگ اس کا شرعی اور مسنون نام ہی بھول گئے۔ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ صرف ہندوؤں، بت پرستوں، گاؤ ماتا کے پجاریوں کو ذلیل و پریشان کرنے کے لیئے۔ اس لیئے کہ اس لفظِ بقرعید کا ترجمہ ہے گائے کی ذبح والی عید۔ لفظ بقر کو اسی لیئے مخصوص کیا کہ یہ ہندؤں کا معبود ہے۔ ورنہ تو قربانی بکرے، دنبے اور اونٹ کی بھی ہوتی ہے۔ تو جب ہندوؤں کو ستانے کے لیئے دین میں یہ بدعت ایجاد ہو سکتی ہے۔ پس منکرینِ سلام کو پریشان کرنے کے لیئے مروّجہ نئے شاندار طریقے سے سلام پڑھنا لازم و ضروری ہے۔ یہ منکرین حضرات اسی قسم کی ہزارہا بدعتیں ہر روز دین میں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر نہ گناہ نہ حرام۔ ان کے نزدیک صرف وہ کام بدعت گناہ اور شرک و کفر و حرام اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ جس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت خوانی و عظمت کا اظہار ہو اللہ ان کو ہدایت دے آمین۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کا حکم

سوال ۱۶:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں۔ کہ نبی پاک صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو یَا مُحَمَّدُ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کہہ کر پکارنا جائز ہے۔ کہ شمع ہمارے کراچی کا ایک مولوی اور مشہور خطیب احتشام الحق تھانوی نے چند دن پیشتر ایک جلسے میں تقریر کے دوران یہ کہا۔ کہ نبی پاک کو یا محمد کہہ کر پکارنا منع اور ناجائز ہے۔ اور کہا۔ کہ اس میں بے ادبی ہے۔ اور دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا فرمایا جائے کہ کیا مولوی احتشام الحق تھانوی کی یہ تقریر درست ہے یا غلط۔ اور مولوی احتشام کی دلیل کہاں تک درست ہے۔ جلد از جلد جواب عطا فرمایا جائے۔ ہم آپ کے فتوے کو اشتہار میں شائع کریں گے۔

السائل:۔ محمد خلیل رانا صدر کراچی۔ مورخہ

۵/۶۶ ۱۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

سوالِ مذکورہ میں جس آیت سے استدلال پیش کیا ہے۔ اِس سے مذکورہ خطیب کی کم علمی واضع ثابت ہورہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ تمام حضرات قرآن مجید کی سمجھ سے بالکل کورے ہیں۔ از نجد تا دیوبند اور از راولپنڈی تا گکھڑ و کراچی کسی دیوبندی کو قرآن مجید کی فہم نہیں۔ چنانچہ اگر اشرف علی صاحب تھانوی اٹھتے ہیں۔ تو وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ؕ کا ترجمہ ہی صحیح نہ کر سکے۔ اور اگر نجدی لوگ اٹھے۔ تو انہوں نے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ؕ کے ترجموں میں لغزش کی۔ اور اس کی غلط فہم سے :- یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کے نعروں کے ناجائز ہونے پر احمقانہ دلیل بنائی۔ اور ادھر مولوی احتشام الحق تھانوی نے اپنے گستاخ مذہب کو بچانے کے لئے لَا تَجْعَلُوْا والی مذکورہ فی السوال آیت سے غلط دلیل پکڑ کے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ صحابہ سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہنا بالکل جائز اور باعث برکت ہے۔ نہ بے ادبی ہے اور نہ ہی برائی بلکہ نبی پاک کی عظیم نعت ہے۔ اللہ اور رسول اِس نعرے کے بولنے سے اور لکھنے سے خوش ہوتے ہیں :- لَا تَجْعَلُوْا کا مقصد وہ نہیں۔ جو مولوی احتشام الحق صاحب نے اپنی ناسمجھی کی بنا پر دھوکہ دینے کے لئے بیان کیا۔ نہ ہی بے ادبی سے بچانا دیوبندی حضرات کا کام دیوبندی تو بے ادب اور بے ادب بنانے والے ہیں۔ اگر احتشام الحق صاحب تھانوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام میں اتنا ہی مخلص ہیں۔ تو ان کو چاہیئے کہ آ گے مسلمانوں کو اشرف علی صاحب تھانوی، خلیل احمد دیوبندی، حسین علی واں بھچراں کی گستاخ اور بے ادب عبارتوں سے بچائیں۔ جو عین کفر ہیں۔ مگر اس طرف کبھی نہ آئیں گے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُن کا مقصد اپنے گستاخ شرکیہ مذہب کو پالنا ہے۔ اور نبی پاک سے امداد لینے والے اور حاضر و ناظر سمجھنے والے عقیدے سے مسلمانوں کو علیحدہ کر کے گستاخ بنانا ہے خیال رہے کہ شریعت اسلامیہ کے بعض قانون از ابتداء محکم ہیں۔ بعض قانون منسوخ بھی ہوتے رہے۔ مگر شرک اور بے ادبی ایسے عظیم قانون ہیں۔ جو ہمیشہ ہی محکم رہے۔ کبھی منسوخ نہ ہوئے۔ اسی طرح اسلام کے بعض قوانین میں بعض لوگ مستثنٰی ہو جاتے ہیں۔ جس طرح اداء زکوٰۃ، قربانی، حج وغیرہ کہ اس میں غرباء مستثنٰی فرشتے اور حیوانات و نباتات، جمادات بھی ان مذکورہ احکام سے علیحدہ ہیں۔ لیکن شرک اور گستاخی بے ادبی کی حرمت والے قانون سے کوئی شخص انسان، فرشتہ، جن، حیوان نباتات، جمادات مستثنٰی اور علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ سب پر گستاخی اور شرک سے بچنا فرض عین ہے۔ چنانچہ ایک

موقعہ پر ابلیس جن نے حضرت آدم علیہ السلام کی گستاخی کی۔ تو اس کو ازلی مردود اور جہنمی بنا دیا گیا۔ ایک دفعہ گرگٹ جانور نے وہابیوں کی طرح حضرت ابراہیم کی گستاخی کی۔ اس کا مارنا حدیث پاک کے حکم سے کار ثواب ہو گیا عیبہ پہاڑ نے نبی پاک سے عداوت اور گستاخانہ دشمنی کی اس کو جہنم کا ایندھن بنا دیا گیا۔ اسی لیئے ہمارے ایک عالم صاحب نے وہابیوں کی فہرست میں ابلیس گرگٹ اور عیبہ پہاڑ کو بھی وہابی ثابت کیا ہے۔:
بہر حال قانونِ شریعت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب واحترام سب سے بڑی عبادت ہے۔ جس طرح عبادت جتنی بھی کی جائے۔ اتنی ہی باعث ثواب واجر ہے۔ بالکل اسی طرح آقا دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ادب جان وایمان اور روح کی چمک کا باعث ہے۔ گویا کہ نماز، روزہ، سجدہ جسم کی عبادت ہے۔ اور نبی پاک کا ادب واحترام اور نعت خوانی، ذکر رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا چرچہ جان وایمان کی عبادت ہے۔ شعر مغز قرآن روح ایمان جانِ دین :۔ ہست حبِّ رحمۃٌ للعالمین۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادب میں اگر ذرہ بھر کمی کا شائبہ بھی پڑتا ہو تو اس سے اجتناب واجب ہے میری تحقیق اور شرعی فتوے کے ماتحت لفظ یا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اور یا رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بلند آواز سے کہنا یا مسجد اور مقدّس مقام میں بلند جگہ پر لکھنا بہت ہی باعثِ برکت اور رحمت ہے۔ اس میں بے ادبی کا احتمال تک نہیں۔ بلکہ صوفیاء کرام کے قول کے مطابق بہتر یہ ہے۔ کہ مسلمان اہلسنت اپنے گھروں، دفتروں وغیرہ میں اور مقدّس مقامات پر عزّت کی جگہ یا محمد، یا رسولَ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک خوبصورت چوکھٹہ فریم کرا کر یا دیواروں پر خوشنما لکھائیں۔ جس گھر میں یہ نام پاک لکھے ہوں گے۔ وہ گھر بہت سی مصیبتوں سے بچا رہے گا۔ اور بجائے صرف یَا مُحَمَّدُ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم لکھنے کے یَا مُحَمَّدُ، یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لکھا۔ اور کہا جائے۔ اور ہر مسجد میں محراب کی جگہ ضرور لکھا جائے۔ اس فتوے پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں:۔

دلیل نمبر ۱:۔ اللہ کریم قیامت کے دن میدانِ محشر میں اپنے حبیبِ پاک کو بڑے پیار ومحبت سے تمام کائنات کے سامنے۔ یَا مُحَمَّدُ کہہ کر خطاب فرمائے گا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۴۸۷ پر ہے:۔ فَاَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَ اَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَاْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ (الخ)۔ ترجمہ:۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ قیامت کے دن میں ایسی حمد کروں گا۔ جو آج تک نہ کی۔ اور اللہ رب کریم کی بارگاہ میں سر جھکاؤں گا۔ سجدہ کرتے ہوئے۔ پس کہا جائے گا۔ "یا محمدؐ"، اپنا سر اٹھایئے۔ جو فرماؤ گے۔ سنا جائے گا۔

الخ۔ اس حدیث پاک میں بہت جگہ لفظِ محمّدًا سے خطاب ہے۔ اگر یہ بے ادبی ہوتی۔ تو سب کے سامنے اس طرح کیوں فرمایا جاتا۔ قرآن کریم کا لفظِ یا محمّدُ سے خطاب نہ فرمانا۔ یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ، یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ سے خطاب فرمانا۔ منکرینِ نبوّت کے سامنے اظہارِ نبوّت و رسالت مقصود تھا۔ کیونکہ کافر لوگ یا محمّدُ کہنے کو برا نہ جانتے تھے۔ بلکہ یا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہنے کے منکر تھے۔ وہ کافر لفظِ محمّدُ کو صرف آپ کا ذاتی نام سمجھتے تھے۔ ترجمے کی طرف توجہ نہ کرتے۔ اس لیے جب ایک دفعہ محمّدًا کے ترجمے کی طرف ابوجہل کو متوجہ کیا گیا۔ تو اس نے محمّدُ کہنا بھی چھوڑ دیا۔ مذمّم مذمّم بکنے اور گستاخی کرنے لگا۔ میرے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو پتہ لگا۔ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ وہ کسی مذمم کو برا کہتا ہوگا۔ ہم تو محمد ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم قرآن کریم میں یا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ جیسے کلماتِ طیبّہ سے خطاب کرنے سے یہ بھی پتہ لگا کہ کافر اور گستاخ جس لفظ سے دکھ کرتے ہوں۔ یا جس چیز کے منکر ہوں۔ اسی لفظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خطاب کرنا افضل ہے۔ تو چونکہ آج کل وہابیوں کو لفظِ یا محمّدُ اور لفظِ یا رَسُوْلَ اللّٰہِ سے بہت دکھ ہے۔ اور انہی کے منکر ہیں۔ لہٰذا ان الفاظ کا بہت چرچا کرو۔ اس حدیث پاک میں تو حشر کے میدان میں خطاب کا ذکر ہے۔ دیگر متعدد احادیثِ قدسیہ میں بھی یا محمّدُ کا خطاب موجود ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ اللہ نے خطاب کیا۔ وہ بڑا ہے۔ ہمارے لیے منع ہے۔ کہ ہم چھوٹے ہیں۔ تو جواب میں دوسری دلیل دیکھو:

دلیل ۲: حضرت جبرائیل بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کرتے ہیں۔ یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ چنانچہ مشکوٰۃ شریف بحوالہ بخاری و مسلم صفحہ نمبر ۱۱ پر ہے بروایت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ (الخ) ط ترجمہ:۔ جبرائیل نے عرض کیا۔ یا محمّدُ خبر دیجئے مجھ کو اسلام کے بارے میں۔ اسی طرح معراج کی رات میں جبرائیل نے یا محمّدُ کہہ کر خطاب کیا۔ چنانچہ تاریخ عبد الملک ابن ہشام جلد اوّل بابُ المِعراج صفحہ نمبر ۲۱۶ پر ہے:۔ فَقَالَ جِبْرَائِیْلُ هُدِیْتَ وَهُدِیَتْ اُمَّتُكَ یَا مُحَمَّدُ، کیا جبرائیل بھی بڑے ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ آپ تو نبی اکرم صَلَّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلِہٖ وَسَلَّمَ کے شاگردوں اور خادموں میں ہیں۔

حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔ اب دیکھو نورِ محمّد کا سبب ہے ظہورِ محمّد کا۔ جبرائیل مقرب خادم ہیں آپ کا مشہور محمّد کا:۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نبی کریم نے اسطرح اپنی ذات کیلیے نقل فرمایا۔ جبرائیل نے اسطرح نہیں کہا ہوگا جسطرح اکثر بزرگ لوگ خود کو، تو سے کلام نقل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اوّلاً تو نبی کریم کا کلام بالکل غلط بیانی اور ملاوٹ سے پاک ہونا لازم ہے کیونکہ وحی الٰہی اور شریعت ہے کوئی بھی بزرگ یہ کہے مجھے فلاں نے کہا تو کوئی سچ جبکہ فلاں نے آپ کہا تو نقل کذب ہے۔ نبی کریم سے ایسا کذب بھی ناممکن دوم اسلیے کہ مشکوٰۃ کی حدیث تو فاروق اعظم سنا رہے ہیں وہ بھی کلام جبریل کو یا محمد سے شروع کر رہے ہیں

اگر یا محمد کہنا بے ادبی ہوتا۔ تو حضرتِ جبرائیل امین کبھی ایسا خطاب نہ کرتے۔ کون بے وقوف کہہ سکتا ہے۔ کہ معاذ اللہ حضرت جبرائیل نے بے ادبی کی یا آپ بے ادب ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بے ادب ہی گستاخ ہوتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و الہ وسلم کا گستاخ کافر ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کہ حضرتِ جبرائیل اس ممانعت سے علیحدہ اور مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ بے ادبی گستاخی سب کیلئے حرام ہے۔ جس طرح باپ کی سب اولاد پر باپ کا احترام فرض، اولاد چھوٹی ہو یا بڑی حاکم ہو یا مملوکہ وزیر ہو جائے یا بادشاہ، عالم ہو یا پیر مرشد، ولی ہو یا غوث، قطب اسی طرح نبی کے سب امتیوں پر نبی عَلَیْہِمُ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ کا ادب و احترام فرض علیٰ جبرائیل ہوں یا میکائیل و اسرافیل، فرشتہ یا جن، انسان ہو یا حیوان۔ جمادات ہوں نباتات کیونکہ یہ سب ہمارے نبی کریم رؤف و رحیم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔ سورۃ انعام آیت نمبر ۳۸ :- وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ - إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (ترجمہ) :- دنیا میں کوئی چرند و پرند ایسا نہیں مگر جو اے مسلمانوں تمہاری طرح امت نہ ہوں، کس کی؟ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی۔ جب سب مخلوق نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی امت بن گئی۔ تو سب پر ادب فرض۔ اور اب ادب جیسی عبادت و ریاضت سے مستثنیٰ۔ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ پس اگر یا محمد کہنا بے ادبی ہوتا۔ تو حضرت جبرائیل کی جرأت نہ تھی کہ اس طرح اپنے نبی اکرم کو خطاب کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی جبرائیل کو منع نہ فرمایا۔ حضرت حکیم الامت کا مرآۃ جلد اول میں فرشتوں کے استثنیٰ کا ذکر کرنا فقط ایک شاذ احتمال ہے۔ جس کو سند نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ حضرت جبرائیل نے جب یہ خطاب مذکورہ حدیث والا کیا تھا۔ تو اس وقت یہ ممانعت والا حکم نازل ہی نہ ہوا تھا۔ نہ یہ آیت لَا تَجْعَلُوا نازل ہوئی تھی۔ اس لیئے اس وقت یا محمد کہنا۔ حرام نہ تھا۔ بعد میں سب پر حرام ہو گیا۔ معاذ اللہ تو دو جواب یاد رکھیئے:- (۱) اولاً یہ کہ نزولِ احکام صرف انسانوں اور مسلمانوں کے لیئے ہیں۔ ملائکہ اور انبیاء کے لیئے نزول نہیں ہوتا۔ وہ حضرات پہلے ہی قوانینِ الہیہ کے مکلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی بزمانہ بچپن یا قبل اعلانِ نبوت شراب نوشی وغیرہ افعال کا مرتکب نہ ہوا۔ اسی طرح وہ الفاظِ بے ادبی جن سے صحابہ کو بذریعہ نزولِ آیات روکا گیا۔ حالانکہ وہ مسلمان بوجہ عدمِ نزول ناسمجھی کی بنا پر اس طرح کلام کر دیا کرتے تھے۔ ان کے لیئے اس وقت جرم نہ تھا۔ جب حکم نازل ہوا۔ تب جرم بنا لیکن فرشتوں کے لیئے پہلے ہی ایسا کلام جرم تھا۔

یہی وجہ ہے۔ کہ لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ اور لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا والے جرم کا ارتکاب کبھی پہلے کسی فرشتے سے صادر نہ ہوا، نہ نزول سے پہلے اور نہ بعد۔ کبھی حضرت جبرائیل علیہ السّلام نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کو راعنا نہ کہا۔ پس اگر یا مُحَمَّدُ کہنا گناہ ہوتا۔ تو نزولِ آیتِ مذکورہ سے پہلے بھی حضرت جبرائیل علیہ السّلام کو اجازت نہ ہوتی۔ اور اس طرح خطاب کرنا ان کے لیے جرم بن جاتا ہے۔

(۲) دوسرا جواب تیسری دلیل میں ہے:۔ **دلیل ۳**:۔ حضرت ملک الموت نے آقائے دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصالِ پاک کے وقتِ وفات سے کچھ دیر پہلے روحِ طیبہ کو جسمِ اطہر سے جدا کرنے کی اجازت طلب کی۔ اور عرض کیا۔ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰہَ اَرْسَلَنِیْ اِلَیْکَ چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب وفات النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم بحوالہ بیہقی شریف صفحہ نمبر ۵۴۷ پر ہے، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْہِ (الخ) ثُمَّ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰہَ اَرْسَلَنِیْ اِلَیْکَ فَاِنْ اَمَرْتَنِیْ اَنْ اَقْبِضَ رُوْحَکَ قَبَضْتُ وَاِنْ اَمَرْتَنِیْ اَنْ اَتْرُکَہٗ تَرَکْتُہٗ (الخ) ترجمہ:۔ جعفر بن محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ کہ حضرت عزرائیل علیہ السّلام عاجزی انکساری کے ساتھ ڈرتے ڈرتے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا جب بارگاہ نبوت سے جوابِ سلام عطا ہوا۔ تو عزرائیل نے کہا۔ یا مُحَمَّدُ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف بھیجا ہے۔ اگر آپ حکم کریں۔ تو آپ کی روحِ مبارک قبض کروں۔ اور اگر آپ مجھ کو حکم کریں۔ تو ہرگز نہ قبض کروں گا۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ کیا ادب و احترام ہے۔ کیا شان ہے میرے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کی۔ دیکھو یہ واقعہ آخری ساعاتِ حیات طیبہ کا ہے۔ مگر ملک الموت خطاباً عرض کرتے ہیں۔ کہ یا مُحَمَّدُ اسی حدیث مبارکہ کے اوّل الفاظ میں حضرت جبرائیل بھی اسی طرح یا مُحَمَّدُ کہہ کر خطاب کر رہے ہیں۔ ظاہر اور لازمی بات ہے۔ کہ اس وقت یہ آیت آچکی ہے۔ تو اگر اس آیت کا مطلب یہی ہوتا جو مذکورہ فی السوال دیوبندی وہابی مولوی احتشام الحق نے لیا۔ تو حضرت جبرائیل و عزرائیل لوقتِ وفات اس طرح خطاب کیوں کر رہے ہیں۔ ثابت ہوا کہ یا محمد کہنا بے ادبی نہیں ہے۔ **دلیل ۴**:۔ صحابہ کرام نے ہجرت کے دن نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد میں جلوس نکالا اور گلیوں اور بازاروں عام راستوں میں۔ یَا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کے نعرے لگائے۔ جب کہ نبی پاک بھی وہاں ظاہراً موجود نہ تھے۔ بالکل ویسا ہی، نقشہ کھینچا۔ جیسا کہ آج کل ہمارے جلسے جلوس میں نعرۂ رسالت ہوتا ہے۔ یعنی اس موقعہ پر یا مُحَمَّدُ، یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہنا خطاب نہ تھا۔ بلکہ محض بطورِ نعرہ لحصولِ برکت و رحمت

اور اظہارِ خوشی کے لیے تھا۔ اسی طرح آج کل ایسا ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ اس نعرے کو قائم و دائم رکھے چنانچہ مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص۴۱۹ پر ہے کہ:۔ وَتَفَرَّقَ الْغِلْمَانُ وَالْخَدَمُ فِي الطُّرُقِ يُنَادُوْنَ - يَا مُحَمَّدُ يَا رَسُوْلَ اللهِ يَا مُحَمَّدُ، يَا رَسُوْلَ اللهِ (رتقا ۲ البراء) (ترجمہ) جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے۔ تو شہر کے نوجوانوں، صحابہ اور مزدور لوگ راستوں میں منفرق ٹولیوں میں پھرتے تھے۔ اور یَا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللهِ کہتے تھے۔ اللہ کی بارگاہ میں یہ نعرہ اتنا مقبول ہوا۔ کہ آج تک ساری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ بلکہ اب یہ نعرہ مسلمان کا نشانِ ایمان بن چکا ہے کہ اس کے بغیر مسلمان کی پہچان مشکل ہے۔ صحابہ کرام نے یہ نعرہ لگایا۔ کون بے دین صحابہ کو بے ادب کہہ سکتا ہے۔ اگر یَا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللهِ کہنا بے ادبی ہوتی۔ تو کوئی تو ان نوجوانوں، شیروں، دلیروں کو منع کرتا۔ پتہ لگا۔ کہ یَا مُحَمَّدُ کہنا عین ایمان اور ادب ہے۔ ایسے پاکیزہ نعرے اور خطاب کو جو شخص بے ادبی کہتا ہے۔ وہ خود گستاخ ہے۔ اور حضرت جبرائیل عزرائیل، صحابہ کرام کی گستاخی کر رہا ہے۔

دلیل ۵ :۔

ابن ماجہ شریف صفحہ نمبر ص۹۹ پر باب الصلوٰۃ دعائے حاجت میں خود آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک حاجت مند صحابی کو ایک دعا تعلیم فرمائی۔ جس میں یَا مُحَمَّدُ کے الفاظ فرمائے۔ اور یہ دعا قیامت تک ہر مسلمان کے لیے جائز ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف بَابُ صَلوٰۃِ الْحَاجَةِ بروایت عثمان ابن حنیف صفحہ نمبر ص۹۹ پر ہے:۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ قَدْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ فِيْ حَاجَتِيْ هٰذِهٖ (الخ) قَالَ اَبُوْ اِسْحٰقَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ (ترجمہ):۔ الٰہی میں تجھ سے مانگتا ہوں۔ اور متوجہ ہوتا ہوں۔ تیری طرف رحمت والے تعریف کیے ہوئے نبی کے طفیل۔ یا محمد بے شک میں متوجہ ہوں۔ آپ کے وسیلے سے اپنے رب کریم کی طرف اپنی اس حاجت میں۔ (الخ) ابو اسحٰق نے فرمایا۔ کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے یہ بات تجربہ شدہ ہے۔ کہ اب بھی انہی الفاظ کے ساتھ یہ دعا بطریقِ مسنونہ پڑھی جائے اگر ذرہ بھر لفظوں میں تبدیلی کر دی جائے تو تاثیر نہیں ہوتا یہ دعا سکھانے والے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اور سیکھنے والے صحابی رسولِ کریم۔ اگر یا محمد کہنا گناہ ہے تو لگاؤ کس پر کیا فتوے لگانے ہو۔

دلیل ۶ :۔

تمام مفسرین کرام قُلْ کی تفسیر میں یا مُحَمَّدُ لکھتے ہیں چنانچہ تفسیر جلالین اور تفسیر ابن عباس تفسیر صاوی وغیرہم میں جہاں کہیں قُلْ۔ واحد مذکر حاضر کا صیغہ آ جاتا ہے وہاں وہ یَا مُحَمَّدُ لکھتے ہیں۔ اگر یَا مُحَمَّدُ کہنا یا لکھنا بقولِ جہلاءِ دیوبند گناہ ہوتا تو یہ مفسر کیوں لکھتے۔ حالانکہ تمام دیوبندی مدارس میں تفسیر جلالین پڑھائی جاتی ہے :۔

دلیل نمبر ۷ :- تمام دیوبندی اکابر کے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب بھی یَا مُحَمَّدُ کہنے کو جائز مانتے ہیں۔ چنانچہ اپنی مصنفات کلیاتِ امدادیہ دس رسائل کا مجموعہ کے آخری صفحات نالۂ امدادیہ صفحہ نمبر ۲۲۳ پر ایک مناجات میں عرض بارگاہ رسالت اشعار لکھتے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:-

شعر

اے رسولِ کبریا فریاد ہے!

یَا مُحَمَّدُ مصطفیٰ فریاد ہے!

(مطبوعہ مکتبہ تھانوی کراچی)

دلیل نمبر ۸ :- سابقہ سات دلائل سے ثابت کر دیا گیا۔ کہ مخلوق میں حضرت جبرائیل اکابرینِ امت تک سب نے یَا مُحَمَّدُ کہا۔ حضرت جبریل سے لے کر صحابہ کرام، مفسرین عظام، صوفیاء کی دعاؤں اور حاجی امداد اللہ صاحب اکابرینِ امت تک بھی سب نے یَا مُحَمَّدُ کہا۔ لیکن کسی نے اس کو برا نہ جانا اور نہ ہی آج تک یہ کلمہ بے ادبی میں شمار ہوا۔ حالانکہ یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا ذاتی نام ہے آخر اس کی بے ادبی نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ تو سنیئے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ہر شخص کے نام نو ۹ قسم کے ہوتے ہیں:-

(۱) اسم جنسی :- جیسے لفظِ حیوانِ ناطق۔ کہ ہر شخص کا نام جنسی ہے۔ (۲) اسمِ نوعی جیسے لفظِ انسان کے ہر شخص کا نوعی نام ہے:- (۳) اسمِ صنفی جیسے لفظِ مرد یا عورت:- (۴) اسمِ سنّی :- جیسے لفظِ بچہ، جوان، بوڑھا۔ کہ ہر شخص کا عمر کے لحاظ سے نام ہوتا ہے (۵) اسمِ دینی :- جیسے لفظ مسلمان، لفظِ عیسائی، یہودی وغیرہ (۶) اسمِ قومی :- جیسے لفظِ سیّد، پٹھان وغیرہ (۷) اسمِ ملکی :- جیسے لفظ عربی ہندی، پاکستانی وغیرہ (۸) اسمِ ذاتی :- جیسے زید، بکر، خالد وغیرہ، (۹) اسمِ وصفی - جیسے لفظ عالم، مولانا، حافظ، قاری، حاکم، آفیسر، تھانیدار، سپاہی، کرنل وغیرہ، مستری، مزدور تمام ناموں میں اصل نام جس سے ذات کی شناخت ہوتی ہے۔ وہ اسمِ ذاتی ہے۔ اس کو عربی میں عَلَم کہتے ہیں۔ یہ نام ہمیشہ دوسرے ناموں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور دوسرا نام وصفی ہے، یہ نام والے کے وصف اور قابلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ عام طور پر وصفی اور ذاتی نام جدا جدا ہوتے ہیں۔ ہمارے نام اسم با مسمّٰی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نام خود ہم نے یا ہمارے والدین نے رکھے ہوتے ہیں۔ کہ جن میں ہمارے وصف کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی یہ ممکن کیونکہ ہمارے نام ذاتی بچپن میں رکھے جاتے ہیں۔ جب کہ ہمارا کوئی وصف ظاہر نہیں

ہوتا۔ بعد میں جیسے جیسے وصف پیدا ہوتے ہیں۔ نام خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ذاتی نام محض ذاتی غیر وصفی ہوتے ہیں بخلاف آقا و دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے کہ آپ کے تمام نام جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ سب کے سب عالمِ بالا میں خود خالقِ کائنات پروردگارِ عالم نے ہی رکھ دیئے۔ آپ کے دو نام ذاتی اور باقی نام صفاتی ہیں۔ لیکن دیگر ناموں کی طرح فقط ذاتی یا فقط صفاتی نہیں۔ بلکہ آپ کے ذاتی نام مع صفاتی ہیں۔ اور بعض صفاتی نام مع ذاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لفظِ محمد اور احمد آپ کے ذاتی نام بھی ہیں۔ اور آپ کی عظیم نعت بھی گویا کہ آپ اسم بامسمّٰی ہیں۔ کائنات میں بجز آپ کے کوئی اسم بامسمّٰی نہیں۔ اور اسی طرح آپ کے بعض صفاتی نام مع ذاتی ہیں۔ جیسے لفظِ رسول، مرسل نبی خاتم النبیین وغیرہ وغیرہ علیہم الصّلوٰۃ والسلام۔ کہ یہ الفاظ اگرچہ آپ کے اوصاف اور عہدے کے اعتبار سے ہیں۔ مگر اب آپ کے ذاتی نام یعنی عَلَمْ بھی ہیں۔ ذاتی اور صفاتی نام میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ کہ ذاتی نام بغیر رکھے ہوئے ہم ہر ایک کے لیئے نہیں بول سکتے۔ مگر صفاتی نام ہر اس کے لیئے استعمال کر سکتے ہیں کہ جس میں یہ صفت پیدا ہو جائے۔ ذاتی اور صفاتی ناموں میں تیسرا فرق یہ بھی ہے۔ کہ ذاتی نام دائمی ہوتا ہے اور صفاتی نام عارضی۔ جب تک کہ صفت ہے نام ہے۔ اور جب صفت ختم، صفاتی نام بھی ختم اب ثابت ہو گیا۔ کہ ذاتی اور صفاتی جب علیحدہ علیحدہ ہوں۔ تو اُن میں تین طرح فرق ہے۔ لیکن دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔ تو یہ تینوں فرق بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ پس یاد رکھو کہ سب لوگوں کے نام ذاتی صفاتی علیحدہ ہیں۔ مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام میں جدائی نہیں۔ اور یوں کہو۔ کہ آپ تو بچھڑوں کو جوڑنے والے ہیں۔ آپ کے تمام ذاتی نام آپ کی عظیم صفتوں کو بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ جس طرح آپ کے بعض صفاتی نام آپ کے عَلَمْ یعنی ذاتی نام بن چکے ہیں۔ اسیطرح آپکے ذاتی نام صفاتی بھی ہیں۔ مثلاً نبی، رسول، آپکے صفاتی نام بھی ہیں۔ اور ذاتی بھی کہ اب کسی کو رسول، نبی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد نہم پارہ نمبر ۱۸ صفحہ نمبر ۲۲۶ پر ہے:۔ وَقَالَ اَبُوْ حَیَّانَ یَنْبَغِیْ اَنْ یَّجُوْزَ النَّعْتُ لِاَنَّ الرَّسُوْلَ قَدْ صَارَ عَلَمًا بِالْغَلَبَۃِ ۵ (ترجمہ) ابو حیان نے فرمایا۔ کہ یا مُحَمَّدُ اور یا رَسُوْلَ اللّٰہِ وغیرہ الفاظ سے نبی پاک کی نعت کہنی جائز ہے۔ کہ لفظِ رسول بھی اب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا عَلَمْ بن چکا ہے۔ کیونکہ اب نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والسلام ہی کا غلبہ ہے۔ یعنی سابقہ انبیاء کی نبوت عِنْدَ النَّاس منسوخ ہے۔ اب دنیا میں رسول کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے سوائے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی کو یَا رَسُوْلُ کہہ کر نہ پکارا۔ بلکہ

یَآ مُوْسٰی، یَآ عِیْسٰی، یَآ اٰدَمُ، ہی فرمایا۔ اور اسی طرف اشارہ ہے۔ علامہ جامی کے اس شعر کا:-

یا آدم است با پدرِ انبیاء خطاب
یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ خطابِ محمد است

جب یہ سمجھ لیا تو یاد رکھو۔

ہمارے اسلامی معاشرے اور رواج میں کسی بزرگ کو محض ذاتی نام سے پکارنا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے لیکن صفاتی نام پکارنا عین ادب اور احترام ہوتا ہے۔ اسی لیئے بیوی خاوند کا، بیٹا بیٹی، ماں باپ کا شاگرد استاد کا، مرید اپنے پیر مرشد کا ذاتی نام لے کر ہرگز نہیں پکار سکتے۔ اس لیئے کہ شریعت مطہرہ کے قانون کے مطابق بڑوں کا ذاتی نام لے کر پکارنا منع ہے۔ کیونکہ ہمارے نام فقط محض ذاتی ہیں، ہاں نسبتی نام اور صفاتی نام لینے بالکل جائز ہیں۔ محض ذاتی نام لینے میں بے ادبی ہے۔ نسبتی اور صفاتی نام لینے میں بے ادبی نہیں۔ بلکہ ادب و احترام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی نام پاک بھی محض ذاتی نہیں بلکہ ہر نام صفاتی نام بھی ہے۔ کہ آپ کے ہر نام میں ہزارہا آپ کی صفات ظاہر ہیں۔ لہٰذا جس وقت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفات طیبہ کا خیال مدنظر ہو۔ تو کسی بھی نام سے ندا کی جائے تو جائز ہے، بدیں وجہ جب لفظِ محمد کے ترجمے پر نور ہو۔ تو یَا مُحَمَّدُ کہہ کر پکارنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت جبرائیل و میکائیل و عزرائیل نے ندا کی۔ بلکہ خود باری تعالیٰ نے اسی نعت و شان کے اظہار کے لیئے اپنی نبی کو یَا مُحَمَّدُ کہہ کر ندا فرمائی۔ ان خطابات میں محض ذاتی نام مراد نہیں۔ اسی لیئے ہمارے اکابرین علماء نے جہاں کہیں یَا مُحَمَّدُ کہنے سے منع فرمایا۔ وہاں یہی مقصد ہے۔ کہ فقط ذاتی نام سمجھ کر عرض و معروض کرنے کے لیئے ندا کرنا اور پکارنا منع ہے۔ کہ اس میں بوجہ عمومیت بے ادبی کا شائبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حکیم الامت نے جاء الحق حصہ اول صفحہ نمبر ۱۷۲ پر فرمایا۔ کہ یا محمد کہہ کر پکارنا منع ہے۔ یعنی یا محمد کا کہنا یا لکھنا منع نہیں۔ بلکہ ندا کرنا اور پکارنا ناجائز ہے۔ اسی طرح جاء الحق جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۳ میں ہے۔ کہ برابری کے الفاظ سے یاد کرنا حرام ہے۔ جاء الحق میں پکارنے کی قید اسی لیئے لگائی گئی۔ کہ یَا مُحَمَّدُ ہمیشہ خطاب کے لیئے نہیں ہوتا۔ بلکہ لفظِ یا، کبھی ندا کے لیئے کبھی توبہ کے لیئے اور کبھی محض نعرے کے لیئے۔ چنانچہ نحو کی کتابوں میں حرفِ یا کے دوسرے استعمال بھی مرقوم ہیں۔ دیکھو شرح جامی صفحہ نمبر ۱۳۴ پر۔ صحابہ کرام ہجرت کے دن مدینہ پاک کی گلیوں، بازاروں کوچوں میں یَا مُحَمَّدُ اور یَا رَسُوْلَ اللہِ کہتے پھر رہے تھے۔ وہ ندا یا خطاب نہ تھا۔

ورنہ اتنی دور سے یہ الفاظ نہ بولتے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاکر عرض کرتے۔ صحابہ نے حرف یا بھی استعمال کیا اور آپ کا ذاتی نام بھی ثابت ہوا۔ کہ یہ پکار یا خطاب نہیں۔ بلکہ فقط نعرہ ہے۔ اور نعرے میں ہمیشہ صفاتی نام ہی مقصود ہوتا ہے۔ اور بقاعدۂ نحوی حرف یا نعرے کے وقت استعمال کرنا جائز ہے۔ ورنہ یہ صحابہ جو خود عربی ہیں۔ اور عربی نحو صرف سے واقف ہیں۔ وہ اس جگہ نعرے میں حرف یا کیوں استعمال کرتے۔ صحابہ کے اس نعرے کو کسی صورت خطاب یا پکار نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ خطاب کا جملہ تامہ ہونا لازم ہے۔ حالانکہ یہ نعرہ جملہ ناقصہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ لفظِ محمد سے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا صفاتی نام مراد ہو۔ تو یا محمد کہہ کر پکارنا ندا کرنا بالکل جائز ہے۔ لہٰذا فی زمانہ ہر جگہ ہر وقت مقدس و مطہر ہو کر یا محمد کہنا باعثِ ثواب۔ کیونکہ اب یہ لفظ بطور نعرہ مستعمل ہے۔ اور نعرہ ہوتا ہی صفاتی ہے۔ استمداد کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر و ناظر اپنے بالکل قریب سمجھ کر آپ سے عرض و معروض کرتے وقت بھی یَا مُحَمَّدُ کہنا جائز۔ جب کہ یَا مُحَمَّدُ کے صفاتی ترجمہ کا خیال ملحوظ ہو رہی وہ آیت کریمہ کہ جس کو وہابیانِ زمانہ نے اپنی دلیل سمجھی۔ اس آیت کا لفظ یَا مُحَمَّدُ سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو راس آیت پاک کی مکمل تفسیرا:۔ اِس آیت پاک کی تفسیر میں تمام مفسرین کرام بہت سے اقوال بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر الحدیث لعلامہ حافظ علیے عمار مصری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۹۳ پر ہے۔ اور تفسیر ابن کثیر لعلامہ اسماعیل ابن کثیر جلد سوم صفحہ نمبر ۳۰۷ پر ہے۔ کہ دعا بمعنی التجاء اور مناجات ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کو اپنی اپنی دعاؤں کی طرح نہ سمجھو ہماری دعائیں بعض قبول بعض مردود مگر انبیاء کرام کی سب دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ کہ فَاِنَّ دُعَآءَہٗ مُسْتَجَابٌ فَاحْذَرُوْہُ اَنْ یَّدْعُوْا عَلَیْکُمْ لِتَهْلِکُوْا۔ یعنی نبی کی بد دعا سے بچو۔ کہ یقیناً وہ ہلاک کر دیتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد چیخ چیخ کر پکارنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینا ہی مراد ہے یعنی لَا تَجْعَلُوْا والی آیت یہ حکم دے رہی ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چیخ چیخ کر نہ بلاؤ۔ بلکہ قریب جاکر آہستہ آہستہ سے کلام کرو۔ اُس وقت بہ نیت احترام و توصیف یَا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر مدارک و تفسیر بیضاوی نے جلد دوم صفحہ نمبر ۱۲۳ پر اسی بات کو ترجیح دی۔ ان مفسرین کے نزدیک لَا تَجْعَلُوْا کا حکم صرف صحابہ کے زمانے میں ہی جاری تھا۔ کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیاتِ ظاہری جلوہ افروز تھے اور لوگ آپ سے بالمشافہ عرض و معروض کیا کرتے تھے۔ اب یہ حکم منسوخ ہے۔ بعض مفسرین

کے نزدیک مطلقاً نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام ذاتی سے کر بلانا ممنوع خواہ زور سے اور خواہ آہستہ، اُن کے نزدیک یہ حکم اِس صورت میں ہے۔ جب کہ لفظِ مُحَمَّدٌ کو ذاتی نام سمجھا جائے تب یَا مُحَمَّدَا کہنا بے ادبی ہے۔ صفاتی نام کی نیت سے یَا مُحَمَّدُ کہنا یا بطور نعرہ یَا مُحَمَّدُ کہنا ان مفسرین کے نزدیک بھی بُرا اور ناجائز نہیں۔ ورنہ پچھلے دلائل مذکورہ کا جواب کیا ہوگا۔ چنانچہ تفسیر ابن عباس و جلالین نے یہ ہی کہا ہے کہ بہت سے لوگ ناسمجھی میں یَا مُحَمَّدُ کو بطریقہ ذاتی نام استعمال کیا کرتے تھے۔ جس سے بے ادبی کا ایک پہلو نکلتا ہے۔ اِس لیئے اللہ تعالیٰ نے ناسمجھوں کو تو منع کر دیا۔ مگر جبرائیل میکائیل و صحابہ کو منع نہ کیا۔ کیونکہ یہ لوگ یَا مُحَمَّدُ کو نبی پاک کی تعظیم و توصیف سمجھ کر کہتے تھے۔ یہ تھے، مفسرین کے نزدیک بعض اقوال اِس آیت کریمہ کی تشریح و تفسیر میں۔ مگر یہ سب غیر مناسب تعبیر ہیں اس لیئے کہ آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر کے چار درجے ہیں۔ ان ہی درجوں سے آیت کی سچی طرح سمجھ لینا ممکن ہے اگر یہ چار درجے تسلیم نہ کیئے جائیں۔ تو کسی آیت کو سمجھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیئے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت کی ہزاروں تفسیریں ہو چکی ہیں۔ جن میں اکثر غلط ہیں۔ ایک اجنبی شخص ان غلط تفسیروں کو پڑھ کر گمراہی کے قریب تر ہو تا ہے۔ اِس لیئے مفسرین کرام تفسیر سے پہلے ان چار تفسیری مدارج کو سمجھنے اور سمجھانے کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ پس جو تفسیر ان چار مدارج کے ماتحت ہو گی۔ وہ درست ہو گی۔ ان سے علیحدہ ہو کر تفسیر قطعاً غلط اور ناقابل قبول۔ مفسرین کے بتائے ہوئے چار درجے حسب ذیل ہیں:۔

نمبر ایک (۱):۔ تفسیر القرآن بالحدیث المبارکہ من لسانِ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم: (۲) تفسیر القرآن بسیاقِ القرآن:۔ (۳) تفسیر القرآن بشانِ نزولِ آیات: (۴) تفسیر القرآن بألفاظ القرآن: یہ چار درجے ہیں۔ کہ جن کے ذریعہ تفسیر کرنا جائز ہے۔ اِن سے ہٹ کر جو تفسیر ہوگی۔ اس کو تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے۔ شریعت میں وہ سراسر غلط ہے۔ مندرجہ بالا جو تفاسیری عبارات کا ذکر کیا گیا۔ وہ سب اِن مدارجِ اربعہ کی حدود سے باہر ہیں۔ اِسی لیئے شرعاً قابلِ سند نہیں اِن جیسی تفاسیر سے ہی دیوبندی حضرات استفادہ کر کے غلط روش اختیار کرتے ہیں اِنہی اقوال سے مولوی احتشام الحق صاحب تھانوی نے استدلال میں سہارا پکڑا ہے۔ آج اِتنے فرقے بھی ان ہی تفاسیر بالرائے سے جنم ہوئے۔ اگر مفسرین قرآن بننے سے پہلے اِن چار درجوں پر غور کر لیا جائے:۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ ضلّا لَهٗ بِالقرآن نہ سر اُٹھا سکے۔ اب اس آیت کریمہ کے بارے میں

یہ چار درجے کسطرح ہیں۔ جب ان مدارج میں غور و فکر کرکے آیت پر نظر کی جائے۔ تو اس کا مطلب کچھ اور ہی شان سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ تفسیری ترجمہ ملاحظہ کیا جائے۔ اے مسلمانو:۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کسی شخص کو آواز دیں۔ تو آپ کی پکار کو لاپرواہی یا سستی سے ٹالا نہ کرو۔ جس طرح کہ ایک دوسرے کی آواز کو کبھی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ جب کبھی خطاب وعظ نصیحت کے لیئے یا کسی اپنے کام کے لیئے بلائیں۔ اور جب تک واپس جانے کی اجازت نہ دیں۔ ہرگز ہرگز واپس نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی فرض، واجب یا نفل بھی پڑھ رہا ہو۔ تب بھی نماز چھوڑ کر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی پکار پر دوڑا چلا آئے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا کرم دیکھئے۔ کہ اس کی نماز بھی نہ ٹوٹے۔ پھر وہیں سے آکر شروع کردے۔ جیسے کہ حاجت کی نماز نہیں ٹوٹتی۔ مگر یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا پکارنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کہ انکی بات چیت، چلنے پھرنے، بازار جانے آنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ اللہ اکبر۔ کیا شان ہے دربارِ شاہانہ کی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمَ ط اب اس تفسیر کو کسی درجے سے دیکھو۔ غلط نہ ہوگی۔ بخلاف دیگر تشریحوں کے۔ (۱) اس آیت کی تفسیر بالحدیث بھی یہی ہے۔ کہ نبی پاک نے خود یہی مطلب بیان فرمایا۔ اور صحابہ کرام نے عمل کیا (۲) اس آیت کی تفسیر روشِ کلام سے بھی یہی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس آیت کا سیاق و سباق اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ سے لے کر بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ تک ہے۔ اس عبارت آیات کا مطلب و مفہوم بلکہ لفظی ترجمہ یہی ہے۔ کہ میرے پیارے حبیب کی مرضی کے بغیر اُن کی مجلس سے اُٹھ کر نہ جاؤ۔ اُن کے بلانے اور جمع کرنے سے فوراً آجاؤ:۔ (۳) اِس آیت کی تفسیر بالالفاظ بھی یہی بات ظاہر فرما رہی ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان نے جلد ششم کے صفحہ نمبر ۱۸۵ پر ارشاد فرمایا:۔ کہ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ "اَلْمَصْدَرُ مُضَافٌ اِلَی الْفَاعِلِ (الخ) یعنی لَا تَجْعَلُوْا کی آیت میں لفظِ دعا مصدر ہے اور مضاف فاعل کی طرف ہے۔ کہ نبی جب تم کو پکاریں۔ اگر یا محمدؐ کہنے کی اس آیت سے ممانعت ہوتی۔ تو دُعَآءَ الرَّسُوْلِ نہ ہوتا۔ بلکہ دُعَآءَکُمْ لِلرَّسُوْلِ ہوتا لہٰذا نحوی اور لفظی لحاظ سے اور لفظی تفسیر کی بناپر بھی یہی مطلب ثابت ہوتا ہے۔ (۴) باعتبار شانِ نزول کے بھی یہی تفسیر بنتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے مفسرین اس کا شانِ نزول یہی بیان فرماتے ہیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم جب کبھی وعظ و نصیحت یا جمعہ و عید کے لیئے جمع فرماتے۔ تو منافقین اور ان کی دیکھا دیکھی بعض ان پڑھ یا کم سمجھ نومسلم بھی جلدی نہ آتے۔ اور جب آتے۔ تو چھپ چھپا کر جلدی بھاگنے کی کوشش کرتے،

ان کے لیے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ غرضیکہ کسی طرح بھی اس آیت کو دیکھا جائے آخری تفسیر ہی ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے جن اکابرین نے اس آیت کے چند مطلب بیان کیے۔ وہ بھی ترجیح اِس آخری معنی کو ہی دیتے ہیں چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد نہم صفحہ نمبر ۲۲۲ پر ساری تفسیریں قَالَ بَعْضُ اور قِیْلَ بَعْضُ بیان کرکے آخر میں فرماتے ہیں کہ نَعَمْ اَلْاَظْهَرُ فِیْ مَعْنَی الْاٰیَةِ مَا ذَکَرْنَا اَوَّلًا کَمَا لَا یَخْفٰی ۵ یعنی اگرچہ بہت سے لوگ اس آیت میں طرح طرح کے مذکورہ ترجمے کرتے ہیں۔ مگر زیادہ شاندار اور ظاہر وہی تفسیر ہے جو سب سے پہلے اوّل نمبر پر ہم نے بیان کی یہاں تک کہ وہابیوں کے سابقہ پیشوا اشرف علی صاحب تھانوی اپنے ترجمے کے صفحہ نمبر ۵۴۳ پر اور موجودہ پیشوا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تفہیم القرآن جلد سوم کے صفحہ نمبر ۴۲۷ پر اسی تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس آیت سے مخالف کا منشاء ہرگز نہیں حاصل ہوتا۔ نہ ہی لفظِ یا محمد کہنے کی حرمت ممانعت کسی بھی آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے لفظِ دعاء الرسول میں رسول مفعولی مضاف الیہ بنایا ہے وہ محققین علماء بھی اسم جنسی اور نوعی اور نسبتی ناموں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے سے ممانعت فرماتے ہیں۔ نہ کہ یا محمد اور یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے۔ ان کا مقصد بھی یہ ہے کہ نبی کریم رؤف ورحیم علیہ التحیۃ والثناء کو ابا چچا بھائی بھتیجا مرد انسان بشر کہہ کر نہ پکارو، ورنہ کیا اُن کے سامنے یا محمد کے ثبوت میں وہ دلائل نہ تھے۔ جو میں نے اوپر بیان کیے؟ ثابت ہوا کہ بجز وہابیوں کے کوئی بھی یا محمد کے نعرے سے منکر نہیں۔ سب علماء جائز اور باعث برکت سمجھتے ہیں۔ کہ جس طرح یا اللہ کہنا اور لکھنا جائز ہے۔ اسی طرح یا محمد بھی لکھنا اور کہنا بالکل جائز ہے۔ کہ وہ بھی اسم ذاتی مع صفاتی ہے اور یہ بھی ذاتی مع صفاتی۔ ذاتی نام کی تعریف نحوی یہ ہے۔ کہ جو موضوع لہٗ کے بغیر کسی اور پر نہ بولا جائے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نام صفاتی سمجھ کر پکارنا اور نعرہ لگانا بالکل جائز۔ ہاں البتہ جب بھی نبی کریم کا کوئی نام منہ سے کہا جائے یا کانوں سے سنا جائے تو ضرور اور ضرور صلی اللہ علیہ وسلم کہا جائے۔ بلکہ لکھنا بھی مستحب اور زیادہ اچھا ہے۔ یہ حکم اِس آیت سے نہیں بلکہ بابُ القیام کی لعنت اور آمین والی حدیث سے ظاہر ہوا۔ لیکن ذاتی مع صفاتی کو صرف ذاتی عَلَمْ سمجھ کر پکارنا منع ہے۔ نحو کے اس قاعدے سے بھی اعتراض کرنا حماقت ہے کہ عَلَم اور وصف جمع نہیں ہو سکتے یہ قانون اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن لفظِ محمد مستجمع صفات ہے۔ جیسے کہ لفظ اللہ چنانچہ مناظرہ رشیدیہ صفحہ ۳ پر ہے:۔ وَاللّٰهُ عَلَمٌ لِذَاتِ الْوَاجِبِ الْوُجُوْدِ الْمُسْتَجْمِعِ لِجَمِیْعِ صِفَاتِ الْکَمَالِ۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ۵

ــــــــــــ کے تیــــــــــــ

✿ ✿ ✿ ✿ ✿

نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح منتقل ہوتا رہا؟

سوال نمبر ۱: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور کس طرح منتقل ہوتا رہا۔ عالی جاہ اس کی حقیقت سے مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ جب کہ احادیث سے مجامعت و قربت ہی سبب معلوم ہوتا ہے۔ کیا نطفہ میں نور مخلوط تھا؟ اسی ذریعے سے پاک پشتوں اور رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہے یا حقیقت کچھ اور ہے: تحریر لطف تفصیلاً باحوالہ وضاحت فرما کر جواب باصواب سے جلد مستفیض فرمائیں: وَجَزَاكُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۔

سائل:۔ مولوی محمد یعقوب خاں خطیب کاموںکے منڈی ضلع گوجرانوالہ۔ بروز پیر ۲۶ محرم شریف ۱۳۹۲ھ :-

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

سوال مذکورہ بہت اہم ہے اس لیے اس کے جواب کو سمجھنے کے لیے چند باتیں یاد رکھنی بہت ضروری ہیں: تاکہ جواب کو بآسانی سمجھا جا سکے (۱) جاننا چاہیئے۔ خلاق کائنات نے دنیا میں بے شمار مخلوق پیدا فرمائی۔ جن کو چار قسموں پر منقسم کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم مخلوقِ لطیف جیسے فرشتہ، جن، ہوا، روح وغیرہ۔ دوسری قسم حیوانات جیسے انسان، بیل، گھوڑا وغیرہ، تیسری قسم نباتات جیسے درخت بیل بوٹے۔ چوتھی قسم جمادات جیسے اینٹ پتھر، آسمان، زمین، چاند، سورج وغیرہ۔ لیکن اس تمام مخلوق کے طریقۂ پیدائش فطرتاً مختلف ہیں۔ چنانچہ ملک، ہوا، روح اور تمام جمادات بلاواسطہ بغیر وسیلہ یک دم مکمل پیدا کیئے گئے۔ اسی کو امرِ کُن کی مخلوق کہا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش میں کسی دوسرے کی مدد وغیرہ کا دخل نہیں۔ بخلاف دیگر مخلوق کے کہ اُن کی پیدائش میں ظاہری طور پر بے شمار وسائل حائل ہیں۔ جن کی بنا پر ان کو خلقتِ کسبی بھی کہا جاتا ہے عالمِ حیوانات میں ہر جاندار جوڑا جوڑا پیدا کیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:۔ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ط ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے ان جانداروں سے دو دو جوڑے مذکر، مؤنث پیدا کیئے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ط وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ مِنْ نُطْفَةٍ (الخ) :- ترجمہ:۔ ہم نے ہر چیز کے دو دو جوڑے پیدا فرمائے۔ اور وہ جوڑے نر و مادہ پیدا کیئے۔ ان آیات سے ثابت ہوا کہ جانداروں کے علاوہ بعض نباتات بھی نر

ومادہ سے پروان چڑھتے اور بارآور ہوتے ہیں۔ لیکن خلاقِ کائنات نے ہر مذکر مونث کا اختلاط اور صحبت وملاپ بے شمار طریقے سے کیا۔ اور نطفے بھی مختلف پیدا کیئے۔ چنانچہ بعض درخت بھی مختلف نوعیت کی نر و مادہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے کھجور کا درخت انگور کی بیل وغیرہ اور ان کا اختلاط بھی مختلف نوعیت کا چنانچہ بعض صرف قرب سے صحبت یافتہ ہوجاتے ہیں۔ اور ہوا کے ذریعے نطفہ منتقل ہوجاتا ہے بعض کو نر درخت سے پیوند کرانا پڑتا ہے۔ اسی طرح جانداروں میں بھی نر و مادہ کی صحبت مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کے علاقوں میں ایک پرندہ قوقیس پایا جاتا ہے۔ جو اپنی شہوت رانی کے لیئے اپنی مادہ۔۔ چونچ سے چونچ رگڑتا ہے۔ جس کی گرمی سے آگ کا شعلہ نکلتا ہے اور دونوں اپنے ہی جمع کیئے ہوئے تنکوں پر جل مرتے ہیں۔ اسی راکھ پر بارش ہوتی ہے۔ جس سے نئے کیڑوں کی شکل میں اس جیسے جانور پیدا ہوجاتے ہیں، پھر پرندہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ حیوٰۃ الحیوان لعلامہ دمیری صفحہ نمبر ۲۲۱ اور کتاب عجائب المخلوقات جلد دوم صفحہ نمبر ۲۴۳ پر ہے۔ (قوقیس) قَالَ الْقَزْوِیْنِیْ اَنَّہٗ طَائِرٌ بِاَرْضِ الْھِنْدِ (الخ)

ایک اور پرندہ ققنس ہے، جبلِ ہند میں پایا جاتا ہے وہ سیٹی بجاتا ہے۔ تو اس کی مادہ حاملہ ہوجاتی۔ ابلیس کی ایک ران میں مذکر ہونے کا اثر ہوتا ہے دوسری میں مادہ کا۔ جب دونوں رانوں کو رگڑتا ہے۔ تو اس کی ذریت پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے۔۔ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ لَہٗ فِیْ فَخِذِہِ الْیُمْنٰی ذَکَرًا وَفِیْ فَخِذِہِ الْیُسْرٰی فَرْجًا۔ فَھُوَ یَنْکِحُ ھٰذِہٖ بِھٰذِہٖ فَیَخْرُجُ کُلَّ یَوْمٍ عَشَرَ بَیْضَاتٍ یَخْرُجُ مِنْ کُلِّ بَیْضَۃٍ سَبْعُوْنَ شَیْطَانًا وَ شَیْطَانَۃً (الخ)۔۔ مینڈک کی پیدائش مختلف طریق سے ہے۔ برساتی مینڈک خشک سالی میں مرکر مٹی بن جاتا ہے۔ پھر بارش ہوتی ہے۔ تو وہی مٹی چھوٹے مچھلی نما کیڑے بن جاتے ہیں جو بعد میں مینڈک کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اسی طرح بچھو کی پیدائش بھی چند مختلف طریقوں سے ہوتی ہے:۔ علا زمین کے گندگی مادے سے بچھو پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے کلر والی زمین میں بچھو زیادہ ہوتے ہیں۔ بعض اطباء کا قول ہے کہ زرد رنگ کی گائے کا گوبر اور اسی کے دودھ کا دہی ہم وزن ملا کر اچھی طرح کسی بنجر اور کلر والی زمین میں گڑھا کھود کر اس میں دہی گوبر ڈال کر اینٹ یا پتھر سے اچھی طرح بند کردو۔ کہ اندر ہوا نہ جائے تو چالیس دن بعد وہ سب گوبر بچھو بنے ہوں گے غرضیکہ خلقِ خلق میں بے شمار قدرتیں اور قوانینِ خداوندی ہیں۔ عقل عقلا حیران سرگرداں ہے۔ یہ تو وہ مخلوق ہے جو عام قانون فطرت کے خلاف پیدا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ مخلوق جو اس فطرتی قانونِ مشہورہ یعنی جماع اور وطی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس میں بھی یکسانیت نہیں۔ بلکہ بے حد امتیازات ہیں۔ چنانچہ انسانی جماع وصحبت اور دیگر حیوانات گائے بکری وغیرہ کے جماع میں کئی طرح فرق ہیں۔ مندرجہ بالا دلائل سے بخوبی واضح ہوگیا کہ پیدائش

مخلوق یا دلادتِ اولاد کا سبب صرف مجامعت و قربت ہی نہیں جیساکہ سائل کو غلط فہمی ہوئی بلکہ بے شمار مختلف طریقے ہیں۔ اب انسانی حیوانی مجامعت کی تفریق سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کی صحبت میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسان سارے جسم سے صحبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زانی کو سارے جسم پر حد لگتی ہے۔ اور جانور صرف آلۂ تناسل سے ۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جانور کا نطفہ صرف مادہ منویہ ہی کے ذریعے رحم میں پہنچتا ہے۔ مگر انسان کا نطفہ زوج و زوجہ کے ہر عضو سے دخول کرتا ہے صرف مادہ منویہ ہی سے نہیں ۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ جانور کی مجامعت سے صرف انتقالِ جسم ہوتا ہے۔ مگر انسانی صحبت سے مختلف اشیاء - (۱) مادہ منویہ سے جسم اور اعضاء - (۲) ہم شکلی چہرے اور ہاتھ پیر کی۔ (۳) نفسِ ناطقہ (۴) عقل (۵) فہم (۶) ادراک (۷) حسن (۸) نفسِ امارہ (۹) نفسِ مطمئنہ۔ اور یہ سب چیزیں مختلف اعضاء سے ہوتی ہیں۔ اگر یہ سب کچھ اصطلاحی نطفے سے ہوتیں تو لازم تھا۔ کہ ہر جانور کو یہ چیزیں حاصل ہوتیں۔ حالانکہ کسی جانور کو ان کا حصول محال بالذات اسی لیئے خالقِ عالم نے انسان کے تمام اعضاء میں قوتِ شہوت ودیعت کی ہے۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ ان کے صرف عضو مخصوصہ میں شہوت ہے یہی وجہ ہے کہ انسانوں پر غسل واجب حیوانوں پر نہیں۔ اگر کسی حلال جانور کو وطی کے فوراً بعد ظاہر گندگی اتار کر پانی میں ڈال دو تو پانی نہ مستعمل ہوگا نہ ناپاک ۔ چنانچہ شرح قاشانی صفحہ نمبر ۲۷ پر ہے :- وَلِهٰذَا تَعُمُّ الشَّهْوَةُ اَجْزَاءَ كُلِّهَا وَلِذَالِكَ اُمِرَ بِالْاِغْتِسَالِ مِنْهُ - فَعَمَّتِ الطَّهَارَةُ كَمَا عَمَّ الْفَنَاءُ فِيْهَا عِنْدَ حُصُوْلِ الشَّهْوَةِ - لِاَنَّ اِنَّمَا ذَاتُ الَّتِيْ تَنْفَصِلُ مِنْهُ اَصْلُ حَيَاتِهٖ (ترجمہ) اور اسی لیئے عام ہوتی ہے شہوت تمام انسانی اعضاء میں کہ وہ تمام اعضاء سے صحبت کرتا ہے۔ اس لیئے انسان پر غسل واجب ہے۔ پس جس طرح مرد کا دخول عام ہے طہارت بھی عام ہوئی۔ اس لیئے کہ وہ مختلف مادے جو مختلف طریقوں سے مرد سے جدا ہو کر رحم زوجہ میں پہنچے ولد کی اصل حیات ہے۔ گویا کہ جانور کی صحبت ظاہراً اور حقیقتاً ایک طرح پر ہے کہ دخولِ عضوِ تناسل۔ مگر انسان کی مختلف طریقے سے کہ ظاہراً دخولِ عضو مخصوصہ مگر باطناً یا حقیقتاً ہر عضو بدن یہی وجہ اجنبی عورت و مرد پر پردہ فرض ہے۔ کہ نہ مرد عورت کے ہاتھ پیر چہرے کو دیکھے نہ عورت اجنبی اور غیر محرم مرد کے چہرے وغیرہ کو۔ اگر چہ ہر دو میں سے ایک نابینا ہو۔ جیساکہ ایک مرتبہ آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو عبد اللہ ابن مکتوم نابینا صحابی رضی اللہ عنہ سے پردے کا حکم دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ عورت، مرد کو کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ ان کی شرم گاہ ڈھکنی فرض ہے۔ مگر جانور کی شرمگاہ یا جسم نہیں ڈھکا جاتا۔ کہ انسان کے سب جسم میں شہوت ہے۔ اور جانور کے شرم گاہ میں بھی شہوت نہیں۔

اس لیے انسان ہر دن ہر وقت مجامعت کر سکتا ہے۔ مگر جانور مخصوص دنوں اور وقتوں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جانور شہوت رانی کے لیے شرم گاہ کی طرف جاتا ہے۔ مگر مرد بوس وکنار۔ یہاں تک کہ ہاتھ اور سینے کے لمس سے بعض کمزوروں کو انزال تک ہو جاتا ہے۔ اس لیے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور حنفی فقہاء بھی اپنے پر غیر مطمئن مرد کو حکم دیتے ہیں کہ روزے یا احرام کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ نہ لے، اور یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ کہ آنکھ زنا کرتی ہے۔ ہاتھ پیر وغیرہ زنا کرتے ہیں۔ یعنی حکمی اور حقیقی طور پر نہ کہ ظاہری، اور ظاہری زنا پر حد ہے نہ کہ باطنی پر۔ اتنے اختلافات اور فرق معلوم ہو جانے کے بعد اب جاننا چاہیئے کہ جانور یا انسان جب کسی مونث سے صحبت و مجامعت کرتا ہے۔ تو بذریعہ آلہ تناسل صرف مادہ منویہ منتقل ہوتا ہے۔ اور ہر حیوان کے اس مادے میں چار اشیاء ہوتی ہیں۔ آگ، ہوا، مٹی، پانی، انہی کو عناصر اربعہ کہتے ہیں۔ تمام مخلوقات علت انتفاعی کے لحاظ سے دو قسم کی ہے۔ ایک نفع لینے والی اور ایک نفع دینے والی، نفع دینے والی اور اور فائدہ مند مخلوق تو انہی عناصر اربعہ سے مکمل ہو جاتی ہے۔ اسے مزید کسی خلقت کی ضرورت نہیں لیکن فائدے لینے والی مخلوق جو کائنات میں صرف انسان ہی ہیں۔ اُن کی تکمیلِ خلقت کے لیئے عناصر اربعہ کے علاوہ اور بہت چیزیں درکار ہیں۔ اور چونکہ وہ اشیاء صرف آلۂ مخصوصہ سے منتقل نہ ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا صانعِ کائنات جلّ مجدہٗ نے تمام اعضائے انسانیہ میں وہ قوّت و دیعت و منتقل کرنے کی طاقت رکھ دی۔ اسی لیئے کوئی جانور ہاتھ پیروں کے اعتبار سے اپنے ماں باپ کے ہم شکل نہیں ہوتا بخلاف انسان کے کہ وہ ظاہر باطن میں اپنے ماں باپ دادا دادی نانا نانی کے ہم شکل ہوتا ہے۔ نسلی ظریف (مراثی) یا نسلی گوّیے کا بیٹا ظریف اور گوّیا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیئے شریعتِ اسلامیہ نے ازدواجی تعلّقات میں کفو اور خاندان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ کفو برادری کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ انسانی بولی کے علاوہ خوش گلوئی اور مذاقیہ ہونا عناصر اربعہ سے متعلق نہیں۔ نہ یہ مادہ منویہ سے پیدا ہوئیں۔ بلکہ یہ خصوصیات اور ذریعہ سے رحمِ مادر میں آئیں۔ اسی طرح عقل فہم اِدراک، شیطانیت، رحمانیت، علم، شعور، رحیمی کریمی جیسی تمام صفات باپ ہی کی طرف سے اولاد کو میسّر ہوئیں، مگر مادہ منویہ سے نہیں۔ بلکہ ہاتھ پیر کان ناک سینہ چہرہ سر دماغ نے بھی بیوی کی انہی اعضاء سے مجامعتِ باطنی کی تھی۔ اس تمام گفتگو سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ پیدائشِ خلق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ نسلِ انسانی چونکہ اشرف المخلوقات و موجودات سے فائدہ لینے والی تھی۔ اس لیئے اس کو باپ کی پشت سے عناصر اربعہ کے علاوہ بوقتِ جماع اور بھی ایسی نعمتیں ملیں۔ کہ جن کے ذریعے یہ دیگر اشیاء کو استعمال کر سکے۔ ہاتھ، پیر اور اعضاء

کو اگرچہ بطور آلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ فقط آلہ ہے۔ اسی طرح مدارس اور کتب علوم فقط آلہ ہیں۔ اصل علم تو پشت والد سے شکم مادر میں منتقل ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح طبیعت اور مشابہت بھی، چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۲ میں ہے: عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَلْحَسَنُ اَشْبَهُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ الصَّدْرِ وَالرَّأْسِ ۔ وَالْحُسَيْنُ اَشْبَهُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَا كَانَ اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ ؕ۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت حضرت حسن وحسین میں موجود تھی۔ کیونکہ آپ نانا ہیں۔ یہ مشابہت بذریعہ والدہ ملی۔ اور یہ مشابہت اسی لیے ہے کہ ہر عضو سے انتقال انسانی ہوتا ہے۔ چنانچہ خاوند بیوی کی آنکھوں کے ذریعے ہم شکلی منتقل ہوتی ہے۔ اگر خاوند بوقت صحبت بچشم خود بیوی کی طرف متوجہ ہو، تو اولاد بیوی یا بیوی کے والدین سے مشابہ ہوگی۔ اگر بیوی اپنے خاوند کو دیکھتی ہو تو اولاد خاوند کے مشابہ ہوگی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ششم صفحہ نمبر ۲۳۰ پر ہے: وَالصُّوَرُ الَّتِيْ تَشْهَدُ الْاُمُّ وَتَخَيَّلُهَا حَالَ الْمُوَاقَعَةِ لَهَا تَاثِيْرٌ عَظِيْمٌ فِيْ صُوَرِ الْوَلَدِ ؕ (ترجمہ) ماں بوقت جماع جس کی شکل دیکھتی ہوگی۔ اور جس کے خیال میں گم ہوگی اس کی ہم شکلی کا اثر ولد پر پڑے گا۔ ہر انسانی صحبت کے وقت آلہ تناسل سے تو عناصر اربعہ مخصوصہ باپ سے ماں کی طرف منتقل ہوئے۔ لیکن بوسے اور پیار سے نطق انسانی منتقل ہوا یہی وجہ ہے کہ بجز انسان کوئی بھی نفس ناطقہ سے یعنی عقل وشعور ادراک سے مزین نہ ہوا۔ نہ جن نہ ملک نہ جانور۔ چنانچہ کتاب تالیقات علی فصوص الحکم جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۶ پر ہے: وَلٰكِنَّ الرُّوْحَ الْاِلٰهِيَّ لَهٗ مَظْهَرٌ اٰخَرُ فِي الْاِنْسَانِ ۔ وَهُوَ النُّطْقُ ۔ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ لَيْسَ كَائِنًا حَيًّا حَسَّاسًا فَحَسْبُ بَلْ هُوَ كَائِنٌ نَاطِقٌ اَيْضًا ؕ۔ یعنی روح الٰہی کا مظہر انسان ہے اور وہ روح الٰہی نطق ہے اس لیے کہ انسان کے لیے اس روح کے بغیر فقط حی اور حساس ہونا کافی نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ ناطق بھی ہو۔ بوقت صحبت ہاتھ کے مس سے قوت لامسہ اور شباہت ید کا انتقال ظاہر ہوتا ہے۔ پسلیوں کے جڑنے سے روح انسانی کا دخول ہوتا ہے۔ جو پہلے قلب مادر میں ٹھہری رہتی ہے۔ رانوں کے ملاپ سے نفس امارہ منتقل ہوتا ہے۔ کہ یہی شیطان کا مقام ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجامعت کے لیے کپڑے اتارنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ اور اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے تاکہ شیطان اور شیطانی اثرات دور ہو جائیں۔ آنکھوں کے تعلق سے شرم وحیا اور ہم شکلی منتقل ہوتی ہے۔ آنکھیں بھی روح خیالی کے دخول وخروج کا راستہ ہیں۔ سینے کے مس سے کیفیات قلبیہ کا انتقال ہے۔ اسی سے شباہت صدری کا بھی حصول ہے۔ پیشانی کے قرب اور ملاپ سے نفس مطمئنہ ضمیر انسانی کا دخول ہے۔ کہ یہ ہی

نورمعرفت کا مقام اول ہے۔ غرض کہ سارا خاوند ساری بیوی سے دخول کرتا ہے جیسے کہ آئینے کے سامنے مرد شبیہی طور پر آئینے میں داخل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلْاِنْسَانُ مِرْاٰةُ الْاِنْسَانِ انسان انسان کا آئینہ ہے۔ فصوص الحکم میں ہے:۔ کَذَالِکَ الْاِنْسَانُ هُوَ الْعَجَبُ الَّذِیْ یُبْصِرُ الْحَقَّ بِهٖ نَفْسَهٗ اِذْ هُوَ مِرْاٰتُهٗ پھر جس طرح اس رب کریم خلاق اعظم سبحانہ نے جانوروں میں اتنے تخلیقی اختلافات کے باوجود سراسر اس کی کروڑہا حکمتوں پر مبنی ہیں۔ جن تک عقل تو درکنار شعور انسانی تک کو پہنچ نہیں۔ مزید خلقت انسانی میں فرق فرمائے۔ پھر انسانوں میں کافر مومن، ولی صحابی اور نبی میں بہت عظیم فرق کیئے گئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔ شعر

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

آں خورد گردد پلیدی زو جدا ۔۔۔۔۔ ایں خورد گردد ہمہ نور خدا

تو بھلا اس رب العزت نے اپنے حبیب سرور انبیاء کرام آقائے دوعالم۔ عرش و فرش کے عطائی مالک جنت و دوزخ کے مختار کی خلقت مبارکہ میں کیا کچھ امتیازات نہ کئے ہوں گے۔ جب انسان کی ادنیٰ اشرفیت کی وجہ سے تمام مخلوق نسل انسانی کو پیدائشی طور پر ایک علیحدہ مقام سے نوازا۔ تو کس طرح ہو سکتا تھا۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خلقت وولادت اور انتقالات عام انسانوں کی طرح ہوں، ہرگز نہیں۔ بلکہ بقول حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ:۔ شعر

خُلِقْتَ مُبَرَّءً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ ۔۔۔۔۔ کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

ترجمہ:۔ اے پیارے نبی آپ تمام مخلوق سے مختلف ہو کر ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے۔ گویا کہ آپ سے پوچھ پوچھ کر آپ کو بنایا گیا ؛ عام انسان مومن جب صحبت کرتا ہے تو پیشانی کے لمس سے نفس مطمئنہ منتقل ہوتا ہے۔ لیکن والدین انبیاء کرام کی پیشانی سے بوقت مقاربت مبارکہ نفس الٰہی یا روح الٰہی کا انتقال ہوتا ہے۔ اگر وہ باپ کے واسطے سے ہے تو نفس الٰہی اور اگر حضرت جبرائیل کے واسطے سے ہو۔ نور روح الٰہی اور اگر بلا واسطہ خود رب کریم کی طرف سے وارد ہو تو عین نور اسی لیئے حضرت آدم صفی اللہ اور حضرت عیسیٰ روح اللہ ہوئے۔ یہ دو واسطے نشان قدرت ہیں۔ مگر پہلی صورت قانون قدرت ہے اسی کو نور اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ باپ کی پیشانی سے والدہ کی پیشانی میں دخول کرتا ہے۔ بجز انبیاء کے کسی کو نہیں ملتا۔ اسی لیئے انبیاء نور ہیں۔ اور والدین انبیاء مومن ہیں۔ نہ انبیاء غیر نور ہو سکتے ہیں، نہ انکے والدین غیر مومن۔ تعلیقات علی فصوص الحکم جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳۲ پر ہے :۔ وَلٰکِنَّ النَّفْسَ الْاِلٰهِیَّ وَالرُّوْحَ الْاِلٰهِیَّ نُوْرَانِیٌّ (ترجمہ) لیکن نفس الٰہی اور روح الٰہی ہر دو نوری ہیں۔ یہ انبیاء

کی روحوں کی شان ہے۔ دیگر انسانوں، حیوانوں کی ارواح نار ہیں۔ کتنا عظیم فرق ہے۔ چنانچہ حاشیہ قاشانی صفحہ نمبر ۲۷۱ پر ہے:۔ فَظَهَرَ اَنَّ الرُّوْحَ يَتْبَعُ فِي الظُّهُوْرِ لِلنَّشْاَةِ فَكَانَ فِي النَّشْأَةِ الطَّبِيْعَةِ نُوْرًا كَمَا فِي الْمَلَآئِكَةِ وَنَارًا كَمَا فِي الْاِنْسَانِ ط ترجمہ پس ظاہر ہوا کہ روح ظہور میں خلقت کے تابع ہوتی ہے پس روح خلقتِ ادلی میں نور رہے۔ جیسے ملائکہ میں اور انسانوں میں نار ہے۔ روحِ اوّل جس کو منطقی لوگ عقلِ اوّل کہتے ہیں نورِ محمدی ہے صَلَّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم اسی کا سب سے اونچا مقام ہے۔ یہی نور سب سے پہلے پیشانی آدم میں خود باری تعالیٰ عز اسمہٗ نے اپنے دستِ قدرت سے رکھا۔ کہ ارشاد ہے:۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ط اسی کو ملائکہ سے سجدہ کرایا گیا۔ کہ ارشاد ہوا:۔ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ ط جھکتے ہوئے گر جاؤ۔ اس کو سجدہ کرتے ہوئے۔ یہی نور منتقل ہوتا ہوا حضرت عبداللہ کی پیشانی میں آیا۔ اور وہاں سے منتقل ہو کر پیشانی آمنہ میں دخول کیا رضی اللہ تعالیٰ عنہما چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْنَ بخلاف دیگر انسانوں کے کہ ان کی ارواح آگ کی ہیں۔ چنانچہ شرح قاشانی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۷۱ پر ہے:۔ فَكَانَ رُوْحُ الْاِنْسَانِ نَارًا لِاَجَلِ نَشْأَتِهٖ اَيِ الرُّوْحُ الْحَيْوَانِي الَّذِيْ بِهٖ حَيَاةُ الْبَدَنِ ط (ترجمہ) پس روحِ انسانی جس سے اس کے بدن کی بقاء اور حیات ہے وہ ناری ہے خلاصۂ کلام کا یہ ہے کہ روح چار قسم کی ہے۔ (۱) نفسِ الٰہی (۲) روحِ الٰہی مَلَکِیَّۃ (۴) روحِ ناری۔ جس کو روحِ قائم بھی کہتے ہیں۔ جسمِ پاکِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ چاروں روحیں عطا ہوئیں۔ بعض انبیاء کو صرف نفسِ الٰہی اور روحِ قائمہ اور بعض کو روحِ الٰہی اور قائمہ۔ دیگر انسانوں کو روحِ ملکی اور قائمہ۔ جانوروں کو فقط روحِ قائمہ عطا ہوئی۔ حرامی ولد الزنا کو بھی فقط روحِ قائمہ ملتی ہے روحِ ملکی سے حرامی اولاد کو نہیں نوازا جاتا۔ نہ وہ مشاہدۂ تجلیات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے حرامی شخص متقی اور ولی نہیں بن سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَاَعْظَمُ الْوُصْلَةِ اَلنِّكَاحُ اَيِ الْجِمَاعُ الْحَلَالُ وَهُوَ بِالنِّكَاحِ اَوِ الْمِلْكِ اِذْ يَدُوْنُهُمَا لَا رُوْحَ لَهٗ فَلَا يُشَاهِدُ الْحَقَّ اَبَدًا - لِذٰلِكَ حَرَمَ الزِّنَا فِيْ جَمِيْعِ الْاَدْيَانِ ط۔ (قاشانی) ترجمہ سب سے بڑا وصل نکاح یعنی حلال صحبت سے ہوتا ہے۔ اور حلال صحبت لونڈی یا بیوی سے ہوتی ہے۔ اس کے بغیر روحِ ملکی حاصل نہیں ہوتی۔ پس وہ شخص تجلیاتِ حق کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اس لئے ہر دین میں زنا حرام ہے۔ خیال رہے کہ روحِ قائمہ سے اجسامِ کثیفہ یعنی مخلوق کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اور روحِ ملکی سے مشاہدۂ تجلیاتِ ربانی ہوتا ہے۔ جس سے ولایتِ کاملہ اور درجۂ ملائکہ حاصل ہوتا ہے اور روحِ الٰہی سے اسرارِ قدرت کا نظارۂ ابدی حاصل ہوتا ہے۔ جو انبیاء کا خاصہ ہے۔ اور نفسِ الٰہی سے ذاتِ خالق کا دیدار ہوتا ہے۔ جو صرف

محمد مصطفیٰ کا خاصہ ہے۔ یہ روح نور اول سے تعبیر ہے یہی پیشانی حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منتقل ہو کر بطن آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں جلوہ گر ہوا۔ تمام ارواح چہرے کے راستے دخول بطن کرتی ہیں۔ مگر نفس الٰہی ماتھے سے اور روح الٰہی اگر باپ کے واسطے سے ہو تو ماتھے سے۔ اگر بلا واسطہ ہو تو گریبان کی حبل ورید کے ذریعے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہی روح دستِ قدرت سے بسبب جبرائیل عطا ہوئی اسی لیے آپ کا لقب روح اللہ ہوا۔ اور آپ سے خدائی کاموں کا ظہور ہوا۔ خود فرماتے ہیں کہ اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ ط (ترجمہ) : میں تمہارے سامنے پرندے کی مثل پیدا کر دوں گا۔ یہ روحِ الٰہی ہے۔ مگر نفسِ الٰہی کا نام روح محمدی ہے۔ یہ ایک بے مثل ذات کی بے مثل مخلوق ہے۔ یہ سب سے اول عینِ ذاتِ باری سے اور تمام مخلوق عین اس سے چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دوم صفحہ نمبر ۳۷۱ پر ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ارشاد فرماتے : کہ اَنَا مِنَ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ مِنِّیْ ط ۔ میں اللہ سے ہوں اور تمام مخلوق مجھ سے ہے۔ اسی روحِ محمدی سے عرش بنا۔ چنانچہ علامہ قاشانی نے اپنی شرح کے صفحہ نمبر ۲۷۵ پر فرمایا : فَاِنَّ الْعَرْشَ مَخْلُوْقٌ مِّنَ الْعَقْلِ الْاَوَّلِ الَّذِیْ هُوَ رُوْحُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ ط (ترجمہ) ۔ کیونکہ عرش مخلوق ہے۔ اسی عقل اول سے جو روحِ محمدی ہے صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ عَلَى النَّبِیِّ ثابت ہوا کہ نور محمدی پیشانی کے ذریعہ دخول ہوا چنانچہ تفسیر روح البیان دوم نے صفحہ نمبر ۳۷۲ پر اس کی مختصر تفصیل بیان کی ہے۔ بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت عیسیٰ کو روح الٰہی عطا ہوئی۔ (ابن مریم علیہ السلام) ۔ اسی طرح غوث پاک عبدالقادر جیلانی کو روح محمدی عطا ہوئی۔ وہ بھی بلا واسطہ یہ بھی بلا واسطہ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا لقب روح اللہ ہوا۔ آپ کا لقب روح محمدی۔ جب حضرت مسیح پر روح الٰہی کا غلبہ ہوتا تو آپ کے دہن پاک سے اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ کا نعرہ نکلتا۔ اور اس کا ظہور بھی ہوتا۔ اسی طرح عبدالقادر جیلانی پر روحِ محمدی کا غلبہ ہوتا۔ تو زبانِ مبارک سے ایسے کلمات نکلتے۔ کہ میں نے حضرت نوح کی مدد کی۔ اور میں نے حضرت ابراہیم کو آگ سے بچایا۔ جس کو کسی نے قصیدہ روحی کے اشعار میں جمع کیا۔ اور ایسے قصیدے کا کھلنا چھپانا پڑتا گناہ ہے کیونکہ اسرار الٰہیہ ہیں۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ کی اپنی آواز تھی اور نہ یہ عبدالقادر جیلانی کی۔ بلکہ وہ روح الٰہی کی آواز تھی۔ اور یہ روحِ محمدی کی۔ اور جس طرح اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ کہنے کے باوجود نہ حضرت عیسیٰ کو خالق کہہ سکتے ہیں۔ نہ سب انبیاء سے افضل۔ اسی طرح نہ غوث اعظم کو نبی کہہ سکتے ہیں۔ نہ صحابہ تابعین سے آپ کا مقام و درجہ زیادہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو مقام ہیں۔ ایک مقامِ روح اللہ ایک مقام نبی اللہ۔ اسی طرح حضرت غوث پاک کے بھی دو مقام ہیں۔ ایک مقامِ قطبیت جو ازل میں رسول اللہ کی معرفت آپ کو حاصل ہوا۔ اور جو درس گاہِ محمدیہ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ

سے بعد حصولِ علومِ لدنیہ عطا ہوا۔ جس کی طرف خود قصیدۂ غوثیہ میں اشارہ ہے۔ کہ دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰی صِرْتُ قُطْبًا میں نے اتنا علم پڑھا کہ میں قطب ہو گیا۔ دوسرا مقام۔ مقامِ غوثیت۔ مقامِ قطبیت کی وہ آواز تھی۔ جو قصیدہ روحی میں تھی۔ جس لحاظ سے آپ اوّلین و آخرین اولیا کے سردار ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر اسی مقامِ قطبیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ ؎ غوث اعظم درمیانِ اولیاء ۔ چوں جنابِ مصطفٰے درانبیاء

اعلیٰ حضرت مجدد ملت مأتہ حاضرہ کا شعر مذکورۃ الذیل بھی اسی طرف مشیر ہے۔ جو ولی قبل تھے یا بعد ہوئے یا ہوں گے۔ سب ادب رکھتے ہیں دل میں میرے آقا تیرا۔ یہاں اولیاء قبل سے مراد صحابہ وغیرہ نہیں بلکہ اولیاء بنی اسرائیل مراد ہیں۔ اور ادب سے مراد شفقت و پیار بھی ہوتا ہے (دیکھو مرقات شرح مشکوٰۃ کتاب الادب) دوسرا مقام غوثیت۔ جس کے لحاظ سے آپ کا درجہ اپنے مشائخ اور اساتذہ علوم ظاہرہ اور داتا گنج بخش وغیرہ اکابرِ دین کے بعد ہے۔ اسی طرف حضرت مجدد الف ثانی کا یہ قول اشارہ کرتا ہے کہ حضرت عبدالقادر جیلانی کا مرتبہ فقط بعد والے اولیاء اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ ہے آپ کا مقامِ غوثیت مجدد صاحب کو سرکار بغداد کے مقامِ اعلیٰ تک پہچان نہیں ہوئی۔۔۔۔۔

حضور غوث پاک کا مقام قطبیت ہی روح محمدی ہے۔ کیونکہ محمدی قطبیت اول ہے چنانچہ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتوحات مکیہ باب نمبر ۲۷۰ صفحہ نمبر ۵۶۶ پر فرماتے ہیں۔ کہ عالم کا قطب اول مخلوقات سے چار کروڑ سال پہلے پیدا ہوا۔ اور یہی قطب تمام انبیاء کی امداد فرماتا ہے۔ اسی قطب اوّل سے تمام مخلوق پیدا ہوئی۔ اسی قطب اول کا نام روح محمدی ہے۔ ابن عربی کے کلام اور ان روایات مبارکہ کا موازنہ کرو۔ جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خلقت سے متعلق صحابہ کرام کے سامنے مختلف الفاظ میں بیان فرمائیں۔ تو ایک ہی مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہی روح محمدی حضور غوث پاک میں بلاواسطہ ودیعت ہوئی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ میں روح اللہ۔ خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ روح اور نور نطفۂ مخصوصہ کے ذریعے منتقل نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی بالواسطہ والد کی پیشانی سے منتقل ہوتا ہے۔ جیسے تمام انبیاء اور خصوصاً حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نور حضرت عبداللہ کی پیشانی سے منتقل ہوا۔ چنانچہ علامہ نبہانی فرماتے ہیں۔ یَتَنَقَّلُ نُوْرُ النَّبِیِّ مِنَ الْجَبِیْنَۃِ اِلَی الْجَبِیْنَۃِ سب سے پہلے یہ نور پاک پیشانی حضرت آدم میں منتقل ہوا۔ اور کبھی یہ نور بلا واسطہ منتقل ہوتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ میں روح اللہ اور غوث پاک میں روح محمدی کا انتقال اسی روح محمدی کی طرف قصیدۂ غوثیہ کا یہ شعر اشارہ کرتا ہے:۔ ؎ دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰی صِرْتُ قُطْبًا!

یہاں قطب سے مراد یہی روحِ محمدی ہے۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ط وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

کافر کی قسمیں اور مرزائیوں کو کیوں اقلیت قرار دیا گیا

سوال نمبر ۱۸ :- کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلے میں کہ آج احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے کل شیعوں کو کافر قرار دینے۔ اور پرسوں وہابیوں کو مرتد قرار دینے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، مسلمانوں کے تمام فرقے اہلِ قرآن، اہلِ حدیث، اہلِ سنت، دیوبندی، اہلِ سنت والجماعت بریلوی، شیعہ و شیعہ اسماعیلی، پرویزی، مودودی وغیرہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور ہر ایک دوسرے کو بدعتی، مشرک، منافق، کافر، مرتد، قابل گردن زدنی وغیرہ سمجھتے ہیں۔ تو پھر قادیانی فرقہ کے جرم کی نوعیت کیا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی نے کئی جگہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی ہے مثلاً ؎

وہ پیشوا ہمارا جس کا ہے نور سارا | بعد از خدا بعشقِ محمد مخمرم
نام اس کا ہے محمد دلبر میرا وہی ہے | گر کفر است ایں بخدا سخت کافرم

ما مسلمانیم با فضلِ خدا
مصطفیٰ مارا امام و پیشوا

ہمت او خیر الرسل خیر الانام | ہم تو رکھتے ہیں مسلمانوں کا دین
بر نبوت را بر و شد اختتام | دل سے ہیں خدام ختم المرسلین

تم ہمیں دیتے ہو کافر کا خطاب!
کیوں نہیں آتا تمہیں خوفِ عذاب

اس لئے لاہوری مرزائی مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ بلکہ سنیوں کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں لہٰذا فرمایا جائے۔ کہ کیا وجہ ہے مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی اور اگر باری باری وہابی شیعہ کو اقلیت قرار دیا گیا۔ تو کون مسلمان رہے گا:۔

السائل :- محمد انور آفیسر مسلم کمرشل بینک منگلا کالونی براستہ دینہ ضلع جہلم

الجواب بعونِ العلامِ الوہّابِ

قانونِ شریعت کے مطابق کافر دو قسم کے ہیں: (۱) کافر عند اللہ (۲) کافر عند الشریعت: وہ لوگ جو عند الشریعت کافر نہیں مگر عند اللہ کافر ہیں۔ جیسے بعض دیوبندی اور بعض شیعہ، چکڑالوی اور اہلِ قرآن وغیرہ اُن کے متعلق شریعت کا حکم اور قانون دوسرے کفار کے قوانین اور احکام سے مختلف ہیں۔ اور مندرجہ ذیل چند قوانین کی بنا پر ان پر شرعی فتوے کی نوعیت کچھ اس طرح ہوگی (۱) شرعاً ان کو اجتماعی طور پر کافر نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ ہر شخص کی علیحدہ علیحدہ کفرِ لزومی کی تحقیق ہوگی (۲) شرعی طور ان کو قومی کافر نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ بعد تحقیق اگر کسی بات سے کفر ثابت ہو۔ تو اُن کو انفرادی طور پر کافر کہا جائے گا۔ نہ کہ اجتماعی ۔ (۳) یہی وجہ ہے کہ اُن کو کسی بھی دارالاسلام میں اقلیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اقلیت صرف اجتماعی اور قومی کافروں کے لیے ہوتی ہے۔ (۴) اس قسم کے کافر کے ہر لفظ پر شرعی طور پر مفتیِ اسلام خوب غور و فکر اور علمی تحقیق کرے گا۔ اگر ایسے شخص کے بولے ہوئے لفظ پر کوئی پہلو اسلام کا نہیں نکلتا۔ ہر طرف سے کفر ہی ثابت ہوتا ہے۔ تب اس کے لیے انفرادی طور پر فتوای کفر جاری کیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص اپنے آپ کو دیوبندی یا شیعہ یا وہابی یا چکڑالوی یا پرویزی کہتا ہے۔ تو اس وقت یہ لفظ کہنے سے ہی اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اس کے عقائد اُس کے منہ سے سُنے جائیں گے۔ اور پھر وہ عقائد اگر شرعی طور پر صرف کفر ہی ثابت ہو۔ تو اس کو شرعاً کافر کہہ دیا جائے گا۔ دینِ اسلام کے تمام فرقوں کا یہی حکم ہے۔ اس لیے مرد دیوبندی یا شیعہ یا دیگر فرقہائے باطلہ کو اجتماعی طور پر کافر نہیں کہا جا سکتا۔ بخلاف دیگر کفار کے کہ وہ لوگ شرعی کافر ہیں شرعی کافر اجتماعی اور قومی کافر ہوتا ہے۔ ایسے کافروں کے عقائد اور الفاظ کی تحقیق یا تفتیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ قومیت کے لحاظ سے کافر ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنے آپ کو ہندو، سکھ، عیسائی یا یہودی کہتا ہے۔ تو اِس اقرار سے ہی اس پر کفر کا فتوای جاری کر دیا جائے گا۔ وہاں لفظی چھان بین نہ ہوگی۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صفحہ ۲۷۹ پر ہے: ۔

مُسْلِمٌ قَالَ اَنَا مُلْحِدٌ یَکْفُرُ (ترجمہ): ۔ مسلمان نے کہا میں ملحد ہوں اتنا کہتے ہی کافر ہو جائے گا۔ ایسے کفار کو اقلیت قرار دیا جاتا ہے۔ ہر دو کفر میں مندرجہ ذیل تین بنیادی اصول ہیں

(۱) نبوت ٭ (۲) کتاب ٭ (۳) شریعت ٭

موجودہ دور کے مرزائی لاہوری ہوں یا قادیانی، ان تین اصول کی بنا پر قومی اور اجتماعی کافر ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ اسلامی فرقوں میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے حق مسئلہ یہ ہے کہ ان کو مرتد قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ان کا کلمہ پڑھنا بھی شرعی طور پر منافقت ہے۔ نہ کہ اسلام اور منافق کافر مطلق ہوتا ہے۔ نہ کہ مرتد بے دین

بدیں وجہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جانا شرعی حکم ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق کہ جس کی بنا پر یہ اسلامی فرقوں سے ممتاز ہیں۔ قادیانی فرقہ مرزے کو نبی اور اس کی تصنیفات کو اللہ کی وحی اس کے اقوال بے ہودہ کو نئی شریعت مان کر کافر شرعی ہوئے۔ اور لاہوری فرقہ مرزا غلام احمد جیسے کافر کو جس کو شرعی مرتد کی حیثیت حاصل ہے:۔ مسلمان کہہ کر کافر ہوئے۔ مرزا غلام احمد کا کفر اور ارتداد ان ہی تین مندرجہ بالا بنیادی اصول سے ہے۔ کہ اس نے پہلے اپنے آپ کو صحیح شرعی مسلمان بنا کر پھر اپنے لیے نبوت نئی کتاب اور نئی شریعت کا دعوے کیا۔

مرزا غلام احمد کا نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی کچھ نعتیں لکھنا۔ اس کے اسلام کی سند نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ ہمارے آقا دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعتیں تو ہندوؤں، سکھوں نے بھی لکھیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ :۔

کتبہ

*

کتاب الجنایات

مجرموں اور ان کی اسلامی سزاؤں کا بیان اور ناسخ منسوخ آیتوں کی فہرست

سوال ع ۱۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ آج سے چند دن پیشتر ہمارے پاس ایک رسالہ بنام بلاغ القرآن پہنچا جس کے چند صفحات پر شریعت کے ایک بہت عظیم قانون کے خلاف قلم اٹھایا گیا ہے۔ اور لکھا گیا ہے کہ زانی کو رجم کرنے کی سزا اسلام کے خلاف ہے۔ ایم آئی چوہدری ایڈووکیٹ لاہور نے گیارہ دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنگسار کرنا شرعی حد نہیں ہے۔ اور اس تحریر کو فاضل وفاقی شرعی عدالت نے بارہ نومبر ۱۹۸۰ء کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ۲۱ مارچ ۱۹۸۱ء کو ایم آئی چوہدری مذکور منکر احادیث پرویزی چکڑالوی کے حق میں رجم کے خلاف اپنا فیصلہ صادر فرما دیا ہے ایم آئی چوہدری کے گیارہ دلیل مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی دلیل:۔ پرویزی کہتا ہے۔ کہ زانی اور زانیہ خواہ کنوارے ہوں یا شادی شدہ ان کی حد شرعی صرف سو کوڑے ہر قسم کے زانی کی مکمل حد ہے۔ دلیل میں یہ آیت پیش کرتا ہے۔ الآیۃ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ

جَلدَۃ:- **دوسری دلیل**:- قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ اور ناسخ نہیں ہوسکتی۔ اور یہ سزا یعنی سو کوڑے، ہر قسم کے زانی کی مکمل حد ہے۔ دلیل میں یہ آیت پیش کرتا ہے۔ سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِیْهَآ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ (الآیۃ)
اس آیت کا ترجمہ اور مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو حدِ زنا کی بیان فرمادی وہی مکمل برحق ہے۔ جو زنا کی حد سنگساری کو بیان کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ **تیسری دلیل**:- چکڑالوی پرویزی کہتا ہے۔ کہ سنگساری سے موت واقع ہوجاتی ہے حالانکہ قرآن مجید نے زانی اور زانیہ کو زندہ رہنے اور نکاح کرنے کا حق دیا ہے۔ دلیل میں یہ آیت پیش کرتا ہے:- اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَۃً " زانی زانیہ سے ہی نکاح کرے یہاں بھی الزانی مطلقاً ہے۔ کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی۔ اور نکاح کا بھی حکم دیا جارہا ہے۔ اگر کسی زانی کی سزا رجم ہوتا۔ تو نکاح کا تذکرہ نہ ہوتا۔ **چوتھی دلیل**:- مخالف کہتا ہے۔ کہ قرآن مجید میں زنا کو فاحشہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:- لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَۃً (الآیۃ)۔ زانیہ کی سزا کے لیے قرآن کریم میں لفظِ عذاب آیا ہے لہٰذا لکھا ہے فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ سورۂ نسا آیت ۲۵ اور سورۂ نور میں بھی زنا کی سزا کے لیے عذاب کا لفظ ارشاد ہوا ہے۔ لکھا ہے۔ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ آیت ۲ پس ثابت ہوا کہ سزا کو عذاب کہا جاتا ہے۔ اور رجم کا نصف ہوسکتا نہیں لہٰذا کوڑوں کی سزا ہی مراد ہے اور زنا کی سزا صرف کوڑے ہی ہیں خواہ زانی زانیہ کنوارے ہوں یا شادی شدہ یا مُتوفّٰی زَوجُها۔ اور بیوہ۔ رنڈوا۔ **پانچویں دلیل**:- سارے قرآن مجید میں رجم کا کہیں ذکر نہیں۔ ہاں کوڑوں کا ذکر بالکل صاف صاف ہے۔ اور جس طرح سورۂ نساء میں آیت ۲۵ کے اندر سزاءِ زنا کا نصف ہوجانا مذکور ہے اسی طرح سورۂ ۳۳ احزاب آیت ۳۰ میں سزا کا دگنا ہونا مذکور ہے۔ لہٰذا لکھا ہے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا۔ ترجمہ:- اے نبی کی بیویو۔ جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بدکاری کرے۔ تو اسے دگنا عذاب دیا جائے گا۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ اس آیت میں بھی زنا کے لیے فاحشہ اور سزا کے لیے عذاب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بیوی شادی شدہ ہی ہوتی ہے اور رجم کی سزا دگنی نہیں ہوسکتی کیونکہ رجم میں موت واقع ہوجاتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ زانیہ و زانی شادی شدہ بھی ہوں تب بھی ان کی سزا کوڑے ہی ہیں۔ کیونکہ کوڑوں کی سزا آدھی بھی ہوسکتی ہے۔ اور دگنی بھی۔ **چھٹی دلیل**۔ نبی کریم نے ساری زندگی کبھی رجم کی سزا نہ دی۔ کیونکہ نبی پاک قرآن پاک کے حکم پر عمل کرانے اور کرنیکے شرعی پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے۔ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (ترجمہ) :- اے صاحبِ قرآن۔ لوگوں میں اس کتاب کے ساتھ فیصلے فرمائیے۔ اور یہ بات شک سے پاک ہے کہ نبی کریم پر صرف قرآن ہی نازل ہوا۔ ثابت ہوا کہ رجم زانی ہرگز سنتِ رسول نہیں بلکہ خلافِ قرآن۔ خلافِ اسلام اور خلافِ رسولِ مقبول ہے۔ اور بناوٹی حدیثوں کے ذریعے نبی کریم کی طرف غلط منسوب ہے:-

ساتویں دلیل:- رجم کی سزا بہت بعد کی ایجاد ہے۔ قرآن مجید میں بِسْمِ اللہ سے لے کر والناس کی

کی سین تک کہیں رجم کا ذکر تو درکنار اشارہ بھی نہیں۔ اگر زنا کی سزا کسی کے لیے رجم ہوتی تو لکھنے میں وضاحتاً یا اشارۃً کس کی شرم تھی۔ اور کیوں نہ لکھی گئی۔ اور یہ کہنا کہ رجم کی آیت لفظاً تلاوتاً منسوخ ہے حکماً باقی ہے۔ یہ کذب ہے اور قرآن کریم کے خلاف کھلی سازش ہے۔ قرآن کریم کی سب آیات محکم ہیں کوئی منسوخ نہیں وہ آیت مَا نَنْسَخْ۔ والی جس سے مخالفِ قرآن لوگ منسوخ مانتے ہیں وہاں شیطانی آیت مراد ہیں مِنْ آیَةٍ میں تنوین عوض کی ہے اور مضاف الیہ شیطان ہے۔ اصل میں آیت اس طرح تھی مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیٰتِ الشَّیْطٰنِ (الخ) **آٹھویں دلیل**:۔ اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ سارے قرآن میں کہیں بھی رجم کا ذکر نہیں۔ نہ زانی کے لیے نہ کسی اور مجرم کے لیے۔ پس ثابت ہوا کہ سنگساری کا تعلق قرآنی آیت سے کسی طرح نہیں۔ **نویں دلیل**:۔ سنگساری اور رجم کرنا۔ ظالمانہ بے رحمانہ۔ اور گمراہ قوموں اور شیطانی عمل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں رجم کا ذکر ہے تو وہ کافروں کا شیطانی کام بتایا گیا ہے۔ کہ کفار نے انبیاء کو رجم کرنے کی دھمکیاں دیں۔ دیکھو آزر کا قول حضرتِ ابراہیم کو ۱۹/۴۶ سورہ یٰسٓ میں چند رسولوں کو کفار کی دھمکی ۱۸/۳۶۔ اصحاب کہف کا اندیشہ ۱۸/۲۰-۱۹ اور ۱۱/۹۱ میں حضرتِ شعیب کو کفار کی یہی رجم سنگساری کی دھمکی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ جس کام کو قرآن مجید نے خالص کافروں کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ ہر دور میں شیطانی عمل ہو سکتا ہے۔ نبی تو درکنار عام مومن بھی ایسا ظالمانہ شیطانی عمل نہیں کر سکتا ہے۔ **دسویں دلیل**:۔ چونکہ سارے قرآن میں کہیں بھی زنا کی سزا قتل یا رجم کی موت نہیں لہٰذا رجم کی موت قتلِ ناحق ہے اور قتلِ ناحق بحکمِ قرآنی حرام ہے۔ لہٰذا پہلی آیت ۳۳/۱۷ سورہ اسراء وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ اسی طرح آیت ۱۵۱/۶ سورہ انعام میں ہے۔ اللہ نے مومنوں کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ وہ شرک نہیں کرتے نہ کسی کو ناحق قتل کرتے ہیں۔ نہ زنا کرتے ہیں۔ سورہ فرقان آیت ۶۸/۲۵ قتل صرف قتل کے بدلے ہوتا ہے۔ قرآنی فیصلہ ہے۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ (ترجمہ):۔ جان صرف جان کے بدلے ہے۔ چونکہ زانی نے کسی کو قتل نہیں کیا ہوتا اس لیے یہ کہنا کہ رجم سنتِ رسولِ مقبول ہے سراسر بہتانِ عظیم ہے۔ **گیارھویں دلیل**۔ اللہ تعالیٰ زانیوں کو زندہ رہنے۔ توبہ کرنے۔ اور اصلاح کا حق عطا کرتا ہے۔ مگر رجم یہ سارے حقوق ختم کرتا ہے۔ سورۂ فرقان آیت ۲۵/۶۸ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا اور ۷۰ آیت ۶۹ میں:۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ ۔ اور وہ لوگ زنا نہیں کرتے۔ اور جو زنا کرے وہ گناہ میں جا پڑا مگر جو توبہ کرے اور ایمان لایا اور نیک کام کیے سو وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ ثابت ہوا کہ زنا کے بعد بھی زندہ رکھا جائے گا تاکہ وہ توبہ اور اچھے عمل سے اچھے بن کر زندہ رہیں۔ لیکن رجم میں یہ مہلت ان کو نہیں ملتی۔ یعنی سزاء زنا کے بعد بھی ان کو توبہ کی مہلت ملتی ہے۔ مگر وفاقی شرعی عدالت نے رجم کا آرڈیننس جاری کر کے قرآنی احکام اور منشاءِ خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ تھے دلائل جو لاہور کے ایک منکرِ حدیث چکڑالوی پرویزی وکیل ایم آئی چوہدری نے وفاقی عدالت میں پیش کیے اور شرعی لاہوری عدالت نے مکمل سماعت کے لیے منظور کر کے

پانچ ججوں کے سپرد کیا جنہوں نے ۱۸-۳-۸۱ کو تین ججوں کے اتفاق سے ایم آئی چوہدری کی بات مانتے ہوئے رجم اسلامی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن دو ججوں نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ مسلمانوں کو اس غلط فیصلے سے سخت اضطراب ہے لہٰذا بحیثیت مفتی اسلام ہونے کے ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ ہم کو جلد از جلد شرعی قانون سے آگاہ فرمائیں:۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا:۔

سائل:۔ شہباز گل پاشا۔ سیئ ڈاک خانہ گجرات و متعلم مدرسہ مسجد میاں جلال ۲-۸-۸۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ رَءُوْفِ الرَّحِیْمِ اَمَّا بَعْدُ:۔ جاننا چاہیے کہ تاریخ کے ورقوں سے یہ بات ثابت و ظاہر ہے کہ ہر دور میں دینِ اسلام کی سنگلاخ چٹانوں سے شر انگیز و خباثت کی طوفانی لہریں ٹکراتی ہی رہیں۔ باطل کی پھونکوں حق کی شمعوں کا مقابلہ فکر و نظر ہوتا ہی چلا آرہا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھا ہی جاتا رہا کہ سلاطینِ عالم اور حکام دنیا کی آغوشِ شفقت و حمایت ہمیشہ باطل نظریات کے لیے کشادہ ہوتی ہی رہی۔ اور بڑی بڑی بادشاہتوں نے جہالت و بطالت کی پشت پناہی کی۔ اہل حق اور ان کی حقانیت سے ان مادہ پرست بڑوں نے ہمیشہ روگردانی کی۔ معتزلہ، خوارج و روافض کے ابتدائی دور اس پر شاہد ہیں۔ تاریخی نمونہ ہمارے پاکستان کے ابتدائی دنوں سے اب تک دیکھنے میں آرہا ہے۔ حالانکہ یہ ملک بالکل ہی نظریاتی ملک ہے۔ اس کی تو جڑیں بنیادیں ہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ اس کا تو پہلا نعرہ ہی نظامِ قرآن و حدیث ہے۔ اس کے لیے کسی باطل فرقے کی انگلیاں نہ کٹیں۔ ہاں اس عظیم الشان مقصد والی سلطنت پر باطل کی انگلیاں ضرور ہی اٹھتی رہی۔ مگر اس کی جڑوں کو حیاتِ جاودانی بخشنے کے لیے اپنے اور اپنے پھول جیسے بچوں کے خون کے نذرانے صرف انہی نے پیش کیے جو قرآن و حدیث دونوں کے باادب اور دونوں کو ایک عدلیہ میں رکھنے والے تھے۔ جن کا ایمان اسی حقیقت پر تھا کہ حدیث مطہرات کے بغیر قرآن مجید کا قانون نافذ ہی نہیں ہو سکتا۔ جو اگر قرآن پاک کو ایمان کا ایک بازو سمجھتے تھے تو حدیثِ پاک تو دوسرا بازو۔ انہی لوگوں نے پاکستان کے بازو مضبوط کیے جو حدیث کو قرآن کی تفسیر اور فقہ کو حدیث کی بھی شرح کہتے تھے۔ وہی مسلمان باہمت یادگار پاکستان کے معمار اول ہیں جو محدثین اسلام پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے محدثین اسلام جانفشانِ خادمین ایمان نے نہایت عرق ریزی اور پُر خلوص محنتوں سے احادیث میں چھان بین کر کے جو فیصلہ کر دیا وہ بالکل درست اور دائمی ہے۔ جو ان فیصلوں میں شک ڈالے اور اب بھی صحیح احادیث کو باطل خیالات کی وجہ سے نہ مانے وہ بے دین ہے۔ ہمارے سچے محسن قائد اعظم محمد علی جناح اپنے عظیم ایمانی مقصد وجودِ پاکستان کے حدوث میں کامیاب نہ ہوتے اگر امام احمد رضا بریلوی کے پیروکار مسلمان اہلسنت علماء و مشائخ ان کا مضبوط ساتھ نہ دیتے۔ اس لیے کہ۔

✲ فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں ✲ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں۔

اس تمام کشاکش اور جاں نثاریوں کے باوجود مذہبی بدنصیبی نے پاکستانیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ قائدِ اعظم نے شاہینوں کا گھونسلا تو بنا دیا۔ مگر عمر فانی نے شاہین بنانے کا موقعہ نہ دیا۔ مسلم لیگ نے کلمۂ طیّبہ اور نظامِ اسلامی کے پرکشش نعرے کی قوت و ہیبت سے۔ انگریزوں کو تو علاقہ سے نکال دیا لیکن انگریزوں کی غلامی اور انگریزی ظالمانہ نظام کو نہ نکال سکے۔ ہمارے مفکروں دانشوروں نے ملک کا نام تو پاکستان رکھ لیا۔ مگر آنے والے حاکموں کے ذہنوں کو انگریز غلامی کے تصوّر سے پاک نہ کر سکے۔ ایک نظریاتی ملک کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہے کہ اُس کے پینتیس۳۵ سالہ دور میں۔ ایک رہنما حاکمِ اعلےٰ ملک کا سربراہ بھی ایسا نہ میسّر ہوا جو ملک کے نظریاتی مقاصد پورے کرتا۔ اوائل میں تو کسی نے توجہ ہی کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ مخالفاً معاندانہ روش اختیار کی۔ بعدہٗ اگر کسی سربراہ نے اس طرف ذرا سی کروٹ موڑی بھی تو اُس نے اپنی مرضی کا اسلام اپنی خواہشات کو دینی قانون کا نام دینے کی کوشش کی۔ اِس کی راہ ہموار کرنے کے لیئے گروہِ باطلہ کو مشیرانِ خواص کی کرسیاں عنایت کی گئیں۔ اور قوتِ باطلہ کی ملک پاکستان میں اتنی حوصلہ افزائی کی گئی کہ اگر کسی سربراہ نے کچھ زیادہ ہی خلوص و سرگرمی سے نظامِ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم قانونِ قرآن و حدیث جاری کرنے کا باہمت ارادہ کیا تو مخالفینِ قرآن و حدیث نے عدالتوں وزارتوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی سر توڑ کوشش کی۔ سائل نے اپنے سوال میں جس فیصلے کا ذکر کیا وہ سب کچھ اسی کا شاخسانہ ہے۔ میں نے بحیثیتِ مفتیٔ اسلام ہونے کے سائل کے سوال اور مخالف کے دلائل کو پوری ذمہ داری کے ساتھ بغور مطالعہ کیا ہے۔ ادارے کا مطبوعہ رسالہ بلاغ القرآن بھی سائل کی طرف سے وصول پا کر کئی بار بہت احتیاط سے پڑھا۔ اس تمام تفتیش و تحقیق کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دلائل نہایت کمزور۔ پرویزیوں کا نظریہ اور مذہب بالکل باطل اور وفاقی شرعی عدالت کے پانچ ججوں میں تین ججوں کا فیصلہ بہت جلد بازی پر مبنی ہے۔ اگر ہمارے فاضل جج صاحبان کو خود تدبّرِ قرآنی اور تفکرِ ایقانی کی فرصت نہ تھی۔ تو پاکستان کے علماءِ کرام سے رابطہ قائم کرنا کیا دشوار تھا۔ فقہاءِ امّت کے فتاوے کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ یہ بات کس سے پوشیدہ ہے کہ علماءِ امّت نے قرآن و حدیث کی تفکر و تدبر و تفسیر میں عمریں صرف کی ہیں۔ جب کہ ہمارے وکلا اور جج و جسٹس صاحبان نے مادی دنیا میں وقت گزارا ہے۔ اور انگریزی قوانین کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ منشاءِ قرآنی کو جتنا فقیہِ امّت سمجھ سکتا ہے۔ اتنا یہ مادّیات کے ماہر کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل سطور میں سات باتیں :۔ بیان کی جائیں گی۔ تب پورا مسئلہ واضح ہوگا :۔

پہلی بات۔ یہ کہ قرآنِ پاک اور حدیثِ مبارکہ کا آپس میں تعلق کیا ہے۔ دوسری۔ یہ کہ نسخ کیا چیز ہے اور ناسخ و منسوخ کا آپس میں ربط کیا ہے۔ یعنی کون کس کا ناسخ ہو سکتا ہے۔ اور کیوں۔؟ ۳ تیسری بات یہ کہ اسلام میں کُل حدود کتنی ہیں اور تعزیر و حد میں فرق۔ اور حدِّ اسلامی کی تعریف اور اس کا حکم کیا ہے۔ اس کو ماننے نہ ماننے یا اس کو جاری کرنے نہ کرنے سے دنیوی اُخروی کیا فرق پڑتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ رجم کی سزا قرآنِ مجید اور

احادیث پاک سے کس طرح ثابت ہے۔ **پانچویں بات** یہ کہ۔ اسلام نے ہمارے جرموں پر ہم کو کتنی سزائیں دیں **چھٹی بات** یہ کہ اپنے مسلک پر دلائل **ساتویں بات** یہ کہ مخالف کے پیش کردہ دلائل کا مکمل رد اور نا سمجھی اور کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرنا۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔ ھُوَ الْمُوَفِّقُ بِالصَّوَابِ:۔

قولِ اوّل:۔ چونکہ ہمارے مخاطبین مخالفین اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ اگرچہ فہم قرآنی سے خاصے دور ہیں اس لیے حدیث و قرآن کا تعلق قرآنِ مجید سے ہی پوچھنا ہے۔ کہ قرآن پاک کے نزدیک، مقامِ حدیث کیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت پارہ ۲۷ سورۂ نجم۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (ترجمہ):۔ اور تمہارے مالک یعنی صاحب ہمارے محبوب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے ایک بات بھی نہیں کرتے مگر وہی بات کرتے ہیں۔ جو اُن کو اِلہام کی جاتی ہے۔ اس واضح کلام سے عظیم الشان طریقے سے ثابت ہوا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تمام باتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں حضور اقدس کی اپنی کوئی بات نہیں یہاں تک کہ گھریلو اور محافل خصوصیہ و عمومیہ کی باتیں اِلہام الٰہیہ سے ہیں اس آیت کریمہ کا یہی مطلب درست ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی مطلب و مقصد بن سکتا ہی نہیں پانچ وجہ سے:۔

پہلی وجہ:۔ یہ کہ الفاظ عبارتِ پاک یہ ہیں وَمَا یَنْطِقُ ہے۔ جو نطق سے مشتق ہے۔ اور نطق لغوی لحاظ سے ذاتی گفتگو اور بولی کو کہا جاتا ہے۔ بخلاف قول کے کہ وہ عام ہے اپنی بات یا دوسرے کی بات کہے۔ اگر یہاں آیت میں۔ بجائے مَا یَنْطِقُ کے مَا یَقُوْلُ ہوتا تو الفاظ قرآن اور وحی جلی بھی مراد لی جاسکتی تھی۔ مگر مَا یَنْطِقُ سے الفاظِ قرآنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔ نطق متکلم اور ناطق کی ذاتی گفتگو کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی جلد چہارم علی اربعہ تفاسیر صـ۵۰۸ پر اور تفسیر روح المعانی جلد دہم صـ۱۷۱ پ ۱۹ ع پر ہے:۔ وَالنُّطْقُ وَالْمَنْطِقُ فِی الْمُتَعَارَفِ کُلُّ لَفْظٍ یُعَبَّرُ بِہٖ عَمَّا فِی الضَّمِیْرِ:۔ (ترجمہ)، مشہور لغت میں اور عام اہل عرب کے مشہور محاوروں میں۔ نطق اور منطق سے ہر وہ لفظ مراد ہوتا ہے جس سے بولنے والا اپنے دل کی بات اور ذاتی کلام تعبیر کرے۔ تفسیر تنویر المقباس صـ۲۳۵ پر ہے۔ (مَنْطِقَ الطَّیْرِ) کَلَامَ الطَّیْرِ (ترجمہ) قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ سے مراد پرندوں کا ذاتی کلام ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنے اِس معجزے کا ذکر کیا کہ ہم انبیاء کرام کو رب تعالیٰ نے پرندوں کی بولی سکھائی ہے تو اُس وقت آپ نے لفظ مَنْطِق ہی فرمایا۔ ثابت ہوا کہ نطق سے مراد ذاتی گفتگو ہے۔ نہ کہ عباراتِ قرآنیہ:۔

دوسری وجہ:۔ یہ کہ تمام اہل لغت بزرگوں نے نطق کا ترجمہ ذاتی گفتگو اور بات ہی کیا ہے۔ چنانچہ وَلی کامل حضرت شیخ سعدی شیرازی صاحب گلستان بوستان۔ اپنے ترجمۂ قرآن مجید میں لکھتے ہیں۔ ونمیگوید از آرزوئے نفس خود و نیست سخن اُو مگر وحی کہ فرستادہ میشود باو۔ ترجمہ:۔ اور پیارے نبی کوئی بھی بات اپنے خواہش دل سے نہیں کرتے مگر وحی سے ہی بولتے ہیں جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ یہی حضرت سعدی اور دیگر تمام مترجمین نے عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ میں۔ مَنْطِقَ کا ترجمہ گفتار مرغان۔ یعنی پرندوں کی ذاتی بولی فرمایا ہے۔ اسی بنا پر ثابت

ہوا کہ لفظِ کلام اور قول۔ کسی دوسرے کی نقل کو بھی کہہ دیا جاتا ہے مگر نطق اپنے ہی کلام کو کہا جاتا ہے :۔

تیسری وجہ :۔ تفسیر کبیر رازی میں وَمَا يَنْطِقُ کے بارے بہت قول نقل کیئے مگر زیادہ ترجیح اسی کو دی گئی کہ یہاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شب و روز کی ذاتی گفتگو مراد ہے۔ اور چونکہ دن رات میں پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مخزنِ علم و حکمت سے ہزارہا کلمات ادا ہوتے رہتے تھے اس لیئے امام رازی نے فرمایا کہ یہاں لفظِ وَحْيٌ يُوحٰى سے مراد ہر وقتی الہامات ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ ۲ پر ہے۔ فَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّفَسَّرَ الْوَحْيُ بِالْاِلْهَامِ۔ (ترجمہ) :۔ مفسرین کے اقوال نے جب یہ ثابت کر دیا کہ یہاں مَا يَنْطِقُ سے نبی کریم کی ذاتی اور شب و روز کی گفتگو مراد ہے اور اگر ہم اس بات کے قائل ہو جائیں تو ضروری لائق ہے کہ وحی سے مراد الہام لیا جائے اس عبارت سے ثابت ہوا کہ نطق سے مراد عبارتِ قرآن مجید کا تکلم نہیں بلکہ ذاتی اور نجی گفتگو مراد۔ **چوتھی وجہ** :۔ یہ کہ اِنْ هُوَ۔ میں هُوَ ضمیر کا مرجع يَنْطِقُ کا مصدر نُطْقٌ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا ورنہ اضمار بلا مرجع یا اضمار قبل الذکر لازم آئے گا اور یہ دونوں ناجائز ہیں۔ جس طرح سورتِ قدر میں۔ ہٗ ضمیر کا مرجع اَنْزَلْنٰهُ کا مُنَزَّلٌ ہے۔

پانچویں وجہ :۔ یہ بات مُتَّفَقًا مُسَلَّمٌ ہے کہ نطق کا معنیٰ ذاتی بولی ہے۔ چنانچہ مولانا رومی فرماتے ہیں۔

؎ نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گل ٭ ہست محسوس از حواسِ اہلِ دل۔ ترجمہ :۔ پانی بھی بولتا ہے اور خاک بھی اور مٹی بھی۔ اہلِ دل اولیاء اللہ ان کی بولی سنتے سمجھتے ہیں۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ آقاءِ دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی اور تمام گفتگو الہامِ الٰہی سے کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں ہوتی۔ تو یہ صاف واضح ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی گفتگو ہی حدیث کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ حدیث و قرآن بالکل ایک درجہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو عبداللہ اپنی کتاب ناسخ منسوخ کے صفحہ ۳۰۹ پر فرماتے ہیں مِنْهَا شِدَّةُ اِعْتِنَاءِ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ بِالنَّاسِخِ وَالْمَنْسُوْخِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ شَانُهُمَا وَاحِدٌ۔ ترجمہ :۔ صحابہ کرام ناسخ منسوخ کی بہت سخت احتیاط فرماتے تھے۔ حدیث و قرآن دونوں کی ایک دوسرے میں کیونکہ صحابہ کے نزدیک حدیث و قرآن دونوں کی شان ایک تھی۔ المغنی ابن قدامہ جلد نہم صفحہ ۳۲ پر ہے :۔ فَاِنْ قِيْلَ فَكَيْفَ يُنْسَخُ الْقُرْاٰنُ بِالسُّنَّةِ قُلْنَا قَدْ ذَهَبَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا اِلٰى جَوَازِهٖ لِاَنَّ الْكُلَّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ اخْتَلَفَتْ طُرُقُهٗ۔ (ترجمہ) :۔ اگر کوئی کہے کہ حدیث سے قرآن کیسے منسوخ ہو سکتا ہے تو ہم کہیں گے کہ بعض نے جائز کہا ہے اس لیئے کہ حدیث و قرآن سب ہی اللہ کی وحی ہے اگرچہ نزول کے طریقے مختلف ہیں اور دونوں کا فیصلہ فرض و لازم ہے۔ ہر ایک کا انکار کفر ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ کی عبارت بہت مضبوط طریقے سے یہ بات ثابت فرما رہی کہ شرعی قانون اور اس پر ایمان لانے کی حیثیت سے قرآن و حدیث کا درجہ ایک ہی ہے۔ خود آقائے دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث یہی بتا رہی ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۲۹ باب الاعتصام میں ہے

وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِ یْکَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ (الخ) - ترجمہ: حضرت ابن معدیکرب فرمایا کہ فرمایا - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار بے شک میں دیا گیا ہوں، قرآن کریم اور اس کی مثل اس کے ساتھ - یہ مثل کون ہے - حدیث پاک ہی ہے - اور یہی احادیث مثلِ قرآن ہیں - یہ روایت اور یہ آیت ایک دوسرے کی شرح و تفسیر ہیں - یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مکتوبی صورت میں نازل نہ ہوا بلکہ اسی زبان پر نازل ہوا جس پر حدیث پاک وَمَا یَنْطِقُ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حدیثِ رسولِ پاک تمام کی تمام قرآن کریم کی تفسیر ہے - حدیث پاک کو چھوڑ کر کسی شخص کو قرآن مجید کی سمجھ آسکتی ہی نہیں لہٰذا حدیثِ پاک کا ہر فیصلہ گویا کہ قرآنِ پاک کا ہی فیصلہ ہے - حدیثِ مبارکہ کا فیصلہ کسی پر جاری کرنا بھی کتابُ اللہ ہی کو جاری کرنا ہے کیونکہ نبی کریم کی ہر بات قرآنی عبارات سے علیحدہ وحیِ خفی اور الہاماتِ الٰہیہ کی ہے - یہ جو بعض شیعہ رافضی حضرت علی یا امام حسین کو ناطقِ قرآن مرکب اضافی یا ناطق قرآن - یا قرآنِ ناطق کہہ دیتے ہیں یہ سب غلط ہے - کیونکہ نطق کے معنے ہیں اپنا کلام بولنا جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق کلی طور پر وحیِ الٰہی ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتیں وحی اور الہام ہوں - کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل شریعت ہے - اور شریعت مِنَ اللّٰہِ تعالیٰ ہی ہوتی ہے - اس آیت پاک سے جہاں حدیث کی اہمیت اور قرآن و حدیث کا آپس کا تعلق ثابت ہوا وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ باری عزّ اسمہٗ ہر وقت نبی کریم سے ہم کلام ہے - الہاماتِ باری تعالےٰ اگرچہ دیگر انبیاء عظام و اولیاءُ اللہ کو ملتے ہیں - مگر ایسی ہر وقتی رسی کو میسر نہیں - دوسری آیت پاک میں ارشاد ہے :- فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَہُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا - (ترجمہ) :- آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے - جب تک کہ اپنے تمام مقدموں جھگڑوں اور مخالفتوں میں آپ کو کاملِ حاکم نہ مان لیں پھر اپنے دل میں آپ کے فیصلے سے کوئی تنگی حرج یا اعتراض نہ پائیں بلکہ بے چون و چرا مان لیں - تیسری آیت کریمہ میں ارشاد ہے - اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ :- (ترجمہ) اطاعت کرو تم اللہ کی اور اطاعت کرو رسولِ پاک کی - چوتھی آیت میں ہے - قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ - (ترجمہ) :- اے پیارے حبیب فرما دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو - ان تمام آیات میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو بھی سزا جزا کا فیصلہ فرما دیں اگرچہ وہ ظاہراً قرآنِ مجید میں نہ ہو - مگر بالکل برحق اور قابلِ نفاذ واجری فیصلہ ہے - اگر کسی نے نبی کریم کے اس ذاتی فیصلے کو نہ مانا اور قرآنِ پاک میں اس فیصلے کی تائید ڈھونڈتا رہا نہ ملنے پر منکر ہو گیا تو وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتا - عقیدۂ دینی یہی ہے کہ کوئی قانونِ شریعت اس کو قرآن مجید میں نظر آئے یا نہ آئے حدیثِ پاک میں دیکھتے ہی مان لے :- **دوسرا قول** :- کائناتِ عالم میں ایک دَور وہ تھا جب قرآنِ حمید نازل ہو رہا تھا اور حدیثِ مقدسہ معرضِ وجود میں آتی چلی جا رہی تھیں -

ایک زبانِ پاک ہی دو طرفہ گوہر افشانی فرما رہی تھی اس دور کی خصوصی شان یہ تھی۔ کہ یہی زبانِ پاک وحیِ جلی یعنی قرآن مجید کے ذریعے اِسی قرآنِ کریم کے عارضی احکام کو منسوخ کر رہی ہے۔ کبھی لفظوں کو اور ان کے معانی کو دوسری آیات کے لفظ منسوخ کر رہے ہیں اور کبھی کوئی آیت دوسری آیت کا فقط حکم منسوخ کر رہی ہے۔ اور کبھی یہی وحیِ جلی یعنی قرآنِ پاک کی آیتیں وحیِ خفی یعنی حدیثِ مبارکہ کے اور پھر کبھی وحی خفی حدیث پاک کے ذریعے دوسری وحی خفی یعنی حدیث شریف کے حکم اور لفظوں یا صرف حکم منسوخ کر رہی ہیں۔ کبھی وحیِ خفی یعنی حدیث پاک کے ذریعے وحی جلی یعنی آیت قرآن کے صرف حکم کو منسوخ کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ناسخ منسوخ کی کل چار قسمیں ہو جاتی ہیں:۔ ع۱ قرآن کے الفاظ کا نسخ قرآن سے اور قرآنِ پاک کے حکم کا نسخ قرآن مجید کی ہی آیت سے ع۲ آیت سے دوسری آیت کے الفاظ اور حکم دونوں کا نسخ ع۳ آیت سے حدیث کا نسخ ع۴ حدیث کا حدیث سے نسخ ع۵ حدیثِ پاک سے فقط حکمِ قرآنی کا نسخ۔ منکرین حدیث چکڑالوی اور پرویزی گروہ ویسے تو بالکل ہی نسخ کا انکار کرتے ہیں مگر نسخِ آیت بالحدیث کے سخت منکر و مخالف ہیں۔ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں:۔ وَعَنْ جَابِرٍ۔ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَامِي لَا يَنْسَخُ كَلَامَ اللّٰهِ وَيَنْسَخُ كَلَامِي وَكَلَامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔ مشکوٰۃ شریف ص۳۲:۔ (ترجمہ):۔ حضرت جابر سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرا کلام اللہ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا ہاں میرا کلام میرے کلام کو اور قرآن قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں الفاظِ قرآن مراد ہیں یعنی حدیث سے الفاظ آیت منسوخ نہیں ہوتے صرف حکم قرآنی منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں:۔

پہلی مثال:۔ آیت سے آیت کے فقط حکم کی تنسیخ تلاوت باقی۔ جیسے جہاد کی آیتوں سے عفو اور درگزر اور کفار پر نرمی کی آیات۔ کہ ان معافی کی آیات کی تلاوت اب تک باقی مگر حکم منسوخ لہٰذا اب کوئی بادشاہ یا حاکم کوئی پیر یا عالم کفار پر حسب حیثیت قتال یا لسان یا قلم یا قلب سے شدت نہ کرے گا۔ تو شرعاً مجرم ہے۔ ع۲ کسی محکم آیت سے دوسری عارضی آیت کا حکم و تلاوت دونوں ختم کر دیئے جائیں گے۔ مثلاً سورۃ حجرات کی ایک آیت اس طرح نازل ہوئی۔ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ:۔ (ترجمہ):۔ دس مقرر گھونٹ شیر خوار بچہ پیئے تو رضاعت ہو گی۔ یہ آیت رضاعت کی آیتوں سے حکماً بھی منسوخ ہو گئی اور الفاظ بھی باقی نہ رکھے گئے۔ اور دوسری آیت سورۃ توبہ کی اس طرح نازل ہوئی تھی:۔ لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى اِلَيْهِمَا ثَالِثًا وَلَوْ كَانَ لَهٗ ثَالِثًا لَابْتَغٰى رَابِعًا وَلَا يَمْلَاُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ (ترجمہ) اگر انسان کو دو جنگل بھر کے سونا ملے تب بھی تیسرے کا لالچ کرے گا اور اگر تین جنگل بھر کے مل جائیں تو چوتھے کا حریص ہو گا انسان کا پیٹ صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔ ہاں اللہ توبہ والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اسی طرح آیت سے دوسری آیت کے صرف الفاظ منسوخ مگر حکم باقی مثلاً اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ والی مشہور آیت کا حکم اب تک باقی ہے مگر الفاظ آیتِ زنا سے منسوخ ہو گئے

ع۳:۔ آیت سے حدیث کا نسخ مثلاً فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ۔ (ترجمہ) کعبے کی طرف نماز میں اپنا منہ پھیرلو اس آیت نے اس حدیث کو منسوخ کر دیا جس میں نمازوں میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم تھا۔ ع۴ حدیث سے حدیث کا نسخ مثلاً۔ زیارت قبور کی اجازت والی حدیث نے۔ ممانعت والی سابقہ حدیث کو منسوخ کر دیا۔ جیسا کہ ابوداؤد میں دونوں حدیثوں کا ذکر ہے۔ ع۵ حدیث سے آیت کا حکماً نسخ مثلاً سجدہ تحیت کی تمام آیتیں حدیث نے منسوخ فرمائیں اور بتایا کہ کسی مسلمان کو تحیۃ کا سجدہ جائز نہیں۔ اور جیسے وارث کو وصیت والی آیت۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ والی آیت حدیث سے منسوخ ہے۔ اور جیسے اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ والی آیت نے صرف مذکورہ فی الآیت عورتوں کو مرد پر حرام کیا مگر حدیث نے اس حکم مَا وَرَآءَ کو منسوخ کر دیا۔ اس آیت کی ناسخ وہ حدیث ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا وَلَا عَلٰى خَالَتِهَا۔ ترجمہ۔ کوئی عورت اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ کی سوت (سوکن) نہ بنے ہر مرد کو ایسا نکاح حرام ہے۔ یہ چند مثالیں تھیں تفصیل تو بہت زیادہ ہے۔ خیال رہے کہ نسخ کا قانون شریعت اسلام میں اتنا اشد اور لازمی ہے کہ باری تعالےٰ نے بہت جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔ اور علماءِ اسلام نے اِس موضوع پر مکمل تحقیق سے ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ صحابہ کرام کا عقیدہ یہ تھا کہ جو انسان نسخِ آیات کا منکر ہے وہ مرتد ہے اور جو اس سے غافل ہے وہ گمراہ و گمراہ گر ہے۔ چنانچہ حضرتِ علی مشکل کشا سے روایت ہے اے

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ مَرَّ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلٰى قَاضٍ فَقَالَ لَهٗ اَتَعْرِفُ النَّاسِخَ مِنَ الْمَنْسُوْخِ قَالَ لَا قَالَ هَلَكْتَ وَاَهْلَكْتَ۔ (ترجمہ):۔ ابوعبدالرحمٰن نے فرمایا۔ کہ علی رضی اللہ عنہ ایک واعظ مقرر کے پاس سے گزرے تو اس کو فرمایا کہ کیا تو ناسخ منسوخ کو پہچانتا ہے۔ اس نے کہا۔ نہیں۔ فرمایا تو گمراہی کا ہلاک ہوا اور تو نے قوم کو گمراہی کا ہلاک کیا۔ اسی ناسخ منسوخ آیتوں کا قرآن مجید میں کئی جگہ اِس طرح ارشاد ہے

پہلی آیت :۔ پارہ اوّل سورۃ بقرہ آیت ع۱۰۶ پر ہے۔: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ:۔ (ترجمہ):۔ جب کوئی آیت ہم خود منسوخ فرما دیں یا اپنے نبی کریم کو ہم بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل دوسری آیت لے آتے ہیں اے انسان کیا تو اس بات کو نہیں مانتا کہ بے شک اللہ تعالےٰ ہر شئی پر قادر ہے۔ اس آیت پاک نے نسخ کی مندرجہ تین قسمیں بیان فرمائیں :۔ — ع۱ آیت سے آیت کے لفظوں کا نسخ ع۲ آیت سے آیت کا حکم منسوخ ع۳ آیت سے آیت کے الفاظ اور حکم دونوں منسوخ۔ اس آیت کے آخری الفاظ میں ناسخ منسوخ پر ایمان لانے کی شدت سے ذکر فرمایا گیا :۔

دوسری آیت :۔ پارہ ع۳۰ سورۃ الاعلیٰ آیت ع۶ :۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (ترجمہ):۔ عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے پس آپ اس قرآن کو نہ بھولیں گے۔ مگر جو اللہ چاہے وہ آیت آپ کے ذہن سے بھلا دے گا۔ اِس آیت کریمہ میں نسخ کی چوتھی قسم کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ یعنی حدیث سے حدیث کا

نسخ یا حدیث سے آیت کے حکم کا نسخ ۔ کیونکہ پہلی آیت شریف میں نُنْسِھَا ہے یعنی ہم بھلا دیں ۔ اور یہاں لَا تَنْسٰی ہے یعنی آپ خود نہ بھولیں گے اسی لَا تَنْسٰی کی نفی اِلَّا نے توڑ دی ۔ تو مطلب ہوا کہ جو اللہ چاہے وہ آیت آپ خود اپنی حدیث کے ذریعے بھولیں گے ۔ اور حدیث پاک سے نیا قانون ظاہر فرمائیں گے ۔ اہل لغت کے نزدیک نسی کے معنی چھوڑنا بھی ہے تو مطلب ہوا کہ جس کو آپ چھوڑ دیں ۔ اللہ نے نبی کریم کو اختیار دیا ہے ۔ **تیسری آیت** :۔ سورت نحل آیت ۱۰۱ :۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ (الخ) ۔ ترجمہ :۔ اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں اور اللہ خوب جانتا ہے ۔ جو اتارتا ہے ۔ یہ آیت سیاق و سباق اور لفظ یُنَزِّلُ سے ثابت کر رہی کہ تبدیلی سے مراد نسخِ آیتِ قرآن ہی ہے ۔ اس کو سابقہ کتب سماوی کی طرف پھیرنا ۔ منکرین کی انتہائی نادانی ہے ۔ چونکہ رب تعالیٰ کے نزدیک ناسخ منسوخ بہت اہم چیز ہے ۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے بہت سی سورتوں میں آیتوں کو نسخ فرمایا ۔ علماء اسلام نے اس کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ قرآن مجید کی ایک سو چودہ ۱۱۴ سورتوں میں سے ترتالیس ۴۳ سورتوں میں کوئی آیت نہ کوئی ناسخ ہے نہ کوئی منسوخ ۔ اور چالیس ۴۰ سورتوں میں آیتیں منسوخ ہیں لیکن ان میں ناسخ آیت کوئی نہیں ۔ اور چھ ۶ سورتوں میں ناسخ آیتیں ہیں لیکن ان میں منسوخ کوئی آیت نہیں ۔ اور پچیس ۲۵ سورتوں میں منسوخ آیتیں بھی ہیں اور ناسخ آیتیں بھی ہیں ۔ اس طرح یہ ایک سو چودہ کی تعداد والی تقسیم مکمل ہوتی ہے ۔ چنانچہ آسانی حفظ کے لیے اس طرح زائچہ بنایا جاتا ہے ۔ مگر چند باتیں پہلے ذہن نشین کر لینی بہت ضروری ہیں :۔ **ایک** یہ کہ کل منسوخ آیتیں دو سو گیارہ ۲۱۱ ہیں ۔ اور کل ناسخ آیتیں اسی ۸۰ ہیں ۔ **دوم** :۔ یہ کہ منسوخ آیتیں پہلے نازل ہوئی تھیں بجز دو آیتوں کے ۔ ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۴ وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ (الخ) ۲ سورت احزاب کی آیت نمبر ۵۰ اِنَّآ اَحْلَلْنَا (الخ) اور ناسخ آیتیں بعد میں حسبِ موقعہ نازل ہوتی رہیں چنانچہ امام ابو عبد اللہ بن حزم اپنی کتاب حاشیہ تفسیر تنویر المقباس صفحہ ۳۱۹ پر لکھتے ہیں :۔ اِعْلَمْ اَنَّ نُزُوْلَ الْمَنْسُوْخِ بِمَكَّةَ كَثِیْرٌ وَ نُزُوْلَ النَّاسِخِ بِالْمَدِیْنَةِ كَثِیْرٌ ۔ (ترجمہ) :۔ جان تو کہ بے شک منسوخ آیتیں زیادہ مکہ شریف میں نازل ہوئیں ۔ **سوم** :۔ یہ کہ ناسخ آیتیں علیحدہ ہوتی ہیں اور منسوخ علیحدہ بجز ایک آیت کے ۔ سورت مائدہ عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (الخ) آیت ۱۰۵ کہ یہ آیت خود ہی اپنی ناسخ ہے ۔ آیت کا پہلا حصہ منسوخ ہے آخری حصے سے ۔ **چہارم** :۔ یہ کہ ناسخ و منسوخ میں ہر آیت مکمل ناسخ یا منسوخ ہوتی ہے بجز سورت اعراف آیت ۱۹۹ خُذِ الْعَفْوَ (الخ) **پنجم** ۔ یہ کہ ۔ کفار کو معافی اور درگزر کرنے کی کل ایک سو چودہ آیتیں ہیں جو سینتالیس سورتوں میں ہیں ۔ **ششم** :۔ یہ کہ کل پانچ حدیثوں سے پانچ آیتوں کو منسوخ کیا گیا دو آیتیں اور دو حدیثیں اوپر بیان کر دی گئیں باقی تین اس طرح ہیں ۔

پہلی آیت :۔ آیت ۱۷۳ :۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ ۔ (بقرہ) :۔ الخ

اس آیت کے اطلاق کو اس حدیث سے منسوخ کیا گیا ہے :۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ :۔ (ترجمہ) :۔ آیت کا ترجمہ اس طرح ہے۔ اے مسلمانو تم پر سب مردار اور سب خون حرام کیے گئے۔ ترجمہ حدیث پاک :۔ ہم مسلمانوں پر دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے اس حدیث نے اُس آیت کی کلیت منسوخ کر دی۔ **دوسری آیت** سورت نساء آیت ۲۴ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً :۔ ترجمہ :۔ تو تم جن عورتوں کو متعہ نکاح میں لانا چاہو۔ تو ان کے اجر انکو فرض سمجھ کر ضرور دے دو جو بھی آپس میں رضامندی سے مقرر ہو۔ اس آیت کی ناسخ یہ حدیث ہے۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّيْ كُنْتُ أَحْلَلْتُ هٰذِهِ الْمُتْعَةَ أَلَا وَإِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ قَدْ حَرَّمَاهَا۔ أَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ :۔ **تیسری** سورت نساء آیت ۱۵ وَاللَّاتِيْ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوْا فَأَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ (ترجمہ) :۔ اور تمہاری بیویاں جو زنا کرالیں تو تم اُن کے خلاف چار سچے متقی گواہ عدالت میں حاضر کرو جب زنا ثابت ہو جائے تو اس بیوی کو اپنے ہی گھر میں اُس کی موت تک قید کر دو یا جب تک کوئی نیا قانونِ الٰہی آجائے۔ یہ آیت اس حدیث پاک سے منسوخ ہے :۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ خُذُوْا عَنِّيْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ السَّبِيْلَ الثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ الرَّجْمُ وَالْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ :۔ (ترجمہ) :۔ فرمایا آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ قانون شرعی مجھ سے لو۔ بے شک بنادیا گیا ان زانیہ عورتوں کے لیے یہ قانون شادی شدہ عورت و مرد کو رجم ہوگا اور کنوارے عورت مرد کو سو کوڑے حدِ شرعی ہوگی اور ایک سال کے لیے شہر بدر تعزیری سزا ہوگی۔ پوچھو ان منکرینِ حدیث لوگوں سے۔ نسخ کے اتنے مضبوط اور حقیقی واقعی قانون کے ہوتے ہوئے پھر تم کس طرح نسخ کے منکر ہوتے ہو۔ نسخ کا انکار در پردہ قرآنِ مجید کی گستاخی ہے۔ کیونکہ سب آیات کو محکم مان کر ناسخ و منسوخ کا ٹکراؤ پیدا کرنا ہے۔ بھلا کس طرح ہو سکتا ہے کہ ناسخ پر بھی عمل کیا جائے اور منسوخ پر بھی۔ اور پھر یہ انکار خدا تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہے جو سراسر بے دینی۔ حالانکہ نسخ کا قانون خود رب کا فرمودہ اور عین حکمتِ الٰہیہ کے مطابق ہے۔ جیسا کہ پہلے دو آیتیں سورۂ بقرہ اور سورتِ اعلیٰ کی پیش کی گئیں۔ اور یہ آیت مندرجہ بالا أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ (الخ) بھی ثابت فرما رہی ہے کہ قانونِ نسخ ہوا کرے گا۔ دراصل پرویزیوں چکڑالویوں کا یہ مذہب یہودی مذہب سے لیا گیا ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ منکرِ حدیث کا اکثر مذہب یہودیوں سے لیا گیا ہے نسخ کے انکار میں پرویزی اور یہودی ایک ہی بات کہتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ پہلے بے علم تھا کہ پہلے کچھ اور پھر کچھ چنانچہ حاشیہ تفسیر مقباس صفحہ ۳۱۲ پر یہی لکھا ہے۔ اور پرویز صاحب کی لغات القرآن چہارم صفحہ ۱۶۰۸ پر بھی

یہی ہے۔ آریہ ہندو بھی یہی اعتراض کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض تو توریت و انجیل کی تنسیخ پر بھی پڑ سکتا ہے جس کو پرویزی یہودی دونوں مانتے ہیں اس تنسیخ پر تم کیا جواب دو گے کیا باری تعالیٰ توریت انجیل ایک دم نازل نہیں کر سکتا تھا۔

ساتویں یہ کہ منکرین حدیث نے نسخ کا اس لیے انکار کیا کہ وہ نسخ کے حقیقی معنےٰ نہ سمجھے۔ بس اپنی جہالت سے اتنے بڑے مفید اور خود رب تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے منکر ہو گئے۔ نسخ کے لغوی معنیٰ ہیں کسی حکم کا ازالہ کرنا۔ اور دوسرے حکم کو اس کی جگہ نافذ کرنا لغات القرآن صـ۲۷ ۔ منجد عربی صفحہ ۸۷۴ نسخ کی شرعی اور اصطلاحی تعریف ہے کسی قانون کی مدتِ نفاذ ظاہر کرنا۔ اور دوسرا قانون لانا۔ چنانچہ کتاب ناسخ حاشیہ تفسیر مقباس صفحہ ۳۱۱ اور مرقات شرح مشکوٰۃ جلد اول صفحہ ۲۱۵ پر ہے:۔ النسخ لغۃً التبدیل وشرعاً بیان لانتہاء الحکم الشرعی المطلق (الخ) وقیل انقضاء العبادۃ التی ظاہرھا الدوام۔ (ترجمہ):۔ نسخ کا لغوی ترجمہ ہے تبدیلی اور شرعی ترجمہ شریعت پاک کے مطلق حکم کی مدتِ انتہا بیان کرنا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جو عبادت ظاہراً دائمی معلوم ہوتی تھیں اُن کو بند کرا دینا خود منکر حدیث گروہ کے موجودہ سرغنہ نے بھی نسخ کا یہ ہی ترجمہ کیا ہے۔ مگر وہ توریت و انجیل کی آیات کی تنسیخ مراد لیتا ہے میں کہتا ہوں کہ توریت و انجیل کی آیات منسوخ نہیں ہوئیں وہ تو پوری کتاب منسوخ ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آیت کا ذکر ہے۔ منکرِ حدیث کہتا ہے سابقہ امتوں کے حالات کے مطابق نرم اور سخت قانون آتے رہے اُن پر میں کہتا ہوں یہ عقیدہ کتنی جہالت کا ہے کتب سابقہ امم سابقہ پر یکدم آئیں مکتوبی شکل میں۔ اور پھر اگر سابقہ امتوں پر حالات کے مطابق نرم سخت احکام و قانون آتے رہے تو اُمتِ مسلم اس مشفقانہ رعایت کی زیادہ حقدار ہے۔ کہ محبوب کی امت ہے۔ منکرِ احادیث اپنی کتاب لغات القرآن جلد چہارم صـ۱۶۰۸ پر لکھتا ہے۔ قرآن کریم میں خدا نے کسی بات کا حکم دیا اُس کے کچھ عرصے بعد سوچا کہ اس طرح حکم کو منسوخ کر دینا چاہیئے چنانچہ اُس نے ایک اور آیت نازل کر دی۔ میں کہتا ہوں کہ مخالفین نے غلط سمجھا۔ نسخ کا مطلب یہ نہیں کہ بعد میں سوچا۔ یہ نظریہ کفر یہ اور اتہام ہے۔ نسخ کا مطلب بلا تشبیہ یوں سمجھا جائے کہ ماں کو پہلے ہی معلوم ہے کہ بچے کی خوراک کب کب تبدیلی کرنی ہے۔ ڈاکٹر حکیم کو شروع دن سے پتہ ہے کہ مریض کی دوائیاں کس کس وقت تبدیل کرنی ہے۔ استاد خوب جانتا ہے کہ ابتدائی شاگرد کے لیے لمحہ بہ لمحہ کونسی کتابیں تبدیل کرنی ہیں۔ بس سمجھ لو کہ رب تعالیٰ ان سب سے زیادہ علیم و خبیر ہے۔ وہ اپنے محبوب بندوں کی ضروریات سے بخوبی واقف ہے۔ نسخ قرآن مجید کا اٹل قانون ہے۔ اور یہ صرف قرآن پاک کی ہی شانِ کریمی ہے کسی اور کتبِ سماوی کو نہ ملی:۔

آٹھویں:۔ یہ کہ جو آیت منسوخ ہے وہ تا قیامت منسوخ ہے اور جو ناسخ وہ ابد تک ناسخ ہے۔ ان کو تیمم اور وضو وغیرہ آیات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ منکرِ حدیث نے دھوکہ کھایا۔ **نہم**:۔ یہ کہ

ناسخ و منسوخ کی جو تعداد ہم نے بیان کی سب علما فقہا کا اس پر اتفاق۔ ہاں البتہ کسی نے پوری تعداد بیان کی کسی نے نہ کی۔ کسی نے ناسخ منسوخ کو علیحدہ کیا اور کسی نے ایک جگہ سب کو لکھ کر مکمل تعداد بتا دی۔ بعض نے حکم قرآنی کو تین طرح سے ختم شدہ کہا ع۱ نسخ ع۲ استثناء ع۳ خصوصیت۔ اس طرح سے اُن کے نزدیک نسخ کی تعداد کم ہو گئی۔ مگر اکثریت نے استثنا اور خصوصیت کو بھی نسخ میں شمار کیا اُن کے نزدیک منسوخ و ناسخ کی تعداد یقیناً زیادہ ہے۔ منکر حدیث کی کم علمی اور نادانی ہے کہ اس کو تعداد میں اختلاف نظر آیا۔ **دسویں**:۔ یہ کہ وہ ایک دور تھا جب ناسخ و منسوخ ہو رہا۔ کہ وحیِ حدیث کو وحیِ قرآن اور وحیِ قرآن کو وحی حدیث منسوخ کرتے رہے اسی طرح وحیِ قرآن کو وحی قرآن۔ اور وحی حدیث کو وحی حدیث نسخ کرتی رہی۔ جب یہ دور ختم ہوا تو سب اپنی اپنی جگہ محکم و مضبوط ہو گئیں۔ اِس دور کے بعد نہ اجتہاد سے منسوخ ہو سکیں۔ نہ قیاس سے۔ نہ کسی خبر سے۔ یہ دور نبی کریم کی حیات طیبہ طاہرہ ظاہرہ و باہرہ کا زمانہ تھا۔ یہ ناسخ و منسوخ سب کے سب نبی کریم نے صحابہ کو بتا دیئے۔ اور صحابہ نے ہم کو۔ اب کوئی عالِم کوئی پیر کوئی ذی عقل و خرد کوئی نئی آیت ناسخ و منسوخ نہیں بنا سکتا۔ اگر کوئی بنائے گا تو کاذب معلون ہے۔ ہمارے اس عقیدے کو بھی قرآن کریم نے متعدد آیات سے ثابت کر دیا۔ چنانچہ۔ پہلی آیت۔ سورۂ انعام آیت ع۱۱۶ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ ترجمہ:۔ اور پورے ہو گئے آپ کے رب کے تمام کلمے صدق اور عدل کے قانون والے کوئی شخص اُس کے اِن کلموں کو تبدیل کرنے والا نہیں۔ اور وہ رب تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ دوسری آیت سورۂ یونس آیت ع۶۴۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ۔ ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کے کلموں میں تبدیلی نہیں ہو گی ع۳ سورۂ انعام آیت ع۳۴ چوتھی آیت سورہ کہف آیت ع۲۷ یہاں بھی یہی بتایا جا رہا ہے۔ پانچویں آیت۔ سورہ مائدہ آیت ع۳ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ ان آیات سے یہی اشارہ ہے کہ اب نسخ نہیں ہو سکتا۔ **گیارھویں بات** یہ کہ صرف احکام کی آیات میں نسخ ہو سکتا ہے۔ لیکن وعظ نصیحت حمد و نعت :۔ وعد و عید خبریں۔ اور قصص کی آیات میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ **بارھویں** یہ کہ صرف قرآن مجید اور احادیث میں ہی ناسخ منسوخ قانون ہیں اس سے پہلے توریت زبور انجیل میں کوئی آیت ناسخ منسوخ نہ ہوئی۔ وہ سب کتاب یکدم آئی اور نبوت کی تنسیخ کے ساتھ ایک دم پوری منسوخ ہو گئی۔ مگر قرآن مجید تھوڑا تھوڑا آیا۔ اور نرم۔ سخت قانون ناسخ منسوخ ہوتے رہے پچھلے دور میں جب کسی نبیِ اکرم کو کفار سے درگزر کا حکم ہوتا تو وہ آخر زندگی تک رہتا۔ سرکش قوم کو جنگ و جہاد سے ختم نہ کرایا جاتا خود رب تعالیٰ عذابِ آسمانی سے سرکشوں کو مٹا دیتا۔ مگر قومِ مصطفیٰ سے یہ سلوک نہیں۔ بلکہ پہلے نبی پاک کو درگزر کا حکم دیا پھر اس حکم کو منسوخ کر کے نبی پاک کو ہی قتال کا حکم دے کر سرکش قوم پر مسلمانوں کے ہاتھوں ہی عذابِ جہاد سے سرکشوں کو مٹایا گیا۔ منکرِ حدیث گروہ کے دماغوں میں تو عقل نہیں ہے ورنہ نزولِ قرآن کا طریقہ ہی ناسخ و منسوخ کی حکمت بتا رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آیتیں آیتیں ہو کر قرآنِ پاک نازل ہو رہا ہے۔ نسخ احکام

تو رحم وکرم کی دلیل ہے۔ وہ استاد رحیم نہیں ہو سکتا جو ایک دم ابتدائی شاگرد کو اوّل آخر سب کتب پڑھنے کا حکم دے۔ نسخ کا انکار رحم وکرم و شفقتِ ربانی کا انکار ہے ہم نے احادیث کی روشنی میں جو ناسخ و منسوخ کی فہرست پیش کی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سب احکام محکم نہیں ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی وہ ۴۳ سورتیں جن میں کوئی ناسخ منسوخ آیت نہیں

۱ سورت فاتحہ	۲ سورت یوسف	۳ سورت یٰسٓ	۴ سورت حجرات	۵ سورت رحمٰن	۶ سورت حدید	۷ سورت الصّف	۸ سورت جمعہ
۹ سورت تحریم	۱۰ سورت ملک	۱۱ سورت الحاقہ	۱۲ سورت نوح	۱۳ سورت قمر	۱۴ سورت مرسلات	۱۵ سورت نبا	۱۶ سورت مطففین
۱۷ سورت نازعات	۱۸ سورت انفطار	۱۹ سورت انشقاق	۲۰ سورت بروج	۲۱ سورت فجر	۲۲ سورت بلد	۲۳ سورت شمس	۲۴ سورت واللّیل
۲۵ سورت والضحیٰ	۲۶ سورت الم نشرح	۲۷ سورت والتین	۲۸ سورت قلم	۲۹ سورت قدر	۳۰ سورت لم یکن	۳۱ سورت زلزلہ	۳۲ سورت عادیات
۳۳ سورت قارعہ	۳۴ سورت التکاثر	۳۵ سورت ھمزہ	۳۶ سورت قریش	۳۷ سورت ماعون	۳۸ سورت کوثر	۳۹ سورت نصر	۴۰ سورت تبت
۴۱ سورت اخلاص	۴۲ سورت فلق	۴۳ سورت ناس	❁	❁	❁	❁	❁

قرآن مجید کی وہ چھ سورتیں جن میں صرف ناسخ آیتیں ہیں

۱	۲	۳	۴	۵	۶
سورت فتح	سورت حشر	سورت منافقون	سورت تغابن	سورت طلاق	سورت الاعلیٰ
ناسخ	ناسخ	ناسخ	ناسخ	ناسخ	ناسخ
ایک آیت ع۱	ایک آیت ع۱	ایک آیت ع	ایک آیت ع	ایک آیت ع	ایک آیت ع۱

قرآن مجید کی وہ ۴۰ چالیس سورتیں جن میں صرف منسوخ آیتیں ہیں

۱ سورت انعام منسوخ ۱۴	۲ سورت اعراف منسوخ ۲	۳ سورت یونس منسوخ ۴	۴ سورت ھود منسوخ ۳	۵ سورت رعد منسوخ ۲
۶ سورت حجر منسوخ ۵	۷ سورت نحل منسوخ ۵	۸ سورت اسرار منسوخ ۳	۹ سورت کہف منسوخ ایک	۱۰ سورت طٰہٰ منسوخ ۳
۱۱ سورت مومنون منسوخ ۲	۱۲ سورت نمل منسوخ ایک	۱۳ سورت قصص منسوخ ایک	۱۴ سورت عنکبوت منسوخ ایک	۱۵ سورت روم منسوخ ایک آخری آیت ع۶
۱۶ سورت لقمان منسوخ ایک	۱۷ سورت سبا یعنی مضاجع منسوخ ایک	۱۸ سورت ملائکہ منسوخ ایک	۱۹ سورت صافات منسوخ ۴	۲۰ سورت صٓ منسوخ ۲
۲۱ سورت زمر منسوخ ۷	۲۲ سورت فصلت منسوخ ایک	۲۳ سورت زخرف منسوخ ۲	۲۴ سورت دخان منسوخ ایک	۲۵ سورت جاثیہ منسوخ ایک
۲۶ سورت احقاف منسوخ ۲	۲۷ سورت محمد منسوخ ۲	۲۸ سورت قٓ منسوخ ۲	۲۹ سورت نجم منسوخ ۲	۳۰ سورت جن منسوخ ایک
۳۱ سورت ممتحنہ منسوخ ۲	۳۲ سورت نٓ منسوخ ۲	۳۳ سورت معارج منسوخ ایک	۳۴ سورت قیامت منسوخ ایک	۳۵ سورت الانسان منسوخ ۲
۳۶ سورت عبس منسوخ ایک	۳۷ سورت طارق منسوخ ایک	۳۸ سورت غاشیہ منسوخ ایک	۳۹ سورت والتین منسوخ ایک	۴۰ سورت کافرون منسوخ ایک

قرآن مجید کی وہ ۴۸ سورتیں جنمیں کفار سے درگزر کرنیکی ۱۱۴ آیتیں ہیں یہ سب منسوخ ہیں

۱ سورت بقرہ	۲ سورت آل عمران	۳ سورت النساء	۴ سورت مائدہ	۵ سورت الانعام	۶ سورت الاعراف
۷ سورت الانفال	۸ سورت توبہ	۹ سورت یونس	۱۰ سورت هود	۱۱ سورت رعد	۱۲ سورت حجر
۱۳ سورت نحل	۱۴ سورت الاسراء	۱۵ سورت مریم	۱۶ سورت طٰہٰ	۱۷ سورت الحج	۱۸ سورت مومنون
۱۹ سورت نور	۲۰ سورت نمل	۲۱ سورت قصص	۲۲ سورت عنکبوت	۲۳ سورت روم	۲۴ سورت لقمان
۲۵ سورت سجدہ	۲۶ سورت احزاب	۲۷ سورت سبا	۲۸ سورت فاطر	۲۹ سورت یٰسٓ	۳۰ سورت صافات
۳۱ سورت صٓ	۳۲ سورت الزمر	۳۳ سورت مومن	۳۴ سورت حٰم سجدہ	۳۵ سورت شوریٰ	۳۶ سورت زخرف
۳۷ سورت دخان	۳۸ سورت جاثیہ	۳۹ سورت الاحقاف	۴۰ سورت محمد	۴۱ سورت قٓ	۴۲ سورت مزمل
۴۳ سورت الانسان	۴۴ سورت الطارق	۴۵ سورت غاشیہ	۴۶ سورت والتین	۴۷ سورت الکافرون	۴۸ سورت جنّ

قرآن مجید کی وہ ۲۵ پچیس سورتیں جن میں ناسخ اور منسوخ دونوں قسم کی آیتیں ہیں

۱ سورت بقرہ منسوخ ۲۵ ناسخ ۱۶	۲ سورت آل عمران منسوخ ۵ ناسخ ایک	۳ سورت نساء منسوخ ۲۳ ناسخ ۱۳	۴ سورت مائدہ منسوخ ۹ ناسخ ۶	۵ سورت الانفال منسوخ ۶ ناسخ ۵	۶ سورت توبہ منسوخ ۷ ناسخ ۶
۷ سورت ابراہیم منسوخ ایک ناسخ ایک	۸ سورت مریم منسوخ ۵ ناسخ ۲	۹ سورت انبیاء منسوخ ۲ ناسخ ایک	۱۰ سورت حج منسوخ ۲ ناسخ ایک	۱۱ سورت نور منسوخ ۷ ناسخ ۷	۱۲ سورت فرقان منسوخ ۲ ناسخ ایک

۱۳ سورت شعراء منسوخ ایک ناسخ ایک	۱۴ سورت سجدہ منسوخ ایک ناسخ ایک	۱۵ سورت احزاب منسوخ ۲ ناسخ ایک	۱۶ سورت مومن منسوخ ۲ ناسخ ایک	۱۷ سورت شوریٰ منسوخ ۸ ناسخ ۲	۱۸ سورت زاریات منسوخ ۲ ناسخ ایک
۱۹ سورت طور منسوخ ایک ناسخ ایک	۲۰ سورت واقعہ منسوخ ایک ناسخ ایک	۲۱ سورت مجادلہ منسوخ ایک ناسخ ایک	۲۲ سورت مزمّل منسوخ ۶ ناسخ ایک	۲۳ سورت مدثر منسوخ ایک ناسخ ایک	۲۴ سورت تکویر منسوخ ایک ناسخ ایک

۲۵
سورت عصر، منسوخ ایک ؛ ۔ ناسخ ایک

ناسخ و منسوخ آیات کی مکمل ترتیب وار فہرست

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	بقرہ	انّ الذین امنوا والذین ھاجروا	۶۲	آل عمران	ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل	۸۵
۲	بقرہ	وقولو للناس	۸۲	توبہ	فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم آیۃ سیف	۵
۳	〃	فاعفوا واصفحوا حتیٰ یاتی اللّٰہ	۱۰۹	توبہ	قاتلوا الذین لا یومنون باللّٰہ ولا بالیوم	۲۹
۴	〃	فاینما تولوا فثمّ وجہ اللّٰہ	۱۱۵	بقرہ	قل للّٰہ المشرق والمغرب یھدی من یشاء	۱۴۲
۵	〃	اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا	۱۵۹	بقرہ	الا الذین تابوا واصلحوا	۱۶۰
	〃	من البینات		〃	وَبَیَّنُوْا	
۶	〃	اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ	۱۷۳	حدیث	قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم احلت لنا میتتان ودمان	
۷	〃	کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ	۱۷۷	مائدہ	وَکتبنا علیھم فیھا انّ النّفس	۴۵
	〃	الحر بالحر			بالنّفس	
۸	〃	کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت	۱۸۰	نساء	یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم للذّکر مثل حظ	۱۱
۹	〃	یاایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام	۱۸۳	بقرہ	احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الیٰ نسائکم	۱۸۷
۱۰	〃	وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام	۱۸۴	بقرہ	فمن شھد منکم الشھر	۱۸۵
	〃	مسکین		〃	فلیصمہ	

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱۱	بقرہ	قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم لاتعتدوا	۱۹۰	توبہ	فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم	5
۱۲	//	ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتیٰ یقاتلوکم	۱۹۱	بقرہ	فان قاتلوکم فاقتلوھم	۱۹۱
۱۳	//	فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم	۱۹۳	توبہ	اٰیۃ سیف	5
۱۴	//	لاتحلقوا رؤسکم حتیٰ یبلغ الھدی محلہ	۱۹۶	بقرہ	فمن کان منکم مریضًا او بہ اذًى من راسہ	۱۹۶
۱۵	//	یسئلونک ماذا ینفقون قل ما انفقتم	۲۱۵	توبہ	انما الصدقات للفقراء والمساکین	۶۰
۱۶	//	یسئلونک عن الشھر الحرام قتالٌ فیہ	۲۱۷	توبہ	اٰیۃ السیف	5
۱۷	//	یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو	۲۱۹	توبہ	خذ من اموالھم صدقۃً تطھرھم وتزکیھم	۱۰۳
۱۸	//	یسئلونک عن الخمر والمیسر	۲۱۹	بقرہ	واثمھما اکبر من نفعھما	۲۱۹
۱۹	//	وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکَاتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ	۲۲۱	مائدہ //	والمحصنات من المومنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب	5
۲۰	//	وبعولتھن احق بردھن فی ذالک	۲۲۸	بقرہ	الطلاق مرتان فامساکٌ بمعروفٍ او تسریح	۲۲۹
۲۱	//	وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاخُذُوا مما اٰتیتموھُنَّ	۲۲۹	//	اِلَّا ان یخافا الّا یقیما حدود اللہ	۲۲۹
۲۲	//	والوالدات یرضعنَ اولادھن حولین کاملین	۲۳۳	//	فان ارادا فصالًا عن تراضٍ منھما وتشاور فلا جناح	۲۳۳
۲۳	//	والذین یتوفون منکم ویذرون اَزْوَاجًا وصیۃ	۲۴۰	//	والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن	۲۳۴
۲۴	//	لا اکراہ فی الدین	۲۵۶	توبہ	اٰیۃ سیف	5
۲۵	//	اشھدوا اذا تبایعتم	۲۸۲	بقرہ	فان اَمِنَ بعضکم بعضًا فلیود الذی اؤتمن	۲۸۳
۲۶	//	وان تبدوا ما فی اَنْفُسِکُمْ او تخفوہ یحاسبکم	۲۸۴	//	لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا	۲۸۶

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	آل عمران	وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلَاغُ	۲۰	توبہ	اٰیۃ سیف	5
۲ ۳ ۴	//	کیف یھدی اللہ قومًا کفروا بعد ایمانھم ۔ ۳ آیتیں	۸۶ ۸۷ ۸۸	آل عمران	اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذَالِکَ وَاَصْلَحُوْا	۸۹

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۵	آل عمران	یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ	۱۰۲	تغابن	فاتقوا اللہ ما استطعتم	۱۶
۱	نساء	واذا حضر القسمۃ اولوا القربیٰ والیتامیٰ	۸	نساء	یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ	۱۱
۲	نساء	ولیخش الذین لو ترکوا من خلفہم	۹	بقرہ	فمن خاف من موص جنفا او اثما	۱۸۲
۳	نساء	ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ	۱۰	نساء	ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف	۶
۴	//	واللاتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم	۱۵	حدیث	قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خذوا عنی الشیب بالشیب	
۵	//	والذان یاتیانہا منکم فاذوہما	۱۶	نور	الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد	۲
۶	//	انما التوبۃ علی اللہ للذین یعملون	۱۷	نساء	ولیست التوبۃ للذین یعملون	۱۸
۷	//	یا ایہا الذین امنوا لا یحل لکم ان ترثوا	۱۹	//	الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ	۱۹
۸	//	انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا	۲۲	//	الا ما قد سلف	۲۲
۹	//	الا ما قد سلف :-	۲۳	//	ان تجمعوا بین الاختین	۲۳
۱۰	//	فما استمتعتم بہ منہن فاتوہن	۲۴	حدیث	قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انی کنت احللت	
۱۱	//	یا ایہا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم :-	۲۹	نور	لیس علی الاعمیٰ حرج ولا علی المریض :-	۶۱
۱۲	//	والذین عقدت ایمانکم فاتوہم نصیبہم	۳۳	انفال	واولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض	۷۵
۱۳	//	فاعرض عنہم وعظہم	۶۳	توبہ	آیت السیف	۵
۱۴	توبہ	استغفر لہم او لا تستغفر لہم	۸۰	نساء	واذ ظلموا انفسہم جاؤک	۶۴
۱۵	//	یا ایہا الذین امنوا خذوا حذرکم	۷۱	//	وما کان المومنون لینفروا کافۃ	
۱۶	//	ومن تولیٰ فما ارسلناک حفیظا	۸۰	توبہ	آیت سیف	۵
۱۷	//	فاعرض عنہم وتوکل علی اللہ	۸۱	//	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱۸	توبہ	اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ	۹۰	توبہ	آیت سیف	۵
۱۹	〃	ستجدون آخرین یریدون ان یامنوکم	۹۱	〃	آیت سیف	۵
۲۰	〃	فَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عدوّ لکم	۹۲	〃	بَرَاءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ	۱
۲۱	〃	ومن یقتل مومنًا متعمدًا فجزاءہ	۹۳	نساء	اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ	۱۱۶
۲۲	〃	ان المنافقین فی الدرک الاسفل	۱۴۵	〃	اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا	۱۴۶
۲۳	〃	فما لکم فی المنافقین فئتین	۸۸	توبہ	آیت سیف	۵
۲۴	〃	فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک	۸۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	مائدہ	لا تحلوا شعائر اللہ	۲	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	فاعف عنھم	۱۳	توبہ	قاتلوا الذین لا یومنون باللہ	۲۹
۳	〃	انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ	۳۳	مائدہ	اِلَّا الذین تابوا من قبل اَنْ تَقْدِرُوْا	۳۴
۴	〃	فان جاؤک فاحکم بینھم او اعرض عنھم	۴۲	مائدہ	وَاَنِ احْکُمْ بینھم بما انزل اللہ	۴۹
۵	〃	ما علی الرسول الا البلاغ	۹۹	توبہ	آیت سیف	۵
۶	〃	یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم	۱۰۵	مائدہ	اِذَا اهْتَدَیْتُمْ	۱۰۵
۷	〃	شھادۃ بینکم	۱۰۶	طلاق	وَاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ	۲
۸	〃	فَاِنْ عُثِرَ عَلٰی اَنَّھُمَا اسْتَحَقَّا اِثْمًا	۱۰۷	طلاق	وَاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ	۲
۹	〃	ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ یَّاْتُوْا بالشھادۃ	۱۰۸	طلاق	وَاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ	۲
۱	الانعام	قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یومٍ	۱۵	فتح	لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ من ذنبک	۲
۲	〃	اذا رایت الذین یخوضون فی اٰیٰتنا فاعرض	۶۸	نساء	فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیثٍ	۱۴۰
۳	〃	وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ من حسابھم من شیءٍ	۶۹	نساء	فَلَا تَقْعُدُوْا معھم حتی یخوضوا فی حدیثٍ	۱۴۰
۴	〃	وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دینھم لعبًا ولھوًا	۷۰	توبہ	قاتلوا الذین لا یومنون باللہ	۲۹
۵	〃	ثُمَّ ذرھم فی خوضھم یَلْعَبُوْنَ	۹۲	توبہ	آیت سیف	۵
۶	〃	فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ عَمِیَ فعلیھا	۱۰۵	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۷	الانعام	واعرض عن المشرکین	۱۰۷	توبہ	آیت سیف	۵
۸	〃	وماجعلناکَ عَلَیْہِمْ حَفِیْظًا وما انت علیھم	۱۰۸	〃	آیت سیف	۵
۹	〃	ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ	۱۰۹	〃	آیتُ السّیف	۵
۱۰	〃	فذرھم وما یفترون	۱۳۸	〃	آیت سیف	۵
۱۱	〃	لا تاکلوا مما لم یذکر اسمُ اللہ	۱۲۲	المرہ	الیوم اُحِلَّ لکم الطیبات وطعام الذین	۵
۱۲	〃	یاقوم اعلموا علی مکانتکُمْ	۱۳۶	توبہ	آیت سیف	۵
۱۳	〃	ان الذین فرّقُوا دینھم وکانُوْ شِیَعًا	۱۶۰	〃	آیت السیف	۵
۱	الاعراف	وذروا الذین یلحدون فی اَسمائہٖ	۱۸۰	توبہ	آیت السیف	۵
۲	〃	واعرض عن الجاھلین	۱۹۹	توبہ	آیت السیف	۵
۱	الانفال	یسئلونک عَنِ الْاَنْفَالِ	۱	انفال	واعلموا انما غنمتم مِنْ شیءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ	۴۱
۲	〃	وَمَا لَھُمْ اَلَّا یُعَذِّبَھُمْ	۳۳	〃	وَمَا کان اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ	۳۳
۳	〃	قُلْ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنْ یَنْتَھُوْا یُغْفَرْلَھُمْ	۳۸	بقرہ	وقاتلوھم حتّٰی لا تکونَ فتنۃٌ	
۴	〃	واِن جنحوا للسلم فاجنح لھا	۶۱	توبہ	قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیومِ الْاٰخِرِ	۲۹
۵	〃	ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا	۶۵	انفال	اَلْاٰن خفف اللہ عنکم وعلم اَنَّ فِیْکُمْ ضعفا۔	۶۶
۶	〃	والذین اٰمَنُوْا ولم یھاجروا لکم	۷۲	〃	واولوا الارحام بعضھم اولٰی بِبَعْضٍ	۷۵
۱	توبہ	براءۃٌ من اللہ ورسولہٖ	۱	توبہ	آیۃ السیف	۵
۲	〃	والذین یکنزون الذھب والفضۃَ	۳۴	بقرہ	وَاٰتُوا الزَّکَاۃَ	۴۳
۳	〃	الا تنفروا یعذبکم عذابًا الیما	۳۹	توبہ	وما کان المومنون لینفروا کآفَّۃً	۲۲
۴	〃	عَفَا اللّٰہُ عنک لِمَ اذنت لَھُمْ	۴۳	نور	فاِذا استاذنوک لبعض شَاْنِہِمْ فاذن لِمَنْ شئت	۶۲
۵	〃	استغفر لھم	۸۰	منافقون	سواءٌ علیھم استغفرت لھم ام لَمْ تستغفر	۶
۶ ۷	〃	الاعراب اشد کفرا ونفاقا ومن الاعراب من یتخذ	۹۷ ۹۸	توبہ	ومن الاعراب من یومن باللہ والیومِ الْاٰخِرِ	۹۹

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	یونس	انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم	۱۵	فتح	لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر	۲
۲	〃	قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین	۱۰۲	توبہ	آیۃ سیف	۵
۳	〃	وان کذبوک فقل لی عملی ولکم عملکم	۴۱	〃	آیۃ سیف	۵
۴	〃	فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ	۱۰۸	〃	آیۃ سیف	۵
۱	ھود	من کان یرید الحیاۃ الدنیا وزینتھا	۱۵	اسراء	من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء	۱۸
۲	〃	وقل للذین لا یومنون اعملو	۱۲۱	توبہ	آیت السیف	۵
۳	〃	وانتظروا انا منتظرون	۱۲۲	توبہ	آیت سیف	۵
۱	رعد	فانما علیک البلاغ	۴۰	توبہ	آیت السیف	۵
۲	〃	فان ربک لذو مغفرۃ للناس	۶	نساء	ان اللہ لا یغفر ان یشرک	۱۱۶
۱	ابراہیم	وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان الانسان	۳۴	نحل	ان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان اللہ لغفور رحیم	۱۸
۱	حجر	ذرھم یاکلوا ویتمتعوا	۲	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	فاصفح الصفح الجمیل	۸۵	〃	آیت سیف	۵
۳	〃	لا تمدن عینیک الی ما متعنا	۸۸	〃	آیت سیف	۵
۴	〃	قل انی انا النذیر المبین	۸۹	〃	آیت سیف	۵
۵	〃	فاصدع بما تومر واعرض عن	۹۴	〃	آیت سیف	۵
۱	نحل	تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا	۶۷	اعراف	قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن	۳۳
۲	〃	فانما علیک البلاغ	۸۲	توبہ	آیت السیف	۵
۳	〃	من کفر باللہ من بعد ایمانہ	۱۰۶	نحل	الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان	۱۰۶
۴	〃	وجادلھم	۱۲۵	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	نمبر آیت	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۵	نحل	واصبر	۱۲۷	توبہ	آیت سیف	۵
۱	اسراء	رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا	۲۴	توبہ	ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا	۱۱۳
۲	〃	وما ارسلناک علیہم وکیلا	۵۴	توبہ	آیت سیف	۵
۳	〃	قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن	۱۱۰	اعراف	واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخفیا	۲۰۵
۱	مریم	وانذرھم یوم الحسرۃ	۳۹	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	یلقون غیا	۵۹	شعرا	الا من تاب وآمن وعمل	۷
۳	〃	قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمٰن	۷۵	توبہ	آیت سیف	۵
۴	〃	فلا تعجل علیہم	۸۴	〃	آیت سیف	۵
۵	〃	فخلف من بعدہم خلف	۵۹	مریم	الا من تاب وآمن	۶۰
۱	کہف	فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر	۲۹	تکویر	الا ان یشاء اللہ	۲۹
۱	طٰہٰ	ولا تعجل بالقرآن من قبل	۱۱۴	اعلیٰ	سنقرئک فلا تنسیٰ	۶
۲	〃	فاصبر علیٰ ما یقولون	۱۳۰	توبہ	آیت سیف	۵
۳	〃	قل کل متربص فتربصوا	۱۳۵	توبہ	سیف	۵
۱	انبیاء	انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم	۹۸	انبیاء	ان الذین سبقت لہم منا الحسنیٰ	۱۰۱
۲	〃	وکل فیہا خالدون	۹۹	〃	ان الذین سبقت لہم منا الحسنیٰ	۱۰۱
۱	حج	وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی	۵۲	اعلیٰ	سنقرئک فلا تنسیٰ	۶
۲	〃	یحکم بینہم	۵۶	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	مومنون	فذرهم فی غمرتهم حتی حین	۵۴	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	ادفع بالتی ھی احسن	۹۶	توبہ	سیف	۵
۱	نور	ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا	۴	نور	الا الذین تابوا	۵
۲	〃	الزانی لا ینکح الا زانیة او مشرکة	۳	نور	وانکحوا الایامی منکم	۳۲
۳	〃	والذین یرمون ازواجهم ولم یکن لهم شهداء	۶	نور	والخامسة ان غضب الله علیها	۹
۴	〃	لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم	۲۷	نور	لیس علیکم جناح ان تدخلوا بیوتا	۲۹
۵	〃	وقل للمومنات یغضضن من ابصارهن	۳۱	نور	والقواعد من النساء	۶۰
۶	〃	فانما علیه ما حمل وعلیکم ما حملتم	۵۴	توبہ	آیت سیف	۵
۷	〃	یا ایها الذین امنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم	۵۸	توبہ	اذا بلغ الاطفال منکم الحلم	۵۹
۱	فرقان	والذین لا یدعون مع الله الٰها آخر (الی) ویخلد فیه مهانا	۶۸	فرقان	الا من تاب وامن وعمل عملا صالحا	۷۱
۲	〃	واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما	۶۳	توبہ	آیت سیف	۵
۱	شعرا	والشعراء یتبعهم الغاوون	۲۲۵	شعرا	الا الذین امنوا وعملوا الصالحات	۲۲۷
۱	نمل	وان اتلوا القرآن	۹۲	توبہ	آیت سیف	۵
۱	قصص	لنا اعمالنا ولکم اعمالکم	۵۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	عنکبوت	ولا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی ھی احسن	۴۶	توبہ	آیت سیف	۵
۱	روم	فاصبر ان وعد الله حق	۶۰	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	لقمان	وَمَنْ کفر فلا یحزنک کفرہٗ	۲۳	توبہ	آیت سیف	۵
۱	سجدہ	فاعرض عنھم وانتظر انّھم منتظرون	۳۰	توبہ	آیت سیف	۵
۱	احزاب	ولا تطع الکافرین والمنافقین وَدَعْ اذٰھم وتوکل علی اللہ	۴۸	توبہ	آیت السیف	۵
۲	〃	لا یحل لک النساء مِنْ بَعْدُ	۵۲	احزاب	یا ایّھا النبی اِنّا احللنا لک ازواجک	۵۰
۱	سبا	قل لا تسئلون عما اجرمنا ولا نسئل	۲۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	صافات	فتول عنھم حتی حین	۱۷۴	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	وابصرھم فسوف یبصرون	۱۷۵	〃	آیت سیف	۵
۳	〃	وتولَّ عنھم حتی حین	۱۷۸	〃	آیت سیف	۵
۴	〃	وابصر فسوف یبصرون	۱۷۹	〃	آیت سیف	۵
۱	ص	ان یوحیٰ الیّ الا انّما انا نذیر	۷۰	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَہٗ بعد حین	۸۸	〃	آیت سیف	۵
۱	زمر	انّ اللہ یحکم بینھم فیما ھم فیہ یختلفون	۳	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	قل انی اخاف ان عصیتُ	۱۳	فتح	لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک	۲
۳	〃	فاعبدوا ما شئتم	۱۵	توبہ	آیت سیف	۵
۴	〃	ومن یضلل اللہ فما لہ من ھادٍ	۲۳	〃	آیت سیف	۵
۵	〃	قل یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکُم	۳۹	〃	آیت سیف	۵
۶	〃	انت تحکم بین عبادک فیما کانوا	۴۶	〃	آیت السیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۷	زمر	فمن اهتدى فلنفسه ومن ضل	۴۱	توبہ	آیت سیف	۵
۱	المؤمن	فاصبر ان وعد الله حق	۵۵	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	فاما نرینهم بعض الذی نعدهم	۷۷	〃	آیت سیف	۵
۱	فصلت	ولا تستوی الحسنة ولا السیئة	۳۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	الشوریٰ	ویستغفرون لمن فی الارض	۵	مومن	ویستغفرون للذین	۷
۲	〃	الله حفیظ علیهم وما انت علیهم بوکیل	۶	توبہ	آیت سیف	۵
۳	〃	فلذلک فادع واستقم کما امرت	۱۵	〃	قاتلوا الذین لا یومنون بالله ولا بالیوم	۲۹
۴	〃	من کان یرید حرث الآخرة نزد له	۲۰	اسراء	من کان یرید العاجلة عجلنا له	۱۸
۵	〃	قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودة فی	۲۳	سبا	قل لا اسئلکم علیه من اجر فهو لکم	۴۷
۶	〃	والذین اذا اصابهم البغی هم	۳۹	شوریٰ	ولمن صبر وغفر ان ذالک لمن عزم	۴۳
۷	〃	ولمن انتصر بعد ظلمه فاولئک	۴۱	توبہ	ولمن صبر وغفر ان ذالک لمن عزم	۴۳
۸	〃	فان اعرضوا فما ارسلناک علیهم حفیظا	۴۸	〃	آیت سیف	۵
۱	زخرف	فذرهم یخوضوا ویلعبوا	۸۳	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	فاصفح عنهم وقل سلام	۸۹	〃	آیت سیف	۵
۱	دخان	فارتقب انهم مرتقبون	۵۹	توبہ	آیت سیف	۵
۱	جاثیہ	قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون	۱۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	احقاف	وما ادری ما یفعل بی ولا بکم	۹	فتح	انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک الله	۲

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۲	احقاف	فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل	۳۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	سورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً	۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	ق	فاصبر علی ما یقولون	۳۹	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	وما انت علیھم بجبارٍ	۴۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	ذاریات	وفی اموالھم حق للسائل	۱۹	بقرہ	واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ	۴۳
۲	〃	فتول عنھم فما انت بملوم	۵۴	ذاریات	وذکر فان الذکرٰی تنفع المومنین	۵۵
۱	طور	واصبر لحکم ربک فانک باعیننا	۴۸	توبہ	آیت سیف	۵
۱	نجم	فاعرض عمن تولٰی	۲۹	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی	۳۹	طور	وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْھُمْ ذُرِّیَّتُھُمْ	۲۱
۱	واقعہ	ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۱۳ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ	۱۴	واقعہ	ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۳۹ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ	۴۰
۱	مجادلہ	یاایھا الذین اٰمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی	۱۲	مجادلہ	ءاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم	۱۳
۱	ممتحنہ	لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین	۸	ممتحنہ	انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم	۹
۲	〃	اذا جاءکم المومنات مھاجرات	۱۰	〃	فلا ترجعوھن الی الکفار	۱۰
۳	〃	وان فاتکم شیءٌ من ازواجکم الی الکفار	۱۱	توبہ	آیت سیف	۵
۱	ن قلم	فذرنی ومن یکذب بھٰذا الحدیث	۴۴	توبہ	آیت سیف	۵

آیت نمبر	ان کی ناسخ آیتیں	نام سورت	آیت نمبر	منسوخ آیتیں	نام سورت	نمبر شمار
۵	آیت سیف	توبہ	۴۸	فاصبر لحکم ربک	ن قلم	۲
۵	آیت سیف	توبہ	۴۲	فذرھم یخوضوا ویلعبوا	معارج	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۲۱	قل انی لا املک لکم ضرًّا	جن	۱
۲	الا قلیلاً	مزمل	۲	قم اللیل	مزمل	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۱۰	فاھجرھم ھجراً جمیلاً	〃	۲
۵	آیت سیف	توبہ	۱۱	وذرنی والمکذبین	〃	۳
۳۰	وما تشاءون الا ان یشاء اللّٰہ	دھر	۱۹	فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا	〃	۴
۵	آیت سیف	توبہ	۱۱	ذرنی ومن خلقت وحیداً	مدثر	۱
۶	سنقرئک فلا تنسٰی	اعلیٰ	۱۶	لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ	قیامت	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۲۴	فاصبر لحکم ربک ولا تطع منھم آثماً او کفورا	دھر الانسان	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۲۹	ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا	〃	۲
۲۹	وما تشاءون الا ان یشاء اللّٰہ رب العالمین	تکویر	۱۱	کلا انھا تذکرۃ فمن شاء ذکرہ	عبس	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۱۷	فمھل الکافرین امھلھم رویدا	طارق	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۲۲	لست علیھم بمسیطر	غاشیہ	۱
۵	آیت سیف	〃	۸	الیس اللّٰہ باحکم الحاکمین	والتین	۱
۳	الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات	عصر	۲	ان الانسان لفی خسر	عصر	۱
۵	آیت سیف	توبہ	۶	لکم دینکم ولی دین	کافرون	۱

یہ تھی نسخ کی مکمل تفصیل۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ نسخ واقعی حقیقت ہے۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ نسخِ آیاتِ قرآنیہ کی چاروں قسمیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ رجم کی آیت بھی حکماً موجود ہے لفظاً و تلاوۃً منسوخ ہے۔ اگر اس آیتِ مشہورہ اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّۃَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ کا انکار کر دیا جائے تو سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ کا بھی انکار لازم آئے گا۔ کیونکہ اس آیتِ رجم کے بغیر اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ضد بازی اور جہالت سے تنسیخ کے انکار کو ہم نہیں روک سکتے۔ ورنہ حقیقت میں تنسیخ کا انکار ناممکن ہے۔ پھر خیال رہے حکم کے نسخ کی تین قسمیں اس طرح بھی ہیں کہ ۱؎ وجوبی حکم کا نسخ ۲؎ حکمِ جوازی کا نسخ ۳؎ حکم استحبابی کا نسخ کا۔ مثلاً پہلے آیتِ منسوخ میں ایک حکم بجالانا فرض تھا۔ ناسخ آیت نے صرف فرضیت منسوخ کی مگر جواز باقی رہا۔ اسی طرح منسوخ آیت میں ایک حکم تھا۔ ناسخ نے اس کا جواز ہی ختم کر دیا۔ اب وہ کام کرنا جائز ہی نہ رہا۔ اسی طرح پہلے کسی آیت میں ایک مستحب کیا گیا تھا دوسری آیت نے اس کا استحباب ختم کر دیا کہ اب وہ کام کرنا نہ کرنا برابر ہے یا نہ کرنا مستحب ہو گیا کرنا بھی صرف جائز رہا۔ یہ تفصیل علماءِ کرام سے پوچھی جا سکتی ہے تفاسیر میں مرقوم ہے۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ جس طرح آیت کا کلام منسوخ ہوتا ہے کبھی صرف حکم وغیرہ۔ اسی طرح کبھی صرف عمومیت منسوخ ہوتی کبھی آدھا حکم۔ کبھی ایک آیت آدھی آیت کو منسوخ کرتی ہے کبھی پوری کو کبھی ایک آیت بہت سی آیات کو کبھی دو ناسخ آیتیں ایک آیت کو منسوخ کرتی ہیں۔ یہ تفصیل بھی تفاسیر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر ہماری یہ ساری تفصیلی گفتگو ذہن نشین رہی تو انشاء الرحمٰن جل جلالہ کبھی کوئی منکرِ احادیث بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے پر ایمان لانے کے بعد رجم زانی کا قانون بخوبی حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر مزید تسلی کے لیے یہ تیسری بات تفصیلاً بیان کرنا ضروری ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں سزاؤں کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کا ثبوت کس طرح ہے۔ تو خیال رہے۔ سزاؤں کی شریعت میں صرف تین قسمیں ہیں ۱؎ حد ۲؎ تعزیر ۳؎ قصاص۔ حد وہ سزا ہے جو قرآن مجید یا حدیثِ پاک یا دونوں سے ثابت ہو یا اجماعِ صحابہ سے ثابت ہو یا ان تینوں سے ثابت ہو۔ چنانچہ ہدایہ اولین حاشیہ ص۵۱۳ پر ہے۔ الحد وہی الزواجر المقدرۃ الثابتۃ بالکتاب او السنۃ او الاجماع۔

اور فتاویٰ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۹۳ پر ہے۔ مُقَدَّرَۃٌ اَیْ مُبَیَّنَۃٌ بِالْکِتَابِ اَوِ السُّنَّۃِ اَوِ الْاِجْمَاعِ۔ ترجمہ۔ سزاءِ حد۔ قرآنِ مجید اور حدیثِ پاک اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہوتی ہے۔ حدود کی سزا وہ ہے جو بالکل مقرر و معین ہو ذرہ برابر کسی کی رائے یا سفارش سے نہ کم ہو سکے نہ زیادہ۔ اور نصِ قطعی سے ثابت ہو۔ چنانچہ فتاویٰ بحر الرائق جلد پنجم ص۲ پر اور فتاویٰ فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۱۲ اور شامی شریف جلد سوم صفحہ نمبر ۱۹۲ ہدایہ اولین صفحہ نمبر ۴۸۵ اور فتاویٰ عالمگیری جلد دوم ص۱۴۲ پر ہے وَالْحَدُّ فِی الشَّرِیْعَۃِ اَلْعُقُوْبَۃُ الْمُقَدَّرَۃُ حَقًّا لِلّٰہِ تَعَالٰی:- (ترجمہ) شریعت پاک میں حد اس

سزا کو کہتے ہیں جو بالکل مقرر اور صرف حق اللہ ہو۔ فقہ شافعی حاشیہ بیجوری جلد دوم صـ ۲۶۵ پر ہے:۔ فَاِنَّ الشَّارِعَ قَدَّرَهَا فَلَا يُزَادُ عَلَيْهَا وَلَا يُنْقَصُ (ترجمہ):۔ اہلِ شریعت یعنی مالک شریعت نے اس سزا کا اندازہ مقرر کر دیا اب نہ زیادہ کی جا سکتی ہے نہ کم۔ دوسری سزا یعنی تعزیر۔ عزرٌ سے مشتق ہے۔ اس کا لغوی ترجمہ ہے جھڑکنا ذلیل کرنا۔ شریعت میں اس سزا کو تعزیر کہا جاتا ہے جو قرآن حدیث نے مقرر نہ کی ہو بلکہ حاکمِ اسلام کی مرضی پر ہو۔ چنانچہ فتح القدیر جلد چہارم صـ ۲۱۱ پر ہے۔ اَلزَّوَاجِرُ الَّتِیْ دُوْنَهَا فِی الْقَدْرِ وَقُوَّةِ الدَّلِیْلِ وَهُوَ التَّعْزِیْرُ وَهُوَ تَادِیْبٌ دُوْنَ الْحَدِّ وَاَصْلُهٗ مِنَ الْعَزْرِ بِمَعْنَی الرَّدِّ وَالرَّدْعِ۔ (ترجمہ):۔ وہ سزائیں جو دلائل اور مقدار میں حد کی مثل نہ ہوں وہ تعزیر ہے۔ مقصود صرف ادب سکھانا اور جرم روکنا ہو اس کا اصلی یعنی لغوی معنیٰ ہے عزر یعنی ذلیل کرنا جھڑکنا۔ تعزیری سزا کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے اور حدیثِ پاک سے بھی:۔

اور حاکم وقت اپنی مرضی سے بھی حسبِ حالات مقرر کر سکتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے۔ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ۔ ترجمہ:۔ نافرمان بیویوں کو یا نصیحت سے سمجھاؤ یا اُن سے بول چال بند کر دو انہیں بستروں میں چھوڑ رکھو اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ان کو مارو۔ یہ آیت تعزیری سزا کو ثابت کر رہی ہے۔ اور واؤ بمعنیٰ اَوْ ہے۔ تعزیر پر عمل واجب نہیں ہوتا حالات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے۔ اسی لیے تعزیر کی مقدار کبھی مقرر نہیں ہوتی۔ فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۱۲ پر ہے:۔ اَنَّهٗ لَیْسَ فِیْهِ شَیْءٌ مُقَدَّرٌ بَلْ مُفَوَّضٌ اِلٰی رَأْیِ الْقَاضِیْ۔ (ترجمہ):۔ بے شک وہ سزا جس کو اسلام نے مقدارِ معین سے بیان نہ کیا بلکہ حاکم کی رائے کے سپرد کیا وہ تعزیر۔ اسی طرح جس سزا کی تقسیم کر دیں کریا وہ بھی تعزیر ہے۔ جیسے کہ مندرجہ بالا آیت میں نافرمان بیویوں کی سزا کو تعزیر بنایا۔ اور جس طرح تارکینِ زکوٰۃ یا سود خوروں کی سزا کا اس طرح ذکر ہو البقرہ آیت ۲۷۹ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ۔ اسی طرح سورۃ مائدہ آیت ۳۳ میں سزا تقسیم ہے چونکہ یہاں بھی سزا منقسمہ ہو گئی اس لیے یہ تعزیر ہوئی نہ کہ حد۔ تیسری سزا قصاص ہے۔ یہ لفظ قَصٌّ سے بنا ہے۔ اس کا لغوی ترجمہ ہے۔ مجرم کا پیچھا کرنا (از غریب القرآن صـ ۳۰ و مجمع البحار جلد دوم صـ ۲۰۶) اور شرعی ترجمہ ہے۔ کسی انسان کو جسمانی نقصان پہنچانے والے مجرم کو اسی قسم کی سزا دینی جیسا اس نے نقصان کیا خواہ گردن کاٹے یا ہاتھ یا ؤں۔ ناک کان یا مجرم جسم پر زخم لگائے۔ حدود خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ تعزیر بندوں کا بھی حق ہے اور حق اللہ بھی۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی معاشرے کے جرم سیاسی جرم سب اس میں شامل ہیں۔ قصاص صرف انفرادی حق العبد ہے۔ اسی لیے حدود سزائیں مقداراً مقرر ہیں اور کسی کے معاف کرانے سے حاکم معاف نہیں کر سکتا۔ قصاص کی مقدار مقرر تو ہے مگر والی وارث یا خود مظلوم مجروح دیت بھی لے سکتا ہے معاف بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر صـ ۱۴۳ پر ہے:۔ وَالْحَدُّ فِی الشَّرِیْعَةِ الْعُقُوْبَةُ الْمُقَدَّرَةُ

حقاللہ تعالیٰ حتی لا یسمی القصاص حداً لما انہ حق العبد ولا التعزیر۔ (ترجمہ): حد خالص اللہ کا حق ہے اسی لیئے مقدار معین ہے قصاص کو حد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ حق العبد ہے تعزیر بھی حد نہیں ہو سکتی کیونکہ معین نہیں۔ خیال رہے کہ اللہ رب العزت کے خالص حق شمار ہیں۔ ایک عقائد میں پانچ عبادات ہیں اور ایک سزاؤں میں جن کی فہرست علی الترتیب اس طرح ہے۔ ۱ ایمان لانا۔ ۲ نماز ۳ زکوۃ ۴ روزہ ۵ حج ۶ جہاد ۷ شرعی حدود سے سزائیں۔ تعزیری سزائیں تو بے شمار ہیں اور جرموں کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر حدود کی سزائیں صرف پانچ قسم کی ہیں۔

پہلی قسم:- حدِ زنا یہ سزا سب سے بڑی ہے کیونکہ جرم سب سے بڑا ہے۔ اسی لیئے یہ سزا قرآن مجید، حدیثِ پاک اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے، قرآن مجید سے ثابت ہونے کا مطلب ہے کہ اس کا صرف حکم وجوبی اور مقدار ثابت ہے۔ حدیث پاک سے ثابت ہونے کا مطلب ہے کہ حکم وجوبی بھی مقدار بھی اور عمل بھی حدیث سے ثابت ہو۔ اجماعِ صحابہ سے ثابت ہونے کا مطلب ہے کہ فیصلہ اور عمل اس پر جاری رہے۔ کبھی عمل بند ہو۔ اگر کسی سزا کا عمل کسی دور میں بند ہو گیا تو وہ تعزیر ہو گی۔ ۲ حدِ قذف ۳ چوری کی حد ۴ شراب پینے کی حد ۵ ڈکیتی کی حد۔ حدِ قذف صرف قرآن مجید سے ثابت ہے عمل حدیث پاک سے۔ چنانچہ رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ سورت نور آیت ۴ پارہ ۱۸ پر ہے:- وَالَّذِینَ یَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ یَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِینَ جَلْدَةً (الخ):- ترجمہ:- جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمتیں لگا دیتے ہیں اور گواہی چار عدد بھی پیش نہیں کر سکتے ان کو اسی کوڑے مارو۔ چوری کی حد بھی حدیث و قرآنِ پاک دونوں سے ثابت ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے سورہ مائدہ آیت ۳۸ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا۔ ترجمہ:- چور اور چورنی کا ہاتھ کاٹو۔ کلائی تک کیونکہ فقط انگلیاں کیونکہ اصطلاحی ہاتھ کلائی سے ہے۔ حدیث پاک یوں ہے۔ تُقْطَعُ الْيَدُ فِي رُبْعِ دِينَارٍ فَصَاعِدًا۔ ترجمہ سونے کی اشرفی کے چوتھائی حصہ چوری کرنے سے یا اس کے زیادہ چوری کرنے سے ہاتھ کاٹا جائے گا:۔ اجماعِ صحابہ سے بھی یہ حد ثابت ہے۔ شراب پینے کی حد صرف اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ المغنی قدامہ جلد نہم ص ۱۵۸ پر ہے:- ثُمَّ سَأَلَ عُمَرُ عَنِ الْحَدِّ فِيهَا فَقَالَ عَلِيٌّ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ إِذَا شَرِبَ هَذَى وَإِذَا هَذَى افْتَرَى فَاجْلِدُوهُ ثَمَانِينَ فَجَلَدَهُ عُمَرُ ثَمَانِينَ جَلْدَةً اور اسی صفحہ پر کچھ پہلے ہے:- وَأَقَامُوا عَلَيْهِمُ الْحَدَّ لِشُرْبِهِمْ إِيَّاهَا فَرَجَعُوا إِلَى ذَلِكَ فَانْعَقَدَ الْإِجْمَاعُ:- ترجمہ:- حضرت فاروق اعظم نے مولیٰ علی سے پوچھا کہ شرابی کی حد کیا ہے تو آپ نے اس کو قذف اور تہمت پر قیاس کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کوئی شراب پیتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور ہذیان میں لوگوں اور اللہ پر تہمتیں لگاتا ہے۔

لہٰذا شرابی کو اسی کوڑے لگاؤ تب فاروق اعظم نے شرابی کو اسی کوڑے کی حد لگائی۔ اور پھر سب صحابہ نے یہی سزا مقرر مقدار سے جاری رکھی اسی پر سب قائم رہے۔ اسی کی طرف سب نے رجوع فرمایا۔ پس اجماع صحابہ منعقد ہو گیا اور فتاوٰے فتح القدیر جلد چہارم صـ۱۱۳ پر ہے:۔ وَالشُّرْبُ وَاِنْ كَثُرَ فَلَيْسَ حَدُّهٗ بِتِلْكَ الْقَطْعِيَّةِ :۔ (ترجمہ) شراب اگرچہ بہت لوگ پیتے ہیں۔ لیکن اس کی حد قرآن مجید سے ثابت نہیں۔ ڈکیتی کی حد صرف حدیثِ مشہورہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ کتب حدیث سے ثابت ہے کہ قبیلہ بنی عرینہ کے ڈاکوؤں کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حد کی سزا اس طرح دی کہ اُن کے ہاتھ بھی کاٹے اور پیر بھی یہ ان کے ڈاکے کی سزا تھی اور انہوں نے قتل بھی کیا تھا لہٰذا اُن کی آنکھیں پھوڑ کر ان کو صحرا میں ڈلوا دیا۔ ہماری اس تمام گفتگو سے ثابت ہوا کہ حد شرعی صرف قرآن مجید سے ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ احادیث اور اجماع صحابہ سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اور ثبوت حد کے لیے حدیث مشہورہ کافی ہے۔ چنانچہ فتح القدیر جلد چہارم صـ۱۱۲ پر ہے:۔ وَالزَّوَاجِرُ الْمُقَدَّرَةُ الثَّابِتَةُ بِالْكِتَابِ اَوِ السُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ :۔ (ترجمہ):۔ مقررہ مقدار والی سزائیں یعنی یہی حدود خمسہ قرآن مجید سے یا حدیث مشہورہ سے ثابت ہیں۔ خواہ وہ لفظاً خبر احد ہو مگر معناً مشہور ہو یا متواتر ہونا کافی ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ ہم نے ثابت کر دیا کہ حدود علاوہ قرآنِ مجید حدیث پاک اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہماری یہ بات کوئی منکرِ حدیث تسلیم نہ کرے تو وہ اسلام کی پانچ حدیں ثابت نہیں کر سکتا۔ شرابی کی سزا قرآن اور ڈاکو کی سزا قرآن مجید میں کس طرح ڈھونڈو گے۔ پھر منکرین حدیث یہ کیسے ثابت کریں گے کہ حد والی سزائیں صرف قرآنِ کریم میں ہی ہیں۔ چکڑالوی پرویز کہتا ہے کہ ہم کو قرآن سے رجم دکھاؤ مگر میں کہتا ہوں کہ ہم کو یہ قرآن سے دکھاؤ کہ فقط قرآن مجید سے حد شرع ثابت ہو گی۔ پرویزیوں کی یہ بات کہ شرعی مقداری حد والی سزائیں صرف قرآن مجید ہی سے ثابت ہوتی ہیں یہ بات بالکل غلط ہے اور دین میں افتراء و کذب بیانی ہے۔ اسلام میں صرف پانچ سزائیں حدیں ہیں جن کا نقشہ اس طرح ہے:۔

۱	۲	۳	۴	۵
حدِ زنا	حدِ قذف (تہمت)	حدِ سارق (چوری)	حدِ شرب (شراب)	ڈاکو کی حد (قطاع الطریق)
ثبوت۔ قرآن حدیث اجماعِ صحابہ	ثبوت قرآن مجید سے	ثبوت قرآن کریم حدیث پاک	ثبوت اجماعِ صحابہ	ثبوت۔ حدیث پاک

ان پانچ حدوں کا فائدہ صاحب شرح وقایہ نے اس طرح بیان فرمایا۔ جلد اول حاشیہ چلپی ۲ صـ۱۵۴ پر ہے، اَنَّ الْحِكْمَةَ فِيْ شَرِيْعَةِ حَدِّ الزِّنَا صِيَانَةُ الْاَنْسَابِ وَفِيْ حَدِّ الْقَذْفِ صِيَانَةُ الْاَعْرَاضِ وَفِيْ

حَدِّ الشُّرْبِ صِیَانَۃُ الْعُقُوْلِ وَفِیْ حَدِّ السَّرِقَۃِ صِیَانَۃُ الْاَمْوَالِ وَفِیْ حَدِّ قُطَّاعِ الطَّرِیْقِ صِیَانَۃُ الطَّرِیْقِ - ترجمہ :۔ زنا کی حد کا فائدہ نسلِ انسانی کو بچانا ہے۔ تہمت لگانے کی حد کا فائدہ عزتیں بچانا ہے۔ شراب کی حد کا فائدہ عقل بچانا ہے۔ چوری کی حد کا فائدہ مالوں کو بچانا ہے۔ ڈاکو کی حد کا فائدہ راستے محفوظ کرانا ہے۔ یہ تو واضح ہو گیا کہ اسلام میں صرف پانچ حدیں اور مقداری سزائیں ہیں اور یہ بھی ثابت ہوا کہ تعزیر و حدیں کیا فرق ہے اور یہ بھی بیان ہو گیا کہ حد کی سزا حدیثِ پاک اور اجماعِ صحابہ سے بھی ثابت ہے۔ یہ بتا دیا گیا کہ حد کی تعریف کیا ہے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کو چھوڑنا ملک و قوم اور معاشرے کو تباہ کرنا تعزیر اختیاری سزا ہوتی ہے مگر حدیں کسی اسلامی حکومت کو کوئی اختیار نہیں۔ ان پانچ حدوں کو جاری کرنا ہر حکومتِ اسلامیہ پر فرض ہے ان کو جاری نہ کرنے سے مندرجہ فوائد سے محرومی کے علاوہ دینوی خرابی ملک و معاشرہ کی تباہی اخلاقی گمراہی اور دینی لحاظ سے قہرِ قہار کا اندیشہ۔ خدا تعالیٰ سب کو قرآن مجید کی سچی سمجھ دے اور جو فرقہ سزائے رجم کا منکر ہے اس کو ہدایت دے۔ **چوتھی بات** :۔ یہ کہ رجم کی سزا قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبات و اجماعِ صحابہ سے کس طرح ثابت ہے۔ یہ چیز بالکل ظاہر ہے تمام انسانی جرموں میں سب سے بڑا جرم زنا ہے اور اس کے بعد بڑا جرم قتل ہے۔ بعض کے نزدیک قتل بڑا جرم ہے اُس کے بعد زنا بڑا جرم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل سے بھی نسلِ انسانی کی تباہی اور زنا سے بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قتل سے جان کی تباہی اور زنا سے نسل کے ایمان و اخلاق کی تباہی۔ قتل بھی تین قسم کا ہے اور زنا بھی۔ قتل کی سزا بھی قرآن و حدیث اور اجماعِ صحابہ سے ثابت۔ اور زنا کی سزا بھی۔ اسی طرح۔ قتل کے جرم تین قسم کے ہیں اور زنا بھی تین قسم کا اسی وجہ سے قتل کی سزائیں بھی شروع اسلام سے تین قسم کی چلی آ رہی ہیں اور زنا کی بھی۔ مگر یہاں قتل و زنا میں مزید یہ فرق ہے۔ کہ قتل کی اسلامی تینوں سزائیں چونکہ پہلی شریعتوں میں سے چلی آ رہی ہیں۔ اس لیے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر زنا کی سب سزائیں شریعتِ مصطفےٰ نے خود ہی اپنی بیان فرمائیں اس لیے ان میں تبدیلی اور نسخ ہوتا رہا۔ قانونی اعتبار سے زنا تین قسم کا ہے۔ عـ۱ زنا قابلِ رجم عـ۲: زنا قابل جلدہ یعنی کوڑوں کے قابل عـ۳ زنا قابل معافی۔ یہ قسمیں زانی کی تقسیم کے اعتبار سے ہیں۔ دیگر مجرم سب ایک قسم کے ہیں۔ مگر قاتل اور زانی تین تین قسم کے ہیں۔ قاتلِ عمد۔ عـ۲ قاتلِ بھول چوک عـ۳ صرف زخم کرنے والا یا کوئی عضو کاٹنے والا۔ ان تینوں کی شرعی سزا مختلف ہے۔ عـ۱ :۔ اسی طرح زانی کنوارہ جس نے اپنی زندگی میں ابھی تک حلال وطی نہ کی ہو پہلے زمانوں میں حلال وطی دو قسم کی تھی آج کل ایک ہی قسم کی نکاح سے حلال وطی ہوتی ہے عـ۲ :۔ زانی ثیب یعنی شادی شدہ خواہ بوقتِ جرم اُس کی بیوی دنیا میں موجود ہو یا نہ ہو۔ عـ۳ :۔ غلط نکاح یا دھوکے سے زنا کرنے والا۔ اس کی کل بائیس قسمیں ہیں مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح

کیونکہ یہ صحبت وطی اگرچہ زنا ہے مگر حد واجب نہیں اسکی پوری تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے۔ قابل معافی سے مراد حد کی معافی ہے ہاں البتہ اس قسم کے بعض زانیوں کو تعزیری سزا لازم ہے۔ مثلاً لواطت یا جانور۔ یا حائضہ بیوی سے وطی کرنے میں بقدر جرم سزا ملے گی۔ دنیا کے سارے جرموں سے زنا سخت جرم ہے۔ چھ وجہ سے۔

پہلی وجہ:۔ یہ کہ زنا ساری شریعتوں میں حرام رہا:۔ **دوسری** یہ کہ زنا سے نسل حرامی ہوتی ہے دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہوتی ہے کہ وہ حرامی انسان امام بن سکتا ہے نہ عالم اور نہ ولی اللہ بن سکتا ہے۔ بلکہ دنیا میں بے ادبی بے حیائی گستاخی دین کی نفرت غرور تکبر گمراہی کج فہمی نادانی کی گندگیاں حرامی اجسام میں جلدی اور زیادہ پیدا ہوتی ہیں **تیسری**:۔ وجہ یہ کہ حرامی اولاد سات نسل تک جنت میں نہ جائے گی۔ چنانچہ فتاوٰی کاملیہ صفحہ نمبر ۴۵ پر ہے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَدُ زِنًی وَلَا وَلَدُهٗ وَلَا وَلَدُ وَلَدِهٖ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَا شَیْءٌ مِّنْ نَّسْلِهٖ اِلٰی سَبْعَةِ اٰبَاءٍ

(ترجمہ):۔ حضرت ابی ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حرامی انسان اور اس کا بیٹا اس کا پوتا بھی جنت میں نہ جائیں گے۔ ایک روایت میں ہے اس کی سات نسلیں جنت میں داخل نہ ہوں گی۔ اگرچہ اس روایت کے مطلب میں کچھ علماء نے مختلف قول کہے ہیں مگر الفاظِ حدیث پاک کی شدت تو ثابت ہے:۔ **چوتھی وجہ** یہ کہ زنا سے دوہرا جرم ہوتا ہے بیک وقت دو آدمی مجرم بن رہے ہیں۔ کسی دوسرے جرم میں یہ بات نہیں:۔ **پانچویں**:۔ وجہ یہ کہ ہر جرم کا مجرم ایک ہی قسم کا ہوتا ہے مگر زنا کا مجرم دو قسم کا۔ ۱ کنوارہ اور ۲ غیر کنوارا۔ **چھٹی**:۔ وجہ یہ کہ زنا سے سب کو نقصان ہی نقصان ہے۔ بخلاف دیگر جرموں کے اس سے کسی کا فائدہ کسی کا نقصان۔ ان وجوہ سے زنا کی سزائیں مختلف ہیں۔ ابتدائی اسلامی دور میں۔ شادی شدہ زانی کو عمر قید کی سزا تھی اور کنوارے زانی کو۔ جھڑک گالی گلوچ ایذاءِ کلام۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ

ترجمہ:۔ تمہاری وہ بیویاں جو زنا کرائیں پھر تم ان پر چار گواہیاں بھی پالو تو ان کو موت تک گھروں میں قید کر دو۔ اس آیت میں زانی اور زانیہ دونوں شامل ہیں مگر صرف عورتوں کا ذکر کیا۔ دو وجہ سے۔ ۱ پہلی یہ کہ زنا میں اصل عورت ہی محرک ہوتی ہے۔ عورت قدرت نہ دے تو مرد کی جرأت نہیں ہوتی۔ عورت ہی مرد کو دعوتِ زنا دیتی ہے۔ مرد نہیں دیتا دیکھو دنیا میں عورتوں نے ہی زنا کے بازارِ حسن کھولے ہوئے ہیں نہ کہ مردوں نے اگر کوئی کہے کہ یَاْتِیْنَ مؤنث کے صیغہ میں مرد کس طرح شامل ہو سکتا ہے۔ تو میں کہوں گا کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ مذکر کے صیغہ میں عورتیں کس طرح شامل ہوگئیں۔ فصاحتِ کلام میں یہ بات شامل ہے کہ اصل میں فرع کو داخل مانا جاتا ہے نماز میں اصل مرد فرع عورت۔ بدکاری میں اصل عورت فرع مرد اسی لیے اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ ہوا نہ کہ برعکس:۔

دوسری وجہ:- یہ کہ آیت کا منشا ہے شادی شدہ عورت کے زنا کی سزا کا ذکر کرنا۔ اس لیئے لفظ نساء کو مضاف کیا گیا۔ یعنی عام عورت نہیں بلکہ اے مردو تمہاری عورت اور تمہاری عورت بیوی ہی ہوتی ہے۔ ہماری اس بات کی دلیل آیت ایلاء ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ۔ یہاں بھی من نسائہم سے مراد بیویاں ہی ہیں اور بیوی شادی شدہ ہی ہوتی ہے یہ تو شادی شدہ زانی وزانیہ کی سزا تھی۔ دوسری آیت میں کنوارے کی سزا کا ذکر ہے۔ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا:- **ترجمہ**:- اور وہ دو مرد عورت تم میں سے جو زنا کریں تو ان دونوں کو باتوں کی مار دو۔ یہاں تک گھبرا کر توبہ کریں۔ پھر ان کو درگزر کرو اللہ تواب، رحیم ہے۔ یہاں اَلَّذٰنِ اسم موصول اگرچہ تثنیہ مذکر ہے۔ مگر مراد عورت مرد ہیں۔ دو وجہ سے۔ ایک یہ کہ اَللّذان سے دو مرد مراد نہیں ہو سکتے۔ نہ آپس میں علیحدہ:- آپس میں تو اس لیئے نہیں کہ یاتیانہا کی ھا ضمیر کا مرجع زنا ہے کہ پہلے اسی کا ذکر چلا آرہا ہے دو مردوں میں آپس میں بدفعلی کو لواطت یا خباثت، کہا جاتا ہے۔ نہ کہ زنا اگر لواطت ہی مراد لی جائے تو قوم لوط کے عذاب سے یہاں اعتراض پڑ جائے گا۔ کہ وہاں اس جرم پر اتنی سختی اور یہاں اتنی نرمی۔ پس لازم آیا کہ یہاں عورت مرد کا زنا ہی مراد ہے۔ دوسری وجہ کنواری عورت کو کسی کی طرف نسبت نہیں کیا جا سکتا اس لیئے اَللَّذان بول کر عورت و مرد بے شادی شدہ مراد لیئے گئے۔ لہٰذا واضح ہو گیا۔ ابتدائی دور میں شادی شدہ زانی وزانیہ کی سزا اور زنا علیحدہ تھی اور کنوارے کی علیحدہ یہ سب فرقوں کو تسلیم ہے۔ تو اب جب مکمل سزا امر تب ہوئی تو دو قسم کے زانیوں کی سزا ایک طرح کس طرح ہو سکتی ہے اور اگر بعد میں ہر دو قسم کے زانیوں کو ایک سزا دینی تھی تو پہلے کیوں تقسیم ہوئی۔ پھر ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے دور کی سزا اور بعد کی سزا کچھ زیادہ مختلف نہیں بلکہ ہم مثل ہیں۔ شادی شدہ کی پہلی سزا جیسے کہ اس آیت سے ثابت ہوا موت پر مکمل ہے اور بعد کی سزا بھی رجم سے موت پر مکمل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی سزا میں قید تنہائی کی دراز مدت تک ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تکلیف دہ موت ہے اور بعد کی سزا میں ایک ہی دن میں پتھروں کی مار سے تکلیف دہ موت ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ پہلی سزا ایسی آیت سے ثابت ہے جس کی تلاوت موجود حکم منسوخ اور دوسری سزا ایسی آیت سے ثابت ہے۔ جس کا حکم موجود تلاوت منسوخ۔ رہی یہ بات کہ اس کی تلاوت کیوں منسوخ ہوئی اس کی حکمت آئندہ سطور میں بیان کی جائے گی۔ اور سزاء رجم کے مزید دلائل بھی آئندہ انشاء اللہ بیان ہوں گے۔ اسی طرح کنوارے زانی کی پہلی سزا زبان کے بہت کوڑے ہیں جس کے زخم تا عمر نہیں بھر سکتے:- اور اور بعد والی سزا اس آیت سے ثابت جس کی تلاوت بھی موجود اور حکم بھی اس کی تلاوت کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے۔ یہ بھی آئندہ اپنے مقام پر بیان ہو گا انشاء اللہ تعالیٰ یہ بات مزید خیال میں رہے کہ کنوارے کی پہلی سزا والی اسی آیت اَللَّذانِ میں زانی اور زانیہ کو ایک جگہ شامل کیا گیا۔ مگر کنوارے زانی کی بعد والی سزا میں

صاف صاف علیحدہ فرمایا گیا:۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا (الخ) ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں چونکہ پہلے زنا کا ذکر ہے اس لیئے اس کی ضمیر لانے کی وجہ سے دونوں کا ذکر اکٹھا کر دیا گیا۔ لیکن سورۂ نور کی اس آیت سے پہلے چونکہ زنا کا ذکر نہیں اس لیئے یہاں:۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ علیحدہ فرمایا گیا۔ یہاں ضمیر نہیں لائی جا سکتی تھی، کیونکہ مرجع پہلے نہیں آیا۔ نیز اَلَّذَانِ سے تو مرد عورت مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ اسم موصول مبہمات میں سے ہے اسی طرح جمع مذکر میں بھی عورتیں شامل ہو سکتی ہیں۔ مگر زانیین یا زانیَیْن میں عورت مرد شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ تثنیہ ظاہر میں ابہام ہوتا ہے نہ جمعیت ان ہر دو مندرجہ بالا آیتوں سے منکرین احادیث پر دو اعتراض پڑتے ہیں۔ ایک یہ کہ۔ اگر یہاں سزا مختلف ہوئی تو آئندہ کیوں ایک ہو گی۔ دوم یہ کہ اگر آیات کی تنسیخ نہیں ہوتی تو یہ سزا زانی کو اب کیوں نہیں دی جاتی اب مرنے کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ اب کیوں کوڑے مروانے ہو۔ ہم اہل سنت تو اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ زمانۂ جہالت کے اہل عرب جو زنا میں مشہور بلکہ اس پر فخر کرنے والے تھے ان کو زنا سے روکنا ایک دم سختی سے ممکن نہ تھا۔ اس لیئے۔ پہلے صرف قید کی سزا سنائی گئی اور کنواروں کو زبانی برا بھلا کہہ کر زنا سے نفرت دلائی گئی پھر جب قلب مومن میں خوف نفرت دھنس گئی تب سختی کا حکم فرمایا گیا۔ یہ پہلی نرم سزا کی پرانی حکمت تھی کہ اگر کوئی مومن شرِ بشری سے مغلوب ہو کر زنا کر بیٹھتا ہے تو خود ہی رو کر پکارتا ہے۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ طَهِّرْنِيْ ۔ اے آقا مجھ کو دنیا میں ہی پاک کر دیجئے

مسئلہ:۔ جرم کے اقرار کے بعد جو سزا ملے گی وہ مجرم مسلمان کو پاک کر دے گی۔ لیکن جو سزا سچی گواہی سے ملے گی وہ مجرم کو شرعی گناہ سے پاک نہ کریں گی۔ کیونکہ۔ سچا اقرار توبہ ہے۔ اور توبہ کے ذریعہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے گواہی توبہ نہیں وہ تو پچھاڑ اور جبر ہے۔ ہم نے تو نسخ آیت مان کر دونوں آیتوں کو اپنی جگہ درست کہہ دیا۔ مصیبت تو منکرین حدیث پرویزیوں کو ہے۔ عبداللہ چکڑالوی کے شاگرد اور منکرین حدیث کے سرغنہ پرویز صاحب اپنی کتاب لغات قرآن جلد سوم میں صفحہ ۱۲۶۶ پر اس آیت لفظِ فاحشہ کے مشترک ہونے سے دھوکہ کھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں مراد ہے کہ تمہاری عورتیں بری باتیں بے حیائی کی باتیں کریں تو ان کو گھر میں قید کر دو۔ میں کہتا ہوں کتنی نادانی ہے۔ کسی نے سچ کہا کہ خدا جب دین لیتا ہے۔ عقل بھی چھین لیتا ہے۔ یعنی تعجب کہ اِدھر تو منکوحہ زانی سے اتنی محبت کہ رجم سے بچانے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے اور اُدھر اتنا ظلم کہ صرف بے حیائی کی باتوں سے عمر قید کی سزا اور پھر آیت کے اگلے لفظ پر دھیان نہیں کہ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ ترجمہ ان بیویوں کو اس وقت تک قید رکھو کہ یا مر جائیں یا اللہ کوئی راستہ بنا دے۔ اگر یہ آیت اب تک جاری ہے تو اب اللہ کب اور کس کو راستہ بتائے گا۔ کیا ان منکروں کو دوسرے قرآن انتظار ہے۔ سچ ہے ایک جہالت بچانے کے لیئے کئی جہالتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ہماری اس دراز گفتگو میں مختصر وضاحت سے ثابت ہوا کہ رجم کی سزا کس طرح ثابت ہوتی ہے مکمل وضاحت آئندہ سطور میں اپنے مقام کی جائے گی لیکن اس سے پہلے:۔ پانچویں بات یہ بتانا

ضروری ہے۔ کہ اسلام نے ہمارے جرموں پر اس کو کتنی سزائیں دی ہیں۔ یہ بات عین انصاف ہے کہ ہر مربی اور سربراہ اپنے مجرم کو سزا دے۔ چونکہ مجرم بہت قسم کے ہیں اس لیے سزائیں بھی بہت قسم کی ہیں۔ جرم اصولاً تین قسم کے ہیں ع۱ عقیدے کا جرم ع۲ عادات کا جرم ع۳ دنیوی جرم۔ مثلاً بغاوت غداری ملکی انتظامی سیاسی جرم۔ پہلے دو جرموں کی سزائیں شریعتِ اسلامیہ نے مقرر کر دی ہیں عقیدے کے مجرم کافر شرعی اور گستاخِ شریعت لوگ ان کی سزا کا نام عذاب ہے۔ کافر کو یہ سزا دنیا میں بھی کسی نہ کسی طریقے سے انفرادی یا اجتماعی انداز میں مل جاتی ہے۔ آخرت یعنی قبر حشر اور میدانِ جہنم میں بھی ملے گی۔ اور گستاخِ شریعتِ پاک جیسے فرقہائے باطلہ کو یہ سزا صرف آخرت میں ملے گی۔ یعنی قبر حشر اور میدان جہنم میں بعض گستاخوں کو بوقت موت بھی عبرتِ دیگراں کے لیے عذاب کی سزا مل جاتی ہے۔ عذاب کی سزا کا تعلق صرف اللہ تعالےٰ سے ہے وہ جس کو چاہے جس کے ذریعے جس سزا کو چاہے معین اور نازل فرما دے۔ اس میں کسی حاکم جج قاضی یا کسی عدالت کچہری کا کوئی اختیار نہیں۔ نہ کوئی مفتی کسی عذاب کا فتویٰ دے سکتا ہے۔ یہاں تک کہ انبیاءِ کرام بھی عذاب نازل نہیں کرتے بلکہ اپنی دعاؤں سے عذاب نازل کرا سکتے ہیں حضرتِ موسیٰ کے شان عذاب کے معجزوں کا بھی یہی مطلب ہے کہ آپ کی دعاؤں سے فوری طور معجزانہ طریق پر عذاب آتے رہے۔ لفظِ عذاب قرآنِ مجید میں تقریباً تین سو بتیس ۳۳۲ دفعہ آیا ہے۔ ان میں صرف چار دفعہ لفظِ عذاب لغوی معنیٰ میں ہے یعنی دنیوی عدالت کی سزا باقی سب آیات میں عذاب بمعنیٰ الٰہی سزا ہے۔ عادات کے مجرم کو شریعت نے تین قسم کی سزائیں دی ہیں۔

ع۱:۔ خالص حقوق اللہ کے مجرم کی سزائیں حدود اللہ ہیں۔ صرف پانچ قسم کی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ع۲ مخلوط جرم کا مجرم اس کی سزا کا نام تعزیر ہے۔ ع۳ خالص حق العبد اور جسم انسانی کا مجرم مثلاً قاتل جارح وغیرہ اس کی سزا کا نام قصاص ہے۔ تعزیر کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم:۔ جسمانی مارپیٹ ع۲ صرف جھڑکنا ع۳ ذلیل کرنا ع۴ صرف شرمندہ کرنا۔ بعض فقہاءِ کرام نے قید کرنا بھی تعزیری سزا بیان کی ہے۔ چنانچہ مغنی لابن قدامہ جلد نہم صفحہ ۱۷۸ پر ہے:۔ وَالتَّعْزِيرُ يَكُونُ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ وَالتَّوْبِيخِ۔ (ترجمہ):۔ اور تعزیر ہوتی ہے۔ مارنا قید کرنا جھڑکنا۔ مگر یہ درست نہیں۔ اسلامی قانون کی یہ خصوصی اور امتیازی شان ہے کہ اس نے مجرم کو فقط جسمانی سزائیں دی ہیں۔ اسلام میں نہ قید کی سزا جائز ہے نہ مالی جرمانے کی۔ یہ دو تو سزائیں جرم کو مٹاتی نہیں بلکہ بڑھاتی ہیں اسی لیے موجودہ عیسائی قانون سے روز بروز جرم بڑھتے جاتے ہیں۔ بخلاف جسمانی سزا کے۔ کہ اس سے جرم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ ہمارے جن بزرگوں نے قید یا جرمانے کو بھی تعزیری سزا قرار دیا ہے ان کو مندرجہ روایت سے دھوکہ ہوا۔ فَاَخْرَجَ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔ وزاد الترمذی والنسائی ثم خلی عنہ حسنہ الترمذی وصححہ الحاکم

وَرَوَی عبد الرزاق فی مُصَنَّفِہٖ عَنْ عِرَاکِ ابْنِ مَالِکٍ قَالَ اَقْبَلَ رَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ غِفَارٍ حَتّٰی نَزَلَا بِضَجْنَانَ مِنْ مِیَاہِ الْمَدِیْنَۃِ وَعِنْدَ ھُمَا نَاسٌ مِنْ غَطْفَانَ مَعَھُمْ ظَھْرٌ لَھُمْ فَاَصْبَحَ الْغَطْفَانِیُّوْنَ وَقَدْ فَقَدُوْا الْبَعِیْرَیْنِ مِنْ اِبِلِھِمْ وَاتَّھَمُوْا الْغِفَارِیَیْنِ فَاَتَوْا بِھِمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَبَسَ اَحَدَ الْغِفَارِیَیْنِ وَقَالَ لِلْاٰخَرِ اِذْھَبْ فَالْتَمِسْ :۔ (الخ) :۔ (ترجمہ) :۔ بنی غطفان کے دو اونٹ گم ہو گئے انھوں نے بنی غفار کے مردوں پر تہمت لگائی اور دونوں کو پکڑ کر بارگاہِ رسالت میں لے آئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک کو قید کر دیا اور ایک کو ڈھونڈنے کے لیئے بھیجا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ قید کرنا اسلام میں تعزیری سزا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث واقعی بالکل درست ہے۔ مگر اس سے یہ دلیل لینا غلط ہے۔ کیونکہ قید کرنا اسلام میں تعزیری سزا نہیں۔ جیل اسلامی قانون میں سے ہی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قید فرمانا سزاءً نہ تھا بلکہ صرف روکنے کے لیئے تھا۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۱۷ پر ہے اَقُوْلُ وَلَا یَخْفٰی عَلَیْکَ اَنَّ الْمُسْتَفَادَ مِنْ تَعْلِیْلِ الْحَبْسِ بِقَوْلِہٖ لِاَنَّہٗ لَوْ خَلّٰی سَبِیْلَہٗ ھَرَبَ ھُوَ :۔ اَنْ یَّکُوْنَ الْحَبْسُ اِحْتِیَاطًا لَا تَعْزِیْرًا :۔ ترجمہ :۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قید فرمانے کی وجہ اس کو بھاگنے سے روکنا ہے۔ پس واضح ہوا کہ یہ قید احتیاطاً ہے نہ تعزیری سزا۔ اور روکنے کے لیئے کسی بھی مجرم کو آج بھی قید کرنا مناسب ہے گویا کہ اسلام میں حوالات ہے جیل کوئی نہیں اسی طرح جرمانہ تو سراسر ظلم ہے۔ چنانچہ فتاوٰی ردالمحتار جلد سوم صـ ۲۶۴ اور فتاوٰی بحر الرائق جلد پنجم صـ ۴۱ پر اور فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صـ ۱۶۷ پر ہے :۔ وَعَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ یَجُوْزُ التَّعْزِیْرُ لِلسُّلْطَانِ بِاَخْذِ الْمَالِ۔ وَعِنْدَ ھُمَا وَبَاقِی الْاَئِمَّۃِ لَا یَجُوْزُ :۔ ترجمہ :۔ صرف امام یوسف کے نزدیک مال کی تعزیر جائز ہے لیکن امام اعظم۔ امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل امام محمد کسی کے نزدیک بھی مال سے جرمانہ لے کر مجرم کو چھوڑنا جائز نہیں۔ بلکہ ظلم ہے۔ ہاں صرف مجرم کو بھاگنے سے روکنے کے لیئے کچھ دن کے لیئے اس کے مال پر قبضہ کرنا جائز ہے۔ تمام فقہاء نے یہ ہی تصریح کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اخروی سزا کا نام عذاب الٰہی ہے اور عدالتی سزا کا نام۔ حد تعزیر۔ قصاص ہے۔ اصطلاحاً حد شرعی کو عذاب نہیں کہا جاتا۔ ہاں لغتاً صرف ایک جگہ قرآن پاک نے کنواری کنوارے زانی کی حد کو عذاب فرمایا ہے۔ جب یہ سمجھ لیا تو اب **چھٹی بات** :۔ میں وہ دلائل ملاحظہ فرمایئے جن سے شادی شدہ زانی و زانیہ کا رجم ثابت ہوتا ہے :۔

دلیل اول :۔ سورۃ نور آیت ۲ :۔ ارشاد ہے :۔ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ :۔ ترجمہ :۔ صرف کنواری زانیہ عورت اور کنوارے زانی مرد کو سو کوڑے لگاؤ۔ اس آیت کریمہ میں لفظ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ پر الف لام عہدِ خارجی ہے نہ جنسی ہو

سکتا ہے۔ نہ استغراقی کیونکہ جنسی یا استغراقی ہونے سے تمام قسم کے زانی شامل ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے پہلے بتا دیا کہ بائیس قسم کے زانی وہ ہیں جن کو حد نہیں لگتی یا معافی ہو جاتی ہے یا تعزیر۔ جیسے مجبور۔ مجنون۔ بچہ۔ غلام۔ وطی بالشبہ سے زانی۔ منکرین ہیں۔ ان زانیوں کو حد نہیں لگا سکتے۔ اور جب الف لام جنسی و استغراقی نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ عہد خارجی ہوگا۔ ذہنی بھی نہیں ہو سکتا ورنہ فَاجْلِدُوْا کا خطاب غلط ہو جائے گا۔ اور بقانونِ نحو الغلام عہدی میں صرف ایک قسم مراد ہو سکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس آیت میں فقط ایک قسم کا زانی مراد ہے وہ کونسا؟ کنوارا بے نکاحا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ دوسری اور تیسری قسم اس میں قانوناً شامل نہیں ہو سکتیں لہٰذا منکوحہ زانی کی سزا سو کوڑے نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ تعالےٰ ہماری اس دلیل کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ ورنہ آپ کو سب زانی اس میں شامل کرنے پڑیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس آیت میں صرف دو قسمیں شامل رہیں باقی نکل جائیں اگر الف لام عہدی مانو تو صرف ایک قسم مراد ہو گی۔ اگر استغراقی یا جنسی مانو تو سب قسمیں مراد ہوں گی اور پھر پاگل مجبور بچے زانی کو بھی سو کوڑے مارنے پڑیں گے۔ حالانکہ یہ منع ہے۔ **دلیل دوم**:۔ دنیا کے کائنات میں صرف اللہ رسول کا دینِ اسلام ہی ایسا مضبوط قانون پیش فرماتا ہے کہ جس میں ہر مجرم کو نہایت مناسب اور عدل و انصاف سے بہت احتیاط سے سزائیں دیتا ہے۔ نہ افراط ہے نہ تفریط نہ سخت مجرم کو نرم سزا کہ جرم بڑھیں نہ نرم مجرم کو سخت سزا کہ کوئی ظلم سے رو دے۔ بلکہ سخت تر مجرم کو سخت تر سزا اور سخت مجرم کو سخت سزا نرم مجرم کو نرم سزا۔ سب جرموں میں بڑا جرم زنا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ جرم شادی شدہ کا زنا ہے۔ کیونکہ تمام جرموں کا نقصان ایک ایک لیکن کنوارے زانی سے تین نقصان۔ کہ خود مجرم عـ۱ زانیہ مجرم عـ۲ اور عـ۳ نسل خراب۔ اور شادی شدہ زانی سے دس نقصان عـ۱ خود مجرم عـ۲ زانیہ مجرم عـ۳ نسل خراب عـ۴ بیوی پر ظلم عـ۵ اولاد سے بے پرواہی کر کے اولاد پر ظلم۔ عـ۶ گھر تباہ۔ عـ۷ سسرالی رشتہ ناراض عـ۸ بے غیرتی کا پھیلنا۔ عـ۹ مسلمانوں کی ذلت و خواری دوسری قوموں کی نگاہ میں یہی سب سے بڑا فساد فی الارض ہے۔ عـ۱۰ کنوارا تو پھر درست ہو سکتا ہے مگر شادی شدہ زانی مرتے دم تک زنا نہیں چھوڑ سکتا سو کوڑے بھی اس سے زنا نہیں چھڑا سکتے تندرست ہو کر پھر شروع ہو جائے گا۔ کنوارا زانی تو شادی کرا کر ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مگر شادی شدہ زانی گویا خبیث بیج ہے اس کے ٹھیک ہونے کا اب کونسا وقت ہے۔ ایسے خبیث بیج کو تلف کرنا ہی درست ہے۔ ایسے فسادی شہوت کے بیماری کو زندہ رکھنا معاشرے کی تباہی ہے۔ اور اللہ نے فسادی کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ۔ سورت مائدہ آیت عـ۳۳ ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا (الخ):۔ ترجمہ:۔ جو لوگ

اللہ رسول سے جنگ اور مقابلے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اور جو لوگ زمین میں فساد معاشرہ بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا صرف یہ ہے کہ ان کو مار ڈالو یا سولی دے دو۔ اس آیت کریمہ میں فسادی کی سزا قتل اور موت فرمائی گئی۔ فسادی وہی ہے جس کی حرکتوں سے معاشرہ تباہ ہو۔ نسلیں ہلاک ہوں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے :۔ وَاِذَا تَوَلّٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ (ترجمہ) :۔ اور جب زمین میں سرکش بے غیرت پھرتا ہے تو اس میں فساد ڈالتا ہے یعنی ہلاکت ڈالتا ہے کھیتوں اور نسلوں میں۔ چونکہ یہاں حرث کے ساتھ نسل کا ذکر ہے۔ اس لیے حرث سے نسلی کھیتی بھی مراد ہوگی۔ اور فساد سے مراد یہی نسلی ہلاکت ہے کیونکہ واؤ تفسیر یہ ہے۔ اس لیے کہ ہلاکت حرث و نسل تفصیل ہے فساد کی چنانچہ صاوی تفسیر جلد اول ص۸۵ پر ہے قَوْلُهٗ وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ تَفْصِیْلٌ لِلْاِفْسَادِ۔ ترجمہ :۔ فساد کے بعد حرث و نسل کا ذکر فساد کی تفصیل بیان کرنا ہے۔ اور تفصیلِ کلام کے لیے واؤ تفسیریہ ہوتی ہے۔ تفسیر روح المعانی جلد اول ص۹۶ پارہ دوم میں ہے :۔ اَنَّ الْحَرْثَ هُنَا النِّسَآءُ وَالنَّسْلَ اَلْاَوْلَادُ (ترجمہ) :۔ اس آیت میں حرث سے مراد عورتیں ہیں اور نسل سے مراد پیدا ہونے والے بچے قرآن مجید میں صاف صاف بھی عورتوں کو حرث فرمایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ۔ (ترجمہ) :۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں پس اپنی کھیتیوں کے پاس آؤ جس وقت چاہو۔ (نہ کہ غیر کی کھیتی کے پاس) :۔ ان تمام عبارتوں سے ثابت ہوا کہ نسل تباہ کرنے والا فسادی ہے۔ اور فسادی کی سزا موت ہے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ زانی ہی نسل تباہ کرتا ہے۔ اور شادی شدہ زانی کا زنا ہر لحاظ سے فساد ہی ہے نہ کہ مجبوری۔ بخلاف کنوارے زانی کے کہ وہاں بشری کمزوری کو زیادہ دخل ہے۔ لہٰذا منکوحہ زانی کی سزا کا اشارہ اس آیت میں قتل اور موت کا دیا گیا۔ اور پتھروں سے مار ڈالنا بھی قتل ہے۔ اشارۃ النص سے ثابت ہوا کہ منکوحہ زانی کی سزا رجم ہے۔ **تیسری دلیل** :۔ اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ :۔ (ترجمہ) :۔ شادی شدہ مرد اور عورت جب زنا کرلیں تو دونوں کو رجم کردو یقیناً۔ عبرت کی سزا ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ یہ آیت پاک رجم کی سزا کے لیے عبارۃ النص ہے۔ اس کی عبارت و تلاوت منسوخ ہے مگر حکم جاری ہے۔ شیخ کے لغوی معنٰے ہیں ع۱ بوڑھا۔ ع۲ خاوند ع۳ ذمہ دار سردار ع۴ بڑا بزرگ قابل تعظیم (منجد) یہاں مراد خاوند اور بیوی یعنی منکوحہ عورت مرد۔ یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے الفاظ منسوخ فرمانے میں کیا حکمتیں ہیں۔ البتہ ایک صوفی بزرگ نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ چونکہ شادی شدہ کا زنا سب سے زیادہ بے غیرتی اور گندگی کا جرم ہے۔ اس لیے ان لفظوں کو آیاتِ قرآن سے خارج کر دیا تاکہ اقوامِ عالم کے سامنے قومِ مسلم کی رسوائی نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ

کہ اپنے حبیب کا اختیار اور صاحب شریعت ہونا ثابت فرمانے کے لیئے کہ حد جیسی نص قطعی سے ثابت ہونے والی سزا حدیثِ پاک کے الفاظ سے ثابت ہو سکتی ہے اگر یہ بتانے کے لیئے جس طرح آیتِ قرآنی نص قطعی اور حکمِ الٰہی ہے۔ اسی طرح حدیثِ صحیحہ بھی نص قطعی ہے۔ بلکہ جو لوگ صحبتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پائیں انکا اجماعی فیصلہ بھی نصِ قطعی ہے۔ **تیسری وجہ**:۔ یہ کہ آیتِ کریمہ مَا نَنْسَخْ کا عملی نمونہ پیش فرمانا تھا۔ اور بتانا تھا کہ ہم آیتِ قرآن کے حکم کو بھی منسوخ فرما سکتے ہیں۔ اور لفظوں کو بھی۔ کیونکہ ہم غالب حکمت والے ہیں۔ منکروں کو ہماری حکمتوں کی سمجھ نہیں آسکتی۔ اب تک تین آیتوں میں رجم کا ثبوت پیش کیا گیا۔ پہلی آیت میں اقتضاء النص سے دوسری آیت میں اشارۃ النص سے تیسری آیت میں۔ عبارۃ النص سے۔ لیکن رجم زانی چونکہ بہت اہم سزا ہے:۔ اس لیئے **چوتھی دلیل**:۔ اس طرح ہے۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۱۰ پر ہے:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا أَتَى مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ فَقَالَ لَهُ لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ أَوْ غَمَزْتَ أَوْ نَظَرْتَ قَالَ لَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ أَنِكْتَهَا۔ قَالَ نَعَمْ فَعِنْدَ ذَالِكَ أَمَرَ بِرَجْمِهِ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ (ترجمہ) حضرت ابنِ عباس سے مروی ہے۔ فرمایا انھوں نے کہ جب حضرت ماعز نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ قدس میں حاضر ہوئے اور زنا کا اقرار کیا تو آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ماعز شاید تو نے صرف بوسہ لیا ہوگا یا صرف چھوا ہوگا۔ یا صرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ اور اسی کو زنا سمجھا ہو۔ عرض کیا نہیں۔ یا رسول اللہ۔ تو فرمایا کیا واقعی تو نے جماع کیا ہے۔ عرض کی ہاں تب اتنی تحقیق و تفتیش کے بعد آپ نے اس کے رجم کا حکم فرمایا۔ روایت کیا بخاری نے۔ رجم کے معنے ہیں پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دینا۔ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی پاک میں صرف پانچ شخصوں کو رجم کرایا۔ دو یہودی زانیوں کو ایک حضرت ماعز ایک یہودی زانیہ۔ ایک قبیلہ غامدیہ کی زانیہ عورت اسی طرح مشکوٰۃ شریف کی احادیث سے ظاہر ہے۔ لیکن مغنی لابنِ قدامہ جلد نہم ص ۳۶ پر ہے:۔ وَقَدْ رَجَمَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْيَهُودِيَّيْنِ الَّذِيْنَ زَنَيَا وَمَاعِزًا وَالْغَامِدِيَّةَ حَتّٰى مَاتُوْا:۔ ترجمہ رسولِ پاک نے دو یہودی مردوں کو ایک ماعز کو ایک غامدیہ عورت کو زنا کی حد میں رجم فرمایا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ مشکوٰۃ شریف میں ص ۳۰۹ پر یہودی مرد و عورت کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مغنی کی اس عبارت میں اَلَّذِيْنَ زَنَيَا سے مراد۔ عورت مرد ہی ہوں نہ کہ دو یہودی مرد کیونکہ مشکوٰۃ شریف میں زَنَيَا کا تثنیہ مذکر کا صیغہ ہی بولا ہے۔ تو اس طرح چار زانی ہی ثابت ہوئے۔ جن کو رجم کیا گیا۔ اور چاروں ہی شادی شدہ تھے۔ پس ثابت ہوا کہ حدیث پاک نے بھی نکاح والے زانی کی سزا رجم ہی فرمائی۔ بلکہ توریت میں بھی ایسے زانی کی سزا رجم ہی تھی جیسا کہ مسلم بخاری اور مشکوٰۃ شریف ص ۳۰۹ پر یہودی کی روایت سے

ثابت ہے۔ مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ رجم کی یہ حدیث خبرِ واحد ہے اور خبرِ واحد سے حد ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حدِ شرعی کے لیئے نصِ قطعی ضروری ہے۔ مگر مخالف کی یہ بات دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک اس لیئے کہ یہ خبرِ واحد نہیں بلکہ اس کے کثیر راوی ہیں۔ چنانچہ احکام القرآن للجصاص جلد سوم نے صفحہ نمبر ۳۲۴ پر فرمایا قَالَ اَبُوْ بَكْرِ الرَّازِيُّ۔ رَوَى الرَّجْمَ۔ ابو بکر وعمرُ وَعَلِيٌّ وَجَابِرُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ وَاَبُوْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيُّ ابو هريرة وَبُرَيْدَةُ الْاَسْلَمِيُّ وَزَيْدُ بْنُ خَالِدٍ فِي اٰخَرِيْنَ الصَّحَابَةِ۔ (ترجمہ):۔ فرمایا ابوبکر رازی نے کہ رجم کی حدیث شریف کو صدیقِ اکبر فاروقِ اعظم۔ علی مشکل کشا۔ جابر بن عبید اللہ اور ابو سعید خدری ابو ہریرہ جیسے کثیر جلیل القدر صحابہ نے روایت کیا۔ اور دو آخری صحابہ بریدہ اسلمی اور زید بن خالد نے بھی روایت کیا۔ خود مشکوٰۃ شریف نے مسلم۔ بخاری۔ ابو داؤد ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ اور شرح سنہ جیسی معتبر کتب کے حوالے سے بیس روایوں کی روایتیں نقل فرمائی ہیں۔ دوم اس لیئے کہ راویوں اور محدثین کی یہ تعداد خبرِ واحد کو بھی مشابہ متواتر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۲۱ پر ہے:۔ لِاَنَّ ثُبُوْتَ الرَّجْمِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَاتِرًا لْمَعْنٰى كَشُجَاعَةِ عَلِيٍّ۔ وَجُوْدِ حَاتِمٍ (وعدالت عمر)۔ ترجمہ:۔ رجم کی حدیث شریف اگرچہ سنداً خبرِ واحد ہے مگر عملاً اتنی مشہور زمانہ ہو چکی ہے کہ معنیً متواتر بن گئی۔ جیسے کہ علی کی بہادری۔ حاتم کی سخاوت اور عمر کا انصاف مشہورِ زمانہ ہو گئے۔ ثابت ہوا کہ شہرت واحد کو متواتر حدیث بنا دیتی ہے۔ اَلْمُغْنِيْ لِابْنِ قدامہ جلد نہم (ص۳۵) پر ہے:۔ اَنَّهُ قَدْ ثَبَتَ الرَّجْمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَوْلِهٖ وَفِعْلِهٖ فِيْ اَخْبَارٍ تَشْبَهُ الْمُتَوَاتِرَ (ترجمہ): بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کی وجہ سے رجم اتنا جاری ہوا کہ وہ خبریں۔ خبرِ متواتر کے مشابہ ہو گئیں۔ پرویزی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو مانو جو قرآن کے مطابق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سب ہی احادیث قرآن مجید کے مطابق ہے۔ جہاں مطابقت نظر نہیں آتی وہ اپنی عقل کا قصور ہے۔ بے عقل کے لیئے تو آیاتِ قرآنیہ بھی آپس میں مطابق نہیں۔ اور پھر بعض احادیث کو بے عقل لوگ مطابق کر سکتے ہی نہیں حالانکہ ان پر عمل ہو رہا ہے۔ مثلاً گدھے کتے کی حرمت والی حدیث کو کسطرح آیت کے مطابق کرو گے۔ پس ثابت ہوا کہ مطابق کرنا ہمارا کام نہیں۔ جب حدیث محدثین کے نزدیک صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر ایمان لانا ہر مسلمان پر فرض ہے:۔

پانچویں دلیل:۔ شادی شدہ زانی کا رجم اجماعِ صحابہ سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صـ۳۰۹ پر ہے:۔ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰيَةُ الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا

بَعْدَهٗ وَالرَّجْمُ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰی مَنْ زَنٰی اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اِذَا قَامَتِ الْبَیِّنَةُ اَوْ کَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ۔ ترجمہ :- فاروق اعظم سے روایت ہے۔ فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ پس جو قانون رب نے نازل کیا۔ اُس میں رجم کی آیت بھی شامل ہے۔ اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زانی کو رجم کیا اور آپ کے بعد ہم تمام صحابہ نے بھی رجم کیا۔ اور رجم کرنا اس عورت مرد زانی زانیہ پر بالکل درست ہے جو محصن ہوں۔ بشرطیکہ یہ زنا چار گواہیوں سے ثابت ہو یا عورت کا حمل بتا دے۔ حالانکہ زمانے سے بیوہ یا مطلقہ ہو یا زانی زانیہ چار مرتبہ صحیح صحیح اقرار کر لیں۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ رجم پر اجماع صحابہ ہے۔ کہ فرمایا گیا سب صحابہ نے زانی کو رجم کیا۔ اسی کو اجماع کہا جاتا ہے۔ رجم پر صحابہ کرام کا قولی اجماع بھی ہے۔ عملی اجماع بھی۔ دوم یہ کہ شادی شدہ زانی جب محصن ہوگا تب رجم ہوگا۔ محصن کے چار معنے ہیں اور سب کے سب قرآن مجید میں مستعمل ہیں۔ جو اپنی جگہ آئندہ بیان ہوں گے۔ یہاں محصن کے معنے شادی شدہ۔ اس میں سات شرطیں ہیں جب یہ ساری ایک مرد یا عورت میں پائی جائیں پھر وہ زنا کرے تو اُس کو رجم کیا جائے گا:-

پہلی شرط :- کسی بیوی سے نکاح ہو۔ **دوم** وطی زنا فرج عورت میں ہو۔ **سوم** :- نکاح ہر طرح سے صحیح ہو باطل یا فاسد نہ ہو۔ **چہارم** :- ہر دو زانی آزاد ہوں غلام نہ ہوں۔ **پنجم** :- بالغ ہوں **ششم** :- عاقل ہوں۔ **ہفتم** :- زنا کیلئے چھ شرطیں مکمل ہوں۔ یعنی وہ مرد یا عورت پانچ شرطوں کے ساتھ حلال وطی کر چکے ہوں زنا کے وقت خواہ بیوہ ہو یا مطلقہ یا طلاق وغیرہ۔ ان شرطوں کا خلاصہ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں۔ اس طرح کیا ہے :- اَجْمَعَ الصَّحَابَةُ وَاَئِمَّةُ الْاَمْصَارِ عَلٰی اَنَّ الْمُحْصِنَ اِذَا زَنٰی عَامِدًا عَالِمًا مُخْتَارًا فَعَلَیْهِ الرَّجْمُ :- (ترجمہ) :- صحابہ کرام اور تمام آئمہ کا اس پر اجماع ہے کہ محصن آدمی جب جانتے بوجھتے سمجھتے اپنے ارادے و اختیار سے زنا کرے تو اس پر رجم کی سزا واجب ہے۔ **سوم** :- یہ کہ گواہی یا اقرار زانی ثبوت کے لیئے ضروری ہے :- پرویز صاحب کو اس گواہی سے بھی انکار ہے۔ وہ اپنی کتاب لغات القرآن جلد سوم صفحہ ۱۲۶۶ پر زانی کے لیئے گواہی کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ عجیب احمقانہ باتیں ہیں۔ مغنی لابن قدامہ صفحہ نمبر ۳۵ پر ہے :- وَاَجْمَعَ عَلَیْهِ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ ترجمہ :- رجم زانی پر صحابہ کرام کا اجماع تھا۔ یہاں تک کی گفتگو سے ہم نے زانی کے رجم کو ثابت کر دیا۔

اب ساتویں بات واضح کی جاتی ہے کہ سائلے منکرین حدیث کے جو اعتراضات رجم کے

خلاف نقل کیئے ہیں۔ اُن کے جواب کیا ہیں۔ میں نے بحیثیت مفتی اسلام ہونےکے سائل کے نقل کردہ اُن گیارہ ۱۱ اعتراضوں کو بغور دیکھا پھر ان کا مطبوعہ رسالہ بلاغ القرآن کا بہت غور سے مطالعہ کیا۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ یہ تمام اعتراضات محض کم علمی نادانی ناسمجھی اور دین کی فہم نہ ہونے کی بناپر ہے اور بعض جگہ لغت سے بھی ناواقفی کا مظاہرہ ہے۔ لہٰذا جوابات ملاحظہ ہوں۔

مخالف کا:۔ **پہلا اعتراض**:۔ چونکہ قرآن مجید کی یہ آیت اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِی مطلق ہے۔ لہٰذا زانی خواہ کنوارہ ہو یا شادی شدہ یہی حد جاری ہوگی۔ **جواب**:۔ قطعًا غلط ہے۔ یہ آیت مطلق نہیں بلکہ الف لام عہدی سے مقید ہے۔ ورنہ تمام قسم کے زانیوں کو یہ سزا دینی پڑے گی حالانکہ مجبور اور دھوکے سے زنا کرتم بھی یہ سزا نہیں دیتے جیساکہ ہم ابھی پہلے ثابت کیا:۔ **دوسرا اعتراض**:۔ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوسکتی۔ اور یہ آیت سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَفَرَضْنٰھَا (الخ) سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ سو کوڑے ہر زانی کی مکمل سزا ہے **جواب** بالکل غلط اور ناسمجھی کی بات ہے۔ ہم نے پہلے ثابت کردیا کہ قرآن مجید کا ناسخ منسوخ بہت ضروری اور باحکمت قانون ہے۔ اس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ پہلی سطور میں جو فہرست پیش کی گئی ہے۔ اُن سے صاف ظاہر ہے کہ بعض منسوخ آیتیں ایسی ہیں۔ کہ اب ان پر عمل ہو سکتا ہی نہیں مثلاً:۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (ترجمہ):۔ اے مومنو اللہ سے ڈرنے کے حق کے برابر ڈرو۔ بھلا اب کون شخص اس حکم پر عمل کرسکتا ہے۔ کرم ہے رب کا کہ اس نے اس سخت حکم کو منسوخ فرماکر دوسرا حکم عطا فرمایا کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (ترجمہ) اتنا ڈرو جتنی تمہاری بشری طاقت ہے اور پھر نسخ کا منکر نسخ کا صحیح مطلب کس طرح کرسکتا ہے۔ آئیں بائیں کرنے سے تو کام نہیں چلتا۔ معترض کی پیش کردہ آیت معترض کی بالکل حمایت نہیں کرتی۔ نہ اس میں رجم کی نفی ہے بلکہ یہ آیت یہ بتا رہی ہے۔ کہ اس میں اکثر احکام مسلمانوں کے لیئے ہیں کیونکہ فَرَضْنٰھَا کا معنی ہے۔ ہم نے فرض کیئے۔ اور فرض واجب مستحب نفل ہونا یہ سب مسلمانوں کے لیئے ہیں کفار پر کوئی چیز فرض واجب نہیں۔ قرآن مجید کو سمجھ کر بات کرنا عقلمندی ہے۔ صرف کھینچا تانی کرنے سے مدعا حاصل نہیں ہوا کرتا:۔

تیسرا اعتراض:۔ یہ کہ رجم سے موت ہوتی ہے حالانکہ قرآن پاک نے زانی زانیہ کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے چنانچہ ارشاد:۔ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً۔ یہاں اَلزَّانِیْ:۔ مطلقًا ہے۔ موت کی سزا ہوتی تو نکاح کرانے کا ذکر کیوں ہوتا۔ **جواب**:۔ یہ بات روشن ہے کہ اسلام نے کبھی کسی مجرم سے محبت نہیں کی۔ بخلاف یہود و نصاریٰ اور ہندو مشرکوں کے کہ وہ سب حتی المقدور مجرم کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہمارے معاشرے کے پرویزیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا دراصل یہ عادت انہوں نے یہود و نصاریٰ سے ہی لی ہے:۔ اور محض دھوکہ دینے کے لیئے غلط تاویلیں بلکہ تحریفیں کرکے آیتوں کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ رجم سے یقینًا واقعی موت واقع ہوتی ہے۔ اور شیب یعنی منکوح زانی کو موت ہی دینا مقصود ہے۔ ایسے مقصدِ بے غیرت ناسورِ معاشرہ کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ نہ اسلام ایسے گندے آدمی کو زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ گندے بدر

خبیث آدمی کو بچانا ایسا ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کمیٹی والے مکھی مچھر مارنے کے لیے ڈیڈی ٹی چھڑکیں تو کوئی چکڑالوی کھڑا ہو جائے اور دوائی چھڑکنے والوں کو برا کہنے لگے کہ اللہ نے تو ان کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے تم ان کو کیوں مارتے ہو۔ جیسے حکومت مکھی مچھر تلف کر کے جسمانی صحت مند معاشرہ پیدا کرنا چاہتی ہے اسی طرح اسلام قاتل اور فسادی زانی جیسے گندے انسان کو رجم سے مار کر روحانی صحت مند معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے:۔

مخالف کا پیش کردہ آیت سے استدلال کرنا نہایت ہی کمزور علمی کا ثبوت ہے۔ چار وجہ سے:۔

پہلی یہ کہ آیت منسوخ ہے اگر اس کو منسوخ نہ مانا جائے تو بت پرست عورتوں سے نکاح کرنا بھی جائز ماننا پڑے گا۔ حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا:۔ (ترجمہ) اور مشرکوں سے کوئی مسلمان نکاح نہ کرے۔ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ **دوم**۔ یہ کہ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ زانی ساری دنیا میں صرف زانیہ سے ہی نکاح کر سکتا ہے۔ کسی اور عورت سے نکاح نہیں کر سکتا اگر اس کو زانیہ عورت نہ ملے تو بغیر نکاح کے رہے اور پھر اسی طرح بھول بھلیاں کے اگر مخالف کہے کہ زانیہ سے مراد اس کی اپنی زانیہ ہے۔ تو مخالف کو دو مصیبتیں پڑیں گی۔ پہلی یہ کہ مخالف خود اس آیت کو مطلق کہہ چکا ہے اب زانیہ کو مقید اور مخصوص ماننا پڑے گا دوم یہ کہ سو کوڑے کھاتے کھاتے اگر وہ عورت زانیہ مر جائے۔ یا ویسے ہی مر جائے تو زانی بقیہ عمر ساری کس طرح گزارے۔ **تیسری**:۔ وجہ یہ کہ اَلزَّانِیُ سے مراد صرف کنوارا زانی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ثابت کر دیا۔ کیونکہ اصطلاحِ قرآنی میں لفظ زانی صرف کنوارے زانی کا لقب ہے۔ کیونکہ اس نے بجز زنا کی صحبت کے اور کوئی صحبت نہیں کی ہوتی۔ **چوتھی** وجہ یہ کہ اگر یہ شادی شدہ زانی کو بھی شامل ہو۔ تو نکاح کرنے کا ذکر کیوں کیا گیا۔ وہ تو پہلے ہی نکاح والا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زنا سے پہلا نکاح ٹوٹ گیا۔ اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زانیہ خاوند کے باوجود کسی دوسرے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے جب یہ کام ناممکن ہیں تو سمجھ لو کہ اَلزَّانِیُ سے مراد صرف کنوارا زانی ہے اسی کو نکاح کرکے اور سزا کی توبہ کے بعد باعزت طریقے سے نکاح کرنے کا حکم ہے اور اپنی ہی زانیہ سے نکاح کرنا اس لیے زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ وہ عورت بھی زمانے میں ذلیل نہ ہو نہ نطفہ مخلوط ہو۔ زانیہ کو دوسرا مرد مشکل سے ہی پسند کرتا ہے رجم کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ نفی نہ ثبوت نہ شادی شدہ زانی اس میں شامل۔ مخالف کا یہ استدلال نہایت غلط ہے

چوتھا اعتراض:۔ مخالف کہتا ہے کہ قرآنِ مجید میں زنا کو فاحشہ کہا گیا۔ اور کہا گیا ہے:۔ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ:۔ (ترجمہ) اور لونڈیوں کو زنا کی سزا شادی شدہ عورتوں سے آدھی ہے۔ محصنات شادی شدہ کو کہتے ہیں۔ اور آدھی سزا رجم نہیں ہو سکتا۔ لازمی ثابت ہوا کہ شادی شدہ زانی زانیہ کو بلکہ ہر زانی کو سو کوڑے ہی سزا دی جائے۔ کنوارا ہو یا شادی شدہ

بیوہ ہو یا رنڈوا۔ **جواب**۔ ہر فاحشہ زنا نہیں۔ ہر عذاب دنیوی سزا نہیں۔ ہر محصن و محصنہ شادی شدہ نہیں یہ تینوں لفظ مشترک المعنیٰ ہیں معترض کتنا جلد باز نادان ہے کہ دیگر آیات پر غور نہیں فرماتا۔ یہی نہیں بلکہ اس گروہ نے اپنے اسی دین کو بچانے کے لیئے بہت جگہ جھوٹ کا سہارا پکڑا۔ کبھی کہتے ہیں۔ ناسخ منسوخ میں علماء اسلام کا اختلاف ہے (لغات القرآن جلد چہارم ص۱۶۰) یہ بالکل غلط ہے قطعًا کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بتا دیا۔ کبھی کہتے ہیں کہ قصاص کی تعریف میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس طرح کی غلط اور عوامی دھوکے کی باتیں انکی سب ہی کتب میں موجود ہیں۔ جیسا کہ رجم کے فیصلے میں چیرمین شرعی عدالت نے لکھا اور رد المحتار کا جھوٹا حوالہ لکھ دیا۔ حالانکہ وہ عبارت ساری کتاب میں نہیں۔ اس طرح غلط بیانیوں سے دین بچانے کا کیا فائدہ۔ اس اعتراض کا لُبِ لباب اور دار و مدار صرف لفظ محصنات پر ہے۔ معترض نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ شادی شدہ زانیہ عورتیں۔ اور فریب میں اپنی دلیل بنا لی حالانکہ محصنہ کے چار معنے ہیں۔ ۱ مسلمان ہونا چنانچہ سورۂ نساء آیت ۲۵ میں ہے۔ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ۔ جب مسلمان کر دی جائیں ۲ پاک دامن ہونا چنانچہ سورۂ نور ۴ وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ :۔ ترجمہ اور وہ لوگ جو پاک دامن پاکباز عورتوں کو تہمت لگاتے ہیں ۳ نکاح سے منکوحہ ہونا چنانچہ سورۃِ نسا آیت ۲۴ میں ہے۔ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ۔ ترجمہ :۔ عورتوں میں سے شادی شدہ عورتیں ۴ آزاد ہونا۔ چنانچہ سورۃِ نساء آیت ۲۵ وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ۔ ترجمہ :۔ اور جو شخص کہ بوجہ غربت آزاد مومنہ عورت سے نکاح نہ کر سکے ان چار آیات میں محصنہ کے چار معنی استعمال ہوئے جس سے اس کا مشترک ہونا ثابت ہوا اور مشترک المعنیٰ الفاظ کے لیئے دو مشہور قانون وضع ہیں ایک یہ کہ استعمال کے وقت ایک ہی معنے مراد ہوں گے دو یا تین نہیں ہو سکتے دوم یہ کہ معنیٰ معین کرنے کے لیئے کسی قرینے کا ہونا شرط ہے ہر شخص اپنی مرضی سے معنیٰ معین نہیں کر سکتا۔ پس سمجھ لو کہ معترض کی پیش کردہ آیت کے الفاظ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ میں محصنات کے معنیٰ کنواری آزاد عورتیں معین ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے معنے یہاں بن ہی نہیں سکتے۔ اس لیئے کہ یہاں لفظِ محصنات کا مقابلہ ہے لونڈی عورتوں سے یہ مقابلہ قرینہ ہے۔ اس بات کا کہ محصنات کا معنیٰ آزاد کیا جائے۔ اور کنواری کی قید اس لیئے لگائی جائے گی کہ آزاد منکوحہ ثیبہ یعنی شادی شدہ مراد نہیں لی جا سکتی اگر ہم محصنات کا معنے کریں۔ منکوحہ آزاد عورتیں۔ تو بیک وقت دو معنیٰ استعمال ہوں گے حالانکہ مشترک المعنیٰ الفاظ میں دو معنے بیک دم استعمال نہیں ہو سکتے۔ ثابت ہوا کہ معترض کی اس آیت میں آزاد کنواری زانیہ عورتوں کی سزا کوڑوں کا ذکر ہے نہ کہ آزاد منکوحہ عورتوں کی سزا رجم کا کوڑوں کا ہی نصف لونڈی زانیہ کو لگے گا یہاں آزاد شادی شدہ کا ذکر ہے ہی نہیں۔ اس اعتراض میں لفظِ فاحشہ اور لفظِ عذاب سے کوئی بحث نہیں۔

پانچواں اعتراض

:۔ اس میں معترض کہتا ہے کہ رجم

کا ذکر سارے قرآن میں نہیں اور زنا کی سزا کا ذکر قرآن میں نصف بھی ہے اور دگنی بھی یعنی پہلے پیش کردہ آیت میں محصنہ کی سزا سے آدھی کا ذکر تھا اور احزاب کی آیت ع۲ میں اسی سزا سے دگنا سزا کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنۡ یَّاۡتِ مِنۡکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفۡ لَہَا الۡعَذَابُ (الخ)۔ ترجمہ اے نبی کی بیبیو جو تم میں سے ظاہر بدکاری کرے تو اس کو دگنی سزا ہے۔ یہاں فاحشہ سے مراد زنا اور عذاب سے اس کی دنیوی سزا ہے۔ اور نساء النبیؐ لازمی شادی شدہ ہیں۔ اور رجم جس طرح آدھا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دگنا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا انجام موت ہے۔ ثابت ہوا کہ زانیہ کنواری ہو یا شادی شدہ اس کی سزا کوڑے ہی ہے وہ آدھی بھی ہو سکتی ہے اور دگنی بھی آدھی پچاس کوڑے۔ دگنی دو سو کوڑے۔

جواب:۔ معترض کی پیش کردہ آیت میں۔ نہ فاحشہ سے مراد زنا ہے اور نہ عذاب۔ سے مراد دنیوی عدالتی سزا ہے۔ بلکہ فاحشہ سے مراد نبی کی نافرمانی اور عذاب سے مراد بعد قیامت کی سزا۔ کیونکہ قرآنِ مجید میں لفظ فاحشہ تین طرح استعمال ہوا ہے ع۱ الفاحشہ۔ جیسے کہ وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ ع۲ فاحشہ مُّبَیِّنَۃ جیسے یہاں اسی آیتِ پیش کردہ میں ع۳ فَاحِشَۃً جیسے وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً۔ (الخ) استعمالِ فاحشہ کی اس تقسیم سے تین معنے ظاہر ہوتے ہیں ع۱ زنا ع۲ کسی بزرگ کی سخت ظاہر ظہور نافرمانی اور برا کام ع۳ نقصان دہ کام یا عام گناہِ کبیرہ۔ اسی طرح لغات القرآن غریب القرآن صــ۲۷۲ پر لکھا ہے جب یہ لفظ الف لام کے ساتھ استعمال ہو تو زنا مراد ہوتا ہے اور اگر یہ لفظ نکرہ ہو تو عام گناہ یا بے حیائی کے کام مراد ہوتے ہیں یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ میں اکثر کے نزدیک زنا مراد ہیں۔ اور۔ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً میں فاحشۃً سے مراد بے حیائی کا کام مراد ہے یعنی زنا کی اصلیت اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ زانی زانیہ اور حرامی نسل کو بے غیرت بنا دیتا ہے۔ اگر یہاں فَاحِشَۃً کا ترجمہ زنا کیا جائے تو مطلب یہ بن جائے گا بے شک وہ زنا۔ زنا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط۔ تفسیر صاوی جلد سوم صــ۲۲۹ پر ہے۔ قِیۡلَ الۡفَاحِشَۃُ اِذَا وَرَدَتۡ مَعۡرِفَۃً فَہِیَ الزِّنَا وَاللِّوَاطُ وَاِنۡ وَرَدَتۡ مُنَکَّرَۃً فَہِیَ سَائِرُ الۡمَعَاصِیۡ فَاِنۡ وَرَدَتۡ مَنۡعُوۡتَۃً کَمَا ھُنَا فَہِیَ عُقُوۡقُ الزَّوۡجِ وَسُوۡءُ عِشۡرَتِہٖ۔ ترجمہ:۔ اگر الفاحشہ معرفہ ہو تو مراد زنا ہے اگر بغیر الف لام کے نکرہ ہو تو مراد دیگر گناہ کبیرہ ہوں گے اور موصوف ہو کر آئے جیسے کہ یہاں اس آیت یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ میں۔ تو مراد خاوند کی نافرمانی ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہاں بِفَاحِشَۃٍ سے مراد گھر یلو ناچاقی نافرمانی۔ جب یہاں فاحشۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ سے مراد زنا ہے ہی نہیں تو عذاب سے مراد بھی حدِ شرعی کی سزا نہیں دو وجہ سے ایک یہ کہ فاحشۃٍ کا لفظ موصوف ہے مُّبَیِّنَۃٍ کا اور مبینۃٍ کا معنیٰ ہے ظاہر ظہور۔ حالانکہ زنا چھپ کر کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی تفسیر روح المعانی جلد ۱۱ صــ۱۸۲ پر ہے۔ ثابت ہوا کہ فاحشۃٍ سے زنا مراد لینا جہالت ہے

دوم یہ کہ کوڑے حدِّ شرعی ہے اور حدِّ شرعی میں افرادِ مخصوصہ کے لیئے زیادتی کمی نہیں ہوسکتی۔ لونڈیوں سے غلاموں کے لیئے حد کی کمی انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طریقے پر ہے۔ اور پھر عذاب کا دُگنا ہونا نساء النبی کے لیئے اُن کی فضیلت اور مدارج کی بنا پر ہے تو لازم آیا کہ جن کو بھی فضیلت قیامت تک تھوڑی بہت ہوتی رہے گی اُس کی حد بھی ایک ایک دو کوڑے بڑھتی رہے۔ مثلاً صحابہ پھر اولیاء اللہ اور پھر علما پھر امرا اس طریقے سے حد نہ رہے گی کھیل بن جائے گا۔ پس ماننا پڑے گا کہ یہاں عذاب سے مراد حد شرعی نہیں بلکہ عذابِ آخروی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عذاب کو رب تعالے نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔ کہ ارشاد ہوا۔ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا یا اللہ پر آسان ہے۔ جب کہ حدود کی سزا حکام کے سپرد ہوتی ہے اُن ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دلیل سے بھی معترض کا مقصد حاصل نہ ہوا اور رجم کی مخالفت ثابت نہ ہوسکی۔

چوتھا اعتراض :۔ رجم زانی ہرگز سنّت نہیں بلکہ خلافِ قرآن خلافِ اسلام اور خلافِ رسول ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی رجم نہ کیا۔ رجم کی ساری حدیثیں بناوٹی ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند تھے۔ کہ ارشاد ہے۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ ترجمہ اے نبی صرف اِس قرآن سے فیصلہ کیجئے جو اُتارا اللہ نے یہ بات یقینی ہے کہ صرف قرآن ہی نازل ہوا ہے :۔

جواب :۔ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی دوپہر کے وقت کہہ دے کہ اس وقت کوئی سورج نہیں کوئی دھوپ نہیں کوئی دن نہیں۔ احادیث سے رجم زانی ثابت ہے اس کا انکار پرلے درجے کی حماقت ہے۔ کثیر احادیث کتب میں موجود ہیں۔ جیسا کہ مختصراً ہم نے پہلے ثابت کردیا۔ اُن احادیث کو بناوٹی کہنا غلام احمد اپنے قلم کی بات ہے۔ اس طرح تو کافر قرآن مجید کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے بیہودہ اعتراضات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور رجم کی سزا اشارۃً و دلالۃً و اقتضاءً و عبارۃً قرآن مجید سے ہی ثابت ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ ہاں البتہ ظاہر عبارت اور نفاذ کا طریقۂ عملی احادیث کثیرہ متواتر المعنیٰ سے ثابت ہے۔ رہا یہ کہنا کہ قرآن مجید کے سوا کچھ اور نازل نہ ہوا یہ غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے۔ سورتِ نساء آیت ۱۱۲ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ (ترجمہ) :۔ اور اتاری اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اور سکھایا تم کو وہ جو تم نہ جانتے تھے۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۳۱ :۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ :۔ ترجمہ :۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہے اور یاد کرو اس کو جو نازل کیا اُس اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت سے اور تیسری جگہ ارشاد ربانی ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ :۔ ترجمہ :۔ اور وہ نبی سکھاتے ہیں تم کو اللہ کی کتاب اور حکمت

ان تینوں آیات میں یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں نازل فرمائیں ۱۔ کتاب ۲۔ حکمت۔ کتاب اللہ مجموعہ ہے۔ احکام قصص اور شریعت و طریقت اسرار رموز وعظ و نصیحت ہدایت و نور کا۔ اور حکمت کے معنی ہیں قانون۔ اور قانون شریعت حدیث پاک ہی ہے کیونکہ قانون وہ ہوتا ہے جس پر عمل کیا جائے حدیث کے بغیر قرآن مجید پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا حدیث ہی قانون خداوندی ہے۔ حدیث پاک کے بغیر اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ۔ اَتِمُّوا الْحَجَّ وغیرہ احکام پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ کہاں سے ڈھونڈو گے تعداد رکعات۔ زکوٰۃ کی تفصیل۔ اور حج کا طریقہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احکام خداوندی کے مطابق فیصلہ کرنے اور اس فیصلے کو جاری کرنے کے پابند ہیں مگر لازمانہ خادمانہ مجبورانہ شان سے نہیں۔ بلکہ با اختیار محبوبانہ شان سے۔ اسی لیے رب کریم نے فَاحْکُمْ بَیْنَہُمْ بِالْقُرْآنِ یا بِالْکِتَابِ نہ فرمایا بلکہ۔ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فرمایا۔ اتنی دراز عبارت میں یہی حکمت اور راز ہے کہ حدیث بھی فیصلہ کرنے میں شامل ہو جائے۔ اور نادانوں کو معلوم ہو جائے کہ حدیث رسول اللہ بھی۔ مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰہِ ہے اور فرمودات محمدی بھی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ہے۔ اللہ نے نبی کریم کو کائنات کا پورا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔ اگر کہیں حد و شرعیہ نبی کریم کی زبان پاک کا اپنے بلکہ خود کوڑوں کی سزا کی تفصیل بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما گئے ہیں کہ کس طرح لگاؤ جسم کے کس حصے پر لگاؤ کتنی زور سے لگاؤ۔ قرآن کریم نے ہم کو تو کچھ بھی نہ بتایا اپنے نبی کو بتایا۔ اس لیے واضح کیا وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ (ترجمہ)۔ اے کائنات والو تم کو ہمارے نبی کتاب و حدیث سکھاتے ہیں۔ ورنہ عربی لغت اور ترجمے سے تو تمام اہل عرب پہلے ہی واقف تھے وہ ہی قانون دان الٰہی اگر کسی کو رجم کرتا ہے تو نہ خلاف قرآن ہوگا۔ نہ خلاف اسلام۔ احمقانہ جلد بازی میں انسان جو چاہے بولتا چلا جائے۔ جب بے لگام ہو جائے تو جس کو چاہو۔ بناوٹ کہہ دو جس کو چاہو لگاوٹ الکتاب والحکمۃ میں واؤ تفسیریہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ کتاب کی تفسیر یا تفصیل حکمت نہیں ہو سکتی۔ کتاب کل ہے حکمت جزء ہے۔ حکمت کے معنی ہیں قانون۔ حالانکہ کتاب میں قانون کے علاوہ بھی آیات ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ حکمت سے :۔ ماننا پڑے گا کہ حکمت سے مراد احادیث پاک ہیں۔

ساتواں اعتراض :۔ قرآن مجید میں رجم کا اشارہ تک نہیں ہے اگر رجم زانی حد شرعی ہوتی تو لکھتے وضاحت کرنے میں کیسی شرم تھی۔ کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی نہ تلاوتاً نہ حکماً۔ رجم کی آیت منسوخ ماننا جھوٹ ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ۔ میں۔ شیطان کی آیت مراد ہے۔ آیت دراصل اس طرح تھی۔ ما ننسخ من ایت الشیطان۔ تنوین عوض کی ہے۔ **جواب** :۔ اس کا تحقیقی جواب تو مکمل طور پر دے دیا ہے مگر الزامی جواب اس طرح ہے کہ ہمیں پرس نہیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے حکم میں نماز کا طریقہ۔ اوقات کی تفصیل رکعات کی تعداد واضح کرنے میں کس کی شرم تھی۔ نیز کتے گدھے کو اللہ نے حرام کیا یا نہیں اگر کیا۔ تو قرآن مجید میں حرمت ذکر کر دینے میں کس کی شرم تھی۔ نیز معترض کہتا ہے کہ آیت دراصل اس طرح تھی۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آیتِ الشیطانِ اللہ تعالیٰ کو اس ہی طرح لکھنے میں کس کی شرم تھی۔ معترض نے اپنے اس جھوٹ پر کوئی ثبوت بھی پیش نہ کیا

کیا معترض کو اختیارِ ذاتی ہے کہ جس طرح چاہے گھر بیٹھے آیتوں کو توڑنا مروڑنا شروع کردے اپنے اس بیہودہ اور کفریہ عقیدے کا ثبوت پیش کرو اور قرآن سے ثابت کرو اور قرآن مجید سے صاف صاف اسطرح ثابت کرو کہ واقعی یہ آیت اس طرح تھی۔ خیال رہے۔ کہ عقلاً نقلاً اور قانوناً لفظِ آیت مرکب اضافی اور شیطان مضاف الیہ نہیں ہو سکتا۔ نہ معلوم معترض کے دماغ میں یہ دور کی کہاں سے سوجھی۔ عقلاً تو اس لیئے کہ اگر ذرا بھی انسان تدبر سے کام لے تو اسی آیت کے روشِ کلام اور طرزِ بیانی و الفاظ کے ربط سے ہی بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہاں آیت سے آیتِ قرآنِ پاک مراد ہے۔ اوّلاً اس لیئے کہ نَنۡسَخۡ کے بعد نُنۡسِهَا فرمایا۔ یعنی آیت کو یا منسوخ کردیں یا بھلا دیں۔ آیت ایک اور اس کے ختم کرنے کے دو طریقے بھلایا اُس کو جاتا ہے جو پہلے یاد ہو اور بھلانے کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ گویا کہ یہ آیت جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یاد ہے۔ چاہے تو اُس کو ہم منسوخ کردیں یا بھلا دیں۔ اور کوئی ایماندار یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ معاذ اللہ نبی کریم کو شیطانی آیتیں یاد ہوں گی۔ دوم اس لیئے کہ آگے ارشاد ہے۔ نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ:۔

ترجمہ:۔ آیت منسوخ کرکے یا بھلا کر۔ اُس سے اچھی دوسری آیت لے آتے ہیں۔ مِنۡهَا میں مِنۡ تفضیلیہ ہے اسی لیئے مفسرین کرام بِخَيۡرٍ کا ترجمہ اَنۡفَعُ کرتے ہیں اسی طرح تفسیر صاوی جلد اوّل ص۴۷ پر ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اچھی وہ بھی آیت تھی مگر دوسری آیت اُس سے بھی اچھی ہو گی۔ اور یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے کہ شیطانی آیت میں اچھائی ہو۔ کوئی ایمانی عقل والا شیطان کی آیت کو خیر اور اچھا نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ رب تعالےٰ اُس کو اچھا کہے سوم اس لیئے کہ آگے ارشاد ہے۔ اَوۡ مِثۡلِهَا۔ یعنی یا اُس منسوخ شدہ آیت کے مثل لائیں گے۔ اس لفظ نے تو مسئلہ بالکل حل فرمایا کہ یہاں آیت قرآنی مراد ہے۔ اس لیئے کہ شیطانی آیت قرآنی آیت کے مثل کس طرح ہو سکتی ہے ایسا کہنے والا تو ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ نقلاً اس طرح کہ لفظِ آیت کے تین معنیٰ ہیں ۱ نشانی ۲ عبرت ۳ کلام۔ قرآن مجید میں لفظِ آیت یا آیات تقریباً تین سو اکیاسی (۳۸۱) دفعہ آیا ہے مگر کہیں بھی اُس کی نسبت یا اضافت شیطان کی طرف نہیں کی گئی۔ نہ کسی حدیث میں نہ فقہ کی کتب نہ کتبِ ادب کہیں ثبوت کا نام نشان تک نہیں۔ ہاں قرآن مجید نے سورت حج آیت ۵۲ باوٌن میں شیطانی کلام کو اَلۡقٰى الشَّیۡطٰنُ فرمایا ہے۔ معترض اپنے رسالے بلاغ القرآن ص۱۸ پر آیتِ شیطانی کی مثال میں لفظِ راعنا پیش کرتا ہے کہ یہودی لوگ راعنا کہتے تھے زبان کو پیچ کر اس کو اللہ نے منسوخ کرکے اُنۡظُرۡنَا اُس کی جگہ مقرر کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے تو معترض کا ہی دین ختم ہوتا ہے کہ نسخ کا ثبوت ہو گیا۔ پھر یہ کہ یہ لفظِ راعنا خود مسلمان کہتے تھے جس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودی منافق رَاعِيۡنَا کہنے لگے۔ تب مسلمانوں کو اس سے روکا گیا اور نیا لفظ سمجھایا گیا۔ راعنا کوئی آیت نہ تھی بلکہ مسلمانوں کا اپنا کلام تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا۔ اے ایمان والو آئندہ راعنا نہ کہنا الخ)

ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو روکا گیا نہ کہ یہودیوں کو اور روکا اس سے جاتا ہے جو پہلے کرتے ہوں تو معلوم ہوا کہ مسلمان پہلے راعنا کہتے تھے جب یہ لفظ مسلمان کہتے تھے تو آیت شیطانی کیونکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جب منافقوں کے منہ پر گستاخانہ لچک سنی تو آپ نے فرمایا کہ آئندہ اگر اس طرح یہ لفظ بولا تو میں تم کو قتل کر دوں گا۔ منافق بولے کہ تم بھی یہی کہتے ہو آپ نے جواباً فرمایا ہم تو راعنا کہتے ہیں اور تم بگاڑ کر راعینا کہتے ہو۔ اور پھر اگر یہ لفظ راعنا معاذ اللہ آیت شیطانی ہوتا تو رب تعالیٰ مسلمانوں کو پہلے دن ہی منع کر دیتا۔ اتنا عرصہ کیوں مہلت دی۔ جیسا کہ روح المعانی جلد اول صـ ۳۴۹ پر ہے۔ اور پھر یہ لفظ پوری آیت نہیں بلکہ معمولاً جملہ فعلیہ کا جز ہے۔ قانوناً اس لیے کہ آیتٍ کی تنوین عوضی نہیں ہو سکتی بلکہ تنکیری کی ہے۔ کیونکہ تنوینِ عوض کے لیے قرینہ ضروری ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ وَ جَعَلْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ :۔ یہاں پہلا بَعْضَهُمْ قرینہ یعنی علامت ہے دوسرے بَعْضٍ کی پہلے نے بتایا دوسرے میں بھی ہُمْ ضمیر مضاف الیہ پوشیدہ اس کے عوض تنوین آگئی مگر آیتٍ میں کوئی قرینہ موجود نہیں جو اضافت کو ثابت کرے لہٰذا یہاں نہ تنوین عوض کی ہے نہ لفظِ شیطان مضاف الیہ ہو کر پوشیدہ ہے۔ نیز مَا نَنْسَخْ کا سیاق و سباق بھی بتا رہا ہے۔ کہ یہاں آیتٍ سے قرآنی آیت مراد ہے۔ کیونکہ سباق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ترجمہ۔ مشرکین وغیرہ کفار نہیں چاہتے کہ تم مسلمانوں پر کوئی خیر کی آیت نازل کی جائے۔ لیکن کافروں کی مراد پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا۔ ترجمہ :۔ ہم اپنی طرف سے لے آتے ہیں۔ اس سے اچھی آیت یا اس کی مثل تعجب اور افسوس ہے :۔ کہ اتنی صاف...... عبارت کے ہوتے ہوئے پھر بھی صرف اپنی ہٹ دھرمی گمراہی بچانے کے لیے اللہ کے کلام کی گستاخی اور توڑ مروڑ کی جائے۔ **آٹھواں اعتراض** :۔ معترض کہتا ہے کہ اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ سارے قرآن میں کہیں بھی رجم کا ذکر نہیں نہ زانی کے لیے نہ کسی اور مجرم کے لیے۔

جواب :۔ واقعی اس سے بڑی دلیل آپ کے پاس اور کیا ہو سکتی ہے ان ہی بڑی دلیلوں نے تو آپ لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیا۔ ایسی ہی نکارہ دلیلوں کو آپ لوگ بڑی دلیلیں سمجھ کر تدبر و تفکر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں محترم قرآنِ پاک سے دلائل لینے کے لیے ایمان و عرفان کی نگاہیں چاہیئے۔ آپ کو دلیلیں نہ ملیں حالانکہ رجمِ زانی اور رجم کا صریحی تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔ جیسا کہ کچھ ہم نے بتا دیا۔ اور کچھ آئندہ سطور میں بیان ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ :۔

نواں اعتراض :۔ سنگساری اور رجم ظالمانہ کام ہے۔ اور ظالمانہ کام صرف کفار ہی کرتے ہیں :۔ اس لیے قرآن مجید میں رجم کو کفار کی طرف نسبت کیا گیا۔ دیکھو آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو۔ سورۂ یٰسٓ میں چند رسولوں کو کفار نے رجم کی دھمکی دی اسی طرح اصحاب کہف کو کافروں کے رجم کا اندیشہ ہوا حضرت شعیب کو کفار نے رجم کرنے کی دھمکی دی تو جس کام کو قرآن نے کفار کی طرف منسوب کیا وہ صرف شیطانی ہو سکتا ہے۔ نبی تو درکنار ایک عام مومن بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ **جواب** :۔ ہمارے معترض صاحب اپنی حماقت میں

نہایت دیدہ دلیری سے باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی یہی نادانیاں گستاخی تک لے جاتی ہیں۔
معترض صاحب کو صرف رجم ہی ظالمانہ نظر آیا۔ ان کے نزدیک صرف سنگساری ہی بے رحمانہ فعل ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ کام جو انسان کو کافر یا گناہگار بنا دے وہ ظالمانہ ہے۔ اسی طرح جو کام انصاف کے خلاف ہو وہ ظالمانہ ہے۔ اور جو انصاف کے عین مطابق ہو وہ نہ ظالمانہ ہے نہ بے رحمانہ بلکہ عین عدل اور حکمت پر مبنی اور ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ظاہر ظہور رجم کی مار کا ذکر کفار کی طرف بھی منسوب ہے اور اللہ رب نہار کی طرف بھی مگر چند فرقوں کے ساتھ۔ پہلا فرق یہ کہ کفار نے صرف رجم کی دھمکی دی مگر رب تعالیٰ نے جس کو رجم کرنا تھا واقعتاً رجم اور پتھروں سے ہلاک کر دیا۔ دوسرا فرق کفار نے نیکوں متقیوں۔ اور نبیوں کو رجم کرنے کی دھمکی۔ مگر رب تعالیٰ نے سرکشوں فسادیوں شیطانوں اور کسی طرح بھی نہ ٹھیک ہونے والوں کو رجم کیا۔ تیسرا فرق کفار نے اپنے ہاتھوں رجم کا ذکر کیا مگر رب تعالیٰ نے آقائے دو عالم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے بذریعہ ملائکہ رجم کیا اور تشریف آوری کے بعد بذریعہ امت مسلم۔ چوتھا فرق کفار نے بے گناہ مسلمان کو رجم کی دھمکی دی مگر رب تعالیٰ نے زانیوں لوطیوں گناہگاروں کو عدالت اور قانون کے ذریعے رجم کرایا۔ اور یہ بات بھی یقین کی حد تک ماننی پڑتی ہے کہ توریت میں حکم رجم کی موجودگی کی وجہ سے ضرور زانیوں کو رجم کیا جاتا رہا ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین جگہ رجم کرنے کا ذکر فرمایا۔ ایک جگہ وہ جب کہ قوم لوط نے بدکاریاں کیں اور لوط علیہ السلام نے بارہا فرمایا کہ اے لوگو تم شادی شدہ ہو تمہاری بیویاں جو میری روحانی بیٹیاں ہیں ان کے پاس جاؤ۔ مگر وہ چونکہ شادی شدہ بے غیرت تھے توبہ کرنا چاہتے ہی نہ تھے اس لیے کیا ہوا۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ سورت ھود آیت ۸۲ (الخ) اور اس پر کنکریلے پتھر برسائے۔ منکرین حدیث پر تین سوال ہیں۔ پہلا یہ کہ۔ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر رجم کا عذاب بھیجکر۔ کیا ان پر ظالمانہ بے رحمانہ اور معاذ اللہ شیطانی کام کیا۔ اس کا جواب دو۔ دوسرا سوال یہ کہ۔ قوم لوط کو رجم کی سزا کیوں دی گئی جبکہ کسی دوسری کافر سرکش قوم کو یہ سزا نہ ملی۔ ان کو طوفانوں ہواؤں چنگھاڑوں کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ سزا ان کے شادی شدہ زانی ہونے کی وجہ سے تھی جس میں اب تھوڑی سی یہ تبدیلی آگئی کہ اب رجم اس کو کیا جائے گا جو شادی شدہ ہو کر عورت سے زنا کرے۔ اگر ہماری یہ بات تسلیم نہیں تو جواب دو کہ قوم لوط کو اللہ نے فرشتوں سے کیوں رجم کرایا۔
تیسرا سوال یہ کہ ہم نے ثابت کر دیا کہ شروع زمانوں سے شادی شدہ زانیوں کو رجم کی سزا ملتی رہی آپ ان کے انکار کا ثبوت پیش کرو جس میں صاف لکھا ہو کہ رجم شیطانی کام ہے۔ اعتراض میں آپ نے صرف اپنا وہم گمان پیش کیا آپکے وہم گمان کو ہم نہیں مانتے کیونکہ حقیقت کے خلاف ہے۔ دوسری جگہ۔ سورت ملک آیت ۵ پر لکھا ہے:
وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ۔ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان ستاروں کو شیطانوں کے لیے رجم بنایا۔ ثابت ہوا کہ شیطانوں سرکشوں فسادیوں کو رجم کرنا اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ کام خواہ وہ فرشتوں کے ذریعے کرائے یا اسلامی

عدالتوں کے ذریعے ۔ تیسری جگہ ۔ قرآن مجید میں بہت جگہ شیطان کو رجیم کہا گیا ہے ۔ یعنی رجم اور سنگسار کیا ہوا جب شیطان ابلیس رجم ہو سکتا ہے تو انسانی شیطان منکوحہ زانی بھی رجم ہو سکتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ زانی پتھر کھا کر مر جاتا ہے ۔ برداشت نہیں کر سکتا مگر ابلیس مرتا نہیں ۔ اگر شیطان کو رجم نہیں کیا جاتا تو کیا قرآن پاک میں غلط لکھا ہے (معاذ اللہ) اب بتایئے معترض صاحب قرآن مجید میں رجم کا صاف صاف ذکر ہے یا نہیں ۔ **دسواں اعتراض** ۔ چونکہ سارے قرآن میں زنا کی سزا قتل یا رجم نہیں ۔ لہٰذا رجم کی موت قتل ناحق ہے ۔ اور قتل ناحق بحکم قرآنی حرام ہے ۔ سورت اسرا آیت ۳۳ میں ہے لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ قتل صرف قتل کے بدلے ہوتا ہے ۔ رب فرماتا ہے ۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۔ اس لیئے یہ کہنا کہ رجم سنت رسول مقبول ہے ۔ سراسر بہتان ہے ۔ **جواب** ۔ اِلَّا بِالْحَقِّ سے جو ثابت ہے کہ ناحق قتل حرام ہے ۔ بالکل ٹھیک ہے ۔ لیکن یہ کہنا کہ صرف قتل کے بدلے قتل ہو گا ۔ یہ غلط ہے ۔ اور قرآن مجید کی صریح آیات کے خلاف ہے دین اسلام میں چار قسم کے شخصوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے ۱ مرتد ۲ منافق ۳ فسادی ۴ قاتل ۔ چنانچہ سورت احزاب آیت ۶۱ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔ وَ قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ۔ ترجمہ : ۔ اور منافق گن گن کر قتل کیئے جائیں ۔ یعنی حاکم اسلام منافقوں کو چن چن کر ختم کردے ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ۔ سورت نساء آیت ۸۹ ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۔ (الخ) ۔ ترجمہ : ۔ تو اگر وہ لوگ اسلام سے پھر جائیں پس ان کو پکڑو اور ان کو قتل کر دو جہاں کہیں سے جس طرح ہو سکے پاؤ تم ۔ یعنی مرتد انسان کو حاکم وقت پکڑوا کر قتل کرا دے ۔ ہاں البتہ پہلے پوچھ گچھ کرے علما کے ذریعے اس کے شکوک دور کرائے توبہ کی تلقین کرے کسی طرح مومن نہ بنے تو قتل کرادے ۔ تیسری جگہ ارشاد ہے ۔ سورت مائدہ آیت نمبر ۳۳ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا (الخ) یہ آیت ہم نے پہلے بھی بیان کر دی ہے اپنے دلائل کے ضمن ۔ اس میں ہر فسادی کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی حاکم اسلام فسادی کو قتل کرے ۔ فسادیوں میں زانی محصن (شادی شدہ) پہلے درجے کا فسادی ہے ۔ لہٰذا اس کو سخت طریقے یعنی رجم سے قتل کیا جائے ۔ چوتھی جگہ قاتل کو قتل کرنا جس کا ذکر معترض کی پیش کردہ آیت میں ہے ۔ مجھ کو منکروں کی کم علمی پر اس لیئے افسوس ہے کہ یہ اہل قرآن اور قرآن مجید کے صحیح سمجھ دار ہونے کے دعوے دار ہیں ۔ مگر لاعلمی کی یہ حالت یہ ہے کہ خود قرآن مجید کی آیتوں کی بھی خبر نہیں ۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ بحکم قرآنی چار شخصوں کے قتل حق ہیں یہ ثابت کر کے معترض کی دسویں دلیل کا خاتمہ کر دیا ۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ رجم زانی ناحق قتل نہیں ۔ یہ تو وہ قتل تھے جو قرآن مجید میں مذکور ہوئے ۔ اس کے علاوہ کچھ وہ قتل ہیں جو حدیث پاک اور تعزیرات فقہا سے ثابت ہیں ۔ ۱ جیسے لواطت کرنے والے ۲ اور ڈاکو ۳ باغی ۔ وغیرہ اٹھارہ قسم کے مجرم تعزیراً قتل کیئے جائیں گے

اب واضح ہو گیا کہ اسلام میں کل بائیس قسم کے قتل حق ہیں۔ اس کے علاوہ تمام قتل ناحق ہیں۔ منکرِ حدیث معترض کا کہنا کہ صرف قاتل کا قتل حق ہے باقی سب ناحق یہ انکی کی جہالت اور کم فہمی ہے۔ **گیارھواں اعتراض**:۔ اللہ تعالےٰ زانیوں کو زندہ رہنے توبہ کرنے اور اصلاحِ حال کا حق عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سورت فرقان آیت ع۶۸ وَلَا یَزْنُوْنَ۔ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا (الخ) اور آگے آیت ع۶۹:۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ:۔ (ترجمہ):۔ یعنی زانی توبہ کرے اور عمل صالح کرے تو اس کو گناہ سے معافی مل جائے گی۔ اور رجم کے بعد توبہ کی مہلت ہی نہیں ملتی رجم سے قتل کیا جاتا ہے۔ توبہ تو تب ہی ہو سکتی ہے جب زنا کے بعد بھی زندہ رہے۔ ثابت ہوا کہ رجم منشاءِ خداوندی کے خلاف ہے۔ **جواب**:۔ ظاہری لحاظ سے تو یہ آیتِ کریمہ معترض کے بالکل خلاف ہے۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ زنا اُکے کوڑوں کی سزا بھی نہ دی صرف زانی کو توبہ ہی کافی ہے۔ یہ کورچشمی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ آیات کے الفاظ و معانی میں تدبر نہ کیا۔ بس اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی۔ خواہ دوسری طرف سے اپنا ستیاناس ہی کیوں نہ ہو جائے محترم اس کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے نکالنا چاہا۔ بلکہ پوری آیت پاک کا مطلب اس طرح ہے۔ کہ مومن کی شان یہ ہے کہ ان میں خصوصی طور پر یہ تین عیب نہیں ہوتے۔ ع۱ وہ کسی جھوٹے معبود کی عبادت نہیں کرتے ع۲ وہ ظلماً جان کو قتل نہیں کرتے ع۳ وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو یہ تین کام کرے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ بھاری سزا پائے گا وہ یہ کہ عذاب دوگنا کیا جائے گا۔ اس کے لیئے قیامت کے دن اور قیامت کے بعد ہمیشہ ہمیشہ تک ذِلت میں اس میں رہے گا مگر جو اس کفر سے دنیوی زندگی میں ہی توبہ کرے اور توبہ پر قائم رہنے کی نشانی کے طور پر اچھے عمل کرے کہ نہ شرک نہ قتلِ ناحق نہ زنا کرے۔ نہ کوئی اور گناہ۔ تو یہی لوگ ہیں جن کے گناہِ سابقہ اللہ نیکیوں سے بدل دے گا۔ ہمارا بیان کردہ مطلب چند وجہ سے لازمی درست ہے:۔

پہلی وجہ:۔ دوسرے آیاتِ قرآنیہ میں کفر و اسلام کی نشانیاں ذکر ہوتی چلی آرہی ہیں پس یہ بھی مومن و کافر کی امتیازی نشانی ہے۔ **دوسری وجہ**:۔ خلود اور عذاب کا دائمی ہونا صرف کافر کے لیئے ہے اور صرف زنا سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا۔ **تیسری وجہ**:۔ یہ کہ مُھَانًا یعنی ذلت کی دائمی سزا صرف کافر کو ہو گی۔ مومن کو جہنم کی عارضی سزا بھی ذلت کی نہ ہو گی:۔ **چوتھی وجہ**:۔ یہ کہ اگر یہاں زنا کی بات مراد ہوتی تو یضعف یعنی دگنا عذاب مراد نہ ہوتا۔ کیونکہ زانی سزا بھی پائے تو پھر دگنا عذاب کیوں ہو اور نیز جب جرم ایک ہے تو عذاب دگنا کیوں ہو۔ اگر معترض صاحب اب بھی اس مطلب کو نہ ماننے پر مصر ہوں اور علیحدہ زنا کی بات ہی مراد لیں تو ہم کہیں گے پھر اس سے کنوارے کا زنا مراد ہے۔ اور یا وہ زنا مراد ہے جس کی خبر حاکم کو نہ لگے پوشیدہ رہے یا اسلامی حکومت نہ ہو یا سزا نہ دی جاتی ہو تو اس صورت میں سچی توبہ سے رحیم و کریم رب تعالیٰ معاف فرما دے گا

بحمدہٖ تعالیٰ ہم نے نہایت دیانت داری انصاف کے ساتھ معترض کے تمام شکوک و شبہات اور دلائل و اعتراضات واضح طور پر بیان کر کے ایک ایک لفظ کی مکمل تردید و تشفی کر دی۔ اب معترض صاحب اللہ دتہ چوہدری فیصل آبادی۔ اور ایم آئی چوہدری ایڈووکیٹ لاہوری صاحب و دیگر منکرین حدیث میرے اس فتوے کو ٹھنڈے دل سے تحقیقِ حق کے لیئے باغور و تفکر و تدبر پڑھیں اور زانی کو توبہ کرانے کے ساتھ اپنے باطل نظریات و عقائد سے بھی توبہ کریں اور وفاقی شرعی عدالت کا فرض منصبی و اسلامی ہے کہ معترض کے دلائل سے متاثر ہو کر جو فیصلہ حد شرعی رجم زانی کے خلاف صادر کر چکے ہیں اُس سے رجوع کرتے ہوئے اپنا فیصلہ واپس لیں۔ اور صحیح اسلامی نظریئے کے مطابق رجم زانی کا فیصلہ جاری فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو خدمتِ اسلام کا اجر عطا فرمائے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

بس ایک سوال باقی ھے۔ جس کا ذکر اور وضاحت اشد ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ زنا جرم ایک ہے۔ اس کی نوعیت و طریقہ فعل بھی ایک ہے۔ مگر سزا تین طرح مختلف ہے۔ اس طرح کہ شادی شدہ مجرم زانی کو سنگسار یعنی رجم کر کے ہلاک کر دیا جائے۔ اور کنوارے زانی کو سو کوڑے مار کر زندہ رکھا جائے اور لونڈی غلام کو آدھی سزا پچاس کوڑے۔ اور مجبور کو بالکل معاف کر دیا جائے۔ تو یاد رکھو اسلام کو مجرم سے صرف جرم کی وجہ سے نفرت ہے۔ جرم جب تک صرف جرم ہی رہے اس وقت تک اس کی سزا بطورِ اصلاح ہوتی ہے لیکن جب جرم فساد اور سرکشی کا روپ دھارلے تو مجرم کی اصلاح کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس کو زندگی کا حق دینا معاشرے پر ظلم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد انسان عظیم ذمہ داریوں کا خود مختار مالک بن جاتا ہے وہ اپنی اصلاح بذاتِ خود بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ اس کو قدرت نے ہر طرح کا قلبی نفسانی ہیجانی سکون عطا کر دیا ہے۔ اب وہ اپنی آئندہ بہتر زندگی بنانے کا ذمہ دار ہے مگر وہ اس طرف توجہ ہی نہ کرے اور اس سکونِ قلبی کی قدر نہ کرے۔ کتے بلّے کی طرح حرص و ہوس کی گندگی میں پھنستا رہے تو اب وہ مجرم و سرکش ہے کہ جس اچھائی کے لیئے اس کو موقعہ دیا گیا ہے۔ اُس کی طرف راغب نہیں۔ اس کا زنا کسی مجبوری کے تحت نہیں۔ پس ایسے سرکش کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ بخلاف کنوارے زانی کے کہ ابھی اس کو سکون کے موقعہ اور باعزت زندگی بنانے کا اختیار نہ ملا۔ کنوارا شخص اپنے زندگی کو بے کیف اور ہیجانی سمجھتا ہے اس لیئے مجبور ہو کر شیطانی راہ چلتا ہے۔ لہٰذا اُس کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا۔ اور اُس کی سزا سو درّے بھی اُس کے اصلاحِ حال کے لیئے ہے۔ اس سزا کے خوف سے وہ اپنی اصلاح کرے گا۔ طبیعت پر جبر کرنے کی عادت پیدا ہو گی۔ سزا کے بغیر تو اچھے سے اچھا انسان بھی بے مہار ہو جاتا ہے۔ لونڈی غلام کو دنیوی کسی اسٹیج پر مکمل حقوق نہیں ملتے اس لیئے اُس کو اصلاحِ حال کے بہت کم موقعہ میسر آتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہ مجبورِ محض ہوتے ہیں۔ چونکہ اُن کے انعامات بھی آدھے ہیں۔ عزت آدھی درجہ آدھا۔ اس لیئے سزا میں بھی اُن کو آدھا حصہ دیا گیا۔ لونڈی غلام کنوارا زانی ہو یا منکوحہ ان کو رجم نہ کیا

اور آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو۔

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

سوال مذکورہ میں مذکرہ مسلم بھنگی (جاروب کش) جس کو پنجابی میں مسلی کہا جاتا ہے انتہا سخت گمراہ اور بداخلاق ہے اور شرعی سزا کا مستحق ہے ایسے لوگ قانون شریعت کے نظریہ مطہرہ کے اعتبار سے دنیائے کائنات میں سب سے بڑا مقام و درجہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہے۔ اور ان کی نسبت سے اُن کی اولادِ پاک تا قیامت کا مرتبہ سارے انسانوں سے بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ غوث و قطب کو بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے ادب کے سوا چارہ نہیں۔ یہ نسبت ہی کی شان ہے کہ قرآن کریم میں خود باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ نے اپنے قانون کے پہنچانے کی اُجرت محبتِ سادات مقرر فرمائی۔ اور بہت شان سے اور اہمیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسلِ پاک کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (ترجمہ) اے پیارے حبیب فرما دیجئے میں اپنی اس ساری تبلیغ پر تم سے تنخواہ یا اُجرتِ مال و دولت نہیں مانگتا۔ ہاں اپنے (آنے والوں) قرابت والوں کی محبت مانگتا ہوں۔ رب تعالیٰ نے اجرت کے ساتھ محبّت کا ذکر فرما کر محبّت کو اجرت بنا دیا کہ جس طرح اُجرت دینا فرض و واجب ہوتی ہے اسی طرح سادات سے محبّت کر کے تم احسان نہ کرو گے۔ بلکہ جس طرح نماز روزہ، حج، زکوٰۃ سب مسلمانوں پر تا قیامت اشد فرض ہے۔ اسی طرح نبی کریم رؤف و رحیم علیہ التحیۃ والثنا کی اولادِ پاک سیّدوں سے محبت کرنا اُن کی ہر طرح خدمت کرنا ہر مسلمان پر فرض و لازم ہے۔ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، وزیر ہو یا بادشاہ سب سادات کے خدّام ہیں اور سب پر سیدوں کا احترام لازم و واجب ہے۔ اور جس طرح نماز میں کوتاہی کرنے والے کو میدانِ محشر میں سزا ہو گی اسی طرح وہ بھی عذاب و عتاب میں مبتلا ہو گا۔ جس نے سیّد کی عزت میں فرق ڈالا۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ جلّ برہانہٗ کو اپنے حبیب کی ہر چیز پیاری ہے۔ یہ سب قانون قرآنِ پاک کی اِس آیت سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اِس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اگرچہ مفسّرینِ عظام نے یہ توجیہہ بھی بیان فرمائی ہے کہ یہاں بذاتِ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا حکم ہے۔ جو صرف اہلِ مکہ قریش اور ہاشمیوں سے خطاب ہے۔ مگر یہ بات زیادہ مضبوط اور درست نہیں اس لئے کہ اِس توجیہہ کو تسلیم کرنے میں دو رکاوٹیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر یہاں قریشِ مکہ کی محبّت رشتہ داروں والی مراد ہوتی اور اس کا مطالبہ ہوتا تو روشِ کلام کے لحاظ سے یہاں فِی الْقُرْبٰى نہ ہوتا۔ لِلْقُرْبٰى ہوتا۔ کیونکہ قرابت داری کو محبّت کا سبب بنایا جاتا۔ اور لام سببیت کا ہوتا ہے نہ کہ فی۔ یہی وجہ ہے کہ جن مفسرین نے محبت قریش والی توجیہہ نکالی ہے اُن کو مجبوراً فی بمعنیٰ لام کہنا پڑا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ خواہ مخواہ اتنی کھینچا تانی کی ضرورت کیا ہے

اور آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو۔

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

سوال مذکورہ میں مذکورہ مسلم بھنگی (جاروب کش، جس کو پنجابی میں مسلی کہا جاتا ہے انتہا سخت گمراہ اور بد اخلاق ہے اور شرعی سزا کا مستحق ہے اس لئے کہ قانون شریعت کے نظریہ مطہرہ کے اعتبار سے دنیائے کائنات میں سب سے بڑا مقام و درجہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہے۔ اور ان کی نسبت سے اُن کی اولادِ پاک تا قیامت کا مرتبہ سارے انسانوں سے بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ غوث و قطب کو بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے ادب کے سوا چارہ نہیں۔ یہ نسبت ہی کی شان ہے کہ قرآن کریم میں خود باری تعالیٰ عزّ اِسْمُہٗ نے اپنے قانون کے پہنچانے کی اُجرت محبتِ سادات مقرر فرمائی۔ اور بہت شان سے اور اہمیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسلِ پاک کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (ترجمہ) اے پیارے حبیب فرما دیجئے میں اپنی اس ساری تبلیغ پر تم سے تنخواہ یا اُجرتِ مال و دولت نہیں مانگتا۔ ہاں اپنے (آنے والوں) قرابت والوں کی محبت مانگتا ہوں۔ رب تعالیٰ نے اجرت کے ساتھ محبّت کا ذکر فرما کر محبّت کو اجرت بنا دیا کہ جس طرح اُجرت دینا فرض و واجب ہوتی ہے اسی طرح سادات سے محبت کر کے تم احسان نہ کرو گے۔ بلکہ جس طرح نماز روزہ، حج، زکوٰۃ سب مسلمانوں پر تا قیامت اشد فرض ہے۔ اسی طرح نبی کریم رؤف و رحیم علیہ التحیۃ والثنا کی اولادِ پاک سیّدوں سے محبت کرنا اُن کی ہر طرح خدمت کرنا ہر مسلمان پر فرض و لازم ہے۔ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، وزیر ہو یا بادشاہ سب سادات کے خدّام ہیں اور سب پر سیدوں کا احترام لازم و واجب ہے۔ اور جس طرح نماز میں کوتاہی کرنے والے کو میدانِ محشر میں سزا ہوگی اسی طرح وہ بھی عذاب و عتاب میں مبتلا ہوگا۔ جس نے سیّد کی عزت میں فرق ڈالا۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ جلّ برہانہٗ کو اپنے حبیب کی ہر چیز پیاری ہے۔ یہ سب قانون قرآنِ پاک کی اِس آیت سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اِس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اگرچہ مفسّرینِ عظام نے یہ توجیہہ بھی بیان فرمائی ہے کہ یہاں بذاتِ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا حکم ہے۔ جو صرف اہلِ مکہ قریش اور ہاشمیوں سے خطاب ہے۔ مگر یہ بات زیادہ مضبوط اور درست نہیں اس لئے کہ اِس توجیہہ کو تسلیم کرنے میں دو رکاوٹیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر یہاں قریشِ مکہ کی محبّت رشتہ داروں والی مراد ہوتی اور اس کا مطالبہ ہوتا تو روشِ کلام کے لحاظ سے یہاں فِی الْقُرْبٰی نہ ہوتا۔ لِلْقُرْبٰی ہوتا۔ کیونکہ قرابت داری کو محبّت کا سبب بنایا جاتا۔ اور لام سببیت کا ہوتا ہے نہ کہ فی۔ یہی وجہ ہے کہ جن مفسرین نے محبت قریش والی توجیہہ نکالی ہے اُن کو مجبوراً فی بمعنیٰ لام کہنا پڑا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ خواہ مخواہ اتنی کھینچا تانی کی ضرورت کیا ہے

جبکہ روش کلام سے بھی قیامت تک کے مساوات کا ادب ہی مقصود من اللہ ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس توجیہہ سے یہ منشاء قرآنی و مطالبہ رحمانی بہت ہی محدود رہ جائے گا حالانکہ وسعت تبلیغ اس مطالبے کی وسعت کی متقاضی ہے۔ کیونکہ اس محبت کو تبلیغ قانون کی اجرت بنایا گیا۔ تو جس شخص تک یہ تبلیغ پہنچی اور جس جس نے اس قانون سے فائدہ حاصل کیا اُس اُس کو اُجرت دینی فرض ہے۔ اور یہ فطری امر بھی ہے کہ جو شخص قانون سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو کورٹ فیس دینی لازم ہے۔ قیامت تک ہر مسلمان نماز روزہ حج زکوٰۃ سے اور نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فائدہ حاصل کر رہا ہے لہٰذا اُس کو اس کی اُجرت سادات کرام کی عزت و خدمت بھی ادا کرنی فرض ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ نبی کریم شہنشاہ کائنات کو اس محبّت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جو اہل مکہ قریش مسلمان ہو چکے تھے اُن کی مودّت تو خود بخود حاصل ہو گئی کہ محبّت کے بغیر ایمان ہی نہیں جیساکہ ارشاد ہے۔ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا مَحَبَّۃَ لَہٗ اور لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ د الخ) مشکوٰۃ شریف کی حدیث سے بھی یہی ظاہر ہے۔ محبّت کے بغیر ایمان منافقت ہے۔ اور جو قریش مسلمان نہ ہوئے اُن کی محبت بے کار کہ کافر کی محبّت نقصان دہ بلکہ ناممکن۔ پس مسلمان کی محبّت کا مطالبہ تحصیل حاصل اور کافر کی محبت محال بالذّات۔ تو ایسا مطالبہ بھی ٹھیک نہیں۔ اب ماننا پڑے گا کہ اس آیت میں قیامت تک سادات کی محبت کا مطالبہ ہے اور ہر مسلمان پر سیّد زادے کا ادب و احترام فرض ہے۔ جیساکہ نماز روزہ فرض ہے۔ اس آیت کے مکّی ہونے سے یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا کہ امام حسن و حسین کی ولادت مکّی نہیں۔ لہٰذا یہاں اولاد کی مودّت مراد نہیں اس لئے کہ حضرت فاطمہ زہرا مکّی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ کوثر مکّی کے نزول پر کوثر سے مراد فاطمہ زہرا لیا گیا۔ اور نسل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہ زہرا سے چلی جو قیامت تک رہے گی اسی کی مودّت مومنوں پر فرض ہے۔ یہ تو قرآن پاک سے ثابت ہوا متعدّد احادیث سے بھی اس فرضیت کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد ۱۲ پارہ ۲۵ صفحہ نمبر ۳۱ پر ہے۔ وَعَنْ اَبِیْ ذَاذَانَ عَنْ عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَجْہَہٗ فِیْنَا اٰلَ حٰمٓ اٰیَۃٌ لَا یَحْفَظُ مَوَدَّتَنَا اِلَّا الْمُؤْمِنُ (ترجمہ) حضرت ذاذان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا کہ مولیٰ علی مشکل کشا کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ حٰمٓ والی سورت میں ایک آیت ہمارے بارے میں ہے۔ ہم سے محبّت مومن ہی کرتا ہے۔ وہی ہماری مودّت کو محفوظ کرتا ہے۔ آقائے کل دانائے سبل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَجَّتِہٖ یَوْمَ عَرَفَۃَ وَھُوَ عَلٰی نَاقَتِہِ الْقَصْوَاءِ یَخْطُبُ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ رَوَاہُ التِّرْمَذِیُّ (ترجمہ) روایت ہے حضرت جابر سے اُنہوں نے فرمایا کہ دیکھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے حج مبارک

میں عرفہ کے دن قصواء مبارکہ اونٹنی پر خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو سنا میں نے کہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اے لوگو بے شک میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے اگر تم مضبوط پکڑے رہے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے ایک چیز کتاب اللہ ہے اور دوسری چیز میری عترت میرے اہل بیت ہیں۔ یہ حدیث شریف ترمذی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۱۹ پر ہے۔ یہ حدیث شریف اسناداً قوی تر ہے۔ اس فرمان پاک سے قرآن کریم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ حضرات سادات کی شان واہمیت بھی معلوم ہوئی۔ کہ جس طرح قرآن کریم کی عزت اور محبت مسلمان کو گمراہی سے بچاتی ہے اسی طرح پیارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پاک سید حضرات بھی قابلِ تکریم اور واجبُ التعظیم ہیں۔ اور ان کی عزت سے مومن کی دین و دنیا کی کامیابی وابستہ ہے۔ اور جس طرح قرآن کریم کی گستاخی کفر ہے اسی طرح سادات کی گستاخی بھی کفر ہے۔ بس یہی کہ اس حدیث پاک نے عترتی کو کتابُ اللہ پر عطف کیا اور بقاعدۂ نحویہ معطوف علیہ کے حکم میں ہی معطوف ہوتا ہے۔ عترتی کی اہمیت اس بات سے مزید ہوتی ہے کہ خود پیارے آقا صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اس لفظ کی تشریح اَہلُ بَیْتِیْ کہہ کر بیان فرمادی۔ تاکہ کچھ اجمال باقی نہ رہے۔ تفسیر ابن کثیر نے جلد چہارم صفحہ ۱۱۳ پر بسند صحیح فرمایا۔ قَالَ اَحْمَدُ حَدَّثَنَا جَرِیْرٌ (الخ) قَالَ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاللہِ لَا یَدْخُلُ قَلْبَ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ اِیْمَانٌ حَتّٰی یُحِبَّکُمْ لِلّٰہِ وَلِقَرَابَتِیْ ترجمہ امام احمد بن حنبل نے مسند حنبل میں فرمایا کہ حضرت جریر نے حدیث فرمائی۔ کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اے میرے اہلِ بیت اللہ کی قسم کسی مسلمان شخص کے دل میں اُس وقت تک ایمان نہیں داخل ہو سکتا جب تک کہ تم سے اللہ کے لیئے اور میری قرابت داری کی وجہ سے محبت نہ کرے۔ اللہ اکبر کیا شان ہے سیدوں کی کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم جن کی قسمیں رب فرماتا ہے۔ وہ اللہ کی قسم فرما کر سید کی محبّت کا سبق اپنی امت کو سکھا رہے ہیں۔ اور آگاہ فرما رہے ہیں کہ ایمان کا دارومدار سادات کی محبّت ہے۔ تفسیر روح البیان شریف جلد ہشتم نے صفحہ نمبر ۳۱۲ پر آقائے دوعالم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طویل خطبہ نقل فرمایا ہے۔ جس کے ابتدائی الفاظ ہیں۔ وَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور درمیان ایک جملہ مبارکہ اس طرح ہے۔ اَلَا وَمَنْ مَّاتَ فِیْ بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ کَافِرًا۔ ترجمہ۔ پیارے آقا صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خبردار اور وہ شخص جو مرا آلِ محمد پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بُغض میں وہ مرا کافر ہو کر۔ اس روایت کو تفسیر کبیر جلد ہفتم نے صفحہ نمبر ۳۹۰ پر تفسیر کشاف سے نقل کیا۔ اور مزید دو روایات نقل کیں کہ۔ مَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مَکْتُوْبًا بَیْنَ عَیْنَیْہِ اٰیِسٌ مِّنْ رَّحْمَۃِ اللہِ دوسری روایت مَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ لَمْ یَشُمَّ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ ترجمہ۔ جو سادات کے بُغض میں مرے گا اس کے ماتھے پر بروزِ قیامت لکھا ہو گا

یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔ اور وہ جنّت سے اتنا دور رہے گا کہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔ روح البیان کی یہ روایت اگرچہ سنداً موضوع معلوم ہوتی ہے۔ مگر معناً بالکل درست ہے۔ اس لئے کہ اِس سے پہلے تفسیر ابنِ کثیر کی صحیح روایت میں ایمان کا مدار محبتِ سادات مقرر فرمایا تو لازمی بات ہے کہ عداوتِ سادات کفر کا مدار بنے گا۔ ورنہ اجتماعِ ضدّین کا اندیشہ یہ بھی خیال رہے کہ قرآن وحدیث کے فرمودات میں قرابت اور اہل بیت سے مراد تاقیامت سید خاندان ہیں۔ نہ کہ تابعیت یا تبع تابعیت اور نہ ہی فقط امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں بھی اور حدیث پاک میں بھی اہلِ بیت کو قرآن کریم سے نسبت ومعیّت دی ہے۔ نہ کہ صحابیت یا تابعیت سے اس کی وجہ یہ ہے کہ دورِ صحابیت وغیرہ قلیل ہے اور دورِ قرآن تاقیامت کثیر۔ پس کثیر کے ساتھ معلّق کرنے سے ثابت ہوا کہ اہل بھی وہ ہیں جو تاقیامت ہوتے رہیں گے۔ اور وہ سید ہی ہیں۔ لہٰذا ان موجودہ سادات کی عزت ومحبت ایمان ہے اور ان کی بے ادبی گستاخی کفر یا فسق ہے۔ اگر صرف حضرات حسنین کریمین کی ہی عزت مدار ایمان ہوتا تو اس کا ذکر صحابہ کے ساتھ ہوتا نہ کہ کلام پاک کے ساتھ۔ اور پھر اُن کی مودّت اجرتِ تبلیغ اسلام بنتی محبت ومودّت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ محبّت صرف قلبی الفت کا نام ہے جو غائبانہ بھی ہوجاتی ہے۔ مگر مودّت اُس امداد کو کہتے ہیں جو عقیدت کے ساتھ ہو۔ جیسے غلام آقا کی، مرید پیر کی، شاگرد استاد کی امداد کرتا ہے (مجمع البحار سوم صفحہ ۲۵۴) مودت ہمیشہ موجود سے ہوتی ہے نہ غیب سے نہ معدوم سے۔ پس سوچو کہ رب تعالیٰ نے اِلَّا الْمَحَبَّةَ فِي الْقُرْبٰى نہ فرمایا بلکہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فرمایا۔ فقہاءِ کرام فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص عالمِ دین سے بلا عذر دنیوی بغض رکھے وہ کافر ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۷۰ پر ہے:۔ مَنْ اَبْغَضَ عَالِمًا مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِيْفَ عَلَيْهِ الْكُفْرُ (الخ) وَيُخَافُ عَلَيْهِ الْكُفْرُ اِذَا شَتَمَ عَالِمًا اَوْ فَقِيْهًا مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ ترجمہ جو شخص عالم سے بغض رکھے بغیر کسی ظاہری وجہ کے اس پر کفر کا اندیشہ ہے۔ اور اندیشہ کیا جاتا ہے اس پر بھی کفر کا جس نے عالم یا فقیہ کو بغیر ظاہری سبب کے گالی دی۔ اس فرمان سے ثابت ہوا کہ کسی بھی دینی بزرگ کو گالی دینا یا اُن سے بغض رکھنا صرف اس لئے کہ وہ عالم دین ہے کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ تو بتاؤ کہ سیّد جس کی عظمت کا حکم خود خالقِ کائنات نے صادر فرمایا۔ اور جس کو آقائے دوعالم رحمتِ کائنات کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے وہ کس قدر دینی بزرگی والا ہوگا اور اس کی گستاخی کس درجے کفر ہوگی۔ بہرحال سیّد کی گستاخی سخت ترین جرم شرعی ہے۔ سیّد وہ لوگ ہیں جو امام حسن اور امام حسین کی اولاد سے ہوں۔ اگرچہ سیّد زادہ فاسق ہو۔ لیکن اس کی گستاخی اور اس سے محض سیّد ہونے کی بناء پر بغض رکھنا کفر ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سیّد زادے کو پڑھانے والا استاد بھی عالم یا محدث مفسر اُس سیّد شاگرد کی توہین نہیں کرسکتا بلکہ بامرِ مجبوری مارنے کی صورت میں بھی گمان کرے کہ اپنے آقازادے کو تنبیہاً ایسا کر رہا ہوں۔ بلکہ روحانی علاج یا میں

پچیں دور کرنے کی نیت کرے۔ امام اعظم امام شافعی جیسی اعلیٰ ترین شخصیات بھی سیّد کا احترام کرتی رہیں۔ تو یاد شما کس زمرے میں ہیں۔ قانون شرعی کے مطابق جو شخص سید سے صرف اس لیئے بغض رکھے یا گستاخی کرے کہ نبی کریم کی اولاد ہے تو ایسا شخص کافر ہوگا۔ اور اگر دنیوی وجہ سے گستاخی کرے تو گمراہ ہے۔ اور لائق تعزیر ہے۔ یہاں تک حکم ہے کہ سیّد زادہ کسی کو برا کہے یا ناراضگی میں سب و شتم کرے تو اس کو بھی برداشت کیا جائے اور نرمی سے سمجھایا جائے جواباً لڑائی مت کرو۔ اور یہ خیال کیا جائے کہ یہ ہمارے سرکار صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرزند ہیں۔ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمارے آقا زادے و مخدوم ہیں۔ عقل کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سیّد کا احترام کیا جائے۔ اس لیئے کہ عقلاً نقلاً یہ بات درست ہے کہ ہر ادنیٰ اعلیٰ کے ماتحت ہے اور ادنیٰ پر اعلیٰ کا احترام واجب اور یہ بھی قاعدہ کلیہ ہے کہ ادنیٰ کی ہر چیز ادنیٰ ہے اور اعلیٰ کی ہر چیز اعلیٰ ہے۔ مومن انسان کو باری تعالیٰ کی طرف سے تین چیزیں عطا ہوئیں ۱۔ جسم ۲۔ روح ۳۔ ایمان۔ ان میں سب سے ادنیٰ جسم اور سب سے اعلیٰ ایمان۔ بحکم قرآنی جسم کو جان پر اور جان کو ایمان پر قربان کرنا اشد ضروری ہے۔ کہ اگر جان کا خطرہ ہو تو حرام کھالے اور اگر ایمان کا خطرہ ہو تو جان کی پرواہ نہ کرے ایمان بچالے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اعلیٰ چیز کا احترام ادنیٰ پر لازم ہے۔ تو سمجھ لو کہ کائنات میں ذاتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اعلیٰ ہے۔ اور بقاعدۂ مشہورہ اعلیٰ کی ہر چیز اسی درجے کی ادنیٰ کی ہر چیز سے اعلیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کائنات میں جو فضیلت مدینہ منوّرہ کو ہے وہ کسی شہر کو نہیں۔ وہاں کی مٹی کنکر پتھر ساری دنیا کے کائنات سے افضل۔ پس وہ نسلِ پاک مصطفیٰ جس میں خونِ پاکِ مصطفیٰ موجزن ہے وہ سب دنیا سے افضل کیوں نہ ہوگا۔ جب بادشاہ کی اولاد دنیوی نظر میں رعایا پر افضل ہوئی۔ پیر مرشد کی اولاد سب مریدین کی نظر میں قابلِ ستائش۔ استاد کی اولاد شاگردوں کے لیئے قابلِ عزت ہوتی ہے۔ تو پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ محترم سادات کا مرتبہ تمام امت میں افضل و اشرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے بھی سادات کا احترام کرتے ہیں۔ کہ وہ بھی امت میں شامل ہیں۔ سیّد سے بغض رکھنے والا کبھی درجۂ ولایت پر نہیں پہنچ سکتا۔ خواہ کتنے ہی عمل صالح کرے۔ ہاں تاریخ سے ثابت ہے کہ بے عمل شخص سیّد کا احترام کر کے ولایتِ عظمیٰ کا مقام حاصل کر گیا۔ دیکھو حضرت جنید بغدادی کا واقعہ۔ دنیا میں ہر انسان کا احترام اس کے کمال سے کیا جاتا ہے۔ مگر سید بے کمال بے علم یا نادان مجنون ہو۔ تب بھی اس کا احترام فرض ہے۔ کیونکہ اس کا سب سے بڑا کمال نسلِ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہونا ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

شعر

تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا — تو ہے عینِ نور تیرا سب گھرانا نور کا

یہی وہ کمال ہے جس کی بناء پر سیّد کو رب تعالیٰ کی طرف سے وہ رتبہ ملا۔ جو کسی بادشاہ، پیر، فقیر، عالم، مفتی

کو نہ ملایں تو کہتا ہوں کہ اگر کسی ولی اللہ کو مرتبۂ علیا میسر نہ آتا ہو یا کسی شخص کے عُقدے نہ کھلتے ہوں یا کوئی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو تو وہ شخص چالیس دن کسی نجیبُ الطّرفین مُتّقی باوضو سیّد کے پیر اور ہاتھ دھوکر پیئے بفضلہٖ شفا ہوگی اور مرادِ قلبی پوری ہوگی۔ سیّد کا یہ احترام آخر کیوں ہے صرف اور صرف اس لیئے کہ یہ نبی کریم حضور اقدس صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسلِ پاک ہیں۔ لہٰذا شرعی قانون کے مطابق مندرجہ بالا دلائل کے تحت جو شخص صرف اِس لیئے سیّد سے بغض رکھتا ہے یا سیّد کی گستاخی کرتا ہے کہ وہ نبی کریم کی اولاد ہے تو وہ شرعاً مُرتد کافر ہے۔ اور جو شخص سیّد سے ذاتی بنا پر بغض یا دشمنی کرے یا گالی دے تو وہ گمراہ ہے کافر نہیں۔ خاص کر ماں کی گالی دینا سیّد کو بہت بڑی گمراہی ہے۔ اسلام کے راستے سے ہٹنے کا نام گمراہی ہے خواہ جان کر ہٹے یا بھول کر چنانچہ تفسیر بیضاوی علیٰ اربع تفاسیر جلد اول صفحہ نمبر ۳۲ پر ہے:۔ وَالضَّلَالُ الْعُدُوْلُ عَنْ طَرِيْقِ السَّوِيِّ عَمَدًا اَوْخَطَاءً ترجمہ:۔ اور گمراہی اسلام کے سیدھے راستے سے ہٹنے کا نام ہے جان بوجھ کر یا خطا سے۔ بحکمِ قرآن مجید سیّد کا احترام کرنا بھی اسلام کا راستہ ہے جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ لہٰذا اس کا منکر کافر اور اس سے صرف ہٹنے والا گمراہ ہوتا ہے۔ پس صورتِ مذکورہ میں جاروب کش مسمیٰ عطا اِس گالی گلوچ اور سیّد زادے کی گستاخی کی بنا پر سخت فاجر فاسق اور گمراہ ہوا۔ شرعی طور پر یہ جرم قابلِ تعزیر ہے۔ اس لیئے کہ قانونِ اسلامی میں گالی و گستاخی کی تعزیر کیلئے تین شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ فعلِ اختیاری کی گالی یا تہمت دے فعلِ خلقی کی تہمت نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ گالی یا تہمت شرعاً حرام ہو۔ تیسری شرط یہ کہ عام طور پر اُس گالی کو عار اور شرم سمجھا جاتا ہو۔ چنانچہ فتاویٰ درِمختار مکمّل صفحہ نمبر ۳۲۶ پر اور فتاویٰ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۲۵۵ پر ہے:۔ وَالضَّابِطُ اَنَّهُ مَتٰى نَسَبَهُ اِلٰى فِعْلٍ اِخْتِيَارِيٍّ مُحَرَّمٍ شَرْعًا وَيُعَدُّ عَارًا عُرْفًا يُعَزَّرُ وَاِلَّا لَا (ترجمہ) اور تعزیر میں قاعدۂ کلیہ شرعیہ یہ ہے کہ جب منسوب کیا کسی شخص نے اس دوسرے شخص کو فعلِ اختیاری میں اور یا ایسے فعل میں جو شرعاً حرام ہو یا عار سمجھا جاتا ہو عرفِ عام میں تو وہ تعزیر دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ سوال مذکورہ میں جاروب کش مُسلّی کے دوسرے بکواسات کا تو علم نہ ہو سکا کیونکہ سائل نے تذکرہ نہیں کیا۔ البتّہ اس کا سیّد زادے کو یہ کہنا کہ تو حرامی ہے اپنے باپ کا نہیں۔ سخت سخت قابلِ تعزیر گالی ہے اس میں تعزیر کی تینوں شرطیں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ زنا کی تہمت ہے اور زنا فعلِ اختیاری ہے۔ یہ گالی شرعاً بھی حرام ہے اور یہ فعل یا حرامی ہونا شرم اور عار کی بات ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا تعزیر کی سزا والا جرم ہے۔ ہدایہ اوّلین کے حاشیہ نہایہ ع۹ صفحہ ۵۱۲ پر ہے۔ وَالْاَصْلُ فِيْهَا اَنَّ مَنْ قَذَفَ غَيْرَهٗ بِكَبِيْرَةٍ لَمْ يَجِبْ فِيْهَا حَدٌّ يَجِبُ فِيْهَا التَّعْزِيْرُ:۔ ترجمہ اور قاعدہ کلیہ اس بارے میں یہ ہے کہ بے شک جس نے اپنے غیر کو کسی ایسے بڑے گناہ کی تہمت لگائی جس سے حدِ قذف واجب نہیں ہوتی تو اس سے تعزیر واجب ہوگی۔ تعزیر کی یہ تین شرطیں تو عام مسلمانوں کو

گالی دینے سے ہیں لیکن فقہا علما اور سید حضرات کو گالی دینا اس سے بھی زیادہ نازک مقام ہے کہ اُن اکابرِ اسلام کو ایسی معمولی گالی دینا جو عام کو دینے سے تعزیر نہیں پڑتی۔ مگر یہاں اِس گالی سے بھی تعزیر واجب ہو جاتی ہے چنانچہ ہدایہ شریف اوّلین صفحہ نمبر ص۵۴۱ پر ہے:۔ وَلَوْ قَالَ یَا حِمَارُ اَوْ یَا خِنْزِیْرُ لَمْ یُعَزَّرْ (الخ) وَقِیْلَ اِنْ کَانَ الْمَسْبُوْبُ مِنَ الْاَشْرَافِ کَالْفُقَہَاءِ وَالْعَلَوِیَّۃِ وَالسَّادَاتِ یُعَزَّرُ :۔ ترجمہ! اور اگر کسی نے کسی کو کہا اے گدھے یا اے خنزیر تو تعزیر نہ ہوگی (کیونکہ یہ فعل اختیاری کی گالی نہیں ہے فعلِ خلقی کی گالی ہے) اور کہا گیا ہے کہ اگر گالی لینے والا افضل و اشرف لوگوں میں سے ہو جیسے کہ علماء کرام اور سیّد حضرات تو تعزیر واجب ہوگی۔ اس عبارت سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ سیّد کو معمولی گالی دینا بھی تعزیری جرم ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام میں افضل اور اشرف اور شرافت والا وہی آدمی ہے جو دینی لحاظ سے بڑا ہو۔ اسلام میں دنیوی بڑائی کی کوئی قدر نہیں۔ پس جاننا چاہئے کہ بادشاہ، وزیر، امیر ہونا دنیوی بڑائی ہے۔ اور سیّد ہونا عالم ہونا حافظ قاری امام ہونا ولی اللہ ہونا دینی بڑائی ہے۔ دونوں جہان میں اسی کی قدر و منزلت ہے۔ شرعی تعزیر کم از کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے ہیں۔ چنانچہ ہدایہ اوّلین صفحہ ص۵۴۱ پر ہے:۔ وَالتَّعْزِیْرُ اَکْثَرُہٗ تِسْعَۃٌ وَّثَلٰثُوْنَ سَوْطًا وَاَقَلُّہٗ ثَلَاثُ جَلَدَاتٍ :۔ ترجمہ:۔ اور تعزیر زیادہ سے زیادہ ۳۹ کوڑے ہیں اور کم از کم تین کوڑے ہیں۔ سوال مذکورہ میں جاروب کش عطا نے سیّد زادے کو گالی دے کر تعزیری جرم کیا ہے لہٰذا اگر حکومت کے ذریعے سزا دلوانی ہے تو دس کوڑے لگوائے جائیں کیونکہ کوڑے لگانا صرف حکومتِ وقت کا کام ہے۔ اور اگر حکومت یہ سزا نہ دے تو فتوائے تعزیری طور پر مجرم عطا پر واجب ہے کہ وہ سب کے سامنے اس سیّد زادے سے معافی مانگے۔ اور جس طرح بھی ہو اس کو راضی کرے خواہ پیسے دے کر یا کسی اور طرح۔ اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اور آئندہ کے لیئے سچی توبہ کرے۔ ورنہ کل قیامت میں اِس سے کہیں زیادہ سزا ہوگی۔ خیال رہے کہ حرامی سیّد نہیں ہو سکتا کیونکہ نسلِ انسانی باپ سے چلتی ہے زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ مسلم شریف جلدِ اول اور ترمذی شریف ص۱۳۸ ج۲ موطا امام مالک ص۱۸ نسائی ص۱۱۰ ج۲ ابو داؤد جلد اول ص۳۱۰ طحاوی شریف ص۶۷ ج۲ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا یُوْنُسُ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ وَہْبٍ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِکٌ عَنِ ابْنِ شِہَابِ الزُّہْرِیِّ عَنْ عُرْوَۃَ عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاہِرِ الْحَجَرُ ترجمہ اُمّ المومنین حضرت صدیقہ سے روایت ہے کہ فرمایا آقائے دو عالم صلّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے کہ بچہ خاوند کا ہوتا ہے۔ زانی کے لیئے محرومی ہے۔ یعنی زانی کا نسب نہیں مانا جائے گا۔ فتاوٰی شامی جلدِ دوم ص۱۷۸ پر ہے:۔ (قَوْلُہٗ لِاَنَّہٗ نِکَاحٌ بَاطِلٌ) اَیْ فَالْوَطْءُ فِیْہِ زِنًا لَا یَثْبُتُ بِہِ النَّسَبُ :۔ ترجمہ یعنی نکاح باطل میں وطی کرنا زنا ہے، اور زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔ اگر معاذ اللہ کوئی سیّد کسی عورت سے زنا کرے اور اس

سے بچہ پیدا ہو تو وہ لڑکا سید زادہ نہ ہوگا۔ اسی طرح جو سید مرتد ہو جائے وہ سید نہیں رہتا۔ لہٰذا تبرائی شیعہ یا مرزائی یا گستاخ وہابی جو ظاہراً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرے اس کو سید کہنا گناہ ہے کیونکہ اس کی سیادت ختم ہو چکی۔ اس لیے کہ دینی مدارج میں دین کا ہونا شرط ہے۔ جیسے کہ دنیوی مراتب کے لیئے ڈگریوں کا ہونا لازم ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتاب العقائد

اہل سنت کو بریلوی کہنے کا بیان

سوال نمبر ۲۲:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید صحیح العقیدہ سنی مسلمان ہے۔ یعنی جو مسائل دیوبندی، وہابی، شیعہ روافض اور اہل سنت والجماعت کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ ان میں زید اہل سنت کے عقیدے اور تائید پر ہے۔ دیوبندیوں، شیعوں کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو بریلوی کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ بکر کہتا ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو بریلوی نہ کہلائے میں اس کو سنی ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے نزدیک وہابی، دیوبندی ہے۔ اور ان ہی گمراہ فرقے کا ایک فرد ہے میں ڈٹ کر اس کی مخالفت کروں گا۔ یہاں فساد کا اندیشہ ہے۔ سب کی نگاہیں آپ کے فیصلے پر لگی ہیں لہٰذا آپ جلد از جلد مدلل جواب سے نوازیں۔ اور فرمائیں کہ کیا واقعی ہر سنی کے لیئے بریلوی کہلانا لازم ہے۔ کیا زید کی مثل لوگ اہل سنت ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو زید کے متعلق قرآن وحدیث سے فیصلہ صادر فرمایا جائے:۔

المستفتی:۔ محمد رفیق معرفت مکتبہ نعمانیہ اقبال روڈ۔ سیالکوٹ مورخہ:۔ ۱۱-۱۱-۱۹۷۰

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ فطرت کائنات میں سب سے بڑی دولت معرفت اور پہچان ہے۔ دنیا و آخرت میں انسان اس کا محتاج ہے۔ بے معرفت والا ہر جگہ ذلیل وخوار ہے۔ انسان کے لیئے دو ہی جہان ہیں۔ اور دونوں ہی میں شہرت و پہچان کے پیچھے بنی آدم دوڑ رہے ہیں۔ مگر بعض خوش نصیب لوگوں نے معرفتِ اُخروی کو سرمایۂ حیات بنایا

اور بعض لوگ دنیوی شہرت کے پجاری بن بیٹھے۔ دنیا یہی ہے مگر ارادے مختلف پرواز ایک ہی ہے۔ مگر جہان علیحدہ۔ راستہ وہی ہے۔ مگر منزل جدا گانہ۔ دماغ وہی ہے مگر خیالات بکھرے ہوئے۔ دل وہی ہے مگر پسند اپنی اپنی۔ شعر

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں ۔۔۔ کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

غرضکہ معرفت ہی ایک ایسی نعمت ہے۔ جس کی بدولت سارا نظام قائم ہے۔ دنیا کے تمام دھندے اسی شہرت و معرفت کی خاطر۔ انبیاءِ کرام کی تشریف آوری کا مقصد بھی سچی معرفت عطا فرمانا ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل و تائید کے لیے علماء اولیاء بنائے گئے۔ جب معرفت ہی خلق کائنات کا سبب اعظم ہے۔ تو ذہن نشین ہونا چاہیئے۔ کہ ہر معرفت اور پہچان کے لیے ایک نشان ہے۔ خواہ دینی پہچان ہو یا دنیوی۔ اور یہ دونوں معرفتیں رب کریم کو محبوب۔ بشرطیکہ دینی معرفت کو متبوع اور دنیوی کو تابع سمجھا جائے۔ اللہ کریم نے ہر معرفت و پہچان کے لیئے نشان مقرر فرمائے۔ مگر بعض دائمی بعض عارضی بعض جسم سے بعض روح سے معلّق بعض مضبوط بعض کمزور بعض آنکھوں کی نظر سے وابستہ اور بعض تکلّمِ لسانی سے۔ معرفت کیا چیز ہے؟ کسی کی ذات و صفات کو پہچاننا ہی معرفت ہے۔ پس بعض نشانات ذات کے معرف ہیں اور بعض صفات کے فطرتاً ہر نفر کی ذات ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر صفات متعدد پس نشانِ ذاتی ہر نفر کا ایک ہی ہوگا۔ لیکن نشانِ صفاتی بقدرِ صفات۔ شکل و صورت رنگ و ڈھنگ کا اختلاف وہ نشان ہے جو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر قبیلے اور گروہ کا متفرق ہونا۔ لسانی معارف ہیں۔ کیونکہ زبان سے بول کر معرفت ہوتی ہے۔ خود قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:۔ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (سورۃ حجرات آیت نمبر ۱۳)۔ ترجمہ:۔ اور ہم نے بنایا تم کو اے انسانو! گروہ اور قبیلے صرف اس لیئے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرو۔ جس طرح قبیلے محض جان پہچان کے لیئے ہیں۔ اسی طرح نام اور عَلَم بھی معرفت کا ایک نشان ہے۔ خواہ ذاتی نام ہو یا ذاتی کنیت ہو یا لقب یا خطاب نوعی ہو۔ یا جنسی صنفی ہو یا ملکی اور وطنی دینی ہو یا دنیوی۔ ذاتی نام کی طرح نوعی اور جنسی اور صنفی نشان بھی ہوتا ہے مگر صفاتی نام بقدرِ صفات۔ جس شخص کی جتنی صفات ہوں گی اتنے ہی زیادہ اس کے اسماءِ صفاتیہ ہوں گے۔ اسی لیئے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسی ہزار صفاتی نام مبارک ہیں۔ جو ہر جہان کی مخلوق کو عطا ہوئے۔ چونکہ کُل جہاں اسی ہزار ہیں۔ جیسا کہ فقہ شافعی سے حاشیہ بجوری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۴۳ پر لکھا ہے۔ ہر جہان کے لیئے ایک ہزار نام۔ مسلمانوں کے لیئے بھی ایک ہزار نام منتخب ہیں۔ جن میں ننانوے نام شریعت کے لیئے اور نو سو ایک نام پاک اہلِ اسرار کے لیئے۔ تمام مخلوق اِن ہی اسماء سے آقائے کائنات فخرِ موجودات کی ثنا خوانی کرتی ہے۔ جو اسماء ان کو مرحمت فرمائے

نبی کریم رؤف و رحیم کے اسماء صفاتیہ کی کثرت آپ کی کثرتِ صفات پر دال ہے۔ قانونی طور پر نشان کو چھوڑنا دنیا اور آخرت کی ذلت و خواری حاصل کرنا ہے۔ کہ بے نشان کسی مقام پر بھی قابلِ تکریم نہیں۔ مگر دینی نشان سے علیحدہ ہونا زیادہ برا۔ اس لیئے کہ دینی نشان دین والوں سے ملتا ہے اور دنیوی نشان دنیا والوں سے سپاہی، فوجی، وزیر، امیر کا لقب دنیا والوں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن غوث و قطب، مومن و متقی، مسلمان، قرآن و حدیث اور اولیائے کرام اور علماءِ عظام سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اور جس طرح کہ ہر انسان دنیوی خطاب و القابات سے پیار محبت کرتا ہے اور اپنے لیئے پسند کرتا ہے اسی طرح واجب ہے کہ اُن ناموں کا بھی احترام کیا جائے جو اللہ اور رسول اور اولیاء علماء کی طرف سے عطا ہوئے۔ بلکہ اپنے لیئے ان کو پسند کیا جائے۔ حکومت کے ناموں، خطابوں سے نفرت کرنے والا حکومت سے متنفّر شمار ہوتا ہے۔ ایسے ہی شریعت و طریقت کے صفاتی ناموں سے متنفّر اللہ اور رسول سے باغی و متنفّر مانا جائے گا۔ ہر ذی عقل کوشش کرتا ہے کہ میں اپنے اندر ایسے صفات پیدا کر دوں جس کی وجہ سے مجھ کو دنیوی خطابات و القابات سے نوازا جائے۔ تو ہر اہلِ دل پر لازم ہے کہ ایسے صفات پیدا کرے جس سے اس کو شریعت و طریقت کے القاب عطا ہوں۔ اسی کوشش کا نام ایمان ہے۔ اور کوشش کے بعد کسی الٰہی لقب کا میسر ہونا ہدایت ہے۔ علماء کے نزدیک ایمان نام ہے۔ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ کا مگر صوفیاء کے مشرب میں پوشیدہ کو ماننے اور احترام کرنے کا نام ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بھی پوشیدہ اور تمام صفات بھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ظاہر، صفات پوشیدہ۔ خیال رہے۔ کہ صفات ہر شخص کے ہمیشہ پوشیدہ ہی ہوتے ہیں۔ صفت کبھی خود بخود ظاہر نہیں ہوتی۔ جب اور جس وقت تک ظاہر کی جائے ظاہر رہتی ہے۔ صفات علومیہ کے بارے میں شیخ سعدی علیہ الرحمت گلستان باب اول پر فرماتے ہیں۔ شعر

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ترجمہ، جب تک کہ انسان اپنی صفت علمی کو بذریعہ گفتگو خود ظاہر نہ کرے اس کے عیب و ہنر چھپے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات پر ایمان لانا ہی ایمان ہے۔ صرف آپ کی ذات کو مان لینا ایمان نہیں ذات کو تو ابوجہل وغیرہ سب نے مانا۔ حضرت ابو طالب نے ذاتِ ابن عبد اللہ کی بہت خدمت کی۔ مگر شرعاً اُن کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ نہ ان کو شرعی مومن کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اہلِ تصوف نے اُن کو ساترین کے درجہ میں مانا ہے۔ مگر یہ اُخروی عند اللہ حکم ہے۔ ہاں البتہ تبرائی شیعہ حضرت ابو طالب کو مومن کہتے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی بعض تفضیلی شیعوں نے بھی یہ ہی کہنا شروع کر دیا۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ مگر خدمتِ ذاتِ پاک کے صلے میں اُن کا نام احترام سے لینا واجب ہے۔ بہر حال آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم

کی تمام صفات کو تسلیم کرنا اور اسی کوشش میں لگے رہنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا اظہار اور چرچا کرنا ایمان اور شکر الٰہی ہے۔ چنانچہ جامع صغیر جلال الدین سیوطی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۵۱ پر جامع عبدالرزاق کے حوالے سے صحیح مرسل حدیث منقول ہے:۔ عَنْ قَتَادَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ شُکْرِ النِّعْمَۃِ اِفْشَاءُھَا ط ترجمہ:۔ حضرت قتادہ تابعی رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے، وہ نبی کریم علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام سے راوی ہیں۔ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے کہ نعمت کا چرچا کرنا بھی اس کا شکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس کا چرچا کرکے بھی ایسا شکر حاصل کرنا ہی اصل ایمان ہے۔ اسی کوشش سے دنیا والوں کو اسماء صفاتیہ میسر ہو سکتے ہیں۔ مگر دیوبندیوں وہابی لوگوں کی بدنصیبی دیکھئے کہ ان ہی صفات کے منکر ہیں۔ حالانکہ انہی صفات کو مان کر انسان اپنے اندر طرح طرح کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ ایسے ہی خوش نصیبوں کو قرآن کریم حدیث شریف اور اولیاء عظام علماء کرام کی طرف سے بے شمار صفاتی نام عطا ہوئے۔ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کے ہم جیسے ثناخوانوں غلاموں کو قرآن کریم سے تین صفاتی نام عطا ہوئے پہلا نام مومن۔ چنانچہ قرآن پاک میں کل چالیس جگہ:۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے پیارے خطاب کرکے اور لفظ مومن کے نام سے نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں نام لیواؤں کو نوازا گیا۔ دوسرا نام متقی۔ چنانچہ سورۃ بقر کے پہلے رکوع میں ارشاد باری تعالٰی ہے:۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ (الم) ترجمہ:۔ وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔ تیسرا نام مسلمان چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا (سورۃ حج آیت) (ترجمہ) اس اللہ تعالٰی جل مجدہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ پہلی کتابوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی یہ تین اسماء طیبہ عمومی ہیں۔ جو ہر انسان تھوڑے سے عمل اور کچھ محنت سے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے عطا کردہ خصوصی نام کا یہاں ذکر کرنا بے محل ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی عمل یا محنت سے یا عبادت و ریاضت زہد و تقویٰ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ اسماء مقدسہ صرف انہی کے لیئے ہیں جن کو اللہ تعالٰی نے عطا فرمائے جیسے نبی، رسول، مرسل اور صدیق ثانی اثنین، رحمۃ للعالمین وغیرہ۔ اسی طرح حدیث پاک کے عطا کردہ خصوصی نام بجز موضوع لہ کے کسی کو نہیں مل سکتے جیسے لفظ صدیق و فاروق، اسد اللہ، سیف اللہ وغیرہ۔ اگرچہ کوئی مسلمان کتنا ہی عابد اور زاہد ہو۔ یہاں ایک نکتۂ عظیم ذہن نشین کرنا لازم ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے پیارے بندوں کے ذاتی نام اپنے بیٹے رکھنے جائز ہیں۔ بشرطیکہ ان کی صفات خصوصیہ کو شامل نہ کیا جائے۔ مثلاً لفظ موسیٰ عیسیٰ اور لفظ محمد، احمد اسی طرح صرف ابوبکر

اور لفظ عمر اور عثمان، علی نام رکھنے جائز ہیں۔ مگر لفظ موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ، محمد رسول اللہ، ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی المرتضیٰ۔ یا کرم اللہ وجہہ، وغیرہ الفاظ سے نام رکھنے منع ہیں۔ انبیاء کی صفات خصوصیہ سے نام رکھنا حرام ہے۔ صحابہ کی خصوصیات سے نام رکھنا مکروہ ہیں۔ کیونکہ یہ صفاتی نام اللہ رسول کی طرف سے عطا ہوئے۔ ہاں علی حیدر نام رکھنا جائز ہے۔ حیدر کا لقب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں عطا کیا۔ خود علی مرتضیٰ کا قول مشہور رہے :۔ اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّیْ حَیْدَرَہ (ترجمہ) میں وہ ہوں کہ میرا نام میری والدہ نے شیر ببر رکھا۔ اسی طرح بڑوں کا ذاتی نام بطورِ مبالغہ اپنی صفت کے لیئے استعمال کرنا جائز ہے۔ مگر اس میں چار شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس بڑے کا ذاتی نام اس کے کسی کارنامے کی بناپر یا اس کی انوکھی نرالی صفت میں مشہور ہو چکا ہو۔ جیسے لفظِ رستم۔ کہ یہ نام رستم کا ذاتی ہے مگر اس کی خصوصی بہادری کی بناپر مشہور رہوا۔ یا جیسے حاتم۔ شخصِ مخصوص کا ذاتی نام ہے۔ مگر سخاوت میں مشہور رہے ایسے ہی نوشیرواں ایک بادشاہ کا ذاتی نام ہے۔ مگر بقولِ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ عدل میں مشہور رہے۔ جیسا کہ گلستان فارسی باب اول صفحہ نمبر ص۱۳ پر ہے۔ مگر مجدد ملت بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے ملفوظات حصہ۴ مطبوعہ بریلی شریف صفحہ نمبر ص۲۱ پر نوشیرواں کو عادل کہنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح قیس مجنوں عشق میں۔ اور جس طرح کہ لفظِ عمر عدل و انصاف میں مشہور ہو گیا۔ حالانکہ یہ فاروق اعظم کا ذاتی نام ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ان ناموں کو کسی کے لیئے استعمال کرتے وقت کسی علاقے یا وقت یا درجے سے نسبت دینا لازم ہے۔ جیسے کہ رستم ہند، حاتم زماں۔ تیسری شرط یہ ہے۔ کہ جس شخص کے لیئے یہ نام استعمال کیا جائے گا۔ اس میں وہ صفت بہت شاندار طریقے سے اُس وقت میں سب سے زیادہ موجود ہو۔ ورنہ بغیر صفت یا کم صفت والے کے لیئے وہ مبالغے کا نام استعمال کیا جانا بیوقوفی یا گستاخی ہوگی۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ خود موصوف اپنے لیے بطور صفت لقباً یا خطاباً استعمال نہ کرے۔ بلکہ قوم یا حکومت یا دینی یا دنیوی بڑا انسان اس کو لقب عطا کرے ورنہ متکبرین میں شمار ہوگا۔ اگرچہ حاملِ صفت ہو۔ اس لقب اور خطاب کے لائق ہو۔ ان چار شرائط کے ہوتے ہوئے کسی بھی بزرگ کا مبالغہ فی الصفت میں مشہور نام اپنے لیے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا شرعاً جائز ہے۔ کسی کا صفاتی نام رستم پاکستان، حاتم ہند وغیرہ لکھنا، اسی طرح نوشیروانِ ثانی، عمرِ ثانی کہا جا سکتا ہے۔ اسی لیئے مورخین نے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کو عمرِ ثانی کا لقب دیا۔ اسی مبالغے کی بنا پر نعت گوئی میں حضرت حسان کا ذاتی نام لفظِ حسّان مشہور ہو گیا۔ لہٰذا کسی بھی سچے نعت گو کو جو متقی اور عاشقِ رسول بھی ہو حسّانِ زماں یا حسّانِ وقت یا حسّانِ پاکستان کہنا جائز ہے۔ اور اس کہنے میں بے ادبی نہیں بوجہ صفاتی یادگار ادب و احترام ہے۔ آج ہم کسی مناسب شخص کو عمرِ ثانی کا لقب دیں تو یہ اقوامِ عالم کے سامنے فاروق اعظم کی عدالت کی یادگار قائم کرنا ہے۔ اسی طرح کسی

خوش عقیدہ اچھی عادت نعت گو شاعر کو حسانِ پاکستان کہنا صحابیِ رسول اللہ حضرتِ حسان کی یادگار قائم کرنا ہے اور فی زمانہ بہت اچھا ہے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے بڑوں کے کارنامے اقوالِ زریں معلوم ہوتے رہیں۔ ہمارے اصاغر اور طلباء کو معلوم ہو کہ اہلِ شریعت و طریقت نے نسلِ انسانی کی بہبود کے لیئے کس طرح جانفشانیاں کیں اور دینِ اسلام کی کتنی خدمتیں کیں۔ کتنی بدنصیبی اور محرومیت ہے کہ ہمارے نوجوانوں طالب علموں نئی نسل کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ تواتر اجار رہا ہے کہ گوئٹے شاعر نے یہ کہا شکسپیئر نے یہ فرمایا۔ لینن اتنا عظیم انسان تھا۔ مارکس ایسی اچھی باتیں کرتا تھا۔ مگر ہمارے جوانوں کے کان اُن دل گداز آوازوں سے نا آشنا ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدسہ سے نکلیں ہمارے دل اُن انوار سے بے بہرہ ہیں۔ جو صحرائے عرب میں صدیق اور فاروق کے سکھائے ہوئے اقوال و اسباق سے نچھاور ہوئے۔ نئی نسل کے دماغ اُن تفکرات سے بہت دور ہیں جو غزالی اور رومی کے درس گاہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ آج ہمارے ملک پاکستان کے بڑے بڑے رسالے اور کئی ڈائجسٹ جو خدمتِ انسانیت اور اردو ادب کے علمبردار بنے ہوتے ہیں اپنے رسالوں میں اقوالِ زریں اور اچھی باتیں اور معلوماتِ عالم کے مختلف عنوانات سے گوئٹے، شیکسپیئر مارکس حالی وڈ کی طرف جھوٹی خود ساختہ باتیں منسوب کر کے اس متعصب کفر کی تشہیر کرنے کے مترادف۔ اب کون بتائے ان بیوقوف مضمون نگاروں نگرانوں اور مدیروں کو کہ تمہارے یہ کام قومی خدمت نہیں۔ بلکہ مسلم قوم کی دینی، ایمانی، اخلاقی، روحانی تباہی ہے۔ یہ رسائل و ڈائجسٹ اپنی کم سمجھی کی بنا پر نسل مسلم کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ آئندہ نسلوں اور موجودہ نوجوان طبقے کے دل و دماغ میں صرف گوئٹے وغیرہ ہی سمائے رہیں۔ ان کی سوچ و فکر ہمیں تک ہو۔ کہ کائنات میں صرف کفر نے ہی نامور جنم دیئے ہیں، عالمِ اسلام میں کوئی ایسا نامور سپوت پیدا ہی نہ ہوا جو ایسی اچھی نصیحتیں اور سبق سکھائے۔ یہی ارادے قوم کی تباہی کا باعث ہیں۔ کہ قرآن و حدیث کے اقوالِ زریں سے یک دم غافل کر کے لینن مارکس کا غبار سینۂ مسلم میں بھر دیا جائے۔ حالانکہ گوئٹے اور شیکسپیئر کے پاس کیا ہے اُن حمقاء کے پاس جو تھوڑی بہت عقل و خرد میسر آئی۔ وہ ہماری ہی اسلامی کتب کے مطالعہ سے آئی۔ انگریز فلاسفر نے جو اچھے کام کیئے وہ ہماری ہی لائبریریوں سے چوری کردہ کتب کے مطالعہ سے کیئے۔ اُن کے تہذیب و اخلاق ہمارے ہی اکابر کے تفکرات و ملفوظات و مکتوبات سے حاصل ہوئے۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ جو کچھ کسی نے علم و خرد و اخلاق و تہذیب سیکھا سب احادیثِ رسول اللہ و فرمانِ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا۔ دولت مند انگریزوں نے ہماری ہی کتب کا ترجمہ کر کے اپنے ناموں سے چھاپا۔ برِ صغیر پر تسلط سارِ حکومت کے دوران کیا کچھ نہ ہوا۔ کلکتہ بمبئی اور دہلی کی شاہی لائبریری کی عربی فارسی کتب کیوں برطانیہ بھیجی گئیں۔ دیکھو تاریخِ ہند جلد دوم ۱۸۶۰ء کا آنکھوں دیکھا واقعہ صفحہ نمبر ص۲۰۱، ۱۸۴۰ء میں غرناطہ کا کتب

خانہ انگریزوں نے کیوں توڑا۔ جن کو اس وقت فرنگی کا لقب دیا گیا تھا۔ عربی کتب اسلامیہ سے ایک غیر عربی غیر مسلم قوم کو کیا واسطہ تھا۔ مقصد وہی تھا۔ جو آج اس تباہ کن ناسور کی صورت ظاہر ہو رہا ہے۔ انہوں نے سب کچھ ہم سے چرایا۔ ہمارے ہی بزرگوں کے پرنور اقوال ہیں۔ جو ڈائجسٹوں اور رسالوں کی زینت بنتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مضمون نگار نے بجائے مسلم و بخاری کے کسی غیر ملکی مصنّف کے بیس والی کتب کے مطالعہ سے چوری کردہ عبارت کو اپنے مضمون میں ڈھال کر مہر چین و جاپان کی لگادی۔ قول حدیث پاک کا ہوتا ہے نیچے نام شیکسپیئر یا گوئٹے کا۔ ہم سے تو ان میٹھے دشمنوں نے یہ سیکھا۔ مگر ہم نے ان کے اسکولوں کالجوں سے کیا سیکھا۔ یہی چوری، فریب کاری، دغابازی، جھوٹ بلکہ بڑے دل فریب طریقے سے یہ بد خصلتیں ہم کو سکھائی گئیں۔ کہ جرم کا راستہ بتا دیا۔ اور قانونی گرفت کو بالکل نرم کر دیا۔ تنخواہیں ضروریات سے کم کر دیں۔ رشوت پر سخت گیری نہ کی۔ راشن خوراک کم دیا۔ فریب کاری کا راستہ چھوڑ دیا۔ قوموں میں اسی طرح اخلاقی پستی آتی ہے۔ بلکہ کون سے موقعہ پر یہ انگریز اسلام دشمنی سے چوکے۔ اسلام کے ہر چھوٹے بڑے قانون کے مقابل اپنا بے ہودہ طریقہ ایجاد کیا۔ اور جبراً مسلمانوں کو سکھانے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ سخت تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو۔ الٹے ہاتھ سے کھانا۔ بجائے چمچ کے چھری کانٹا پکڑنا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنا۔ پیر لٹکا کر کرسی پر بیٹھ کر ہگنا۔ کاغذ سے استنجا کرنا۔ اسی گندے جسم کے ساتھ ایک بڑے برتن میں بیٹھ کر نہانا۔ وہی پلید پانی چہرے اور منہ پر ڈالنا وغیرہ۔ کتنے تکلیف دہ اور گھنونے طریقے ہیں۔ مگر صرف مسلمانوں کو معاشرے میں تباہ کرنے کی خاطر سب کچھ برداشت کیا۔ اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں بڑے ٹھنڈے طریقے سے گھول دیا۔ اب وہ ہی مسلمان ہے۔ کہ اسلام کے صاف پاک اصولوں سے بھاگا پھر رہا ہے۔ ان رسائل و اخبارات وغیرہ کو چاہیئے یہ تھا۔ کہ اپنے مضامین میں بجز فرمودات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ و اولیاء علماء کے کسی غیر کا قول نقل نہ کرتے کہ یہی قومی اور مذہبی روح پھونکنے کا طریقہ ہے۔ یہی سچی تبلیغ دین ہے اسی طریقے سے نسلوں کی قسمتیں سدھرتی ہیں۔ شاید مضمون نگار حضرات اس طرح سے اپنی خود ساختہ اخلاقی تہذیب اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور دنیا والوں کو یہ بتانا چاہتے ہوں۔ کہ ہم تنگ نظر نہیں۔ تو یاد رکھو کہ یہ فراخ دلی نہیں بلکہ بیوقوفی و حماقت ہے۔ بھیڑیئے کو بکریوں میں، آگ کو بھوسے میں جگہ دینی کہاں کی اعلیٰ ظرفی اور اخلاقی تہذیب ہے۔ اور میں اس سوال کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ کیا اس قسم کی قوم کو تباہ کرنے والی ساری اخلاقی تہذیبیں صرف آپ لوگوں کے حصے میں آئیں۔ کبھی کسی ہندو، سکھ، مجوسی، پارسی، عیسائی، یہودی وغیرہ نے اپنے رسالوں میں ہمارے بزرگوں کے فرمودات کو جگہ دی؟ بلکہ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی اتنی عیاں ہے۔ کہ انگریز چیف جسٹس نے پنڈت راجپال لاہوری جیسے نبی پاک کے گستاخ کے خلاف بھی قلم کو جنبش نہ دی۔

جس کی گستاخی سے تمام برصغیر کے مسلمانوں کے دل زخمی ہوئے۔ یہ قوم کی تباہی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ وہ مسلمان نسل جن کا مقصدِ حیات ہی اللہ والا بننا ہے۔ خود اللہ والوں اور ان کی نسبت سے متنفر ہوتی چلی جا رہی ہے کسی کو حنفیت سے دکھ ہے۔ تو کوئی قادریت سے بیزار کسی کے دل میں مالکیت سے غبار ہے۔ تو کوئی نقش بندیت سے متنفر۔ کسی نے شافعیت کے خلاف محاذ آرائی کی ہے۔ کو کسی کے سینے میں چشتیت کا کانٹا۔ کوئی احمد بن حنبل سے مخالف نظر آرہا ہے۔ تو کوئی سہروردیوں سے برسرِ پیکار، نہ کسی کا ادب نہ احترام، علماء کی گستاخی سے پاک نہیں۔ تو اولیاء اللہ کی طعن سے شرم نہیں۔ علیحدہ راہیں جدا منزلیں یہ سب اسی غلط تربیت کا نتیجہ ہے۔ اور انہیں اختراعی مضامین کا شاخسانہ ہے۔ مگر ابھی بھی مایوسی نہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ کہ اس دھارے کا رخ موڑا جائے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم اپنی نئی نسل کو یہود و مجوس سے روشناس کرائیں۔ اور ان سے نسبت و تعلق پیدا کرنے کا شوق پیدا کریں۔ ہم پر فرض ہے کہ اپنے اکابر کے بھولے ہوئے سبق اپنی قوم کو یاد کرائیں۔ اور اس کے بجائے کہ ہم موجودہ نامور مسلمانوں کو مارکسِ زماں، ٹارزنِ وقت، شیکسپئرِ قوم جیسے القاب دیں۔ اپنے نامور بزرگوں سے نسبت پیدا کریں۔ پس جائز ہے غزالیٔ زماں، حسانِ پاکستان، شیرازیٔ پنجاب جیسے مبارک الفاظ سے خطاب دینا۔ ہاں بزرگوں کی خصوصی صفت سے لقب دینا ناجائز ہے۔ اس لئے کہ ذاتی نام تو صفت کا مبالغہ بن سکتا ہے۔ جیسے زیدٌ عدلٌ مگر صفاتی نام مبالغے کا صیغہ نہیں بنتا۔ لہٰذا حسانِ پاکستان کہنا جائز صدیقِ پاکستان کہنا گناہ۔ اسی طرح عمرِ ثانی کہنا جائز ہے۔ فاروقِ ثانی کہنا منع ہے۔ صدیقِ ثانی کہنا بھی منع۔ یہ جائز و ناجائز اسلئے ہے کہ لفظ حسان ذاتی نام ہے اور صدیق صفاتی نام۔ یہ فرق ضرور خیال رکھا جائے۔ ابوبکر پاکستان یا علی زماں لقب دینا اس لئے منع ہے کہ یہ نام اگرچہ ذاتی ہیں مگر کسی صفت کا مبالغہ نہ بنے۔ مسلمانوں کو ایک صفاتی نام حدیث پاک سے عطا ہوا اہل سنت والجماعت۔ چنانچہ مقدمہ ابنِ ماجہ بابِ اتباعِ سنتِ خلفاءِ راشدین صفحہ نمبر ۵ پر ہے:۔

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ اَحْمَدَ بْنِ اَحْمَدَ بْنِ بَشِيْرِ بْنِ ذَكْوَانِ دِمَشْقِيُّ (الخ) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (الخ) سَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِيْ اِخْتِلَافًا شَدِيْدًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ (ترجمہ) عنقریب میرے بعد بہت اختلاف دیکھو گے۔ لہٰذا لازم پکڑ لو میری اور خلفاء راشدین کی سنتوں کو۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو عامل بِالسُّنَّۃ یعنی اہلِ سنت ہونا لازم ہے۔ اور یہ نام نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ اور مقدمہ دارمی کے ۵۷ بابوں میں سے باب ۱۵ میں ہے:۔ تَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُمْ ترجمہ اے مسلمانوں اگر تم اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دو۔ تو

تم سب گمراہ ہو جاؤ۔ تاریخ ابن خلدون جلد دوم صفحہ نمبر ۱۱۲ مطبوعہ نفیس اکیڈیمی کراچی نمبر ۱ میں امام عالی مقام کے میدان کربلا والے آخری الفاظ اس طرح ہیں۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَوَلَمْ یَبْلُغْکُمْ قَوْلٌ مُسْتَفِیْضٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ قَالَ لِیْ وَلِاَخِیْ اَنْتُمَا سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَقُرَّۃُ عُیُوْنِ اَھْلِ السُّنَّۃِ ؏ (ترجمہ) اے یزید کے لوگو! کیا تم کو وہ قول یاد نہیں جو آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفیض ہے۔ وہ قول آپ نے میرے اور میرے بڑے بھائی حضرت حسن کے لیئے فرمایا۔ کہ تم دونوں جنتی جوانوں کے سردار ہو۔ اور اہل سنت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اس حدیث سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کا ایک نام اہلِ سنّت بھی ہے۔ شیعہ کتاب احتجاج طبرسی جلد اول صفحہ نمبر ۱۴۶ پر ہے کہ حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ نے دورانِ خطبہ ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اَمَّا اَھْلُ الْجَمَاعَۃِ فَاَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَاِنْ قَلُّوْا وَذَالِکَ الْحَقُّ عَنْ اَمْرِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَعَنْ اَمْرِ رَسُوْلِہٖ۔ الخ :۔ وَاَمَّا اَھْلُ السُّنَّۃِ فَالْمُتَمَسِّکُوْنَ بِمَا سَنَّۃِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ قَلُّوْا الخ (ترجمہ) حضرت علی نے فرمایا لیکن اہل جماعت تو وہ میں اور میرے متّبع ہیں اگرچہ کم تعداد ہوں۔ اور یہی اہلِ جماعت ہونا حق ہے۔ اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق اور لیکن اہل سنت تو وہ اللہ اور رسول کی سنت پر مضبوطی سے عمل کرنے والے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ صحابہ کرام اپنے آپ کو مومن اور مسلمان سمجھنے کے علاوہ اہلِ سنّت کہا کرتے تھے۔ لفظِ وَالجماعت کا ثبوت حضرت کے اس فرمانِ پاک کے علاوہ اور بھی متعدّد احادیث میں موجود ہے۔ چنانچہ کنوز الحقائق جلد دوم صفحہ نمبر ۱۹۷ اور جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۲۰۵ پر اور ترمذی شریف جلد دوم صفحہ ۳۹ پر ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَۃٍ وَیَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ ط (ترجمہ) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ السّلام نے فرمایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ میری اُمّت کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے گا۔ اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ ترمذی شریف کے اسی صفحہ نمبر ۳۹ پر ایک حدیث اس طرح ہے:۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ خَطَبَنَا عُمَرُ بِالْجَابِیَۃِ فَقَالَ یَا اَیُّھَا النَّاسُ (الخ) عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ الخ؏ ترجمہ حضرت ابن عمر سے روایت ہے۔ فرمایا۔ کہ خطبہ دیا ہم کو حضرت فاروق اعظم نے۔ فرمایا۔ اے لوگو! ہمیشہ جماعت کے ساتھ لگے رہنا۔ اور چھوٹے فرقوں سے خود کو بچانا۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن اور حدیث سے ہم کو چار نام عطا ہوئے ۱ مومن ۲ مسلمان ۳ متقی ۴ اہلِ سنت والجماعت۔ مومن اور مسلمان کے درمیان بعض کے نزدیک نسبت عام خاص

مطلق ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ غلط ہے۔ ہر مسلمان مومن ہے اور ہر مومن مسلمان۔ اسی طرح مومن اور اہلِ سنت میں بھی نسبتِ تساوی ہے کہ ہر مومن اہل سنت ہے۔ جو اہل سنت نہ ہو وہ مسلمان اور مومن بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ موجبہ کلیہ کا عکس نقیض موجبہ کلیہ ہی ہوتا ہے ہر غیر سنی غیر مسلم ہی ہوگا۔ شریعت کی طرف سے ہم کو چار نام صفاتی عطا ہوئے۔ مالکی، شافعی، حنفی، حنبلی اور طریقت نے بھی ہم کو چار نام عطا فرمائے۔ قادری، چشتی، نقشبندی، اور سہروردی۔ مگر فرق یہ ہے کہ قرآن کریم کے اور حدیث پاک کے عطا کردہ صفاتی نام کسی مقسم کی قسمیں نہیں۔ اس لیئے وہ نام بیک وقت ہر مسلمان کے ہوں گے۔ کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں مومن متقی بھی ہوگا۔ اور مسلمان اہل سنت بھی۔ جب ان چار ناموں کی صفت اپنے اندر پیدا کرے گا تب انسانِ کامل کہلانے کا حقدار ہوگا۔ مگر شریعت و طریقت کے عطا کردہ نام اپنے اپنے مقسم کی قسمیں ہیں پہلی چار اقسام کا مقسم شریعت ہے۔ دوسری کا طریقت اور یہ چاروں نام آپس میں قسیم ہیں۔ اِس لیئے بیک وقت ایک شخص کو اِن چار میں سے ایک ہی نام مل سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی آدمی حنفی بھی ہو اور شافعی بھی۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی شخص قادری بھی ہو اور نقش بندی بھی۔ یہ جو بعض لوگ خود کو قادری، چشتی لکھتے ہیں۔ اس کی نوعیت اور ہے جو نام پہلے لکھا جائے گا۔ اصل وہی ہوگا۔ ہاں البتہ شریعت کے چاروں نام طریقت کے ناموں سے متحد ہو سکتے ہیں مثلاً ایک آدمی حنفی بھی ہو قادری بھی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ منزلِ دین و ایمان ایک ہے۔ قرآن و حدیث اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ مگر اس منزل کے راستے مختلف پہلے شریعت کے۔ پھر انہیں چاروں میں سے ہر ایک کے طریقت کے چار راستے۔ باعتبار منزل کے ہر شخص کو چاروں نام عطا ہوئے۔ اور باعتبار راہِ مقصود کے ہر ایک کو ایک نام۔ اسی طرح یہ سب اہل سنت ہی ہیں۔ حنفی ہوں یا قادری، مالکی ہوں یا چشتی، نقشبندی۔ ان سب کی اصل اہلِ سنت ہونا ہے۔ جب تک اہل سنت نہ ہوں۔ شافعی، مالکی، قادری، چشتی نہیں بن سکتے۔ پس لازم ہوا کہ اہلِ سنت ہونے کے لیئے قادری، چشتی ہونا ضروری نہیں۔ جیسے کہ پہلے قرونِ اولیٰ و ثانیہ میں۔ کہ تمام صحابہ و تابعی اہلِ سنت تو تھے۔ مگر کوئی بھی حنفی، مالکی یا چشتی، نقش بندی نہ تھا۔ کیونکہ وہ منزل کے قریب تھے۔ راستہ ہمیشہ دور والے کو درکار ہوتا ہے۔ بہر حال مسلمان اور مومن متقی ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ سنت ہونا ہر شخص کے لیئے لازم و ضروری ہے۔ گویا کہ اہلِ سنت کا نام ہر حنفی، شافعی، نقشبندی، سہروردی کے لیے دلالت مطابقی ہے یہ آٹھ اسماءِ صفاتیہ بھی ہر شخص کے لیئے عطا ہوئے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب بادشاہ ہو یا رعایا عالم ہو یا ولی اللہ، پیر ہو یا مرید۔ بشرطیکہ پہلے اہل سنت ہو۔ ہر راہ روِ منزل کے لیئے ان ناموں کو اختیار کرنا اشد لازم ہے۔ جو اِن اسماءِ طیبہ سے علیحدہ یا متنفر ہوگا۔ وہ ہی بے دین اور گمراہ ہے۔ قانونِ فطرت

ہے کہ ہر بڑے اور خطرناک راستے پر راہ گیروں کو بے جانے کے لیئے قائد و پیش رو اور مرشد متعین ہوتے ہیں۔ تو عالمِ کائنات میں دین کے راستے سے زیادہ مشکل کون سا راستہ ہوگا۔ لہٰذا شریعت و طریقت نے چند نام ایسے بھی عطا فرمائے جو صرف ان لوگوں کو عطا ہوئے جو قائدِ راہِ شریعت اور مرشدِ بحرِ طریقت بننے کا شرف حاصل کریں۔ چنانچہ شریعت پاک نے محدث، مفسر، شارح، محشی، امام، عالم اور محقق جیسے پاکیزہ نام عطا فرمائے۔ اور طریقت نے غوث، قطب، ابدال، اوتاد، افراد اسماءِ نورانیہ سے نوازا۔ یہ تمام نام تو کچھ نہ کچھ خصوصی اہتمام رکھتے ہیں۔ لیکن اہلِ سنت ہونا ان سب کے لیئے ضروری جو اہل سنت نہ ہو۔ وہ نہ غوث ہو سکتا ہے نہ محدث و مفسر کہلانے کا حقدار یہ سب اسماءِ طیبہ مسلمانوں کو بطورِ نشان عطا فرمائے۔ تاکہ کائناتِ عالم میں امتِ مصطفوی عجب آن بان سے درخشاں ہو۔ نشانات کی اسی وقت ضرورت ہوتی ہے جب کسی طرف سے امتیازاتِ صدق و کذب ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ اس سعیِ باطلہ کو ختم کرنے کے لیئے اگرچہ لفظِ اہلِ سنت کا صفاتی نام بطورِ نشانِ مسلم کافی تھا۔ مگر دنیا میں روزِ اول کا شروع سے یہ طریقہ رہا کہ پھول کے ساتھ کانٹے ہوئے ہر شمع کے ساتھ دھواں چلتا رہا۔ ہر کھرے کے مقابل کھوٹ ظاہر کیا گیا۔ ہر سچے کے لباس میں جھوٹے نمودار ہوئے۔ اہلِ سنت ہونا دربارِ الٰہیہ کا عظیم الشان انعام ہے۔ جس سے مسلمانوں کی دینی و دنیوی عزتیں وابستہ ہیں۔ اسی چیز کو دیکھتے ہوئے جھوٹی عزت کے متلاشیوں نے دامِ تزویر کی ٹھانی۔ اور دشمن اہل سنت نے اہل سنت کے بڑھتے ہوئے وقار و احترام کو دیکھتے ہوئے سنیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے غلط عقیدوں کا باطل طبل بجانا شروع کیا۔ اور خود کو اہل سنت کے بھیس سے مشہور کرتے ہوئے شربتِ عشقِ مصطفیٰ کے پیاسوں کو زہرِ ہلاہل سے مردۂ ایمانی بنانا شروع کیا۔ مرورِ زمانہ کے اعتبار سے مختلف اَدوار میں چمنِ اہلسنت پر اس قسم کی بے شمار خزاں کی ہوائیں چلیں۔ مگر ہر موقعہ پر باغِ اہل سنت کے مالی، علماء و صوفیائے غنچۂ سنیت کو خزاں کے تھپیڑوں سے بچایا۔ اور ایسے ایسے نشان مقرر فرمائے جن سے سچے اور جھوٹے سنی اور کھوٹے کھرے مسلمان کا پتہ لگ جائے۔ یہ سب نشان بزرگوں کی نسبتیں ہی تھے۔ اُس زمانے میں صحابہ کرام نے اہل سنت کی دس نشانیاں مقرر فرمائیں۔ چنانچہ تفسیراتِ احمدی صفحہ ٢٣ پر ہے۔ وفی روایۃ عن ابن عباس انہ من کان فیہ عشر خصال تفضیل الشیخین وتوقیر الختنین وتعظیم القبلتین والصلوۃ علی الجنازتین والصلوۃ خلف الامامین وترک الخروج علی الامامین والمسح علی الخفین والقول بالتقدیرین والامساک عن الشاہدتین واداء الفریضتین یعنی تفضیل ابوبکر و عمر و توقیر عثمان و علی ترجمہ:۔ ابو بکر صدیق اور فاروق اعظم کی فضیلت سارے صحابہ پر حضرت عثمان و علی مرتضیٰ کی عزت کرنا بیت المقدس و کعبہ کی تعظیم کرنا۔ نیک و بد کا جنازہ پڑھنا نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھنا جس کی بدی ظاہر نہ ہو۔ عادل یا جابر حاکم کی دنیوی امور میں اطاعت کرنا بغاوت نہ کرنا چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا۔ سفر و حضر میں خیر و شر کی تقدیر من اللہ ماننا۔ جنت و دوزخ کی گواہی دینا ہر شخص

کے لیے نماز و زکوٰۃ دونوں کو فرض جاننا۔ پھر جہمیہ مرجیہ پھر ان سات فرقوں کی شاخیں تہتر ہوئیں (تفسیرات احمدی) اس طرح ایک زمانہ وہ تھا جب اہل سنت والجماعت کے مقابل روافض کے علاوہ معتزلی، خارجی، جبریہ، قدریہ فرقِ باطلہ نے جنم لیا۔ اُس وقت خارجیوں نے اپنے آپ کو جھوٹا سنّی بنا کر لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔ اور مسلمانوں کو طرح طرح کے حیلے بہانوں کافر کہنا شروع کیا۔ اُدھر معتزلی فرقے نے نئے رخنے ڈالنے شروع کیے انہوں نے اپنا نام اصحابِ عدل وتوحید رکھا۔ اپنے آپ کو موحّد کہنے کا رواج سب سے پہلے اسی باطل فرقہ معتزلہ نے ڈالا۔ جب اُن کا ظلم کسی طرح رکنے میں نہیں آتا تھا۔ تب پروردگارِ عالم نے اہل سنت کی امداد کے لیئے یمن کے قبیلے بنی اشعر کے صحابیِٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اولاد سے ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعری کو علم وعرفان کی نعمت ہائے رنگا رنگ سے مالامال کرکے بھیجا۔ آپ نے خوارج ومعتزلہ کے فریب کاری کے پردے کو چاک کیا اور بتایا۔ کہ یہ اہل سنت نہیں بلکہ دجل وفریب کے پروردہ۔ صرف لبادۂ سنیت اوڑھ کر آئے ہیں۔ اُن کی روسیاہیاں توابلیس پردہ ہیں۔ آپ نے ہی اُن کے جال سے پھنسے ہوئے اہل سنت مسلمانوں کو نکالا۔ اور اسلام واہل سنت کے صحیح عقائد سمجھائے۔ اس دور میں آپ کا نام ہی رئیس المتکلمین اور امامِ اہلِ سنت تھا۔ ان کی تعلیم سے سچے مسلمان پیدا ہوئے۔ جھوٹے سنّیوں سے لوگ خبردار ہوئے۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں اہل سنت کا نشان اور امتیازی نام اہل سنت اشعری تھا۔ چنانچہ نبراس صفحہ نمبر ص۳ پر ہے:۔

وَاَبُو الْحَسَنِ هُوَ رَئِیْسُ اَکْثَرِ الْمُتَکَلِّمِیْنَ مِنْ اَهْلِ السُّنَّةِ وَهُمْ یُسَمَّوْنَ الْاَشَاعِرَةَ لِذَالِکَ ط (ترجمہ) ابوالحسن رئیس المتکلمین ہے۔ اور اہل سنت کے رئیس ہیں۔ تمام سنیوں کا نام اُس وقت اہلِ سنت اشعری انہی کی نسبت سے تھا اس زمانے میں یہی اہل سنت کا نشان تھا۔ اور دنیا میں وہی سنی سمجھا جاتا تھا جو اپنے آپ کو اشعری کہتا تھا۔ اور جو اشعری نہ کہتا اور اہل سنت ہونے کا دعویٰ بھی کرتا۔ اس کو معاشرے میں جھوٹا کذّاب اور خارجی گنا جاتا تھا۔ پھر ایک زمانہ آیا۔ کہ دوسرے باطل لوگوں نے اہلِ سنت کا بہروپ بھر کر غلط اور بے ہودہ عقیدوں سے فریب کارانہ طریقہ پر بھولے اور ناواقف اہل سنت مسلمانوں کو ورغلانا شروع کیا۔ تو امامِ وقت شیخ ابومنصور ماتریدی سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ سنت کو ایک اسٹیج پر جمع فرمایا۔ اور جھوٹے بناوٹی سنیوں کو قعرِ ذلت میں غوطہ زن کیا۔ اُن کی تربیت سے اہلِ سنت نکھر کر تاریخ کے پردے پر اُجاگر ہوئے۔ اس وقت جھوٹے، سچے سنی کی شناخت آپ کی نسبت تھی۔ اور اس وقت صحیح اہل سنت مسلمانوں کو سنّی ماتریدی کہا جاتا تھا۔ جو اہلِ سنت خود کو ماتریدی کہتا اس کو سچا اہل سنت والجماعت سمجھا جاتا۔ جو اس نسبت سے نفرت کرتا، یا شرم کرتا۔ وہ قوم کی نظروں میں

ذلیل وخوار اور فریب کار جھوٹا سنی شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ نبراس علی شرح العقائد صفحہ نمبر ۳۲ پر ہے:۔
وَمُقْتَدَاهُمْ فِي الْكَلَامِ هُوَالْإِمَامُ عَلَى الْهُدٰى أَبُوْمَنْصُوْرِ الْمَاتُرِيْدِيُّ وَمَاتُرِيْدُ قَرْيَةٌ بِسَمَرْقَنْد وَهُمْ يُسَمُّوْنَ الْمَاتُرِيْدِيَّ :۔ (ترجمہ):۔ اور اہل سنت کے مقتدا علمِ کلام میں وہ امام علی الھدیٰ یعنی برحق امام ابو منصور ماتریدی ہیں۔ اور ماترید علاقہ سمرقند کا ایک گاؤں ہے۔ اور تمام اہلسنت وجماعت مسلمانوں کا نام ماتریدی۔ انہی امام اہل سنت کی نسبت سے رکھا جاتا ہے۔ ثابت ہوا کہ تغیر زمانہ کے لحاظ سے ان چودہ صدیہ دورِ اسلامی میں جتنی جتنی ملاوٹیں اور کھوٹ لفظِ اہل سنت سے ناجائز فائدے اٹھاتی رہیں۔ مفکرانِ نمگسار اور علماءِ دل فگار نے اتنے ہی بند ھ باندھ کر اپنی قومِ مسلم کو بچایا۔ اور ہر زمانے میں جماعتِ اہل سنت کو بطورِ نشان و امتیاز کسی نہ کسی مقتدائے اسلام سے نسبت دی جاتی رہی۔ کبھی اس کے علاقائی نام سے۔ کبھی اس کے شہر سے۔ یہ محض اس لیئے تھا۔ کہ فریب کاروں کا فریب نہ چل سکے۔ آج وہ باطل فرقے اور جھوٹے سنی فریب کار خود ساختہ بناوٹی لوگ مٹ چکے۔ ان کے نام ونشان بھی مٹ گئے۔ کیونکہ باطل مٹنے ہی کے لیئے ہے۔ مگر اہلِ سنت کا سچا نشان اب بھی نیّرِ تاباں بن کر چمک رہا ہے۔ اور ابدالآباد تک چمکتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ برطانوی انگریز کی چالبازیوں سے فقط مسلمانوں کی قوّتِ ایمانی کو سلب کرنے کے لیئے۔ اور آقائے دوعالم سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے جمالِ جہاں آرا کی تجلیات سے قلوبِ مومن کو خالی کرنے کے لیئے برّصغیر میں آج سے صرف دوسو سال پہلے نجدی بیج بویا گیا۔ (دیکھو تاریخ دیوبند سید احمد کی سچی تصویر اور کتاب زلزلہ۔ رشید احمد کی حیاتِ طیبہ) نجدی جھاڑ جھنکار نے آناً فاناً سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان کچرے کی کھیریوں سے ایسے بھبھوکے پھوٹے کہ تعفّن سے ناک دم ہوا۔ کہیں دیوبندیت کی یلغار پھوٹی۔ تو کہیں وہابیت نے اڈا جمایا۔ جہاں بیٹھے وہاں سب کا دین وایمان گمایا۔ طرح طرح سے شرک وبدعت کا داؤ چلایا مگر پھر بھی کام بنتا نظر نہ آیا۔ تب پھر انہوں نے بھی اہلِ سنّت کا بیبل لگایا۔ جیسے چاہا اپنا بنایا۔ جسے چاہا بدعتی ومشرک بنایا۔ حتی الامکان اللہ ورسول اور صحبتِ اولیاء سے دور ہٹایا۔ جب ظلم وستم انتہاء سے ڈھایا۔ اور جھوٹے اہل سنت بن کر سچوں کا فرق مٹایا۔ تب اللہ کریم نے بریلی شریف میں ایک نور چمکایا جس نے وہابیت کی لادینیت کو دبایا۔ اور بہکے ہوئے مسلمانوں کو سمجھایا۔ کہ صحابہ کرام کے وقت سے لے کر اب تک سچے اہل سنت اور پروانۂ شمعِ رسالت یہی لوگ ہیں۔ جو گستاخوں سے بچا رہے ہیں دربنی پر بلا رہے ہیں۔ اور حمد باری عزّاسمہٗ کے ساتھ صفات انبیاء واولیاء سنا رہے ہیں۔ بریلی کے اسی نور نے کائناتِ سنیت کو نورِ مصطفیٰ سے روشناس کرایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اصاغر اہل سنت نے

علم وعرفان سے جو کچھ پایا اسی در سے پایا۔ اس ہی شہنشاہ بریلی کی مشفقانہ تعلیم و تربیت نے ہمارے بے بہرہ قلوب کو محبتِ احمد مجتبیٰ سے جگمگایا۔ ورنہ جہلاءِ دیوبندیت اور حمقاءِ وہابیت نے ہم کو نارِ ابدی کے کنارے کھڑا کر دیا تھا۔ کتنا عظیم احسان ہے۔ اس مفکرِ اسلام کا تمام اہلِ سنت پر جس نے سنیوں کو دیوبندی کچرے سے نکال کر ایک سچے اور درست مرکز پر جمع کیا۔ آخر کیوں نہ ہم اس سلطان العلماء اور بستان العرفاء کے گیت گائیں۔ اور کیوں نہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ حدیث پاک میں آتا ہے جو محسنوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۷ :۔ بابُ مَا جَآءَ فِی الشُّکْرِ لِمَنْ اَحْسَنَ اِلَیْکَ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللہِ ابْنُ الْمُبَارَکِ ثَنَا الرَّبِیْعُ بْنُ مُسْلِمٍ۔ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ زِیَادٍ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَا یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللہَ۔ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ ط (ترجمہ)۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو محسن لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر گزار نہیں بن سکتا۔ یہ حدیث ہر طریقے سے صحیح ہے۔ جامع صغیر جلد دوم صفحہ ۱۸۱ پر بحوالہ مسند احمد اور الضیاء لابی سعید سے مروی ہے :۔ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ ط ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ ط ترجمہ۔ جس نے محسنِ انسان کا شکریہ نہ کیا۔ اس نے اللہ کا بھی شکر نہ کیا۔ لہٰذا ہم اہلِ سنت کا اپنے آپ کو جہاں بریلوی کہنا بطورِ نشان ہے وہاں اس محسن کا شکریہ بھی ہے۔ بریلوی نام رکھنا نہ سنت ہے نہ فرض نہ واجب۔ بلکہ جس طرح پہلے زمانوں میں ہر اہلِ سنت کے لیئے برائے تفریقِ اشعری یا ماتریدی کی نسبت لازم تھی۔ کیونکہ جھوٹوں نے بھی اپنے آپ کو سنّی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح فی زمانہ ہر اہلِ سنت کے لیئے لفظ بریلوی کا نشان اور نسبتی وصفاتی نام اشد لازم ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں بہت سے جھوٹے لوگوں نے اپنا نام اہلِ سنت رکھنا شروع کر دیا۔ صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیئے اگر بریلویت کے پیارے لقب کو ہٹا دیا جائے تو جھوٹے اور سچے کا لفظی امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بجز اس لفظ کے دنیا میں اس وقت کوئی دوسرا لقب نہیں۔ جس کو اختیار کر کے ایک اجنبی کو جھوٹے سنیوں سے بچایا جا سکے۔ اگر زید لفظِ بریلوی سے نفرت کا اظہار نہ کرتا تو نہ قوم میں انتشار و فساد کا اندیشہ ہوتا نہ اس سوال و جواب کی حاجت پڑتی۔ زمانے کے حالات اور زمانہ ساز لوگوں کے پُرفریب واقعات کو دیکھتے ہوئے بکر کا قول شرعاً بالکل درست ہے۔ ہمارے دوست زید کو چاہیئے کہ آئندہ ایسی بات نہ کرے۔ کہ جس سے علاقے میں مشکوک نظروں سے دیکھا جائے "پس زید پر لازم ہے کہ خود کو بریلوی کہلوائے اور اس لقب سے نہ شرم کرے نہ نفرت :۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہٗ

گردشِ زمین کے سائنسی عقیدے کی تردید

سوال ۲۳ :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ تحقیقی طور پر عقیدۂ اسلامیہ کے مطابق زمین و آسمان پھرتے چکر لگاتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے مسلمان سائنس پڑھ کر یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ زمین اور آسمان پھرتے ہیں بلکہ آسمان کے وجود کے قائل ہی نہیں۔ اور دلائل میں مندرجہ ذیل چند باتیں کہتے ہیں۔ ۱ سورج اور چاند گرہن اسی لیے لگتا ہے کہ زمین پھرتی ہے ۲ :۔ چاند گھٹتا بڑھتا نہیں بلکہ چاند کے جتنے حصے پر سورج کی روشنی پڑتی ہے وہ حصہ روشن ہوتا ہے۔ یہ بھی گردش زمین کی وجہ سے ہوتا ہے ۳ :۔ چاند خود روشن نہیں ہے بلکہ زمین کی طرح بے نور ٹھوس کرہ ہے۔ ۴ ہمارے ایک پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ علماحضرات کا یہ کہنا کہ آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے یہ جھوٹ ہے۔ لہٰذا براہِ کرم ہم کو اس کا مدلل مکمل جواب عطا فرمایا جائے۔ اور اس حدیث شریف کا متن بھی لکھا جائے جس میں آسمانوں کا فاصلہ پانچ سو سال کا راستہ ہے۔ فقط والسلام :۔ بَیِّنُوا وَتُوجَرُوا

سائل :۔ نور محمد ٹنڈو اللہ یار صوبہ سندھ پاکستان ۶۶-۱۲-۷

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ :۔ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ وَرَءُوْفِ الرَّحِیْمِ ؕ

اَمَّا بَعۡدُ۔ جاننا چاہیئے کہ جس طرح تمام عقائدِ اسلامیہ بے شمار مضبوط دلائل پر قائم و ثابت ہیں اسی طرح یہ عقیدہ بھی عقلاً نقلاً ایماناً ایقاناً۔ احادیث و قرآن اور منکرین اسلام کے اقوالِ زریں کے بے شمار دلائل سے بہت مضبوط ہے کہ زمین آسمان بالکل ساکن و جامد ہیں اقوام عالم کے سائنس دان اور مسلمانوں میں اندھی تقلیدِ سائنس کرنے والوں میں کسی کے پاس ایک بھی ایسی دلیل نہیں جس سے زمین کے متحرک ہونے یا سیارہ ہونے کو ثابت کیا جائے۔ کچھ لایعنی باتیں سائنس پڑھے ہوئے لوگ کرتے ہیں جن میں سے کچھ سوال میں درج ہیں۔ مجھ سے بہت دفعہ عیسائی اور مسلمان پروفیسروں سائنس کے ماہروں نے اس مسئلے پر مکالمہ کیا مگر بحمدہٖ تعالیٰ چند منٹ کی گفتگو سے ہی متاثر ہو کر ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی زمین و آسمان ساکن ہیں اور چاند سورج متحرک سیارہ ہیں۔ سلجھے ہوئے دماغ والے تو حقیقت کو جلدی تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر بگڑے لوگ ہٹ دھرمی اور سائنس دانوں کی وہمیات پر اس طرح ایمان لائے ہوئے ہیں۔

کہ شکست خوردہ ہو کر بھی سچائی کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ میں رب کریم کے بھروسہ پر مندرجہ ذیل سطوروں میں اِس مسئلہ پر دلائل پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقت تسلیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور سائنس وہمیات کی الجھنوں سے بچائے۔ آمین۔ یا ربّ العالمین۔ چونکہ چیز بنانے والے کے اقوال چیز کے بارے میں زیادہ معتبر ہوتے ہیں اور زمین وآسمان کا بنانے خود باری تعالیٰ رب العزت ہے۔ اس لیئے اوّلاً اسی کے فرمودات کو دلائل واستدلال بنایا جاتا ہے۔

دلیل اوّل:۔ قرآنِ مجید سورۃ حج آیت ع ۶۵ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ (الخ) اور اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:۔ سورۃ فاطر آیت ع ۴۱:۔ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا:۔ (ترجمہ):۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالکل ٹھہرایا ہوا ہے۔ روکا ہوا ہے۔ اس سے کہ گریں۔ اِن آیتوں میں رب تعالیٰ نے اپنی قدرتِ عجیبہ کا اظہار فرمایا ہے۔ کیونکہ چلتی پھرتی اڑتی ہوئی چیز کا نہ گرنا تعجب خیز نہیں اسطرح کا مشاہدہ تو دن رات پرندوں اور ہوائی جہازوں سے ہوتا رہتا ہے یہ نہ گرنا زیادہ حیران کن نہیں حیران کن یہی ہے کہ بغیر حرکت کے اتنے بڑے بڑے آسمان وزمین ٹھہرے ہوئے ہیں ان آیات سے ثابت ہوا کہ آسمان و زمین ساکن ہیں۔ **دوسری دلیل**:۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے۔ سورۂ نحل آیت ع ۱۵:۔ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ۔ اور دوسری آیت سورۃ الانبیاء آیت ع ۳۱:۔ وَجَعَلْنَا فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ:۔ (ترجمہ):۔ اور لگا دیئے ہم نے زمین میں لنگر تاکہ بالکل حرکت نہ کرے ایک جگہ کھڑی رہے۔ جس طرح بحری جہاز کو چلنے سے روکنے کے لیئے لنگر انداز کیا جاتا ہے تو وہ چل نہیں سکتا یہی بات کائنات کے لوگوں کو زمین کے بارے میں یہاں سمجھائی جا رہی ہے۔ کتنی صاف اور بڑی دلیل ہے اس بات پر کہ زمین بالکل ساکن ہے۔ اہل عقل کو سمجھانے کے لیئے یہ دلیل ہی کافی ہے۔ **تیسری دلیل**:۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سورۂ مومن آیت ع ۶۴:۔ اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا:۔ (ترجمہ) اللہ وہ ہے۔ جس نے تمہارے لیئے سب زمین کو ٹھیرا ہوا بنایا۔ **چوتھی دلیل**:۔ قرآنِ مجید میں ہے۔ سورتِ قٓ آیت ع ۷:۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِىَ۔ (ترجمہ):۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ کی کیلوں کا لنگر ٹھونک دیا۔ ان تمام آیات سے یہی ثابت ہوا کہ زمین بالکل ایک جگہ ٹھیری ہوئی ہے۔ **دلیل پانچویں**۔ تمام منکرین اور فلاسفہ کی کتب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام کواکب ستارے صرف تین قسم کے ہیں:۔

پہلی قسم:۔ سیارہ ستارے یہ صرف سات ہیں۔ شمس وقمر زہرہ مریخ۔ عطارد مشتری۔ زحل۔ ان سیارگان میں نہ زمین کا نام ہے نہ آسمان کا۔ چنانچہ منطق کی مشہور کتاب مرقات کے ص ۱۱ پر اسی طرح

ہے۔ کواکب کی دوسری قسم متحرکین ہیں۔ اُن کی تعداد بے شمار ہے۔ تیسری قسم ساکنین کی ہے وہ صرف دو ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی۔ یہ اقسام کواکب سماویہ کی ہیں۔ متحرکین اور سیارگان میں فرق یہ ہے کہ سیارگان بار بر جوں سے گزرتے ہوئے طلوع ہوتے ہیں اور اُن کے مطالع تاریخوں اور سالوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن متحرکین کا تعلق بر جوں سے قطعی نہیں ہوتا نہ اُن کے مطالع یعنی طلوع و ظہور کی جگہ بدلتی ہے۔ بلکہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے انکی حرکت ایک معین مقام سے ہے۔ اُن کی حرکت مثل تیرنے کے ہے۔ اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ :۔ (ترجمہ) ۔ تمام تمام ستارے اپنے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں (سورت انبیاء آیت ۳۳) آسمان پر غور کرنے سے یہ دو قسم کے ستارے بخوبی ظاہر ہوتے۔ ایک کا طلوع و غروب بدلتا رہتا ہے۔ اور قسم دوم کا طلوع ایک ہی رہتا ہے۔ اگر زمین پھرتی ہوتی تو کسی بھی ستارے کا طلوع ایک نہ رہتا۔ متحرکین ستاروں کا ہر دن ایک ہی جگہ سے طلوع کرنا بتا رہا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ اسی طرح ساکن ستاروں کا ہم زمین والوں کو ہمیشہ ایک ہی جگہ نظر آنا بتا رہا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ مگر یہ تجربہ اور مشاہدہ تب ہو سکتا ہے جب یک دم سب ستاروں پر نظریں دوڑا کر غور و فکر کیا جائے اور ہماری اس دلیل میں تدبر کیا جائے۔ دوربین سے یک وقت صرف ایک ستارہ تو نظر آ سکتا ہے سب ستارے دکھائی نہیں دیتے سائنس دانوں کو اسی لیے دھوکہ لگا انہوں اپنی رسد گاہ اور تجربہ گاہوں سے بذریعہ دوربین سیاروں کو دیکھا۔ وہ ساکن زمین پر کھڑے ہو کر جب چلتے ستارے میں نظر دوڑانے لگے تو دماغ نے دھوکہ کھایا۔ اور ستارے کی روش سے زمین کو چلتا سمجھ لیا۔ پھر کیا تھا۔ بس شور مچا دیا۔ کہ زمین سیارہ ہے۔ پھر یہیں پر بس نہ کی بلکہ اپنے وہمیات سے نئی سے نئی نت نرالی زمین کی رفتاریں اور چالیں بنا ڈالیں۔ اور تعجب یہ کہ دلیل کسی بات پر نہیں۔ ان سائنس دانوں نے اتنی بڑی زمین کو کھلونا سمجھ لیا۔ ان کی کتابوں کو پڑھ کر عجیب مضحکہ خیز نظریات ملتے ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق زمین بالکل ساکن ہے۔ اور آسمان کے چند مذکورہ ستارے۔ سیارے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھو کہ ایک شخص کھڑی ہوئی بس یا ریل میں بیٹھا ہے۔ اور کسی دوسری بس کو دیکھ رہا ہے، وہ بس چل پڑے تو اپنی بس چلتی نظر آتی ہے۔ اگر یہ شخص اسی بس کو دیکھتا ہے تو اپنی کھڑی بس کو چلنے کا اعتقاد بنائے گا۔ اگر حقیقت اور سچائی کو جاننا چاہتا ہے تو دوسری سمت میں کھڑی اور ساکن اشیاء کو دیکھے۔ اگر یہ سائنس دان دوسرے کواکب ساکنہ پر بھی نظر کر لیتے۔ تو کبھی زمین کو سیارہ نہ کہتے اور بغیر دلائل ایک نیا مذہب و عقیدۂ باطلہ نہ بناتے ہمارے بعض مسلمان فلاسفر سائنس دانوں کی تائید کرتے ہوئے عجیب باتیں کرتے ہیں یہ سب یات ہیں۔ **دلیل ششم** ۔ قرآن مجید سے تو زمین کے سکون پر بہت آیات پیش کر دی گئیں جن کی تائید اہلِ عقل نے اپنے تجربوں سے کر لی۔ تجربہ ۱ :۔ مشاہدہ کواکب آسمانی جس کا ابھی ذکر ہوا۔ تجربہ ۲ :۔ اگر زمین حرکت کرتی ہے تو ہم کو محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ جب کہ ذرا سا زلزلے

کا جھٹکا بھی ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ تجربہ ۲ پھر قطبین کا رخ کیوں نہیں بدلتا وہ روزانہ ایک جگہ کیوں نظر آتے ہیں۔
بعض لوگ ایک آیتِ قرآنی سے حرکتِ زمین پر دلیل پکڑتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں سورۂ نمل آیت ۸۸ میں ہے
وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ :۔ اس آیت کا ترجمہ وہ اس طرح کرتے ہیں۔ اور دیکھتا ہے تو پہاڑوں کو گمان کرتا ہے تو ان کو جامد و ساکت حالانکہ چل رہے ہیں وہ سب پہاڑ بادلوں کی طرح چلنا۔ معترض مخالف کہتا ہے کہ قرآن مجید سے زمین کا چلنا ثابت ہو گیا۔ **جواب** :۔ میں کہتا ہوں یہ دلیل چند وجہ سے غلط ہے :۔

پہلی وجہ :۔ یہ کہ اس کا ترجمہ مخالف نے غلط کیا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ اور دیکھے گا تو پہاڑوں کو تو گمان کرے گا کہ جامد ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے پھرتے ہوں گے۔ اس ترجمہ نے بتا دیا کہ آج کل ایسا نہیں ہے کبھی آئندہ ایسا ہوگا۔ **دوسری وجہ** یہ کہ یہ واقعہ قیامت کو ہوگا۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیری وضاحت دوسری آیت نے اس طرح فرما دی۔ سورت کہف آیت ۴۷ :۔ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ (الخ) ترجمہ اور قیامت کے دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے۔ **تیسری وجہ** :۔ یہ کہ خود اس آیت کے سیاق و سباق میں بھی قیامت کا ہی ذکر ہے۔ اسی کے واقعات ہیں۔ پس اس کے درمیان پہاڑوں کی حالت کا ذکر ہے کہ بروزِ قیامت وہ پہاڑ زمین سے اکھڑ کر بادلوں کی طرح اُڑیں گے۔ اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں گے۔

چوتھی وجہ یہ کہ یہاں پہاڑوں کی روش کا ذکر ہے۔ نہ کہ زمین کی حالانکہ گفتگو گردش زمین کے متعلق ہے
پانچویں وجہ یہ کہ پہاڑوں کے چلنے کو بادلوں کے چلنے سے مشابہ کیا گیا۔ اور بادل زمین سے جدا ہو کر چلتے ہیں نہ کہ جڑ کر۔ پھر اگر پہاڑ کے چلنے سے زمین کا چلنا ہی مراد لیا جائے تو صرف پہاڑ کا ذکر بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ کہنا چاہیئے تھا۔ کہ ہر چیز چلتی ہے درخت وغیرہ بھی مگر گمان ہوتا ہے کہ کھڑی ہے۔ بہر حال آج تک سائنس دانوں کے پاس گردش زمین پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکی فقط وہمیاتِ باطلہ اور خیالات فاسدہ ہیں جو گھڑ لیئے گئے ہیں۔ گردش زمین و آسمان کے متعلق تین قول سامنے آتے ہیں۔ ۱ ایک فلاسفہ قدیم کا وہ کہتے ہیں کہ فقط آسمان گردش کرتا ہے۔ نہ کہ زمین اور ایک قول فلاسفہ جدید کا جن کو عرف عام میں سائنسدان کہا جاتا ہے۔ تیسرا قول خود خَالِقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا۔ اور ہر ذی عقل اس بات کو بخوبی سمجھ جائے گا۔ کہ جو کچھ خود بنانے والا اپنی بنائی ہوئی چیز کے متعلق جانتا ہے۔ وہ دوسرا نہیں جان سکتا۔ میں ایک چیز بناؤں۔ اور کہوں کہ اس کے اندر رہو ہے۔ مگر دوسرا کہے۔ کہ نہیں تانبا ہے تو یقیناً لوگ مجھ کو ہی سچا سمجھیں گے۔ خیال رہے۔ کہ کسی بات کو نہ ماننے کی چند وجہ ہوتی ہیں۔ یا تو بولنے والا اکثر جھوٹ کہتا ہو۔ یا زیادہ جاہل ہو۔ اور جہالت سے خبر دے رہا ہو۔ اور یا نہ ماننے والے کے پاس ٹھوس دلائل ہوں۔ جو اس کے دعوٰی کو حتی اور یقینی

ثابت کردیں۔ اور یا کسی کی بات محض ضد یا دشمنی کی وجہ سے نہ مانی جائے۔ ایسوں کے بارے میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ط اور یا فقط جہالت کی وجہ سے نہ ماننے۔ جیسے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ط پہلی صورت تو عقیدۂ اسلامی میں ناممکن ہے۔ ایسے ہی دوسری بھی اس لیئے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ جھوٹ سے پاک ہے۔ خود فرماتا ہے:۔ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ط اور اللہ تعالیٰ جہالت سے بھی پاک ہے۔ کہ فرماتا ہے:۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ط:۔ رہی تیسری قسم کی صورت تو خود سائنسدان فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ط کی مانند کبھی کچھ کہتے تھے۔ کبھی کچھ۔ آج سے پچاس سال پہلے سب فلاسفہ جدیدہ متفقہ طور پر کہتے تھے۔ کہ سیارگان صرف سات ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا یہی سات سیارے فلاسفہ قدیم اور اسلام میں مسلّم ہیں مگر پچاس سال گزرنے کی دیر تھی۔ کہ فلاسفہ جدید کے دماغوں نے چکر کھایا۔ اور کہنے لگے۔ کہ آسمان و زمین گھومتے ہیں۔ اور لگے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کہ کوئی تو دلیل ہاتھ لگے۔ مگر وائے رے دماغی چکر۔ کہ ایک دلیل آتی ہے۔ تو دوسرے دعوای کو ختم کرتی ہے اور دوسری دلیل لی تو پہلا دعوےٰ صفا نکل گیا۔ اِدھر آتے ہیں۔ تو اُدھر کی خرابی۔ اُدھر آتے ہیں تو اِدھر کی خرابی۔ آخر تھک ہار کر چیخ اٹھے کہ نہیں نہیں۔ ہماری کوئی تحقیق حتمی نہیں۔ ہمارا کوئی دعوای یقینی نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ کرو سائنس کی مشہور کتاب حدائق النجوم صفحہ نمبر ۱۳۲ پر جس میں بہت بڑے روسی سائنسدان کا قول نقل کرتے ہیں۔ جس کا نام مسٹر بیرڈ ہے۔ کہتا ہے کہ اتنی معلومات و تحقیقات کے باوجود ہم کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ ہو سکتا ہے کہ کل ہم یہ کہہ دیں۔ کہ زمین بالکل ساکن ہے۔ ٹھوس دلائل تو درکنار۔ اپنے دعوے سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ سائنس کے گرو گھنٹال تو یہ کہتے ہیں۔ مگر ہمارے نئے نویلے سائنس دان کہ جنہوں نے بجز باتوں کے کوئی سائنسی کمال نہ دکھایا۔ فلاسفر بننے کی ٹھان بیٹھے اور شاگرد سعید کی مثل سائنس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اب سائنسدان کچھ کہے۔ مگر یہ بغیر تصدیق کیئے سرِ تسلیم خم ہیں حالانکہ کہ مسلمان کی شان قرآنِ کریم نے یہ فرمائی ہے:۔ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا :۔ سائل کے سوال میں جو دلائل حرکتِ زمین کے حق میں درج ہیں۔ وہ بیتِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اور یہ دلائل تو آج تک کسی سائنسدان کو نہ سوجھے۔ اُن تمام باتوں کے ہوتے ہوئے مجھ پر لازم آیا۔ کہ میں سائل کی تسلی کے لیئے فلاسفہ قدیم کا عقیدہ بتاؤں۔ اور اس کا ردّ کروں۔ پھر فلاسفہ جدیدہ کا عقیدہ اور اُن کے دلائل بیان کروں۔ اور اُن کا عقلاً رد کروں۔ جاننا چاہیئے کہ حرکتِ زمین کے متعلق فلاسفہ قدیمہ کے دو گروہ ہیں ایک حکماءِ متقدمین کا اور ایک حکماءِ متاخرین کا متقدمین کہتے ہیں۔ کہ زمین گردش نہیں کرتی۔ صرف آسمان گردش کرتا ہے۔ مگر سیارہ نہیں۔ ایک ہی جگہ لٹو کی طرح یا چکی کی مانند گھوم رہا ہے۔ چنانچہ عجائب مخلوقات صـ۲۲ پر ہے۔

ذَهَبَ الْحُكَمَاءُ اِلٰى اَنَّ الْفَلَكَ جِسْمٌ بَسِيْطٌ كُرَوِيٌّ مُتَنَقِّلٌ عَلَى الْوَسَطِ مُتَحَرِّكٌ عَلَيْهِ ؂ ترجمہ: حکمائے کہا کہ فلک جسم بسیط ہے ایسا کرہ ہے جو اپنے مقام پر متحرک ہے۔ اور حکماء متاخرین جن کو عرفِ عام میں منطقی بھی کہتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے۔ کہ آسمان گردش نہیں کرتا بلکہ زمین گھومتی ہے اور اپنے ہی محور پر قائم اور چکی کی طرح گھوم رہی ہے۔ چنانچہ کتاب عجائب المخلوقات صہ ۲۱۵ پر منطقی۔ عقیدہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اَلْاَرْضُ جِسْمٌ بَسِيْطٌ طِبَاعُهٗ اَنْ يَّكُوْنَ بَارِدًا يَابِسًا مُتَحَرِّكًا اِلَى الْوَسَطِ ؂ :۔ (ترجمہ):۔ زمین جسم بسیط یعنی ٹھوس ہے اسکی حالتیں یہ ہیں کہ ٹھنڈی خشک اور ایک جگہ گھومنے والی ہے اسی لیئے ان تمام فلاسفہ کے نزدیک صرف سیارے سات ہیں مگر یہ سب عقائد دو طرح باطل ہیں (۱) اِس لیئے کہ خالقِ کائنات نے یہ گردش بے فائدہ کیوں فرمائی۔ کیوں کہ سیارہ تو فقط وہ ہی ہیں۔ جن سے دن رات اور تاریخیں ثابت ہوتی ہیں۔ شانِ باری تعالیٰ ہے :۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط خلاقِ کائنات نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی۔ مگر یہ گردش ہر طرح بیکار نظر آتی ہے (۲) اِس لیئے کہ یہ عقیدہ خود فلاسفہ کے بھی خلاف ہے۔ کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ چاند، سورج اور تمام ستارے اپنے اپنے کمانوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس عقیدے سے ان کا سیارہ ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ اور زمین کی گردش بھی ناممکن۔ اِس لیئے پھر تو لازم آتا۔ کہ ہمیشہ اِنسانی رہائش کے رُخ تبدیل ہوتے رہتے۔ اگر میرا مکان صبح جانبِ مغرب ہے تو شام جانبِ مشرق اور دوپہر کو کسی اور جانب۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ سب محض باطل ہیں۔ اور فلاسفہ جدیدہ پہلے ان کا عقیدہ تھا۔ کہ زمین بِالکل ساکن ہے۔ پھر اُن کا عقیدہ ہوا۔ کہ آسمان صرف اپنے مقام پر رہ کر گھوم رہے ہیں۔ جیسا کہ فلاسفہ قدیمہ کا مذہب تھا۔ جب ان پر مندرجہ بالا اعتراضات کیئے گئے۔ تو اس عقیدے کو چھوڑ کر دوسرا دعوے لے بیٹھے۔ اور کہنے لگے۔ کہ اسمان زمین کی دو حرکتیں ہیں۔ ایک اپنے محور پر مثلاً (زمین) گھوم رہی ہے۔ اور دوسرا چکر اس طرح (ع) یعنی گول دائرے میں سیارے کی مثل پھرتی ہے۔ پھر کسی سائنسدان نے سوچا۔ کہ اس گردش کو ہم سالانہ حساب سے مانیں روزانہ یا ماہانہ سب گردشِ داخلہ میں نہیں آسکتے۔ اس لیئے کہنے لگے۔ کہ نہیں نہیں۔ زمین تین قسم کی گردش کرتی ہے :۔ (۱) روزانہ اپنی جگہ پر (۲) ماہانہ اور (۳) دوسری گردش پوری کر کے آگے کی طرف تھوڑا سا بڑھتی ہے : (ےےےےےےےےے) مثلاً اِس گردش جیسی کرتی ہے گویا کہ آج اس جگہ چکر لگایا۔ تو ایک ماہ کے بعد کچھ آگے چکر لگایا۔ اور اس کی ہیئات گردش یہ ہے۔

اُن کے سے سوال چکر جس

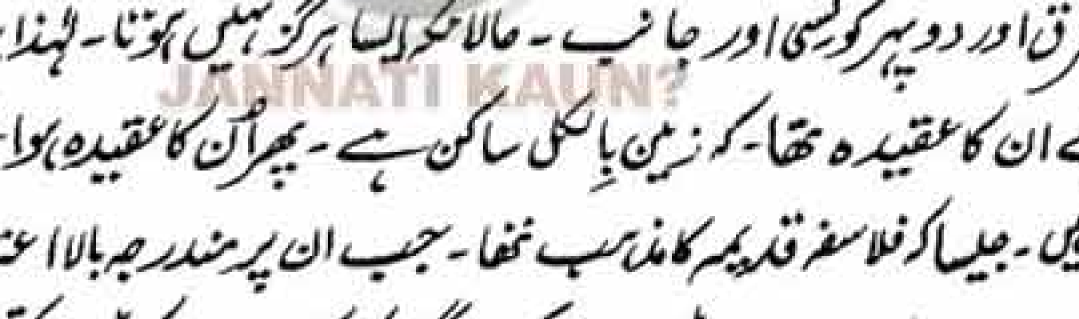

اس عقیدے پر تین طریقے کیا گیا :۔ نمبر ۱ یہ تیسرا طرح شکل بنائی گئی۔ ایک ہی

سمت کو جا رہی ہے۔ یا گول دائرے میں اگر ایک ہی سمت ہو تو بارہ مہینوں کی تعداد کیسے پوری کرو گے اور ہر تیرھواں مہینہ

لوٹ کر جنوری کیسے ہوگا۔ پھر تو اس کا بڑھنا غیر انتہائی سمت کی طرف ہے اس طرح تعداد ماہ بھی بارہ نہ ہو گی۔ بلکہ غیر انتہائی ماہ متصور ہوں گے (۲) زمین کا آگے کی طرف بڑھنا غیر انتہائی ہے۔ یا انتہائی اگر غیر انتہائی ہے۔ تو وہی اعتراض جو اوپر ذکر ہوا۔ اور اگر انتہائی ہے۔ تو بڑھتے بڑھتے دو قسم کی خرابیاں (۱) یہ کہ کسی چیز سے ٹکرا کر واپس لوٹی (۲) کیوں واپس آئی۔ آگے جانے سے کون مانع اور پھر تیسری حرکت سے چوتھی حرکت مزید سمجھ آئی۔ کہ زمین اُن چکروں کے علاوہ دائیں بائیں بھی پھرتی ہے۔ حالانکہ ابھی تک کسی سائنس دان کو اس حرکت کی نہ سوجھی (۳) اگر تیسرا چکر بھی گول دائرے میں گھومتا ہے۔ تب لازم آئے گا۔ ہر سال یہ چکر دراز ہوتا جائے۔ اور اس کی شکل یہ ہوگی۔ اس طرح ہر سال چکر دراز ہونے کے شکل میں اوقاتِ ایام

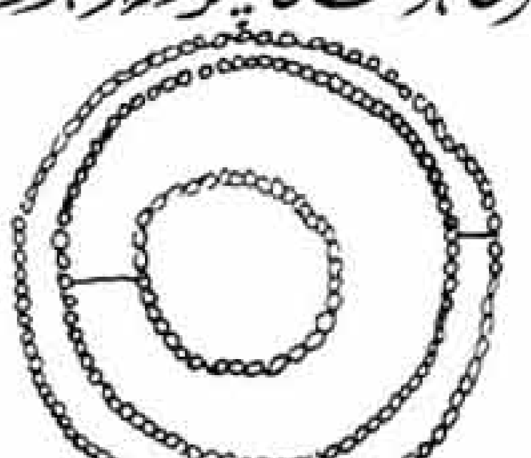

میں بھی یقینی طور پر درازی ہوگی۔ اس لیے جتنا لمبا چکر ہوگا۔ اتنا ہی دیر سے پورا ہوگا جتنا چکر چھوٹا ہوگا۔ اتنا ہی جلد پورا ہوگا۔ اس کا تجربہ پہیے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جب چھوٹا چکر تھا۔ تب دن رات کا محور چوبیس گھنٹوں میں پورا ہوتا ہے۔ تو اب اتنے عرصے کے بعد چاہیے۔ کہ دن بھی ہزاروں سال کے برابر ہو۔ اور رات بھی اور ماہ بھی اور سال بھی اس سے زیادہ بڑے ہوں۔ حالانکہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ دن رات اسی مقدار کا ہے :۔ جو آج سے تین صدی پہلے تھا۔ اور سال کے دن بھی شروع سے اب تک تین سو پینسٹھ (۳۶۵) ہی ہیں ہاں صرف لیپ کا سال کچھ دن عام سال سے بڑا ہوتا ہے۔ اور وہ دن اس چکر کی لمبائی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اتنے ہی دن زیادہ ہوتے ہیں۔ جو علماء نجوم نے کہہ دیا۔ بعض جہلا فلاسفہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ آسمان و زمین سب کے سب کسی نامعلوم غیر انتہائی سمت کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ سائنس کی مشہور کتاب اصول علم ہیئات جلد دوم صفحہ ۳۰۱ پر ایسا ہی لکھا ہے یہ بے فائدہ اور عقل سے دراز بات ہے۔ یعنی کہ زمین نہ ہوئی۔ ریل گاڑی ہو گئی۔ پھر اگر اس دوڑ میں زمین کی رفتار تیز ہے۔ تو مثل ریل گاڑی کے سب کو پیچھے چھوڑ جانا چاہیے تھا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ قطب ستارہ اپنی جگہ پر اسی قائم رہتا ہے :۔ باوجود اس بات کے کہ وہ زمینوں کے ساتھ معلق نہیں۔ بلکہ آسمان میں ہے۔ اور اگر سب کی رفتار یکساں ہے۔ تو چاہیے کہ چاند، سورج وغیرہ کبھی غائب نہ ہوں۔ جب یہ فلاسفر ان کے جوابات سے عاجز آ گئے۔ اور ان مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت نہ پائی۔ تو پانسہ پلٹا۔ اور کہنے لگے۔ نہیں نہیں۔ زمین کی یہ حرکتیں دن رات سال مہینہ کے نظام چلانے کے لیے نہیں۔ یہ نظام تو چاند، سورج سے چل رہا ہے۔ بلکہ زمین وغیرہ ہر سیارہ کا اپنے محور پر گھومنا اس وجہ سے ہے۔ کہ طبعیات میں ثابت ہوا ہے۔ کہ کائنات کی ہر چیز

بالطبع آفتاب سے نور و حرارت لینا چاہتا ہے۔ اگر ستیارے حرکت وضعیہ نہ کریں۔ تو جمیع اجزاء کو نور و حرارت نہ پہنچے:۔ (الخ) یہ دلیل فلاسفر کی بہت قوی دلیل ہے۔ اس دلیل سے سب دلائل کو ٹھکرا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ دلیل بہت سی کتب میں لکھی ہے۔ چنانچہ حدائق النجوم میں صفحہ ۲۴۴ پر مشہور سائنس دان مسٹر نیوٹن کے شاگرد مسٹر طام کا قول نقل کرتے ہوئے اس دلیل کو پیش کرتے ہیں۔ مسٹر نیوٹن وہی ہے۔ کہ جس نے ۱۶۶۵ء میں سیب کے گرنے سے کشش زمین کا بے ہودہ عقیدہ باندھا تھا۔ مگر میں اس دلیل کو نو طریقوں سے توڑتا ہوں:۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ط (۱) ابھی تک سب سائنس دانوں نے تمام اجزاء میں صرف تین قوتیں تسلیم کی ہیں۔ (۱) قوتِ جاذبہ: (۲) قوتِ نافرہ: (۳) قوتِ ماسکہ: اس دلیل سے ایک اور قوت ماننی پڑے گی۔ جس کا نام قوتِ شائقہ ہے۔ حالانکہ اب تک کسی نے یہ قوت نہ مانی۔ (۱) جب ہر جز ہی آفتاب سے نور اور حرارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو چاہیئے۔ کہ ہر وقت اڑتا ہے یہاں تک کہ ریت کے ذرے اینٹ، پتھر جو زمین کے اجزاء گہرائیوں میں دبے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اوپر آ کر حرارت و نور حاصل کریں نہ کوئی مکان سلامت رہے نہ پہاڑ، وہ چیزیں جو زمین میں دبی ہوتی ہیں۔ کیا وہ زمین کی جز نہیں اور کیا اُن کو حرارت نہیں چاہیئے: (۳) فلاسفر جدیدہ کہتے ہیں۔ کہ زمین میں اتنے مسامات ہیں۔ کہ اگر سب کو دبایا جائے۔ اور زمین کو شکنجہ میں کسا جائے۔ تو زمین ایک انچ کی رہ جائے۔ تو لازم ہوا۔ کہ زمین کا کوئی جز دوسرے جز سے متصل نہیں بلکہ خاصے فاصلہ پر ہے۔ گویا زمین ایک جالی ہے۔ تو ہر جز اپنے محور پر علیحدہ کیوں نہیں گھومتا۔ اور اپنے اندرونی اجزاء کو حرارت سے کیوں محروم رکھتا ہے فقط کرۂ ارض کا گھومنا تو ہر چیز کو اندرونی نور و حرارت نہیں پہنچا سکتا: (۴) کرۂ ارض کی حرکت وضعیہ سے سطح بالا ہی کے سب اجزاء فی الجملہ مستفید ہوں گے۔ اندر کے تمام اجزاء اب بھی مطلقاً محروم رہے۔ تو تمہاری دلیل کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ تمام اجزاء کا استفادہ کب ہوا۔ اندر کے اجزاء طلب نور و حرارت کے لیئے اوپر کیوں نہیں آئے۔ اگر کوئی بیوقوف فلاسفر یہ کہہ دے۔ کہ اوپر کے اجزاء اُن کو اوپر نہیں آنے دیتے۔ تو یہ بھی غلط ہے۔ اوّلاً اس لیئے۔ کہ جب زمین میں بقول تمہارے اتنے اتنے بڑے مسام ہیں۔ کہ ساری زمین دبانے سے ایک انچ رہ جائے۔ تو نیچے والے اجزاء اُن مسامات میں سے گزر کر اوپر کیوں نہیں آ جاتے۔ دوم اس لیئے کہ پھر تو صرف اوپر کے اجزاء نے ہی حرارت لی۔ بلکہ اُن میں سے بھی بعض کیوں کہ جو اجزاء آفتاب سے حجاب میں ہیں۔ بالمقابل اجزاء ان کے لیئے رکاوٹ ہیں اور قطب جنوبی جہاں چھ ماہ رات رہتی ہے۔ حرارت سے یکسر محروم رہے۔ ان تمام وجوہ سے حرکتِ وضعیہ بیکار ہوئی: (۵) سورج کیوں گردش کرتا ہے۔ وہ کس سے طلب نور و حرارت کرتا ہے۔

(۶) نصف کرۂ ارض تاریک کیوں رہتا ہے (۷) بفرضِ محال سب ہی مقابل آفتاب سہی۔ تو پھر عمود و منحرف کا فرق کدھر کرو گے (۸) اگر یہ بھی نہیں۔ تو اختلاف منظر کیوں کر ہوا (۹) سیارے صرف سات یا آٹھ یا نو کیوں ہیں کائنات کی ہر چیز سیارہ کیوں نہیں ہے۔ ان تمام سوالات میں نے اپنی تحقیق کے مطابق فلاسفہ کے اقوال حمقاء کا ردِ بلیغ کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ :۔ ہمارا اسلامی فلسفہ جس کو منطق بھی کہتے ہیں۔ جس کو امام رازی اور بو علی سینا نے پیش کیا۔ اور سارے عالمِ اسلام کا اتفاق ہے۔ وہ یہ ہے کہ چاند سورج اور ستارے زمین و آسمان سب گول مثل گیند کے ہیں :۔ اور جَعَلَ الْاَرْضَ فِرَاشًا ط اِس مسلک کے مانع نہیں۔ ہاں بعض منطقی کہتے ہیں۔ کہ زمین تھالی کی طرح گول ہے اور دلیل میں۔ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط والی آیت پیش کرتے ہیں۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ زمین مثل انڈے کے گول ہے! اور چاند گھٹتا بڑھتا نہیں ہے بلکہ چاند ایک سیاہ کرہ ہے جو سورج کے نور سے منور ہوتا ہے۔ چاند اور سورج گردش کرتے ہیں مخالفِ سمت پر اسی لیے چاند رات کو چمکتا ہے اور طلوع ہوتا ہے۔ اور سورج دن کو۔ پس جس حصہ کا سورج سے آمنا سامنا ہو جائے۔ وہ ہی منور ہو جاتا ہے چاند اور سورج کا گرہن ہونا بھی اِس لیے نہیں۔ کہ زمین گردش کرتی ہے۔ بلکہ یہ دلیل پیش کرنا بھی جہالت کی نشانی ہے منطقی اور اِسلامی نقطہ سے چاند اس لیے گرہن ہوتا ہے۔ کہ دو گردشیں ہیں۔ ایک سردی کی اور ایک گرمی کی۔ اِس لیے قطب جنوبی میں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات ہوتی ہے۔ جب زمین چاند کے بالکل مقابل آجائے! اور سورج زمین کے پیچھے بالکل نیچے میں ہو۔ تو چاند گرہن لگ جاتا ہے اسی لیے ہمیشہ تیرھویں چودھویں اور پندرھویں رات کو ہی گرہن ہوتا ہے۔ کیونکہ سورج چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے پھر کبھی سورج کے بالکل سامنے چاند آجاتا ہے۔ اور زمین کیلئے چاند آڑین جاتا ہے۔ تو ہم سمجھ لیتے ہیں۔ کہ سورج گہہ گیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمیشہ سورج چاند کی اٹھائیس، انتیس کو ہی گرہن ہوتا ہے۔ اور ساتوں آسمانوں میں پانچ پانچ سو سال کا فاصلہ ہے چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۱۰ باب بدء الخلق پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ الخ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهَا خَمْسُ مِائَةِ عَامٍ (الخ) قَالَ سَمَاءٌ اَنْ بُعْدَ مَا بَيْنَهُمَا خَمْسُ مِائَةِ عَامٍ ثُمَّ قَالَ كَذٰلِكَ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط اور زمین کا نقشہ یہ ہے۔ کہ زمین آدھی پانی کے اندر ہوتی ہے اور آدھی باہر، جس پر آبادی ہے یہی وَجَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ط ہے۔ نقشہ پر پوری طرح گردش سورج چاند کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ مگر سمجھنے کے لیے نقشے پر غور کیا جائے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

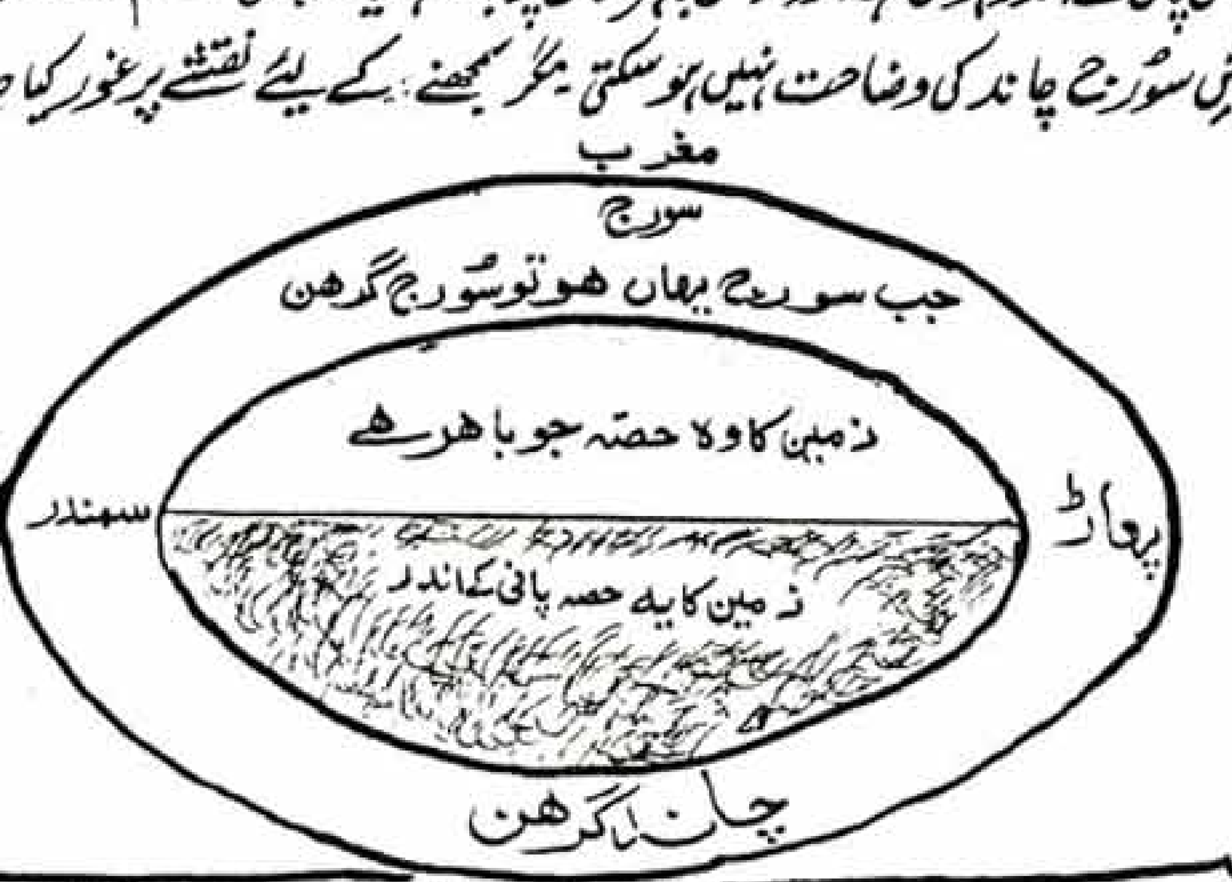

کتبہ

چاند پر راکٹ جانے کا بیان اور عقیدہ

سوال نمبر ۲۴! - کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ کفار آئے دن یہ اعلان کرتے ہیں۔ کہ فلاں راکٹ چاند پر اتر گیا ہے۔ اور ہم انسان کو چاند پر بھیج دیں گے۔ اور چاند ہماری ملکیت بن جائے گا۔ آیا کیا یہ کامیاب ہوں گے یا نہیں کیا چاند آسمان پر ہے۔ اور بموجب حدیث پانچ سو سال کا رستہ ہے۔ اور قرآن مجید کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کامیاب نہ ہوں گے۔ وہ آیت یہ ہے۔ کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ۔ ط ترجمہ:۔ کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے تابع کر دیا جو کچھ زمین میں ہے۔ اِس آیت سے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ زمین کی چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اُنکے بس میں کر دی ہیں۔ اور آسمان کی چیزوں کا تو ذکر ہی نہیں ہے والسلام نور محمد سکنہ ٹنڈو الٰہ یار سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

الجواب

شریعتِ پاک کے اقوال کے مطابق چاند پر پہنچنا ناممکن نہیں۔ نہ کسی آیت پاک سے یہ عدم امکان ثابت ہوا۔ حدیث شریف اور سائل کی پیش کردہ آیت بھی مذکورہ فی السوال منشا ثابت نہیں کرتی۔ اس لیئے کہ ایک کا ثبوت دوسرے کا عدم ظاہر نہیں کرتا۔ چنانچہ قرآن مجید میں آسمانوں پر جانے کا ذکر ہے اور جنات و انسان کو کہا گیا ہے۔ کہ تم کہیں بھی چلے جاؤ اللہ کی سلطنت میں ہی جاؤ گے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ط:۔ (ترجمہ) اے جنات و انسان کے گروہ اگر تم طاقت رکھتے ہو۔ کہ آسمان و زمین کی حدود سے نکل جاؤ۔ تو نکل جاؤ۔ مگر اللہ کے قبضے سے باہر نہیں جا سکتے۔ اِس آیت میں آسمانوں سے باہر نکلنے کی قدرت کا ذکر ہے ؛؛ استفسار صرف حکومتِ الٰہیہ سے باہر نکلنے کا ہے۔ لہٰذا چاند پر پہنچنا کوئی محال نہیں۔ بشرطیکہ طاقت ہونی چاہیئے۔ اس لیئے آیت کریمہ میں اِنِ اسْتَطَعْتُمْ کی قید لگی ہے:۔ نحوی قاعدے کے لحاظ سے اس جملے کو شرط بنایا۔ اور آسمان کی حدود سے نکلنے کو جزا۔ جزا بغیر شرط ناممکن مگر شرط کے ہونے سے ممکن اِس مسئلہ پر اور بھی بہت سی آیات واضح ہیں۔ ایک جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد قرآن مجید

میں ہے۔ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (ترجمہ): کہ اللہ تعالیٰ نے چاند اور سورج کو مسخر فرمایا۔ اگر سائل سوال کرے۔ کہ اس آیت کریمہ میں (لَكُمْ) نہیں ہے۔ جس سے انسان کے لیے مسخر نہیں ثابت ہوتا۔ حالانکہ سوال میں مذکورہ آیت لفظ لَكُمْ کے ساتھ ہے۔ تو میں پارہ نمبر ۲۵ کی آیت کریمہ پیش کروں گا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے۔: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط ترجمہ:۔ اور اللہ رب العزت نے مسخر کر دیا۔ اے انسانوں تمہارے لیے تمام وہ کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ منشاءِ باری تعالیٰ یہ ہے۔ کہ انسان کو اتنی طاقت بارگاہِ خلّاقِ عالم سے عطا ہوئی ہے۔ کہ ہر چیز پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبیبِ خالقِ کائنات خیر البشر فخر الرسل محمد و نبی الکل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معراج کرائی۔ جس طرح چاند، سورج بلکہ تمام کروں پر عبور حاصل کیا اور ثابت کر دیا۔ کہ قادرِ مطلق نے نفوذِ آسمانی کے لیے طاقت کی شرط لگائی۔ اور فرمایا:۔ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ تاکہ پتہ لگے۔ کہ آسمان پر جانا ممکن ہے۔ مگر یہ بے طاقت کا کام نہیں۔ اور دنیا بھر کے سائنسدان اس کو جان لیں۔ اور اقوامِ عالم سمجھ لیں کہ ؎

پتہ لگا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

مگر فرق یہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ایک بار لامکان میں پہنچ گئے لیکن سائنسدان ابھی تک زور لگا رہے ہیں۔ بہر حال مذہبِ اسلام میں چاند پر بذریعہ براق یا بذریعہ راکٹ یا کسی بھی طاقت کے ذریعے جانا ناممکن نہیں۔ یہ بات ہر شخص کو ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ سائنسی تجربات صرف کفار نے ہی نہیں کیے بلکہ دنیا کی ایجادات میں مسلمان فلاسفہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جیسا کہ تاریخی کتب سے ظاہر ہے اور یہ سب تجربات قرآن مجید میں تفکر و تدبر سے ہی حاصل کیے گئے۔ یہاں تک کہ کافر سائنس دان نے بھی جو کچھ حاصل کیا تدبرِ قرآنی سے ہی حاصل کیا۔ مگر اس کے باوجود کہ مسلمانوں نے دنیوی سائنس میں بہت تحقیق کی ہیں ہمارے لیے کوئی فخر کی بات نہیں۔ کیونکہ مسلمان کی پیدائش اس لیے نہیں کہ دنیوی محنتوں میں پھنسا رہے وہ تو صرف اُخروی محنتوں اور کمالاتِ دینیہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے مسلمان کی خوشی یہ نہیں کہ وہ راکٹ و جہاز بناتا رہے۔ یہ سب کام تو دنیاداروں کے ہیں۔ مسلمان شہنشاہی آخرت کے لیے پیدا کیا گیا۔ جیسے بادشاہ کا کام انتظامِ شہنشاہی ہے اور خدام کا کام اس کی ضروریات پوری کرنا ہے۔ دیکھو ساری دنیا کے کفار ایجادیں کرتے ہیں اور اس کو برتنا مسلمان کے لیے ضروری ہوگیا۔ بالکل یہی بات ثابت ہوگئی کہ سب جہان میرے لیے اور تو خدا کے واسطے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

آسمان اور فلک میں فرق کیا ہے اس کا بیان

سوال نمبر ۲۵ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین مسائل ذیل میں:۔ (۱) سما اور فلک دونوں الفاظ ایک معنیٰ میں ہیں۔ یا کچھ فرق ہے ؟ (۲) آسمان کا وجود کیا ہے۔ اور کیا کوئی ٹھوس مادہ ہے یا رقیق ہے۔ اگر رقیق ہے۔ تو اگر کوئی چیز گزرے اس میں تر ہوگی یا نہیں۔ اور آسمان کو خلا کہا جا سکتا ہے۔ یا نہیں۔ زید صاحب فرماتے ہیں۔ کہ آسمان جس کو آپ کہتے ہیں۔ وہ خلا ہے۔ کیونکہ روسی خلائی جہاز چاند پر آتر گیا۔ وہاں پر خلا ہی خلا ہے۔ اگر رقیق یا ہوا کی طرح ہے تو جہاز کو تر ہونا چاہیئے۔ اور وہاں ہوا۔ نہیں۔ آسمان۔ کا وجود کس طرح ہے۔ فقط والسلام؛

(نور محمد ٹنڈو الٰہیار حیدر آباد سندھ)

بِعَونِ العَلّامِ الوَهَّاب

الجواب

(۱) لفظِ سما اور لفظِ فلک لغت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ چنانچہ لفظِ سماء کا لغوی ترجمہ ہے۔ بلندی یا بلند اسی لیئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ کہ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ط اور لفظِ فلک کا لغوی ترجمہ ہر دو سطح چیز۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور حدیث قدسی میں ہے، لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ ط یہاں افلاک اپنے لغوی معنیٰ میں ہے۔ اسی لیئے شارحینِ حدیث اس حدیث پاک کی شرح میں لکھتے ہیں۔ یہاں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمین مراد ہیں۔ اور اِن تمام الفاظ کا اصطلاحی ترجمہ آسمان ہے:۔ چنانچہ باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ ارشاد فرماتا ہے :۔ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے :۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ط (۲) ابھی تک آسمان کی حتمی حقیقت حتمی طور پر کسی سے آشکارا نہیں ہوئی۔ ہمارے علماء بھی اِس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں یعض فلاسفۂ اسلام فرماتے ہیں۔ کہ آسمان ٹھوس دھاتوں کا بنا ہوا ہے۔ اور اُن کی دلیل وہ آیت کریمہ ہے۔ وَخَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط کیونکہ لفظ طِبَاقًا جمع ہے طبق کی۔ طبق کہتے ہیں۔ ٹھوس مادے کو۔ اور چاند پہلے آسمان پر ہے مگر ہے نیچے۔ لہٰذا چاند تک پہنچنے سے آسمان تک پہنچنا لازم نہیں آیا:۔ پہلا آسمان چاند سے بھی اوپر ہے۔ یہ فلاسفر کہتے ہیں۔ کہ ایک آسمان سونے کا ہے۔ ایک لوہے کا

وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہمارے اکثر علماءِ نجوم فرماتے ہیں۔ کہ ساتوں آسمان رقیق ہیں۔ اور دھوئیں کی شکل ہیں۔ ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے ۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا (الخ) اور دوسری آیت یہ ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ط تمام نجم اپنے اپنے آسمانوں میں گھوم رہے ہیں۔ اور میری تحقیق میں قول درست ہے۔ رقیق شئے میں تر ہونا لازم نہیں۔ دیکھو ہوا رقیق ہے مگر ہم اور ہمارے کپڑے تر نہیں ہوتے۔ حالانکہ بادل پانی سے ہے۔ ہم دھوئیں میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ مگر ہمارا ہاتھ تر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ قول بالکل غلط ہے۔ کہ رقیق ہو تو تر کیوں نہ ہوتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ آسمان مادۂ رقیق ہے۔ جیسے دھواں اور ہوا۔ مگر وہ دھواں نہیں نہ ہوا ہے جنس اُس کی کچھ اور ہے۔ قرآن کریم کا یہ فرمان کہ وَھِیَ دُخَانٌ یہاں صرف مثلیت مراد ہے۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبـــــــــــــــــــــــہ

رعد اور برق کی کیا حقیقت ہے

سوال ۲۶؎۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین مسائل ذیل میں۔ برق اور رعد کی کیا حقیقت ہے، اور حدیث کا متن نقل کر دیا جائے ۔ والسلام۔

(نور محمد ٹنڈو الٰہ یار حیدر آباد سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ط

الجوابـــــــــــــــــــ

نظریۂ اسلام کے مطابق رعد اور برق کی حقیقت موجودہ سائنس دان اور پہلے زمانے کے فلاسفہ کے عقیدے سے مختلف ہے۔ ہمارے علماء اور فلاسفہ رعد کی حقیقت کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔ کہ رعد ایک بادل کی خوفناک آواز کا نام ہے۔ جس وقت ہوائیں بادلوں کو چلاتی ہیں۔ تو بادل کے ٹکڑے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ یا بادل جب پھٹتا ہے۔ تب آواز پیدا ہوتی ہے اسی کو عرفِ عام میں بادل کا گرجنا کہتے ہیں۔ اور برق اسی روشنی کا نام ہے۔ جو بادلوں کی رگڑ سے تیزی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اسی تیزی اور گرمی سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ جس کو آسمان کی بجلی بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ تفسیر روح البیان صفحہ نمبر ۷ پر لکھا ہے :۔ وَالْمَشْھُوْرُ بَیْنَ الْحُکَمَآءِ اَنَّ الرَّعْدَ

يُحْدِثُ مِنْ اِصْطِكَاكِ اَجْرَامِ السَّحَابِ بَعْضِهَا بِبَعْضٍ اَوْمِنْ اَنْقِلَاعِ بَعْضِهَا عَنْ بَعْضٍ عِنْدَ اِضْطِرَابِهَا بِسُوْقِ الرِّيَاحِ اِيَّاهَا ط لیکن یہ نظریہ اسلام کے فرمان سے مختلف ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کے آپ کے پاس یہودی عالم حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے عرض کیا۔ کہ بتائیے۔ رعد کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک فرشتہ ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے بادلوں پر مقرر کیا ہے۔ یہودی نے عرض کیا۔ یہ کڑک کیسی ہوتی ہے۔ فرمایا یہ اِس فرشتے کی آواز ہے۔ اور برق اس شعاع کا نام ہے۔ جن کے ذریعہ وہ فرشتہ بادلوں کو چلاتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلَتِ الْيَهُوْدُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اَخْبِرْ عَنِ الرَّعْدِ الخ) قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے چنانچہ سورت رعد آیت ۱۳ میں ہے وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ الخ۔ ترجمہ۔ اور تسبیح پڑھتا ہے رعد اس کی حمد سے اس سے ثابت ہوا کہ تسبیح کا فاعل رعد ہے اور فاعل ذی عقل و حواس ہی ہو سکتا ہے۔ موجودہ سائنس دان کا بھی وہی عقیدہ ہے جو فلاسفر کا ہے۔ مگر صرف ظاہر پر نظر کرتے ہیں۔ حقیقت کو نہیں دیکھتے۔ اسلام حقیقت کو بیان فرماتا ہے۔ جس پر اس کا فیصلہ یقینی ہوتا ہے۔ جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہی نظریہ توریت اور زبور نے پیش کیا۔

سات زمینوں کی کیفیت

سوال نمبر ۱۷ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اِس مسئلہ میں۔ کہ زمین آپس میں ملی ہوئی ہے۔ یا سات زمینیں جدا جدا ہیں۔ اور ایک دوسرے سے پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ جس طرح آسمانوں میں ہے۔ اور کیا ہر زمین میں کوئی مخلوق ہے۔ اور ہر ایک زمین میں ایک نبی آیا ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن کثیر میں سورت حدید کی تفسیر میں ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر ایک زمین کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ارشاد فرمایا ہے۔ اور اسی طرح سورت طلاق آیت وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ کے تحت ایک روائیت مروی ہے۔ کہ ہر زمین میں مثل حضرت ابراہیم کے اور اس زمین کی مخلوق ہے۔ اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ کہ ہر ایک زمین پر ایک نبی آیا ہے۔ اس حدیث کا متن نقل کریں۔ جس سے زمین کا آپس میں ملا ہوا ثابت ہے۔ فقط والسلام!

(سائل :- نور محمد ٹنڈو الہ یار حیدر آباد سندھ)

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ ط

فلاسفۂ قدیم و جدید اور شریعتِ اسلامیہ کے علماء نے زمینوں کے بارے میں بہت اختلاف کیا ہے مگر صحیح مسلک یہ ہے۔ کہ زمینیں سات ہیں پیاز کی طرح چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے۔ وَقَالَ الضَّحَّاكُ مُطْبَقَةً بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ مِنْ غَيْرِ فُتُوْقٍ وَفُرْجَةٍ ط اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے۔ مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شِبْرًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى سَبْعِ اَرَضِيْنَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيْ کتاب ص۵۹ بدء الخلق باب ۲" اسی طرح ایک اور حدیث شریف ہے :۔ مَنْ ظَلَمَ قِيْدَ شِبْرٍ طُوِّقَهٗ مِنْ سَبْعِ اَرَضِيْنَ (مسلم شریف حدیث ۱۳۷ باب ۶۳ کتاب المساقاۃ صفحہ ۱۳۷) ان دونوں حدیثوں کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ جس شخص نے کسی شخص کی ایک بالشت کے برابر زمین چھینی۔ قیامت کے دن ساتوں زمینوں تک کا طوق اس کے گردن میں ڈالا جائے گا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ان تینوں قولوں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ساتوں زمینیں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ بلکہ جڑی ہوئی ہیں۔ سائل کی پیش کردہ احادیث اس مسلک میں قابلِ قبول نہیں کیونکہ وہ روایت جس میں راوی نے لکھا ہے کہ بفرمانِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر زمین کے درمیان پانچ سو سال کا رستہ ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ حدیث غریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین اس روایت کو سندِ مسلک نہیں بناتے۔ بلکہ اس کے خلافِ مسلک پیش کرتے ہیں چنانچہ اربعۃ تفاسیر جلد ششم صفحہ ص ۲۹۵ پر ہے :۔ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ سَبْعًا وَلٰكِنَّهَا مُنْبَسِطَةٌ ط مندرجہ بالا صحیح حدیث سے یہی اشارۃ النص سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ زمین اپنے پرت کے لحاظ سے سات ہیں نہ کہ علیحدہ علیحدہ اور صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے غریب حدیث کو پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اِس روایت کی اسناد میں ایک راوی حسن ہے۔ جس کے بارے میں دیگر محدثین فرماتے ہیں۔ کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ ابو قریب راوی غیر ثقہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ سائل کی پیش کردہ دوسری حدیث بالکل من گھڑت ہے اور غلط ہے :۔ تفسیر ابن کثیر نے اگرچہ یہ حدیث بالکل دیگر مفسرین کی طرح نقل کی ہے۔ مگر سب مفسرین اِس روایت کو بالکل من گھڑت بناتے ہیں۔ اِس روایت کی اسناد میں ایک راوی واقدی ہے محدثین کے نزدیک وہ بہت جھوٹا ہے اور اکثر جھوٹی روائتیں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی

جلد پانزدہم صفحہ صہ۱۴۳ میں ہے :- وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَا شَكَّ فِيْ وَضْعِهٖ وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الرُّوَاةِ الْكَذَّابِ ط مؤرخین فرماتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ یہودیوں کے قصوں سے لیا گیا ہے۔ ایسی باتیں یہودیوں کے قصوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان صفحہ ۱۴۴ پر ہے۔ عَلٰى اَنَّهٗ اَخَذَهٗ عَنِ الْاِسْرَائِيْلِيَّاتِ اَىْ اَقَاوِيْلِ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ مِمَّا ذُكِرَ فِى التَّوْرَاةِ (الخ) فَهُوَ مَرْدُوْدٌ ط یعنی یہ سب روائتیں مردود ہیں۔ عبدالحی لکھنوی نے۔ انہی مردود اسرائیلیات کی آڑ میں نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کے مثل کو ثابت کرنے کی گستاخ کوشش کی ہے :- وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ :-

کتب

ہندوؤں اور مشرکوں کی مذہبی کتب کے بارے میں تحقیقی بیان

سوال نمبر ۲۸ :- کیا فرماتے ہیں۔ علماء دین مسئلہ ذیل میں :- زید کا قول ہے :- ممکن ہے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں جنہیں وہ الہامی مانتے ہیں۔ واقعی آسمانی ہوں۔ اگرچہ ان کتابوں کو آسمانی نہ ماننے سے اور ہندوؤں کو اہلِ کتاب تسلیم نہ کرنے سے مسلمان گنہگار نہیں ہوتا۔ کیونکہ واضح طور پر قرآن پاک میں توریت، انجیل اور زبور کے ساتھ زید گیتا یا منوسمرتی کا ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی نے ہر قوم میں اپنا پیغام بھیجا۔ لہٰذا کوئی بعید نہیں۔ کہ ہندوستان میں بھی خدا کا پیغام آیا ہو۔ پھر آگے اپنے دعوے کے ثبوت میں زید چند الفاظ گیتا کے نقل کرتا ہے۔ وہ یہ ہیں "بہت سے لوگ مجھ کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرتے ہیں۔ تو میں اُن سے بے پرواہ ہوں۔ اس جملے پر خدا کے کلام ہونے کا گمان کیا جاسکتا ہے۔ اور آخر میں یہ بات ثابت کرتا ہوا یہ کہتا ہے۔ کہ اس سے ثابت ہوا۔ کہ ہندوؤں کی پرانی کتابیں آسمانی ہوں گی۔ مگر بعد میں ہندوؤں نے تحریف کر دیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ جس طرح عیسائی تثلیث کی۔ بدولت شرک میں مبتلا ہیں۔ اور انجیل کی تحریف کو خود عیسائیوں نے تسلیم کیا۔ اسی طرح ہندو مشرک بن گئے ؛ فقط والسلام

(مخلص) :- نور محمد شاد جہان پوری ٹنڈو الہٰ یار حیدرآباد سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

سوال مذکورہ میں زید سخت گنہگار ہے۔ کیونکہ غیر کتاب کو کتاب اللہ اور اللہ تعالٰی کا کلام یا کتاب کہنا سخت گناہ ہے۔ احادیث شریفہ سے ثابت ہے۔ کہ کتابیں صرف چار نازل ہوئیں۔ اور صحیح مذہب کی بنا پر صحیفے ایک سو دس نازل ہوئے۔ کتابوں کے نام بھی معین ہیں۔ انجیل (۲) توریت ع۲ زبور ع۴ قرآن کریم اور اللہ تعالٰی نے جن صحیفوں کے نام کچھ نہیں رکھے۔ اُن کو صحیفہ ہی کہا جاتا ہے۔ اور وہ صحیفے بھی چند مخصوص انبیاءِ کرام پر نازل ہوئے۔ جن کا ذکر واضح طور پر قرآن و حدیث میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ چنانچہ تفسیر القرآن روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ع۲۱۱ پر ہے:۔ رُوِیَ اَنَّ جَمِیْعَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتَابٍ مِائَۃٌ وَّاَرْبَعَۃُ کُتُبٍ اُنْزِلَ عَلٰی اٰدَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَشْرُ صُحُفٍ وَعَلٰی شِیْثَ عَلَیْہِ السَّلَامُ خَمْسِیْنَ صَحِیْفَۃً وَعَلٰی اِدْرِیْسَ عَلَیْہِ السَّلَامُ ثَلَاثِیْنَ صَحِیْفَۃً وَعَلٰی اِبْرَاھِیْمَ عَشْرَ صَحَائِفَ وَالتَّوْرَاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَالزَّبُوْرَ وَالْفُرْقَانُ وَفِی التَّیْسِیْرِ صُحُفُ شِیْثٍ وَھِیَ سِتُّوْنَ وَصُحُفُ اِبْرَاھِیْمَ وَھِیَ ثَلَاثُوْنَ وَصُحُفُ مُوْسٰی قَبْلَ التَّوْرَاۃِ وَھِیَ عَشَرٌ وَالتَّوْرَاۃُ وَالْاِنْجِیْلُ وَالزَّبُوْرُ وَالْقُرْاٰنُ ۵

ترجمہ:۔ ایک روایت یہ بھی ہے۔ کہ کُل کُتُب جو اللہ تعالٰی نے نازل فرمائیں۔ وہ ایک سو چار ہیں دس صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر اور پچاس حضرت شیث علیہ السلام پر اور تیس حضرت ادریس علیہ السلام پر اور دس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر کُل ایک سو اور چار کتابیں۔ تفسیر تیسیر البیان میں ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام پر ساٹھ نازل ہوئے۔ اسی طرح کُل ایک سو دس صحیفے بنتے ہیں۔ وَھُوَ الْاَصَحُّ چنانچہ تفسیر عزیزی جلد دوم صفحہ نمبر ع۱۴۹ پر ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ تعالٰی عنہ آزاں حضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم پرسید کہ از باری تعالٰی چند کتب نازل شدہ است الخ۔ در حاشیہ کشاف صد و چہاردہ آوردہ است۔ دہ صحیفہ ازآں جملہ بر حضرت موسٰی سوائے تورات زیادہ کردہ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ ط

لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ آسمانی کتابیں صرف ایک سو چودہ ہیں۔ جن میں ایک سو دس صحیفے اور چار نام والی کتابیں۔ تمام کی تمام مخصوص۔ مندرجہ بالا انبیاءِ کرام پر نازل ہوئے۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے۔ و یلدیا گیتا بھی اللہ کی کتاب ہو سکتی ہے۔ وہ سخت فاجر ہے نبی پاک نے فرمایا۔ کہ مَنْ کَذَبَ عَلٰی مُحَمَّدٍ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ یعنی جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ گھڑا۔ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔ جب نبی پاک کے کلام میں اتنی احتیاط ہے۔ تو غیر خدا کے کلام کو کلام اللہ کہنا کہاں جائز ہوگا۔ زید کو توبہ کرنی چاہیئے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

کششِ زمین کے سائنسی عقیدے کی تردید

مسئولہ المنیٰ ۲۹:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل ذیل میں :- (۱) زید کا قول ہے۔ کہ آپ نے اپنے ایک فتوای میں فرمایا ہے کششِ زمین کا بیہودہ عقیدہ ہے۔ زید کہتا ہے۔ کہ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ زمین میں کشش ہے۔ اور اس پر چند دلائل کا ذکر کیا ہے۔ اور کہا کہ مولانا صاحب کے پاس کیا دلائل ہیں وہ اپنے دلائل سے مطلع فرمائیں۔ اس کے دلائل یہ ہیں:- (۱) اگر زمین میں کشش نہ ہو۔ تو کوئی چیز زمین پر نہیں ٹھہر سکتی (۲) ہوا زمین کی گرفت میں کیوں ہے (۳) کوئی چیز اگر یہاں پر تول کرو۔ تو کچھ ہے۔ اور دوسری جگہ تول کرو۔ تو کچھ ہوتا ہے۔ وزن کم زیادہ کیوں ہوتا ہے۔ وغیرہ دلائل ہیں۔ سوال ۲: تارہ کیوں ٹوٹتا ہے۔ اس کا شرعی نقطہ کیا ہے۔

فقط والسلام :- نور محمد ٹنڈو الہیار حیدرآباد سندھ مورخہ ۱۸-۷-۶۷ء

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

۱:- کششِ زمین کے بارے میں فلاسفر اور سائنسدان حضرات کا اختلاف ۱۶۶۵ء سے شروع ہوا جب کہ مشہور سائنسدان نیوٹن نے سیب کے گرنے سے کششِ زمین کے قاعدہ کو گھڑ کر تمام پچھلے سائنس دانوں کے بڑے بڑے قولوں کو ٹھکرا دیا۔ اس سے پہلے کے تمام سائنسدان اور فلاسفر کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ کائنات کے ہر جسم جو ہر میں میلان تحتی کی وجہ ہے۔ اس پر بے شمار دلائل وارد ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کروں گا۔ چونکہ ہر دعوے کے لیے دلیل اشد ضروری ہے۔ لہٰذا میں ہر دو فریق کے دعوے اور دلائل کا ذکر بالوضاحت کر کے اپنے مسلک اور اپنی تحقیق کو بیان کروں گا۔ سائنسدان لوگوں کا دعویٰ ہے۔ کہ کائنات کے ہر جسم میں قوتِ تجاذب موجود ہے۔ حالانکہ وہ صرف زمین میں ہی جذب کی قوت مانتے تو شاید عقلاً اس کو تسلیم کر لیتے مگر ہر جسم میں قوتِ کشش کے ماننے سے اس عقیدے کو اور بھی مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ یہ عقیدہ ۱۶۶۵ء میں نیوٹن نے ایجاد کیا۔ جس کو سب موجودہ سائنسدان تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک

سیب گرنے سے نہ اس سے پہلے کسی سائنسدان کو ہوش آیا۔ نہ خود نیوٹن نے ہی اِس سے پہلے چیزوں کے گرنے سے یہ کشش معلوم کی۔ اور سائنسدان جس طرح اپنے اور قوانین کے بارے میں بہت اختلاف کرتے ہیں۔ اِسی طرح اس عقیدے پر بھی ان کا حتمی اور یقینی فیصلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض سائنسدان کہتے ہیں۔ کہ نیوٹن سے پہلے یہ عقیدہ نہیں تھا۔ اس نے یہ عقیدہ سیب کو گرتے ہوئے دیکھ کر بنایا۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ نہیں بلکہ نیوٹن سے پہلے ایک سائنسدان کیپلر گزرا ہے۔ جس نے گردشِ سیارگان کے لیئے تین قانون بنائے اِس کے تیسرے قانون سے نیوٹن نے قوتِ جاذبہ اخذ کی۔ ہمارے فلاسفر کا عقیدہ ہے۔ کہ کسی جسم میں بھی قوتِ جاذب نہیں ہے۔ بلکہ ہر جسم میں طبعی طور پر قوتِ میلان ہے۔ جس کی وجہ سے ہر چیز نیچے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ چنانچہ فلسفہ کی مشہور کتاب ہدیہ سعیدیہ صفحہ نمبر ص۵۵ پر ہے:۔ فِیْ اَنَّ کُلَّ جِسْمٍ لَا بُدَّ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ فِیْهِ مَبْدَءُ مَیْلٍ مُسْتَقِیْمٍ مُسْتَدِیْرٍ ۵ موجودہ سائنسدان کے دلائل بالکل وضاحت سے مندرجہ ذیل ہیں۔ ع۱:۔ ہر جسم کشش کرتا ہے۔ کیونکہ سن ۱۷۴۰ء میں بوگیر نے پہاڑ پر تجربہ کیا۔ ایک گیند کو پہاڑ کے ساتھ باندھ کر لٹکایا۔ تو پہاڑ نے اِس کو اپنے ساتھ کشش کر لیا۔ دلیل ع۲ سن ۱۷۷۵ء میں سکلین نے بوگر کے تجربہ کو غلط قرار دیا۔ اور پہاڑ پر نیا تجربہ کر کے قوتِ جذبات ثابت کی:۔

دلیل نمبر ع۳:۔ سن ۱۷۹۸ء میں کیونڈش نے پچھلے تجربوں کی غلطیاں خامیاں نکالتے ہوئے اُن کو غلط قرار دیا۔ اور اپنا نیا تجربہ کیا۔ لوہے کی سلاخ سے تجربہ کیا۔ اور قوتِ کشش ثابت کی

دلیل ع۴:۔ سن ۱۸۸۴ء میں ابرلی نے کان میں تجربہ کیا۔ اور قوتِ جاذب ثابت کی:۔

دلیل ع۵:۔ سن ۱۸۸۱ء میں خان جالی نے پچھلے تمام تجربوں کو غلط قرار دیا۔ اور ترازو سے تجربہ کر کے نیوٹن کے قاعدے کی جان بچائی۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے دس سائنسدانوں نے تجربے کیئے۔ مگر موجودہ سائنسدان سب کے تجربوں کو غلط کہتے ہیں۔ صرف بوائز اور ھیل کے تجربوں کو درست مانتے ہیں۔ جس نے سن ۱۹۳۰ء میں تجربہ کر کے پچھلے سائنسدانوں کو جھٹلایا۔ اور اس کے بعد اب تک کوئی سائنسدان پیدا نہ ہوا۔ جس نے ایسا تجربہ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی اور تجربہ کر کے ھیل کے تجربہ کو بھی غلط کہہ دے۔ سائنسدان کے پاس موجودہ قاعدہ تجاذب پر صرف یہی دلائل ہیں۔ جو کہ میں نے نقل کر دیئے۔ جو دلائل سائل نے سوال میں پیش کیے۔ وہ آج تک کسی سائنسدان کو نہ سوجھے۔ نہ ہی کوئی ذی عقل ان کو صحیح تسلیم کرنے کے لیئے تیار ہے بہر حال جتنے بھی دلائل کششِ اجسام کے بارے میں نقل کیئے گئے ہیں۔ یا سائنسدان دیتے ہیں وہ سب لغو ہیں اور اسلام ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ چند وجہوں سے۔ پہلی وجہ ع۱:۔ قوتِ جاذبہ

اور قوت کشش یا نافرہ یہ سب منطقی قاعدے کے لحاظ سے مادیات، کی چھ قسمیں ہیں۔ جن میں سے چوتھی قسم مشاہدات ہیں۔ مگر آج تک بغیر تجربہ کے کسی سائنسدان کو اس کشش کا مشاہدہ نہ ہوا۔ حالانکہ مقناطیس کی کشش کا دن رات مشاہدہ ہوتا ہے۔ (۲) سمندر کے کنارے جہاز بغیر کسی رکاوٹ کے کھڑا رہتا ہے۔ زمین اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ حالانکہ سمندر کے اندر کسی جگہ مقناطیس کا پہاڑ آ جائے۔ تو جہاز کو فوراً کھینچ لیتا ہے۔ اور جہاز ڈوب جاتا ہے (۳) ڈھلوان زمین یا کسی پہاڑی زمین پر چھوٹی چیز پھسلتی ہوئی نیچے آ جاتی ہے۔ اگر زمین میں یا ہر جسم میں کشش ہوتی۔ تو ہر چیز نیچے ہی کیوں گرتی۔ دیواروں سے کیوں نہ چمٹتی:۔ (۴) بفرض محال اگر زمین میں قوت جذب ہوتی۔ تو ایک گڑھے میں کھڑا ہوا انسان صرف نیچے ہی کیوں گرتا ہے۔ دائیں بائیں کی زمین اپنی طرف کیوں نہیں کھینچتی:۔ (۵) ہم ہاتھ کو زمین کے قریب لے جاتے ہیں۔ مگر ہاتھ زمین کے ذرّے کو بھی نہیں کھینچتا۔ اگر زمین سے ہاتھ لگا دو۔ تو بہت سے ذرات ہاتھ سے لگ جاتے ہیں۔ ایسے ہی مقناطیس کو زمین پر قریب کرو۔ تو زمین پر پڑے ہوئے لوہے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اگر زمین بھی کشش رکھتی ہے۔ تو باوجود بڑا ہونے کے اس لوہے کو مقناطیس کی پکڑ سے روکتی کیوں نہیں سائل کی دلیل ع ا غلط ہے۔ کیونکہ اشیاء کا زمین پر ٹھہرنا ان کی ساخت اور وزن کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ کشش کی وجہ سے۔ دیکھو ڈھلوان زمین پر گیند نہیں ٹھہرتی مگر مربع یا تکون شئے ٹھہر جاتی ہے۔ یوں ہی سوکھا پتہ اور تنکا نہیں ٹھہرتا مگر وزنی پتھر ٹھہرا رہتا ہے۔ اگر کشش ہوتی۔ تو سب کا ٹھہرنا برابر ہوتا۔ بلکہ ہلکی چیزیں سختی سے چمٹی رہتیں۔ مگر یہاں معاملہ الٹا ہے۔ معلوم ہوا کشش نہیں اوپر سے "تنکا پھینکو بہت دیر میں گرتا ہے۔ بھاری پتھر جلدی سے گرتا ہے۔ اگر زمین میں کشش ہوتی۔ تو مثل مقناطیس کے ہلکی چیز کو جلد کھینچتی۔ سائل کی دوسری دلیل بھی غلط ہے۔ کیونکہ ہوا ہرگز زمین کی گرفت میں نہیں۔ اور یہ ایک نیا دعوٰے ہے نہ کہ دلیل۔ اِس کے لیئے علیٰحدہ دلیل کی ضرورت ہے۔ سائل کو دلیل اور دعوٰے کے فرق کا بھی پتہ نہیں۔ تیسری دلیل بھی غلط ہے۔ وزن ہر جگہ ایک جیسا رہتا ہے۔ جس کا دن رات مشاہدہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے۔ تو یہ دلیل سائل کے مقصد کے بھی خلاف ہو گی۔ کیونکہ اس کے نزدیک چیزوں کے وزن قوت کشش کی وجہ سے ہیں۔ تو ہر جگہ کشش ایک جیسی لہٰذا وزن بھی ایک برابر۔ اگر سائل کہے۔ کہ قوتِ کشش مختلف ہے۔ تو یہ ایک علیٰحدہ دعوٰے ہوگا۔ جس کے لیئے علیٰحدہ دلیل درکار ہے

ہمارے فلاسفر اسلامی قوتِ جاذبہ کے قائل نہیں۔ بلکہ ہر جسم میں قوتِ میل مستقیم اور قوت مستدیرہ کے قائل ہیں یعنی ہر جسم طبعی طور پر نیچے کی طرف گرنے کا میلان رکھتا ہے۔ اور یہ گرنا بتقاضائے وزن ہے۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

پہلی دلیل: کتاب فلسفہ صفحہ نمبر ۵۵ پر ہے:۔ وَذَالِکَ لِاَنَّ الجِسْمَ اِقْتَضٰی اَنْ یَّجُوْزَ عَلَیْہِ الْاِنْتِقَالُ مِنْ حَیِّزٍ اِلٰی حَیِّزٍ اٰخَرَ فَلَا یَکُوْنُ ذَالِکَ اِلَّا بِمَیْلٍ مُسْتَقِیْمٍ:۔ ہر جسم کا منتقل ہونا ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف فقط اس میل مستقیم کی وجہ سے ہے

دلیل دوم:۔ صفحہ نمبر ۵۲ پر ہے:۔ وَالْقُوَّۃُ مُحَرِّکَۃٌ ھِیَ الْمَیْلُ فَوُجُوْدُ الْحَرَکَۃِ لَا یُمْکِنُ بِدُوْنِ الْمَیْلِ۔ مَثَلًا اِذَا فَرَضْنَا حَجَرَیْنِ (الخ) یعنی حرکت بغیر میلان طبعی کے ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر ہم اوپر سے دو پتھر پھینکیں۔ ایک کا وزن سیر بھر دوسرے کا وزن چھٹانک تو بھاری پتھر پہلے گرے گا۔ اور دوسرے کی حرکت ہلکی ہوگی:۔ اِنَّمَا ذَالِکَ لِاَنَّ الْمَیْلَ فِی الْاَوَّلِ اَشَدُّ (الخ) اس لئے کہ بڑے پتھر میں میلان زیادہ قوی ہے۔ اس نے جلد فضاء کو چیرا۔ اور جلدی نیچے کی طرف آیا۔ اور اور میری تحقیق بھی یہ ہے۔ کہ سوائے مقناطیس کے کسی چیز میں قوت کشش نہیں۔ قرآن مجید میں بھی کشش زمین کا انکار ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔ وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ط یعنی اللہ کے خوف سے پتھر گرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پتھر وغیرہ ہر چیز خود گرتی ہے۔ نہ کہ زمین کی کشش سے کیونکہ اس وکلمۃ النص میں خلاق کائنات نے یَھْبِطُ کا فاعل پتھر کو قرار دیا۔ جب کہ سائنسدان کشش کو قرار دیتے ہیں۔ اور بھی بہت آیات واحادیث ہیں کہ جس میں کشش کا انکار ہے اور آیت کریمہ میں پتھر گرنے کی وجہ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ہے نہ کہ کشش۔ **جواب ۱۷:**۔ آسمان سے جو تارا ٹوٹتا ہے۔ اس کو عربی میں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے شہاب کا ترجمہ "شعلہ اڑنے والا" ہے۔ اور ثاقب ثقب سے بنا ہے۔ جس کا ترجمہ سوراخ ہے۔ ثاقب کا ترجمہ سوراخ کرنے والا۔ قانون شریعت میں شہاب ثاقب وہ شعلہ ہے۔ جو رات کے وقت ستارے کی طرح کبھی اڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس شیطان کو مارا جاتا ہے۔ جو آسمان پر پہنچ کی غیبی باتیں سننے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَۃَ فَاَتْبَعَہٗ شِھَابٌ ثَاقِبٌ ۵ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَجَعَلْنٰھَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ ۵ یہ شعلہ مثل گولی کے شیطان کو لگتا ہے۔ اس لیئے ثاقب کہتے ہیں۔ اس کو ہماری اصطلاح میں تارا ٹوٹنا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ تارا نہیں ٹوٹتا۔ بلکہ تارے کی مثل شعلہ نکلتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کریمہ سے ظاہر ہے۔ کہ بنایا ہم نے ان تاروں میں رجم شیطانوں کے لیئے۔ موجودہ سائنسدانوں کا اس میں کچھ اور نظریہ ہے:۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کسی ولی اللہ کو اللہ کے نبی علیہ السّلام سے بڑھانے کا کفریہ عقیدہ

سوال نمبر ۳۰: کیا فرماتے ہیں۔ علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص اپنے پیر کے حق میں ایسے شعر لکھتا ہے۔ کہ جن میں اپنے پیر کو انبیاء سے زیادہ بڑھاتا ہے۔ یہاں تک کہ مندرجہ ذیل اشعار میں حضرت یوسف علیہ السّلام کی توہین کرتے ہوئے۔ اپنے پیر کا خادم بنایا ہے۔ اس شخص کا اپنا نام اسحاق ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

سوہنا گارڈ عرفان دیاں گڈیاں دا
سرور سخی ھادی دو جہان والے
یوسف جیسے لکھاں اہدے ہین خادم　　ایسا حسن میرے سخی سلطان والے
اہدی دید دی عیدی سک اگو　　چاہ جنت دا ناں حور و غلمان والے
اہدے قدماں دا صدقہ اسحاق صدقے
عاجز وچ جنت موجاں مان والے

فرمایا جائے۔ ایسے شخص کا شریعت میں کیا حکم ہے:۔

سائل:۔ صدرالدین لوہدی مقام ٹانڈہ موٹا ضلع گجرات

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

اَلْجَوَاب

قانون شریعت کے مطابق سوالِ مذکورہ والے اشعار لکھنے والا کافر ہو گیا ہے۔ یہ شعر کسی انسان کیلئے لکھنے درست نہیں۔ ہاں نبی پاک کی شان میں ایسے شعر لکھنے جائز ہیں۔ اگر یہ اشعار مذکورہ فی السوال اسحاق نامی شاعر نے نبی پاک کیلئے لکھے ہیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ شاعر مذکور کی یہ نیت نہیں وہ کسی پیر کیلئے ہی یہ لغویات کر رہا ہے۔ جیسا کہ سیاق و سباق الفاظ اشعار سے بالکل صاف ظاہر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسے شعر نبی کریم کیلئے بنائے تو گناہ نہیں۔ کیونکہ تمام انبیاء اور ملائکہ اور جملہ مخلوق آقا دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اُمتی ہیں اور اُمتی نبی کے خادم ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت فریدالدین عطار پندنامہ میں نعت لکھتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

آنکہ آمد نُہ فلک معراج او　　انبیاء و اولیاء محتاج او

ترجمہ:۔ نبی کریم کی شان یہ ہے۔ کہ نو آسمان آپ کی معراج بن ہیں۔ اور تمام انبیاء اور اولیاء آپ کے محتاج ہیں۔

مولانا روم صاحب ارشاد فرماتے ہیں :-

اے ہزاراں جبرائیل اندر بشر

بہر حق سوئے غریباں یک نظر

نبی پاک کی شان یہ ہے۔ کہ ہزاروں جبرائیل آپ کے آستانے پر کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں۔ خدا کے لیے ہم غریبوں کی طرف ایک نظر رحمت ہو۔ اور اگر اس شخص نے یہ شعر اپنے کسی پیر کے لیئے بنائے ہیں۔ تو یہ شخص مردودِ ازلی ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگر اس کا پیر کسے باشد حیاتِ ظاہری میں ان اشعار اور اپنی طرف نسبت سے راضی تھا۔ تو وہ پیر بھی مردودِ ازلی ہے۔ کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں بعد خدا رب العزت آقائے دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ اور شان ہے۔ آپ کے بعد تمام انبیاء مرسلین کا درجہ ہے، انبیاء عظام کے بعد سب مخلوق سے صدیق اکبر کی شان بلند ہے۔ چنانچہ علم عقائد کی مشہور کتاب نبراس صفحہ نمبر ۵۸۴ اور مستدرک حاکم میں حدیث شریف حضرت ابوہریرہ سے مرقوم ہے :- اِعْلَمْ اَنَّ الْمَذْهَبَ عِنْدَ اَهْلِ السُّنَّةِ مَا رَوَاهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ عَدِيٍّ وَالْخَطِيْبُ اَنَّ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ۔ خَيْرُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ وَخَيْرُ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَخَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِيْنَ اِلَّا النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ ؕ :- یعنی حضرتِ صدیق و حضرت فاروق، انبیاء و مرسلین کے بعد تمام زمین و آسمان والوں سے افضل ہیں۔ ثابت یہ ہوا۔ کہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہم کا درجہ حضرت جبرائیل، میکائیل و اسرافیل سے بھی زیادہ ہے۔ اگرچہ وہ رُسلِ ملائکہ ہیں۔ اس لیئے کہ حضرتِ صدیق اکبر کی شان میں جہاں کہیں افضل الخلق بعد الرسل آیا ہے وہاں رُسل سے صاحبِ شریعت نبی مراد ہیں نہ کہ رسول، فرشتے جس طرح اعلیٰ حضرت اپنے سلام میں ارشاد فرماتے ہیں :-

یعنی وہ افضل الخلق بعد الرسل ثانی اثنین ہجرت پہ لاکھوں سلام۔ یہاں بھی لفظِ رُسل سے (۱) موسیٰ علیہ السلام (۲) حضرت داؤد علیہ السلام (۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام (۴) آقائے دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم صاحب کتاب ہیں خیال رہے کہ یہ تقسیم قانون شریعت کے مطابق ہے۔ اور یہ اسماء معینہ و متفرقہ اصطلاحِ شرعی کے اعتبار سے ہیں۔ لہٰذا اس پر سورۃ صٰفٰت پارہ نمبر ۲۳ کی اِن آیات اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ؕ وغیرہ سے اعتراض دو وجہ سے غلط ہے۔ (۱) ان آیات میں لغوی معنیٰ مراد ہے۔ یعنی بھیجا ہوا۔ نہ کہ بمعنی مرسل اصطلاحی یعنی صاحب کتاب نبی :(۲) قرآن کریم پر اصطلاح فقہاء لازم نہیں۔ اس کا اپنا مقام اس کا اپنا مقام، نبراس کی عبارت اور

اعلیٰ حضرت کے اس شعر میں لفظِ مرسلین اور رسل سے صاحب کتاب اور صاحبِ شریعت نبی مراد ہیں۔ صاحب شریعت نبی ہی رسول ہیں۔ ورنہ اگر رسول فرشتہ مراد لیا جائے۔ کہ جس طرح بعض نے کہا ہے۔ تو لازم آئے گا۔ کہ جبرائیل علیہ السلام وغیرہ، غیر رسول نبی سے بھی معاذ اللہ افضل ہو جائیں۔ کیونکہ علم عقائد میں رسول کا درجہ نبی سے زیادہ ہے کہ رسول خاص صاحب شریعت ہوتا ہے۔ اور نبی عام ہے۔ بعض انبیاء محض صاحب تبلیغ تھے۔ اُن سے رسول کا درجہ زیادہ اور رسول سے مُرسل کا درجہ بلند۔ پہلا درجہ نبوت پھر اُس کو ہی صاحب شریعت بنا دیا جائے۔ تو رسول اور اگر رسول کو کتاب عطا ہو۔ تو مُرسل انبیاء ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں رسول تین سو تیرہ مُرسل صرف چار ۱ موسےٰ علیہ السلام ۲ حضرت داؤد ۳ حضرت عیسےٰ ۴ آقائے دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم خیال رہے کہ مقتابہ قول یہ ہے۔ صدیق و فاروق کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام کا درجہ سب سے بلند ہے۔ چنانچہ کتب فقہ و عقائد میں ہے :۔ رُسُلُ الْمَلٰئِکَۃِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّۃِ الْبَشَرِ یعنی رسل ملائکہ عام مسلمانوں سے افضل ہیں :۔ جن میں صحابہ کرام، اولیاء، علماء، سب شامل ہیں۔ صدیق و فاروق بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں مگر دیگر احادیث نے ان کی افضلیت علےٰ سائر مخلوق بیان کرکے اس حکم سے خارج کر دیا۔ کبیری ص۴۸۲ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا درجہ نبی سے کم ہے مگر رسول کا درجہ نبی سے زیادہ چنانچہ شرح عقائد میں ہے :۔ وَالرَّسُوْلُ اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اِلَی الْخَلْقِ لِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ الشَّرْعِیَّۃِ فَقَدْ یُشْتَرَطُ فِیْہِ الْکِتَابُ بِخِلَافِ النَّبِیِّ فَاِنَّہٗ اَعَمُّ اور نبراس میں صفحہ نمبر ص۸۰ پر ہے :۔ قَوْلُ الْجُمْہُوْرِ اَنَّ النَّبِیَّ اَعَمُّ :۔ جہاں کہیں بھی مطلق لفظِ رُسُل استعمال ہوتا ہے۔ وہاں صاحبِ شریعت نبی ہی مراد ہوتا ہے۔ نہ کہ حضرت جبرائیل وغیرہ۔ حضرت جبرائیل کو رسول صرف لفظاً بمعنیٰ قاصد کہا جاتا ہے۔ اس معنیٰ میں ہر اہلِ عرب اپنے قاصد کو رسول کہہ دیا کرتا ہے۔ جیسا کہ متعدّد احادیثِ مشہورہ میں رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آتے ہیں :۔ پس ثابت ہوا۔ کہ مستدرک حاکم کی حدیث کے مطابق حضرت صدیق اکبر کی شان بعد رسول و انبیاء سب فرشتوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور انسانوں سے بھی اس لیے شرح عقائد صفحہ نمبر ص۱۰۷ پر ہے :۔ وَاَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ الْاَنْبِیَاءِ اَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ ط اور خیالی شرح عقائد نسفی صفحہ نمبر ص۱۴۲ پر ہے قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَاللّٰہِ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی اَحَدٍ اَفْضَلَ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ ط :۔ اس حدیث میں لفظِ رسول بھی ترک فرما دیا۔ تاکہ فضیلت جبریلی کا کوئی شبہ نہ پیدا کر سکے۔ شرح خیالی میں آگے ارشاد فرمایا :۔ وَبِہٖ یَظْہَرُ اَنَّ اَبَا بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ اَفْضَلُ مِنْ سَائِرِ الْاُمَمِ ط یعنی اس مندرجہ ذیل حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ابوبکر صدیق

تمام کائنات کی امتوں سے افضل ہیں۔ لہٰذا حضرتِ جبرائیل سے افضل ہوئے۔ کہ وہ بھی امم میں داخل ہیں۔ صدیق اکبر کے بعد باقی صحابہ درجہ بدرجہ پھر تابعین، پھر تبع تابعین کی شان ارفع واعلیٰ ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۵۵۲ پر ہے:۔ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ اُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ (الخ) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ کائنات میں کوئی بھی غوث، قطب، ابدال، اوتاد، افراد، محدث، مفسر وغیرہ یا کوئی پیر کسی صحابی کے گردِ قدم کو نہیں پہنچتا چہ جائیکہ کوئی معمولی پیر کسی نبی سے افضل ہو۔ (اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ) جس شخص نے اپنے پیر کے لیے یہ شعر بنا۔ یا منسوب کیے۔ اگر اسی عقیدے پر ہے۔ تو مرتد ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی توہین وگستاخی ہے اور کسی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کفر ہے۔ لہٰذا اس شخص کو چاہیئے۔ کہ فوراً دوبارہ کلمہ پڑھ کر توبہ کرے۔ اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے۔ اور بطور شرعی تعزیر ستّر مساکین کو کھانا کھلائے اِسی طرح وہ جاہل نعت خوان اور گمراہ واعظین جو کسی بھی گدی نشین کی موجودگی میں نبی کریم رؤف الرحیم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے نعتیہ اشعار اُس جاہل پیر گدی نشین کی طرف صرف چند روپوں کے لالچ میں منسوب کر دیتے ہیں۔ وہ سب گمراہ اور گمراہ گر و بدبخت ہیں:۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

حضرت خضر علیہ السّلام کے نبی ہونے کا بیان

سوال نمبر ۳۱:- کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام بنی اسرائیل کے ولی تھے۔ مولوی قاسم نانوتوی نے بھی یہی کہا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ اور پھر زید یہ کہتا ہے۔ کہ بہت دفعہ ولی نبی کے درجے سے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ موسےٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے علم سیکھنے گئے تھے۔ لہٰذا استاد کا درجہ شاگرد سے یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔ زید اپنے اِس مضبوط عقیدہ پر قائم ہے۔ فتوٰی صادر فرمایا جائے۔ اور بتایا جائے۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام نبوت کے درجے پر ہیں۔ یا صرف ولایت کے درجے پر:۔

سائل:- شہاب الدین مقام وڈاکخانہ سہارن پور انڈیا ہندوستان ۔ ۲۲ ؍ ۴ ؍ ۷۷

الجواب ـــــــــ بعون العلام الوھاب

حضرت خضر علیہ السلام اپنے وقت کے نبی تھے۔ آپ کا نام شریف بلیا ابن ملکان ہے۔ آپ ابھی تک اپنی حیات ظاہری میں دنیا پر جلوہ افروز ہیں۔ اولیاء کاملین سے ملاقاتیں فرماتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بیداری کی حالت میں دوپہر کے وقت جمعہ کے دن دیدار اور گفتگو سے مشرف فرمایا۔ بعض اولیاء اللہ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام اولیاء کاملین سے ملاقات فرماتے ہیں۔ بلکہ اُن خوش نصیبوں سے ملاقات فرماتے ہیں جن کو ابدالیت کا درجہ ملنے والا ہو۔ ہر روز عالم کی سیر فرماتے ہیں۔ حضور اقدس کے تشریف لانے کے بعد سے اب تک اشراق کے نفل ریاض الجنت میں ادا فرما کر نبی اکرم حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے کر دورہ کائنات کی ابتدا فرماتے ہیں۔ حضور غوث پاک کے روحانی پیشوا ہیں۔ اب نبی پاک کی امت کے تمام اولیاء کے سرپرست ہیں۔ سب سے پہلے دجّال سے انہیں کا مناظرہ ہوگا۔ جس کا حدیث پاک میں ذکر ہے۔ خیال رہے کہ چار انبیاء کرام اب تک اپنی حیات ظاہری میں جلوہ افروز ہیں۔ چنانچہ اشعۃ اللمعات جلد چہارم صفحہ ۲۷۶ پہ ہے از امام محی السنہ نقل کردہ اند کہ چہار کس از انبیاء زندہ اند دو بر زمین خضر و الیاس و دو بر آسمان ادریس و عیسیٰ اور تفسیر روح البیان جلد دوم صفحہ ۲۱۹ اور جلد ہفتم صفحہ ۲۸۱ پر ہے اَرْبَعَۃٌ مِّنَ الْاَنْبِیَاءِ اَحْیَاءٌ اثنان فی السماء عیسیٰ وادریس واثنان فی الارض الخضر و الیاس ترجمہ۔ ہر سہ عبارت کا ترجمہ۔ اور مطلب یہ ہے کہ (۱) حضرت خضر علیہ السلام (۲) حضرت الیاس علیہ السلام۔ یہ دو بزرگ زمین پر تشریف فرما ہیں۔ ہر سال حج ادا فرماتے ہیں۔ اور رمضان میں ایک دوسرے کا حلق فرماتے ہیں۔ اس وقت جو کلمات ان دونوں بزرگوں کے زبان مبارک سے ادا ہوتے ہیں۔ جو ان کلمات کا وظیفہ رات کو سونے سے پہلے پہلے پڑھے۔ وہ چالیس دن میں ولی اللہ بن جاتا ہے (۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ (۴) حضرت ادریس علیہ السلام جنت میں بحیات ظاہر تشریف فرما ہیں۔ سوال مذکورہ کے زید اور قاسم نانوتوی دیوبندی کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت خضر محض ولی اللہ ہیں۔ باطل اور غلط ہے۔ جن مفسرین نے بھی آپ کو اولیاء میں شمار کیا ہے۔ وہاں اصطلاحی ولی مراد نہیں۔ بلکہ لغوی ولی یعنی مددگار اور ولایت الٰہیہ کا مالک مراد ہیں۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بھی ولی ہیں۔ اور انبیاء کی ولایت تمام صحابہ کی ولایت سے زیادہ ہے اور تمام صحابہ کی ولایت اولیاء اصطلاحیہ کی ولایت سے زیادہ ہے اور تمام معروف اولیاء کی ولایت علماء کی ولایت الٰہیہ سے زیادہ۔ جمہور علماء و محققین کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام بہت عظمت والے نبی ہیں چنانچہ تفسیر روح البیان جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۹۰ پر ہے:۔ وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى اَنَّهٗ نَبِیٌّ غَیْرُ مُرْسَلٍ ط یعنی اکثریت علماء کرام کی اس بات پر متفق ہے۔ کہ حضرت خضر نبی غیر مرسل غیر صاحب کتاب ہیں۔ اسی طرح تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۸ پر ہے وَاٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ای نبوۃً فی قولٍ و ولایۃً فی اُخریٰ۔ بڑی جماعت نے حضرت خضر علیہ السلام کو صحیح مذہب کی بنا پر نبی فرمایا۔ اور ایک قول میں ولی کہا گیا۔ تفسیر بیضاوی پارہ پندرہ صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے:۔ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ھی الوحی والنبوۃ۔ تفسیر مدارک پارہ پندرہ اسی آیت کی تفسیر میں ہے۔ ھی الوحی والنبوۃ ط الی بجع تفاسیر۔

تفسیر ابن عباس میں ہے۔ اسی آیت کے ماتحت :۔ یَقُوْلُ اَکْرَمْنَاہُ بِالنُّبُوَّۃِ ط تفسیر صاوی جلد سوم میں ہے :۔ اِلٰی نُبُوَّۃٍ فِی قَوْلٍ وَقَدْ صَحَّحَہٗ جَمَاعَۃٌ ط پس ثابت ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام برحق نبی تھے جو محققین کرام آپ کی نبوت کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل یہ بھی ہے۔ کہ رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔ وَاٰتَیْنٰہُ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا یعنی ہم نے خضر کو اپنے پاس سے رحمت فرمائی۔ اور قرآن کریم میں اکثر مقام پر رحمت سے نبوت اور وحی ہی مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے فرمان کو تفسیر روح البیان نے ثبوتِ نبوت کے لیے دلیل بنایا۔ چنانچہ روح البیان جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۸۲ پر ہے :۔ قَالَ اِمَامُ الْمُسْلِمِ اَنَّ النُّبُوَّۃَ رَحْمَۃٌ کَمَا فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّکَ الخ ط (آیت ۳۲ سورۃ زخرف پارہ ۲۵)۔

گویا کہ اصل رحمت، وحی اور نبوت ہے۔ رحمت دوسرے معنوں میں بالتبع یا مجازاً ہے۔ اسی بنا پر محققین فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تمام جہانوں پرند، چرند، جمادات و نباتات، جن و ملک وانس کے نبی ہیں۔ کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ط دوسری دلیل سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَۃً مِّنَّا ط یہاں بھی رحمت سے مراد نبوت ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں۔ نہ کہ ولی۔ اگرچہ حضرت خضر نبی ہیں مگر چونکہ رسول یا مرسل نہیں۔ اس لیے آپ سے حضرت موسےٰ کا مقام و درجہ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ زیادہ اور چونکہ حضرت خضر صرف طریقت معرفت کے نبی ہیں اور حضرت موسیٰ صرف شریعت کے جامع کمالات تو صرف ہمارے نبی ہی ہیں اور شریعت کا مقام طریقت سے زیادہ ہے اس لیئے حضرت موسیٰ کا درجہ حضرت خضر سے زیادہ ہے حضرت موسیٰ خضر علیہ السلام کے پاس طریقت سیکھنے کے ارادے سے تشریف لائے تھے مگر علم سیکھا ہوتا تو حضرت خضر کا درجہ بڑھ جاتا۔ کیونکہ استادِ دینی و مرشدِ برحق کا درجہ ہمیشہ زیادہ ہوا رہتا ہے حضرت موسیٰ کا علم بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ علمِ شریعت زیادہ وسیع ہے علمِ طریقت سے آپ کا حضرت خضر کے پاس جانا کمی علم کی بنا پر نہ تھا بلکہ حصولِ زیادتی علم کی بنا پر۔ مگر وہ علم آپ کے لیے غیر ضروری تھا اسلیے رہنے سیکھنے نہ دیا ایسا ہی تفسیر صاوی جلد سوم و روح البیان جلد پنجم میں ہے اب جو شخص یہ کہے کہ معاذ اللہ نبی سے غیر نبی کا درجہ بڑھ جاتا ہے وہ جاہل و بے دین ہے خیال رہے۔ کہ حضرت خضر کسی قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے نہ آپ کو عام تبلیغ فرض تھی۔ بلکہ مشائخ و صوفیا کی طرح یہ علم سینہ بسینہ اور اسرارِ الٰہیہ میں سے ہوتا ہے۔ خواص ہی کو عطا کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ بلیا ابن ملکان ابن فالح ابن عام ابن شالخ بن ارفخشد ابن سام ابن نوح علیہ السلام۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اولاد شیث میں سے ہیں۔ (تفسیر مظہری سورۂ یونس پارہ ۱۱ جلد پنجم) :۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

حضرت شاہ دولہ دریائی کی ڈوبی برات کا بارہ برس بعد نکالا جانا

سوال نمبر ۳۴۲ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ غوث پاک کی مشہور کرامت ہے۔ کہ آپ نے بارہ برس کا ڈوبا بیڑا تراد یا تھا۔ اس کی فوٹو بھی بازار میں ملتی ہے۔ مگر اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ فرمایا جائے کیا یہ کرامت سچی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ غلط اور بناوٹی ہے۔ وہ لوگ کراماتوں کا بالکل انکار کرتے ہیں۔ براہِ کرم ہم کو اس کا ثبوت عطا فرمایا جائے :- سائل محمد لطیف ریل بازار گوجرانوالہ - نزد گھنٹہ گھر - ۸ / ۱۱ / ۵

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

مسلک اہلسنت یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات برحق یعنی بالکل درست اور صحیح ہیں۔ یہی تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے پہلے زمانوں میں معتزلی فرقہ اس کا منکر ہوا پھر خارجیوں نے اس کا انکار کیا۔ اور آج کل دیوبندی وہابی اور غیر مقلد وہابی اس کے منکر ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معتزلیوں کا ہی دوسرا نام وہابی ہوا۔ اور تیسرا نام خارجی ہوا یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کے تقریباً تمام باطل عقائد کو وہابیوں نے شروع کیا ہوا ہے۔ انھیں گندے اور کفریہ عقائد میں سے ایک انکارِ کراماتِ اولیاء ہے۔ حالانکہ یہ تجربات کے علاوہ قرآن و حدیث کی عبارات کثیرہ و روایات عدیدہ و آیاتِ حمیدہ سے بھی ثابت و ظاہر ہے۔ اور نقلاً عقلاً و تجرباً اس کے بہت دلائل ہیں۔ اس لیئے کہ قانون شریعت کے مطابق افعالِ باری تعالٰے عَمَّ اِسْمُہٗ دو قسم کے ہیں ایک قسم افعال قانونیہ۔ دوسری قسم افعالِ قدرت افعالِ قانونیہ ملائکہ کے ذریعے کرائے جاتے ہیں۔ جن کو تدبیر بھی کہا جاتا ہے۔ اور ان کے کارندوں کو مدبراتِ امر کہا جاتا ہے۔ ان فرشتوں کے ذمے تمام کائنات کے انتظامی امور ہوتے ہیں۔ جیسے جان ڈالنا زندہ کرنا۔ مارنا۔ رزق دینا بارش برسانا وغیرہ وغیرہ۔ افعالِ قدرت دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم معجزہ جس کا ظہور انبیاء عظام سے ہوتا ہے۔ دوسری قسم کرامات۔ جس کا صدور اولیاء اللہ سے ہوتا ہے۔ بڑے بڑے قدرتی کام انبیاء کرام سرانجام دیتے ہیں اور چھوٹے کام اولیاء کاملین سرانجام دیتے ہیں۔ انبیاء کرام سے جو قدرتی کام قبل اظہارِ نبوت ہو اس کو ارہاص کہا جاتا ہے۔ بعد ظہور نبوت کو معجزہ کہا جاتا ہے اور ولی اللہ سے جو بھی قدرتی کام صادر ہو جس وقت بھی ہو خواہ بچپن یا ماں کے پیٹ میں یا عالم ارواح میں یا جوانی بڑھاپے میں اس کو کرامت ہی کہا جائے گا۔ جس طرح قانونی افعال کا دوسرا نام تدبیر ہے اسی طرح قدرتی افعال

کا دوسرا نام خرقِ عادت ہے۔ بہرحال قانونی افعال ہوں یا قدرتی اُن کا فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے اور اس کے حکم سے فاعل مجازی فرشتے انبیاء کرام اور اولیاء اللہ ہیں۔ اور جس طرح حضرت عزرائیل علیہ السلام اچھے خاصے زندہ شخص کی جان نکال سکتے ہیں۔ اور نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کاملین مردہ انسان میں نکلی ہوئی جان ڈال سکتے ہیں اور جس طرح حضرت عزرائیل کا جان نکالنا اپنی ہمت و طاقت و اختیار سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ہے اسی طرح انبیاء کرام کا کسی مردہ کو زندہ کر دینا وغیرہ بھی اپنی طاقت و اختیار سے نہیں بلکہ رب قدیر کی عطا کردہ طاقت و اجازت سے ہے۔ تو جب فرشتوں کا زندہ کرنا مارنا۔ شرک کفر بدعت نہیں تو انبیاء کرام کے اِس قدرتی طاقت کے ذریعے کسی کو زندہ کرنا بھی شرک کفر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عین ایمان ہے۔ یہی وہ باریک اصلیت ہے جو وہابی گستاخ کو سمجھ نہیں آتی اُن کی نفسانی فہم صرف شانِ انبیاء و اولیاء پر بھٹکتی ہے۔ ہر بات تسلیم ہے صرف منکر ہیں تو معجزات و کرامات کے۔ ان کی سمجھ سے یہ بات جدا ہے کہ افعال قانونی ہوں یا قدرتی سب اللہ ہی کے کام ہیں۔ صرف مظہر جدا جدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افعال تدبیری ہوں یا خرقِ عادت سب کا ثبوت قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ چنانچہ قانونی افعال کا ذکر پارہ عـــ۳۰ سورتِ نازعات میں ہے۔ وَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا۔ (ترجمہ) :۔ ملائکہ ہیں جو عالم کی تدبیر انتظامی کرنے والے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (ترجمہ) ملائکہ قطعاً نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ قدرتی افعال کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں سے کراتا ہے۔ عین درست ہے۔ اور یہی اہلسنّت کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ شرح عقائد صـــ۱۰۱ پر ہے :۔ وَكَرَامَاتُ الْاَوْلِيَاءِ حَقٌّ۔ (ترجمہ) :۔ اور اولیاء اللہ کی کرامتیں ظاہر ہونا بالکل سچا عقیدہ ہے۔ فتاویٰ درِ مختار شامی جلد دوم صـــ۲۶۷ پر ہے :۔ نَقْضُ الْعَادَةِ عَلٰى سَبِيْلِ الْكَرَامَةِ لِاَهْلِ الْوِلَايَةِ جَائِزٌ عِنْدَ اَهْلِ السُّنَّةِ۔ (ترجمہ) ولایتِ الٰہیہ والوں کے لیئے عاداتِ انسانیہ کے خلاف کام کرامت کے طریقے پر اہلِ سنت کے عقیدے میں جائز ہے۔ شرح فقہ اکبر میں ملا علی قاری نے لکھا صـــ۹۵ پر ہے :۔ فَخَرَجَ غَيْرُ الْخَارِقِ كَطُلُوْعِ الشَّمْسِ مِنْ مَشْرِقِهَا كُلَّ يَوْمٍ وَالْخَارِقُ عَلٰى خِلَافِهِ۔ (الخ) فَالْكَرَامَةُ خَارِقٌ لِلْعَادَةِ :۔ (ترجمہ) پس خارج ہوا جو عادتِ خلق کے علاوہ۔ مثلاً مشرق سے سورج کا طلوع عادتِ خلق کے مطابق اور اس کا الٹ خلاف عادت ہے۔ اور کرامت عادت کے خلاف کاموں کا نام ہی ہے۔ شامی جلد دوم صـــ۲۶۸ پر ہے :۔ فَالْحَاصِلُ اَنَّ الْاَمْرَ الْخَارِقَ لِلْعَادَةِ بِالنِّسْبَةِ اِلَى النَّبِيِّ مُعْجِزَةٌ سَوَاءٌ ظَهَرَ مِنْ قِبَلِهٖ اَوْ مِنْ قِبَلِ اٰحَادِ اُمَّتِهٖ وَبِالنِّسْبَةِ اِلَى الْوَلِيِّ كَرَامَةٌ۔ (ترجمہ) :۔

قانونی فعل تو وہ ہے جو روزمرہ ہوتا ہے۔ قدرتی انبیاء عظام کے دستِ مبارک سے ہوتے پس خلاصہ یہ کہ بے شک وہ افعال جو عادتِ انسانی کے خلاف ہوں۔ وہ نبی علیہ السلام کی نسبت سے معجزہ کہلاتا ہے برابر ہے کہ ظاہر ہو اُن کی طرف سے یا ان کی امت کے کسی ولی کے ہاتھ سے اور وہی فعل بنسبت ولی اللہ کے کرامت کہلاتا ہے۔ لہٰذا قانونی موت و زندگی ملائکۂ مدبّر کے ذریعے ہوتی ہے۔ اور قدرتی موت و زندگی انبیاء کرام اولیاء عظام کے ذریعے ہوتی ہے۔ ولی اللہ کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہی ہے اور چونکہ یہ ہر دو افعال باری تعالیٰ ہی کے حکم اور رضا سے ہیں۔ اس لیئے اگر فرشتہ کسی کو موت و زندگی دے تو شرک نہیں اسی طرح اگر نبی یا ولی کسی کو موت یا زندگی عطا فرمادیں تب بھی شرک نہ ہوگا۔ وہابی دیوبندی فرشتوں کی طاقت تو تسلیم کرلیتے ہیں ان کو اگر موت آتی ہے تو انبیاء کرام کی طاقت تسلیم کرتے ہوئے۔ تمام علماءِ اسلام نہ تدبیر ملائکہ کے منکر ہیں نہ معجزے و کرامت کے اس لیئے کہ تدبیر ہو یا معجزہ یا کرامت سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ وہی ذاتِ وحدہٗ لاشریک قانون و قدرت کا مالک ہے وہ اپنے کاموں میں مختارِ کل ہے جس سے چاہے جو کام لے۔ کسی کو انکار یا دم مارنے کا حق نہیں پہنچتا۔ فی زمانہ دیوبندی جن کو وہابی کہا جاتا ہے۔ وہی دیوبندی وہابی اس کے منکر ہیں جب کہ پہلے زمانے میں معتزلی فرقہ اس کا منکر تھا۔ چنانچہ شرح فقہ اکبر ص۹۵ پر ہے۔ وَالْكَرَامَةُ لِلْاَوْلِيَاءِ حَقٌّ اَىْ ثَابِتٌ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَلَا عِبْرَةَ بِمُخَالِفَةِ الْمُعْتَزِلَةِ وَاَهْلِ الْبِدْعَةِ فِىْ اِنْكَارِ الْكَرَامَةِ۔ (ترجمہ):- کرامات اولیاء حق ہیں۔ اور حق ہونے سے مراد ہے کہ قرآن مجید اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ اور معتزلہ کی اور بدعت والوں کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں کرامت کے انکار کرنے کی صورت میں۔ ملا علی قاری کی اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اس زمانے میں جو لوگ منکرین کرامات تھے اس فرقے کا نام معتزلی تھا دوسری یہ کہ وہابی لوگ ہم کو بدعتی کہتے ہیں۔ حالانکہ بدعتی وہ ہے جو منکر کرامات اولیاء ہے۔ تو گویا خود وہابی ہی بدعتی ہوئے۔ فقہ اکبر امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اپنی تصنیف ہے اس کی شرح ملا علی قاری صاحب نے کی ہے۔ اس سے امام اعظم کا مسلک کتنا واضح ثابت ہوا کہ وہ خود فرماتے ہیں کراماتِ اولیاء نہ صرف حنفی مسلک ہے۔ بلکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ منکرِ کرامات ہر دور میں مردود اور بے اعتبار رہا۔ اور یہ کہ ان وہابیوں کا پہلا نام معتزلی تھا پھر خارجی ہوا آج کل وہابی ہے۔ اور لقبِ اصلی بدعتی ہے۔ نہ یہ حنفی نہ اہلِ سنّت۔ یہ ماڈل دیوبند میں تیار ہوتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانونی افعال فرشتوں سے کراتا ہے۔ اور قدرتی کام انبیاءِ کرام کے ذریعے اولیاء اللہ کے ذریعہ۔ جو اس کا منکر وہ رب تعالیٰ کا منکر قانونی

موت و حیات کے لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (ترجمہ):۔ فرما دیجیے موت دیتا ہے تم کو وہ ملک الموت جو تم پر مؤکّل ہے۔ اور احیاءِ قدرتی کے لیے قرآنِ پاک میں اس طرح ارشاد ہے۔ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (ترجمہ) حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں اللہ کے اذن سے۔ اللہ تعالیٰ کا اذن اور اجازت ہر کام میں لازم ہے۔ تدبیر ملائکہ بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتی ہے اور نبی کا معجزہ بھی ولی کی کرامت بھی بغیر اذن خداوندی کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو یاد رکھو کہ جس طرح ملک الموت عزرائیل علیہ السلام کی خدا داد قوت و اختیار اور قانونی ڈیوٹی نوکری کا انکار قانونِ الٰہی اور قرآن مجید کی آیت کا انکار ہے جو صراحتًا کفر ہے۔ اسی طرح معجزے اور کرامت کا انکار بھی قدرتِ الٰہیہ کا انکار ہے۔ اور قدرت کا مقابل مجبوری ہے۔ پس جب اللہ کی قدرت کا انکار ہوا تو بداہتًا اللہ کریم کی مجبوری ثابت ہو گی۔ تو جو لوگ کراماتِ اولیاء اللہ کے منکر ہیں وہ در پردہ اللہ کو مجبور سمجھتے ہیں۔ (معاذ اللہ) اسی لیے ربِّ کائنات نے ایک جگہ فرشتوں کے دشمن کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ جو میرے ولیوں کے دشمن اور منکر ہیں ان کو اللہ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کیونکہ ملائکہ قانونی کارندے ہیں اور اولیاء اللہ قدرتی کارندے۔ کرامت اور معجزہ عام ہے اسباب کو کہ وہ ہوا پر اڑنے کا ہو یا دریا چلانے کا یا مُردہ انسان زندہ کرنے کا اس عمومیت سے ثابت ہوا کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام اور ولی اللہ مُردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ سابقہ امتوں اور انبیاءِ کرام کے معجزات و کرامات کا ذکر تو قرآنِ پاک اور احادیث مبارکہ میں آگیا۔ لیکن اُمّتِ مصطفٰے علیہ التحیۃ والثنا کی کرامات کا ذکر تو کتبِ تاریخ و اذکار اور قصصِ اولیاء کی کتابوں میں ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔ اور مسلمانوں کو کرامات ماننے کے لیے ان کتب کو ماننا ہی پڑے گا۔ چنانچہ کتب اصول و عقائد و سوانحات سے معجزات و کرامات بے حد بے شمار ثابت ہیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کرنا بھی اسی خرقِ عادت میں شامل کرتے ہوئے انبیاءِ کرام اور اولیاء اللہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ شرح فقہ اکبر ص ۹۵ پر ہے:۔ اَنَّ الْمُعْجِزَةَ اَمْرٌ خَارِقٌ لِّلْعَادَةِ كَاِحْيَاءِ الْمَيِّتِ۔ (ترجمہ):۔ بے شک معجزہ امر خارق یعنی قدرتِ الٰہی ہے جیسے کہ مُردوں کو زندہ کرنا ویسے تو تمام اولیاء اللہ کی کرامات ثابت ہیں مگر حضور غوثِ پاک کی کرامات تو شمار سے باہر ہیں۔ چنانچہ حاشیہ نبراس ص ۴۸۲ پر ہے:۔ لَا تُحْصٰى۔ يَعْنِيْ مِنَ الْاَوْلِيَاءِ لَا سِيَّمَا لِلْقُطْبِ الْجِيْلِيِّ۔ ترجمہ:۔ ولیوں کی کرامتیں بے شمار مشہور ہیں۔ خاص کر قطبِ عالم غوثِ پاک جیلانی کی کرامات تو بہت ہی

زیادہ مشہورِ عالم ہیں۔ یہ سب کرامتیں تاریخ اور تصوف سیر کی کتابوں سے ثابت ہیں۔ اُن کے انکار کی جرأت کیسے کی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی بداخلاقی ہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہی کرامت مان لی اور جس کا چاہا انکار کردیا۔ اس لیئے کہ اسلام کا قانون اور اصول ایک باضابطہ چیز ہے۔ ہر چیز اصول کے مطابق ہی مانی جائے گی۔ اور اصولِ شریعت سے ہی اس کا انکار کیا جاسکتا ہے جس طرح حضور غوثِ پاک کی دوسری بہت کرامات مختلف کتب سے ثابت ہیں اسی طرح یہ بارہ برس بعد ڈوبی ہوئی برات کا زندہ نکالنا بھی چند بزرگوں کی کتب سے ثابت ہے۔ چنانچہ کتاب سلطان الاذکار۔ اور شیخ شہاب سہروردی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف شدہ کتاب خلاصہ قادریہ کے صفحہ ۴۶ پر یہ واقعہ تفصیل سے درج ہے۔ اسی طرح مولانا برخوردار ملتانی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب غوث اعظم ص ۲۷۰ پر فرماتے ہیں کہ واقعہ بہت مشہور ہے کسی واقعے کو ماننے کے لیئے اتنی شہرت کافی ہے اور ایمان والوں کے لیئے تو بزرگوں کے اقوال ہی سند کثیر ہیں کیونکہ انکار کی کوئی شرعی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور بلاوجہ انکار گناہ ہے۔ بارہ برس کے بعد ڈوبے ہوئے لوگوں کو زندہ نکال لینا یہ میرے رب کی قدرت کاملہ ہے جس کا ظہور ذاتِ غوثِ پاک سے ہوا اب اس قدرت کا انکار شانِ خداوندی میں اسی طرح گستاخی ہے جس طرح قرآنِ پاک کا بیان کردہ حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ۔ کہ حضرت عزیر علیہ السلام سو سال تک فوت رہے اور پھر زندہ ہوگئے۔ قرآنِ پاک نے سو سال بعد زندہ ہونے کا ذکر فرمایا۔ اس کو ماننا اور اس کی حقانیت پر یقین رکھنا عین ایمان ہے اس کا منکر کافر صریحی ہے حالانکہ سو سال بعد زندگی زیادہ تعجب ناک ہے بارہ سال بعد زندگی سے جو رب تعالیٰ سو سال بعد زندہ کرسکتا ہے۔ اس پر بارہ سال بعد زندہ کرنا کیونکر مشکل ہو سکتا ہے۔ اور جب اُس کا اقرار ہے تو اس کا انکار کیوں وہ بھی قدرت کا کرشمہ تھا یہ بھی۔ نہ وہ قانونی فعل نہ یہ۔ وہاں بھی معجزانہ طور پر قدرتِ الٰہی کو انکار کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ جلد خراب ہونے والا سالن کھانا پینا سو سال تک نہ خراب ہوا اور لمبی زندگی والا اپنی طبعی زندگی پوری کرکے مر جانے والا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر گل سڑ گیا وہی دھوپ اور بارشیں جسم پاک عزیر علیہ السلام پر پڑیں مگر معجزانہ طور پر اس کو کچھ بھی نہ ہوا جس طرح یہ سب کچھ قدرتی امر تھا اسی طرح بارہ سال بعد زندہ کرنا بھی قدرتی امر تھا فرق صرف اتنا تھا کہ وہ نبی علیہ السلام کے جسم پر بطور معجزہ ظاہر ہوا اور یہ غوثِ پاک کے دستِ اقدس پر بطور کرامت ظاہر ہوا۔ بلکہ یاد رکھو کہ جس طرح معجزات باری تعالیٰ کے قانون کو ثابت کرنے کے لیئے ہوتے ہیں اسی طرح کرامات معجزوں کو ثابت کرنے کے لیئے ہوتی ہیں۔ قانون کے منکروں کو معجزات دکھا کر

قائل و مائل کیا جاتا ہے معجزات کے منکروں کو کراماتِ اولیاء اللہ دکھا کر قائل و مائل و بے بس کیا جاتا ہے۔ پس یقینی حد تک یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ غوثِ پاک کے زمانے میں شاید حضرت عزیر کے واقعے کے کچھ فرقے منکر ہو گئے ہوں گے تو اللہ جل شانہٗ نے غوثِ پاک کے ذریعے بارہ برس بعد ڈوبی ہوئی بارات کو زندہ کر کے اس واقعے کی تائید و توثیق فرمائی ہو۔ اور پھر پوری بارات ڈبو دی تاکہ اس کرامت کے عینی شاہد زیادہ ہوں ایک دو آدمیوں کی بات کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس بارات میں بھی کوئی واقعۂ عزیر کا منکر ہو۔

بہر حال یہ واقعۂ بارات عقلاً۔ نقلاً۔ شرعاً ہر طرح درست ہے فی زمانہ قرآن پاک سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔ ایسے صحیح سچے اور قابلِ قبول واقع کا صرف اس لیے انکار کرنا کہ حضور غوثِ پاک کی ذات سے زندہ کرنا محال ہے تو یہ وجہ بے عقلی ہے۔ اس لیے کہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز کراماتِ غوث پاک مرغی کو زندہ کرنا ہے مدارج نبوت جلد اوّل ص۱۴۲ پر اور فتاوٰی حدیثیہ ص۲۵۱ پر بھی ہے حالانکہ وہ مرغی بھنی ہوئی اور کچھ کھائی تھی۔ اور معتبر کتب اسلامیہ سے ثابت ہے۔ خلاصہ یہ کہ بارات کی کرامت ہو یا مرغی کی شرعاً قابل قبول ہے۔ ہاں وہ کرامات جو جوشِ جنون میں بعض خبثا نے خود گھر بیٹھے بنا کر غوثِ پاک عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب کر دیں اور وہ شریعت کے بھی خلاف ہیں وہ نا قابل قبول ہیں کیونکہ ان کی تائید قرآن و حدیث سے کہیں بھی نہیں ملتی مثلاً غوثِ پاک کا روحوں والی زنبیل چھین لینا (معاذ اللہ) اسی طرح کی کفریہ فسقیہ باتیں لوگوں کو گستاخِ بزرگان بنا دیتی ہیں۔ اس لیے کہ حضرت ملک الموت عزرائیل علیہ السلام رسل ملائکہ تمام غوثوں قطبوں سے ان کا مقام بلند تر ہے۔ غوثِ پاک عبد القادر جیلانی کا مقام و درجہ صرف اپنے وقت اور بعد والے تمام اولیاء اللہ سے بلند ہے۔ جیسا کہ ہم نے سیرتِ امام اعظم میں ثابت کر دیا۔ یہ دراز گفتگو مجھے اس لیے کرنی پڑی کہ فی زمانہ جس طرح وہابی دیوبندی اہلسنت بن کر حضور غوثِ پاک اور دیگر اولیاء اللہ کی گستاخیاں کرتے پھر رہے ہیں اسی طرح بعض شیطانی لوگ سنی بن کر صوفیانہ لباس پہن کر غوثِ پاک کے جھوٹے عاشق بن کر یہاں تک بدعقیدگی کر جاتے ہیں کہ ولی کا درجہ نبی سے بڑھا دیتے ہیں حالانکہ مسلکِ اہل سنت ہے کوئی ولی کسی نبی سے برابری نہیں کر سکتا۔ غوث پاک عبد القادر جیلانی اور دیگر تمام غوث و قطب تو تابعین و تبع تابعین کے بعد درجہ رکھتے ہیں۔ وہ سرکار ہیں یہ غوث و قطب ان کے خادم ہیں۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والا حاشا حاشا سنی نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ غوث پاک نورِ نظر صاحبِ لولاک بے شمار کرامات کے مالک و مختار ہیں یہ بات بھی ظاہر و ثابت ہے کہ معجزہ ہو یا کرامت۔ انبیاء کرام اور ان کے ولیوں کو ان پر مختار و مالک بنا دیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن

قرآن پاک سے ثابت ہے۔ انھیں کرامات میں سے ڈوبی بارات کو بارہ سال بعد نکالنا ہے۔ جیسا کہ استدلالی طور پر قرآن مجید سے بھی یہ کرامت ثابت ہو گئی اور تاریخی کتابوں قصص اولیاء سے بھی یہ کرامت ثابت ہو گئی اور تاریخی طور پر بزرگوں کے حوالے سے بھی انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ ہاں یہ وضاحت ضروری ہے۔ کہ اس برات کا دولھا کون تھا۔ تو کتب سیر سے بھی اور تشہیر فی العوام سے بھی یہی ثابت ہے کہ وہ دولھا حضرت سید کبیر الدین شاہِ دولہا دریائی ہیں اُن کا نام کبیر الدین ہے چونکہ اس برات کے دولھا یہی تھے فارسی النسل عجمی تھے اور زبانِ مادری فارسی ہی تھی فارسی میں نالکح شخص کو دولہا یا شاہ دولہا یا نوشاہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان میں مستعمل ہے۔ اسی لیے ان کا لقب شاہ دولہا ابھی تک چلا آرہا ہے۔ یہ ہی بارہ برس تک دریا میں ڈوبے رہے اس لیے ان کا لقب دریائی اب تک مشہور ہے۔ ان کا ایک مزار ہمارے شہر گجرات پنجاب میں ہے اور ایک مزار صوبہ گجرات احمد یا دا نڈیا ہندوستان میں ہے۔ چنانچہ کتاب مقاماتِ محمود ص۳۶۸ پر اسی طرح درج ہے۔ اسی کتاب کے اگلے ص۳۶۹ پر درج ہے کہ آپ کو غوثِ پاک نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا اور خدمتِ وضو پر مامور کیا تھا ایک دفعہ آپ کو حضور غوثِ پاک نے اپنے وضو کا غسالہ پلایا تو آپ کی عمر ایک سو سال طبعی کے علاوہ پانچ سو سال مزید بڑھ گئی کل چھ سو سال ہو گئی۔ غوثِ پاک نے اپنا خلیفہ بنا کر گجرات آپ کو بھیجا۔ چنانچہ کتاب حقیقتِ گلزارِ صابری ص۷۷ پر اسی طرح درج ہے۔ تمام تاریخوں میں آپ کا لقب شاہِ دولہا لکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی شجرات روحانیہ میں بھی آپ کو شاہ دولھا کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ شجرہ قادریہ جنیدیہ غفوریہ ص۷۵ پر بھی اسی طرح درج ہے۔ ان تمام کڑیوں کو جوڑنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ہی کی برات کو حضورِ غوثِ پاک نے ترایا تھا چونکہ آپ نے دریا سے زندہ نکل کر باقی زندگی حضور غوثِ پاک کے قدموں میں گزار دی اس لیے آپ کی کوئی اولاد نہ ہوئی مگر آپ کو رب کریم نے صلۂ خدمت غوثِ اعظم میں ایسی تاقیامت زندہ کرامت دی ہے۔ کہ دنیا جہان میں اولاد والوں کی اولاد سے آپ کو حصۂ اولاد بشکلِ چوہا عطا ہوا۔ دنیا میں صرف آپ کو ہی یہ کرامت ملی ہے۔ وہ چوہے جس طرح دنیا میں عجیب طرح سے آتے ہیں اسی طرح اپنی جوانی وغیرہ گزار کر روپوش ہو جاتے ہیں اُن انسانی چوہوں کا آج تک کسی نے جنازہ اٹھتا نہ دیکھا۔ آپ کی دوسری کرامت یہ مشہور ہے کہ ایک پانی کی بیماری سے جسم انسانی میں موکے نکل آتے ہیں۔ آپ کے مزار پر جھاڑو کی منت ماننے سے وہ موکے جھڑ جاتے ہیں۔ میری خوش بختی کہ یہ مزار مقدس میرے

مکان کے بالکل قریب ہے۔ اور منکرین گستاخوں کا جواب دینے کے لیئے بھی مجھ کو منتخب کیا گیا فالحمد للہ علیٰ ذالک اتنے دلائل با ضابطۂ شرعیہ کے ہوتے ہوئے پھر بغیر دلیل محض ضد بازی میں اپنی ناقص عقل سے انکار کرتے چلے جانا جہلا کا کام ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک صرف اُن چیزوں کا انکار کیا جائے گا۔ جن میں مندرجہ چار خرابیاں ہوں۔ ؏۱ اصولِ اربعہ فقہیہ شرعیہ کے بعد ظہور میں آئیں اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق نہ ہو ؏۲ جس چیز میں کسی اسلامی قانون کا مقابلہ پایا جائے وہ کرامت بناوٹی اور شرعًا ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ ایسی جھوٹی کرامت کو ماننے اور لکھنے کہنے سننے والا بدبخت گمراہ ہوتا ہے۔ مثلًا وہی روحیں چھیننے والی بناوٹی بات جس کا ذکر پہلے ہوا یہ کرامت عقلًا و نقلًا غلط ہے کیونکہ احادیث سے روحوں کے لے جائے جانے کا طریقہ اور ہے تھیلے میں ڈال کر نہیں لے جائی جاتیں۔ اِن وجوہ شرعیہ سے یہ کرامت غلط ہے۔ اولیاء اللہ کو کرامت اس لیئے نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے بڑوں کے مقابلے آجائے یا اپنا رعب جماتا پھرے بلکہ صرف کفر اور بے دینی گمراہی کو پسپا کرنے کے لیئے عطا ہوتی ہیں ؏۳ جس کرامت سے کسی دوسرے بزرگ کی شان میں گستاخی ہوتی ہو وہ کرامت بھی غلط ہے جیسے کہ زہرہ رنڈی اور ہاروت و ماروت کا واقعہ کہ اس کا امام رازی نے امام قاضی عیاض نے انکار کیا کیونکہ اس میں گستاخی ملائکہ ہے۔ دیکھو ہذا اس صفحہ ۱۸۰ پر۔ ؏۴ اسی طرح وہ کرامت جس سے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہوتی ہو۔ جیساکہ حقیقتِ گلزارِ صابری کے جاہل مصنف نے صفحہ ۹ پر بناوٹی روایتیں درج کر کے اپنی سمجھ میں نبی کریم کی تعریف کرنی چاہی۔ لکھتا ہے۔ حدیث:۔ اَنَا اَحْمَدٌ بِلَا مِیْمٍ وَعَرَبٌ بِلَا عَیْنٍ۔ حالانکہ جہالت تو دیکھیئے کہ لفظ۔ بلا۔ عربی فقروں میں مستعمل ہی نہیں۔ نہ یہ حرفِ استثناء ہے نہ حرفِ صفت۔ اور شیعوں رافضیوں کی بناوٹی روایت پیش کرتا ہے:۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَعْرِفُ اللّٰہَ اِلَّا اَنَا وَ عَلِیٌّ۔ یہ سب روایتیں گستاخی و کفریہ ہیں۔ اور عقائدِ اہلسنّت کے سراسر خلاف۔ بعض جہلا بدباطن لوگوں نے عیسائیوں یہودیوں اور شیعوں کی طرح حضور غوث پاک کو انبیاءِ کرام سے بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اتنی عظیم اعلیٰ و مشہور و کثیر کرامات کے باوجود عقائدِ اسلامیہ کے مطابق غوث پاک کا درجہ انبیاءِ کرام سے کہیں لاکھوں مقام نیچا ہے بس مسلکِ اہلِ سنت میں نہ اِفراط ہے نہ تفریط۔ بلکہ جو کرامت شریعت کے معیار پر پوری ہو اور اس کا قیاسی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو اس کا انکار جائز ہے اور جو کرامت

شریعت کے معیار پر پوری ہو اور اس کا قیاسی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو اس کا انکار نا جائز ہے اور جو کرامت اس معیارِ شرعی سے ہٹ جائے اس کو ماننا گناہ ہے سوال مذکورہ میں مسئولہ کرامت غوثِ پاک شریعت اور اصولِ قرآن کریم کے مطابق ہے اور کتابوں میں مشہور ہے اس لیے شرعًا بالکل درست و صحیح ہے بلاوجہ ہٹ دھرمی سے انکار گناہ ہے۔ ہاں البتہ یہ فوٹو جو بکتا پھرتا ہے۔ جس کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے:۔ بالکل بناوٹی ہے۔ اس کو خریدنا چھاپنا۔ گھروں میں لگانا سخت گناہ ہے:۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

وہابیوں کے اہلسنت پر چھ اعتراض اور انکے جوابات

سوال نمبر ۳۲:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقہ کے ایک خبیث ترین وہابی نے کسی محمد اسلم کے نام سے ایک آٹھ ورقی رسالچہ چھاپا اور شائع کیا ہے اس کا عنوان ہے۔ میں نے بریلویت کیوں چھوڑی۔ ہمارے علاقے میں ہیں تو یہ آٹے میں نمک کی برابر مگر چوہوں کی طرح شور بہت مچائے پھرتے ہیں اس رسالچے میں مندرجہ ذیل سات طرح پر اعتراض کرتا ہے اور دعوٰی کرتا ہے کہ کوئی سنی بریلوی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ براہِ کرم اس کا مدلل جواب دیا جائے۔ اگر سب سوالات کا جواب نہ دیں تو کم از کم اُن باتوں کا جواب ضرور دیں جو وہابی معترض نے حضرت حکیم الامت قبلۂ عالم رحمۃ اللہ علیہ کی کتب پر کیے ہیں۔

پہلا اعتراض:۔ ۱ فرقہ بریلویہ کے نزدیک حضور علیہ السلام کی حیثیت ایک شکاری اور دھوکہ باز کی ہے۔ معاذ اللہ جاء الحق ص۱۷۵ اَیُّکُمْ مِثْلِیْ کے تحت لکھا ہے کہ اے کفار تم مجھ سے گھبراؤ نہیں میں تمہاری جنس سے ہوں یعنی بشر ہوں شکاری جانوروں کی آواز نکال کر شکار کرتا ہے۔ ثابت ہوا کہ بریلوی فرقہ گستاخِ رسول ہے۔ **دوسرا اعتراض**۔ فرقہ بریلویہ کا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے خزانے بچانے کے لیے جھوٹ بولا (معاذ اللہ) جاء الحق ص۹۱ بحث علم غیب میں لکھا ہے کہ یہاں حکم میں کفار سے خطاب ہے یعنی اے کافرو میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں تم چور ہو چوروں کو خزانے نہیں بتائے جاتے۔ تو گویا کہ نبی کریم نے جھوٹ بولا جو کہا کہ اے کافرو میرے پاس خزانے ہیں۔ **تیسرا اعتراض**:۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر کافر نہیں

ہے۔ معاذ اللہ۔ ملفوظات حصہ اول ص۵۲ پر لکھا ہے کہ ایک شخص میاں صاحب تھے انہوں نے کچھ سوال کیے اسماعیل دہلوی کے متعلق۔ مولانا احمد رضا خان صاحب نے یہ بھی مانا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ مانو اور اس کی تکفیر بھی نہیں کرتے ثابت ہوا کہ بریلوی فرقہ رسول کے منکر کو کافر نہیں کہتے۔ **چوتھا اعتراض**:۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک کامل ولی وہ ہے جو عورت کے فرج میں نطفہ پڑا دیکھ لے۔ تنویر الخواطر ص۴۲ پر عربی عبارت ہے لا تستقر نطفة في فرج انثى الا ينظر ذالك الرجل ايها۔ اس کا ترجمہ اس طرح لکھا ہے۔ کسی مادہ کی شرم گاہ میں کوئی نطفہ نہیں قرار پکڑتا مگر وہ کامل اسی کو دیکھتا ہے۔ **اعتراض ۵**۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک شیطان حضور اکرم سے زیادہ جگہ حاضر و ناظر ہے۔ انوار ساطعہ ص۱۷ پر مولوی عبدالسمیع صاحب رام پوری نے لکھا کہ اصحاب محفل میلاد تو زمین کی تمام جگہ پاک ناپاک مجالس مذہبی وغیر مذہبی میں حاضر ہونا رسول اللہ کا نہیں دعوے کرتے ملک الموت اور ابلیس کا حاضر ہونا اس سے بھی زیادہ تر مقامات پاک ناپاک کفر غیر کفر میں پایا جاتا ہے۔ **اعتراض ۷**:۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں توضیح البیان ص۲۷ پر مولانا ابو وفا غلام رسول سعیدی جامعہ نعیمیہ لاہور نے لکھا کہ۔ کیونکہ وہ انبیاء جھوٹ بولتے تو نہیں مگر بول سکتے ہیں:۔ **اعتراض ۶**:۔ فرقہ بریلویہ کا اعلان کہ نہ ہم سنی ہیں نہ شیعہ اور نہ ہمیں علم ہے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون مقالات مرضیہ ص۸۲ ملفوظ ص۴۶ ملفوظات مہریہ گولڑہ شریف۔ یہ ہیں اس خبیث کے چند اعتراض اگرچہ ہم نے وہابیوں کو منہ توڑ جواب دے دیئے ہیں مگر آپ کے قلم سے علمی و تحقیقی رنگ میں جواب کی تشریف آوری ہمارے لیے باعث افتخار و خوشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ اہلسنت پر قائم رکھے ہمارے لیے آپ کے در کے سوا اور کون دروازہ ہے۔ **السائل**۔ ابو طاہر محمد نجیب قادری پٹیالہ سائیکل ورکس کورٹ روڈ جھنگ صدر :۔ ۸-۷-۹۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

جناب ابو طاہر صاحب سلام مسنون گرامی نامہ بشکل سوال نامہ وصول ہوا سوال نامے کے ساتھ سلسلہ آٹھ ورقی رسالہ بھی وصول ہوا اول آپ کا سوال نامہ پڑھا تحریری عبارت سخت ہے، جس میں تنگی نظر کی جھلک نمایاں تھی میں چاہتا تھا کہ آپ کو بطور نصیحت آئندہ کے لیے اس کج خلقی سے منع کروں کیونکہ ہمارا مسلک اور اعلیٰ حضرت بریلوی و حکیم الامت بدایونی کی تعلیم ہم کو دشمن کے ساتھ بھی نرم کلامی و اخلاق مشفقانہ ہی کا سبق دیتا ہے۔ مگر بعدہٗ جب رسالہ موصولہ کا مطالعہ کیا تو

وہ بداخلاقی و بدتہذیبی و کج خلقی میں بڑھا چڑھا پایا جس سے میں نے اندازہ کرلیا کہ آپ کی تحریر کی سختی اسی کا ردِ عمل ہے بہر حال آپ لوگوں کو نرم کلامی کا ہی شیوہ اپنانا چاہیئے کہ آپ اہل سنت میں آپ کے ہی طلبِ متور میں اخلاقِ حسنہ کا خزانہ ہے۔ آپ کا دین آپ کو مٹھاس سکھاتا ہے۔ آپ کو تہذیب سے ہٹی بات زیب نہیں کیونکہ تند مزاجی بداخلاقی ان کو ہوتی ہے جس کا مسلک کمزور ہو اور جس کے پاس دلائل و براہین نہ ہوں وہ ہی شکست خوردہ حالت میں غصہ غیض و غضب اور بداخلاقی پر اتر آتا ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ اہلسنت والجماعت کے پاس اپنے ہر مسلک پر قرآن و حدیث سے دلالۃً وعبارۃً۔ کنایۃً واقتضائً۔ اشارۃً وتاویلاً۔ دلائل کثیرہ موجود ہیں۔ یہ میں نے ویسے ہی نہیں لکھ دیا بلکہ تجربتاً آپ اس فتوے کی مندرجہ ذیل عبارت کے علاوہ میرے مطبوعہ فتاوے العطایا جلد اول کا مطالعہ فرما سکتے ہیں:۔ جس نے بھی بے راہ روی یا گمراہی اختیار کرنے کی کوشش کی اس کو سمجھانے کے لیئے اتنے کثیر دلائل میسر آئے کہ مخالف کو جواب کا چارہ نہ رہا۔ یہ سب کچھ میرے مسلک پر میرے رب تعالیٰ جلّ مجدہٗ کا کرم ہے۔ یہ ہمارے مضبوط دلائل کی ہی مار ہے کہ مخالف فریق بجز بداخلاقی کے کچھ نہیں دکھا سکتا جیسا کہ اس رسالچہ کی لایعنی بے سروپا عبارت سے ظاہر ہے۔ رسالے کو پڑھنے کے بعد ایک غیر جانبدار محقق مؤرخ سلجھے ہوئے انسان سے مندرجہ تاثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ ع۱ یہ کہ یہ رسالہ کسی سنے دیوبندی نے نہیں لکھا بلکہ کسی پرانے غالی متعصب نے لکھا ہے اور یہ کہنا کہ میں نے بریلویت کیوں چھوڑی محض جھوٹ اور فریب ہے محمد اسلم نامی کوئی شخص نہیں محض فرضی نام بنایا گیا یہ تاثر مصنف کے پیش لفظ کو بغور پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے کہ مصنف دیوبندی اکابر مولویوں کی تعریف اور بڑائی بیان کرنا چاہتا ہے۔ نبی کریم رؤف و رحیم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اس رسالے کی اشاعت کے لیئے آڑ بنا رہا ہے ورنہ کیا ضروری تھا کہ بریلویوں کی گستاخی کا ذکر کرتے وقت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی موڑ کھائی جائے۔ ع۲ یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس رسالے کا مصنف اللہ رسول سے محبت کرنے والا نہیں نہ ہی خدا پرست ہے بلکہ دیوبند پرست اور دیوبندی نواز ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ بریلویت سے ہٹنے والا سیدھا بلا سوچے سمجھے دیوبندیت میں جا گھسے "تلاشِ حق کی جستجو کرنے والا تو ہر دروازے پر جاتا ہے ہر ایک سے ملتا ہے ۷۲ بہتر فرقوں میں سے اس کی "تلاش سب سے پہلے دیوبندیت میں گھسی اور پھر وہیں پہ کیوں رہ گئی تلاش آگے کیوں نہ بڑھی کسی اور رہبر سے کیوں نہ پوچھا جو اسے بتاتا کہ اے کم عقل بارش سے بچ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ جس جماعت کی معمولی باتوں کو گستاخی سمجھ کر تو بھاگا تو نے پناہ کہاں لی جو گستاخیوں کا

گہوارہ ہے۔ اے کم ہمت تو نے ایک ازلی جماعت کو صرف اس لیئے چھوڑا کر اُس کے ایک بیوقوف کم عقل انسان نے معاذ اللہ انبیاءِ کرام کے متعلق یہ لکھ دیا کہ۔ انبیاءِ کرام جھوٹ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ مگر پھر تو نے ان لوگوں کا دامن پکڑا جو متفقہ طور پر یہی گستاخانہ بات اللہ تعالیٰ کے بیئے کہتے ہیں۔ اور بڑی بڑی کتابوں میں امکانِ کذب کا مسئلہ بنا کر صاف صاف لکھتے چلے آرہے ہیں کہ۔ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے مگر بولتا نہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) اور پھر آج تک تمام دیوبندی وہابی اس کفریہ عقیدے پر اصرار کرتے پھر رہے ہیں نہ اس کفر سے رجوع ہے نہ بیزاری مگر یہ مصنفِ رسالہ اسی فرقے کی حمایت میں ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ انہی میں کا ایک ہے۔ ایک نیا جستجو والا تو کبھی ایسا نہ کرے گا کہ ایک نبی کے گستاخ سے ہٹ کر رب تعالیٰ کے گستاخوں میں شامل ہو جائے۔ ع۳ یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ رسالے کا مصنف سخت کم علم ہے اور ساتھ ہی ساتھ تعصب میں یکتاءِ زمانہ ہے۔ اس لیئے کہ وہ بریلوی مصنفین کی کتب میں خود ایک عبارت منتخب کر کے پیش کرتا ہے اور پھر خود ہی اس میں گستاخی کا مطلب نکالتا ہے۔ اور پھر خود کہتا ہے کہ دیکھو دیکھو بریلویوں نے گستاخی کر دی۔ حالانکہ جب غیر جانبداری سے اس آٹھ ورقی رسالے کو دیکھ کر پھر بریلویوں کی محولہ کتب کو دیکھا جائے تو وہ مطالب اور توڑ مروڑ کہیں بھی نظر نہیں آتے جو مصنفِ رسالہ نے بڑے شد و مد سے لکھ کر واویلا کیا۔ یہ ہیں وہ تاثرات جو غیر جانب دار سلجھے دماغ والے کو اس رسالے کے مطالعے سے پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح مصنفِ رسالہ کے اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے جو وہ دینا چاہتا ہے یہ رسالہ کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں نہ ہی اس میں شمۂ علم نہ ذرۂ عقلیت ہے اس کے جواب کی چنداں حاجت نہ تھی نہ ہی میں ان وہابی سنی کے جھگڑے میں پڑنے کو تیار تھا۔ کہ ابتدا ہی سے میرا ذہن ان خرافات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ میری گوشہ نشینی یہ برداشت نہیں کرتی کہ خواہ مخواہ بغیر سوچے سمجھے بلاوجہ کسی کو کافر یا ظالم بناتا پھروں یہ کارِ حمقا ہے۔ میں نے شروع ہی سے تمام اسٹیجوں کو چھوڑ کر منصبِ افتاء کو اپنے لیئے پسند کیا۔ میں صرف مفتیِ اسلام ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو فقہِ اسلام سے محبت ہے۔ فی زمانہ مفتیِ اسلام مثل قانونی جج کے ہے جس طرح جج ہر طرح غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اسی طرح مفتیٔ وقت پر بھی غیر جانب دار ہونا لازم ہے میں اس مناظرانہ رسالچے کے جوابات میں مشغول تو نہ ہونا چاہتا تھا مگر آپ کے استفتا اور پیہم اصرار کی بنا پر اپنے منصبِ افتاء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے محض تحقیقی فتوے سے نافذ کر رہا ہوں بغیر کسی جانب داری یا تعصب کے بریلویت دیوبندیت دونوں اسٹیجوں سے ہٹ کر اپنی ذاتی تفتیش کے مطابق یہ تحریر لکھ رہا ہوں کیونکہ کسی کے استفسار

پر حقیقتِ حال کو واضح کرنا مفتی پر واجب و لازم ہوتا ہے۔ آپ کے استفتاء کے درج شدہ جواب طلب اعتراضات کے علاوہ موصولہ رسالے کے دیباچہ (پیش لفظ) کی مختصر صحیح مؤرّخانہ وضاحت ضروری ہے۔ لہٰذا اس ضمن مصنفِ رسالہ مذکورہ نے صـ۳ پر لکھا کہ ان کی یعنی بریلویوں کی اکثر کتب صرف صرف ان لوگوں پر کیچڑ اچھالنے کے لیے لکھی گئیں جنہوں نے انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مردانہ وار مقابلہ کیا۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بہادری و جرأت کے جھنڈے گاڑ دیئے تحریک سید احمد شہید۔ تحریک خلافت۔ تحریک ریشمی رومال۔ اور تحریک پاکستان میں ان کا کردار تاریخی صفحات پر سنہری حروف میں رقم کیا جا چکا ہے (الخ)۔ جواب مصنف کی طرزِ تحریر کی بنا پر بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ عبارت ہے جس کو شائع کرنے اور لوگوں کو دکھانے کا مقصد ہے اسی کے لیے اتنے تانے بانے بنے گئے ہیں اور چونکہ بریلوی لوگ اِن کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے صرف بریلوی ہی نہیں بلکہ بجز دیوبندیوں کے دیگر فرقے بھی اس کو نہیں مانتے شیعہ۔ چکڑالوی۔ قادیانی اہل حدیث وغیرہ سب کہتے ہیں کہ یہ تاریخ بناوٹی ہے۔ لہٰذا اس بات کا جواب دینا اور اس کی تاریخی حیثیت معلوم کرنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ بالکل غیر جانب دار ہو کر میں نے۔ اس تفتیش و تحقیق کرنے کے لیے صرف وہی کتابیں دیکھی ہیں جو دیوبندیوں کی لکھی ہوئی اور انہیں کی مطبوعہ ہیں۔ اس ضمن میں اب تک میں نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا وہ حسبِ ذیل ہیں چونکہ میں نے اس چھان بین میں صرف انہی کتب کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے فوقیت دی اور انہی کتب کا مطالعہ کیا جو دیوبندیوں کی تصنیف شدہ دیوبندی مطبوعات ہیں کیونکہ دیوبندی مسلک کو جواب دے رہا ہوں۔ لہٰذا انہی کے قابلِ اعتماد کو مدِّ نظر رکھا گیا۔ اس چھان بین کے لیے مجھ کو دراز سفر بھی کرنا پڑا اور دیوبندی اکابر و مبلغین سے رابطہ بھی قائم کرنا پڑا یہ صعوبتیں صرف اس لیے برداشت کیں تاکہ میرا بر فتوے کسی پہلو کمزور نہ رہے اور نہ ہی تعصب کی راہ کا کسی کو بہانہ مل سکے میں نے اکابر و فضلاءِ دیوبند سے مناظرانہ و مکالمانہ طرز پر اپنے خدشات کا اظہار کیا تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ میرے خدشات کی قوت کتنی ہے۔ جب وہ حتیٰ القدور تفہیم کے بعد لاجواب ہو گئے تب میں اس خدشات کو بذریعہ تحریر ہذا آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں نہ میری عادت نہ میرا منصب کہ خواہ مخواہ کسی کو زیر کروں۔ اس تفتیش سے پہلے میں صرف یہی جھگڑا اتفاقاً چلا آ رہا تھا کہ دیوبندی بریلویوں پر پاکستان دشمنی انگریز دوستی کا الزام لگاتے تھے اور بریلوی دیوبندیوں پر۔ سچائی کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا نہ ہی کبھی تحقیق حال کی طرف طبیعت راغب ہوئی اس لیے کہ دیوبندی

بریلوی کا اصل اختلاف یہ نہیں بلکہ اصل اختلاف تو عظمتِ انبیاء و اولیاء بلکہ خود خالقِ عالم جلّ مجدہٗ کی ذات پاک کی عظمتِ پاک کا مسئلہ ہے جس کے دیوبندی قائل نہیں۔ جیسا کہ مشہورِ زمانہ کتاب جاء الحق حصہ اوّل و دوم میں بالتفصیل وضاحت کی گئی ہے اور یہاں بھی آئندہ سطور میں کچھ مشتے نمونہ کے طور پر وضاحت کر دی جائے گی۔ فی الحال چونکہ قابلِ جواب آٹھ ورقی موصولہ رسالے میں اول صفحات پر اسی کو واضح و ظاہر کیا گیا ہے کہ دیوبندی لوگ انگریز دشمن تھے اور رہیں اور انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے لڑے جنگ کرتے رہے۔ پس ضروری ہوا کہ محض منصفانہ و مفتیانہ و عادلانہ ذہن سے اس جھگڑے کو نمٹانے کی غرض سے حقیقت کو واضح کیا جائے۔ مجھ کو اس تفتیش کے ذریعے چار چیزیں بڑی واضح طریقے سے آشکارا ہوئیں۔ اوّلاً یہ کہ دیوبندی اکابر سکھوں سے جنگ کرتے رہے۔ دوم یہ کہ سکھوں سے جنگ انگریز حکومت کے حکم اور ان کی حمایت میں کرتے تاکہ انگریز حکومت مضبوط ہو۔ سوم یہ کہ یہ دیوبندی سپاہ سالار انگریز حکومت سے باقاعدہ ہر طرح کی امداد وصول کرتے رہے۔ چہارم یہ کہ۔ یہ دیوبندی اکابر اسی انگریزی دور میں انگریز حکومت کے حکم سے مسلمانوں سے بھی جنگ کرتے رہے۔ چنانچہ علی الترتیب حوالہ جات کتب مع ضروری مختصر مضمون ملاحظہ ہو۔ ع۔

ع۱:۔ رسالہ الفرقان شہید نمبر ۱۳۵۵ھ کے صفحہ ۷۶ پر لکھا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ آپ نے (یعنی اسماعیل شہید نے) انگریزوں کی مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا۔

ع۲:۔ مقالات سر سید حصہ نہم صفحہ ۱۴۲ پر لکھا ہے

اثناءِ وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے وہ بھی تو کافر ہیں اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں سے ہم کبھی جہاد میں شریک نہ ہوں:۔

ع۳:۔ سوانح احمدی مطبوعہ فاروقی دہلوی صفحہ ۵۷ پر لکھا ہے:۔

یہ بھی صحیح ہے کہ اثناءِ قیام کلکتہ۔ مولانا اسماعیل شہید کے وعظ کے دوران ایک شخص نے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریز پر جہاد درست ہے یا نہیں۔ جواب میں مولانا شہید نے فرمایا کہ ایسی بے رو ریا غیر متعصب سرکار پر کسی طرح جہاد کرنا درست نہیں:۔

ع۴:۔ موجِ کوثر مصنف صفحہ ۳ مطبوعہ میں لکھتے ہیں:۔

سیّد احمد سے کسی نے پوچھا کہ سکھوں سے اتنی دور جہاد کرنے جاتے ہو۔ انگریز بھی تو کافر ہیں ان سے کیوں نہیں لڑتے۔ سیّد صاحب نے جواب دیا۔ سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم نہیں کرتی

ع۵ :۔ حیاتِ طیبہ مرزا حیرت دہلوی کی تصنیف مطبوعہ فاروقی دہلوی ص۲۹۶ پر ہے۔

مولوی محمد اسماعیل شہید نے ایک شخص کو جواب دیا کہ انگریز پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں بلکہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو انگریزوں پر حملہ آور ہو اُن سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں

ع۶ کتاب الحیات بعد الممات ص۲۰۳ پر لکھا ہے۔

اسماعیل دہلوی نے اپنے شیخ سیّد احمد کو امام مان کر مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ پنجاب میں جہاد کیا۔ تو گورنمنٹ انگلیشیہ نے بھی کسی طرح کی مزاحمت نہ کی نہ جہاد میں پیچیدگی پیدا کی۔

ع۷ ترجمانِ وہابیہ مصنف نواب صدیق حسن ص۵۱-۵۲ پر لکھا ہے۔

نہ انہوں نے سرکار انگریزی سے کبھی جہاد کیا نہ ہندوستان میں جہاد کا فتوٰے دیا گورنمنٹ اگر ساری کتب بھی دیکھے تو کسی کتاب میں جہاد یا بغاوت کا فساد سکھانے کی سرکار انگلیشیہ سے کوئی بات نہ پاوے گی۔

ع۸ :۔ کتاب۔ تحریک جہاد کا قیمتی سرمایہ مکتوبات سیّد احمد۔ مصنف اقبال کاہندلوی ص۴ پر لکھا ہے۔

حضرت کی شہادت کے بعد جتنی بھی کتب لکھی گئیں اس میں اس بات کو بار بار ثابت کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے خلاف حضرت سیّد احمد شہید نے کوئی حرکت نہیں کی۔

ع۹ :۔ مقالات سر سیّد حصہ نہم ص۱۴۸ پر لکھا ہے۔

وہ اپنے بال بچوں کو اور مال اسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور محافظوں پر حملہ کرنا ان کے مذہب میں نہایت ممنوع ہے۔

ع۱۰ :۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مصنف مسعود عالم ندوی ص۵۴-۵۵ پر لکھا ہے۔

لیکن پنجاب کا اکثر علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔

ع۱۱ :۔ ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی از محمد سرور ص۳۶۲ پر لکھا ہے

ایک مرتبہ میں سرحد پار بیر کے مقام پر گیا تاکہ احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے مجاہدین کی زندگی دیکھوں جب گیا تو حد درجہ افسوسناک و قابلِ رحم حال تھا۔ ان کی گزران صاحبزادہ عبد القیوم کی معرفت انگریزی حکومت کے رہینِ منت تھی :۔

ع۱۲ ب سوانح احمدی مصنف جعفر تھانیسری ص۴۹

ایک انگریز گھوڑے پر سوار آیا جو بہت سا کھانا سیّد صاحب اور اُن کے مجاہدین کے لیئے لایا اور کہا کہ پادری صاحب (سیّد صاحب) کہاں ہیں جب ملاقات ہوئی تو کہا کہ حضور میں نے آپ کے آنے کی خبر سنی تھی تو یہ کھانا حاضر کیا ہے حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کردو قریب دو گھڑی وہ انگریز حضور میں حاضر رہا۔

ع۱۳ :۔ کتاب مخزنِ احمدی مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ مصنف سید محمد علی مجاہد تحریکِ سید احمد یہ سیّد احمد کے بڑے بھانجے ہیں اپنی اسی کتاب کے ص۶۴ پر۔ انگریز کے کھانا لانے کا یہی واقعہ فارسی زبان میں لکھتے ہیں۔

ع۱۴ :۔ سیرتِ سید احمد شہید حصہ اول ص۲۱۹ پر لکھا ہے مصنف ابوالحسن علی ندوی۔

مقام اسرولی سے چار میل پہلے حضرت کے پاس ایک انگریز کی ہندوستانی بیوی آئی اور کھانے کی دعوت دی انھوں نے انکار کیا۔ پھر وہ فرنگی (انگریز) خود آیا تو آپنے فرمایا۔ تمہاری دعوت کیوں نہ قبول کریں گے آپ نے اُس دن اس کی دعوت کھائی۔

ع۱۵۔ مکتوباتِ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ مکتوب مرقوم ۱۸ جنوری ۱۹۶۲ء ص۹۵ مصنف غلام رسول مہر وہابی ص۹۵ پر لکھا ہے :۔

سید احمد شہید کے پاس ہندوستان گورنمنٹ سے جو ہنڈیاں (گورنمنٹ مالیتی ڈرافٹ) آتی تھیں اُن میں اشرفیوں کا بھی ذکر ہے اور روپوں کا بھی۔

یہاں تک تو یہ ثابت ہوا کہ یہ اکابر دیوبند سکھوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے اور انگریز کے حکم سے یہ سب کچھ ہوا صرف اس لیئے کہ انگریز حکومت مضبوط ہو۔ میں نے مندرجہ بالا جتنی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں وہ سب تقریباً ۱۸۵۶ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان لکھی اور چھاپی گئیں میں نے اپنی تحقیق کے دوران کسی نئے مصنف یا نئے مطبوعہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سابقہ دور میں مجھ کو ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہ ملی جس میں ذرہ بھر یہ لکھا ہو کہ وہابی دیوبندی حضرات انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے رہے اور انگریز سے جنگ کرتے رہے۔ اور اپنی اس تحقیق کے بعد میں چیلنجی طور پر زمانے بھر کے وہابیوں کو دعوتِ عام دیتا ہوں کہ سابقہ دور کی ایک بھی کتاب دکھادو جس میں ذرہ بھر یہ لکھا ہو کہ کبھی وہابی نے کسی انگریز سے جھگڑا بھی کیا ہو۔

چہ جائے کہ مسلّحہ جنگ۔ بلکہ ان ہی کتابوں سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں کہ سکھوں سے جنگ کی انگریزوں سے محبت کی ہی نہیں بلکہ اس پر فخر کرتے رہے کہ ہم نے انگریز کی حکومت مضبوط کی اور انگریز کے سب مخالفین سے لڑائی کی جیسا کہ ابھی اوپر ہم نے نواب صدیق حسن خان وہابی کی کتاب ترجمانِ وہابیہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے تو بیس سال سے اِن وہابیوں نے کروٹ بدلی اور کہنا شروع کر دیا کہ ہم انگریز کے مخالف تھے۔ اور یہ کہ ہم انگریز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے جنگ کرتے رہے۔ ان کتب کے مصنف بھی نئے اور مطبوعات بھی جدید اس جدیت تصنیف سے ذہنی تجدید کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے اس دور کے وہابی اسی بات پر مصر ہیں اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ کہ ہم انگریز کے دشمن تھے۔ یہی وہ بات تھی جس کے اب مخالف نظر آ رہے اور بیس سال قبل اسی پر فخر کرتے تھے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ پہلے انگریزی دور تھا دل بھر کے انگریز کی حمایت کی اور انگریز سے روپیہ چھینا اور ہتھیایا پھر پاکستان بننے کا دور آیا تو ہندوستان نوازی اور ہندو کافر کی حمایت کا بڑھ چڑھ کر بیڑا اٹھایا۔ اور پاکستان۔ قائد اعظم اقبال کی سخت توہین آمیز مخالفت کی اور اب جب کہ پاکستان بن گیا۔ تو اس ڈر سے کہ کہیں کوئی حکومتِ پاکستان ہمارا محاسبہ و محاکمہ کر کے واجبی سزا نہ دیدے۔ سابقہ ساری تاریخوں کو جھٹلا کر پاکستان کے حامی ہونے کے دعویدار بنتے چلے جا رہے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی اور سچی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ کہ برصغیر پر تین دور گزرے۔ پہلا دور جب کہ انگریز کا تسلط علاقۂ ہند پر شروع ہوا دوسرا دور جب کہ پاکستان بننے کا دور شروع ہوا۔ تیسرا دور جب پاکستان بحمدہٖ تعالیٰ بن گیا۔ ان تینوں دوروں میں برِّصغیر کے دو گروہوں کا کردار مندرجہ ذیل طریقوں سے کھل کر سامنے آتا ہے۔ پہلا دور مغل بادشاہ ظفر کے زمانۂ سلطنت میں انگریز نے قابض ہونا چاہا تو اکابر وہابیہ جن کو بعد میں دیوبندی کہا جانے لگا نے انگریز کی بھرپور حمایت کی اور مسلمانوں کی جاسوسیں کر کے اسلامی سلطنت کی قوت کو توڑا انہی غداروں کی جاسوسیوں کی بل بوتے پر انگریز نے تسلط جمایا اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا ورنہ عسکری قوت کے سامنے ایک لمحہ یلغار انگریز نہ ٹھیر سکی تھی۔ چنانچہ غداروں کی سرفہرست تین آدمیوں کے نام سے شروع ہے۔ پہلا شخص سلطنتِ مغلیہ کا مشیرِ خاص۔ مرزا الٰہی بخش ظفر بادشاہ کا سمدھی۔ سید احمد خان وہابی کا چوتھا خلیفہ مرید تھا اس نے محل کی ہر راز دارانہ بات سے انگریز والے سرائے اور کلیطر کو آگاہ کیا انگریزوں نے اس کو سربراہی کا لالچ دیا تھا جو پورا نہ ہوا دوسرا شخص حکیم احسن اللہ خان سید احمد خان اور اسماعیل دہلوی کا مرید معتقد

ایک ساتھی (بحوالہ کتاب تاریخِ غدر ص۱۲) تیسرا شخص حیدر آباد دکن کا میر صادق۔ یہ سلطنتِ مغلیہ کا وزیرِ مال بھی رہا تھا۔ جس نے مالی طور پر بھی انگریز کی حمایت کی اور تمام مسلمانوں سے غداری کی۔ یہ تھا ۱۹۵۹ء میں دیوبندی وہابی کردار۔ اسی قسم کی تاریخی عبارت یکم نومبر ۱۹۷۹ء اخبار امروز کے ص۳ پر بعنوان آخری تاجدارِ مغلیہ کے آخری عید قربان۔ شائع ہوا ہے۔ اسی دور میں۔ بریلوی گروہ کے سربراہ فضلِ حق خیرآبادی کو انگریز نے تین جرموں کی بنا پر کالے پانی کی سزا دی اور دریائے شور جزیرۂ انڈمان کی خطرناک جیل میں رکھ کر موت سے ہم کنار کرا دیا۔ پہلا جرم یہ کہ ظفر بادشاہ کی حمایت کیوں کی دوسرا جرم یہ کہ فتوئے جہاد کیوں دیا۔ تیسرا جرم یہ کہ انگریز حکومت کے خلاف شاہی فوج کو کیوں منظم کیا اور اپنے خطبات سے مسلمانوں کو اسلامی فوج میں کیوں بھرتی کرایا۔ میری اس تحقیق کو اپنے پرائے سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس دور کے تمام بریلوی علماء و عوام۔ فضل حق صاحب کے جھنڈے تلے ہو کر انگریز کی مخالفت میں کمربستہ رہے۔ چنانچہ۔ ع۱ انتظام اللہ شہابی کی تصنیف بنام غدر کے چند علماء ص۴۹ ع۲ کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مصنف خورشید مصطفیٰ ص۲۵۵ ع۳ ۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ مصنف غلام رسول مہر وہابی ص۲۰۶ ع۴ کتاب بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد مصنف رئیس احمد جعفری دیوبندی ص۲۱۵ پر اور اُن کے علاوہ بہت زیادہ تاریخی کتابوں میں صاف صاف لکھا ہے کہ دہلوی بغاوت کے زمانے میں فضل حق خیرآبادی صاحب نے انگریز کے خلاف جنگ کا فتوائے دیا اور بہادر شاہ ظفر کے حامیوں میں شامل رہے اور انگریزوں کی جیلیں برداشت کرتے ہوئے جیل کی کال کوٹھری میں ہی انتقال کیا۔ مگر باوجود سرکاری و غیر سرکاری وکلاء کے سمجھانے کے کہ آپ فتوے سے انکار کر دو تو سزا معاف ہونے کے علاوہ اتنی جاگیر بھی دی جائے گی۔ مولانا نے اس پیش کش کو عدالت میں رد کرتے ہوئے صاف کہا کہ میں کافر کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ یہ ملک و ملت و قوم سے غدّاری ہے۔ یہ تھا برِصغیر کے پہلے دور میں سنّی وہابی کے عملی کردار کا تضاد جس کو اسی زمانے کے مورخوں نے بلاتعصب آئینے کی طرح صاف کر دیا۔ اب ایک غیر جانبداری مخلص جج و قاضی و مفتی کیا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور کس کو یہ فیصلہ دے کہ وہ انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انگریز سے لڑتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اتنی تاریخی دستاویزات کے ہوتے ہوئے کوئی بھی منصف مزاج یہ ڈگری دیوبندیوں کو نہیں دے سکتا۔ لامحالہ یہ ڈگری اور تمغۂ جرأت بریلویوں کو ہی ملے گا۔ یہ تھا پہلا دور۔ بعدہٗ اسی برصغیر پر دوسرا دور آیا جب کہ انگریز اپنی مکاریوں اور بے غیرت مسلمانوں کی غداریوں کی بنا پر سرزمینِ ہند پر قابض ہوا تو دو قومیں اس کے لیے دردِ سر بنگئیں پہلی قوم سرحدی پٹھان اور دوسری قوم سکھ۔ ان دونوں قوموں سے لڑنے کی بھی انگریز میں :-

سکت و ہمت نہ تھی۔ انگریز نے پھر پکارا المدد۔ تو اسی برِصغیر کے کچھ لوگ لبیک کہتے ہوئے انگریز کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور کافروں کی حمایت میں غیر ملکیوں کی محبت میں اپنی ہی قوم کے قتل پر آمادہ و کمربستہ ہوئے۔ اپنوں ہی کو تہِ تیغ کیا صرف چند ٹکوں کی لالچ میں اور صاحب بہادر کی مسکراہٹ و رضا کے حصول میں۔ کون تھے یہ لوگ؟ تاریخ سے پوچھنے پر ظاہر ہوا کہ یہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد خان تھے۔ یہ کس نے بتایا؟ خود ان ہی کے حواریوں عقیدت مندوں شاگردوں کاسہ لیسوں نے بتایا اور خوب فخر سے بتایا؟ کیونکہ یہی وقت کچھ ملنے کا تھا انگریزوں کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی مسلمانوں کچھیے در پے غداریوں سے کمزور کیا جا چکا تھا۔ قوم کشی ہو چکی تھی اب وقت تھا جاگیریں تقسیم ہونے کا عہدے بٹنے کا۔ تمغۂ غداری کے حصول کا۔ اس لئے اشتہار چھپے۔ کتابیں بٹیں۔ تقریریں ہوئیں خطبے پڑھے گئے اور بڑے شد و مد اعلانات ہوئے کہ ہم ہیں جنہوں نے انگریزوں کی حمایت کی، ہم ہی ہیں جنھوں نے اپنوں کو مارا اپنا ملک غیروں کو دیا۔ اور عیسائیت کی جڑیں مضبوط کیں۔ اور اسلام کی بنیادوں کو اکھیڑا انگریز کے مقابلے میں جو بھی آیا مسلم یا غیر مسلم ہمارے ہی تیروں کا نشانہ بنا۔ تاریخیں تو چھپ گئیں کتابیں تو شائع ہو گئیں خطبے تو مشہور ہو گئے کہ وہ حقیقت تھی چھپ نہ سکتی تھی مگر ملا کیا۔؟ آخرت کو خدا جانے دنیا میں صرف سر کا خطاب اور شہید کا لقب۔ حضرت جی اسی پر پھولے نہیں سماتے کہ انگریز صاحب بہادر نے ہم کو سر سید احمد خاں کہدیا۔ اور قوم نصاریٰ نے ہم کو شہید کا لقب دے دیا۔ نہ کوئی عہدہ نہ کوئی جاگیر انگریز نے جو کام لینا تھا سو کھٹ پتلی بنا کر لے لیا۔ میں کہتا ہوں کہ کل تک جس پر تم کو فخر تھا آج اس کی اشاعت سے گھبراہٹ کیوں؟ وجہ ظاہر ہے کہ وہ وقت انعام ملنے کا تھا مگر یہ وقت محاسبے کا ہے۔ وہ زمانہ لالچ کے پورا ہونے کا تھا یہ زمانہ محاکمے سے خوف کا بدیں وجہ وہ عرصہ کارگزاری کے اظہار کا تھا یہ عرصہ غداری کے چھپانے کا۔ مگر کہاں تک چھپا سکتے ہو۔ یہ تو ان لوگوں کی خوش قسمتی ہے اور قدرت کی طرف سے غالباً ڈھیل ہے کہ ابھی تک کسی حکومت نے صحیح طور محاسبہ نہ کیا۔ ان دو دوروں کے بعد اسی ایشیاء کوچک پر پھر دوسرا وقت آیا جب انگریز کی ٹکر جرمن سے ہوئی ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا یہی برطانوی سامراج ہٹلر سے شکست کھانے لگے تو برِصغیر کے مقبوضہ علاقے کے باشندوں کے سامنے وعدے کئے کہ تم لوگ ہماری مدد کرو اگر ہٹلر شکست کھا گیا تو ہم تمہارا علاقہ تم کو واپس کر کے برطانیہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ۔ سب نے سر دھڑ کی بازی لگا کر خوب مدد کی اور ہٹلر شکست کھا گیا۔ انگریز اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے جب ملک چھوڑنے لگا تو یہاں کے مسلمان

اور ہندو باشندوں میں اختلاف ہوا کہ ملک کس کے سپرد ہو۔ ہندوؤں اور ان کے بڑے لیڈر نہرو گاندھی۔ پٹیل۔ وغیرہ کا منشاء تھا کہ ملک سارا ہم کو ملے۔ اس لیئے انہوں ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگایا مگر مسلمان لیڈر تقسیم کے طالب تھے ان کا نظریہ تھا کہ ہندو مسلم علیحدہ دو قومیں ہیں۔ ان کے وطن بھی علیحدہ ہونے چاہیئے۔ چنانچہ علاقۂ ہند سے مولانا احمد رضا خانؒ نے ترکِ موالات و دو قومی نظریے کی تحریک چلائی۔ اور علاقۂ پنجاب سے علامہ اقبال نے اسی تحریک کی حمایت میں علیحدہ مسلم ریاست کا خاکہ پیش کیا جس کو بعد میں چل کر پاکستان کا نام دیا گیا۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ نے اسی تحریک کے ضمن میں ۱۸۹۶ء کے دوران پٹنہ کے علاقے میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد کی جس میں تمام اہلسنت علماء و مشائخ کو اس اسٹیج پر جمع کیا کہ مسلمانوں کے لیئے علیحدہ ملک ہونا چاہیئے۔ یہ تحریک تاریخی و عملی طور پر اتنی کامیاب ہوئی کہ اس تحریک نے آگے چل کر عملی جامہ پہنانے والے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بصیرت افروز قیادت کے لیئے راہ ہموار کر دی۔ اس دور میں بھی دیوبندی حضرات نے تمام مسلمانوں سے مختلف راہ نکالی اور ہندو نوازی کرتے ہوئے ہندؤں کے ساتھ لگ گئے اور بجائے دین پرستی کے وطن پرستی کو سامنے رکھا۔ مذہبی اختلاف سے کنارہ کش ہو کر ہم قومیت کا پرچار کرتے ہوئے ہندو نعرے کی حمایت میں اپنا اور اپنے فتووں کا زور لگانے لگے۔ اور ہندؤں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے۔ مودودی صاحب ع۲ عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب حسین احمد مدنی وغیرہ لیڈروں نے اپنی اپنی پارٹیاں تشکیل دیں۔ اور سب جماعتوں کو ہندو جماعت میں لگایا مسلمانوں کی عالم گیر آواز کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اس تشکیل بازی نے بڑے سیلاب کی شکل اختیار کر لی تو ربِ قدیر جَلَّ مجدہٗ نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اس سیلابِ باطل کو روکنے کے لیئے مقرر فرمایا۔ اور آپ نے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کے لیئے مسلم لیگ مرتب فرمائی۔ مسلم لیگ کی تحریک کے وقت بھی اس سرزمین میں دو ہی جماعتیں تھیں۔

ع۱:۔ بریلوی۔ ع۲ دیوبندی (اگرچہ دیوبندیت کی شاخیں آج تک بہت ہیں) مثلاً مودودیت وہابیت۔ خاکساریت) ان دونوں کا کردار محمد علی جناح کے ساتھ بھی وہی رہا جو سابقہ پہلے دور میں بہادر شاہ اور انگریز کے ساتھ رہا۔ چنانچہ۔ دیوبندیہ مسلم لیگ اور اس کے بانی قائدِ اعظم اور نظریۂ پاکستان کے سخت مخالف رہے اور کانگریس کے ساتھ شامل ہوئے:۔ مودودی صاحب نے بھرپور طریقے سے قائدِ اعظم کی مخالفت کی دیکھوان کی کتاب سیاسی کشمکش عبدالماجد دریابادی وہابی نے اپنے ماہنامے سلک جدید میں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کو مشرک لیگ اور مشرکوں کی جماعت لکھا۔ ابو الکلام آزاد نے الہلال رسالے میں قائدِ اعظم بانی پاکستان کے خلاف

جو گستاخانہ زہر اگلا اس کا دہرانا چنداں مفید نہیں۔ سب عوام و خواص کو یہ معلوم ہے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی دل بھر پاکستان کی مخالفت کی حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ قائدِ اعظم سے گاندھی ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ تھا اس قوم کا کردار دورِ اوّل اور دورِ ثالث میں پہلے انگریزوں کی دوستی کا دم بھرتے رہے پھر ہندوؤں کی چاپلوسی کو دھرم بنایا مخالف ہوئے تو صرف مسلمانوں کے نقصان پہنچایا تو صرف کس کو؟ اپنوں کو۔ آخر کیوں؟ صرف لالچ میں۔ ابوالکلام نے تو ہندوستان کی وزارت بھی حاصل کر لی۔ اور ان کے مرید خاص ڈاکٹر ذاکر حسین نے صدارت کی لالچ میں مورتی کو سجدہ بھی کر لیا۔ ادھر تو حال تھا دوسری قوم بریلوی لوگوں کی تاریخ اس سے یکسر مختلف ہے چنانچہ مسلمان لیڈر صدرالا فاضل سید مولانا نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی ایسی شاندار حمایت کی جو آگے چل کر پاکستان بننے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ قائدِ اعظم کی ہی حمایت اور ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے۔ آل انڈیا بنارس کانفرنس منعقد فرمائی اور اپنے مشیر خاص پیر جماعت علی شاہ علی پوری صاحب کو اپنی پر اثر تقریر سے قائل و مائل کیا کہ قائدِ اعظم کی حمایت دراصل اس وقت اسلام کی حمایت ہے۔ صدر الا فاضل مولانا نعیم الدینؒ صاحب قبلہ کا یہ خداداد انفرادی ملکہ تھا کہ آپ کی تقریر دلپذیر سخت سے سخت انسان کے دل کو بھی موم کر دیتی تھی۔ جیسا کہ حضرت مولانا نعیمی مراد آبادی حال کراچی مدظلہ العالی نے مجھ کو بتایا۔ اس وقت گویا کہ صدر الا فاضل قائدِ اعظم کے دستِ راست کی حیثیت سے تھے۔ پیر جماعت علی صاحبؒ کے کہنے سے پیر مانکی شریف پیر مہر علی شاہ صاحب اور تمام برصغیر کے بریلوی علماء و مشائخ مولانا سید نعیم الدین علیہ الرحمۃ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مسلم لیگ کی حمایت میں کمر بستہ ہوئے اور اسی سلسلے میں بنارس کانفرنس منعقد ہوئی جو تاریخ کی پہلی شاندار و کامیاب سنی کانفرنس تھی ۱۹۴۶ء اس ہی کانفرنس سے جگمگا اٹھا۔ تمام علاقوں سے۔ جلوس کے جلوس بنارس پہنچے۔ حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خانؒ گجرات سے عظیم قافلہ لے کر بنارس پہنچے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی حمایت میں یہی وہ کانفرنس تھی جس نے ہندوستان بنیاساماج انگریز سے سودے بازی کرنے والے ہندو لیڈر اور ہندو نواز دیوبندی حضرات کو بوکھلا گئے۔ اور اس کانفرنس کو خراب کرنے کی کوشش اور شرارت کرنے کا پروگرام بنایا۔ مگر جب کسی طرح حیلہ گری کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو پیر جماعت علی صاحبؒ علی پوری کی تقریر کے اس والہانہ محبت کے فقرے پر ہی شور برپا کر دیا جو آپ نے دورانِ وعظ قائدِ اعظم جناح کے وقار کی خاطر اُن کو ولی اللہ کہہ دیا تھا۔ اس خطاب پر شرارت کے لیے آئے ہوئے دیوبندی حضرات نے اتنا شور مچایا کہ خطرہ پڑ گیا کہیں باقی کانفرنس ناکام نہ ہو جائے۔ مگر صدرِ کانفرنس بانیِ محفلِ سنیت صدر الا فاضل سید نعیم الدین کی پر اثر صلاحیتوں خطاباتِ دلنواز کا اثر تھا کہ تین گھنٹے بعد یہ شور ختم ہوا اور کانفرنس کامیابی سے

جاری ہوئی یہی وہ کانفرس تھی جس سے مسلمانوں کے دل میں عشق کی حد تک مسلم لیگ سے محبت پیدا ہوئی۔ اور چودہ کروڑ مسلمان کا ووٹ مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کو ملا۔ موازنہ صرف یہ کرنا ہے کہ بریلوی علماء و مشائخ عظام قائدِاعظم کے ساتھ کیوں لگے اور دیوبندی لوگوں نے اور وہابی لیڈروں نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی مخالفت کیوں کی۔ ظاہراً وجہ صرف یہی ہے کہ قائدِ اعظم کے پاس صرف ایک ہی نعرہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اس بے بارک نڈر بے لوث مخلص محسن شخصیت نے صرف یہی تو کہا تھا کہ پاکستان میں قانونِ محمدی کا جھنڈا گاڑھا جائے گا۔ جو اُن سے ملا وہ بھی اسی نعرے کی وجہ سے اور جو اُن کا مخالف ہوا وہ بھی اسی نعرے کا مخالف تھا۔ یہی نعرہ قائدِاعظم کو کامیاب کرا گیا رہتی دنیا تک عزت بڑھا گیا۔ ورنہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ کبھی کسی نے اس طرح نظریاتی طور پر ملک نہیں بنایا۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ بنیادِ پاکستان میں قائدِاعظم کا کمال نہیں بلکہ نامِ پاکِ احمد مجتبےٰ کا کمال ہے صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمْ۔ ورنہ کون کسی کی خاطر سر کٹاتا ہے گھربار لٹاتا ہے۔ وطن گنواتا ہے۔ خون بہاتا ہے۔ یہ تو شانِ پاک مصطفےٰ ہی کا کرشمہ ہے کہ۔

ع۔ سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

ہاں قائدِاعظم کا جذبہ قابلِ فخر ہے اور ان علماء و مشائخ بریلویہ کا مخلصانہ ساتھ و حمایت قابلِ ذکر ہے۔ جس سے تاریخِ پاکستان درخشندہ اور جس کی بنا پر قائدِاعظم محسن بن گئے۔ یہ تھے تین دور جن میں دیوبندی کردار تاریخی طور پر معاندانہ و مخالفانہ ہی ثابت ہوئے۔ یہ ذکر ضمناً ہو گیا ورنہ اصل مقصود درمیانی اور دوسرے دور کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ مستفتی کے مرسلہ رسالے کے دیباچہ میں اسی دور کا ذکر کیا گیا ہے اور تاریخ سے بالکل ہٹ کر اسی چیز کا انکار کیا گیا ہے۔ جس کو ان ہی کے اکابر کی محررہ تاریخ فخریہ پیش کر رہی ہے میں نے مندرجہ بالا سطور میں۔ دیوبندی کتب سے ہی ثابت کیا کہ اسماعیل دہلوی اور اس دور کے دیوبندی مرکزی حیثیت رکھنے والے پیشوایانِ دیوبندیت کا عملی کردار انگریزی حکومت کی محبت اُن سے لگاوٹ اُن کے حکم اور اُن کے چندوں پر ان کی دولتِ برطانیہ پہ سکھوں سے جنگ رہی مجھ کو اس تفتیش میں باوجود کوشش بسیار کے ایک کتاب بھی ایسی نہ ملی۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ دیوبندی لیڈر سا انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑے ہوں۔ ہاں البتہ مزید یہ ثابت ہوا کہ وہابی ٹولہ انگریز کے حکم سے صرف سکھوں سے نبرد آزما رہا بلکہ مسلمانوں سے بھی انگریز کو مضبوط کرنے کے لیئے لڑا اور تمام مسلمان ان جنگجو وہابیوں کو انگریز کا جاسوس سمجھتے تھے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل چند اس ہی زمانے کی خود اُن کی ہی تاریخی تصنیفات سے بہ واضح ہو رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ع۱ : مکتوب محمد اسماعیل دہلوی سید احمد کتاب سید احمد شہید کے مکتوبات ص۲۴ لکھتے ہیں ۔
یہاں یعنی سرحد میں دو معاملے درپیش ہیں ایک تو مفسدوں مخالفوں کا ارتداد ثابت کرنا اور قتل و خون کے جواز کی صورت نکالنا۔

ع۲ : مکتوباتِ سید احمد شہید ص۱۲۵ : مکتوب بنام سردار میر عالم میں لکھتے ہیں :۔
منافقین کے ساتھ جہاد کرنا ایک واجب معاملہ ہے اس لئے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قرب و جوار میں بدکردار (پٹھان) منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتار تک پہنچ گیا ہے ۔

ع۳ تاریخ تنادلیاں ص۴۹ پر لکھا ہے ۔
القصہ پھر تو خلیفہ نے پائندہ خان سرحدی پٹھانوں کے امیر کے خلاف فتوے کفر دے کر محمد اسماعیل کے لشکر کے ساتھ مل کر پائندہ خان سے جنگ کا ارادہ و تیاری کی :۔

ع۴ :۔ سید احمد شہید ص۵۶ بنام شاہزادۂ کامران ۔
جب امامت کا کام پورا ہو گیا تو شاہ صاحب نے منکرین امامت کو باغی اور واجب القتل قرار دیا۔

ع۵ مکتوبات سید احمد شہید ص۵۶ بنام شاہزادۂ کامران ۔
سوالنامہ آپ نے تو سکھوں سے جنگ کرنی تھی وہ تو پنجاب میں ہیں آپ لوگ یہاں سرحدی مسلمانوں کے علاقوں میں مسلح لشکرلے کیوں آئے ۔ جواب نامہ مکتوب ۔ چونکہ ان منافقوں نے سرکشوں کی حمایت کی ہے اس لئے ان کی گوشمالی ضروری ہے اور پہلے جہاد ان مسلمانوں کے خلاف کیا جائے اور یہاں سے فراغت کے بعد پنجاب کے سکھوں سے بات ہو گی ۔

ع۶ : کتاب فریاد مسلمین ص۱۰۲ پر ہے :۔
جب سرحدی پٹھان مغلوب نہ ہوئے تو ایک دن بہت سے ملکی جمع کر کے مولوی اسماعیل صاحب خود اُن کے مقابل گئے مد مقابل پٹھان یوسف زئی جرگہ تھا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی مولوی صاحب کی پیشانی پر ایک یعقوب نامی یوسف زئی پٹھان کی گولی لگی ۔ اور شہید ہو گئے ۔

ع۷ :۔ مضمون الجیہ ہسپانیہ کے عوامل از یوسف جبریل ۔ یہ مضمون روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۵ اگست ۱۹۷۶ء میں بھی چھپا تھا۔ اس کا ایک فقرہ اس طرح ہے ۔
اسماعیل شہید جیسے لوگ سر سے کفن باندھ کر نکلے لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے ۔ اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے :۔

ع۸ :۔ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کا مقدمہ کتاب کابل میں سات سال مصنف عبداللہ سندھی صـ۱۶ پر لکھا ہے:۔
بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہید اور ان کے ساتھی شہید کر دئے گئے اور خود آزاد قبائل میں سے بعض لوگوں نے ہندوستانی مجاہدین کو لوٹا گھسوٹا اور قتل کیا۔

ع۹ مقالات سرسید حصۂ نہم صـ۱۳۹ پر لکھا ہے :۔
ہندوستان کے گوشۂ شمال و مغرب میں سرحد پر جو پہاڑی قومیں رہتی ہیں وہ سنی المذہب حنفی قومیں ہیں چونکہ یہ پہاڑی قومیں سید احمد و اسماعیل دہلوی کے عقائد کی مخالف تھیں اس لیے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے اور انہوں نے ہی مولوی اسماعیل صاحب و سید صاحب کو شہید کر دیا :۔

ع۱۰ :۔ کتاب علماءِ ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صـ۲۴۵ پر لکھتے ہیں۔
خود مسلمانوں کے ہاتھوں سید صاحب کے غازیوں کے بڑے حصہ کو ایک ہی رات میں ذبح کروایا

ع۱۱ :۔ الحیات بعد الممات صـ۲۰۴ پر لکھا ہے۔
اس بے وفا قوم نے عین حالتِ جنگ میں بے وفائی کی جس سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اور منافقوں نے مولوی اسماعیل صاحب کو شہید کر دیا وہ ۱۲۴۶ھ کو ۲۴ ذیقعد تریپن سال کی عمر میں شہید ہوئے :۔
ان تمام حوالاجات سے واضح ثابت ہوا کہ وہابی لوگ اس وقت بھی حنفی مسلمانوں کو مرتد۔ منافق۔ مشرک بدعتی کہتے رہے اور ان پر کفر کا فتوے لگا کر ان کو قتل کرتے رہے۔ اور یہ کہ اسماعیل دہلوی وغیرہ کے نزدیک نہ مسلمان پیارے تھے نہ ہم وطن۔ ان کے پیارے تو صرف انگریز تھے۔ کیونکہ وہ دولت مند اور خوبصورت تھے۔ اور ان کا سورج چڑھ رہا تھا اور یہ وہابی ہوئے تاریخی۔ دولت اور چڑھتے سورج کے پجاری سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر مسلمانوں نے ان وہابی لشکروں کا ساتھ کیوں نہ دیا۔ یہ بھی خود ان کی زبانی سنئے :۔

ع۱ حاشیہ مقالات سرسیّد حصۂ سولھواں مصنف محمد اسماعیل پانی پتی صـ۲۵۱ پر لکھا ہے۔
جب حضرت شہید بعزم جہاد صوبہ سندھ اور سرحد کے علاقے میں داخل ہوئے یہ صوبے اس وقت انگریز کی عملداری میں نہ تھے۔ تو ان کے متعلق عام طور پر یہ شبہ کیا گیا کہ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ اور یہ شبہ اس لیئے کیا گیا کہ حضرت شہید کے تعلقات انگریزوں سے نہایت درجہ خوشگوار تھے :۔

ع۲ :۔ کتاب سیّد احمد شہید حصۂ دوم مصنف غلام رسول مہر وہابی صـ۲۸ پر لکھتے ہیں :۔
سرحد کے حنفی علماء نے یہ فتوے دیا کہ۔ وہ (یعنی مولوی اسماعیل شہید اور سرسیّد احمد شہید) ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیا دین انھوں نے نکالا ہے کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے

سب کو برا کہتے ہیں انگریزوں نے انھیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے ان کی باتوں میں نہ آنا عجب نہیں تمہارا ملک چھنوا دیں۔

ع۳:۔ کتاب سید احمد شہید مصنف غلام رسول مہر ص۲۹۷ پر لکھا ہے۔

کاردیں جوان شاہ۔ سید صاحب سے ملاقات کے لیے آئے اور ایک بڑا بھینسا بطور نذر پیش کیا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ لوگ عام طور پر سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھتے ہیں اسی لیے بد کہتے ہیں۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات واضح ہوئی کہ مسلمان کیونکہ وہابیوں سے متنفر ہوئے۔ اس کا سیاسی پس منظر یہی تھا کہ ان کے انگریزوں سے خوشگوار تعلق تھے۔ اور یہ خوشگواری اس حد تک تھی کہ جو انگریز سے نفرت کرتا یہ وہابی لوگ اس کو مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے اور باقاعدہ جنگ کرتے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ثابت کر دیا اور جو انگریزوں سے جنگ کرتا تو یہ ہی وہابی اس سے نفرت کرتے اس کے خلاف کفر۔ شرک کے فتوے دیتے جیسا کہ ابھی ان ہی کی کتب سے ثابت کیا جائے گا۔ چنانچہ ع۱۔ حاشیہ مقالات سرسید حصہ سولہواں مصنف و مرتب محمد اسماعیل پانی پتی ص۳۵۲ پر لکھا ہے۔

۱۸۵۷ء میں پورے جوش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب علمائے کرام تھے جو عقیدۃً حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسماعیل کے شدید ترین دشمن تھے اور جنہوں نے حضرت شاہ اسماعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں۔

ع۲:۔ ترجمان وہابیہ از نواب صدیق حسن وہابی ص۵۵

انگریزوں سے جنگ کرنے والے اور جہاد کا فتوےٰ دینے اور مہر لگانے والے غالباً وہی لوگ تھے جو اہلِ سنت اور اہلِ حدیث کو زبردستی وہابی کہتے ہیں۔

ع۳ الاقتصاد فی مسائل جہاد مطبوعہ قاسمی پریس دہلوی ص۴۹ پر لکھا ہے

۱۸۵۷ء میں جو مسلمان انگریز کے خلاف جنگ لڑے وہ سخت گنہگار۔ اور بحکم قرآن وحدیث وہ مفسد۔ باغی اور بدکردار تھے۔ سمجھدار لوگ اس میں ہرگز شریک نہ ہوئے۔

ع۴:۔ تذکرۃ الرشید حصہ اول از عاشق الٰہی میرٹھی ص۷۳ پر لکھا ہے۔

بعض کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی (انگریزی حکومت) کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل حکومت گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم اٹھایا۔ اور قائم کیا:۔

یہ تھی میری وہ تحقیق جو تاریخی طور پر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی تاکہ غیر جانب دارانہ طور پر

یہ ثابت ہو جائے کہ مذکورہ فی السؤال صاحب تحریر کا یہ نعرہ قطعاً غلط اور جھوٹ ہے کہ وہابیوں نے انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جنگ کی۔ صرف زبانی باتیں کرنے سے تو کوئی کسی کو نہیں روک سکتا البتہ تاریخ وہابیت بتاتی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ کلمہ گو مسلمانوں کو کافر مشرک۔ بدعتی کہہ کر قتل کیا۔ یہ اتنے کثیر حوالے محض اس لیئے دیئے گئے کہ رسالے کا پورا جواب ہو اور اتمام حجت ہو جائے۔ ورنہ انگریزی دور میں ان کا انگریز کا ساتھ دینا اور پٹھان مسلمانوں سے جنگ کرنا اور برصغیر کے مسلمانوں کو قتل کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ ایسی غداریوں اور بغاوتوں سے اُن کی تاریخ بھری پڑی ہے یہی ہیں وہ لوگ جن کا پہلا نام خارجی (دیکھو فتاوٰے شامی) دوسرا نام نجدی (دیکھو حدیث پاک) تیسرا نام وہابی چوتھا نام دیوبندی۔ یہ بھی میں جانتا ہوں میری اس صاف صاف باحوالہ اور غیر متعصبانہ تحریر کو یہ تسلیم نہ کریں گے۔ مگر باانصاف لوگ اس حقیقت سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ آج اگر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم انگریز کے دشمن ہیں تو فقط اس لیئے کہ انگریز یہاں موجود نہیں اور آج پھر انہیں پاکستان کی کرسی کی طلب ہے۔ یہ پاکستان کی عوام اور حکومت کی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اس قوم کا محاسبہ نہیں ہوا۔ اب رہے وہ اعتراضات جو ضمناً صاحب رسالہ نے بریلوی گروہ پر وارد کیئے۔ اُن کے جواب حسب ذیل ہیں:۔

پہلا اعتراض:۔ کہ بریلوی لوگوں نے معاذاللہ نبی کریم کو شکاری اور دھوکہ باز کہا۔ **جواب** یہ اعتراض اتنا کمزور بلکہ متعصبانہ جاہلانہ اور گستاخانہ ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کا قطعاً جواب نہ دیا جائے۔ لیکن چونکہ خاموشی سے عوام غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہٰذا کج فہمی کی وضاحت ضروری ہے۔ اس اعتراض میں تعصب تو یہ ہے کہ معترض وہابی صاحب نے جو حوالہ جاء الحق صفحہ ۱۷ کا پیش کیا وہاں لفظ دھوکے باز نہیں ہے۔ یہ لفظ وہابی صاحب نے اپنے پاس سے لگایا جو سراسر خیانت ہے اور جاء الحق میں صراحتاً کہیں بھی نہیں لکھا کہ نبی کریم شکاری ہیں۔ بلکہ محض تشبیہ ہے۔ اور تشبیہ اصل حقیقت نہیں ہوتی جس طرح دن رات کہا جاتا ہے کہ زید مثل شیر کے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں بہت جگہ تشبیہات پیش فرمائی ہیں اور تشبیہ پر اعتراض کرنا یہودی کفار کا طریقہ ہے۔ جیسا کہ پہلا سیپارہ وضاحت فرماتا ہے۔ وہابی معترض کی گستاخی یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ والہٖ وسلم کو کس طرح بے باکانہ طریقے سے بلا جھجک دھوکے باز کی نسبت دے رہا ہے۔ اِن ظالموں کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ جس پر اعتراض کر رہا ہے اس کی کتاب میں اس لفظ کا شائبہ تک نہیں اور یہ خود اپنے پاس سے یہ کفریہ لفظ بڑھا رہا ہے تو گویا اس گستاخی کا خود اسی معترض کو شوق ہے۔ اس اعتراض میں جہالت و حماقت یہ ہے کہ شکار کرنا دھوکے بازی نہیں اور شکاری کو دھوکے باز کہنا شرعاً گناہ ہے۔ قرآن مجید کے خلاف ہے اور تمام اہلِ علم اور اہلِ لغت اس کی تردید کرتے ہیں:۔ باری تعالےٰ رب العزت قرآن پاک کی پانچویں سورت مائدہ کی آیت ۲ میں ارشاد فرماتا ہے:۔

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا - (ترجمہ) :- اور حاجیو جب تم احرام سے کھل جاؤ تو شکار کرو - اس آیت میں شکار کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ صیغہ امر کا ہے - یہ امر اگرچہ استحبابی ہے مگر حکم ہے کس کو ؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رض کو اور تمام مسلمانوں کو تا قیامت - یعنی شکار کرنا مستحب ہے جس کا حکم خود اللہ فرماتا ہے - کہ شکار کرو - اگر معاذ اللہ شکار کرنا دھوکے بازی ہے جیسا کہ وہابی معترض نے کہہ دیا - تو کیا معاذ اللہ اللہ کریم نے دھوکے بازی کا حکم دیا - اور نبی کریم و صحابہ کو دھوکے بازی کی اجازت مستحب کر دی - کیسی کفریہ حماقت ہے - بریلویوں کو برا کہتے ہو نادانی تو خود آپ کی ثابت ہو گئی اور قرآن پاک کی گستاخی تو آپ نے کر دی - خیال رہے کہ شکار کا لغوی ترجمہ ہے کسی کو اپنے ساتھ مائل کرنا - چنانچہ مشہور لغت المنجد ی عربی مصری صفحہ ۴۵۶ پر ہے :- صَادَ زَیْدًا اَیْ جَعَلَہٗ اَحِبُّہٗ اَیْ مَائِلَ الْعُنُقِ - (ترجمہ) :- شکار کیا - اس نے زید کو یعنی مائل کر لیا اس نے زید کو گردن سے اپنی طرف - تمام اہل علم اسباب پر متفق ہیں کہ کسی کو ایک راہ سے ہٹا کر دوسری راہ پر لانا چار طریقے سے ہوتا ہے :- ۱ اچھی راہ سے ہٹا کر بری راہ پر لانا - اضلال ہے یہ حرام ہے ۲ کسی کو اچھا راہ بتانا ہی نہ بلکہ برے راہ کی ایسی تعریف کرنا کہ چلنے والا اس کو اچھا سمجھے یہ اخداع ہے یہ سخت گناہ ہے بلکہ یہ سخت گناہ ہے بلکہ یہ بھی حرام ہے ۳ کسی کو برے راہ سے ہٹا کر اچھے راہ پہ لانا یہ تدبیر ہے یہی ایمان ہے - کسی متلاشی کو اچھے راہ کی خوبیاں سنا کر اچھے راہ پر لے آنا - یہ حیلہ ہے اسی کو ہدایت کہتے ہیں - بس یہی چار طریقے ہیں کسی کو اچھی بری طرف مائل کرنے کے - اضلال - اخداع - تدبیر - حیلہ اردو میں اس کے ترجمے ہیں ۱ گمراہ کرنا ۲ دھوکا دینا ۳ تدبیر کرنا - ۴ حیلہ کرنا - شریعت میں پہلے دو کام ناجائز ہیں اور دوسرے دو کام جائز و ضروری ہیں - دھوکا دینا ہر شریعت ہر قانون ہر رواج اور ہر معاشرے میں سخت ترین عیب اور گناہ ہے بجز کافر بحالت جنگ اس کے علاوہ کبھی دھوکا دینا جائز نہیں بدیں وجہ دھوکے باز انسان ہر معاشرے میں برا سمجھا گیا - اضلال یعنی گمراہ کرنا اور کسی کو غلط پٹی پڑھانی دینی اور مذہبی لحاظ سے قابل نفرت کام ہے - لیکن تدبیر کرنا اور اسی طرح کسی کام کا حیلہ کرنا ہر قانون میں ہر وقت جائز ہے - فقہاء کرام ہر بری چیز سے بچنے کے لیے عوام کو چلانے کے لیے بے شمار شرعی حیلے بیان فرماتے ہیں - اور اس کا نام رکھا کتاب الحیل - یعنی حیلوں کی کتاب پنجابی مقولہ مشہور ہے - کہ حیلے رزق بہانے موت ، یعنی رزق حیلوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور موت بہانے سے آتی ہے - ثابت ہوا کہ حیلہ کرنا بالکل جائز ہے اور حیلہ والا شخص قابل قدر ہو سکتا ہے قابل نفرت نہیں - جب یہ سمجھ لیا تو یاد رکھو اہل علم و اہل لغت کے نزدیک شکار کرنا اور شکاری ہونا دھوکے بازی نہیں بلکہ حیلہ کرنا ہے - چنانچہ المنجد عربی مصری صفحہ ۴۵۲ پر ہے :- وَصَادَ الطَّیْرَ قَنَصَہٗ وَاَخَذَہٗ بِحِیْلَۃٍ - (ترجمہ) :- اور شکار کیا اس نے پرندے کو یعنی حیلے

سے پکڑا۔ ثابت ہوا کہ شکار کرنے کا مطلب ہے حیلے سے پکڑنا اور حیلہ تو ہر طرح جائز ہے۔ کیونکہ حیلے کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اپنے اُس حق کو جو حاصل نہ ہو رہا تھا تو کبھی تدابیر سے حاصل کر لینا۔ ساری مخلوق حیوانات و جمادات و نباتات چرند پرند۔ درند۔ بحری و برّی انسان کے لیئے بنیں اور تمام انسان انبیاء کرام کے لیئے پس جس طرح انسان کو شرعاً ہر طرح حیوانات برّیہ و بحریہ کا شکار جائز ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام کو جائز ہے۔ کہ جہنم کی وادیِ بیابان کی طرف دوڑتے وحشی انسانوں کو شکار کر کے شریعت کے جال میں جکڑ کر معرفت کے سنہری پنجروں میں بند کریں اور جنت کے محلوں کی طرف لے جاتے ہوئے عالم لاہوت کے باغوں میں چھوڑ دیں کہ کہیں انوار و تجلیات کے بحر انوار میں غوطے لگائیں اور کبھی مشاہداتِ اسرار کے میوے کھائیں۔ یہ وہ پیارا شکار ہیں اور یہ وہ دل نواز شکاری ہیں کہ

ع ، ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف ۔ بامید زانکہ روزے بشکار خواہی آمد

یہی وہ شکار ہے کہ عرب کے صحرائیوں کو پکڑ کر۔ صدیق و فاروق۔ اسد اللہ و سیف اللہ بنا دیا۔ کیا ہم اس شکار ہونے پر ناز نہ کریں کیا شکار کر کے پکڑنے والے اور دامنِ رحمت سے باندھنے والے کا احسان نہ مانیں۔ ہم وہی وحشی تھے۔ سے جو

۔ آزردہ پھر رہے تھے ہم اس کائنات میں۔ ہم بیکسوں کی بات بنائی حضور نے (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

بدنصیب وہابی اس کو دھوکا بازی کہتا ہے۔ جب جسمانی شکار اور حیوانات کا شکار جائز ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بہت شکار کھیلتے تھے دیکھو تاریخ اور قصص ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تفاسیر قرآن کریم حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو شکار کرنے کی اجازت دی۔ تو انسانوں کی بہبود کے لیئے انسانوں کا شکار کیوں منع ہو گا۔ بہت سے صحابہ کبار بھی شکاری تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی نے جسمِ حیوانی کو شکار کیا مگر پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم نے دلوں کا شکار کیا کاش ہم بھی اُنکے شکار ہو جائیں دوسرے اعتراض کا جواب معترض کہتا ہے کہ جاء الحق صہ ۹۱ پر لکھا ہے۔ بحث علم غیب میں اے کافرو میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں۔ اس عبارت پر وہابی معترض اپنا مطلب نکالتے ہوئے۔ بریلوی لوگوں کو ہدفِ تنقید بنانے کی غرض سے لکھتا ہے۔ (کہ نبی کریم نے اپنے خزانے بچانے کے لیئے کفار کے سامنے جھوٹ بولا کہ میرے پاس خزانے نہیں ہیں۔ میں آن دریدہ دہنوں بریلویوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا مختارِ کل عالم الغیب اور حاضر ناظر کا مال چوری ہو سکتا ہے۔ اور اس عبارت میں تمنے چوروں کی طاقت حضور اکرم سے زیادہ تسلیم نہیں کر لی۔) یہ تھی معترض کی عبارت جو اُسنے بلا جھجک نڈر ہو کر پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ۔ منسوب کر دیا۔ ایسی بات لکھتے ہوئے مومن کا قلم کانپ جاتا ہے۔ جاء الحق میں نہیں

لکھا کہ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ ہمارے آقا نے کفار کے سامنے جھوٹ بولا اور کیسے لکھ سکتے تھے بھلا کس کی جرأت ہو سکتی ہے بریلوی علما تو درکنار عوام بھی ایسی گستاخی سے کانپ جائیں یہ جرأت تو تاریخ نے وہابیوں کی ہی ثابت کی ہے کہ بغیر معاذ اللہ کے اس طرح کی گستاخی لکھنے میں بے باک ہیں۔ وہابی معترض یہ اعتراض اُس آیت کی تفسیر پر کر رہا ہے جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے۔ سورۂ انعام کی آیت پ۷ع۱۵ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ؕ۔ سے متعلق جاء الحق حصہ اوّل ص۱۴۰ پر فرمائی ہے۔ میں یہاں اس آیت کی لمبی چوڑی تفسیر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ مفسرین کرام نے بہت تفسیریں فرما دیں ہیں۔ میں مندرجہ ذیل چند سطور میں معترض کی چند خامیوں کا علمی طور پر ذکر کروں گا۔ جس سے اعتراض کی کمزوری اور معترض کی جلد بازی۔ حماقت۔ وجہالت اور کج فہمی ثابت ہو جائے گی۔ اس اعتراض سے بھی مصنف کا مقصد محض عوام کو بہکانا فریب دینا ہے بریلویوں کو بدنام کرنا ورنہ حقیقت کچھ نہیں نہ اس تفسیر سے معاذ اللہ جھوٹ ظاہر ہوتا ہے نہ کمزوری۔ نہ عجز نہ ہی نبی اکرم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مختار کل۔ غیب دانی۔ اور حاضر و ناظر پر فرق آ سکتا ہے۔ یہ آیت بھی اپنی جگہ بالکل اسی تفسیری آن بان کے ساتھ نیر تاباں ہے۔ جو حکیم الامت نے تفسیر کی اور پیارے آقا علیہ السلام مختار کل۔ غیب دانِ کائنات۔ حاضر و ناظر بھی بعطاءِ الٰہی تا قیامت ہیں۔ صرف دیدہ کوری تو نصیب وہابیان و دیابنہ ہے۔ اعتراض دوم میں خامیاں ہیں۔

پہلی خامی:۔ یہ کہ اس اعتراض میں ایک خیانت ہے وہ یہ کہ جاء الحق میں کہیں بھی جھوٹ کا ذکر تک نہیں معترض نے خود اپنا مطلب نکالنے کے لیے جھوٹ بولنے کا لفظ بڑھا کر خیانت کی:۔

دوسری خامی:۔ یہ کہ معترض نے نہایت ڈھٹائی بے حمیتی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پاک باز مقدس ہستی کے متعلق خود اپنے الفاظ میں جھوٹ بولنے کی نسبت کر کے بدترین گستاخی کی۔ مگر یہ گستاخی ان سے متعجب نہیں کیونکہ ان کے اکابر نے تو خدا تعالیٰ کو بھی جھوٹ سے ملوث کر دیا۔ :

تیسری خامی:۔ تیسری خامی یہ کہ معترض وہابی صاحب اس آیت کی اس تفسیر پر تنقید کرتے ہیں جو قبلۂ عالم حضرت حکیم الامت نے جاء الحق میں فرمائی ہے۔ حالانکہ یہ تفسیر بالرائے یا ذاتی نہیں بلکہ حدیث پاک۔ قرآنِ کریم اور شانِ نزول و منشاءِ باری تعالیٰ کے عین مطابق ہے جیسا کہ دیگر آیات سے ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ تمام مفسرین بھی اِسی سے ملتی جلتی تفسیر فرماتے ہیں۔ یہ آیت سورہ انعام پارہ ہفتم کے آیت ع۱۵ پر ہے۔ اسی طرح کی آیت سورہ ہود پارہ بارہواں آیت ع۱ ۳ پر بھی ہے۔ مگر چند فرقوں سے ع۱ یہاں نبی کریم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرمانے کا حکم دیا گیا لہٰذا قل سے شروع فرمایا قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ ۔ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ؕ۔ اس آیت

میں حضرت نوح علیہ السلام کا قول نقل فرمایا گیا۔ ع۲ یہاں دو جگہ لَکُمْ ہے وہاں ایک جگہ۔ جاء الحق کی مذکورہ تفسیر کا دار و مدار لفظِ لَکُمْ پر ہے اور لَا اَقُوْلُ پر لفظِ لَکُمْ نے۔ لَا اَقُوْلُ کی حد بندی کر دی اور آیت پاک کو مقید کر دیا اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مضمونِ آیت خبر نہ رہا بلکہ دعوے بن گیا اور یہ خطاب سب کو نہ رہا بلکہ صرف لَکُمْ ضمیر کے مرجع کو خطاب ہوا اور وہ کفارِ مکہ کیونکہ یہ آیت مکی ہے آیت اتنی صاف اور واضح طور پر بتا رہی ہے کہ صرف کافروں سے کہا جا رہا ہے۔ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ میں تم کو نہیں بتاتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے اور علمِ غیب ہے۔ چوتھی خامی یہ کہ ہمارا معترض بالکل علم سے خالی ہے۔ اس کو نحو۔ صرف علمِ اصول و معانی سے کوئی لگاؤ نہیں یہ جہالت ہی ہے کہ دیوبندی بن کر اس طرح کے احمقانہ اعتراض کرتا ہے بلکہ وہابی بننا ہی جہالت ہے۔ اور اس تفسیر پر معترض ہے جو تمام مفسرین کے فرمودات سے ماخذ ہے۔ چنانچہ تفسیر مدارک جلد دوم صفحہ ۱۴ پر ہے :۔ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ اَیْ لَا اَدَّعِیْ۔ تفسیر روح المعانی جلد چہارم پارہ ہفتم صفحہ ۱۵۵ پر ہے :۔ وَالْمَعْنٰی لَا اَدَّعِیْ اِنَّ هٰذِهٖ الْخَزَائِنَ مُفَوَّضَةٌ اِلَیَّ (ترجمہ): لَا اَقُوْلُ کا مطلب ہے کہ میں دعوے نہیں کرتا اس کا کہ میرے پاس اللہ کے مقدورات کے خزانے سپرد کیے ہوئے ہیں۔ اصولی طور پر دعوے اور خبر میں بہت فرق ہیں پس آیت کریم کا دعوے کی نفی ہے نہ کہ حقیقت کی یہ مطلب لفظِ لَکُمْ سے ثابت ہوا یعنی صرف کفار کے سامنے دعوے کی نفی فرمائی گئی نہ کہ مسلمانوں کے سامنے لَکُمْ نے اس خطاب کو مقید کر دیا اگر یہ جملہ خبریہ ہوتا تو لَکُمْ کی قید نہ ہوتی کیونکہ خبر عام ہوتی۔ تمام مفسرین کا یہی قول ہے چنانچہ تفسیر معالم التنزیل خازن جلد دوم صفحہ ۱۴ پر ہے :۔ قُلْ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ یَعْنِیْ قُلْ یَا مُحَمَّدُ لِهٰؤُلَاءِ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (ترجمہ) :۔ یعنی اے حبیب کریم ان مشرکوں سے خزائن الٰہیہ کی بابت اس طرح گفتگو فرماؤ اور علم غیب کے متعلق بھی ان کو نہ بتاؤ۔ یہ تعلیم حکم رب نے سکھایا۔ کیوں سکھایا اس کی بڑی وجہ تو وہی ہے جو حضرت حکیم الامت نے اپنی تفسیر میں جاء الحق کتاب کے صفحات میں بتائی ہے تفسیر قرآن پاک کی دیگر آیات سے مطابقت رکھتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی وجہ تواضع انکساری فرمائی۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن جلد دوم صفحہ ۱۴ پر ہے :۔ وَاِنَّمَا نَفٰی عَنْ نَفْسِهٖ الشَّرِیْفَةِ هٰذِهٖ الْاَشْیَاءَ تَوَاضُعًا لِلّٰهِ تَعَالٰی۔ (ترجمہ) :۔ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے اپنے سے تین چیزوں کی نفی صرف بارگاہِ الٰہی میں انکساری کرتے ہوئے فرمائی نہ کہ حقیقتاً کیونکہ اصلاً آپ کے پاس خزانے بھی ہیں غیب دانی بھی ہے۔ اور ملکی صفات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بلکہ جبرائیل و میکائیل علیہما السلام سے زیادہ صفاتِ ملکیہ نبی کریم کے اندر ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد سوم صفحہ ۲۵ پر ہے :۔ فَمَنْ قَالَ اِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ فَقَدْ اَخْطَاءَ

فِیْمَا اَصَابَ وَ لَا اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَکٌ۔ وَاِنْ کُنْتُ عَبَرْتُ عَنْ مَقَامِ الْمَلَکِ۔ (ترجمہ):۔ جو گستاخ یہ کہے کہ بے شک نبی اللہ غیب نہیں جانتے اس نے حقیقت کے خلاف غلط کہا اور آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمان لَا اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ یہ بھی تواضعاً ہے کہ میں فرشتہ نہیں اگرچہ میں توت میں مقامِ ملکیت سے بھی عبور کر گیا (معراج کی رات)۔ یہ تھیں مسلمان مفسّروں کی تفاسیر۔ جو سراسر وہابی حضرات کے خلاف ہیں کیونکہ وہابی کہتے ہیں کہ نبی کریم معاذ اللہ کچھ نہیں جانتے نہ آپ کے پاس خزائن الٰہیہ ہیں۔ اور ثبوت کی آیاتِ کثیرہ و احادیث متعددہ سے یکسر کور چشمی کر جاتے ہیں وہابی حضرات اس آیت کو جملہ خبریہ بناتے ہیں۔ یہ ان کی جہالت ہے کیونکہ اس میں رب تعالیٰ کی بھی گستاخی ہے کہ اسی ذاتِ پاک نے یہ کہنے کا حکم دیا۔ اس کو جملہ خبریہ ماننے سے تمام ان آیات کا انکار لازم آئے گا جس میں رب تعالیٰ نے نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غیب کے ثبوت کا ذکر فرمایا۔ معترض کا اس تفسیر میں جھوٹ کا احتمال پیدا کرنا بھی نادانی ہے کیونکہ لَا اقول لکم جملہ انشائیہ ہے۔ یعنی میں نہیں بتاتا تم کو۔ یہاں تم کو بتانے کی نفی ہے۔ لفظِ لکم نے اس کی خبریت کو بطرفِ انشائیت منتقل کر دیا جس سے یہ جملہ انشائیہ بن گیا۔ قانون شریعت میں انشاء کی دس قسمیں ہیں۔ ۱۔ امر ۲۔ نہی ۳۔ استفہام ۴۔ تمنیٰ ۵۔ ترجی ۶۔ عقود ۷۔ ندا ۸۔ عرض ۹۔ قسم ۱۰۔ تعجب۔ مرقات منطق صفحہ ۱ پر اور تمام کتب نحاۃ میں اسی طرح ہیں۔ بہت سے موقعوں پر خبر کو انشاء بنانا پڑتا ہے۔ چنانچہ علم فصاحت کی کتاب مختصر المعانی صفحہ نمبر ۲۰۸ پر ہے:۔

وَلِاَنَّ اَکْثَرَ هَا فِی الْاَصْلِ اَخْبَارٌ نُقِلَتْ اِلٰی مَعْنَی الْاِنْشَاءِ۔ (ترجمہ):۔ اور اس لیے کہ اکثر جملے خبریہ جملے انشائیہ بنا دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں لَا اَقُوْلُ لَکُمْ میں بھی۔ جملہ انشائیہ میں منتقل کرنے کے بہت طریقے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ خبریت کو کسی نسبت سے متقید کر دیا تو وہ جملہ انشائیہ بن جاتا جیسے میں نے خریدا میں نے بیچا۔ میں نے نکاح کیا۔ میں نے طلاق دی۔ ان تمام جملوں میں ظاہراً خبریت ہے مگر چونکہ خریدنے میں بیچنے والے کی نسبت ہے۔ بیچنے میں گاہک کی نسبت۔ نکاح میں منکوحہ کی نسبت طلاق میں مطلقہ بیوی کی نسبت اشد ضروری بدیں وجہ یہ جملہ خبریہ نہیں رہا بلکہ جملہ انشائیہ ہو گیا ان کا نام عقود ہے اسی لیے شرعی قانون ہے کہ اگر طلاق میں نسبت الی الزوجہ نہ ہو گی صرف خبریت ہو گی تو طلاق نہ پڑے گی۔ پس اسی طرح سمجھ لو کہ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ میں لَکُمْ کی قیدِ اضافی نے اس جملے خبریہ کو انشائیہ بنا دیا اگر یہاں لَکُمْ نہ ہوتا تو انتقالِ انشائیت بھی نہ ہوتا اور عام سب کے لیئے یہ خبر ہوتی مگر لَکُمْ نے بتایا کہ یہ بات صرف کافروں سے ہے چنانچہ تمام مفسّرین نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہی تائید فرمائی جس سے وہابی خائب و خاسر ہوئے۔ تفسیرات اربعہ جلد دوم

صنا۴ پر ہے۔ اَلْخِطَابُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْنِیْ قُلْ یَا مُحَمَّدُ لِھٰؤُلَاءِ الْمُشْرِکِیْنَ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ۔ تفسیر روح المعانی جلد چہارم صفحہ ۱۵۵ پر ہے:۔ قُلْ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ الْبَشِیْرُ النَّذِیْرُ لِلْکَفَرَۃِ الَّذِیْنَ یَقْتَرِحُوْنَ۔ (ترجمہ):۔ دونوں عبارتوں کا قُلْ میں خطاب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ اے پیارے محمد بشیر نذیر رسول ان مشرکوں کافروں سے فرما دو کہ وہ کافر جو مجھ سے رازِ الٰہیہ پوچھتے ہو میں تم کو نہیں بتاتا کہ میرے پاس غیب اور اللہ کے خزانے ہیں۔ صاف پتہ لگا کہ یہ عبارت جملہ انشائیہ ہے اور پھر تو ہماری زبان میں بھی بطور خبر نہیں ہوتا۔ دن رات اس طرح مستعمل ہے۔ جا میں تجھ کو نہیں بتاتا کہ میرے گھر میں دولت ہے۔ یہاں تک تو مفسرین کے اقوال مبارکہ جاء الحق کی تائید میں پیش کیے گئے۔ اس آیت کریم کا شانِ نزول بھی اسی کی تائید کر رہا ہے:۔ چنانچہ تفسیر خازن جلد دوم صفحہ نمبر صنا۱۴ پر ہے:۔ نَزَلَتْ حِیْنَ اِقْتَرَحُوْا عَلَیْہِ الْاٰیَاتِ۔ قَالُوْا لَہٗ اَخْبِرْنَا بِمَصَالِحِنَا وَمَضَارِنَا فِی الْمُسْتَقْبَلِ:۔ ترجمہ:۔ جب کفارِ مکہ نے آیتوں کا سوال کیا تب یہ آیت اتری۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو ہمارے نفع نقصان کے زمانۂ مستقبل کے سارے اسرار سمجھا دو بتا دو۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کو منع فرما دیا کہ ان کو کہہ دو میں تم کو نہیں بتاتا۔ حالانکہ سب خزانے اور علوم غیبیہ آپ کے پاس ہیں یہی مفسرین فرماتے ہیں چنانچہ روح البیان جلد سوم صفحہ نمبر ص۳۵ پر ہے:۔ عَلٰی اَنَّھَا عِنْدِیْ وَلٰکِنْ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ (ترجمہ):۔ علاوہ اس بنا پر کہ یہ سب کچھ میرے پاس ہے مگر میں تم کو نہیں بتاتا۔ اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ چونکہ کفار نے اسرار الٰہیہ کے جاننے اور بتانے کی خواہش کی تھی تو رب نے منع فرما دیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے منع کیوں فرمایا۔ اور بتانے سے کیوں روکا اگر یہ حقیقت کی خبر تھی۔ تو وہ روایت جھوٹی ہوتی ہیں جن میں ارشاد ہے:۔ سَنُرِیْھِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ ع۲ اوتیت جوامع الکلم۔ ص۳ اُوْتِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ۔ ترجمہ:۔ مجھ کو زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں مجھ کو جامع کلمات دیے گئے۔ ہم اپنے انبیاء کو آفاقِ کائنات کی نشانیاں دکھائیں گے۔ اور اگر ان احادیث کو سچا مانا جاتا ہے تو آیت کو غلط کہنا پڑے گا حالانکہ وہ رب تعالیٰ کا حکم۔ جب یہ دونوں محال تو مطابقت واجب اور مطابقت اسی طرح ہو سکتی ہے جس طرح تمام مفسرین اور حضرت حکیم الامت نے فرمائی کہ احادیث اپنی جگہ بالکل صحیح سچی اور آیت کا حکم بھی درست کیونکہ وہ خبر نہیں بلکہ انشاء وہ ہوتا ہے جس میں جھوٹ سچ کا شائبہ نہیں ہوتا نہ ہی تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ کتاب توضیح ص۵۰۴ پر ہے:۔ اِمَّا خَبَرٌ اِنِ احْتَمَلَ الصِّدْقَ وَالْکِذْبَ اَوْ اِنْشَاءٌ اِنْ لَمْ یَحْتَمِلْ۔ (ترجمہ):۔ جملہ یا خبریہ ہوتا ہے۔ اگر سچ جھوٹ کا احتمال رکھے یا جملہ انشائیہ ہوتا ہے اگر اس کو سچ جھوٹ سے تعلق کوئی نہ ہو پس معترض کا یہ کہنا

کہ اگر بقول جاء الحق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب اور خزانوں کو کافروں سے چھپایا تو گویا جھوٹ بولا۔ یہ معترض کی جہالت ہے کیونکہ جملے انشائیہ کو جھوٹ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جاء الحق میں حضرت قبلہ نے لکھا ہے کہ کفار سے خزانے چھپائے گئے اور فرمایا کہ اسے کافر تم چور ہو اور چوروں سے خزانے چھپائے جاتے ہیں۔ یہ ہی عبارت ہے جس سے معترض وہابی کو دکھ پہنچا کہ کافروں کو چور کیوں کہہ دیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جاء الحق کی یہ عبارت بھی غلط نہیں بلکہ اقوالِ مفسرین۔ شانِ نزول اور دیگر آیات و منشاءِ حکمِ باری تعالیٰ سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سورہ حجر آیت ۱۵ پ ۱۳ ع ۱

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (ترجمہ) اور ہم نے چھپایا یا حفاظت کی ان آسمانی اسرار الٰہیہ کو جو برجوں میں ہیں ہر مردود سے مگر وہ شیطان جس نے چوری کی راز و اسرار کو سن کر تو پیچھے لگا اس کے شہابِ مبین۔ اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بذریعہ شہاب ثاقب اور ملائکہ۔ آسمانی رازوں کو مردود شیطانوں سے چھپاتا ہے۔ حفاظت دو قسم کی ہوتی ہے، ع۱ بچانا کرے ۲ چھپا کر رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت فرمائی اس کو فساد یوں سے بچا کر اسرار کی حفاظت فرمائی۔ چھپا کر شیطان جس طرح ابلیسی جنوں میں ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے سورہ انعام آیت ۱۱۲ پ ۸ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ (ترجمہ)۔ اور اسی طرح بنایا ہم نے ہر نبی علیہ السلام کے لیے دشمن انسانوں اور جنوں کے شیطانوں سے۔ تو جس طرح شیطان جن چور ہیں اسی طرح انسانی شیطان بھی چور ہیں اللہ تعالیٰ نے جناتی شیطانوں سے آسمانی اسرار چھپائے اسی طرح انسانی شیطانوں سے بھی اسرارِ کائنات چھپائے اور اپنے پیارے حبیب کو فرمایا۔ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ۔ اے پیارے ان کافر چور شیطانوں سے کہہ دو کہ میں تم کو نہیں بتاتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے اور علم غیب ہے۔ یہ ممنوعہ حکم کیوں تھا صرف اسی لیے کہ شیطان چور اسرار کی چوری نہ کرے۔ آسمان پر شہاب کیوں بنائے گئے تاکہ وہاں کے شیطان بھی اسرار کی چوری نہ کریں وہاں فرشتوں سے رکھوالی کرائی گئی اور یہاں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے۔ معترض کہتا ہے کہ یہ جھوٹ بولنا ہے (معاذ اللہ) مگر قرآن و حدیث فرماتے ہیں کہ یہ جملہ انشائیہ ہے۔ جس میں جھوٹ کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ معترض کہتا ہے کہ اگر حضور مختارِ کل غیب دان اور حاضر و ناظر ہیں۔ تو آپ نے کفار سے خزانے کیوں چھپائے چھپانا تو ڈر سے ہوتا ہے۔ اور ڈرنے والا بزدل ہے

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مختار کل عالم الغیب۔ اور ہر جگہ حاضر و موجود ہے۔ اور قوی ہے۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا کی صفت والا ہے تو اس نے آسمانی اسرار شیطانوں سے کیوں چھپائے جو جواب یہاں ہوگا وہ ہی وہاں ہے معترض کہتا ہے کہ آیت کے کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ اے کافر و تم چور ہو۔

دراصل بیچارے معترض وہابی کو دکھ بھی اسی چیز کا ہے کہ ہمارے کافروں کو چور کیوں کہہ دیا۔ اور وہ اس
دکھ میں حق بجانب ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ترجمہ الفاظِ آیت کا نہیں بلکہ تفاسیری اشاروں کا ہے۔ جیسا کہ اوپر
ثابت ہوا۔ آگے چل کر معترض عجیب احمقانہ تانے بانے بناتا ہے۔ لکھتا ہے کہ صدیق سے کب پوشیدگی
میں کہا تھا کہ میرے پاس خزانے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کہا تھا اُوْتِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ وغیرہ وغیرہ
معترض کہتا ہے کہ اگر یہ راز تھا تو بریلوی اب کیوں بتاتے پھرتے کیا اب کفار چوری نہ کریں گے۔ میں کہتا
ہوں بریلوی صرف یہ بتاتے ہیں کہ۔ مالکِ کونین ہیں گو تم کو بتلاتے نہیں۔ دو جہاں کی چابیاں ہیں ان کے
دستِ پاک میں بریلوی یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے آقا کے پاس سب خزانے ہیں مگر خزانوں کا پتہ نہیں
بتلاتے تو خبیث چوری کیسے کر سکتے ہیں۔ ہاں صحابہ کو اولیاء اللہ کو اور ہم غلاموں کو سب پتہ ہے بلکہ اُن ہی
خزانوں سے شریعت والے۔ طریقت والے۔ روحانیت والے۔ جسمانیت والے سب پل رہے ہیں
اگر معترض اور اُس کے ساتھی پوچھے کہ کہاں ہیں تو میں کہوں گا۔ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ جاؤ میں تم کو نہیں بتاتا

تکفیری اعتراض کا جواب:۔ معترض کہتا ہے کہ بریلویوں کے امام احمد رضا رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر کو کافر نہیں کہتے اسماعیل دہلوی جگہ جگہ لکھتا ہے خدا کے سوا کسی کو نہ مانو۔ مگر امام احمد
رضا اس کی تکفیر نہیں کرتے میں کہتا ہوں کہ تم بھی تو آخر مسلمان کہلاتے ہو تم بھی تو اسی آقا صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کے در کے ٹکڑے سے پلے ہو نمک خوار ہو کلمہ انہی سے لیا۔ ایمان۔ قرآن اُن ہی سے پایا۔ خدا کا پتہ انہیں
سے لگا۔ ع۔ ورنہ تم کیا سمجھتے خدا کون ہے۔ کچھ حق نمک خواری ادا کرو نمک حلال بن جاؤ۔ اور تم ہی ایسے
بیہودہ کو کافر کہہ دو۔ مگر تم نے تو ان گستاخیوں کو دیکھتے جانتے اسماعیل صاحب کو امام مطلق بنا رکھا ہے
امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ نے تو کم از کم اس کو۔ برا۔ بے دین۔ اور گمراہ تو سمجھا۔ ہاں کافر نہ کہا۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی کتب و تصانیف سے ثابت ہے کہ آپ جلد بازی نہ کرتے تھے بلا سوچے
سمجھے کچھ نہ بولتے تھے بلا تحقیق و تفتیش تسلی و تشفی کے کبھی کسی کے خلاف نہ ہوتے تھے۔ کبھی بلا وجہ
کفر کا فتوٰے نہ لگاتے یہ جلد بازی اور کفر و بدعت و شرک کی تیز رفتار مشین تو سہارنپور کے
قریب ہے۔ امام اہلسنت نے اپنے دور کے صرف تین لوگوں پر کفر کا فتوٰے لگایا۔ اور وہ بھی اس
وقت تک جب اچھی طرح اُن سے تحریری تقریری گفتگو کر لی ان کی گستاخانہ عبارات کے
ان ہی کے منہ سے مطلب سن لیئے مناظرے کر لیئے پورا اتمام حجت کر لیا وہ لوگ لاجواب ہو گئے کوئی
پہلو بجز کفر نہ نکل سکا تو بہ بار بار دلائی جب توبہ اور رجوع کی طرف بھی نہ آئے تب کفر کا فتوای لگایا اور
پھر ایسا مضبوط اور صحیح لگایا کہ عرب و عجم نے تسلیم کیا۔ اسماعیل دہلوی کون سا چچا کا بیٹا تھا کہ اس کی

رعایت کی جاتی بات صرف یہ تھی کہ توت ہو گیا تھا۔ اسماعیل صاحب دہلوی کا زمانہ پہلے ہی لد چکا تھا
گستاخانہ عبارتیں واقعی دیکھیں اور اب تک دیکھی جا رہی ہیں مگر کس سے تحقیق کی جائے کون متکلم کا مطلب
بتائے کون رجوع کرے کس سے توبہ کرائی جائے۔ ہر بات میں کئی پہلو نکالے جا سکتے ہیں کفر بہت نازک ہے
اسی امام وقت نے یہ بتایا کہ اگر ننانوے احتمال کفر کے ہوں ایک اسلام کا تو بات کو اسلام کی طرف لاؤ۔ اس
احتیاط کے پیش نظر مردہ شخص کو کافر نہ کہا گیا اگر اس وقت اسماعیل صاحب زندہ ہوتے تو ان سے بھی بات
کی جاتی اور کسی نہج پر لا کر شرعی فیصلہ کیا جاتا۔ **چوتھے اعتراض کا جواب:۔** معترض وہابی
کہتا ہے۔ بریلوی عالم اللہ دتہ صاحب لاہوری نے یہ عبارت عربی اپنی کتاب تنویر الخواطر ص ۴۳ لکھی۔
لا تستقر نطفۃ فی فرج انثی الا ینظر ذالک الرجل ایھا یہ گستاخی ہے اور ص ۴۶ پر لکھا ہے
کہ اوپر والے یہ کلمات طیبہ یعنی پاک کلمات ہیں۔ الجواب میں بحیثیت مفتی اسلام ہونے کے کسی کو سخت لفظ
نہ کہہ سکتا ہوں نہ کہنا چاہتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض دیکھ کر جب علامہ اللہ دتہ صاحب کی کتاب
مذکور دیکھی جائے تو ہر شخص کہے گا کہ اس اعتراض میں کتنا فریب ہے کتنی مکاری و دھوکہ بازی۔ علامہ
نے ص ۴۳ پر یہ عبارت خود نہیں لکھی بلکہ ایک وہابی مولوی سرفراز گکھڑوی کی کتاب تبرید النواظر ص ۴۴
سے نقل کی ہے اور سرفراز صاحب وہابی نے یہ عبارت سنیوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھی ہے۔ طرفہ
تماشہ یہ کہ سرفراز گکھڑوی وہابی صاحب نے اس عبارت کو لکھتے ہوئے یہ نہ بتایا کہ یہ کس کا قول ہے۔ صرف
کتاب غیر معروف بلکہ نام نہاد نجم الرحمٰن کا حوالہ دیا۔ یہ کتاب روئے زمین پر ابھی تک پیدا ہی نہیں۔ جس
سے ثابت ہوا کہ یہ گستاخانہ اور بے ادبانہ عبارت خود وہابی سرفراز گکھڑوی صاحب کی ہے اور
اپنے اکابر کی طرح یہ بھی جھوٹی عبارتیں بنانے میں مشتاق ہیں۔ ان کا ایک پیر مرشد اشرف علی تھانوی
صاحب نے اپنی ایک کتاب رویاء صادقہ میں جھوٹی خوابیں خود بنا کر اپنا کلمہ پڑھوایا اور اشرف علی
رسول اللہ لکھا اور مرتے دم تک اس پر ضد کی جب اہلسنت نے پاپوش زنی کی تو بھرے مجمع میں کہہ
دیا کہ اب میں لکھ چکا ہوں اب کیسے پھاڑوں۔ اور پھر ان کے ہی ایماء سے نا لیا ان کے حواریوں نے حضرت
شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور خواجہ خواجگان قبلہ عالم خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف ایک
جھوٹ باندھا کہ انہوں نے بھی اپنے مریدوں سے اپنے کلمے پڑھوائے حالانکہ یہ بات سرے سے ہی
غلط ہے اولیاء اللہ کی یہ جرأت نہیں کہ اس طرح گستاخی کریں۔ اپنا کلمہ پڑھوانا تو بطور آزمائش بھی
کفر ہے۔ کم از کم مرید تو اس وقت کافر ہو جائے گا۔ اور پھر کہلوانے والے پر کفر لزومی لاحق ہوا
اور کہنے والے پر کفر التزامی۔ بہر حال یہ بھی وہابیوں کی بدترین تہمت اور ذلیل ترین بناوٹ ہے

خواجہ صاحب اور شبلی صاحب کی پرانی مطبوعہ میں یہ واقعہ قطعًا نہیں تھا۔ ان کے حواریوں نے اب چند سال پیشتر سے اپنے اشرف علی کو بچانے کے لیئے ایک کتاب خود ساختہ شائع کر دی صرف دھوکہ دینے کے لیئے خود اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنی کتاب الظہور ص ۲۹ پر لکھا کہ یہ بریلوی موجد محفل میلاد۔ صبح کے وقت گہوارہ لٹکاتے اور پورا سوانگ بھرتے ہیں اگر یہی نقل ہے تو خدا خیر کرے ایک عورت کو بھی لا دیں گے اور کہہ دیں گے کہ چلا یا کرے (بحوالہ کتاب اذکار حبیب ص ۱۶ مرتبہ شاہ عارف اللہ رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ) اشرف علی وہابی کا یہ کتنا بڑا دھوکہ فریب اور جھوٹ ہے بھلا کب محفل میلاد میں جھولا لٹکایا جاتا ہے اور سوانگ بھرا جاتا ہے۔ تو جب اشرف علی غلط عبارتیں بناتے رہے تو ان کے مرید سرفراز سے کیا بعید ہے۔ مگر یہ مذکورہ معترض اپنی کم عقلی یا جان بوجھ کر نیا دھوکہ دیتے ہوئے علامہ صاحب کی طرف اس کو منسوب کر رہا ہے۔ علامہ اللہ دتہ صاحب نے ص ۴۶ پر اس عبارت کو کلماتِ طیبہ نہ کہا کوئی کور چشمی پر اتر آئے تو اس کی مرضی۔ بلکہ تنویر الخواطر ص ۴۶ پر لکھا ہے۔ اس کے مثل کلماتِ طیبہ کو اس عبارت سے صرف واقعاتی تشبیہ دی ہے۔ ہمارے کسی بزرگ نے ایسے لفظ ادا نہ کیئے نہ ہی اس کی کچھ ضرورت۔ لیکن جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ کوئی عیب نہیں۔ رب تعالٰی فرماتا ہے:۔ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ترجمہ اللہ تعالٰی اس کو جانتا ہے جو مؤنثوں کے رحم میں ہے۔ باری عزاسمہ نے اپنے ولیوں کو اپنی قوت اپنے علم کی دلیل بنا کر بھیجا اس لیئے ان کو بھی وسیع علم عطا فرمایا اور اسی علم کے ذریعے وہ بھی جان لیتے ہیں کہ رحموں میں کیا ہے۔ دیکھنا اور ہے جاننا اور ہے۔ دیکھنا اتنا کمال نہیں جتنا بغیر دیکھے جاننا کمال ہے۔ دیکھنا کیا مشکل ہے یہ تو ڈاکٹر لوگ بھی اپنی سائنسی ایجادات کے ذریعے کر لیتے ہیں۔ ایکسرے کے ذریعے آنتوں کے اندر کی چیز بھی نظر آ جاتی ہے اور بہت سے لوگ اپنی تجرباتی عقل سے حمل کا پتہ لگا لیتے ہیں جو اکثر بالکل درست ہوتا ہے۔ مگر ولی اِلٰی صفاتِ الٰہیہ سے متصف کیے جانے کی بنا پر اپنے علم سے جانتا ہے کہ رحم مونث میں کیا ہے۔ علم کے لیئے آنکھ یا آلے کی حاجت نہیں آنکھ بند کر کے بھی علم آ جاتا ہے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کے لیئے ینظر کا استعمال کسی نے نہ کیا۔ اور یہ عبارت بناوٹی حضرتِ شعیب علیہ السلام کو بھی حضرت یحیٰی کی ولادت و شکمِ مادر میں آنے کا پورا علم تھا:۔ جنابِ باری سے علامات کا سوال صرف ایام کے تعیین کا پوچھنا تھا۔ نہ کہ حمل کا۔ پس ثابت ہو گیا کہ معترض کا یہ سوال بھی محض دھوکہ بازی تھی:۔

پانچویں اعتراض کا جواب:۔

انوار ساطعہ کی یہ عبارت شرعًا۔ عقلاً۔ نقلاً ہر طرح درست ہے۔ واقعی انبیاءِ کرام اولیاءِ عظام ناپاک جگہ پلید مقام پر نہیں جاتے۔ انوارِ ساطعہ میں صرف یہ لکھا ہے کہ ہم دعوٰے نہیں کرتے قدرتِ

قدرتِ حضور کا انکار نہیں یعنی ہم یہ نہیں کہتے کہ اِن مقاموں میں حاضر ہونے کی قدرت و طاقت نہیں۔ طاقت تو ہر جگہ جانے کی ہے۔ مگر خلافِ شان جگہ پر جاتے نہیں۔ دعوے حضور کی نفی ہے نہ کہ قدرتِ حضور کی۔ اور یہ عقیدہ عین حدیث پاک کے مطابق ہے۔ چنانچہ۔ حدیث پاک کی معتبر و مشہور کتاب طحاوی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۶۳ پر ہے :۔ قَالَ یَا عَائِشَۃُ (الخ) اِنَّا لَا نَدْخُلُ بَیْتًا فِیْہِ تَصَاوِیْرُ (ترجمہ) :۔ آقائے کائنات نے فرمایا۔ اے عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہا) ہم اُس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔ یہاں بھی دخول کی نفی ہے نہ کہ قدرت کی میں کہتا ہوں کہ انبیاء اولیاء کو اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ حاضری کی طاقت بخشی مگر اپنی شانِ اَرفعیت کی وجہ سے گندی جگہ جاتے نہیں۔ شیطان نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ طاقت پالی مگر وہ ہر جگہ چلا جاتا ہے :۔ اور ہر گندی مندی جگہ موجود ہوتا ہے۔ معترض وہابی دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ دیکھو شیطان کو زیادہ مان لیا۔ پوچھو اِن نادانوں سے کہ کیا یہ افضلیت اور شان کی نشانی ہے ؟ کیا گندی جگہ جانا اچھی بات ہے ؟ کیا زیادہ پھرنا اچھی بات ہے۔ افسوس کہ حسد نے عقل ہی ماردی۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ وہابی صرف روٹی کھاتا ہے۔ مگر کتا۔ بلّا روٹی۔ گندگی۔ حرام غذا۔ اور چوہے وغیرہ بھی کھاتا ہے۔ لہٰذا کتا بلّا وہابی سے افضل ہے تو کیا جواب دوگے۔ معترض صاحب۔ زیادتی اور ہر اچھی بری جگہ چلا جانا شان و افضلیت نہیں اور نہ ہی اس سے تمہارے شیطان کی عظمت ظاہر ہو۔ انوارِ ساطعہ والوں نے تو صرف زمینی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ جو قلیل ہیں۔ مگر عرشی کرسی۔ لوحی۔ قلمی بہشتی۔ عالمِ انوار۔ عالمِ اسرار۔ لاہوت۔ جبروت۔ عالمِ قدس۔ تجلیات۔ عالمِ تقریب۔ عالمِ امکان۔ محافلِ سماوات اور اس طرح کی کروڑہا محفلیں اور اربوں مقامات ہیں جہاں انبیاء و مرسلین۔ اولیاء واصلین حاضر و ناظر ہیں وہاں شیطان کی پھٹک بھی نہیں اس کو تو محفلِ ملائکہ تک رسائی و قدرت نہیں ہے شہابِ ثاقب کی مار گواہ ہے۔ تو شیطان کس طرح زیادہ جگہ حاضر و ناظر ہو سکتا ہے معترض صاحب کے سب اعتراض غلط ثابت ہو گئے . . . . . اور پھر قبلۂ عالم مولانا سمیع صاحب نے اپنے لفظوں میں کہیں بھی نہ کہا کہ شیطان زیادہ حاضر ہے۔ یہ تو مذکور معترض نے اپنے دل سے مطلب نکال لیا۔ لیکن خود وہابی پیشوا خلیل احمد انبیٹھوی صاحب نے تو معاذ اللہ شیطان کا علم نبی کریم رؤف و رحیم سے زیادہ مانا اور اپنی کتاب براہین قاطعہ ص ۵۱ پر لکھتے ہیں کہ شیطان کے علم کے لیے تو نصِ قطعی آ گئی۔ نبی پاک کے لیے کون سی نص قطعی آئی۔ ان بیوقوفوں نادانوں کو شیطان کے لیے نصِ قطعی مل گئی۔ مگر جس کے طفیل قرآن مجید کی کل نصوص قطعیہ نازل ہوئیں

اُس کے علم کے لیے کوئی آیت نہ ملی سے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بھلا قرآن مجید میں نبی الانبیا راحت قلب اصفیا مرسل ہر کل سرا۔ نذیر عالمیاں بشیر بر انس و جان صَلَّی اللّٰہُ الخالِقُ جَنَّان عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ کے علم کے ثبوت میں کوئی نص قطعی نہ ہو۔ ناممکن ومحال میں کہتا ہوں کہ ساری آیات ہی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ثابت کر رہی ہیں۔ کیا یہ آیت نظر نہ آئی۔ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمْ (سورہ جمعہ آیت نمبر ۲) :۔ ترجمہ: وہ اللہ وہ ہے جس نے مبعوث فرمایا رسول بے علموں میں جو انہی کی اصل میں سے تلاوت فرماتا رہے گا ان کے سامنے اللہ کی آیات اور پاک فرماتا رہے گا ان کو اور علم پڑھاتا رہے گا ان کو۔ اس آیت نے بتایا کہ نبی کریم کی تمام امت بے علم تھی نبی پاک نے ان کو علم دیا تو علم آیا۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کی تعداد کیا ہے؟ قرآن مجید فرماتا ہے :۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۵۸ (ترجمہ) :۔ اے حبیب فرما دو کہ اے انسانو بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (تافیا منتہا) دوسری جگہ خود رب نے فرمایا کہ صرف انسانوں کی طرف ہی نہیں۔ بلکہ۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۟ۙ (سورہ ۲۵ فرقان ۱) :۔ (ترجمہ) برکتوں والا ہے وہ رب کائنات جس نے نازل فرمایا فرقان اپنے بندے پر تاکہ ہو جائے وہ تمام کائنات والوں کے لیے نذیر۔ عالم ماسوا اللہ کو کہتے ہیں جیسا کہ امام رازی کو تسلیم کرنا پڑا۔ عالمین اس کی جمع کثرت ہے۔ جس میں از فرشی تا عرشی۔ جبرائیل و میکائیل و عزرائیل علیہم السلام۔ جنات و حیوانات فلسفی و منطقی حکماء و فضلاء سائنس دان سب ہی شامل فی الامت ہیں۔ اُمت مصطفوی کی اس کثرت تعداد کو امیین فرمایا گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی کتنا ہی عالم و معلم ہوں مگر احمد مجتبٰے کے سامنے اُمیین ہیں اس سے بڑی نص قطعی اب کہاں پاؤ گے۔ بلکہ قلیل تفکر سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ شیطان و عزرائیل علیہ السلام کے علم کا نص قطعی میں ذکر آنا بھی شان محبوب پاک صاحب لولاک کا بتانا ہے :۔

جیسے کوئی کہے کہ یہ پتھر فلاں پہلوان اٹھا سکتا ہے تو جواب دینے والا کہے کہ یہ پتھر تو فلاں کمزور آدمی اور عام آدمی بھی اٹھا لیتا ہے۔ ظاہراً پہلوان کے اٹھانے کا ذکر نہ کیا مگر منشاء کلام ظاہر و باہر اور صاف ہے۔ کہ عام آدمی کا ذکر کرنا بھی شان قوت پہلوان بتانا ہے۔ عقلاء منکرین کو حیرت ہوئی کہ نبی اکرم ہر امتی کو زمین کے ہر گوشے میں دیکھ سکتے ہیں اور کیا ہر عاشق کے گھر تشریف لا سکتے ہیں حاضر و ناظر ہونے

کی قوت ہے۔ رب نے فرمایا زمین تو معمولی اور قلیل مقام ہے یہاں تو شیطان جیسا روحانی مریض کمزور مخلوق بھی تم کو دیکھتا حاضر و ناظر ہوتا ہے۔ اور حضرت عزرائیل کی قوت بھی سیر کر لیتی ہے۔ پس اس طرز تکلم سے معلوم ہو گیا کہ شان اپنے محبوب صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہی بتانا ہے۔ اگر کوئی اب خلیل انبیٹھوی یہ معترض ہو کہ یَعۡلَمُہُمۡ کی ضمیر سے صرف صحابہ مراد ہیں تو اِنَّہٗ یَرٰاکُمۡ ھُوَ وَقَبِیۡلُہٗ میں بدرجۂ اولےٰ صحابہ مراد ہو سکتے ہیں کہ وہ غائب ہے یہ حاضر کی ضمیر۔ پھر آج ستانوے سال بعد انوار ساطعہ کتاب پر اعتراض کی سوجھی ۱۳۰۳ھ میں خود خلیل صاحب انبیٹھوی نے اسی کتاب کا جواب لکھتے ہوئے اپنی کتاب براھین قاطعہ کے صفحات پر یہ کیوں نہ لکھا کہ بریلویوں نے شیطان کو زیادہ جگہ حاضر و ناظر مان لیا۔ اور آج کے معترض نے انوار ساطعہ کی یہ صحیح عبارت دیکھ کر خود ساختہ مطلب نکال کر بریلویت چھوڑ کر وہابیت میں پناہ لے لی اس کو براھین قاطعہ کی یہ گستاخیاں اور کفریات کیوں نظر نہ آئے کہ خلیل احمد انبیٹھوی براھین کے ص۵۱ پر شیطان کا علم صاف صاف لفظوں میں بڑھا رہا ہے۔ اور ص۲۶ پر دیوبندیوں کو۔ معلم ملائکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اردو استاد بتا رہا ہے اور جھوٹی شیطانی خواب گھڑ رہا ہے۔ پس اندازہ آپ کے اپنے ہاتھ میں فیصلہ رب تعالیٰ کے قبضے میں۔ **چھٹے اعتراض کا جواب:۔** معترض کہتا ہے کہ فرقہ بریلویہ کا اعلان کہ نہ ہم سنی ہیں نہ شیعہ۔ حوالے میں مولانا فخر الدین ہمعصر مرزا جان جاناں کا نام اور دو شعر فارسی کے پیش کرتا ہے جس کے ترجمے سے ہی پتہ چل گیا کہ معترض خاصہ جاہل ہے۔ ملفوظات مہریہ کے ملفوظ ۲۶ کا حوالہ دیتا ہے اور اس پر بڑے غیض سے بریلویوں کے خلاف تبصرہ کرتا ہے۔ **جواب۔** ! ہم بیہودہ اور طرز جاھلانہ کا تو کچھ جواب نہ دیں گے کہ وہاں خاموشی ہی بہتر ہے۔ البتہ صحیح حقائق سے آگاہ کیا جاتا ہے معترض وہابی۔ وہ رباعی اس طرح لکھتا ہے۔

نہ سنی ام کہ کند رافضی گلہ احق ۔ نہ رافضی کہ کند سنیم گریبان شق ۔ مرید حضرت عشقم وگرنمی دانم

کدام بر سر باطل کدام بر سر حق ۔

اور اس کا ترجمہ خود معترض اسطرح کرتا ہے۔ نہ سنی ہوں کہ احق رافضی گلہ کرے۔ اور نہ رافضی ہوں کہ سنی بگڑیاں ہوں میں تو حضرت عشق کا مرید ہوں۔ اور نہیں جانتا کہ کون حق اور کون باطل پر یہ تھی رباعی جس کی آڑ سے کر معترض نے تمام بریلویوں کو ظالم۔ شکم پرور وغیرہ بلکہ تہذیبی کے الفاظ سے خطاب کیا۔ اس کے جواب چند طرح پر ہیں۔ اولاً یہ کہ معترض نے جانتے بوجھتے رباعی میں خیانت کی رباعی کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے

نہ سنی ام کہ کند رافضی گلہ احمق ۔ ترجمہ ۔ ملفوظات مہریہ ص۵۱ پر اس طرح لکھا ہے ۔

نہ میں سنی ہوں کہ احمق رافضی گلہ کرے ۔ اور یہ رباعی و ترجمہ ۔ ملفوظات کے ص۵۱ پر بالکل صاف صاف

لکھا ہے۔ مگر معترض جان بوجھ کر لفظِ احمق کو لفظ احق اسم تفضیل بنا دیتا ہے۔ جس کا ترجمہ زیادہ سچے۔ معترض نے صرف اپنے اعتراض کو مضبوط بنانے اور بریلویوں کو بُرا کہنے کے لیئے راہ ہموار کرنے کی غرض سے یہ خیانت کی۔ حالانکہ لفظِ احمق بمعنی بیوقوف ہوتا ہے جس کو عربی میں سفیہ کہتے ہیں اس کی جمع سفہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کافروں کو ہی سفہا فرمایا۔ تو مولانا مذکور نے اشارۃً بنا دیا کہ یہ کفر میں ہیں۔ لفظِ سنی کے ساتھ کوئی غلط لفظ نہ لگایا۔ اور ان کی عزت بحال رکھی۔ آگے فرمایا کہ جب سے وادیٔ عشق و مستی میں قدم رکھا تمام علومِ ظاہریہ شرعیہ فراموش ہو چکے ہیں اب نہیں یاد رہا کہ کس کو باطل کہوں کس کو حق پر کہوں یہ کام تو متبحر مفتیٔ اسلام کا ہے تدبر و تفکر میں اسی کو قدرت و مہارت ہے۔ اس تشریح کی تائید شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس شعر سے ہوتی ہے۔ شعر

اگر ہفتاد علم از بر بدانی

چوں عاشق شدی الف با نا ندانی

ترجمہ:۔ اگر تو ستر علم جانتا ہو گا جب عاشق بن جائے تو الف بے تے بھی نہ جان سکے گا۔

مولانا فخر الدین کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اتنے بڑے اہم کام فتوئے کفر کے لیئے غلط جگہ پر آگئے۔ میں ایسا فتوائے دینے کا پہلے اہل تھا اور روافض کے خلاف فتوے دیتا رہا۔ مگر اب مرید عشق ہوں اب کچھ یاد نہیں رہا۔ لہٰذا اب اہل نہیں رہا۔ ہاں اشارہ کر دیا۔ اہلِ ذوق ہو گئے تو سمجھ جاؤ گے محظوظ ہو گئے تیسے خیر ہو گئے تو حیران ہو گئے۔ میری جان تو چھوٹے گی۔ اسی لیئے سید مہر علی شاہ صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ نے یہ لکھ دیا۔ ثالثاً جواب اس طرح ہے کہ مولانا فخر الدین تاریخی حیثیت سے بالکل غیر معروف شخصیت ہیں نہ یہ سنیت کے امام ہیں نہ معیار۔ مرزا جانِ جاناں کی تاریخ میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ قابلِ اعتراض وہ بات ہوتی ہے جو مرکز سے خارج ہو۔ پہلے زمانوں میں مرکزِ سنیت امام منصور ماتریدی کا آستانہ تھا پھر امام اشعری مرکزِ سنیت کی حیثیت میں جلوہ گر تھے۔ پھر اعلیٰحضرت بریلوی پھر صدر الافاضل مراد آبادی۔ پھر آج کل مرکزِ اہلسنت حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب لائلپوری علیہ الرحمۃ ہیں۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ مولانا فخر الدین کون بزرگ ہیں معترض وہابی نے کہاں سے جانا کہ یہ کون ہیں صرف لوگوں کو فریب دینے کے لیئے۔ رابعاً جواب اس طرح ہے کہ یہ رباعی ملفوظاتِ مہریہ کے علاوہ پیر صاحب کی دیگر کسی کتاب میں دستیاب نہیں۔

نہ اس کی تشریح کسی طرح پر پیر صاحب نے فرمائی لہٰذا غالب گمان ہے کہ یہ بناوٹ اور اختراع ہے۔ اور ملفوظات میں اکثر ایسی بناوٹیں ہو جاتی ہیں بدیں وجہ امر مسلّم متفقًا ہے کہ ملفوظات کسی کے بھی ہوں قابل اعتماد نہیں نہ ہی ملفوظات پر کوئی فتوےٰ دیا جا سکتا ہے جیسا کہ خود مرتبِ ملفوظ ہٰذا نے اسی کتاب ملفوظاتِ مہریہ کے صـ۲ پر اعتراف کر لیا ہے۔ اور اس ملفوظات کو پڑھ کر تو غالب گمان ہوتا ہے کہ اس کا ترتیب دینے والا جمع کرنے لکھنے والا یعنی سننے والا تفضیلی شیعہ ہے کہ اکثر ملفوظ مائل برفض اور شریعت کے خلاف ہیں۔ یہ تھے کمزور اور متعصبانہ اعتراض۔ جن کو اٹھا کر وہابی صاحب مذکور نے اہلسنّت بریلوی کو برا بھلا کہنے کی راہ نکالی انہی بے سوچے سمجھے اعتراضات کی بنا پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ محمد اسلم کوئی وہابی نہیں اور نہ کسی نے بریلویت چھوڑی صرف دھوکہ بازی کے لیے یہ (ہیڈ نگ) پیش لفظ بنایا۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ دیوبندیت کے مرکزی حیثیت والے خلیل احمد انبیٹھوی کی وہ مندرجہ گستاخیاں نظر نہ آئیں جو انہوں نے اسی انوار ساطعہ کا جواب دیتے ہوئے اپنی کتاب براہین قاطعہ میں لکھی۔ ان سے نفرت نہ ہوئی ان کا بڑا مرکز اشرف علی تھانوی اپنا کلمہ پڑھوائے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی شانِ عفت میں۔ بے غیرتی کی گستاخی کرے تو معترض وہابیت کو گھن نہ آئے۔ اور ان مرکزی گستاخوں کی وجہ سے وہابیت نہ چھوڑے اور پیچھے پڑے تو عشاقِ مصطفےٰ کے اور چھوڑے تو عاشقوں محبوبوں کی جماعت۔ اور شامل ہو تو بڑے گستاخوں میں ثابت ہوا کہ یہ سب تعصب ہی تعصب ہے حقیقت کچھ نہیں۔ **ساتویں اعتراض کا جواب :-** معترض صاحب کہتے ہیں کہ اہل سنّت و جماعت کے ایک عالم ابو وفا غلام رسول سعیدی فاضلِ جامعہ نعیمیہ نے اپنی کتاب میں توضیح البیان صـ۲۴۷ پر لکھا کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ اس اعتراض سے بھی معترض کا تعصب اور محض کیچڑ اچھالنا ظاہر ہو رہا ہے۔ اور یہ ثابت ہو رہا ہے۔ کہ معترض پرانا وہابی ہے اس کو بریلویت کی ہوا بھی نہ لگی اور یہ کہنا کہ میں نے بریلویت کیوں چھوڑی۔ نرا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی مذہب کے کسی عقیدے کو بنیادی حیثیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ یا تو مرکزی اکابر کے اقوال سے وہ عقیدہ ثابت ہو یا مجموعی طور پر اس کو تسلیم کیا جاتا ہو۔ انفرادی حیثیت کا قول مذہبی اساس میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ معترض ایک عام مولوی صاحب کی خود اپنی غلط فہمی پر مبنی بات کو پکڑ کر کہتا ہے کہ میں نے بریلویت اس مولوی صاحب کی بات کی وجہ سے چھوڑ دی اور پھر حیرانی کی بات ہے کہ معترض سعیدی صاحب کی اس بات پر بریلویت چھوڑ کر کہاں داخل ہوتا ہے؟ جو فرقہ دیوبندیہ۔ وہابیہ۔ نجدیہ۔ مرکزی اور مجموعی طور پر متفقًا اب تک علی الاعلان کہتا چلا آ رہا ہے

کہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ (معاذ اللہ) گویا کہ بیوقوف معترض کے نزدیک یہ کہنا درست ہے۔ کہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بُرا ہے کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں۔ معترض خدا کی شان گھٹاتا ہے انبیاء کی شان بڑھاتا ہے۔ معاذ اللہ۔ معترض کی انصاف پسندی اور محبتِ خدا و رسول کا ثبوت یہ تھا کہ دونوں گروہوں سے بے یک دم نفرت کا اظہار کرتا اور دیوبندیوں وہابیوں سے زیادہ نفرت کرتا۔! کیونکہ دیوبندیوں نے رب کریم کو جھوٹ کی تہمت دی۔ اور دیوبندیت کے مرکزی لوگوں نے خدا تعالیٰ کو جھوٹ کا الزام دیا اور مجموعی طور پر سب وہابی دیوبندی لوگوں نے اس بے دین گمراہی کے عقیدے کو تسلیم کیا اس عقیدے پر بڑے بڑے دیوبندیوں راہنماؤں نے ضخیم کتابیں لکھیں چنانچہ خلیل احمد انبیٹھوی نے اپنی کتاب براہین قاطعہ میں اور محمود الحسن صاحبان نے اپنی کتاب جہد المقل میں اسی مسئلہ امکان کذب میں صفحاتِ کثیر سیاہ کر ڈالے ہیں یہ خلیل احمد اور محمود الحسن صاحبان مذہب دیوبند کے مرکزی لوگوں میں شامل ہیں۔ اور ان کی تحریر و تقریر عقائدِ وہابیت کی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں حال ہی میں دیوبند کی طرف سے ایک کتاب بنام بیس بڑے مسلمان شائع ہوئی ہے۔ جس میں ان مذکورہ بالا حضرتوں کا نام شامل کر کے وہابیوں نے ثابت کیا کہ ان بڑوں کی بات ہمارے مذہب کی بنیاد ہے بخلاف جماعتِ اہلسنت والجماعت۔ کہ ان کے کسی بڑے عالم نے یہ گستاخانہ بات نہ کہی۔ جماعت اہلِ سنت بریلویہ کے مرکزی قائد اعلیٰحضرت احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما جن کی بات تحریراً تقریراً مسلکاً بنیادی حیثیت رکھتی ہے ان کا بیان فرمودہ صاف صاف عقیدہ ہے کہ نہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے نہ جملہ انبیاءِ کرام علیہم السلام جھوٹ بول سکتے ہیں نہ جملہ ملائکۂ ارضی و سماوی۔ اِن بزرگوں کی کتب میں صاف صاف لکھا ہے کہ انبیاءِ کرام معصوم ہوتے ہیں اور جو معصوم ہو وہ جھوٹ پر قادر ہی نہیں ہوتا۔ جو رب تعالیٰ کو یا انبیاءِ اللہ کو یا ملائکہ کو جھوٹ پر قادر مانے وہ کفر کی حد تک گمراہ ہے۔ یہ تھا بریلوی مرکزی عقیدہ جس کا با دلائل حوالہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا۔ تمام بریلوی مشائخ و علماء نے اسی عقیدے پر اجماع فرمایا ہے کوئی سنی بریلوی اس کا مخالف نہیں ہاں اب ایک بریلوی عالم غلام رسول سعیدی صاحب نے اپنی کج روی سے یہ تخریب کی کہ مسلک و مرکز سے ہٹ کر گمراہانہ بات لکھ دی۔ سعیدی صاحب نہ مرکزی حیثیت کے مالک ہیں نہ ان کا قول اجماعی درجہ رکھتا ہے یہ فاسد بات اِن کی اپنی انفرادی ہے جس سے اہل سنت کو کوئی واسطہ نہیں۔ نہ اتفاق اہلسنت بریلوی پر اس کا وبال ہے اس استفتاء کے بعد میں نے تحریری طور پر سعیدی صاحب کا سخت محاسبہ کیا۔ اور میرے ساتھ انہوں نے بڑے فاضلانہ انداز میں مناظرہ کیا۔ جس میں انہوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور سب عقلی ہتھیار ڈال دیئے۔ جس کا

خلاصہ مندرجہ ذیل پیش کیا جا رہا ہے۔ سعیدی صاحب پر میرا یہ محاسبہ اور محاکمہ اس لیے ہوا کہ دیگر فرقوں اور اہلسنت بریلوی گروہ کے درمیان کثیر بنیادی فرق کے علاوہ ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے تمام فرقے خاص کر دیوبندی وہابی اپنے مولویوں پیشواؤں کی عزت و عظمت سب سے اونچی سمجھتے ہیں۔ اپنوں کی عزت بہر صورت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عزت رہے نہ رہے کوئی پرواہ نہیں۔ انبیاء کی توہین ہوتی رہے نہ ان کا ایمان بگڑے نہ توحید میں فرق آئے کعبہ و قرآن کی بےحرمتی ہوتی رہے تو کوئی غیرت مند نہ بولے۔ ہاں ان کے مولویوں کی عزت پر آنچ نہ آئے دیکھو ان کے ہی مولویوں نے کہا رب تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ کسی کو غصہ نہ آیا۔ ان کے ہی مولویوں نے کہا اشرف علی رسول اللہ۔ سب نے کہا واہ واہ۔ ان کے بڑے نے کہا شیطان کا علم نبی کریم سے زیادہ ہے۔ سب نے بر ملا کہا ٹھیک۔ لیکن کسی نجدی کا شیخ کی برائی کر کے تو دیکھو شرک و بدعت کا فتوے لگ جائے گا۔ ان کے ہی نجدی پیشواؤں نے کہا گاندھی جی المدد کسی نے فتوے نہ لگایا نہ توحید بگڑے نہ ایمان جائے۔ شاہ سعود کے بُت (فوٹو) ہر ہسپتال ہر دفتر میں علاقہ حجاز میں لٹکائے گئے ہیں نہ ایمان جائے نہ توحید بگڑے۔ قرآن مجید کو زمین پر رکھ دیتے ہیں جوتے اوپر کر لیتے نہ ایمان جائے نہ توحید بگڑے۔ کعبے کی طرف پیر کیئے لیٹے رہتے ہیں نہ ایمان جائے نہ توحید بگڑے۔ لیکن کسی حضرت جی کی طرف تو پیر کر کے دیکھو۔ اپنا مولوی ہو تو حاضر و ناظر بھی غیب دان بھی (ارواحِ ثلاثہ) نہ توحید بگڑے نہ ایمان جائے۔ بخلاف اہلسنّت بریلوی گروہ کے کہ ان کے نزدیک بجز عظمت رسول اللہ کے کوئی شی نہیں عزتِ پاکِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل ہر چیز ہیچ ہے جس طرح دیوبندی وہابی پیشواؤں نے گستاخیٔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جسارتیں کیں اور پھر بھی قوم میں ہیرو بنے پھرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی بریلوی ایسا کرتا تو اپنوں میں ہی خائب و خاسر۔ ذلیل و رسوا ہوتا۔ قسم بخدا۔ ہم نے اگر اعلیٰحضرت بریلوی کو اپنا آقا مانا۔ صدر الافاضل کو پیشوا سمجھا۔ حضرت حکیم الامت کو قائد بنایا تو صرف اس لیئے کہ انہوں نے عشقِ رسول اللہ کے درس پڑھائے۔ اور اُس دور میں جب کہ حمقا اپنے تمغوں اور لقبوں کے درپے تھے۔ اپنے کو شیخ الہند وغیرہ کہلانے کے لالچ و تمنا میں مصروف تھے ہملوگوں کا ایک ہی نعرہ تھا کہ۔ میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں۔ ان اکابر نے خود کو گدا کہا۔ تو رب نے قوم کا آقا بنا دیا۔ بلند بانگ دعوے ہمیشہ باطل ہی کے ہوتے ہیں۔ مگر حق پرست کہتا ہے کہ۔ ع۔ میرا اتنا ہی دعویٰ ہے کہ خادمِ مصطفےٰ کا ہوں۔ سنّی کے سامنے عزت رسول سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اس کے مقابل نہ وہ اپنوں کو کچھ سمجھتا ہے نہ پرایوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ مسنفتی محترم نے غلام رسول سعیدی صاحب کی ایک ایمان سوز غلطی کی جب نشاندھی کی تو میں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ یہ

اپنے ہی ہیں۔ فوراً محاسبہ اور گرفت کی تاکہ آئندہ نسلیں جب توضیح البیان کی یہ باطل عبارت پڑھیں گی تو اس کی تردید میں میرا یہ فتویٰ بھی ملاحظہ کر کے اہلسنّت کی طرف سے غلط فہمی دور کرتے ہوئے اپنے دین کو بچاسکیں گے۔ اور کوئی بھی بریلویت سے بدظن نہ ہو گا۔

مسئلۂ قدرتِ کذبِ انبیاء پر سعیدی نعیمی تحریری مناظرے کی مکمل روئیداد

ع۳۴۲ سعیدی صاحب نے اپنے مسلک پر کہ (معاذ اللہ) انبیاءِ کرام جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مجھ کو یکے بعد دیگر تین عدد خطوط کراچی مدرسہ نعیمیہ سے بھیجے۔ پہلا خط ایک صفحہ۔ دوسرا خط چھ صفحات (بڑے سائز رجسٹر) تیسرا خط چھ صفحات رجسٹر سائز ہر سہ کا خلاصہ بکدم اپنی عبارت میں پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت علامہ مفتی اقتدار احمد خان صاحب دام ظلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی ہمایوں گرامی نامہ باصرہ نواز ہوا۔ توضیح البیان کے اس عبارت پر کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مگر بولتے نہیں آپ کا اعتراض غلط ہے یہ عبارت بالکل درست ہے اور یہی میرا عقیدہ ہے میرے پاس حسب ذیل دلائل ہیں۔ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی ذات سے امید قوی ہے کہ یہ تمام دلائل دیکھ کر پھر توضیح البیان کی عبارت کے بارے میں آپ کو خدشہ نہیں رہے گا۔ طالب دعا غلام رسول سعیدی غفرلہ ۱۰؍۷؍۸ ۱۲

دلیل نمبر اوّل :۔ یہ مسلک صرف میرا ہی نہیں بلکہ سب اہلِ سنّت کا ہے۔ آپ کے والد محترم حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالے کا بھی یہ ہی مسلک ہے۔ **دلیل دوم** :۔ علامہ تفتازانی مصنف شرح عقائد نسفی ص۱۵۷ پر فرماتے ہیں۔ وَحَقِیْقَۃُ الْعِصْمَۃِ اَنْ لَّا یَخْلُقَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الْعَبْدِ الذَّنْبَ مَعَ بَقَاءِ قُدْرَتِہٖ وَاِخْتِیَارِہٖ وَھٰذَا مَعْنٰی قَوْلِھِمْ ھِیَ لُطْفٌ مِنَ اللّٰہِ تَعَا! یَحْمِلُہٗ عَلٰی فِعْلِ الْخَیْرِ وَیَزْجُرُہٗ عَنِ الشَّرِّ مَعَ بَقَاءِ الْاِخْتِیَارِ تَحْقِیْقًا لِلْاِبْتِلَاءِ۔ وَلِھٰذَا قَالَ الشَّیْخ ابو منصور الما تریدی اَلْعِصْمَۃُ لَا تُزِیْلُ الْمِحْنَۃَ وَبِھٰذَا یَظْھَرُ فَسَادُ قَوْلِ مَنْ قَالَ اِنَّھَا خَاصَّۃٌ فِی الشَّخْصِ اَوْفِیْ بَدَنِہٖ یَمْتَنِعُ بِسَبَبِھَا صُدُوْرُ الذَّنْبِ عَنْہُ وَلَوْ کَانَ الذَّنْبُ مُمْتَنِعًا لَمَا صَحَّ تَکْلِیْفُہٗ بِتَرْکِ الذَّنْبِ وَمَا کَانَ مُثَابًا عَلَیْہِ :۔

دلیل سوم :۔ انبیاءِ کرام معصوم ہوتے ہیں لیکن معصوم ہونے کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے لیا ہے۔ آپ کا مطلب تمام اہلسنت کے خلاف بلکہ صحیح تعریف وہی ہے جو امام اہل سنّت ابو منصور ماتریدی اور علامہ تفتازانی نے مراد لی ہے۔ یہی عقیدہ علامہ شمس الدین خیالی کا ہے۔ چنانچہ حاشیہ خیالی صفحہ نمبر ع۱۴۲ پر فرماتے ہیں :۔ وَاَمَّا تَعْرِیْفُھَا فَھِیَ مَلَکَۃُ اِجْتِنَابِ الْمَعَاصِیْ مَعَ التَّمَکُّنِ فِیْھَا وَقَدْ یُعَبَّرُ عَنْ تِلْکَ الْمَلَکَۃِ بِالتَّلَطُّفِ لِحُصُوْلِھَا بِمَحْضِ

لُطفِ اللّٰہِ تعالیٰ وَفَضلٍ مِنّہٗ۔ **دلیل چہارم**: تفصیلی گفتگو سے پہلے چند اصطلاحات کی وضاحت کردوں تاکہ بحث آسان ہو۔ علم عقائد والوں کی اصطلاح میں چند جملے سمجھنے اشد ضروری ہیں ع۱ واجب لِذاتِہٖ جس شی کا وجود عقلاً واجب اور عدم عقلاً محال ہو اور شی اپنے وجود میں جعل جاعل کی محتاج نہ ہو۔ ع۲ ممتنع لِذاتِہٖ جس شی کا عدم عقلاً واجب اور وجود عقلاً محال ہو۔ اور وہ شی اپنے عدم میں جعل جاعل کی محتاج نہ ہو۔ ع۳ ممکن بالذات۔ یعنی جو محال عادی بھی ہو جاتی ہے۔ جس شی کا ہونا نہ ہونا عقلاً ممکن ہو۔ اگر جاعل نے وجود کو واجب کر دیا تو واجب بالغیر اور اگر عدم کو واجب کر دیا تو ممتنع بالغیر ع۴: ممتنع بالذات: جو ممتنع بالغیر کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔ کیونکہ ممتنع بالغیر کو امکانِ ذاتی لازم ہے: ع۵: استحالہ شرعیہ۔ جو شرعاً ناجائز ہو۔

ع۶: استحالہ عقلیہ۔ جو عقلاً ناجائز۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز محال شرعی ہو۔ محال عقلی نہ ہو۔ جیسے عبادتِ غیراللہ۔ ع۷ ممتنع لِذاتِہٖ۔ کی ضد واجب لِذاتِہٖ ہوتی ہے:۔

(اقول۔ مخالف نے یہ اصطلاحات اس زعم باطل میں لکھیں ہیں کہ گویا اس کے سوا ان کا علم کسی کو نہیں۔ اسی زعم نے کج روی و گستاخیِ رسول کا دروازہ کھولا اسی غرور نے علما کو رسوا کیا خواہ تفتازانی ہوں یا سعیدی۔ یہ اصطلاحات اپنی جگہ بالکل درست ہیں مگر مخالف کو ان کی سمجھ نہ آئے تو کیا کیا جائے؟ مخالف کے ان تمام دلائل کا جواب اختتام پر بالتفصیل انشاء اللہ تعالیٰ جَلَّ مَجْدُہٗ دیا جا رہا ہے۔ اسی دلیل ع۷ کی اس تمہید کے بعد مخالف لکھتا ہے۔)

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کذب ممتنع لِذاتِہٖ ہو تو لازماً اس کی ضد۔ صدق واجب لِذاتِہٖ ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممکن ہیں اور ممکن کی صفت: واجب لِذاتِہٖ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر صفات واجب لِذاتِہا ہوں تو ان کا محل وموصوف بھی واجب اور اس صورت میں تعددِ واجب لازم آئے گا۔ جو شرک صریح کو مستلزم ہے۔ العیاذ باللہ۔ اقول۔ یہی تو مخالف کی نادانی ہے کہ اس صحیح بات کو توڑ مروڑ کر اپنی غلط بات کے درپے ہے جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا۔ **دلیل نمبر پنجم**: اَلْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ بخاری جلد دوم صفحہ نمبر ۹۷۸ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ظاہر ہو گیا کہ عصمت جعل جاعل پر موقوف ہے اور جو چیز جعل جاعل پر موقوف ہو وہ ممکن بالذات اور واجب بالغیر ہو گی اس لیے اس حدیث سے ثابت ہوا کہ معصوم کا گناہوں سے بچنا محال عادی ہے محالِ عقلی نہیں لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ نبی جھوٹ بول سکتا ہے۔ (اقول معاذ اللہ) احناف اہل سنت مسائل کلامیہ

ہیں امام محمد بن محمد بن محمود ابو منصور سمرقندی ماتریدی متوفی ۳۳۳ھ کے نظریات کے تابع ہیں اور شوافع امام ابو الحسن اشعری کے۔ اور ہر دو کا یہی مسلک ہے جو میں نے لکھا۔ **دلیل ششم**:۔ ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ اپنی کتاب شرح فقہ اکبر ص ۵۹ پر شیخ ابو منصور ماتریدی سے منقول عصمت کی تعریف کا ذکر کرتے ہیں:۔ اَلْعِصْمَۃُ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ لُطْفٌ مِنْہُ وَلٰکِنْ عَلٰی وَجْہٍ یَبْقٰی اِخْتِیَارُ ھُمْ بَعْدَ الْعِصْمَۃِ فِی الْاِقْدَامِ عَلَی الطَّاعَۃِ وَ الْامْتِنَاعِ عَنِ الْمَعْصِیَۃِ وَ اِلَیْہِ مَالَ الشَّیْخُ ابو منصور الماتریدی

دلیل ہفتم:۔ علامہ تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ نے عصمت کی یہ تعریف لکھی ہے:۔ ھِیَ لُطْفٌ مِّنَ اللّٰہِ تعالٰی یَحْمِلُہٗ عَلٰی فِعْلِ الْخَیْرِ وَیَزْجُرُہٗ عَنِ الشَّرِّ مَعَ بَقَاءِ الْاِخْتِیَارِ تَحْقِیْقًا لِلْاِبْتِلَاءِ۔

دلیل ہشتم:۔ اس کی شرح میں علامہ عبد العزیز پرہاروی لکھتے ہیں:۔ عِلَّتُہٗ لِبَقَاءِ الْاِخْتِیَارِ وَ ھٰکَذَا التَّعْرِیْفُ مَنْقُوْلٌ عَنِ الْمُعْتَزِلَۃِ وَلٰکِنْ لَمَّا کَانَ غَیْرَ مُخَالِفٍ لِتَعْرِیْفِ الْاَشَاعِرَۃِ فِی الْمَآلِ ذَکَرَہٗ تَائِیْدًا لِبَقَاءِ الْقُدْرَۃِ۔ (نبراس ص ۵۳۵):۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ سنت ماتریدی اشاعرہ اور معتزلہ سب کے نزدیک عصمت کی یہی تعریف ہے:۔ **دلیل نہم**:۔ علامہ شہاب الدین خفاجی اس کی شرح اپنی کتاب نسیم الریاض جلد چہارم ص ۱۲۵ پر لکھتے ہیں:۔ (وَ الْجُمْھُوْرُ) اَیْ اَکْثَرُ النَّاسِ وَ مُعْظَمُھُمْ (وکسبھم) لا انھم مُضْطَرُّوْنَ لِعَدَمِ قُدْرَتِھِمْ عَلٰی خِلَافِہٖ۔ اِلَّا حُسَیْنًا النَّجَّارَ وَ ھُوَ حَسَنُ بْنُ مُحَمَّدِ النَّجَّارُ الَّذِیْ یُنْسَبُ لَہُ الطَّائِفَۃُ النَّجَّارِیَّۃُ وَھُمْ فِرَقُ الْمُبْتَدِعَۃِ الضَّالَّۃُ (شفاء):۔ اور نسیم الریاض کی عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ جمہور مسلمین کا عصمت کے بارے یہی مسلک ہے کہ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں (اقول معاذ اللہ من ھذہ العقیدۃ الباطلۃ):۔ اور جو لوگ عدم قدرت کا عقیدہ بناتے ہیں وہ فرقہ ضالہ ہے مبتدعہ ہے۔ (اقول۔ جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے) ملا علی قاری نے شرح شفا علی ہامش نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ نمبر ص ۱۳۸ پر نجار کو معتزلی قرار دیا ہے۔ (اقول تعجب ہے کہ ابھی آپ کہہ رہے ہیں معتزلی کا مذہب قدرت علی الذنب ہے اور اب نجار کو اس لیے معتزلی کہہ رہے ہیں کہ اس نے عدم قدرت کا عقیدہ بنایا۔ صدق السعدی۔ دروغ گو را حافظہ نباشد) **دلیل دہم**:۔ جن لوگوں نے انبیاء کے لیے گناہوں کو محال قرار دیا ہے وہ روافض کا ایک فرقہ ہے چنانچہ علامہ عبد العزیز پرہاروی نبراس صفحہ نمبر ۵۲۵ پر لکھتے ہیں:۔ قَالَ ھُمْ (بَعْضُ الشِّیْعَۃِ) اَنَّمَا اَیِ الْعِصْمَۃُ خَاصَّۃٌ فِیْ نَفْسِ الشَّخْصِ اَیْ رُوْحِہٖ اَوْ فِیْ بَدَنِہٖ یَمْتَنِعُ بِسَبَبِہٖ صُدُوْرُ الذَّنْبِ عَنْہُ:۔

دلیل ۱۱ یازدہم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے اپنی تفسیر نور العرفان صفحہ نمبر

صـ۱۴۲ پر لکھا۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ ممتنع بالذات ہے۔ کیونکہ پیغمبر کا جھوٹ ممتنع بالغیر ہے اور رب تعالیٰ تمام سے زیادہ سچا تو اس کا سچا ہونا واجب بالذات ہونا چاہیئے ورنہ اللہ کے صدق اور رسول کے صدق میں فرق نہ ہوگا۔ حکیم الامت قُدِّسَ سِرُّہٗ کی عبارت سے بھی میرے عقیدے کی تائید ہو رہی ہے۔ (اقول کیا عجیب اوندھی عقل ہے) **دلیل دوازدھم** (یعنی بارھویں دلیل) نسیم الریاض جلد چہارم صـ۳۹ پر ہے:۔ وَقَدْ تَقَرَّرَ اَنَّ الْعِصْمَةَ عِنْدَ الْمُتَكَلِّمِيْنَ اَنْ لَّا فِي النَّبِيِّ ذَنْبًا وَعِنْدَ الْحُكَمَاءِ مَلَكَةٌ تَمْنَعُ مِنَ الْفُجُوْرِ حَاصِلَةٌ مِنَ الْعِلْمِ۔ (الخ) وَقِيْلَ۔ اَلْعِصْمَةُ خَاصَّةٌ فِي النَّفْسِ اَوِ الْبَدَنِ بِسَبَبِهَا يَمْتَنِعُ عَنْ صُدُوْرِ الذَّنْبِ وَيَابَاهُ اَنَّهٗ لَوْ كَانَ كَذَا مَا اسْتَحَقَّ الْمَدْحَ وَالثَّوَابَ لِاَنَّهَا لَيْسَتْ دَاخِلَةً تَحْتَ الْاِخْتِيَارِ وَهُمْ مُكَلَّفُوْنَ بِالْاِتِّفَاقِ۔ اس عبارت سے پتہ چلا کہ انبیاءِ کرام بھی مکلّف ہوتے ہیں:۔

دلیل تیرھویں:۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت جگہ جبراً و حکماً انبیاء کو گناہوں سے روکا۔ آیات ملاحظہ ہوں:۔

نمبر ایک:۔ حضرت آدم علیہ السلام سے خطاب فرمایا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ع۲ حضرت نوح کو روکا۔ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ع۳ حضرت موسیٰ و ہارون کو منع کیا:۔ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ع۴ حضرت داؤد کو کہا گیا۔ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى ع۵:۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ سے نہی کا خطاب وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ع۶ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ یہ آیت بھی نبی کریم کے لیئے ہے ع۷ نبی علیہ السلام کو خطاب وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ ع۹ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ع۱۰ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ

دلیل چودھویں:۔ میر سید شریف جرجانی اپنی کتاب شرح مواقف صـ۶۹۹ پر لکھتے ہیں۔ وَقَالَ قَوْمٌ اَلْعِصْمَةُ يَكُوْنُ خَاصَّةً فِيْ نَفْسِ الشَّخْصِ اَوْ فِيْ بَدَنِهٖ يَمْتَنِعُ بِسَبَبِهَا صُدُوْرُ الذَّنْبِ فِيْهِ يُكَذِّبُهٗ۔ اَيْ هٰذَا الْقَوْلَ اِنَّهٗ لَوْ كَانَ صُدُوْرُ الذَّنْبِ كَذَالِكَ اَيْ مُمْتَنِعًا لَمَا اسْتَحَقَّ الْمَدْحَ بِذَالِكَ اَيْ بِتَرْكِ الذَّنْبِ اِذْ لَا مَدْحَ وَلَا ثَوَابَ بِتَرْكِ مَا هُوَ مُمْتَنِعٌ:۔ وَاَيْضًا۔ فَالْاِجْمَاعُ مُنْعَقِدٌ عَلٰى اَنَّهُمْ اَيِ الْاَنْبِيَاءُ مُكَلَّفُوْنَ بِتَرْكِ الذُّنُوْبِ مُثَابُوْنَ بِالطَّاعَاتِ۔ وَاَيْضًا۔ فَقَوْلُهٗ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ يَدُلُّ عَلٰى مُمَاثَلَتِهِمْ بِسَائِرِ النَّاسِ فِيْمَا يَرْجِعُ اِلَى الْبَشَرِيَّةِ۔ وَالْاِمْتِيَازُ بِالْوَحْيِ لَا غَيْرُ فَلَا يَمْتَنِعُ صُدُوْرُ الذَّنْبِ عَنْهُمْ كَسَائِرِ الْبَشَرِ (۱) قولؔ۔ کیا فرق رہا ایک گستاخِ رسول ہیں اور میر سید شریف ہیں اور

اُن کے متبع سعیدی صاحب میں دیکھو نبی کی دشمنی کس حال تک پہنچا دیتی ہے ؛ ۔ **دلیل پندرھویں:۔** قاضی عیاض مالکی شرح شفا جلد دوم کے صـ۱۲۵ پر لکھتے ہیں :۔ وَالْجُمْهُوْرُ قَائِلٌ بِاَنَّهُمْ مَعْصُوْمُوْنَ مِنْ ذَالِكَ مِنْ قِبَلِ اللّٰهِ تَعَالٰی مُعْتَصِمُوْنَ بِاخْتِیَارِهِمْ وَكَسْبِهِمْ اِلَّا حُسَیْنًا النَّجَّارُ فَاِنَّهُ قَالَ لَا قُدْرَةَ لَهُمْ عَلَی الْمَعَاصِیْ اَصْلًا :۔ اس عبارت سے قاضی عیاضؒ کا عقیدہ بھی پتہ چل گیا۔ لہٰذا آپ کا اعتراض مجھ پر اور میری کتاب توضیح البیان پر غلط ہے۔ مجھ پر اور میری کتاب پر فتوٰی لگانے سے پہلے اِن اکابر پر فتوٰے لگاؤ فقط وَالسّلام غلام رسول سعیدی دار العلوم نعیمیہ بلاک عـ۱۵ دستگیر کالونی کراچی نمبر عـ۳۸ ۔!

باوجود اسبات کے کہ یہ تمام دلائل نہایت کمزور اور سعیدی صاحب کا ان دلائل کی آڑ میں اپنے باطل عقیدہ کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرنا نہایت ضلالت و گمراہی ہے اور گستاخیِ رَسُوْلُ اللّٰہ پر ڈھٹائی کرنا ہے۔ جو ایک سنی بریلوی کہلوانے والے کے لیئے ہرگز زیب نہیں۔ مگر میں نے نہایت انصاف کے ساتھ سعیدی صاحب کے تمام دلائل لفظاً۔ حرفاً حرفاً لکھ دیئے اگرچہ یہ گستاخانہ نظریات لکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تین وجوہ کی حقّہ لکھے گئے ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ معترض وہابی صاحب اور دیگر وہابیان کو معلوم ہو جائے۔ ہمارے سنی عالم غلام رسول سعیدی صاحب نے یہ عقیدہ کسی گستاخی یا تعصب یا دشمنی رسولِ پاک یا بے ادبی انبیاء کے ارادہ سے نہیں لکھا۔ بلکہ جلدی میں کم فہمی سے ان دلائل کے ماتحت یہ غلط عقیدہ بنا بیٹھے اور محض کذبِ باری تعالیٰ کے وہابیانہ عقیدے کو توڑنے کے لیئے یہ غلط راہ اختیار کرلیا اور میں حتمًا کہتا ہوں کہ جن دلائل مندرجہ بالا کا سعیدی صاحب نے سہارا پکڑا ہے ان کا جواب اور ان کی تردید معترض صاحب یا کسی بھی وہابی دیوبندی کی جرأت نہیں۔ اگر دیوبندی اکابر ان دلائل کو دیکھیں تو بغلوں میں منہ دبالیں۔ اور صمیت وبکمیت کے سوا چارہ نہ رہے۔ اور سعیدی وغیرہ پر ایسے اعتراض کرنا بھول جائیں۔ بخلاف دیوبندیت اور وہابیت کے کہ وہ لوگ جو بھی عقیدہ بناتے ہیں محض تعصب گستاخی اور دشمنیءِ انبیاء کی بنا پر۔ بغیر دلائل بناتے چلا جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ سعیدی صاحب کے دل میں یہ حسرت باقی نہ رہے کہ اقتدار احمد نعیمی قادری بدایونی نے میری فلاں بات کا جواب نہیں دیا۔ تیسری وجہ یہ کہ ناظرین وقارئین اس مضمون کو پڑھنے میں پورا فہم حاصل کرسکیں اور سمجھنے میں تشنہ نہ رہیں تاکہ انصاف وعقلِ ایمانی وفہم عرفانی کی خداداد میزان میں تول کر اپنے عقیدے کو گمراہی سے بچا سکیں اور آئندہ نسلوں کو پتہ لگ جائے کہ باطل کا کہاں تک شور ہوتا ہے اور حق میں کتنا زور ہوتا ہے فَبِسْمِ اللّٰهِ مَا بِیَ اللّٰهُ حَسْبِیَ اللّٰهُ تَوَكَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ اعتصمت باللّٰه لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ :۔

پہلی دلیل کا جواب :۔ علامہ نے کہا کہ سب اہل سنت کا عقیدہ یہی ہے یہ بات علامہ کی کم علمی ہے اور بلا تحقیق اتہام محض ہے۔ حقیقت یہ ہے تمام اکابر اہل سنت کا اصلاً عقیدہ یہی ہے کہ انبیاءِ کرام گناہِ کبیرہ وصغیرہ پر ہرگز ہرگز قادر نہیں۔ وہ ہستیاں گناہ کر سکتی ہی نہیں گناہ کے معاملے میں انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام بالکل بے اختیار و بے قدرت ہیں اسی لیئے انبیاءِ کرام صرف امر میں مکلف ہوتے ہیں نہی میں مکلف نہیں ہوتے قرآن پاک میں جتنی بھی نواہی اور ممانعتیں وارد ہوئی ہیں ان میں بعض اگرچہ ظاہراً انبیاء سے خطاب ہیں مگر حقیقتاً وہ تمام ممانعتیں عوام امت کو ہیں۔ ہاں امر میں انبیاءِ پاک مکلف ہوتے ہیں اور ان کو عبادات بلکہ ہر فعل پر یہاں تک کہ سونے جاگنے کھانے پینے پر ثواب ملتا ہے۔ سعیدی صاحب کی پیش کردہ جتنی عبارتوں میں بھی مکلف ماننے کے عقیدے کا ذکر آیا ہے وہ سب مکلّف فی الامر کے لیئے ہیں علامہ نے اپنی باطلیت کو بچانے کے لیئے دھڑا دھڑ بزرگوں کی عبارتوں پر قلم تو چلایا ہے مگر بیچارے اپنی ان عبارتوں کو خود بھی نہ سمجھ سکے۔ اگلی سطور میں با دلائل ثابت کیا جائے گا کہ تمام اہلِ سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ انبیاءِ کرام نہ جھوٹ بول سکتے ہیں نہ بولتے ہیں وہ پاک ہستیاں گناہوں پر قادر ہی نہیں ہاں تین شخصوں نے انفرادی اور ذاتی طور پر یہ لکھ دیا کہ معاذاللہ انبیاء کرام گناہ پر قادر ہوتے ہیں۔ مگر ان کے نزدیک بھی گناہ کبیرہ نہیں بلکہ گناہ صغیرہ مراد ہے۔ اس لیئے کہ سب عبارتوں میں ذنب ہی لکھا ہے اور ذنب دو قسم کا ہے۔ صغیرہ وکبیرہ۔ اسی کا دوسرا نام معصیت ہے۔ جب یہ بزرگ جگہ جگہ لفظ ذنب استعمال کر رہے ہیں تو ہم کو کیا مصیبت ہے کہ خواہ مخواہ کبیرہ ہی مراد لیں اور ان کو گناہ گار بنائیں۔ جہاں تک ہو سکے مسبوقین کی عزت بچانی چاہیئے۔ حدیث پاک میں ہے۔ اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ (جامع صغیر)۔

جب ایک بچنے کی راہ نکل رہی ہے تو کیوں فقط اپنی نادانی کی بنا پر غلط مطلب نکال کر خود بھی گنہگار بنو اور ان کو بھی گناہگار و مطعون کرو۔ اہلِ سنت میں تین لوگوں میں سے اصل ایک شخص نے عقیدہ بنایا وہ ہیں امام منصور ماتریدی۔ جنہوں نے سب سے پہلے کہا کہ انبیاء کو گناہ میں اختیار ہے مگر مراد گناہ صغیرہ لیا۔ ان کی دیکھا دیکھی علامہ تفتازانی کو بھی جرئت ہوئی مگر حد میں رہتے ہوئی۔ مگر تیسرے نمبر والے میر شریف نے شرح مواقف میں۔ گستاخی میں تجاوز اور بالکل نجدی مار کر گمراہی پھیلائی امام منصور اپنے زمانے میں اہلِ سنت کے امام تھے ان کی صرف وہی بات مانی جائے گی جو اصولِ شریعت کے مطابق ہوگی۔ ان کے ذاتی نظریات کے ماننے میں نہ ہم ان کے مقلد ہیں نہ مکلف۔ یہ غلط باتیں ان کے ذاتی ہیں۔ جماعتِ اہل سنت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ذاتی انفرادی اقوال تو لاکھوں ایسے مل جائیں گے کہ جن کو اگر تسلیم کیا جائے تو دین ایک کھلونا بن جائے۔ میر شریف کے بعد ہمارے سعیدی صاحب

کو مصنف بننے کا شوق چرایا تو گستاخی میں دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ لیکن زمانہ بتا رہا ہے کہ ابابیل سے فیل ہلاک ہوتے چلے گئے اگر کانٹے نکلتے ہیں تو قدرت پھول بھی ظاہر فرماتی ہے۔ بقول شخصے لکلِّ فرعونٍ موسیٰ۔ بہرحال مجھ پر فرض منصبی ہے کہ میں ثابت کروں کہ تمام اہل سنت کا عقیدہ کیا ہے۔ میں نے جو امام منصور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عبارت کا مطلب گناہ صغیرہ کی طرف پھیرا ہے وہ صرف ان کو بچانے کے لیے ورنہ اگر کوئی ثابت کر دے کہ امام منصور نے گناہ کبیرہ ہی مراد لیا ہے تو امام منصور کی تردید کی جائے گی۔ کیونکہ ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد۔ فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد۔ غلط نظریات سے سعیدی صاحب جیسے بھٹک سکتے ہیں۔ مگر میرے رب نے حفاظت فرمائی ہے اور اب مجھ کو اپنے کرم سے محفوظین کے خدام میں داخل فرمایا۔ ابتدائے شباب میں جب کبھی گناہ کے قریب ہوا تو میرے کریم رب نے غوث پاک کے صدقہ اس طرح مجھ کو گناہ سے بچایا کہ بعد میں خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی اور اب جب کہ مکمل صحتمند جوانی کے دور میں ہوں جب کبھی گناہ کرنے کا خیال آتا ہے تو دل پکارتا ہے کہ تیری قسمت میں یہ گناہ نہیں ہے۔ اس آواز کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میں گناہ کر سکتا ہوں مگر کرتا نہیں۔ کس کی بدبختی اس کو اس عقیدے پر لائے کہ معاذ اللہ انبیاء بھی گناہ کر سکتے ہیں مگر کرتے نہیں۔ فَمَا قَدَرُوا الرَّسُوْلَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ کس کی بدقسمتی اس کو مسلک سے بھٹکا رہی ہے۔ سچا مسلک یہی ہے کہ انبیاء کرام مرسلین عظام کروڑہا قدرتوں پر قادر ہیں۔ مگر گناہ پر قادر نہیں۔ اے ہمارے رب ہم کو اس سچے مسلک پر رہنے کی قدرت عطا فرما۔ امام علامہ قاضی عیاض قدس سرہٗ شفا شریف میں فرماتے ہیں مَنْ اٰمَنَ بِالْوَحْدَانِیَّۃِ وَصِحَّۃِ النُّبُوَّۃِ وَبِنُبُوَّۃِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلٰکِنْ جَوَّزَ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ الْکِذْبَ فِیْمَا اَتَوْا بِہٖ اَدَّعٰی فِیْ ذٰلِکَ الْمَصْلِحَۃَ بِزَعْمِہٖ اَمْ لَمْ یَدَّعِهَا فَهُوَ کَافِرٌ بِاِجْمَاعٍ۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبوت کی حقانیت اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتقاد رکھتا ہو با ایں ہمہ انبیاء علیہم السلام پر ان باتوں میں کہ وہ اپنے رب کے پاس سے لائے کذب جائز مانے بزعم خود اس میں کسی مصلحت کا ادعا کرے یا نہ کرے ہر طرح بالاجماع کافر ہے سبحٰن اللہ حضرات انبیاء علیہم افضل الصلوٰۃ والثناء پر کذب جائز ماننے والا بالاتفاق کافر ہوا۔ یہی مذہب مسلک اعلیٰحضرت کا ہے۔ چنانچہ سبحان السبوح ص۳۶ پر ہے کہ اگر عصمت یعنی امتناع صدور و عدم قدرت ہی لیجئے تاہم امتناع ذاتی نہیں کہ صلب عصمت خود زیر قدرت۔ سبحان اللہ اعلیٰحضرت بریلوی نے کیسی واضح عبارت فرمائی بالکل یہی میرا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں اور عصمت کا معنے امتناع صدور اور گناہ پر عدم قدرت ہے ہاں سلب عصمت ہو سکتی ہے۔ مگر جب تک سلب نہ ہو اور عصمت باقی اس وقت تک ہرگز کوئی نبی علیہ السلام گناہ پر قادر نہیں۔ سعیدی صاحب کہتے ہیں کہ عصمت بھی ہے اور قدرت بھی یہ اجتماع ضدین ہے۔ ایسی غلطی کسی نے نہ کی۔ جنہوں نے قدرت گناہ مانا ہے انہوں نے امتناع صدور و عدم قدرت نہیں مانا۔ سعیدی صاحب کو چاہیئے کہ پردے میں نہ رہیں بلکہ کھل کر سامنے آئیں اور سرے سے عصمت کا انکار کریں

جیسے کہ مودودی صاحب نے اور جیسے کہ قاسم نانوتوی نے تصفیۃ العقائد میں کھل کر انکار کیا۔ یہ تھا۔ اعلیٰحضرت کا مسلک جو انکی کتاب سے ظاہر ہوا اسی مسلک کو اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۸ پر فرماتے ہیں۔ اور جو معصوم من اللہ ومؤید بالمعجزات ہو کر کذب کا امکان و وقوع بھی نہ رہے مگر بنظر نفس ذات امکان ذاتی ہو۔ اعلیٰحضرت سے کیسی شاندار وضاحت فرمادی کہ عصمت کی وجہ سے وقوعِ ذنب کا امکان و قدرت بھی نہیں مگر عصمت سے ہٹ کر صرف ذات اور تشخص کو دیکھا جائے تو امکان بالذات ہے۔ یعنی امتناع بالغیر کی وجہ سے قطعاً قدرت نہیں۔ صدر الافاضل سید نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب العقائد ص ۸ مطبوعہ مرادآباد میں لکھا۔ س معصوم کس کو کہتے ہیں۔ ج جو اللہ کی حفاظت میں ہو اور اس وجہ سے اس کا گناہ ناممکن ہو۔ علامہ سید نذیر الحق قادری جو اہل سنت کے اکابر میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب الاسلام ص ۴۴ پر لکھا۔ ہم انبیاء کرام کو معصوم کہتے ہیں اور اس کہنے سے یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ ان میں گناہ خداوندِ عالم کا مادہ اور سامان ہی نہیں۔ کیونکہ ان میں جب کوئی صفت ہی نہیں تو پھر ان سے برے افعال صادر ہونا بھی ممکن نہیں۔ یہ تھے اکابرِ اہلِ سنت کے اقوالِ زریں۔ کیا سعیدی صاحب کے نزدیک یہ سب شیعہ رافضی اور کیا صدر الافاضل و اعلیٰحضرت نے بھی شیعہ روافض کا مذہب اختیار کیا؟ (معاذ اللہ) حقیقت یہ ہے کہ انبیاءِ کرام کے مقابل بجز آپ کے کسی اہلسنت نے اتنی دیدہ دلیری اور بیباکی کا مظاہرہ نہ کیا یہ باطل راستہ آپ نے ہی اختیار کیا خدا تعالیٰ ہدایت دے:۔

جواب دلیل دوم:۔ سعیدی صاحب نے مجھ کو تین خط یکے بعد دیگرے لکھے جن میں سے ضروری اور صحیح مناظرے سے متعلق باتیں میں نے درج کر دیں ان کے جواب میں میں نے سعیدی صاحب کو چار خط لکھے جن میں پہلا خط تین صفحات پر دوسرا خط چار صفحات پر اور تیسرا خط گیارہ صفحات پر چوتھا خط آٹھ صفحات پر بڑا رجسٹر سائز پر لکھے گئے۔ اُن کی پوری عبارت تو درج نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ صرف تین آدمی مسلک اہلِ سنت سے ہٹے ہیں باقی جتنے بھی حوالے سعیدی صاحب نے لکھے وہ سب بزرگ صرف لوگوں کے مسلک بیان کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ فلاں نے عصمت کی تعریف یہ کی وغیرہ وغیرہ اپنا مسلک ظاہراً یا قرینۃً نہیں بتایا اور پھر تماشہ یہ کہ یہی مصنفین کرام اپنی ان ہی کتابوں میں عصمت کی صحیح اور عدمِ قدرت والی تعریف بھی کر رہے ہیں مگر سعیدی صاحب اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ سعیدی صاحب کے دلائل میں جن عبارتوں میں یہ لکھا ہے کہ نبی کا گناہ پر قادر ہونا جمہور کا مذہب ہے۔ یہ بات ان کی اپنی خود ساختہ بات ہے کسی جمہور کا یہ مذہب نہیں ہے۔ وہ کون جمہور ہے جس کو اعلیٰحضرت۔ صدر الافاضل۔ حکیم الامت تو نہ سمجھ سکے مگر آج سعیدی صاحب سمجھ گئے اعلیٰحضرت حکیم الامت ح

رحمۃ اللہ علیہ نے صاف فرمایا کہ انبیاءِ کرام گناہ پر قادر ہی نہیں ہوتے۔ چنانچہ حاشیہ بخاری غیر مطبوعہ کے ص۹۷ صفحہ پر ہے:۔ قَوْلُہٗ المعصوم مَنْ عَصَمَہُ اللہُ (الخ) ۔ لَیْسَ الْمُرَادُ بِالْمَعْصُوْمِ۔ الْمَعْصُوْمُ الِاصْطِلَاحِیُّ اَعْنِیْ غَیْرُ قَادِرٍ عَلَی الذَّنْبِ کَمَا ھُوَ شَانُ الْاَنْبِیَاءِ بَلِ الْمُرَادُ بِہٖ الْمَحْفُوْظُ کَمَا ھُوَ شَانُ الْاَوْلِیَاءِ اَوِ الْمَمْنُوْعُ کَمَا ھُوَ حَالُ اَکْثَرِ الصَّالِحِیْنَ فَعِصْمَۃُ الْاَنْبِیَاءِ بِطَرِیْقِ الْوُجُوْبِ وَعِصْمَۃُ غَیْرِھِمْ بِطَرِیْقِ الْجَوَازِ کَذَا فِی الْعَیْنِیْ۔ (ترجمہ):۔ اس روایت میں معصوم سے مراد اصطلاحی معصوم نہیں یعنی اصطلاحِ شریعت میں عصمت کا معنی ہے۔ گناہ پر قادر نہ ہونا یہ انبیا کی شان ہے۔ بلکہ یہاں مراد یا معصوم سے محفوظ ہے اور یا مراد ممنوع ہے۔ محفوظ اولیاء اللہ ہوتے ہیں ممنوع صالحین ہوتے عصمتِ انبیاء وجوبی و لازمی شئی ہے اور عصمتِ غیر جوازی چیز ہے۔ سعیدی صاحب کی اس دلیل کی غلطی بالکل عیاں ہے۔ کہ جب انبیاء میں خلقتِ گناہ ہی نہیں۔ تو گناہ کر سکنا کیا مطلب ہے تفتازانی صاحب کا یہ کہنا مع بقاءِ قدرتہٖ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قدرت سلبِ عصمت پر ہے۔ جیسا کہ اعلحضرت نے فرمایا سلبِ عصمت زیرِ قدرت ہے اور کس کی زیر قدرت! باری تعالی کے زیرِ قدرت کہ جب چاہے عصمت ختم کر دے نہ کہ خود انبیاء کے زیرِ قدرت انبیاءِ کرام اپنی عصمت ختم نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالی ختم کرنے پر قادر ہے۔ لیکن جب تک عصمت قائم ہے۔ انبیاءِ کرام گناہ پر قادر نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر عصمت ختم ہو جائے تب یہ کہہ سکتے ہیں کہ گناہ کر سکتے ہیں۔ مگر چونکہ عصمت نبوت کو مستلزم ہے۔ سلبِ عصمت سے سلب نبوت بھی ہو گی۔ مگر یہ فطرت اور وعدۂ الٰہیہ کے خلاف ہے اس لئے ممتنع ہے۔ دلیل دوم کا جواب دینے کے بعد اب اپنی تحاریر کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ جس میں۔ علامہ کی تمام باقی دلیلوں اور ان کی خطوط کی دیگر لغویات کا جواب بھی ہو گا حقیقتِ عصمت وہ نہیں جو علامہ تفتازانی اور مولانا سعیدی صاحب نے لکھ دی توضیح البیان کی عبارت کچھ قدر جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ اہلِ علوم میں جب کبھی اختلافات کی خلیج وقوع پذیر تو اس کی بڑی وجہ یہ ہی ہوتی رہی کہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ایک ہی پہلو کو اول سے ہی نظریہ بنایا اور اسی پر جمود کیا اور جب یہ بات ٹھان لی کہ ہم نے اس نہج پر چلنا ہے اور اسی پر مصر رہنا ہے۔ اسی کو ٹھوس مسلک بنانا ہے تو ذہن و دماغ تحقیق سے عاری ہو جاتے ہیں اور کسی حقیقت کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتے۔ فرقہ پروری کی جڑ بنیاد سب سے بڑی یہی ارادۂ ذہنی اور خیالی کیفیت ہے۔ اور اسی سے انسان میں غرور و تکبر کے سوتے پھوٹتے ہیں پھر انسان سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہو سکتا اور مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ یہی خیالِ خام اس کی دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی شخص کو اپنے علم پر غرور ہوا تو ربِ کریم نے کسی بھی چھوٹے

انسان سے ایسی ذِلت آمیز شکست دلوائی کہ ساری عمر کی دل تنگی نصیب ہوئی اور اس افسوس میں فوت ہو گئے۔ چنانچہ ملّا واحدی جب شیراز سے ہندوستان آئے تو عبد الحکیم سیالکوٹی سے ایک صیغہ بتانے پر شکست کھا گئے عبد الحکیم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس وقت چھوٹی عمر میں تھے۔ ملّا واحدی اسی شکست کے رنج سے جانبر نہ ہو سکے۔ مولانا مہر الدین صاحب قبلہ نے اپنی شرح مبانی کے ص۸ پر علامہ تفتازانی کے متعلق بھی اسی قسم کا واقعہ لکھا ہے کہ نقمانِ معتزلی کی وجہ سے میر سید شریف جرجانی سے ایسی شکست کھا گئے کہ اسی غم میں فوت ہو گئے۔ آخر یہ ذلت کی شکست کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ جب کسی سے نادانستہ طور پر گستاخی ہو جاتی ہے تو اس کو دنیا میں اس طرح پر سزا دے دی جاتی ہے یہ سزا گستاخیٔ انبیاء کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور جب کوئی دانستہ گستاخی کرے تو اس کو آخرت میں سزا ملتی ہے۔ یہ خوش بختی ہے کہ دنیا میں سزا مل جائے جن کو دنیا میں سزا نہ ملے اُن کو آخرت میں ملتی ہے جب تک توبہ کرے۔ بزرگ صحابی حضرت حسّان آخرِ عمر میں نابینا ہو گئے تھے خود فرماتے تھے کہ مجھ کو سزا ملی ہے اس بات کی کہ میں نادانی سے واقعۂ تہمتِ اُمّ المومنین میں شریک ہو گیا تھا۔ (تفسیر کا باب بخاری شریف جلد دوم ص۵۹۷) اللہ کریم ہم سب کو گستاخی سے بچائے۔ آمین اگر علامہ تفتازانی اور ماتریدی صاحب کو بھی کوئی سمجھانے والا سمجھا دیتا تو یقیناً وہ دونوں حضرات اس بطلان سے رجوع کر لیتے۔ سعیدی صاحب کو خاصا سمجھا دیا گیا اور وہ اپنے آخری خط میں در پردہ خفیف اشاروں دبے لفظوں میں اپنی شکست تسلیم بھی کر چکے ہیں۔ ان کے ترکشِ علم میں دلائل کے سب تیر ختم ہو چکے ہیں مگر ابھی تک ان کو توبہ و رجوع کی توفیق نہیں ملی۔ میری دعا ہے کہ یا اللہ میرے سعیدی صاحب دنیا سے اس گستاخی کے ساتھ نہ جائیں منزلِ مقصود اور راہ ہدایت وادیٔ علم و تحقیق میں تب حاصل ہوتی ہے جب انسان توفیقِ اللہ کے سہارے محض مخلص بن کر خشیت الٰہی سے وابستہ ہو کر ذاتی نظریات و مسالک اختراعیہ سے یکسر خالی الذہن ہو کر قدم اٹھائے۔ وَقَاکَ عِلْمُکَ۔ کا زعم باطل کبھی خیر کا طالب نہیں ہوتا سعادتِ ابدی تو وَفَّانِیْ فَضْلُ رَبِّیْ سے ہی ملتی ہے۔ جس طرح کہ تمام مسائل میں ایک سے زیادہ پہلو مل جاتے ہیں نظریاتِ کثیفہ و لطیفہ و اقوالِ صادقہ و کاذبہ مل جاتے ہیں۔ اسی طرح۔ عصمتِ انبیاء کرام میں بھی تین نظریات پائے جاتے ہیں۔ پہلا نظریہ اہلِ سنت کا۔ دوسرا نظریہ حکما کا۔ تیسرا نظریہ معتزلہ کا۔ مسلک اہلِ سنت میں عصمت کی تعریف یہ ہے کہ گناہ پر انبیاء کرام قادر ہی نہیں ہوتے اور اطاعت بشانِ امتیازی پر قادر ہوتے ہیں۔ حکماء کے نزدیک عصمت ایک ملکہ ہے گناہ سے بچنے کا اس ملکے کے باوجود گناہ پر قادر ہوتے ہیں۔ معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ عصمت اللہ کی طرف سے ایک ایسا لطف ہے۔ کہ جس کی وجہ سے

شخصِ معصوم [شخص] باوجود قادر ہونے کے گناہ کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظریے باطل ہیں۔ اور در پردہ عصمت کا انکار ہے۔ کیونکہ یہ صفت محفوظین کی ہے نہ کہ معصومین کی۔ حکما اور معتزلہ بوجہ خوفِ طعن کھل کر عصمت کا انکار نہ کر سکے تو عصمت کی تعریف بدلنے کی کوشش کی۔ تاکہ جان بھی بچ جائے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ اس دور کے بیباک پیشواؤں نے اِن ہی باطل نظریات کو دیکھ کر کھل کر عصمتِ انبیاء کا انکار کر دیا۔ دیکھو قاسم نانوتوی کی کتاب تصفیہ عقائد صفحہ ۳۱ ۔ صاف منکر ہوا۔ اسی طرح مودودی صاحب صاف انکاری ہوئے۔ بات ایک ہی ہے حکماء و معتزلہ منکر ہوئے ہیرا پھیری کرکے۔ یہ منکر ہوئے صاف صاف۔ علامہ سعیدی صاحب نے بھی معتزلہ کے نظریے کو قبول کیا۔ اور یہی دو نظرئیے پیش کیے۔ اہل سنّت کا مسلک بالکل صاف ہے جس سے امتیازی طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ معصوم اور محفوظ مِنَ اللہ اور ممنوع مِنَ اللہ میں کیا فرق۔ شرح تجرید کے مولف شرح ہٰذا کے صفحہ ۱۰۸ پر لکھتے ہیں:۔ اَلْعِصْمَةُ عِنْدَ الْاَشَاعِرَةِ هِيَ الْقُدْرَةُ عَلَى الطَّاعَةِ وَعَدَمُ الْقُدْرَةِ عَلَى الْمَعْصِيَةِ وَعِنْدَ الْمُعْتَزِلَةِ هِيَ لُطْفٌ مِنَ اللّٰهِ لَا يَكُوْنُ لَهٗ مَعَ ذٰلِكَ دَاعٍ اِلٰى تَرْكِ الطَّاعَةِ وَاِرْتِكَابِ الْمَعْصِيَةِ مَعَ قُدْرَتِهٖ عَلٰى ذٰلِكَ۔ وَعِنْدَ الْحُكَمَاءِ هِيَ مَلَكَةٌ تَمْنَعُ صَاحِبَهَا مَعَهَا الْمَعَاصِيْ ۔ (ترجمہ)۔

اہلِ سنّت اشاعرہ کے نزدیک عصمت یہ ہے کہ معصوم شخص اطاعت پر پورا ہر وقت پر قادر ہے اور گناہ پر کبھی قادر نہ ہو۔ معتزلہ یعنی موجودہ وہابیہ فرقہ کہتا ہے کہ عصمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطف ہے جس کے ذریعے معصوم گناہ نہیں کرتا مگر قادر رہتا ہے حکما یعنی فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ عصمت ایک ذاتی ملکہ اور مہارت ہے۔ جس کے سبب سے معصوم کو گناہ سے بچنے کی مہارت ہوتی ہے۔ یہ دونوں مذہب بالکل غلط اور منشاءِ الٰہیہ کے منافی ہیں۔ شرح تجرید کی یہ عبارت بالکل صاف اور حقیقت پر مبنی ہے۔ یہی اعلیٰحضرت اور صدرالافاضل اور حضرت حکیم الامت نے اختیار فرمائی۔ مگر افسوس کہ ہمارے سعیدی صاحب امتناع اور محال کے چکر میں پھنس کر اتنی صاف عبارت اور اکابرِ دین کے مسلک سے فرار ہوگئے اور شرح تجرید کی عبارت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ شرح تجرید کا مصنف نصیر الدین طوسی غالی شیعہ ہے لہٰذا اس کی نقل ہم کو مفید نہیں۔ کتنی نادانی کی بات ہے حضرت یہ نقل نہیں بلکہ خبر ہے۔ آپ کے نزدیک صاحب شرح زیادہ سے زیادہ کافر متصور ہوگا۔ تب بھی خبر معتبر ہے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ کافر کی خبر معتبر ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دُرِّ مختار مجرد صفحہ نمبر ۲۱ پر ہے:۔ وَيَجِبُ طَلَبُهٗ اِنْ ظَنَّ ظَنًّا قَوِيًّا قُرْبَهٗ دُوْنَ مِيْلٍ بِاَمَارَةٍ اَوْ اِخْبَارِ عَدْلٍ :۔ (ترجمہ) متیمم کا پانی تلاش کرنا فرض ہے۔ اگر قوی گمان ہو کہ پانی میل سے کم ہے یہ گمان یا علامات سے ہو یا کسی بھی عادل کے خبر دینے سے ہو۔ اس عبارت میں عادل میں مسلمان ہونے کی قید نہیں ثابت ہوا کہ عادل کافر کی بھی

خبر معتبر ہے۔ کیونکہ کافر بھی اگر اپنے دینی لحاظ سے فاسق و فاحش نہ ہو تو عادل ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی در مختار جلد چہارم صـ۵۲۲ پر ہے۔ وَمِنَ الذِّمِّیِّ لَوْعَدْلًا فِیْ دِیْنِہٖ عَلٰی مِثْلِہٖ۔ (ترجمہ) اور ذمی کافر کی گواہی اپنے مثل کے خلاف معتبر ہے جب کہ ذمی اپنے دین کے اعتبار سے عادل ہو۔ نتیجہ ثابت ہے کہ کافر عادل کی خبر معتبر ہے اصولِ فقہ کی مشہور و معتبر کتاب نور الانوار صـ۱۹۱ پر ہے:۔ وَاِنْ کَانَ لَا اِلْزَامَ فِیْہِ اَصْلًا یَثْبُتُ بِاَخْبَارِ الْاٰحَادِ بِشَرْطِ التَّمِیْیزِ دُوْنَ الْعَدَالَۃِ یَعْنِیْ یُشْتَرَطُ اَنْ یَّکُوْنَ الْمُخْبِرُ مُمَیِّزًا صَبِیًّا کَانَ اَوْ بَالِغًا حُرًّا کَانَ اَوْ عَبْدًا مُّسْلِمًا کَانَ اَوْ کَافِرًا عَادِلًا کَانَ اَوْ فَاسِقًا۔ (ترجمہ)۔ خبر غیر الزامی میں عدالت شرط نہیں صرف سمجھ شرط ہے لہٰذا ایک شخص کی خبر بھی معتبر ہے خبر دینے والا بچہ ہو یا بالغ آزاد ہو یا غلام مسلمان ہو یا کافر عادل ہو یا فاسق۔ کافر کی صرف گواہی مسلمان کے خلاف مردود۔ پس جب ذمی عادل کی خبر یہاں معتبر ہے شرح تجرید کی یہ عبارت حجت کیوں نہ ہو گی۔ اور پھر ہم کو تو اعلیٰحضرت صدر الافاضل اور حکیم الامت کے صریح اقوال حاصل ہیں۔ ان کو کون رد کر سکتا ہے۔ مزید براں یہ مسلک قرآن مجید سے بھی ثابت ہے چنانچہ سورت یوسف پارہ عـ۱۲ آیت عـ۳۸ پر ہے۔ مَاکَانَ لَنَا۔ اَیْ مَاصَحَّ وَلَا اَمْکَنَ لَنَا (الخ) اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ۔ اس آیت کا مطلب تفسیر مظہری میں اس طرح ہے۔ مَاکَانَ لَنَا۔ اَیْ مَاصَحَّ وَلَا اَمْکَنَ لَنَا (الخ) فَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ خَلَقَنَا عَلٰی جِبِلَّۃِ التَّوْحِیْدِ وَعَصَمَنَا مِنَ الشِّرْکِ

ترجمہ:۔ نہیں پہنچتا۔ ہم کو کہ ہم اللہ کا شریک بنائیں کسی چیز کو یعنی قدرت ہی نہیں ہم کو کیونکہ اللہ نے ہم کو جبلّہ توحید پر پیدا کیا اور شرک سے معصوم کیا۔ تفسیر مظہری پ ۱۲ صـ۲۱ جبلت فطرت کو کہتے ہیں اور فطرت بقولِ حدیث پاک ناممکن التغیر ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر جلد پنجم صـ۱۲۹ پر فرمایا:۔ وَنَظِیْرُہٗ قَوْلُہٗ مَاکَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ۔ (ترجمہ):۔ حضرت یوسف کا یہ فرمان مَاکَانَ لَنَا مشابہ ہے رب تعالیٰ کے اس فرمان کے مَاکَانَ لِلّٰہِ تو جب اللہ کا بچہ بنانا ناممکن ہے پس انبیاء کا گناہ بھی ناممکن ہاں یہ ضرور ہے نظیر ہونا صرف ناممکن ہونے میں ہے ورنہ رب تعالیٰ کا محال بالذات ہے انبیاء کا بالغیر۔ لہٰذا یہ کہنا سراسر گمراہی ہے کہ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مذہب اہلِ سنت میں صغیرہ کبیرہ۔ شرک۔ کفر۔ انبیاء کرام سے ناممکن ہے۔ اور معصومین بالکل قادر علی الذنب والکذب نہیں۔ اس مسئلے کو مزید آسان کرنے کے لیئے تمہیدی طور پر دس الفاظ ذہن میں کرنے چاہیئے۔ عـ۱ امتناع عـ۲ محال عـ۳ تکلف عـ۴ کر سکنا عـ۵ نہ کر سکنا عـ۶ استحالہ عـ۷ بالذات عـ۸ بالغیر عـ۹ قدرت عـ۱۰ عدم قدرت۔ ہمارا اختلاف نہ امتناع میں نہ محال نہ استحالہ میں نہ ان ہر سہ کی تقسیم میں اور نہ مفہوم میں نہ قسموں میں۔ ہم دونوں کو تسلیم ہے کہ امتناع دو قسم کا ہے عـ۱ امتناع بالذات عـ۲ بالغیر دونوں کا اتفاق ہے کہ محال دو قسم کا ہے ہم مانتے ہیں کہ استحالہ دو قسم کا ہے اور لہٰذا معصیت معصومین ممتنع بالغیر ہی ہے۔ صرف نزاع اس میں ہے کہ معصوم گناہ اور جھوٹ پر قادر ہے یا نہیں۔

سعیدی صاحب نے ان ہی اصول کو مان کر غلط راہ اختیار کی یہ آپ کی کم فہمی و ناسمجھی ہے۔ تمام انبیاء کرام حادث ہیں۔ کوئی قدامت کا قائل نہیں لہٰذا بالذات ممتنع کا بھی کوئی تصور نہیں کرتا۔ گناہ پر قادر نہ ہونا تو ممتنع بالغیر کی بھی صفت ہے۔ علامہ سعیدی نے اپنی اسی ناسمجھی میں مسلکِ اہلِ سنت متقدمین و متاخرین سے ہٹ کر اپنے تین مسلک بنائے۔ ع۱ انبیاء کرام گناہ پر قادر ہیں۔ میں کہتا ہوں نعوذ باللہ منہا ع۲ علامہ صاحب کہتے ہیں انبیاء کرام ممنوعاتِ شرعیہ سے مکلف ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام کو نہی کے ذریعے جبراً گناہ سے روکا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں استغفر اللہ منہا ع۳ سعیدی صاحب کا تیسرا عقیدہ کہ معصوم ہونے کا صرف یہ مطلب ہے۔ انبیاء پاک گناہ کرتے نہیں۔ البتہ کر سکتے ہیں۔ یہ تینوں عقائد باطل و سراسر گمراہی ہیں۔ کیونکہ مسلکِ اہلِ سنت کے خلاف ہیں مسلک اہل سنت یہ ہیں۔ ع۱ انبیاء کسی گناہِ صغیرہ و کبیرہ پر قادر نہیں وہ پاک ہستیاں گناہ کر سکتی ہی نہیں کیونکہ معصوم ع۲ تکلف دو قسم کا ہے تکلف فی الامر تکلف فی النہی۔ انبیاء کرام صرف امر میں مکلف ہیں اُن کو ہر نیکی پر ثواب ملتا ہے۔ جن بزرگوں نے انبیاء کو اجماعاً مکلف مانا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ لیکن میر شریف نے یہاں جو بدتمیزی دکھائی وہ اس کی بیہودگی ہے۔ اسی راستہ کو سعیدی صاحب نے اگر اختیار کر لیا تو سزاءِ اخروی کے لئے تیار رہیں۔ انبیاء کرام نہی کے مکلف قطعاً نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ معصوم ہیں۔ اسلام کے تمام فرقے عصمتِ انبیاء کے قائل ہیں۔ کسی نے ڈرتے ڈرتے مانا کسی نے عقیدے سے مانا کسی نے غلو کیا یہی وجہ ہے کہ عصمت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اپنے دل کی کیفیت کو ظاہر کر دیا۔ شیعہ نے عصمت کو مانا مگر غلو کیا کہ آئمہ بھی معصوم ہیں یہ اُن کا بطلان ہے۔ ان کا علامہ مجلسی کہتا ہے اپنی کتاب حیاۃ القلوب جلد سوم صفحہ نمبر ع۱ یہ کہ امام برحق کے لیے عصمت شرط ہے کیونکہ امام برحق ساری کائنات کا فیض ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں حرص ع۱، حسد ع۲، غضب ع۳، شہوت ع۴ نہیں ہوتا۔ اور جن میں یہ رذائل نہ ہوں وہ معصوم ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اختراعی ہیں۔ لہٰذا صغریٰ کبریٰ حدِ اوسط نتیجہ سب غلط اصغر و اکبر میں بھی توافق نہیں۔ معتزلہ نے عصمت کو مانا مگر ڈرتے ڈرتے۔ لہٰذا عصمت کی تعریف ایسی مسخ کی۔ کہ ماننا نہ ماننا برابر ہو گیا۔ ماتریدی صاحب کو ایسا چکر آیا کہ چکرا کر معتزلہ کے جال میں گرے۔ تفتازانی بھیڑ چال چل پڑے۔ میر شریف یا موجودہ سعیدی بے چارے کس شمار میں ہیں ہاں مسلکِ اہل سنت متقدمین کو امام اشعری نے سہارا دیا اور متاخرین کو امام احمد رضا نے سہارا دیا کہ سچی تعریف کر کے اُنہوں نے سنیوں کو مقام نبوت سمجھایا اور معتزلیوں سے بچایا اور انہوں نے سنیوں کو عشقِ رسول سکھایا اور وہابیوں سے بچایا۔ جن کا نام پہلے اشعری تھا اب بریلوی ہوا اور جن کا نام پہلے معتزلی تھا۔ اب وہابی دیوبندی۔ مجموعی اہل سنت کا شروع سے یہ ہی عقیدہ رہا کہ معصومین

گناہ پر قادر ہی نہیں ہوتے۔ ہاں انفرادی طور پر اگر منصور ماتریدی یا تفتازانی یا کوئی شیعوں سے مل گیا یا معتزلہ سے مل گیا تو اس بطلان سے اجماعی مسلک پر کچھ فرق نہیں پڑتا یہ کج رویاں تو ہر دور میں رہتی ہیں اگر موجودہ زمانے میں کچھ بگاڑ تھا تو سعیدی صاحب نے خانہ پری کر دی۔ ہمارے جن اکابر نے ذاتی طور پر شیعہ یا معتزلی مسلک اختیار کیا وہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ ہم کو لائق نہیں کہ اجماعی مسلک اور دلائل قاہرہ کو چھوڑ کر کسی کے ذاتی نظریوں پہ چل پڑیں۔ ہمارے دلائل حسبِ ذیل ہیں :۔

پہلی دلیل :۔ اس سے پہلے عصمت کی تعریف میں چار اقوال نقل کیے گئے ع۱ شرح تجرید کا ع۲ اعلیحضرت کا ع۳ صدر الافاضل کا ع۴ حضرت حکیم الامت کا اب پانچواں حوالہ ملاحظہ ہو نسیم الریاض شرح شفا جلد سوم ص۶۰۲ پر ہے۔ وَالْعِصْمَةُ تَخْصِيْصُ قُدْرَتِهٖ بِالطَّاعَةِ دُوْنَ الْمَعْصِيَةِ۔ ترجمہ اور عصمتہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ معصوم کو اطاعت پر تو قدرت عطا فرماتا ہے گناہ پر ان کو قدرت نہیں ہوتی :۔

دوسری دلیل :۔ چھٹا حوالہ نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ نمبر ع۲۵۰ پر ہے :۔ وَعِصْمَتُهٗ مِنَ الْكِذْبِ وَخُلْفِ الْقَوْلِ فَلَمْ يَصْدُرْ عَنْهُ شَئٌ مِنْهُ وَهُوَ مُسْتَحِيْلٌ۔ (ترجمہ)۔ اور انبیاء کرام کی عصمت یہ ہے کہ وعدہ خلافی اور جھوٹ وغیرہ گناہ اُن سے صادر ہی نہیں ہو سکتے اور وہ محال یعنی ممتنع ہیں۔ ساتواں حوالہ شفا شریف میں اسی جگہ پر ہے۔ وَاِسْتِحَالَتُهٗ ذَالِكَ عَلَيْهِ شَرْعًا وَاِجْمَاعًا۔ (ترجمہ) :۔ انبیاء کرام کا کذب محال ہونا شرعی اور اجماعی مسلک ہے۔ اور محال پر قدرت ناممکن سعیدی صاحب کے قول میں کر سکنا ہے۔ کر سکنا قدرت پر دال ہے۔ چنانچہ لغاتِ کشوری ص۱۱۵ پر ہے۔ کر سکنا یعنی طاقت و قدرت پانا اسی محال اور استحالے کا معنی ممتنع ہونا ہے جن لوگوں نے معتزلہ جیسی تعریف کی ہے وہ امتناع کے قائل بھی نہیں مگر سعیدی صاحب پر تعجب ہے کہ ممتنع بھی مانتے ہیں اور جھوٹ پر قدرت بھی۔ اس پر اتفاق ہے کہ ذاتِ باری تعالےٰ کا کذب ممتنع بالذات ہے۔ اور معصوم من اللہ کا گناہ ممتنع بالغیر ہے۔ ممتنع بالذات قدیم ہے اور ممتنع بالغیر حادث۔ ممتنع خواہ کیسا ہی ہو قدرت سے خارج ہوتا ہے چنانچہ المعتقد ص۱۶ پر ہے۔ وَبِالْاِمْتِنَاعِ مَالَا يَتَصَوَّرُ فِى الْعَقْلِ وُجُوْدُهٗ ضَرُوْرَةً۔ (ترجمہ) امتناع سے مراد یہ ہے کہ عقل اس کے وجود کا تصور بھی نہ کرے۔ اور انبیاء کرام کا گناہ ممتنع ہوا تو تصور بھی ناممکن اسی کو محال بھی کہتے ہیں محال کی تین قسمیں ہیں :۔ ع۱ محال شرعی ع۲ عقلی ع۳ عادی جو چیز ناممکن ہو اس کا ہو سکنا محال آتی یا نہیں مان کر پھر کہنا کہ نبی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ گویا کہ ہو سکنے نا ہو سکنے کی ضدین کو جمع کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ محال بالغیر ہے جس کا خاتمہ ناممکن۔ جب بالغیر ختم ہو تو قدرت ممکن ہے۔ لیکن جب تک غیریت قائم ہے قدرت نہیں ہو سکتی اور یہ کہنا تو بدیہی ہے نادان

بھی سمجھ جاتا ہے کہ زبان کٹ جائے تو بول نہیں سکتا قدرتِ گویائی ختم ہے۔ کیا کوئی بیدائشی گونگے یا اندھا کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بول سکتا ہے دیکھ سکتا ہے مگر بولتا دیکھتا نہیں۔ لیکن جو آنکھیں میچ لے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ بس بالکل اسی طرح سمجھ لو کہ عصمت سے امتناع لاحق ہوا لہٰذا ذی عقل نہیں کہہ سکتا کہ نبی جھوٹ بول سکتا ہے مگر بولتا نہیں اس بدیہی عقیدے کا کوئی نادان ترین ہی انکار کرے گا۔ امتناع ذاتی وہ ہے جو ازلی ابدی قدیم ہو۔ انبیاء کا امتناع اس طرح نہیں۔ **تیسری دلیل**:۔!

آٹھواں حوالہ نسیم الریاض جلد چہارم ص۱۴۳ پر ہے:۔ اَلْعِصْمَةُ (الخ) اَنْ لَّا يَخْلُقَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى النَّبِىِّ ذَنْبًا۔ اور لا بریز صفحہ نمبر ۲۲۵ پر ھ:۔ فَاِنَّهُمْ جُبِلُوْا عَلَى الْعِصْمَةِ:۔ (ترجمہ):۔ عصمت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم میں گناہ پیدا ہی نہیں کرتا بس بے شک وہ پیدائشی عصمت پر ہوتے ہیں۔ مقام تعجب ہے کہ جو چیز پیدا ہی نہیں ہوئی اس پر قدرت مانتے ہیں اور کہتے ہیں (معاذ اللہ) نبی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ خدا غارت کرے نفس و شیطان کو کہ کس طرح علماء عقلاء و زہاد خشک کا راستہ مارتا ہے۔ میں سعیدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ رب نے تو گناہ پیدا ہی ان میں نہ کیا پھر ان کا کر سکنا کیونکر ہوگا کون خالقِ گناہِ نبی ہوگا۔ نواں حوالہ۔ نسیم الریاض شرح شفا جلد چہارم ص۴۱ پر ہے:۔ وَقَدْ تَقَرَّرَ اَنَّ الْعِصْمَةَ عِنْدَ الْمُتَكَلِّمِيْنَ اَنْ لَّا يَخْلُقَ اللّٰهُ فِى النَّبِىِّ ذَنْبًا۔ وَفِى التَّحْرِيْرِ لِابْنِ الْهُمَامِ اَلْعِصْمَةُ عَدَمُ الْقُدْرَةِ عَلَى الْمَعْصِيَةِ۔ (ترجمہ):۔ متکلمین کے مذہب سے ثابت ہو گیا کہ عصمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی میں گناہ پیدا ہی نہیں فرماتا امام ابن ہمام کی تحریر میں بھی یہی مذہب ظاہر ہو رہا ہے کہ عصمت قدرت نہ ہونے کو کہتے ہیں۔ دسواں حوالہ شفا شریف یہی مقام وَعِصْمَتُهٗ فِىْ كُلِّ حَالَاتِهٖ مِنْ رِضٰى وَغَضَبٍ وَجِدٍّ وَمَزْحٍ۔ (ترجمہ):۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر حالت میں معصوم ہوتے ہیں۔ رضا ہو یا غضب عام حالت ہو یا خوش طبعی۔ یعنی کبھی بھی گناہِ صغیرہ و کبیرہ نہیں کر سکتے۔ ان حوالوں سے پتہ چلا کہ اکابرِ دین کا مسلک یہی ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہاں ان ہی بزرگوں نے معتزلہ کے عقیدے بھی نقل فرمائے ہیں سعیدی صاحب کی عقل دیکھئے کہ ان بزرگوں کے اپنے مسلک کی عبارات چھوڑ کر منقولہ مذہب غیر کی عبارات لیتے ہیں۔ اور اپنی نادانی سے تہمت بزرگوں پر لگاتے ہیں۔ عصمت انبیاء کی چھ نوعیتیں ہیں ع۱ عصمت عَنِ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ ع۲ عصمت عَنِ الشَّكِّ یہ ہے کہ نبی شک سے بھی معصوم ہیں اپنی وحی میں یا اس کے سمجھنے میں یا اس کی تعبیر میں غلطی کر سکتے ہی نہیں خواہ وحی جلی ہو یا خفی منامی ہو یا ایقاظی۔ محی الدین ابن عربی فصوص الحکم میں یہاں ٹھوکر کھا گئے اور کہہ گئے کہ معاذ اللہ نبی اپنی خواب کی تعبیر میں غلطی کر سکتا ہے اور ملفوظات مہریہ

میں اس بات کی ناجائز تائید بھی ہوئی مگر یہ سب غلطی ہے۔ انبیاء کرام سے یہ غلطی بھی ناممکن۔ انہوں نے مقام نبوت کو کما حقہٗ سمجھا نہیں ع۳ عصمت عن الکبائر ع۴ عن تسلط الشیطان ع۵ عَنِ الصَّغائر ع۶ عَنِ المیلان اِلَی الذنب۔ یہ تقسیم نوعی ہے ان تمام پر عصمتِ جنسی یعنی عدم قدرت کلی مطابقی ہے۔ امام منصور رحمۃ اللہ علیہ نے صغائر میں اختیار تسلیم کیا ہے یعنی ان کے مسلک میں نبی گناہ صغیرہ کر سکتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بھی غلط ہے کیونکہ کائنات میں صرف دو ہی جماعتیں مامور من اللہ ہیں ع۱ جماعت ملائکہ ع۲ جماعت انبیاء کرام اور مامور من اللہ ہی معصوم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معصوم بھی صرف یہ دو ہی جماعتیں ہیں۔ امور الٰہیہ بہت زبردست امانت ہے اس کو لینے والا شخص بھی زبردست ہونا چاہیئے۔ جس میں غلطی۔ خیانت۔ نسیانِ دین جھوٹ فریب جیسی قباحتوں کا امکان بھی نہ ہو۔ اور وہ قادر ہی نہ ہو کہ گناہ کر سکے اِس لیے اُن کو معصوم بنا دیا جاتا ہے۔ عصمت ملائکہ ہو یا نبوّت تعریف و درجہ ہر دو کا یکساں ہے یعنی بوجہ امتناع بالغیر گناہ پر قادر نہ ہونا چنانچہ عصمتِ ملائکہ کے متعلق مسلک اہلِ سنّت اس طرح ہے۔ نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ نمبر ص۲۵۵ پر ہے۔ فَہُمْ مَعْصُوْمُوْنَ عَنْ جَمِیْعِ الذُّنُوْبِ کَبِیْرِھَا وَ صَغِیْرِھَا وَ لَا یُجَوَّزُ ذَالِکَ عَلَیْہِمْ وَلَا یَقْدِرُوْنَ عَلَیْہِ۔ (ترجمہ):۔ پس وہ ملائکہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہیں۔ اور ان پر قطعاً گناہ کا جواز نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ فرشتے گناہ پر قادر نہیں ہوتے۔ وجہِ عدم قدرت صرف! معصومیت ہے۔ اس عبارت پر سب کا اتفاق ہے۔ یہاں ماتریدی صاحب بھی متفق اور خاموش ہیں۔ اس پر تفتازانی صاحب نے بھی کان لپیٹ لیئے میر شریف بھی مان گئے۔ علامہ سعیدی کے سارے خطوط میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ یہاں بالذات بالغیر کے ھیوے بھول گئے یہاں شرک کا ہوتا نہ چھوٹا یہی معصیت انبیاءِ کرام کو رب نے بخشی تو وہ بھی قادر علی الذنب نہ ہوئے معصیت ہر دو جگہ یکساں ہے۔ چنانچہ شارح شفا امام شہاب الدین خفاجی اپنی کتاب صفحہ نمبر ص۲۵۶ پر فرماتے ہیں۔ وَ اتَّفَقَ اَئِمَّۃُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ عُلَمَاءِ الْمِلَّۃِ الْاِسْلَامِیَۃِ عَلٰی اَنَّ حُکْمَ الْمُرْسَلِیْنَ مِنْھُمْ حُکْمُ النَّبِیِّیْنَ مِنَ الْبَشَرِ فَھُمْ سَوَاءٌ اَیْ مُسَاوُوْنَ لَھُمْ فِی الْعِصْمَۃِ مِنَ الْکَبَائِرِ وَ الصَّغَائِرِ۔ (ترجمہ)۔ ملتِ اسلامیہ کے تمام اماموں نے اس پر اتفاق کیا ہے رسل ملائکہ (جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔) معصوم ہونے میں ہر قسم کے گناہِ صغیرہ و کبیرہ سے انبیاء کے برابر ہیں یعنی مساوی ہیں کہ جیسے وہ قادر نہیں یہ بھی قادر نہیں۔ کیسی پیاری ایمان افروز عبارت ہے۔ کہ فرشتوں کو انبیاء کے مثل کہا نہ کہ انبیاء کو تاکہ پتہ لگے کہ اصل معصیت اور گناہ پر غیر قادر انبیاء ہی کا مقام و درجہ شان ہے۔ ان کی مشابہت و اتباع میں ملائکہ اجمعین کو بھی یہ مرتبہ عظیمہ حاصل ہوا۔ ثابت ہوا کہ جس طرح فرشتے بوجہ عصمت گناہ پر

بے قدرت ہیں اسی طرح انبیاء کرام بھی لہٰذا جس طرح متفقہ عقیدۂ صحیحہ ایمانیہ میں فرشتوں کو نہیں کہہ سکتے کر وہ گناہ کر سکتے ہیں مگر۔ اسی طرح انبیاء کرام کو بھی یہ کہنا کہ جھوٹ بول سکتے مگر بولتے نہیں سراسر گمراہی ہے اس دلیلِ لمی سے ثابت ہوا کہ جس عصمت کی بنا پر ملائکہ کو گناہ پر عدمِ قدرت ہے اسی عصمت کی بنا پر انبیاء کرام بھی گناہ میں معذور و مجبور ہیں۔ جب علت ہر دو جگہ ایک ہے تو معلول میں فرق کیوں ہوگا: ماہیت تو کبھی منفسم نہیں ہوتی۔ **دلیل چہارم**:- ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تعریفِ عصمت میں چند قول نقل فرمائے۔ چنانچہ صفحہ نمبر ۲۰۷ پر ہے:- فَقَالَ بَعْضُهُمْ هِيَ مَحْضُ فَضْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِحَيْثُ لَا اِخْتِيَارَ لِلْعَبْدِ فِيْهِ وَذَالِكَ اِمَّا بِخَلْقِهِمْ عَلٰى طَبْعٍ يُخَالِفُ غَيْرَهُمْ بِحَيْثُ لَا يَمِيْلُوْنَ اِلَى الْمَعْصِيَةِ وَلَا يَنْفِرُوْنَ عَنِ الطَّاعَةِ كَطَبْعِ الْمَلَائِكَةِ۔ (ترجمہ):- بعض اکابر نے فرمایا کہ وہ عصمت محض اللہ کریم کا فضل ہے۔ اس طرح سے کہ بندے کا گناہ پر کچھ اختیار نہیں اور یہ عدمِ قدرت یا ان کی انبیائی طبعی پیدائش کی وجہ سے ہے کہ دیگر انسان اس میں ان پیاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ انبیاء پاک نہ گناہ مطلقہ کی طرف مائل ہو سکتے ہیں نہ اطاعت سے نفرت کر سکتے ہیں ملائکہ کی معصوم طبیعت کی مثل۔ **دلیل پنجم**:- کائنات میں مخلوق پانچ قسم کی ہے۔ ۱ محفوظ ۲ معصوم ۳ ممنوع ۴ مرفوع ۵ مکلف معصوم صرف مامور من اللہ ہیں یعنی انبیاء کرام اور ملائکہ۔ محفوظ صرف اولیاءِ کاملین ہیں جیسے غوث قطب ابدال اوتاد یہ لوگ مامور من الانبیاء ہیں فتاویٰ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۵۴ پر ہے:- فَيُشْتَرَطُ فِيْهِ كَوْنُهٗ مَحْفُوْظًا كَمَا يُشْتَرَطُ فِي النَّبِيِّ كَوْنُهٗ مَعْصُوْمًا كَمَا فِيْ رِسَالَةِ الْاِمَامِ الْقُشَيْرِيِّ۔ (ترجمہ):- پس واجب فرض ہے ولایتِ اولیاء اللہ میں محفوظ ہونا جیسا کہ نبی کی نبوت میں معصوم ہونا شرط اور فرض ہے ایسا ہی امام قشیری کا مسلک ہے۔ ممنوع علماءِ ملت اور زاہد لوگ ہیں۔ مرفوع۔ چرند پرند جمادات نباتات دیوانہ اور نابالغ بچہ مکلف کی دو قسم ہیں ۱ مکلف مطلقہ۔ جیسے تمام جنات اور عاقلِ بالغ انسان۔ ۲ مکلف فی الامر صرف جیسے انبیاء کرام اور ملائکہ۔ تمام اہلِ سنت کے عقیدے میں معصوم وہ ہے جو گناہ پر قادر ہی نہ ہو۔ وہ گناہ نہ کرتا ہے نہ کر سکتا ہے محفوظ وہ ہے جو گناہ سے بچتا رہے۔ یعنی کر سکتا ہے مگر کرتا نہیں۔ ممنوع وہ ہے جو گناہ کر سکتا ہے اور کر بھی لیتا ہے مگر دنیا میں ہی اُس کو سچی توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔ مرفوع وہ مخلوق ہے جس کو نیکی بدی پر کوئی جزا سزا نہیں نہ شرعی دنیوی نہ اخروی مکلف فی النہی والامر یعنی مکلف مطلقہ۔ جو گناہ کر سکتے ہیں کرتے بھی اور سچی توبہ کی توفیق ضروری نہیں۔ مکلف فی النہی جن کو نیکی پر ثواب یا قرب مدارج۔ بدی و گناہ اُن سے ممکن ہی نہ ہو معصوم کا کام

جہان کو بچانا کہ وہ مامور ہے اسی لیے مکلف فی الامر ہیں نہی نہیں محفوظ کا کام خود کو بچانا ممنوع کا کام بچنے کی کوشش کرنا عام مکلفین کا کام۔ قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ (ترجمہ):۔ خود کو بھی بچاؤ اور اپنے لواحقین کو بھی بچاؤ۔ مرفوع کا کام نہ بچنا نہ بچانا۔ محفوظ کو نیکی پر ابتدائً جنت لازم ممنوع کو جنت کا وعدہ ہے یقین نہیں ہوسکتا ہے رب کرم کرے مرفوع کو جزا کی جنت نہیں یا طفیلی جنت جیسے دیوانے اور بچے یا فنا۔ عام مکلفین میں انسانوں کی نیکی پر جنت گناہ پر جہنم۔ جنات کو بقول بعض گناہ پر جہنم اور نیکی پر فنا یا فنا کر دینا اور جہنم سے چھٹکارا ہی ان کی نیکی کا بدلہ ہے۔ اور بقول بعض نیکی پر ابدی قیام عالم برزخ میں اور بقول بعض نیکی پر جنت۔ بدی پر متفقاً جہنم۔ انبیاء کرام کی نیکی کا ثواب جنت نہیں بلکہ ترقی درجات قیام جنت تو ان کا اصل مقام ہے۔ جیسے کہ انسانوں کا مقام موجودہ زمین۔ جبرائیل علیہ السلام کا یوں ملائکہ میں کسی کا عرش کسی کا سماء اوّل۔ دوم۔ سوم وغیرہ اور جنات کا کوہ قاف۔ مقام اصل کی پہچان یہ ہے کہ وہاں پہنچنے کی ہر وقت آزادی ہو۔ سو جنت میں داخلے کی انبیاء کرام کو ہر وقت آزادی اب یا تب۔ اس وضاحت کے بعد یہ کہنا کہ انبیاء کرام گناہ کر سکتے ہیں مگر کرتے نہیں۔ کتنی غلطی ہے یہ محفوظ کی تعریف ہے۔ ورنہ فرق کس طرح کرو گے۔ یہی وہ باطل نظریات ہیں جن سے طرح طرح کی گمراہیاں پھیلیں۔ کسی نے کہا۔ غوث پاک انبیاء کرام کے برابر ہیں۔ کسی نے حضرت ابراہیم کے متعلق تین جھوٹ والی روایت گھڑ لی۔ امام رازی نے فرمایا یہ روایت بالکل بناوٹی ہے:۔ (تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ نمبر ۱۲ پر ہے) **دلیل ششم**:۔ عقلاً نقلاً ثابت ہو گیا کہ انسانوں میں صرف انبیاء ہی معصوم ہیں کوئی ولی غوث قطب معصوم نہیں نہ صحابی نہ صدیق و فاروق نہ عثمان و علی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ چنانچہ امام ابن ہمام جن کی بزرگی کا اعتراف مجدد الف ثانی علیہ رحمۃ نے بھی اپنے مکتوبات حصہ پنجم کے صفحہ نمبر ۱۶۶ پر کیا ہے جن کا نام کمال الدین محمد ابن عبدالواحد ہمام متوفیٰ ۸۶۱ھ نے اور امام دباغ نے اپنی کتاب ابریز صفحہ نمبر ۲۲۵ پر لکھا ہے:۔ وَاَمَّا الْاَمْرُ الثَّانِيْ وَهُوَ الْعِصْمَةُ فَهُوَ مِنْ خَصَائِصِ النُّبُوَّةِ۔ وَالْوِلَايَةُ لَا تُزَاحِمُ النُّبُوَّةَ۔ (ترجمہ) معصوم ہونا نبی کا خاصہ ہے ولایت نبوت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ ولی کی صرف کرامت خرق عادت ہوتی ہے مگر نبی علیہ السلام سراپا بذات خود چمکار وحا۔ ربما عادتاً خرق عادت ہوتا ہے۔ اب اگر معصوم کی تعریف وہی کی جائے۔ جو سعیدی صاحب نے کی تو معصوم۔ محفوظ ممنوع کا فرق کس طرح کرو گے۔ یا فرق تباؤ یا سب کو معصوم مانو اور یہ تا قیام قیامت نہ کر سکو گے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ انبیاء کرام کے لیے گناہ ممتنع ہے ہاں ممتنع بالذات نہیں کہ یہ خاصۂ الٰہیہ ہے۔ بلکہ بالغیر ہے وہ غیر کیا ہے؟ وہی عصمت ہے۔ تو جب تک عصمت قائم عدم قدرت قائم ہے۔ ہاں اگر خدانخواستہ عصمت ختم ہو جائے۔ تب گناہ کا امکان و قدرت

ہو سکتی ہے مگر عصمت نبوت کو مستلزم ۔ جب تک نبوت قائم عصمت ہو گی اور عصمت قائم تو عدمِ قدرت قائم نبوت کے خاتمے کا مشاہدہ نہیں ۔ ملکیت کا زوال قصۂ ہاروت و ماروت سے عیاں ہے ۔ لہٰذا نبوت و عصمت قائم رہتے ہوئے یہ کہنا کہ نبی جھوٹ بول سکتا ہے ۔ نری گمراہی ہے ۔ یہاں تک کثیر حوالوں سے ثابت کر دیا کہ جمہور اہلسنت کا مذہب یہی ہے کہ انبیا علیہم السلام نہ جھوٹ بول سکتے ہیں نہ بولتے ہیں ۔ متکلمین علماء کا بھی یہی مسلک ہے ۔ امام منصور ماتریدی نے جو نظریہ پیش کیا وہ ان کا انفرادی عقیدہ ہے مولوی عبدالحیؒ لکھنوی کا ان کو امام المتکلمین کہنا اگرچہ درست ہے مگر عصمت کی یہ تعریف تمام متکلمین کے خلاف ہے جیسا کہ نسیم الریاض کی عبارت سے ثابت ہوا ۔ امام ہونا یا حنفی اہل سنت ہونا علیحدہ بات ہے مگر ایک نظریے میں غلطی کھا جانا علیحدہ بات ہے ۔ ایک مسلک سے پھر جانے سے سنیت یا حنفیت پر حرف نہیں آتا جب کہ گناہ صغیرہ بلا اختیار مراد ہو ۔ مگر صاحب بصیرت کو چاہیے کہ ایسے ذاتی نظریات پر اعتماد نہ کر بیٹھیں ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے ۔ دیکھو ۔ اہل سنت کا جمہوری عقیدہ ہے کہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں مگر شرح مواقف نے صفحہ نمبر ۶۹۹ پر لکھا کہ معتزلہ کی طرح دو سنی عالم بھی بھٹک گئے ۔ چنانچہ عبارت ہے :۔ فَقَالَ اَکْثَرُ اصحابنا الانبیاء اَفْضَلُ وَعَلَیْہِ الشِّیْعَۃُ وَاَکْثَرُ اَھْلِ الْمِلَلِ ۔ وَقَالَتِ الْمُعْتَزِلَۃُ وَاَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ الْحَلِیْمِیُّ وَالْقَاضِیْ اَبُوْ بَکْرٍ ۔ مِنَّا اَلْمَلٰئِکَۃُ اَفْضَلُ وَعَلَیْہِ الْفَلَاسِفَۃُ ۔ اَقْبَحُ اَصْحَابُنَا بِوُجُوْہٍ (ترجمہ) :۔ ہمارے جمہور اصحاب نے عقیدہ فرمایا ہے کہ انبیاء کرام فرشتوں سے افضل ہیں یہی شیعہ اور اکثر دین والوں کا عقیدہ ہے ۔ مگر معتزلہ اور ہمارے دو سنی عالم ابو عبداللہ حلیمی اور قاضی ابو بکر اور فلاسفہ نے یہ عقیدہ بنایا کہ معاذ اللہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں ۔ اہل سنت نے اس نظریہ کو بہت وجوہ سے برا کہا ۔ امام غزالی صاحب نے بھی احیاء العلوم کے صفحہ نمبر ۵۲ پر یہی عقیدہ بنایا ۔ تو کیا کسی اہل سنت کو جائز ہے کہ وہ حدیث و قرآن کو چھوڑ کر ۔ امام غزالی وغیرہ چند احباب کا ذاتی نظریہ قبول کرے ۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ معتزلہ نے عصمت کی تعریف غلط ہی اس لیے کی کہ پہلے ملائکہ کو افضل کہہ چکے تھے ۔ اس باطل عقیدے کو بچانے کے لیے عصمت کی تعریف مسخ کر کے نبی کو گناہ پر قادر مان بیٹھے ۔ بعض سنی بھی دھوکہ کھا بیٹھے ۔ مقام غور ہے کہ جب نبیٔ مکرم کو گناہ پر قادر مان لیا ۔ اور کہہ دیا کہ نبی گناہ کر سکتا ہے تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کذب باوجود مقدور ہونے کے اس کے وقوع میں نہیں آئے گا کیونکہ جب عقلاً تو استحالہ رہا نہیں پھر ایک جانب کی ترجیح اور تخصیصِ عدم وقوع مقدور کے اندر کیسے ہو گی ۔ اور نقلاً استحالہ اسی کلام سے ہو گا جس میں کذب و گناہ ممکن اب وہ کون سا استحالہ ہے جس سے کذب کا عدمِ وقوع یقینی طور سے ثابت ہو ۔ اب جب کہ آپ کو ایسا استحالہ نہ ملے اور یقیناً نہ ملے گا تو آج تو یہ

کہا ہے کہ جھوٹ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ کل کو یہ بھی کہہ دینا کہ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں اور بولتے بھی ہیں۔ کیونکہ نا بولنے پر کوئی یقینی گارنٹی نہیں۔ **دلیل ھفتم**۔ نبراس صفحہ نمبر ۵۳۲ پر ہے۔ اِنَّهُمْ ذَكَرُوا لِلْعِصْمَةِ تَعْرِيفَيْنِ اَحَدُهُمَا عَدَمُ خَلْقِ اللهِ الذَّنْبَ فِي الْعَبْدِ فَعَلَى هٰذَا يَكُوْنُ الْمَعْصُوْمُ مَنْ لَا يُخْلَقُ۔ ثَانِيْهِمَا مَلَكَةٌ نَفْسَانِيَّةٌ (الخ) اَنَّ التَّعْرِيْفَ الْاَوَّلَ مَبْنِيٌّ عَلَى اُصُوْلِ الْاَشَاعِرَةِ (الخ) وَالثَّانِيْ مَبْنِيٌّ عَلَى اُصُوْلِ الْفَلَاسِفَةِ (ترجمہ) بے شک علماء عظام نے عصمت کی دو تعریفیں ذکر کی ہیں۔ پہلی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام میں گناہ پیدا ہی نہ کیا پس اس تعریف کی بنا پر معصوم وہ ہوگا جو گناہ نہ پیدا کیا جائے۔ اور دوسری تعریف یہ ہے کہ عصمت نفسانی یعنی ذاتی بچنے کا ملکہ ہے۔ بیشک پہلی تعریف۔ اہل سنت اشاعرہ کے قواعد پر مبنی ہے اور دوسری فلاسفہ کے اصول پر۔ اس عبارت سے جہاں یہ پتہ لگا کہ اہل سنت اشاعرہ کا عقیدہ عدم خلق یعنی عدم قدرت ہے وہاں صاحب نبراس کے عقیدے کا بھی پتہ چل گیا کہ ان کا عقیدہ عدم قدرت کا ہے کیونکہ علمائے ملت کا طریقہ یہ ہے کہ صحیح قول کو پہلے ذکر کرتے ہیں قول باطل کو دوسرے نمبر پر۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۶ و ۴۰۵ پر ہے:۔ وَفِيْ اٰخِرِ الْمُسْتَصْفٰى لِلْاِمَامِ النَّسَفِيِّ اِذَا ذُكِرَ فِي الْمَسْئَلَةِ ثَلَاثَةُ اَقْوَالٍ فَالرَّاجِحُ هُوَ الْاَوَّلُ اَوِ الْاَخِيْرُ لَا الْوَسْطُ (ترجمہ) مستصفیٰ کتاب کے آخر میں امام نسفی کا قول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں تین قول ذکر ہوں تو معتبر یا پہلا ہوگا یا تیسرا نہ کہ دوسرا۔ یہ علامہ شامی کا اپنا کلام نہیں بلکہ امام نسفی کا ہے اور یہ قاعدہ صرف فتاویٰ شامی کیلئے نہیں بلکہ تمام فقہا کا مقرر کردہ ہے۔ ثابت ہوا کہ ملّا علی قاری اور صاحب نبراس کا عقیدہ عصمت کے بارے یہی ہے کہ انبیاء کرام گناہ پر قادر ہی نہیں۔ غلام رسول سعیدی شرح تحریر کو تو رافضی کہہ کر ٹھکرا سکتے ہیں مگر۔ ۱ اعلیٰحضرت ۲ صدر الافاضل ۳ حکیم الامت ۴ تمام اشاعرہ ۵ تمام متکلمین ۶ ملّا علی قاری ۷ صاحب نبراس ۸ امام ہمام ۹ امام دباغ ان تمام کے خلاف کب تک چلیں گے۔ **دلیل ساتویں:**۔ سے صاف صاف تمام اشاعرہ کے مذہب کا پتہ لگا۔ نسیم الریاض کی عبارت سے صاف صاف تمام متکلمین کے مذہب کا پتہ لگا۔ کہ عدم قدرت ہی سچا عقیدہ ہے۔ مگر جن لوگوں کے گناہ پر قادر ہونے کے عقیدے کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے صرف امام منصور کا انفراداً ذکر کیا۔ اگر یہ باطل عقیدہ کسی گروہ کا ہوتا تو صاف صاف گروہ کا نام لیا جاتا۔ بخلاف عدم قدرت کے عقیدے پر۔ کہ صاف صاف جماعتوں کا نام بھی لیا اور انفرادی حضرات کا بھی نام لیا۔ بلکہ علامہ سعیدی تو اپنے ان بنیادی پیشواؤں کے بھی خلاف چلے کہ انھوں نے اپنے اس باطل نظریے کو بچانے کے لیے

امتناع بالغیر کا بھی انکار کیا نبی کو بشر مشکلم کہہ کر اپنے جیسا مانا مکلف فی النہی میں ملوث ایک بطلان کو بچانے کے لیے اتنی خطائیں کرنی پڑیں۔ مگر آپ امتناع بالغیر مان کر بھی پھر یہ چکر دے رہے ہیں۔ امتناع بالغیر مان کر وہ لازم نہیں آتا جو توضیح البیان میں لکھا۔ بلکہ میرا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ میر شریف وغیرہ کو امتناع کا انکار نہ کرنا پڑتا۔ امتناع مان کر وہی لازم آتا ہے جو حسین نجار وغیرہ اہل سنت نے کہا۔ **دلیل ہشتم:۔**

امام فضل رسول بدایونی قدس سرہٗ اپنی کتاب المعتقد کے صفحہ ۱۲۰ پر فرماتے ہیں۔ وَفِيهِ كَوْنُ الْكِذْبِ فِي التَّبْلِيغِ مُحَالًا عَقْلِيًّا وَاِنَّ تَجْوِيْزَهٗ عَلٰى نَبِيٍّ كُفْرٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ اور اسی کے صفحہ نمبر ۱۲۰ پر ہے:۔ مَنْ جَوَّزَ الْكِذْبَ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ فَهُوَ كَافِرٌ۔ (ترجمہ):۔ اور نبی کا پیغام پہنچانے دین کی تبلیغ کرتے ہیں یعنی لوگوں کو دین دنیا سمجھانے میں جھوٹ بولنا محال عقلی ہے۔ اور بے شک گناہ کو نبی پر جائز سمجھنا یعنی ممکن سمجھنا تمام کے اتفاق سے کفر ہے۔ اس پر اجماعِ امت ہے۔ وہ شخص جس نے جھوٹ کو انبیاء کے لیے ممکن مانا تو وہ شخص کافر ہے۔ جوز کا معنے ممکن ماننا ہے جواز کا معنیٰ صادر ہونا واقع ہونا نہیں بلکہ امکان ہے یعنی یہ کہنا کہ انبیاء کرام گناہ کر سکتے ہیں یہ کہنا کفر ہے۔ چنانچہ المعتقد صفحہ نمبر ص ۱۵ پر ہے:۔ وَبِالْجَائِزِ مَا يُمْكِنُ عَقْلًا وُجُوْدُهٗ وَعَدَمُهٗ ضَرُوْرَةً۔

(ترجمہ):۔ جائز سے مراد یہ ہے کہ عقلاً اس گناہ کو ممکن مانا جائے اور ضرورۃً عدم مانا جائے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ اسی کو امام اہلِ سنت امام فضل رسول نے کفر کہا۔ یہ بات یا معتزلہ نے کہی یا سعیدی صاحب نے ماتریدی صاحب نے اس بات کی جرأت نہ کی انہوں نے ذنبِ صغیرہ پر قدرت مانی ہے۔ تبلیغ سے مراد فعلِ نبی ہے جو عام ہے اسبات کو کہ تبلیغِ قرآن ہو یا حدیث تبلیغ عملی یا قولی ہو۔ یہاں یعلینہ آیت قرآن مراد نہیں جیسا کہ سعیدی صاحب نے دھوکہ کھایا وہ کہتے ہیں کہ تبلیغ سے مراد قرآنِ پاک ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے وہ واقعی جھوٹ سے دور ہے وہاں جھوٹ محال ہے۔ مگر یہ ان کی کم عقلی ہے۔ کیونکہ قرآن کا مضمون اور چیز ہے تبلیغ کا مضمون اور چیز ہے۔ یہاں تک کہ عبارتِ مذللہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام گناہوں پر بالکل قادر نہیں ہوتے۔ اور سعیدی صاحب اس کا خلاف کر کے گمراہی کے راستے پر ہیں اب اسی کے ضمن میں اتنا اور سمجھ لو کہ شریعت میں انبیاءِ کرام کو امرِ عبادت تو ہوتا ہے۔ مگر ممانعت نہیں ہوتی کیونکہ ممانعت مکلف فی النہی کو ہوتی ہے۔ منع کسی کام سے اس کو کیا جاتا ہے جس کے اس ممنوعہ کام کی طرف جانے کا اندیشہ ہو اور بچنا واجب ہو۔ انبیاءِ کرام چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لیے وہ ممنوعہ حرام کام کی طرف جا سکتے ہی نہیں۔ ان کو ممانعت پہلے ہی حاصل ہے۔ لہٰذا ان کے لیے کوئی نہی علی الحرمۃ وارد نہیں۔ ورنہ

تحصیلِ حاصل لازم آئے گی جو محال ہے۔ قرآن کریم جتنی نہی وارد ہوئی ہیں اُن میں بعض نہی اگرچہ ظاہراً انبیاء کو مخاطب ہیں۔ مگر درحقیقت وہ مسلمانوں کو ہی مخاطب ہیں۔ چونکہ سعیدی صاحب یا اُن کے ہم نوا اس سے دھوکہ دے سکتے ہیں لہٰذا اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اس وضاحت میں مفسرین کے بعض جگہ مختلف اقوال بھی ملتے ہیں مگر میں معتبر اور روشِ کلام کے مطابق اقوال ہی پیش کروں گا۔ اور وہ قول رد کیئے جائیں گے۔ جس میں عظمتِ انبیاء پر حرف آتا ہو۔ کیونکہ ترجیح اس قول کو دی جاتی ہے۔ جو ایمان وادب کو قائم رکھے مولوی سعیدی صاحب نے اپنی تیرھویں دلیل میں جن آیاتِ نہی کا ذکر کیا ہے ان کا جواب :۔

پہلی آیت :۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاءِ کرام و ملائکہ کسی گناہ پر قادر نہیں۔ اسی لیئے یہ حضرات بابرکات نہی میں مکلف نہیں اور کسی نہی کے خطاب میں داخل نہیں۔ ہاں البتہ امر میں مکلف ہیں یعنی ان پاک و منزّہ ہستیوں سے یہ تو کہا جاتا ہے کہ یہ کرو یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ مت کرو۔ یہ قاعدۂ کلیہ تمام اہلسنّت مسلمانوں کا ہے مگر سعیدی صاحب چونکہ انبیاءِ کرام کی عزّت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ملائکہ کے لیئے تو شاید اس قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں مگر انبیاءِ کرام کے لیئے کھلم کھلا اس قاعدے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیاءِ کرام کو بذریعہ نہی جبراً گناہ و شرک سے روکا جاتا ہے۔ (معاذ اللہ) اور اپنی اس بے دینی میں دس آیتیں پیش کیں۔ ان کا شافی جواب دینے سے پہلے۔ اہلِ سنت کے اس قاعدۂ کلیہ پر دلائل ملاحظہ ہوں۔ شقِ اوّل انبیاءِ کرام و ملائکہ امر میں مکلف ہیں ع۱ نسیم الریاض جلد چہارم ص۲۰۱ پر ہے :۔ وَهُمْ مُكَلَّفُوْنَ بِالْاِتِّفَاقِ۔ (ترجمہ) :۔ وہ معصوم ہستیاں بالاتفاق مکلف ہیں ع۲ تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۰۸ پر ہے :۔ لِاَنَّهٗ ثَبَتَ بِالْاِجْمَاعِ اَنَّ الْمُكَلَّفِيْنَ هُمُ الْمَلَائِكَةُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ (ترجمہ) :۔ یہ بات اجماع سے ثابت ہوئی کہ بے شک مکلفین وہ فرشتے اور جنات و انسان ہیں ان عبارات سے انبیاء و ملائکہ کا مکلفِ شرعی ہونا ثابت ہوا یہاں صرف امر میں مکلف ہونا مراد ہے۔ اور ان ہر دو آیات میں انبیاءِ کرام ملائکہ جنات اور دوسرے انسان شامل۔ جنات و دیگر انسان کے مکلف فی النہی ہونے کی دیگر عبارات ہیں۔ اور انبیاءِ کرام و ملائکہ کے مکلف فی النہی نہ ہونے کی عبارات بھی صراحتاً ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہشتم صفحہ نمبر ۴۰۹ پر ہے :۔ ع۱ :۔ وَمَذْهَبُ الْعُلَمَاءِ اِخْرَاجُ الْمَلَائِكَةِ عَنِ التَّكْلِيْفِ فِي الْوَعْدِ وَالْوَعِيْدِ وَهُمْ مَعْصُوْمُوْنَ كَالْاَنْبِيَاءِ بِالْاِتِّفَاقِ۔ (ترجمہ) :۔ اور تمام علمائے عظام کا مذہب ملائکہ کو مکلف ہونے اور ڈرانے دھمکانے سے علیحدہ ماننا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاءِ پاک کی طرح بِالْاِتِّفَاق معصوم ہیں۔ یعنی مکلف فی النہی نہ ہونا معصوم ہونے کی وجہ سے اور انبیاءِ کرام بھی معصوم لہٰذا وہ بھی مکلف فی النہی نہیں ہو سکتے۔ عقائد کی کتاب ع۲ ابریز ص۲۷۵ پر ہے

بِحَیْثُ اَنَّھُمْ لَا یَحْتَاجُوْنَ اِلٰی شَرْعٍ یَتَّبِعُوْنَہٗ۔ (ترجمہ) معصوم حضرات اس حیثیت میں ہیں۔ کہ بے شک وہ کسی قانون کے محتاج نہیں ہوتے جس کی پیروی اُن پر فرض ہو۔ اس عبارت نے یہ بھی ثابت فرما دیا کہ انبیاء کا مکلف نہی ہونا تو درکنار ان کا مکلف فی الامر ہونا بھی بے مثل ہے۔ ہم لوگوں کی طرح مالے باندھے کا نہیں۔ ع۳ شرح مسلم الثبوت صفحہ نمبر ع۲۰۵ پر ہے:۔ لَا یَجُوْزُ التَّکْلِیْفُ بِالْمُمْتَنِعِ مُطْلَقًا۔ وَھُوَ الَّذِیْ یَسْتَحِیْلُ وُجُوْدُہٗ عَقْلًا لَا یَدْخُلُ تَحْتَ الْقُدْرَۃِ اَصْلًا:۔ (ترجمہ) جس شخص کے لیئے گناہ ممتنع ہو اُس کو مطلق طور پر مکلف کہنا جائز نہیں اور گناہ کا ممتنع ہونا یہ ہے۔ کہ گناہ کا وجود عقلاً مستحیل ہو یعنی ناممکن نہ داخل ہو قدرت کے تحت بالکل یہی وجہ ہے قرآن پاک میں جتنی بھی نہی کی آیتیں ہیں وہ ظاہراً اگرچہ بعض طریقے سے مخاطب انبیاء سمجھ آتی ہیں مگر اہل سمجھتے ہیں کہ یہ ممانعت امت کو ہے۔ ع۴ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ع۲۵ پر ہے:۔ کَمَا اَنَّ اَمَّتَہٗ اَصْلٌ فِی الْمَنْھِیَّاتِ:۔ (ترجمہ) جس طرح بے شک امت کے لیئے ہی اصل میں نہی وارد ہوتی ہے۔ صرف خطاب کے صیغہ سے شبہ ان کا پڑ جاتا ہے۔ ع۵ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ع۶۰ پر ہے:۔ دَلِیْلٌ عَلٰی عِصْمَۃِ الْمَلَائِکَۃِ (الخ) وَدَلِیْلٌ اَیْضًا عَلٰی اَنَّہٗ لَا نَھْیَ عِنْدَھُمْ لِاَنَّ الْمَلَائِکَۃَ خَلَا عِبَادَتُہُمْ لِلنَّھْیِ عِنْدَھُمْ (ترجمہ):۔ فرشتوں کے معصوم ہونے کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ان کو کسی طرح کی نہی نہیں ہوتی اور وہ ممانعت کی عبادت نہیں کرتے۔ اس عبارت نے بتایا کہ عصمت کی دلیل یہ ہے کہ اُن کے لیئے کوئی ممانعت وارد نہیں۔ یہی عصمت انبیاء کرام کے پاس ہے تو ان کے لیئے۔ نہی کیونکر ہو سکتی ہے۔ خیال فرماؤ دو عبارتوں سے مکلف ہونے کا ثبوت مل رہا ہے اور پانچ عبارتوں سے مکلف نہ ہونے کا۔ اور ہر دو قسم کی عبارت اکابر دین کی ہیں۔ بلا مرجح کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ پس تطابق واجب اور وہ یہی ہے کہ انبیاء کرام و ملائکہ مکلف بالاتفاق ہیں لیکن صرف امر میں اور انبیاء اجماعاً مکلف نہیں یعنی نہی وممانعت میں اب جب کہ عقل عقلاء میں یہ بات بیٹھ گئی تو سمجھو کہ اُن آیات کا مقصد کیا منہج کس طرف ہے۔ علامہ سعیدی کی پیش کردہ پہلی آیت لَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ (ترجمہ):۔ اے آدم و حوا اس درخت کے قریب مت جاؤ۔ علامہ کہتے ہیں کہ یہ حکم نہی وجوبی ہے اور آدم علیہ السلام کا درخت کے قریب جانا حرام تھا۔ اس لیئے سختی سے منع کیا گیا۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ پھر یہ آپ کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام گناہ کرتے نہیں مگر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ کر بھی لیا کیونکہ درخت کے قریب گئے اور کھا لیا۔ پس آپ کے متعلق میرا وہ خدشہ درست ہو گیا کہ آج کہا ہے کہ کر سکتے ہیں مگر کرتے نہیں کل کہو گے کہ کر بھی لیتے ہیں۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ

تفسیر کبیر جلد اول صفحہ نمبر ۳۰۵ پر ہے :- اِنَّ ذَالِكَ النَّهْيَ كَانَ نَهْيَ تَنْزِيْهٍ لَا نَهْيَ تَحْرِيْمٍ ۔ (ترجمہ)
لاتقربا کی نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ تنزیہی ہے۔ صدر الافاضل نے تفسیر خزائن نے صـ۶ پر اس کو نہی تنزیہی کہا۔
تفسیرات اربعہ جلد اول صـ۱۱۰ پر اس کو نہی تنزیہی لکھا حضرت حکیم الامت نے نور العرفان صـ۹ پر فرمایا ارادہ
بھی کھانے میں اور رضاءِ الٰہی بھی کھانے میں تھی۔ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ نہی تحریمی میں رضاءِ الٰہی بھی کرنے میں!
ہو۔ ثابت ہوا کہ لَاتَقْرَبَا والی نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے۔ یعنی ترکِ قرب فرض یا واجب نہ تھا بلکہ مستحب تھا
یہ قانونِ شرعیہ ہے کہ کراہتِ تنزیہی میں انسان مکلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ شرح مسلم الثبوت صـ۱۹۵ پر ہے
اَلْمَكْرُوْهُ كَرَاهَةَ التَّنْزِيْهِيِّ كَالْمَنْدُوْبِ ۔ لَا نَهْيَ وَ لَا تَكْلِيْفَ :- (ترجمہ) :- تنزیہی کراہت
مثل مستحب کے ہے لہٰذا اس میں نہی حقیقی یعنی تحریمی نہیں ہوتی جس کا مکلف ہوتا ہے اگر اس کو نہی تحریمی مانا
جائے تو حضرت آدم کو گناہگار ماننا پڑے گا۔ کیونکہ نہی تحریمی کا مرتکب فاسق گناہگار ہوتا ہے سعیدی صاحب
کو صرف کتابیں لکھنے اور مصنف بننے کا شوق ہے مگر محنت سے جی چراتے ہیں۔ مصنف و مفتی بننا آسان
نہیں اگر اس کا شوق ہے تو اللہ کے کرم و فیضان کی دعا کرو اور تحقیق میں محنت کرو۔ ورنہ چھوڑ دو
کتابیں لکھنا کہ یہ جہنم کا راستہ بھی بن سکتی ہیں۔ **دوسری آیت** :- لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (ترجمہ)
اے داؤد علیہ السلام خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ سعیدی صاحب نے بس اتنا ہی جملہ لکھا۔ اور غالباً دیکھا بھی
اتنا ہی جملہ۔ ان بے چاروں کو زیادہ دیکھنے کی فرصت کہاں پوری آیت سیاق و سباق سے بغور دیکھتے وہاں ہی
اس کا جواب نظر آجاتا۔ پوری آیت اس طرح ہے :- يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ
بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (الخ) :- (ترجمہ) :- یا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام بے شک ہم نے تم کو تمام
علاقے میں بادشاہ بھی بنا دیا ہے پس لوگوں کے درمیان درست فیصلہ فرمایا کرنا خود تحقیق کر لیا کرنا۔ لوگوں کی
اپنی خواہشوں پر اعتماد نہ کرنا۔ کہیں تم کو درست رضاءِ خداوندی کے فیصلے سے پھیر دیں۔ یہاں آیت کا
مضمون بالکل ختم ہوگیا۔ اگلی آیت کا منشا جدا ہے۔ اس آیت میں جو مطلب سعیدی صاحب نے لیا یعنی نہی
تحریمی مراد لے کر اپنا مسلک درست رکھنا چاہا مگر مقامِ نبوت کا خیال نہ رکھا وہ مطلب یہاں نہیں بن
سکتا۔ دو وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ لفظ ہَوٰی کا معنٰی ہے خواہش۔ خواہش اچھی بھی ہوتی ہے۔ بری بھی۔ اپنی
بھی ہوتی ہے دوسروں کی بھی مگر آیت نے کوئی وضاحت نہ کی کہ یہاں کس کی کونسی خواہش مراد ہے
لہٰذا یہ آیت مجمل ہوئی اور بقاعدۂ اصولِ فقہ مجمل کلام سے حرمت ثابت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا نہی تحریمی
نہیں ہوسکتی۔ خواہش کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ۱ خواہش نفسِ امارہ یہ خواہش ہر طرح بری ہے :-
انبیاء کرام اس سے معصوم ہیں ان کو یہ خواہش ہو سکتی نہیں۔ اسی کی نہی۔ نہی تحریمی ہے ۲ خواہشِ ذاتی

یہ اچھی بھی ہو سکتی ہے بری بھی ۳۔ اپنی خواہش ۴۔ دوسرے کی خواہش۔ حضرتِ داؤد کو فرمایا جا رہا ہے۔ خواہش کے پیچھے نہ چلو پہلے فرمایا گیا لوگوں کا فیصلہ کیا کرو۔ اس سیاق کلام سے ثابت ہوا کہ فیصلہ کرنا سکھایا جا رہا ہے۔ اور ہوٰی سے مراد مدعی یا مدعیٰ علیہ کی ذاتی مرضی ہے۔ خواہ جائز ثابت ہو یا ناجائز۔ اس سے بچایا جا رہا ہے۔ یعنی شرعاً کسی کی جائز خواہش کو پورا کرنا عام لوگوں کے لیے جائز ہے مگر قاضی اور مفتی کے لیے یہ بات درست نہیں کہ یک طرفہ فیصلہ کرے۔ اگرچہ سچا ہو۔ پس ثابت ہوا کہ یہ نہی تحریمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حاکم صرف مدعی کے بیان پر فیصلہ کر دے اور واقعتہً بھی صحیح ہو جائے تب بھی منصب قضاء کے مناسب یہ کام نہیں۔ لیکن یہ شرعی جرم نہ ہو گا۔ اس نہی میں شرعی جرم سے نہیں روکا بلکہ نامناسب کام سے منع کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ کہ نہی تحریمی میں تعیین شرط ہے۔ کہ اس معین سے بچو یا یہ معین کام نہ کرو۔ اس آیت میں ہوٰی کا تعیین نہ فرمایا گیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ نہی تحریمی نہیں بلکہ مناسبِ حال ہے۔

تیسری آیت:۔ وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي۔ (ترجمہ) :۔ اے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تم دونوں میرے ذکر میں ضعف محسوس نہ کرنا۔ یہ بھی نہی تحریمی نہیں۔ بلکہ استحبابی ہے۔ کیونکہ لفظِ تَنِيَا وَنٰی سے مشتق ہے۔ بمعنیٰ ضعف و کمزوری کا (المنجد عربی ص۱۰۲۲) ضعف و کمزوری کسی شخص کے اختیاری نہیں لہٰذا یہ نہی تحریمی کیسے ہو سکتی ہے نہی تحریمی ہمیشہ اختیاری چیز پر ہوتی ہے نہ کہ اضطراری پر ویسے بھی ہر وقت ذکر اللہ فرض نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اس آیت میں بحالتِ سفر کا ہمہ وقتی ذکر مراد ہے جو فرض نہیں ہوتا۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ مستحب فعل کے ترک پر نہی تحریمی وارد ہو۔ کوئی نادان ہی ایسا کہہ سکتا ہے۔ لَا تَنِيَا کا مطلب یہ ہے کہ ذکر میں کمزوری نہ دکھانا دلیر بننا۔ اور کام چاہیں چھوڑ دینا مگر اس سفر میں ذکر اللہ نہ چھوڑنا۔ **چوتھی آیت پاک**:۔ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ یہ نہی بھی تحریمی نہیں بلکہ ترکِ سوال بطورِ اباحت ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ نمبر ص۶۴ پر ہے :۔ وَجَبَ جَعْلُ هٰذِهِ الْوُجُوْهِ الْمَذْكُوْرَةِ عَلٰى تَرْكِ الْاَفْضَلِ۔ (ترجمہ) :۔ اس قسم کی منہیات کو ترکِ افضل میں شامل کرنا واجب ہے۔ یعنی چونکہ حضرتِ نوح کا یہ سوال خطاءِ اجتہادی تھی۔ لہٰذا استحباباً منع فرمایا گیا کہ آئندہ ایسی خطاء کرنا آپ کی شان کے لائق نہیں۔ اور خلافِ شان کوئی بات کرنا گناہ نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی مکلف ہے۔ ہاں افضل ہے کہ ایسی خطا بھی نہ ہو۔ **پانچویں آیت**:۔ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ :۔ اس آیت کا ترجمہ دو طرح ہو سکتا ہے۔ پہلا۔ نہ عبادت کر تو اللہ کے علاوہ کی۔ اکثر مفسرین نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ اور ہمارے مخالف مذکور نے بھی یہی ترجمہ اختیار کیا ہے پھر کہتا ہے کہ یہ نہی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے۔ حالانکہ یہ ترجمہ لے کر پھر پیارے معصوم آقا کو مراد لینا ارتداد سے کم

نہ ہوگی۔ تمام مفسرین نے فرمایا کہ اس نہی میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ ۱۷۸ پر اور تفسیر خازن جلد سوم صفحہ ۲۹۴ پر ہے:۔ فَالْمُرَادُ بِهٖ غَيْرُهٗ لِاَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شَيْئًا اَلْبَتَّةَ فَيَكُوْنُ الْمَعْنٰى لَا تَدْعُ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (ترجمہ):۔ پس مراد اس خطاب سے نبی کریم کے علاوہ عام امتی لوگ ہیں اس لیئے کہ نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی کسی شی کو نہ پوجا یقیناً۔ پس لا تدع کا معنیٰ ہوگا۔ اے انسان تو نہ پوجنا کسی جھوٹے معبود کو۔ سعیدی صاحب نے آنکھیں بند کرکے اس نہی کو نبی کریم کی طرف پھیر دیا۔ حالانکہ سیاقِ کلام سے تو یہ کلام خود نبی کریم کا ہے اور نبیِ پاک اس کلام کے متکلم ہیں۔ کیونکہ یہ مضمون قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ سے شروع ہو رہا ہے۔ اگلی آیت اس کا مقولہ ہیں۔ بھلا کبھی ہو سکتا ہے کہ متکلم خود ہی اپنے کلام کا مخاطب ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیارے نبی تم فرما دو لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اعلیٰحضرت کا ترجمہ بھی یہ ہی سمجھا رہا ہے۔ اس آیت پاک کا دوسرا ترجمہ اس طرح ہو سکتا ہے۔ نہ بلا تو اللہ کے دشمن کو یعنی اے انسان اللہ کے دشمن کو دین کی طرف مت بلا ان کا بلانا بے فائدہ ہے۔ نہ ان کا کچھ نقصان تجھے پہنچے۔ تفسیر کبیر نے اسی ترجمے کی طرف توجہ دی ہے۔ چنانچہ جلد پنجم صفحہ ۴۳ پر ہے:۔ لَا يُمْكِنُ اَنْ يَكُوْنَ هٰذَا نَهْيًا عَنْ عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ۔ (ترجمہ):۔ ناممکن ہے کہ یہ نہی بتوں کی عبادت کی ہو۔ یعنی لَا تَدْعُ کا بر ترجمہ کرنا کہ مت پوج یہ درست نہیں اور پھر یہ ترجمہ کرکے اس کا رخ نبی کریم کی طرف پھیرنا ناممکن ہے۔

چوتھی آیت:۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ۔ یہ نہی بھی نبی کریم کو نہیں ہے بلکہ عام انسان کو ہے۔ جیسا کہ اعلیٰحضرت کے ترجمے نے اشارہ کیا۔ اعلیٰحضرت اپنے ترجمے میں نبی کریم کو بصیغۂ جمع ادب سے خطاب کرتے ہیں اور عام انسان بصیغۂ واحد اگر یہ نہی نبی پاک کو ہوتی تو اعلیٰحضرت اس طرح ترجمہ فرماتے۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ کافروں کی اطاعت نہ کیجئے۔ مگر ترجمہ اس طرح ہے۔ تو کافروں کا کہا نہ مان۔ علاوہ ازیں اطاعت کا لغوی معنیٰ ہے۔ بات ماننا۔ عام ہے اس کو کہ دینی بات ہو یا دنیوی۔ نبی کریم کے لیئے کافر کی دینی بات ماننا تو محال شرعی وعقلی ہے۔ پس اس مرجح سے دنیوی بات ترجیح پا گئی۔ اور تعین ہوا کہ یہاں لَا تُطِعْ سے دنیوی بات ماننے سے نہی ہے۔ اور شرعاً کافر کی دنیوی بات ماننا حرام نہیں پس یہ نہی تحریمی نہ ہوئی۔ بلکہ تنزیہی ہوئی اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔ چنانچہ بہت دفعہ نبی کریم نے کافروں کی دنیوی بات تسلیم کی۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے واقعے سے عیاں ہے۔ باوجود اس احتمال کے روشِ کلام کے لحاظ سے اس نہی کو عام مسلمان کی طرف پھیرنا جائز ہے۔ تو کیا ضروری ہے کہ ضد کرکے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہی پھیری جائے۔ بہرحال اس آیت سے بھی مقصدِ مخالف حاصل نہیں ہوتا۔ **ساتویں آیت**:۔ وَلَا تَقُمْ

عَلٰی قَبْرِہٖ (ترجمہ) :- پوری آیت کا اس طرح ہے۔ نہ جنازہ پڑھنا اس کافر کا اور قبر پر نہ کھڑا ہونا اس کافر کی یہ حقیقتاً نہی صرف نبی کریم کو نہیں بلکہ اس آیت میں ممانعت تامہ ہے جس کو قانون کہا جاتا ہے۔ اور قیامت تک کے تمام مسلمان مراد اور مخاطب ہیں۔ گویا کہ اس آیت نے ایک مستقل قانون بنا دیا۔ اور یہ نہی قانون ساز عبارت ہے۔ اگر یہ نہی صرف نبی کریم کو ہوتی تو لفظ ابداً نہ ہوتا۔ **آٹھویں آیت** :- لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ سورہ طٰہٰ پ ۱۶ آیت نمبر ۱۳۱ اس کا ترجمہ اعلیٰحضرت سے اس طرح فرمایا۔ اور اے سننے والے اپنی آنکھیں نہ پھیلا۔ تفسیر صاوی نے جلد سوم صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے :- وَهٰذَا الْخِطَابُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ وَالْمُرَادُ غَیْرُهٗ لِاَنَّ ذٰلِكَ مُسْتَحِیْلٌ عَلَیْهِ لِمَا وَرَدَ :- ترجمہ ظاہراً خطاب نبی پاک کو ہے لیکن حقیقتاً مراد عام امت ہے کیونکہ نبی پاک کے لیئے یہ ارتکاب ناممکن ہے جیسا کہ ثابت ہے اور محال پر نہی ہو سکتی ہی نہیں۔ صاف معلوم ہوا کہ یہ نہی عوام کو ہے نہ کہ نبی کریم کو۔ **نویں آیت** :- لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ (ترجمہ) :- اے پیارے نبی قرآن مجید یاد کرنے کے لیئے اپنی زبان پاک نہ ہلایئے (ہم خود حفظ کرا دیں گے) یہ نہی تحریمی و تکلیفی نہیں بلکہ کریمانہ کرم ہے۔ جس سے شانِ محبوبی کا اظہار ہے۔ جیسے کوئی استاد اپنے پیارے لائق لاڈلے شاگرد سے کہے۔ اتنا نہ پڑھ تھک جائے گا جا آرام کر میں خود تجھ کو سبق یاد کرا دوں گا۔ میرا یہ مفہوم تفسیر بالرائے نہیں جیسا کہ سعیدی صاحب کو وسوسہ ہوا۔ بلکہ اشارۃ النص سے ثابت ہے :-

آیت نمبر دس :- اور گیارھویں۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (ترجمہ) :- یتیم کو نہ جھڑکو۔ سائل کو مت ڈانٹو نہ بھگاؤ۔ یہ آیت بھی نبی پاک کے لیئے نہیں بلکہ قانون بنایا جا رہا ہے۔ اور سب امت کے لیئے نہی ہے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں نبی کریم کو اجازت ہے کہ جس کو چاہیں ڈانٹیں جھڑکیں۔ اس لیئے کہ نبی اکرم کی جھڑک اور ڈانٹ بھی امت کے لیئے رحمت ہے :- پیارے آقا کی ہر ادا عین حکمت ہے۔ جب استاد کی جھڑک باپ کی ڈانٹ شرعاً جائز ہے تو نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جھڑک تو بدرجہا اولیٰ ہے۔ ایک صحابی تو میدانِ بدر میں صرف نبی پاک کے ہاتھ سے قمچی کھانے کی تمنا میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قربانی کے دِن حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دستِ اقدس سے ذبح ہونے کی خوشی میں اونٹ گردنیں آگے کرنے میں جلدی دکھانے لگے۔ آج جبرائیل و میکائیل۔ غوث و قطب۔ نبی کریم کی ایک التفاتی نگاہ کے منتظر ہیں۔ بھلا کون ہو گا جو نبی کریم کی جھڑک سے کبیدہ خاطر ہو۔ بڑے بڑے اولیا تو مدینہ منورہ کے عوامی ہجوم سے دھکے کھانے کی غرض سے ہر سال حاضری کے لیئے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ ایک بزرگ نے تو یہاں تک فرمایا کہ نجدی حکومت اپنے ظالمانہ رویہ کے باوجود جواب تک پنپ رہی ہے۔ وجہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل۔ ورنہ قوی ہیکل لوگ چھوٹے چھوٹے نمازی شرطوں کے ہاتھ سے دھکے کھا کر برداشت کر جاتے ہیں صرف عشقِ مصطفےٰ علیہ السلام کی خاطر اور وہ عشاق ان دھکوں میں لذتِ عشق پاتے ہیں اگر بقول سعیدی صاحب لاتقہر کی نہی حضور اکرم کی طرف پھیری جائے تو تحصیلِ حاصل لازم آئے گا۔ یا ایھا النبی اتقِ اللہ سے تحصیل حاصل کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں امر تنجیزی یا فوری نہیں بلکہ امر ثبوتی ہے یہ تحسین وہ آئیں جن سے آپ نے غلط استدلال کر کے عصمتِ معصوم کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی جرأت دکھائی۔ اور جو تعریف محفوظ من اللہ کی تھی وہ عصمت پر چسپاں کی۔ محفوظ اولیاءِ کاملین وہ ہوتے ہیں جو گناہ کر سکتے ہیں۔ مگر کرتے نہیں میرے ایک دوست حضرت قبلہ حکیم الامت کے شاگرد حاجی رحمۃ اللہ عرف فقیر شاہدو لہا چڑ یا ڈلوی کے سیاق سباق ماضی حال مستقبل کو اندرونی بیرونی طور سے میں جانتا ہوں میں برملا کہتا ہوں کہ انہوں نے ساری عمر کوئی گناہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ کر سکتے تھے تو وہ بھی معصوم ہو گئے۔ اس سے درگزر۔ حضراتِ صدیق و فاروق کی شان یہ ہے کہ وہ کر سکتے ہیں۔ مگر کرتے نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ معاذ اللہ یہ حضرات مقامِ عصمت پر فائز ہو گئے جب کہ عقیدۂ حقیقیہ مسلّم ہے کہ عصمت انسانوں میں صرف انبیاء کو ہے۔ چنانچہ المعتقد صفحہ نمبر ۱۱۷ پر ہے:۔ اَلْعِصْمَۃُ وَھِیَ مِنْ خَصَائِصِ النُّبُوَّۃِ عَلٰی مَذْھَبِ اَھْلِ الْحَقِّ۔ (ترجمہ) معصوم ہونا اہلِ تحقیق کے مذہب میں انبیاء کا خاصہ ہے۔ اور اگر کوئی نادان یہ کہہ دے کہ صحابہ و اولیاء معصوم تو نہیں مگر شان ان کی بھی یہی ہے۔ تو عصمت بیکار ہو گی۔ ماننا پڑے گا۔ انبیاءِ کرام نہ گناہ کر سکتے ہیں نہ کرتے ہیں یہی سچی تعریفِ عصمت ہے۔ نبراس علی شرحِ العقائد صفحہ نمبر ۵۲۳ پر ہے:۔ لَا یَلْزَمُ اَنْ یَکُوْنَ غَیْرُ الْمَعْصُوْمِ مُذْنِبًا لِجَوَازِ اَنْ یَکُوْنَ الشَّخْصُ خَالِیًا عَنْ ھٰذِہِ الْمَلَکَۃِ وَلٰکِنْ لَّا یَصْدُرُ عَنْہُ بِمَحْضِ حِفْظِ الْحَقِّ۔ (ترجمہ):۔ یہ ضروری نہیں کہ غیر معصوم انسان ضروری ہی گناہ کرے۔ کیونکہ جائز ہے کہ یہ ملکہ جن کو نہیں ملا ان سے بھی گناہ تا عمر صادر نہ ہو فقط حفاظتِ الٰہیہ سے۔ ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے بھی عصمت کی تعریف غلط کی ہے وہ لوگ حقائق کے مقابل اپنی غلطی کو بچانے کے لیے اس کہنے پر مجبور ہیں کہ گناہ کی بابت نبی و غیر نبی برابر ہے۔ حالانکہ یہی عقیدہ گمراہی ہے۔ صحیح عقیدہ یہی ہے۔ کہ انبیاءِ کرام بے مثل ہیں ان کا ہر قول فعل جسد و روح بے مثل یہاں تک اشیاءِ مشترکہ بھی ان کی بے مثل ہیں۔ ان کا مکلّف فی الامر ہونا بھی بے مثل ہے۔ تمام مخلوقِ مکلّفہ کو تکلیف جبری ہے مگر ان ہستیوں کا مکلف ہونا بھی تکلّفِ عشقِ الٰہی ہے انبیاءِ کرام پر جو کچھ فرض و واجب ہوتے ہیں وہ ان کی روحانی لذتِ عشق کے لیے ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ پیارے مقدس بزرگ عبادت کرنے نہ کرنے میں مختار ہوتے۔ چاہیں تو نماز پڑھیں خواہ نہ پڑھیں۔ چار کی تین پڑھیں۔ یا چار کی دو پڑھیں

کوئی عتاب نہیں۔ کوئی غوث وقطب پیر و عالم تو ایسا کر دیکھے۔ یہ مناظرہ ۳۰-۹-۸۰ء کو شروع ہوا۔ اور ۲۰-۱۲-۸۰ کو میرے آخری چوتھے خط پر ختم ہوا اور اس حالت میں ختم ہوا کہ سعیدی صاحب کے ترکش علم کے سب تیر ختم ہو چکے تھے اور اشارۃً و دلالۃً شکست تسلیم کر چکے تھے مگر ہٹ کی پٹی آنکھوں پر تھی منطقی فلسفی غبار دماغ پر تھا اس لیئے ظاہراً کھلی کھلی جرئتِ رجوع نہ کر سکے بہرحال وہ سوال جو ابھی تک تشنۂ جواب ہیں اور صاف صاف ان کو بتا دیئے گئے حسب ذیل ہیں۔ ع۱:۔ عصمتِ انبیاء اور عصمتِ ملائکہ میں کیا فرق ہے۔ باحوالہ بتایا جائے۔ سوال ع۲:۔ جب کذب انبیاء ممکن ہوا تو کیا آپ کے مذہب میں انبیاءِ کرام علیہم السلام کو بالامکان کاذب بلکہ فاسق و فاجر کہا جا سکتا ہے (العیاذ باللہ) اگر نہیں تو امکانِ کذب سے بھی آج توبہ کرو۔ سوال ع۳:۔ جب انبیاءِ کرام باوجود عصمت کے گناہ کر سکتے ہیں تو کرنے سے کون مانع ہے اور نہ کرنے کی کیا گارنٹی ہے۔ اور یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ کرتے نہیں باحوالہ سمجھایا جائے۔ سوال ع۴:۔ جب انبیاءِ کرام کا جھوٹ ممکن ہوا تو ساری آیات قرآنیہ و احادیث مشکوک ہو گئیں۔ اِس شک کو کس طرح دور کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود تو پکار کر بتانا نہیں:۔ اس کے کلام تو دو ہی ذریعوں سے ملتے ہیں۔ ع۱:۔ انبیاء ع ملائکہ اسی وجہ ان کو معصوم بنایا:۔ سوال ع۵:۔ معصوم اور غیر معصوم متقی مسلمان میں کیا فرق ہے سوال ع۶:۔ معصوم بنانے کی کیا حکمت ہے سوال ع۷:۔ کیا وجہ ہے کہ اعلحضرت اور صدر الافاضل اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے ماتریدی اور شرح مواقف کی تعریف کو مردود کر کے۔ اشاعرہ متکلمین۔ ابن ہمام۔ حسین نجار کی تعریف کو اختیار فرمایا۔ کیا اب بھی کوئی مقال ہے یا اساتذہ سے بھی اعتزال ہے۔ تو یہ آپ کی ہی مجال ہے۔ جو سراسر حق سے فرار ہے۔ نہ کہ مقابلہ اقتدار۔ واللہ اگر صدر الافاضل حیاتِ ظاہری میں ہوتے تو آپ کو یہ عبارت کاٹنے پر مجبور کر دیتے۔ اور رجوع کا فوری حکم دے دیتے۔ مگر ہائے افسوس اب وہ مشفق نگاہیں کہاں ڈھونڈیں۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کِتَابُ العِلم

بیٹیوں کو میراث اور جہیز دینے کا حکم

سوال نمبر ۳۵ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ بعض عوام ہمارے علاقے کے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو جب لاکھوں کا جہیز دے دیا جاتا ہے تو ان کو میراث سے حصہ دینا درست نہیں ہزاروں بیٹیاں اس رواج کی بنا پر اپنے باپوں کی میراث سے محروم رہتی ہیں اور باپ کی لاکھوں کی میراث بیٹے ہی لے لیتے ہیں اسی طرح کا ایک جھگڑا یہاں ہے صورتِ مسئلہ اس طرح ہے۔ ۱:- ایک شخص فوت ہو گیا۔ اس کی کچھ زمین ہے جس میں اس کے مکانات تعمیر ہیں پسماندگان میں ۱ بیوہ تین لڑکے۔ چار لڑکیاں۔ ایک بھائی موجود ہے اس متوفی کی میراث کیسے تقسیم ہو گی۔ دوسرا مسئلہ اس طرح ہے۔ تین بھائیوں میں سے ۲ بھائی فوت ہو چکے ان کا تیسرا بھائی بھی فوت ہو گیا تھا۔ اس کی بیوہ بھی اب فوت ہو گئی اولاد میں صرف اس کی ایک لڑکی سگی ہے دونوں بھائیوں فوت شدگان کی اولاد نرینہ ہے فرمایا جائے کہ ان کی میراث کس طرح تقسیم ہو گی۔

الراقم حافظ غلام محی الدین فاروقی بجے منگلا کالونی منگلا ۶ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ ۲-۷-۱۹۷۹ء

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ العَلَّامِ الوَهَّابْ

قانونِ اسلامیہ کے مطابق تمام عبادات سے زیادہ اہم عبادت فوت شدہ کی میراث تقسیم کرنا ہے اس لیے کہ یہ حقوق العباد ہے۔ اور اس لیے کہ بعض حالات میں ورثاء میں یتیم بھی شامل ہوتے ہیں لہذا کسی وارث کا حصہ نہ دینا یا کم کرنا اشد ظلم ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت ہے کہ اگر کوئی وارث کسی دوسرے حقدار وارث کا حصہ خود لے لے یا تقسیم کے وقت کسی وارث کو خارج کر دے تو اس کی نماز روزہ سب بیکار اور وہ ظالم شخص دنیوی اخروی مجرم ہو گا:-

پہلی دلیل:۔ اللہ تعالیٰ نے تمام عبادات کی تفصیل انبیاء کرام اور پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بیان فرمائی مگر میراث تقسیم کرنے کی تفصیل خود بیان فرمائی۔ چنانچہ قرآن پاک میں تمام ذی فرض وارثوں کا ذکر پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ فتاوٰی شامی میں ہے جلد پنجم صـ۶۶۲ پر ہے:۔ وَلَمْ يُفَوِّضْ تَقْدِيرَهُ إِلَى مَلَكٍ مُقَرَّبٍ وَلَا نَبِيٍّ مُرْسَلٍ بِخِلَافِ سَائِرِ الْأَحْكَامِ كَالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ۔ (ترجمہ):۔ اللہ تعالیٰ جلّ مجدہٗ نے میراث کے حصے مقرر کرنا کسی فرشتے یا کسی نبی مرسل علیہ السلام کے سپرد نہ فرمائے۔ بخلاف تمام باقی احکام کے جیسے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ۔ ثابت ہوا کہ میراث کی تقسیم کتنی ضروری اور اہم ہے۔ باری تعالیٰ کا خود اپنے ذمۂ کرم پر یہ کام لینا ثابت کر رہا ہے کہ یہ کام اہم ترین ہے جب انبیاء کرام اور ملائکہ کے سپرد نہ فرمایا حالانکہ وہاں ظلم ناممکن تو کس بندے کی جرأت ہے جو میراث کی تقسیم کے قانون خود بنائے اور جب انبیاء کرام کے فرمودہ قانون توڑنے گناہ عظیم ہیں تو خود باری تعالیٰ کے فرمودہ قوانین توڑنے اور اُس کی خلاف ورزی کرنا اور مختلف حیلے بہانوں سے کسی وارث کو محروم رکھنا کتنا بڑا ظلم اور گناہ کبیرہ ہوگا۔ اور پھر ایسے مجرم کی سزا کتنی سخت ہوگی جرم کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم دنیا کے فانی مال کے لیئے کس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ **دوسری دلیل:۔** بہت سی عبادات فرض ہیں مگر کسی کی فرضیت اتنی بڑی نہیں کہ وہ خود سراپا فرض کہلائے۔ دیکھو۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ فرض ہیں مگر ان کا نام فرض نہیں بلکہ نماز ہے زکوٰۃ ہے وغیرہ وغیرہ بخلاف میراث کے کہ اس کا نام ہی اسلام میں فرض ہو گیا اور اس کے جاننے کا نام علم فرائض ہوا۔ فتاوٰی درِّ مختار مجلد مکمل صـ۸۰۶ پر ہے:۔ وَسُمِّيَ فَرَائِضَ لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَّمَهُ بِنَفْسِهِ وَأَوْضَحَهُ وُضُوحَ النَّهَارِ بِشَمْسِهٖ۔ (ترجمہ):۔ اس عبادت کا نام فرض رکھا گیا۔ اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود اس کو تقسیم فرمایا اور سورج کی طرح صاف صاف واضح فرمایا۔ تاکہ کوئی انسان اس میں غلطی کر کے جہنمی نہ بن جائے۔ علامہ شامی نے اس کی شرح اس طرح فرمائی۔ (قَسَّمَهُ) أَوْلَى قَدَّرَهُ كَمَا قَالَ الزَّيْلَعِيُّ لِأَنَّهُ مَعْنَى الْفَرْضِ:۔ (ترجمہ):۔ مصنف نے کہا کہ تقسیم فرمایا۔ بہتر یہ تھا کہ مصنف کہتے قَدَّرَ یعنی ٹھیک ٹھیک اندازہ بیان کر دیا جس طرح امام زیلعی نے کہا۔ اس لیئے کہ فرض کے معنٰی ہیں اندازہ بیان کرنا۔ اور اندازہ وہ ہو سکتا ہے۔ جس میں نہ کمی ہو سکے نہ زیادتی جیسے نماز وغیرہ عبادات۔ کہ نہ اس میں کچھ کم ہو سکے نہ زیادہ حالانکہ ان عبادات کے اندازے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمائے۔ تو وراثت جیسی اہم عبادت جس کا اندازہ خود ربِّ قدیر نے بیان فرمایا اس میں کوئی کس طرح کمی کر سکتا ہے اور کس طرح کسی وارث کو محروم کر سکتا ہے۔ **تیسری دلیل:۔** کائنات میں کروڑہا قسم کے علوم ہیں۔ مگر علم میراث سب سے زیادہ اہم اور بوجھل ہے کہ سارے علم ملائے جائیں تو دنیا کے آدھے علم

بنتے ہیں مگر یہ علم اکیلا آدھا علم ہے۔ حدیث پاک میں اس کو آدھا علم فرمایا گیا۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف ص۱۹۵ پر ہے۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا ھُرَیْرَۃَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْھَا فَاِنَّہٗ نِصْفُ الْعِلْمِ وَھُوَ یُنْسٰی وَھُوَ اَوَّلُ شَیْءٍ یُنْزَعُ مِنْ اُمَّتِیْ۔ (ترجمہ)۔ حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ فرمایا آقائے کائنات حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اے ابوہریرہ علم فرائض سیکھو اور سکھاؤ کیونکہ یہ کائنات کا آدھا علم ہے یہی جلدی بھلایا جاتا ہے اور یہی سب سے پہلے میری امت میں سے اٹھایا جائے گا۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں پہلی یہ کہ اس علم کو فرض کا علم کہتے ہیں اور فرض کس کا نام؟ میراث کا گویا یہ حقوق العباد سراپا فرض ہوئے اور مبالغۃً کہا گیا ہے زَیْدٌ عَدْلٌ زید سراپا عدل ہے۔ اسی طرح میراث اتنا بڑا فرض ہے کہ گویا خود فرض بن گیا۔ دوسری بات یہ کہ اس کا سیکھنا بھی اہم فرض کیونکہ امر وجوب کے لیئے ہے۔ اور جس کا سیکھنا فرض اس پر عمل تو اور بھی زیادہ۔ تیسری یہ کہ یہ علم سب سے پہلے اٹھایا جائے گا۔ اس سے بھی اس کی اہمیت ثابت ہوئی۔ اس طرح کہ جب علم اٹھ جائے گا تو کوئی بھی تقسیم کرنے والا نہ رہے گا اور لوگ بلا تقسیم وارثوں کے یتیموں کے۔ بھائی اپنی بہنوں کے وراثت کے حصے غصب کرلیں گے۔ بہنوں کو یعنی متوفّٰی کی بیٹیوں کو محروم کردیا کریں گے۔ اور ظالم و خائن کہلا کر اشرارِ خلق بنیں گے اور ان پر قیامت نازل ہو جائے گی۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اشرار خلق پر قیامت طاری ہوگی جب کوئی منصف نہ رہے گا سب ظالم ہی ظالم رہ جائیں گے۔ ثابت ہوا کہ میراث صحیح تقسیم نہ کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے

چوتھی دلیل، مسلم شریف جلد دوم ص۳۷ پر ہے کہ ایک شخص بشیر نامی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہِ اقدس میں آیا۔ اور عرض کیا یا رسول میں اپنے ایک بیٹے نعمان کو اپنا اتنا اتنا مال دینا چاہتا ہوں۔ اس کی شرح نووی نے لکھا وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفَعَلْتَ ھٰذَا بِوَلَدِکَ کُلِّھِمْ۔ قَالَ لَا قَالَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْدِلُوْا فِیْ اَوْلَادِکُمْ :۔ (ترجمہ):۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اپنی سب اولاد کو اتنا اتنا دیا ہے۔ عرض کیا نہیں۔ فرمایا آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اللہ سے ڈرو۔ اور اپنی اولاد میں انصاف کرو۔ مقامِ غور ہے کہ جب زندہ مرد کو اپنے مالِ ملکیتی میں یہ اختیار نہیں کہ ایک بچے کو دے دوسرے کو نہ دے یا بیٹے کو دے بیٹی کو نہ دے یا اس کا الٹ تو وفات یافتہ کی دولت و جائیداد میں کسی اور کو کس طرح اجازت ہو سکتی ہے کہ کسی وارثِ شرعی کو محروم کرے جب اللہ تعالیٰ عطا فرما رہا ہو تو کس کی طاقت ہے کہ حصہ مارے اور خدا تعالیٰ کا مقابلہ کرے۔ لہٰذا اے وارثو۔ اللہ سے ڈرو اور قیامت کی نشانی نہ بنو۔ کوئی بیٹی کسی بیٹے کو یا کوئی بیٹا کسی بیٹی کو محروم نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی لڑکا ایسا کرے گا کہ اپنے باپ کے ترکے میں

بیٹی کو شرعی حصہ نہ دے گا اور وہ مال خود کھائے گا تو وہ اس پر حرام ہوگا۔ اور وہ مال جہنم کی آگ ہے:۔

دلیل ۵:۔ ترمذی شریف جلد دوم ص۳۰ پر ہے۔ سعد بن ربیع جنگِ احد میں شہید ہو گئے ان کی ایک بیوہ دو لڑکیاں ایک بھائی پسماندگان وارث تھے۔ سعد بن ربیع شہید کے بھائی یعنی لڑکیوں کے چچا نے سعد کی ساری دولت چھین لی لڑکیوں اور بیوہ کو کچھ نہ دیا۔ بیوہ نے بارگاہِ رسالت میں مقدمہ پیش فرمایا تو ابھی نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابھی فیصلہ نہیں فرمایا تھا کہ وحی میں آیات میراث نازل ہوئی۔ جس میں خاص طور پر بیٹیوں کے حصہ کی اہمیت و وضاحت کی گئی۔ یعنی رب کریم نے اشارۃً فرمایا کہ اے پیارے حبیب یہ مقدمہ اتنا اہم ہے کہ اس کا فیصلہ ہم خود فرمائیں گے۔ اب جو بدبخت بیٹا اپنے باپ کی جائیداد سے اس کی بیٹیوں کو میراث نہ دے یا کسی رشتہ دار آدمی میت کی بیٹیوں کو باپ کی ترکہ جائیداد سے محروم کر دے وہ کتنا بڑا ظالم ہے۔ ترمذی شریف کی مذکورہ منقولہ حدیث پاک کے کچھ الفاظ اس طرح ہیں۔ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ هَاتَانِ بِنْتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قُتِلَ اَبُوْهُمَا مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ شَهِيْدًا وَاِنَّ عَمَّهُمَا اَخَذَ مَالَهُمَا فَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا۔ (الخ):۔ (ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گزرا۔ ترمذی نے اس باب کا نام ہی۔ باب میراث البنات۔ رکھا۔

دلیل ۶:۔ مشکوٰۃ شریف ص۲۶۳ پر ہے:۔ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ:۔ (ترجمہ):۔ حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا کہ فرمایا رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام وارثوں کو ان کی میراث دے دو تو جو بچ جائے وہ قریبی عصبہ مرد کو دے دو۔ اِس حدیث سے نبی کریم رؤف رحیم پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ذیشان واجب ولازم بن کر ثابت ہوا کہ اے مسلمانوں ہر اہل ذی فرض وارث کو اس کا پورا پورا حصہ فوراً دے دو۔ خبردار نہ کسی کا حصہ چھیننا نہ روکنا نہ بہانے بنا کر کسی وارث کو محروم کرنا۔ لفظ الحقوا امر کا صیغہ ہے جو وجوب کے لیے آیا ہے۔ واجب کو ادا نہ کرنے والا شرعی مجرم گناہ گار رہے لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کوئی شخص میت کی مستحق بیٹی کو میراث کا حصہ نہ دے گا تو فاسق فاجر ہوگا اور حرام روزی کا مرتکب ہوگا۔

دلیل ۷:۔ بخاری شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۵۲ پر ہے:۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ۔ (ترجمہ):۔ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اے مسلمانو! اپنی اولاد کے عطیوں میں انصاف کرو۔ اس کے حاشیے میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا۔ قَوْلُهُ اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ (الخ)۔ هٰذَا وَاجِبٌ اَشَدُّ الْوُجُوْبِ وَغَفَلَ عَنْهُ النَّاسُ:۔ (ترجمہ):۔ حدیث پاک کا فرمان اِعْدِلُوْا (الخ) یہ بہت سخت واجب حکم ہے

حالانکہ لوگ اِس سے غافل ہیں۔ ثابت ہوا کہ کسی وارث کو میراثی حصے سے محروم کرنا سخت گناہ اور لائق عذاب ہے۔ اور جو شخص بھی وہ حصہ چھینے گا اس کے لیے حرام مال کی مثل ہوگا۔ **دلیل ۸** :۔ میراث کو شریعتِ پاک کی زبان میں فرض کہتے ہیں اور فرض کے لغوی معنٰی ہیں کاٹنا۔ چنانچہ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف جلد سوم ص ۲۸۷ پر ہے :۔ اَلْفَرْضُ اَصْلُہٗ اَلْقَطْعُ یُقَالُ فَرَضْتُ لِفُلَانٍ اِذَا قَطَعْتَ لَہٗ مِنَ الْمَالِ شَیْئًا :۔ (ترجمہ) :۔ فرض کا لغوی معنٰی ہے کاٹنا۔ اور کاٹنے کا مطلب ہے اس طرح جدا ہونا کہ اس سے جڑ نہ سکے۔ جیسے کہ درخت کی شاخ جب کٹ جائے تو ہرگز جوڑی نہیں جا سکتی اسی طرح مقصد یہ ہے کہ وہ مال جو پہلے ایک ہی جگہ جڑا ہوا تھا مال والے کے مرنے کے بعد ایسا کٹے گا اور ایسے حصے ہوں گے کہ کوئی حصہ دوسرے سے جڑ نہیں سکے گا۔ جو بیٹی کا حصہ ہے وہ بیٹی کو ہی ملے گا کسی کی طاقت نہیں کہ بیٹے کے حصے سے اس کو جوڑ دے۔ جو جوڑنے کی ناجائز کوشش کرے گا وہ شرعی مجرم ہوگا۔ **دلیل ۹** :۔ زمانۂ جاہلیت میں نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے میراث تقسیم کرنے کا ایک ظالمانہ طریقہ رائج تھا وہ یہ کہ میت کا ترکہ نہ میت کے یتیم بچوں کو دیا جاتا نہ اس کی بیٹیوں کو بلکہ یہ سارا مال بیٹے لے لیتے یا میت کے حلیف اور وعدے والے جس سے فوت شدہ مرد اپنی زندگی میں میراث کا وعدہ کر لیتا وہ لے لیتے۔ یہ ایسا ظالمانہ رواج تھا کہ اس پر ایک کافر اور حریص و پیٹ پرست کو تو فخر ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی مومن رحم دل یتیم پرور درد مند اور اولاد والے کو یہ ظلم ہرگز پسند نہیں آ سکتا۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ نمبر ۴۵۷ پر ہے :۔ فَاِنَّ اَھْلَ الْجَاھِلِیَّۃِ کَانُوْا یَجْعَلُوْنَ جَمِیْعَ الْمِیْرَاثِ لِلذُّکُوْرِ دُوْنَ الْاِنَاثِ۔ (الخ)۔ ترجمہ :۔ بے شک دورِ جاہلیت والے کفار تمام میراث لڑکوں کو دے دیتے تھے اور بیٹیوں کو کچھ نہ دیتے تھے اس ظلم کو باری تعالیٰ نے ختم فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا۔ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ :۔ (ترجمہ) :۔ اے مسلمانو! تم کو اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے اور وصیت اس آخری اور اٹل حکم کو کہتے ہیں جو ایسا واجب ہو کہ اُس کو توڑا نہ جا سکے۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ نمبر ۱۵۳ پر ہے :۔ مَعْنٰی قَوْلِہٖ ھٰھُنَا یُوْصِیْکُمْ اَیْ یَفْرِضُ عَلَیْکُمْ لِاَنَّ الْوَصِیَّۃَ مِنَ اللّٰہِ اِیْجَابٌ :۔ (ترجمہ) :۔ یہاں یوصیکم کا معنٰی ہے کہ تم پر فرض کیا اس لیے کہ وصیت اللہ کی طرف سے گویا واجب کرنا ہوتا ہے اور چونکہ اللہ کے فرض کردہ حکم کے خلاف کرنا حرام ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بیٹیوں کو میراث نہ دینی حرام ہے کیا کرم ہے اس کریم کا جس نے مظلوم اور کمزور اولاد سے کیسا پیار فرمایا کہ جب والدین کو بھی اپنی بے بس بے کس اولاد کی پرواہ نہ تھی تو رب کائنات جو کروڑ ہا ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا اس نے اپنے حبیب پاک صاحب لولاک کے ذریعے دین اسلام کا ایسا عظیم الشان قانون عطا فرمایا۔ جس نے ہر شخص کے ہر قسم کے

علیحدہ علیحدہ حقوق مسلمانوں پر واجب و لازم فرما دیئے اور خود فرما دیا کہ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ اللہ وصیت فرماتا ہے۔ تم کو یہ آخری حکم ہے۔ اس میں تبدیلی ناممکن۔ یہ فرضی حکم صرف تمہاری اولاد کے بارے میں ہے اس کا بہت خیال رکھنا خبردار تمہارے مال کے جس طرح تمہارے بیٹے مستحق ہیں اسی طرح تمہاری بیٹیاں بھی حق دار ہیں۔ سب سے پہلے ان کو دو پھر ان سے بچے تو اوروں کو دے دو ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ۔ (ترجمہ):۔ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے گا اس لیے کہ مرد پر اخراجات اور ذمہ داریاں زیادہ ہیں مثلاً بال بچوں کا نفقہ وغیرہ۔ بیٹی پر یہ نہیں۔ اسلام نے میراث کو تین وجہوں پر تقسیم کیا۔ عـ۱ نسب کی وجہ سے عـ۲ نکاح کی وجہ سے عـ۳ ولاء کی وجہ سے مگر اب فی زمانہٖ حال صرف دو وجہ باقی ہیں عـ۱ نسب اور عـ۲ نکاح۔ ولاء یعنی لونڈی غلام کی میراث اب نہیں کیونکہ لونڈی غلام نہیں ہیں۔ پہلے تھے اس لیئے پہلے کے مفسرین نے تینوں کا ذکر فرمایا چنانچہ تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ نمبر ص۱۵۳ پر اور تفسیر خازن جلد دوم ص۲ پر ہے وَاَمَّا اَسْبَابُ الْاِرْثِ فَثَلٰثَۃٌ نَسَبٌ وَنِکَاحٌ وَوَلَآءٌ۔ (ترجمہ وہی ہے جو اوپر گذرا):۔ اور سب میں سب سے اہم اولاد یعنی بیٹا بیٹی جیسا کہ یُوْصِیْکُمْ سے ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قوانین وراثتِ اسلامیہ میں اولاد کا ذکر فرما کر زمانۂ جاہلیت کے رواجوں کو توڑا۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ مسلمان جو بیٹیوں کو میراث سے محروم کر کے پھر زمانۂ جاہلیت کے رواج کو پسند کر رہے ہیں صرف حرصِ دنیا کی خاطر اللہ رسول کو ناراض کر رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بھی دور ہو کوئی وقت اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ بیٹیوں کے حصے کوئی نہیں روک سکتا۔ رہا جہیز دینے کا سوال اور جہیز کا بہانہ تو یہ بہانہ چار وجہ سے غلط ہے پہلی یہ کہ جہیز صرف بیٹی کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں بیوی کے ساس سسر سالے اور خاوند کا بھی حصہ دیا جاتا ہے جیسا کہ رواج ہے۔ دوسری یہ کہ جہیز شریعت کے خلاف ہے بلکہ فی زمانہ ایک مصیبت بنی ہوئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز دیا تھا اس کی دو وجہ تھیں عـ۱ حضرت علی اتنے مفلس تھے کہ ان کے گھر میں کچھ بھی نہ تھا صرف گھر چلانے کے لیئے خاتون جنت چند برتن لے آئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز فاطمہ زہرا کے کسی اور بیٹی کو جہیز نہ دیا اس لیئے کہ ان کے خاوند حضرت عثمان بہت امیر تھے۔ عـ۲ یہ کہ نبی کریم علیہ التحیہ والثناء کی میراث نہ تھی کہ نبی علیہ السلام کا مال وقف ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر نبی کریم نے اپنی بیٹیوں مطہرات کو اپنی زندگی پاک میں دے دیا تو اس پر قیاس روا نہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ جہیز باپ نے دیا ہے نہ کہ بھائی نے وہ اپنی بیٹی کو اپنی زندگی میں جو چاہے دے بعد وفات بھائی کیا لگتا ہے کہ جہیز کے بدلے میں اس کی میراث چھین لے۔ چوتھی وجہ یہ کہ۔ بقانونِ شریعت برے رواج کو ختم کرنا چاہیئے نہ کہ اچھے اور شرعی فرض کو۔ جہیز برا رواج ہے اور میراث شرعی فرض

اگر تم میں ہمت اور توفیق ہے تو بری رسم یعنی کثرتِ جہیز کو بند کرواؤ۔ شریعت کے قانون کو کیوں توڑتے ہو یہ تو ظلمِ عظیم ہے جس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔ بہر حال۔ بیٹی کا حصہ ضرور ضرور دینا پڑے گا خواہ قانوناً خواہ شرعاً خواہ خوفِ خدا سے۔ یا مصالحت سے۔ اس کام کو نافذ کرنا فرض ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر نے صاف صاف فرما دیا۔ جلد دوم صفحہ ۲۱۶ پر ہے۔ فَالْمُرَادُ يَأْمُرُكُمْ وَيَفْرِضُ عَلَيْكُمْ :۔ (ترجمہ):۔ یعنی خدا کے حکم سے مراد ہے کہ تم پر میراث صحیح تقسیم کرنا فرض ہے۔ اور یہ حکم صرف چند لوگوں کے لیئے نہیں بلکہ تمام کائنات کے مسلمانوں کے لیئے ہے خواہ جہیز دیا ہو یا نہ دیا ہو۔ بیٹی چھوٹی ہو یا بڑی کنواری ہو یا صاحبِ اولاد غریب ہو۔ بیٹی یا امیر۔ میراث کا حصہ دینا پڑے گا۔ یہ ایک ربانی امتحان ہے۔ تفسیر ابن کثیر اوّل نے صفحہ نمبر ۴۵۷ پر فرمایا۔ لِأَنَّهُ يُبْتَلَى بِهِ النَّاسُ كُلُّهُمْ :۔ (ترجمہ):۔ علم میراث کا نام فرض اس لیئے رکھا گیا ہے کہ تمام مسلمان اس فرض میں مبتلا ہیں۔ اور سب کی پوچھ قیامت میں ہوگی کہ کس نے صحیح تقسیم کی اور کس نے وارثوں کے حصے خود کھائے۔ بہر حال قانونِ شریعت کے مطابق بیٹیوں کو لازمی وراثت کا حصہ دیا جائے گا۔ اور آپ کی بستی والوں کو جہیز جہیز کا بہانہ بنانا بے کار ہے۔ جہیز وراثت کا بدلہ نہیں بن سکتا۔ ان تمام دلائل سے مسئلہ با اہتمام واضح ہوگیا اب بھی اگر کوئی چوں چرا کرے تو شرعی مجرم ہوگا۔ اور مستحقِ عذابِ نار۔

آپ کا مسئولہ مسئلہ تقسیم اگرچہ یک طرفہ ہے مگر اس کا جواب پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ جواب حتمی فیصلہ نہیں ہے اس لیئے کہ صرف آپ کے بیان پر فتوٰے دیا جا رہا ہے۔ میراثی مسائل کے فتاوے یکطرفہ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اس میں صرف طریقۂ تقسیم کا سوال ہوتا ہے اور تقسیم کار تمام ورثا کی شرکت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں فریقِ ثانی ہوتا ہی کوئی نہیں۔ ہاں جن صورتوں میں سائل بحیثیت مدعی یا مستغیث ہو تو وہاں یکطرفہ فتوٰی حرام ہے۔ کہ اس میں مدعی علیہ یا مستغاث علیہ کی حق تلفی اور ظلم ہے۔ اسی طرح جب مفتی نے فتوٰے جج یا قاضی کو دینا ہو تو یک طرفہ فتوٰی صرف ایک بیان پر دینا جائز ہے۔ کیونکہ اب تفتیشِ حال کی ذمہ داری قاضی یا جج پر ہوگی مفتی کا کام صرف شرعی حکم بتانا ہوگا نہ کہ سنانا اور نافذ کرنا۔ لیکن جب مفتی فتوٰے سائل کو دے جیسا کہ آج کل ہم لوگ فتوٰی دیتے ہیں تو مفتی پر واجب ہے کہ سائل اگر مدعی یا مستغیث کی صورت میں ہے تو تفتیشِ حال خود مفتی کرے کیونکہ وہ فتوٰے عدالتِ قانونیہ میں گئے بغیر نافذ ہو جائے گا۔ اور احتمالِ یقینی ہے کہ دوسرے فریق کا بیان سنے بغیر جو فتوٰی نافذ ہوگا وہ ظلم ہوگا۔ فی زمانہ جو لوگ علماءِ کرام سے فتوے طلب کرتے ہیں وہ شریعت کا جج اور قاضی سمجھ کر طلب کرتے ہیں کہ محض مفتی اور فتوے کو شرعی فیصلہ قرار دیا جاتا ہے نہ کہ فقط فتوٰی اس لیئے میں کہتا ہوں کہ فی زمانہ مفتیِ اسلام کو قاضی بن کر خود تحقیق کرتے ہوئے دوسرے فریق کا بیان سن کر

فتوٰی لکھنا واجب ہے تاکہ فریقِ ثانی کو مفتی و فتوے پر طعن کا موقعہ نہ ملے۔ یہ فقہاءِ متقدمین فرماتے ہیں کہ مفتی کو فقط ایک شخص کے بیان پر فتوٰے دینا جائز ہے۔ وہ اُن کے اپنے زمانے کی بات ہے جب ملکوں میں اسلامی حکومتیں قائم تھیں اور مستفتی قاضی ہوتا تھا نہ کہ عام مدعی۔ آج کل یہ بات نہیں نہ قاضی رہے اور نہ جج مستفتی بنتے ہیں۔ عدالتیں کافرانہ قانون پر فیصلے کرتی ہیں۔ اس لیئے مفتی براسلام بدرجۂ قاضی ہیں خود ان پر دو طرفہ تفتیش واجب۔ لیکن جن صورتوں میں سائل محض سائل ہے نہ کہ مدعی وہاں تحقیق کے بغیر بھی فتوٰی جائز ہے۔ جیسے کہ مذکورہ فی السئوال وراثتی مسائل کہ وہاں صرف تقسیم کا طریقۂ شرعی ہی پوچھنا مقصود ہے ان وجوہ کی بنا پر آپ کو یک طرفہ فتوٰی دیا جارہا ہے۔ وراثتِ مسئولہ کی پہلی شکل میں۔ اگرچہ ان مسائل میں بھی حتمی فیصلے کے لیئے غیر جانبدار گواہی لینا ضروری ہے تاکہ کوئی وارث نہ رہ جائے فتوٰے لینے والے کا بیان جھوٹا ہونا ممکن ہے۔ سائل کے اس سوال کی تحریر کے مطابق طریقۂ تقسیم کچھ اس طرح ہے:۔

زید   زید   ۸

بیوہ ایک	بیٹی چار عدد	بیٹے تین عدد	سگا بھائی ایک
ایک حصہ	چار حصے	۶ حصے	محروم

یعنی فوت ہونے والے بھائی کی جائیداد سے آٹھواں اس کی بیوہ کو۔ پھر بقیہ جائیداد کے دس حصے کیئے جائیں گے اور اس طرح مسئلے کی تصحیح کرکے دو دو حصے تین بیٹوں کو اور ایک ایک حصہ چار بیٹیوں کو دیا جائے۔

دوسرا مسئلہ غیر واضح ہے نہ یہ بتایا کہ اس فوت شدہ بھائی کی بیوی پہلے مرگیا یا خاوند کے بعد یہ تو لفظِ بیوہ سے سمجھ آگیا خاوند پہلے فوت ہوا۔ نہ یہ پتا کہ دونوں بھائی اس مسئولہ مورث بھائی سے پہلے فوت ہوئے یا بعد۔ ہم اپنی سمجھ کے مطابق ان دونوں بھائیوں کو بعد میں فوت کرتے ہیں اور نہ یہ بتایا کہ یہ دونو سگے بھائی ہیں یا اخیافی یا علاتی۔ ہم اپنے رواج کے مطابق ان دونوں کو سگے بھائی لیتے ہیں پھر یہ بھی نہ بتایا کہ بیوہ کے اور دونوں بھائیوں کے کتنے وارث ہیں۔ اگر یہ سب بات واضح کردی جاتی تو یہ مناسخہ کا مسئلہ پورا حل کردیا جاتا۔ بہر حال اصل مسئلہ یعنی شقِ اوّل کا طریقۂ تقسیم بتایا جاتا ہے۔ نقشۂ وراثت اس طرح ہے:۔

بکر   ۱۶/۸

		دو بھائی	
ایک بیوہ	ایک بیٹی	ایک بھائی	۱ ایک بھائی
۲	۸	۳	۳

اس مسئلہ کو اوّلاً ثمن یعنی آٹھ سے تقسیم کیا گیا۔ بٹائی صحیح نہ ہونے کی بنا پر ثمن کو نسبت کے مخرج یعنی دُو سے ضرب دے کر سولہ سے تقسیم کیا تو آٹھواں یعنی دُو بیوہ کو آدھا حصہ یعنی آٹھ بیٹی کو ان ذی فرضوں سے بچے چھ حصّے۔ وہ دونوں عصبہ سببی بنفسہٖ سگے بھا ئیو کو آدھا آدھا یعنی تین۔ تین دے دیئے۔ اس طرح اس مسئلہ مناسخہ کی پہلی تقسیم ہوئی:۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ :۔

کتبہ

انبیائے کرام کسی مخلوق کے شاگرد نہیں ہوتے

سوال نمبر ۳۶: کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ کیا انبیاء کرام کسی غیر مخلوق کے شاگرد ہو سکتے ہیں۔ ایک تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ حضرت اشمویل علیہ السلام۔ بیت المقدس کے ایک عالم کے پاس توریت کا سبق لیتے رہے۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ نبی۔ غیر نبی کا شاگرد ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اب تک سنتے آئے ہیں۔ کہ انبیاءِ کرام صرف اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ وہیں سے تمام علوم سیکھ کر آتے ہیں۔ لہٰذا بڑی کرم نوازی ہے کہ آپ اس کا جواب عطا فرمائیں۔ بَیِّنُوْا وَ تُوْجَرُوْا ؕ

السائل:۔ صوفی عبدالغفور صاحب کیمبل پور:۔ مورخہ: ۱۹۶۷-۲-۱

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابْ ؕ

قانونِ الٰہیہ کے مطابق انبیاءِ کرام کا واحد گروہ اور جماعتِ مبارکہ ہی وہ ہے۔ جس کو رب کریم نے دنیا میں تمام مخلوق کو پڑھانے کے لیئے بھیجا ہے۔ ایسا دبیر ہے۔ کہ ان کے علوم سب مخلوق سے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جبرائیل و میکائیل علیہما السلام سے بھی زیادہ ہیں دنیا میں آج تک جتنے بھی علوم پیدا ہوئے یا قیامت تک پیدا ہوں گے۔ وہ سب علوم انبیاءِ کرام کے پاس ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی صنعت کاری سے لے کر منطق و فلسفہ موجودہ سائنس، علمِ فلکیات وغیرہ علومِ عقلیہ تک بے شمار علوم ظاہری ہیں۔ اُن کو بھی انبیاءِ کرام بخوبی سب کائنات سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ستر ہزار علوم ایسے ہیں۔ جو بجز انبیاءِ کرام کوئی نہیں جانتا۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ جس قوم کی طرف انبیاءِ کرام میں سے جس نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے اُسی علم کو ظاہر فرمایا جن کی وہاں ضرورت تھی۔ باقی علوم ظاہر نہ فرمائے۔ کہ ظہور کی حاجت نہ تھی مگر اس عدمِ ظہور سے نفی ثابت

نہیں ہوتی۔ کہ تجاربِ عدیدہ سے علومِ مخفی کا ثبوت ہے۔ یہ سب علوم کس نے سکھائے؟ سب رب تعالیٰ نے ہی سکھائے۔ چنانچہ حضرتِ آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ۚ (ترجمہ) اللہ کریم نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء یعنی علوم سکھا دیئے۔ حضرتِ آدم اول نبی ہیں:۔ باعتبارِ نبوت اصلِ انبیاء کرام ہیں۔ اور قاعدہ مشہور کے مطابق کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ۚ:۔ ہر شَے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ تو تمام انبیاء کرام علوم میں اپنی اصل کی حیثیت پر ہیں۔ جس سے یہی علوم سب میں لازم و ثابت ہوئے۔ پھر دنیا جہان کا قاعدہ ہے۔ کہ جس ڈگری سے جج یا مجسٹریٹ یا تھانیدار بنایا جاتا ہے۔ وہ ڈگری ہر جج مجسٹریٹ اور تھانیدار کو حاصل ہونی لازم ہے۔ پس جاننا چاہیئے۔ کہ حضرت آدم کو یہ علوم محض نبوت کے لیئے سکھائے گئے۔ نہ کہ انسانیت یا بشریت کی بنا پر۔ ثابت ہوا۔ کہ یہ علوم نبوت کی ڈگری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو بوجہ قاعدہ ہر نبی علیہ السلام کے لیئے یہ ڈگری درجۂ نبوت پر فائز ہونے کے لیئے لازم ہوا۔ اور یہ ڈگری کہاں سے ملتی ہے۔ صرف بارگاہِ ربُّ العزت سے۔ اسی لیئے فقہاء کرام فرماتے ہیں نبوت کسبی نہیں۔ بلکہ عطائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے حضرت سلیمان کے لیئے فرمایا:۔ وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ ۚ (ترجمہ):۔ ہم گروہ انبیاء کرام پرندوں کی بولی سکھائے گئے یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے صرف اپنا ذکر نہ فرمایا۔ بلکہ صیغۂ جمع متکلم سے پتہ لگا۔ کہ تمام انبیاء کرام کا ذکر ہے۔ اب غور کریکہ پرندوں کی بولیاں انبیاء کرام نے کس سے سیکھیں۔ دنیا میں کون سا مدرسہ ہے۔ جہاں یہ تعلیم ہوتی ہے۔ کون سکھائے بجز رب تعالیٰ کے سکھانے والا خود فرماتا ہے:۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ (ترجمہ):۔ اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا فرمایا۔ یہ کہنا۔ کہ معاذ اللہ! انبیاء کرام دنیا کے انسانوں سے پڑھتے اور علم سیکھتے ہیں ایسی ہی بدتمیزی کی بات ہے۔ جیسے کہ مولوی خلیل احمد انبیٹھوی وہابی نے اپنی کتاب براہین قاطعہ مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند ۱۳۵۵ھ کے صفحہ نمبر صـ۲۶ پر یہ ایسا جملہ خبیثہ لکھا۔ جس کا مفہوم ہے۔ کہ جب سے مدرسہ دیوبند بنا۔ نبی کریم نے اردو یہاں سے سیکھ لی۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا:۔ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ (ترجمہ):۔ اے میرے رب کریم بے شک تو نے مجھ کو سلطنت دی۔ اور باتوں کا انجام نکالنا سکھایا۔ یہاں بھی تعلیم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ صرف قانون اور معرفت کی تعلیم ہی نہیں۔ بلکہ دنیا کی تمام صنعت کاری بھی انبیاء کرام اپنے اللہ تعالیٰ سے سیکھ کر آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم سورتِ انبیاء آیت نمبر صـ۸۰ پارہ نمبر صـ۱۷ پر ہے:۔ وَعَلَّمْنٰہُ صَنْعَۃَ لَبُوْسٍ لَّکُمْ ۚ (ترجمہ):۔ اور ہم نے اُن کو اے لوگو تمہارے لیئے لباس کی کاریگری سکھائی۔ غرض کہ کسی کو طب کا علم کسی کو لکڑی کا کام خود اپنے پیارے نبیوں کو سکھایا۔ اور ایسے

مدرسے میں پڑھایا کہ کوئی انسان نہ جان سکا۔ تاکہ تمام کائنات انبیاء کے زیر رعب رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:۔ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (ترجمہ):۔ ہمارے یعقوب بہت علم والے تھے۔ کیونکہ ہم نے جو اُن کو سکھایا تھا۔ اور لیکن اکثر کو پتہ نہیں۔ آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو وہ سکھا دیا۔ جو تم نہ جانتے تھے۔ سورت رحمٰن میں فرمایا:۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ط خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ط (ترجمہ):۔ رحمٰن نے نبی کریم کو قرآن سکھایا۔ انسان کامل محمد مصطفےٰ کو پیدا فرمایا۔ پھر اسی وقت ان کو ساری کائنات کا بیان سکھا دیا۔ تمام مفکرین و مفسرین کے نزدیک یہاں لفظِ انسان سے مراد محمد صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ کیونکہ دیگر انسانوں اور مخلوق کو سکھانا انبیاء کرام کی ڈیوٹی ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورت جمعہ آیت نمبر ۲:۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط (ترجمہ) میرے نبی تمام مخلوق کے سامنے میری آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔ (صرف تعلیم کے لیے۔ اور اُن کو پاک فرماتے ہیں۔ اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں گویا کہ بتایا یہ جا رہا ہے۔ کہ ہم تو اپنے انبیاء کو سکھاتے ہیں۔ اور باقی مخلوق کو ہمارے نبی سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ مخلوق تو بے شمار ہے کسی نے کچھ سیکھنا ہے کسی نے کچھ۔ لیکن نبی ہر قوم میں ایک۔ بلکہ آقائے دو عالم تو ساری کائنات میں واحد نبی ہیں۔ اس لیئے اُن کو سارے ہی علوم و زبانیں سکھانی لازم ہیں۔ عقلاً بھی یہ بات تسلیم ہے۔ کیونکہ اگر کسی اسکول کالج میں مختلف کلاسیں بہت مضامین کی ہوں۔ اور استاد ایک ہی ہو۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ استاد اِس سارے کالج کے تمام علوم کا صرف ماہر ہی نہیں۔ بلکہ ہر ایک کو پڑھانے کا بھی سلیقہ رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا تعلیم گاہ تو عرش و فرش تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اِس درس گاہ کے معلم صرف انبیاء کرام ہیں۔ جو مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کو ہر قسم کی تعلیم دیتے رہے۔ خاص کر نبی کریم رؤف الرحیم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو قیامت تک ساری مخلوق کو پڑھانے کے لیئے تشریف لائے۔ تو اب ہر ذی عقل خود جان سکتا ہے۔ کہ انبیاء کرام اور نبی کریم کا علم کیسا ہوگا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بے شمار مقام پر اِس چیز کا ذکر فرمایا۔ کہ ہم نے اپنے نبیوں کو پڑھایا، سکھایا۔ مگر قرآن و حدیث میں ایک جگہ بھی ذکر نہیں۔ کہ کسی نبی نے کسی نبی یا غیر نبی مخلوق سے کچھ ذرہ بھر سیکھا ہو۔ یا پڑھا ہو۔ نہ کہیں ثابت۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ انبیاء کرام مخلوق سے سیکھ سکتے ہی نہیں۔ اس کی چند وجہیں ہیں:۔

پہلی وجہ:۔ عقلاً یہ چیز روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ کہ جس جگہ کسی شخص کو پڑھانے کے لیئے بھیجا جائے۔ وہاں پہنچ کر وہ پڑھتا نہیں۔ نہ وہ بے پڑھا جاہل ہوتا ہے۔ بلکہ کسی دوسرے مدرسے میں

پڑھ کر پڑھانے کا تجربہ سیکھ کر اُستادی کی سند حاصل کر کے پھر دوسرے مدرسے میں بطور استاد بھیجا جاتا ہے دنیا کی تعلیم گاہوں میں اُن کا نام مدرس، ماسٹر، پروفیسر وغیرہ ہوتا ہے۔ اور ان پڑھنے والی مخلوق ہوتی تھی اور یہ حضرات خدا کے علم پڑھاتے ہیں۔ لہٰذا ناممکن ہے۔ کہ جس مدرسے میں پڑھانے کے لیئے آئیں۔ تو بلا پڑھے آ جائیں۔ اور وہی پڑھنا شروع کر دیں۔ ایسا عقیدہ بنانا۔ مبعوث فرمانے والے اللہ تعالیٰ کی گستاخی ہے۔ اور ایک مذاق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ کریم نے مخلوق میں سب سے بڑا درجہ انبیاءِ کرام کا رکھا ہے۔ اور قانون شرعی کے مطابق دینی اور روحانی استاد کا درجہ بہر صورت شاگرد سے بڑا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فقہاءِ کرام کا فرمان ہے۔ کہ دینی استاد کا درجہ والد سے بھی زیادہ ہے۔ کہ والد اولاد کو عالمِ بالا سے عالمِ اسفل کی طرف لایا۔ لیکن استاد نے پھر اسفل سے اعلیٰ پر پہنچایا۔ اور اِس لیئے کہ استاد دینی۔ خواہ شریعت کا یا طریقت کا۔ اپنے شاگرد اور مُرید کا نبی کریم سے رشتہ جوڑتا ہے۔ اور وہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ باپ کا تعلق بعد وفات ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ کُلُّ سَبَبٍ وَّ نَسَبٍ يَنْقَطِعُ بِالْمَوْتِ اِلَّا سَبَبِيْ وَ نَسَبِيْ (شامی جلد اوّل باب غسلِ میت صفحہ نمبر ۸۰۳ پڑھے) ترجمہ:۔ قیامت میں تمام تعلق اور برادریاں ٹوٹ جائیں گی سوائے میرے تعلق اور رشتہ داری کے۔ اِسی لیئے بعض اولاد دینی لحاظ سے ماں باپ سے درجے میں عند اللہ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی شاگرد دینی اُستاد یا مرشدِ کامل سے درجے میں بڑھ نہیں سکتا۔ اگرچہ غوث و قطب ہو جائے۔ پس چونکہ شریعت کے اِس قانون سے شاگرد کا درجہ ہمیشہ اُستادِ روحانی سے چھوٹا ہی رہتا ہے۔ اور اُدھر اللہ کے نبی کا درجہ کسی مخلوق سے کم ہو نہیں سکتا اِس لیئے دنیا کی مخلوق میں کوئی شخص نبی کا استاد نہیں بن سکتا۔ تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ ہر علم کسی مقصد کے لیئے سیکھا جاتا ہے۔ استاد وہی ہو سکتا ہے جو شاگرد کے مقصد کو پورا کرے۔ حصولِ مقصد کے بغیر تعلیم و تعلّم بیکار بلکہ ناممکن۔ مثلاً ایک شخص قرآن کریم کی صرف ادائے لفظی سیکھنا چاہتا ہے۔ تو اُس کو ہر پڑھا لکھا آدمی یا امام مسجد پڑھا دے گا۔ اگر وہ علمِ تجوید سیکھنے کا خواہش مند ہے۔ تو ایک عام امام مسجد اُس کا اُستاد نہیں بن سکتا۔ بلکہ کوئی کامل قاری ہی استاد بن کر پڑھا سکتا ہے اور اگر ایک شخص اسی قرآن کریم سے علم شریعت سیکھنا چاہتا ہے۔ تو قاری بھی اُستاد نہیں بن سکتا۔ اگر کسی نے فلسفۂ قرآنی حاصل کرنا ہے۔ تو امام رازی جیسا یگانۂ روزگار ہی اُس کا استاد بن سکتا ہے۔ اگر کسی نے طریقت و معرفت کا حصول لینا ہے۔ تو عبد القادر جیلانی جیسے بزرگ ہی سکھا سکتے ہیں۔ تو پتہ لگا۔ کہ طالب معرفت کا ہر شخص استاد نہیں بن سکتا۔ قرآن مجید ایک ہی ہے۔ مگر مقصدِ حصول جداگانہ اس بنا پر ہر ایک اُستاد نہیں بن سکتا۔ تو مقامِ غور و تفکر ہے کہ انبیاءِ کرام کا مقصدِ علم کیا ہو گا۔ اور جب

طالبِ طریقت کے لیئے غوثِ اعظم جیسے اُستاد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ تو بتائیے۔ ایک نبی اللہ کی ضرورت کیا ہوگی۔ اور دنیا کا کون شخص اس کی ضرورت کو پُورا کر سکے گا۔ کس کی مجال ہے۔ کہ نبی کی استادی کا دم بھرے صحابہ کرام نے آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سیکھا۔ تو آج کائنات میں جن و ملک میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ سیکھنے والے صحابی نے کیا سیکھا اور سکھانے والے آقا صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا سکھایا۔ کسی کی ہمت نہیں۔ کہ اندازہ ہی کر سکے۔ جب ساری کائنات کا علم نبی کریم کے شاگرد (صحابی) کے برابر نہیں۔ تو بتائیے۔ کہ نبی کو کون شخص پڑھا سکتا ہے بس عقلِ سلیم والوں کو ماننا پڑے گا۔ شعر:۔

دنیا میں لکھے نہ پڑھے جناب والا شاگردِ رشیدِ حق تعالےٰ

شعر:۔ انبیاء دنیا میں آتے نہیں پڑھنے کے لیئے (کیونکہ)
وہ تو آتے ہیں زمانے کو پڑھانے کے لیئے

چوتھی وجہ:۔ دنیا کا قاعدہ ہے۔ کہ کسی پروفیسر، پرنسپل کا شاگرد، کسی اسکول ماسٹر کی شاگردی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس میں پروفیسر، پرنسپل کی بدنامی ہے۔ قانون اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی عام انسان کو بھی کسی ڈیوٹی پر بھیجنا ہوتا ہے تو پہلے اسکو کامل بناتے ہیں پھر اسکو بھیجتے ہیں لیکن اللہ جل شانہٗ اپنے انبیاء کرام کو اکمل ترین بنا کر مبعوث فرماتا ہے۔ اور ہر فن میں اکمل تر فرماتا ہے۔ اس لیئے کہ انبیاء کرام کو کائنات کی سرداری کا تاج بخشا جاتا ہے۔ کسی طرح کمی کیسے ہو سکتی ہے۔ دیکھو قومِ صالح پہاڑ کاٹنے اور سنگتراشی میں کامل تھے۔ تو اللہ کریم نے صالح علیہ السلام کو ایسا اکمل ترین بنا کر بھیجا۔ کہ انہوں نے پتھر سے زندہ اونٹنی نکال کر دکھا دی۔ قومِ نوح لکڑی کی اشیاء بنانے میں کامل تھی۔ تو نوح علیہ السلام کو ایسا اکمل بنا کر بھیجا۔ کہ دنیا میں بغیر کسی سے سیکھے۔ گیارہ منزلہ بحری جہاز بنا کر عقولِ البشری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ قومِ داؤد اوزار بنانے میں کامل تھی۔ تو اللہ جل شانہٗ نے داؤد علیہ السلام کو ایسا اکمل تر بنا کر بھیجا۔ کہ لوہے کو موم کر کے اقوامِ عالم کو حیران کر دیا۔ قومِ موسیٰ اپنے فن میں ماہر تھی۔ کہ رسیوں، بانسوں کو سانپ بنا سکتی تھی۔ مگر اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ جَلَّ جَلَالُہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسا اکمل تر بنا کر بھیجا۔ کہ انہوں نے ایسا سانپ بنا کر دکھایا۔ کہ جو ستر ہزار سانپوں کو کھا کر پھر ویسی ہی پتلی سی لاٹھی بن جائے۔ قومِ مسیح طب کے علاوہ کھلونا سازی میں کامل تھی۔ ربِ اکرم نے مسیح علیہ السلام کو ایسا اکمل تر بنا کر بھیجا۔ کہ مٹی کے پرندے اڑا کر بھی دکھا دیں۔ اھلِ عرب کو اپنے تکلم پر بڑا ناز اور افسانہ گوئی فصاحت و بلاغت میں کامل تھے۔ تو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایسا اکمل الاکملین بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے ایسا قرآن سنایا۔ کہ عرب کی فصاحت و بلاغت نے

دم توڑ دیا۔ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ خَیْرِ خَلْقِہٖ وَنُوْرِ عَرْشِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَبَائِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ ۔ دنیا میں کونسا ایسا مدرسہ ہے۔ جہاں یہ چیزیں سکھائی جاتی ہوں۔ پس ماننا پڑے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ہی پڑھ کر سیکھ کر انبیاء کرام دنیا میں تشریف لائے دنیا کے سب استاد صرف کامل بنا سکتے ہیں۔ اکمل تر بنانا رب کا ہی کام ہے۔ حضرت اشمویل علیہ السلام کا مذکورہ فی السوال واقعہ قطعاً غلط ہے۔ کسی تفسیر سے اشارۃً بھی یہ بات ثابت نہیں۔ کہ کسی نبی اکرم نے کچھ بھی کسی انسان یا جن، فرشتے سے سیکھا ہو۔ نہ ہی حضرت شمویل علیہ السلام کا بیت المقدس کے کسی عالم سے پڑھنا یا توریت سیکھنا ثابت۔ صرف اتنا واقعہ تفسیر جمل علی حاشیہ جلالین جلد اول صفحہ نمبر ۲۲۸ پر ہے۔ کہ:۔ فَلَمَّا کَبُرَ سَلَّمَتْہُ التَّوْرَاۃَ فِیْ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ وَکَفَّلَہُ الشَّیْخُ مِنْ عُلَمَائِھِمْ ۔ (ترجمہ) :۔ پس جب کہ اشمویل علیہ السلام کچھ بڑے ہوئے تو اُن کی والدہ محترمہ مکرمہ نے توریت شریف اُن کے سپرد کر دی۔ اور بیت المقدس کے علماء کرام میں سے ایک شیخ کی کفالت میں دے دیا۔ یہ تھی وہ عبارت جس سے سائل کو یا تو غلط فہمی ہوئی یا کسی وہابی دیوبندی نے فریب دیا۔ کیونکہ یہ بات اُن کے عقیدے والے سے ملتی جلتی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی مرزائی قادیانی نے چکر دیا ہو۔ اور ثابت کرنا چاہتا ہو۔ کہ انبیاء لوگوں سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ اُس کا مرزا غلام احمد بقول سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ایک ہندو ماسٹر سے پڑھتا رہا۔ بہت کند ذہن تھا۔ بہر حال یہ بات قطعاً غلط ہے۔ بادی النظر میں تو شاید کسی کا ذہن استادی، شاگردی کی طرف مائل ہو۔ لیکن بنظر عمیق غور کرنے سے اِس عبارت سے بھی تعلیم و تعلم کا ذرہ اشارہ نہیں ملتا۔ اس لیئے کہ اگر والدہ محترمہ کا مقصد پڑھانا ہوتا۔ تو اولاً اتنی بڑی کتاب نہ پکڑاتیں۔ بلکہ ابتدائی تعلیم میں چھوٹے بچوں کو قاعدہ پکڑایا جاتا ہے۔ پوری کتاب توریت شریف کا تھما دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ والدہ محترمہ کو ان کی لیاقت خداداد کا پتہ لگ گیا تھا۔ اور لفظِ سَلَّمَتْ بتا رہا ہے۔ کہ توریت شریف کو ان کی حفاظت و ضمانت میں دیا تھا۔ نہ کہ تعلیم کے لیئے :۔

باوجود اس بات کے کہ آج کل قرآن کریم کے بے شمار نسخے دستیاب ہیں۔ پھر بھی بوجہ ادب و احترام چھوٹے بچے کو نہیں پکڑایا جاتا۔ تو وہ زمانہ جب کہ ساری دنیا میں صرف چند ہی عدد میں توریت شریف موجود تھی۔ بھلا ایک عام بچے کو کس طرح دی جا سکتی تھی۔ پھر لفظِ کفالت، تعلیم پر دال نہیں۔ کیونکہ کفیل صرف دیکھ بھال کرنے والے اور منتظم کار کو کہا جاتا ہے۔ یعنی بیت المقدس کے ایک عامل عالم شیخ حضرت شمویل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خدمت گار، تربیت و پرورش کا انتظام کرنے کیلیئے مقرر ہوگئے۔ خلاصہ :۔ یہ کہ اس عبارت سے پڑھنا کہیں ثابت نہیں ہوتا۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

سجدۂ تلاوت کرنے اور اسکے واجب ہونے کا بیان اور سجدوں کی تعداد

سوال نمبر ۳۷:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ع۱ سجدۂ تلاوت فرض ہے یا سنت۔ ع۲ نماز کے علاوہ سجدۂ تلاوت کس طرح کیا جائے ع۳ نماز کے اندر مثلاً تراویح میں سجدۂ تلاوت کا طریقہ کیا ہے۔ اس دفعہ ۱۹۶۳ء مطابق ھجری ۱۳۸۲ھ کے ماہِ رمضان شریف میں زید حافظِ قرآن نے تین دفعہ اس طرح سجدے تلاوت کرایا کہ تراویح دو رکعت شروع کرنے سے پہلے اعلان کیا کہ پہلی رکعت میں سجدہ ہے مگر علیحدہ سجدہ نہیں کرایا جائے گا بلکہ سب حضرات رکوع میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کریں پھر امام حافظ مذکور نے سجدے کی آیت پڑھ کر اور چار آیتیں آگے پڑھکر رکوع کیا جس میں سب نے سجدے کی نیت کی تھی۔ تقریباً دو یا تین سجدے اسی طرح کرائے گئے پھر لوگوں نے شور مچایا کہ یہ غلط ہے کبھی کسی کو اس طرح کرتے نہ دیکھا۔ تب حافظ مذکور نے باقی سجدے مروجہ مشہور طریقے سے علیحدہ سجدے میں ہی کیئے اور کرائے۔ فرمایا جائے کیا یہ طریقہ صحیح ہے ع۴ سجدوں کی تعداد کتنی ہے۔ اور کس کس آیت اور پارے میں ہے۔ ع۵:۔ نماز کے علاوہ تلاوت میں سجدے کرنے کی اہمیت کیا ہے بہت سے لوگ خصوصاً عورتیں یا مسجد کے طلبا جو ختم شریف پڑھنے آتے ہیں اور پورا قرآن مجید برائے ایصالِ ثواب پڑھتے ہیں وہ سجدے نہیں کرتے۔ ہمارے ستیوں کے ایک مولوی احترام الحق تھانوی صاحب کراچی کے رہنے والے کہتے ہیں۔ سجدوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ سجدوں کے بغیر بھی تلاوت صحیح باعثِ ثواب ہے اور ایصالِ ثواب ہو جاتا ہے۔ ہمیں ان کی اس بات پر اعتماد نہیں لہٰذا مدلل طور پر صحیح مسئلے سے آگاہ فرمایا جائے۔ بَيِّنُوا تُوجَرُوا:۔ سائل محمد شرف الدین کراچی۔ سائل محمد ریاض شاہیوال ۶۳-۶-۱۲۔ سائل حافظ رحمت علی مقام مائی دی جھگی احاطہ ع۸۴ لائلپور ۶۸-۸-۶

نوٹ:۔ یہ استفتاء مختلف ماہ میں تین طرف سے وصول ہوا۔ کچھ تغیر لفظی سے ہم نے تینوں کو ایک جواب ارسال کیا اس لیئے ایک سوال پر تینوں سائلوں کا نام درج ہے:۔ (ادارہ):۔

الجواب بِعَونِ العَلّامِ الوَهّابِ

ع۱ :۔ سجدۂ تلاوت نہ فرض ہے نہ سنّت بلکہ واجب ہے ۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلداوّل صفحہ ۱۳۲ پرہے :۔ وَالسَّجْدَۃُ وَاجِبَۃٌ فِیْ ھٰذِہِ الْمَوَاضِعِ عَلَی التَّالِیْ وَالسَّامِعِ سَوَاءٌ قَصَدَ سَمَاعَ الْقُرْاٰنِ اَوْ لَمْ یَقْصُدْ :۔ (ترجمہ) :۔ ان مندرجہ ذیل مقام میں پڑھنے والے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے سننے والا سننے کا ارادہ کرے یا نہ کرے ۔ اور فتاوٰے درمختار میں ہے جلداوّل صفحہ نمبر ۱۱۵ باب سُجُوْدِ التِّلَاوَتِ یَجِبُ بِسَبَبِ تلاوتِ آیۃٍ ۔ ترجمہ :۔ تلاوت کے تمام سجدے ۔ آیت سجدہ کے تلاوت کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں ۔ ع۲ نماز کے علاوہ کسی بھی وقت سجدہ کی آیت تلاوت کرنے سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے ۔ مگر اُس کے ادا کرنے کیلئے ایسا وقت ہونا ضروری ہے جن وقتوں میں نوافل مکروہ نہیں ہوتے وہ پانچ وقت ہیں ع۱ طلوعِ آفتاب ع۲ غروب آفتاب ع۳ زوال آفتاب ع۴ بعد نمازِ عصر ع۵ بعد نمازِ فجر ۔ ان وقتوں میں اگر تلاوت کی تو سجدہ اس وقت نہ کرے ۔ بلکہ جب صحیح وقت آجائے تب سجدہ ادا کرے ۔ اور سجدہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کھڑا ہو جائے اور قبلہ رخ ہو کر اللہ اکبر کہتا ہوا سجدے میں گر جائے اور بالکل اُسی طرح سجدہ کرے جس طرح نماز کا سجدہ ہوتا ہے ۔ تین مرتبہ سجدے کی تسبیح پڑھے ۔ اس کے بعد یہ سجدے میں پڑے پڑے یہ دعا پڑھے :۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ ھٰذِہِ سَجْدَۃَ التِّلَاوَتِ ذُخْرًا فِیْ یَوْمِ الْقِیَامَتِ وَنُوْرًا عَلَی الصِّرَاطِ یَارَبِّ یَارَبِّ یَارَبِّ :۔ (ترجمہ) :۔ یا اللہ میرے اس سجدۂ تلاوت کو قیامت کیلئے ذخیرہ بنا اور پل صراط پر نور بنا ۔ اے میرے رب اے میرے رب ۔ سجدے تلاوت میں وہی شرطیں ہے جو سجدۂ نماز میں ہیں ۔ یعنی جسم پاک باوضو ۔ لباس پاک ۔ جگہ پاک ۔ طریقہ ادا سر سے پیر تک بہت احتیاط سے پیشانی بھی زمین سے لگے اور دونوں پیر کی انگلیاں بھی قبلہ رخ ہوں چارپائی اور نرم فوم یا گدے پر نہ یہ سجدہ جائز نہ سجدۂ تلاوت ۔ جب سجدے سے فارغ ہو تو اسی طرح اللہ اکبر کہکر کھڑا ہو جائے ۔ یہ ایک سجدہ مکمل ہوا نہ سلام پھیرے نہ ہاتھ باندھے نہ تشہد پڑھے ۔ کھڑے ہو کر سجدے کرنا مستحب ہے ۔ بیٹھ کر بھی کرسکتا ہے ۔ جو چیزیں نماز کو توڑتی ہیں وہی سجدۂ تلاوت کو توڑتی ہیں مثلاً بے وضو ہونا ۔ ناپاکی لگنا سجدے میں زور سے ہنسنا ۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلداوّل ص ۱۳۵ پر ہے :۔ وشرائطُ ھٰذِہِ السَّجْدَۃِ شَرَائِطُ الصَّلٰوۃِ اِلَّا التَّحْرِیْمَۃَ :۔ ترجمہ سجدۂ تلاوت کی تمام شرطیں وہی ہیں جو نماز کی ہیں سوائے ہاتھ اٹھاکر تحریمہ کہنے کے ۔ یعنی

سجدۂ تلاوت کے لیے نہ ہاتھ اٹھایا جائے نہ تکبیر تحریمہ کہی جائے۔ فتاوٰے عالمگیری نے مزید فرمایا کہ اگر گھوڑے پر بیٹھ کر تلاوتِ آیت سجدہ کی تو گھوڑے پر سجدہ جائز ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز نہیں کیونکہ سجدۂ تلاوت واجب ہے اور واجب نماز تو گھوڑے یا چلتی سواری پر جائز نہیں اسی طرح یہ واجب بھی زمین پر اتر کر کرنا پڑے گا۔ تاکہ قبلہ رخ درست رہے۔ نماز کے علاوہ سجدۂ تلاوت کسی بھی نماز کے اندر کرنا منع ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو نماز بھی ٹوٹ جائے گی۔ اور سجدہ بھی ادا نہ ہوگا۔ یعنی مستقل علیحدہ سجدۂ تلاوت کیا تو۔ لیکن اگر بیرونی سجدے کو نماز کے رکوع میں یا سجدے میں نیت کر لیا تو نماز نہ ٹوٹے گی۔ البتہ سجدہ بھی ادا نہ ہوگا۔ اسی طرح کتب فقہ میں ہے۔ نماز کے علاوہ تلاوت سے صرف اس پر سجدہ واجب ہوگا جو پڑھ رہا ہے یا سُن رہا ہے۔ پڑھنے والے کے لیے باہوش ہونا ضروری نہیں لہٰذا سوتے میں یا نشے میں یا عارضی بیہوشی یا عارضی جنون۔ یا آسیب زدہ کا بحالتِ جنات کی حاضری تلاوتِ آیت سجدہ کرنے سے سجدہ واجب ہو جائے گا۔ جب وہ درست حالت میں ہو یا جاگے تو اس کو بتایا جائے تو نے فلاں آیتِ سجدہ اُس حالت میں تلاوت کی تھی اب باوضو ہو کر سجدہ کرے لیکن سامع اگر گونگا بہرہ ہو یا مجنون مدہوش یا آسیب زدہ ہو تو اس پر سجدہ واجب نہ ہوگا۔ لیکن مقتدی اگرچہ گونگا ہو اس پر بھی امام کی تلاوت سے واجب ہوگا۔ ہاں مقتدی کی تلاوت سے کسی پر واجب نہ ہوگا۔ نہ خود پڑھنے والے پر نہ امام پر نہ دیگر مقتدیوں پر۔ اسی طرح فتاوٰے عالمگیری میں ہے۔ سجدے کی آیت ایسی آواز سے پڑھی کہ اپنے کان سُن لیں تب سجدہ واجب ہوگا۔ بشرطیکہ آیت کا آخری لفظ پڑھے۔ اگر ساری آیت پڑھی مگر آخری لفظ چھوڑ دیا تب بھی سجدہ واجب نہ ہوگا۔ اسی طرح صرف آیت لکھنے سے یا زبانی ہجے کرنے سے بھی سجدہ واجب نہ ہوگا۔ جتنا جلدی ہو سکے سجدے کرے موت کا پتہ نہیں ہوتا۔ مگر مجبوراً تاخیر بھی جائز ہے۔ ع۳ نماز کے اندر سجدے کی آیت تلاوت کرنے سے بھی سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی ادا کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ عام مشہور اور مروج ہے۔ اور تراویح میں یہی کرنا چاہیئے دوسرے دو طریقے بحالتِ مجبوری یعنی وقت کی کمی کی بنا پر جائز کیے گئے ہیں۔ اس لیے تراویح میں وہ طریقہ نہ اختیار کرنا چاہیئے۔ پہلا طریقۂ مشہورہ کہ جس رکعت میں جس وقت پوری آیتِ سجدہ تلاوت کر لی گئی اُسی وقت کھڑے ہو کر فوراً سجدے میں چلا جائے اور صرف سجدے کی تین تسبیح پڑھ کر پھر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو کر رکعت پوری کرے ایک دو آیت اور پڑھ کر پھر نماز کے رکوع سجدے میں نیت نہ کرے۔ نماز کے سجدے میں کوئی دعا وغیرہ نہ پڑھے ورنہ نماز ٹوٹ جائے گی۔ دوسرا طریقہ یہ کہ سجدے کی آیت تلاوت کر کے

فوراً رکوع میں چلا جائے اور سب مقتدی و امام اسی رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرلیں تو یہ رکوع اس وقت نماز کا رکوع اور تلاوت کا سجدہ شمار ہوگا۔ یعنی ایک کام سے دو فائدے حاصل کئے گئے تیسرا طریقہ یہ کہ آیتِ سجدہ کے تلاوت کرتے ہی نماز کا رکوع کرے پھر نماز کا سجدہ کرے اور پہلے سجدے میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرے۔ مگر یہ دونوں طریقے بحالتِ مجبوری ہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ کوئی شخص نماز فجر میں آیتِ سجدہ تلاوت کرے اور طلوعِ آفتاب بالکل قریب ہو سجدۂ تلاوت علیحدہ مستقل کرنے سے وقتِ نماز ختم ہونے کا اندیشہ ہو تو رکوعِ نماز یا سجدۂ نماز میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرنے کی اجازت دی گئی یہی دشواری نمازِ عصر میں غروبِ آفتاب سے یا بعد نمازِ عصر سورج پیلا ہونے کے قریب گذشتہ ایام کی نماز قضا کرتے وقت آیتِ سجدہ کے تلاوت ہوجانے سے پیش آسکتی ہے۔ ایک مجبوری سورتِ اقرأ میں بھی پیش آجاتی ہے۔ کہ سورتِ اقرأ کی آخری آیت میں سجدہ ہے۔ اس آیت کے لیے بھی نماز میں مستقل سجدہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مستقل سجدے کے لیے لازم ہے کہ پھر اُٹھ کر دو تین آیتیں پڑھ کر پھر نماز کا رکوع سجدہ کرے مگر یہاں نہیں ہوسکتا کیونکہ سورت ختم ہوگئی لہٰذا اس سجدے میں بامرِ مجبوری دوسرا اور تیسرا طریقہ ہی اپنایا جائے گا۔ یعنی رکوعِ نماز یا سجدۂ نماز میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرنی پڑے گی۔ اگرچہ سورۂ اعراف و سورہ نجم کی آخری آیت سجدہ ہے مگر یہ بڑی سورتیں ہیں اُن کے ساتھ دوسری سورت پڑھی جاتی ہے۔ مگر اِقرأ چھوٹی ہے ایک رکعت میں ایک ہی پڑھی جاتی ہے۔ پس حفاظ حضرات کو چاہیئے کہ تراویح میں تیرہ سجدے پہلے مشہور طریقے پر کریں اور آخری سجدہ دوسرے یا تیسرے طریقے سے کریں۔ لیکن مذکورہ فی السوال حافظ امام نے جو طریقہ اختیار کیا وہ قطعاً غلط ہے۔ کہ اس نے آیتِ سجدہ تلاوت کرکے فوراً رکوع نہ کیا بلکہ چند آیات اور پڑھ کر پھر نماز کا رکوع کیا اور اس میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرلی۔ اس طرح مذکورہ فی السوال یہ تینوں سجدے ہرگز ہرگز ادا نہ ہوئے۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اول ص۱۳۳ پر ہے:۔ وَاِنْ قَرَأَ آيَةَ السَّجْدَةِ فِي الصَّلٰوةِ فَاِنْ كَانَتْ فِيْ وَسْطِ السُّوْرَةِ فَالْاَفْضَلُ اَنْ يَسْجُدَ ثُمَّ يَقُوْمَ وَيَخْتِمَ السُّوْرَةَ وَيَرْكَعَ وَلَوْ لَمْ يَسْجُدْ وَرَكَعَ وَنَوَى السَّجْدَةَ يُجْزِيْهِ قِيَاسًا وَبِهٖ نَاْخُذُ وَلَوْ لَمْ يَرْكَعْ وَلَمْ يَسْجُدْ وَاَتَمَّ السُّوْرَةَ ثُمَّ رَكَعَ وَنَوَى السَّجْدَةَ لَا يُجْزِيْهِ وَلَا يَسْقُطُ عَنْهُ بِالرُّكُوْعِ وَعَلَيْهِ قَضَاؤُهَا بِالسُّجُوْدِ مَا دَامَ فِي الصَّلٰوةِ (ترجمہ):۔ نماز کے سجدۂ تلاوت کے لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً مستقل سجدہ کرے پھر کھڑا ہوکر ایک دو آیت پڑھ کر پھر رکوعِ نماز کرے اگر فوراً آیت سجدہ کے بعد رکوع کیا اور اس میں ہی نیت سجدہ کرلیا تب بھی جائز ہے۔ لیکن اگر سجدے کی آیت کے بعد فوراً سجدہ یا رکوع نہ کیا پھر چند آیات

پڑھکر پھر رکوعِ نماز میں ہی نیت سجدہ کر لیا تو یہ ناجائز ہے سجدۂ تلاوت نہ ہوگا۔ بلکہ جب تک اسی نماز میں ہے مستقل سجدہ کر کے سجدۂ تلاوت کی قضا کرے اور اس قضا کا گناہ بھی پڑے گا۔ چنانچہ اسی فتاوٰی کے صـ۱۳۵ پر ہے:۔ اَمَّا الصَّلٰوتِیَّۃُ اِذَا اَخَّرَھَا حَتّٰی طَالَتِ الْقِرَاءَۃُ تَصِیْرُ قَضَاءً وَیَاثِمُ۔ ترجمہ:۔ اگر بحالتِ نماز سجدہ کی آیت پڑھ کر فوراً کسی طرح سجدہ ادا نہ کیا اور قرأت لمبی کر دی تو سجدہ قضا ہو جائے گا۔ اور نمازی گناہ گار ہوگا۔ اگرچہ نماز میں ہی قضا کرے لیکن موجودہ سورت میں تو زید نے جو سجدہ سمجھا وہ ہوا ہی نہیں اور سب نمازی بے سجدہ رہ گئے۔ سب پر گناہ ہوا سب توبہ کریں۔ کیونکہ نماز ختم ہو گئی قضا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم صـ۱۲۲ پر ہے کہ افضلیت مستقل سجدہ کرنے میں ہے باقی دو طریقے یعنی نماز کے رکوع سجود میں نیت کر لینی تو مندرجہ مجبوریوں کے تحت جائز کیے گئے ہیں۔ اور اسی بحر الرائق کے صـ۱۱۹ پر ہے:۔ اِذَا تَلٰی اٰیَۃَ السَّجْدَۃِ وَلَمْ یَسْجُدْ وَلَمْ یَرْکَعْ حَتّٰی طَالَتِ الْقِرَاءَۃُ ثُمَّ رَکَعَ وَنَوَی السَّجْدَۃَ لَمْ تَجُزْ چنانچہ فتاوٰے درمختار علی شامی جلد اوّل صـ۷۲۲ پر ہے:۔ وَلَوْ تَلَاھَا فِی الصَّلٰوۃِ سَجَدَھَا فِیْھَا لَاخَارِجَھَا لِمَا مَرَّ۔ وَاِذَا لَمْ یَسْجُدْ اَثِمَ فَتَلْزِمُہُ التَّوْبَۃُ:۔ اس کی شرح فتاوٰے شامی کے اسی صفحہ پر یہی لکھا ہے:۔ (ترجمہ):۔ اور اگر آیت سجدہ نماز میں پڑھی تو سجدہ بھی نماز میں ہی کر سکتا ہے۔ بعد نماز نہیں کر سکتا۔ اگر نمازیوں نے سجدہ نہ کیا تو گناہ گار ہوئے سچی توبہ کرنی لازم ہے۔ اور فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم صـ۱۲۲ پر ہے:۔ اِذَا لَمْ یَسْجُدْ فِی الصَّلٰوۃِ حَتّٰی فَرَغَ فَاتَتْہُ یَاثِمُ لِاَنَّہٗ لَمْ یُؤَدِّ الْوَاجِبَ وَلَمْ یُمْکِنْ قَضَاؤُھَا لِمَا ذَکَرْنَا وَھٰذَا مِنَ الْوَاجِبَاتِ الَّذِیْ اِذَا فَاتَ وَقْتُہٗ تَقَرَّرَ الْاِثْمُ عَلَی الْمُکَلَّفِ وَالْمُخْرِجُ لَہٗ عَنْہُ التَّوْبَۃُ کَسَائِرِ الذُّنُوْبِ:۔ ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزرا۔ اور توبہ کا طریقہ کتبِ تصوف میں اس طرح لکھا ہے۔ کہ سب گنہگار مجرم ایک جگہ باوضو نفل دو رکعت پڑھیں اور بتوسطِ آقا صلی اللہ علیہ وسلم رب کریم کی بارگاہ میں توبہ کریں اور معافی مانگیں گناہ کا نام بھی لیں۔ اگر گناہ مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ بڑا رحیم وکریم ہے۔ آئندہ کے لیے ایسی خلافِ شرع حرکت نہیں ہونی چاہیئے۔ بہر حال زید مذکور نے اپنی نادانی سے سب نمازیوں کو گناہ میں مبتلا کر دیا اور خود زیادہ مجرم بنا۔ ان عبارات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے اندر تو سجدۂ تلاوت فوراً کرنا چاہیئے۔ ایک آیت بھی دیر لگے تو قضاء مگر نماز کے علاوہ جب بھی ادا کرے گا ادا ہی ہوگا قضا نہ ہوگا اگرچہ دیر منع ہے۔ چنانچہ فتاوٰے ہندیہ جلد اوّل صـ۱۳۵ پر ہے:۔ وَاَدَاؤُھَا لَیْسَ عَلَی الْفَوْرِ حَتّٰی لَوْ اَدَّاھَا فِیْ اَیِّ وَقْتٍ کَانَ۔ یَکُوْنُ

مُوَدِّیًا لاَ قَامِیًا۔ (ترجمہ وہی ہے جو اوپر گذرا) بحالتِ رکوع یا سجدۂ نماز میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب مقتدیوں کو پہلے بتا دیا جائے تاکہ وہ بھی نیت قائم کر لیں بخلاف مستقل سجدے کے کہ اس میں اگر پہلے نہ بھی بتایا گیا تو رواجی طور پر ہر نمازی فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ سجدۂ تلاوت ہے۔ اگرچہ بتا دینا پھر بھی بہتر ہے تاکہ نابینا لوگوں کو دھوکہ نہ لگے اور حسبِ عادت رکوع میں ہی نہ اٹک جائیں جب کہ باقی سب سجدے میں ہوں۔ ع۴ تلاوت کے سجدے تین ائمہ مجتہدین امام اعظم امام شافعی امام احمد حنبل کے نزدیک چودہ ۱۴ ہیں یہاں ہم پارے اور سورتوں کے نشان بتاتے ہیں۔ اور آیت کا صرف نمبر بتایا جائے گا۔ آیت کی عبارت نہ لکھی جائے گی تاکہ فتویٰ پڑھنے والے کو سجدہ نہ پڑے:۔ پہلا سجدہ پارہ ع۹ سورت اَلْاَعْرَاف آیت نمبر ع۲۰۶ دوسرا سجدہ پارہ ع۱۳ سورۃ رعد آیت ع۱۵ تیسرا سجدہ پارہ ع۱۴ سورۃ نحل آیت ع۵۰ چوتھا سجدہ پارہ ع۱۵ سورۃ اَلْاَسْرَاء آیت ع۱۰۹ پانچواں سجدہ پارہ ع۱۶ سورۃ مریم آیت ع۵۸ چھٹا سجدہ پارہ ع۱۷ سورۃ حج آیت ع۱۸ ساتواں سجدہ پارہ ع۱۹ سورۃ فرقان آیت ع۶۰ آٹھواں سجدہ پارہ ع۱۹ سورۃ نمل آیت ع۲۶ نواں سجدہ پارہ ع۲۱ سورۃ سجدہ آیت ع۱۵ دسواں سجدہ پارہ ع۲۳ سورۃ ص آیت ع۲۴:۔ گیارھواں سجدہ پارہ ع۲۴ سورۃ حٰم آیت ع۳۸ بارھواں سجدہ پارہ ع۲۷ سورۃ نجم آیت ع۶۲ تیرھواں سجدہ پارہ ع۳۰ سورت انشقاق آیت ع۲۱ چودھواں سجدہ پارہ ع۳۰ سورۃ اِقْرَاء آیت ع۱۹ یہ تھے قرآن مجید کے وہ چودہ سجدے جن کی آیتیں تعداد میں تین اماموں کا اتفاق ہے۔ مگر امام مالک فرماتے ہیں کہ سجدے صرف گیارہ عدد ہیں۔ امام شافعی اور ہمارا اس بات میں اختلاف ہے کہ ہمارے نزدیک سورۃ حج میں ایک سجدہ اور سورۃ صٓ میں ایک سجدہ۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ سورہ صٓ میں کوئی سجدۂ تلاوت نہیں بلکہ داؤد علیہ السلام کا سجدۂ شکر ہے۔ اور سورہ حج میں دو سجدے ہیں ہمارا قول ہے کہ یہ سجدۂ صٓ حضرت داؤد کے لیئے شکر تھا مگر ہمارے لیئے واجب ہے دوسرا اختلاف ائمہ کا یہ ہے کہ تمام سجود تلاوت واجب ہیں یا سنت۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ تمام سجدے واجب ہیں۔ ہمارا مسلک تو فتاویٰ شامی جلد اوّل ص۵۱۷ فتاوٰے بحرالرائق جلد دوم ص۱۱۹ فتاوٰے فتح القدیر جلد اوّل ص۳۸۲ سے ظاہر ہے امام احمد کا مسلک مُغْنِی لِابْنِ قُدَامَہ جلد اوّل ص۴۴۵ پر اسی طرح درج ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ امام احمد شافعی مالک علیہم الرحمۃ یہ سب بزرگ سجودِ تلاوت کو سنت مانتے ہیں جیسا کہ ان کی کتب میں لکھا ہے۔ چنانچہ بلغۃ السالک مالکی فقہ جلد اوّل ص۱۴۰ اور شافعی فقہ مُغنی المحتاج جلد اوّل ص۲۱۴ پر ایسا ہی ہے

بہر حال شافعی یا مالکی حنبلی ہوں یا کوئی اور دلائل و مسائل میں امام اعظم کے شاگردوں کے برابر بھی نہیں بعد کے غیر مقلد وہابی مرف امام اعظم کی گستاخی کرنا ہی جانتے ہیں۔ اور گستاخی کرتے ہوئے امام اعظم کو صاحب الرائے کہتے ہیں۔ امام اعظم سے زیادہ نہ امام شافعی کو حدیث آتی ہے نہ امام مالک و امام حنبل کو۔ یہ سب تینوں ائمہ امام اعظم کے بالواسطہ یا بلاواسطہ حدیث و فقہ میں شاگرد ہیں۔ سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے پر امام اعظم کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:۔

پہلی دلیل:۔ قرآنِ مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے سورۂ انشقاق آیت ۲۱:۔ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ۔ (ترجمہ):۔ اور جب اُن کے سامنے قرآن مجید پڑھا جائے تو سجدہ نہیں کرتے۔ اِس آیت سے ثابت ہوا کہ آیاتِ سجدہ کے تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ سجدہ نہ کرنا کفار کی نشانی بتایا گیا کیونکہ یہاں ذکر کفار کا ہے لہٰذا یہ وجوب سجدہ کے بارے میں تاویلاً اقتضاء النص سے اور اقتضاء النص دلیل ظنی ہوتی ہے۔ یہ آیت وجوب سجدۂ تلاوت کے حق میں قطعی الثبوت ظنی الدلالت ہے۔ اور ایسی دلیل سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ نہ کہ فرض یا سنت چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اوّل صہ ۸۷ پر ہے:۔ اَلثَّانِیْ قَطْعِیُّ الثُّبُوْتِ ظَنِّیُّ الدَّلَالَةِ كَالْاٰيَاتِ الْمُؤَوَّلَةِ (الخ) وَبِالثَّانِیْ وَالثَّالِثِ الْوَاجِبُ وَكَرَاهَةُ التَّحْرِيْمِ:۔ (ترجمہ):۔ جن کلمات طیبات کا ثبوت قطعی ہو لیکن کسی خاص مسئلہ پر دلالت ظنی ہو۔ جیسے تاویل کی گئی آیات وہ دوسری قسم کی دلیل ہیں اُن سے کرنے والے اعمال میں واجب کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور نہ کرنے والے کاموں کو مکروہ تحریمی بنا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی اِس آیت نے سجدۂ تلاوت کو واجب بنا دیا۔ دوسری دلیل:۔ اِس آیت پاک میں کفار کی نشانی بتائی گئی ہے کہ وہ آیات کی تلاوت کے وقت سجدہ نہیں کرتے اور مسلمانوں کو کفار کی مخالفت ہر طرح کرنی واجب ہے چنانچہ فقہ اسلامی کی مشہور کتاب فتاویٰ فتح القدیر جلد اوّل صہ ۳۸۲ پر اور فتاویٰ بحر الرائق جلد دوم صہ ۱۱۹ پر باب سجدۂ تلاوت میں ہے۔ وَمُخَالِفَةُ الْكَفَرَةِ وَاجِبٌ ترجمہ آیات سجدہ میں بہت جگہ کفار کے سجدہ نہ کرنے کا ذکر ہے اور بہت آیات میں انبیاء کرام کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو انبیاء کرام کی متابعت اور کفار کی مخالفت واجب ہے۔ سجدے میں متابعت اور مخالفت کیا ہے؟ یہی کہ سجدہ کیا جانا واجب ہو:۔

تیسری دلیل:۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے:۔ وَاَخْرَجَ اِبْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ فِیْ مُصَنَّفِهٖ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ اَلسَّجْدَةُ

عَلٰی مَنْ سَمِعَهَا وَعَلٰی مَنْ تَلَاهَا۔ دوسری حدیث شریف بخاری شریف میں تعلیقاً ہے:۔
اَخْرَجَهٗ عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ اِبْنِ الْمُسَيِّبِ اَنَّ عُثْمَانَ مَرَّ
بِقَاصٍ فَقَرَءَ سَجْدَةً لِيَسْجُدَ مَعَهٗ عُثْمَانُ فَقَالَ عُثْمَانُ اِنَّمَا السُّجُوْدُ عَلٰی مَنِ اسْتَمَعَ (ترجمہ)
فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سجدۂ تلاوت واجب ہے سجدے کی آیت پڑھنے والے
اور سننے والے پر ۔ ۲ بخاری شریف میں تعلیقاً روایت ہے کہ عثمان غنی نے بھی یہی فرمایا کہ سننے
والے پر بھی سجدہ لازم ہے ۔ اس حدیث پاک میں لفظِ علیٰ آیا ہے ۔ جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے
چنانچہ شرح عنایہ جلد اوّل صـ ۳۸۲ پر ہے :۔ وَعَلٰی کَلِمَةُ اِیْجَابٍ ۔ (ترجمہ) :۔ اور
حرف علیٰ واجب کو ثابت کرنے والا ہے ۔ فتح القدیر جلد اوّل صـ ۳۸۲ پر ہے ۔ یعنی لفظِ علیٰ
مِنْ صِیَغِ الْاِلْزَامِ ۔ (ترجمہ) :۔ علیٰ کا حرف لزوم پیدا کرتا ہے ۔ قرآن و حدیث کے ان تمام
دلائل سے بہت مضبوط طریقے سے ثابت ہوا کہ تلاوت کے تمام سجدے واجب ہیں ۔ ہماری
پیش کردہ یہ روایتیں خبر واحد ہیں اور خبر واحد سے بھی وجوب ثابت ہوتا ہے دیکھو فتاوٰے
شامی جلد اوّل صـ ۸۷ حنبلی مالکی شافعی حضرات کے پاس صرف ایک دلیل ہے جس سے وہ
سجدوں کو سنّت کہہ دیتے ہیں ۔ چنانچہ فقہ شافعی مغنی المحتاج جلد اوّل صـ ۲۱۴ پر ہے :۔ وَلِقَوْلِ
اِبْنِ عُمَرَ ۔ اُمِرْنَا بِالسُّجُوْدِ یَعْنِیْ لِلتِّلَاوَةِ فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ اَصَابَ وَمَنْ لَّمْ یَسْجُدْ فَلَا
اِثْمَ عَلَیْهِ ۔ (ترجمہ) :۔ ابن عمر رض کا قول ہے کہ ہم مسلمان تلاوت کے سجدوں کا حکم دیئے گئے
تو جو شخص سجدہ کرے وہ درست ہے اور جو شخص سجدہ نہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں ۔ یہ تمھی مخالفوں کی
دلیل مگر یہ دلیل چار وجہ سے ناقابل قبول ہے ۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ روایت بے سند ہے ۔ لہٰذا مجہول ہے اور مجہول روایت
قابلِ قبول نہیں ہوتی ۔ جو روایت ہم نے پیش کی ہے اُس کی مضبوط سند ساتھ موجود ہے ۔ دوسری وجہ یہ کہ اس
روایت کے الفاظ بھی مخالف کا منشا پورا نہیں کرتے ۔ کیونکہ اس میں پہلے ہے اُمِرْنَا (ہم حکم دیئے گئے) اور حکم
بلا قرینہ وجوب کو ہی ثابت کرتا ہے ۔ پھر کہا گیا فَقَدْ اَصَابَ (اس نے درست کیا) یہاں ثواب کا ذکر نہیں ۔ صرف
درستی کا ذکر ہے ۔ حالانکہ سنّت پر ثواب ہوتا ہے صرف درستی نہیں ۔ درستی تو عام کام میں جائز ہوتی ہے
پھر اسی میں ہے فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ اُس پر گناہ نہیں ۔ حالانکہ ترکِ سنّت پر گناہ ہے ۔ تیسری وجہ اس روایت
کو اگر درست بھی مانا جائے ۔ تب بھی اس سے سنّت ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ مستحب ہونا ثابت ہو رہا ہے
کیونکہ یہ ابن عمر کا اپنا قول ہے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمان سے سنیت ثابت ہوتی ہے ۔ چوتھی وجہ یہ کہ
اگر سنت بھی ثابت ہو جائے تو لازماً سنتِ مؤکدہ ہی ثابت ہوگی کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تمام آیاتِ

سجدہ میں نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات تلاوت کی ہوں۔ اور سجدہ نہ کیا ہو۔ جب کہ یہ سجدہ نہ کرنا علامتِ کفر ہے۔ تو جس جس آیت کا سجدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کیا وہ مؤکدہ ہوگی اور مؤکدہ کا ترک بھی گناہ ہے حالانکہ مخالف کی دلیل میں لا اِثْمَ ہے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ پیش کردہ مخالفین کی دلیل بہت ہی کمزور ہے۔ اور سجدۂ تلاوت واجب ہی ہے۔ سائل کے پانچویں سوال کا جواب۔ مولوی احترام الحق تھانوی وہابی ہے ان کی کوئی بات سننے کے قابل نہیں ہوتی یہ لوگ تو ایصالِ ثواب کے ہی منکر ہیں اب اِن کو ایصال ثواب کی کیا فکر پڑ گئی جو تلاوت کے سجدوں کی اہمیت کو ختم کر رہے ہیں۔ خیال رہے کہ ایصالِ ثواب صرف مستحب ہے ضروری نہیں بلکہ قرونِ اُولیٰ میں اِس کو کبھی بھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی کے اب ایک رواج لازمی بن گیا ہے۔ اسی رواج نے تلاوت کے اصل مقصد کو ختم کر دیا۔ اسی رواج سے امیر لوگوں نے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود تلاوت کرنا ہی چھوڑ دی۔ بس دینی مدرسوں کے طلبا کو بلایا اور کچھ روپے دیئے قرآن مجید پڑھوالیا ایصالِ ثواب کرا دیا۔ حالانکہ شرعاً ایسی آرام طلبی اور تجارت قطعاً ناجائز ہے۔ موجودہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن مجید صرف مُردوں کو بخشنے کے لیے ہے۔ خود پڑھو نہ پڑھو۔ عمل کرو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان فاسد خیالات سے بچائے۔ ایصالِ ثواب نہ فرض ہے نہ واجب نہ سنت مگر سجدۂ تلاوت واجب جیسا کہ ہم نے دلائل کثیرہ سے ثابت کر دیا۔ اور یہ مسئلہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ عبادت میں واجب رہ جائے تو عبادت ناقص ہوتی ہے دیکھو کتب فقہ بابُ الکراہت۔ باب السہو وغیرہ۔ تلاوت عبادت ہے اُسکے سجدے تلاوت کے واجب ہیں۔ جب سجدۂ تلاوت ادا نہ ہوگا اس محفل کی تلاوت ناقص ہوگی اور ناقص عبادت کا ایصالِ ثواب بہتر نہیں۔ ترکِ واجب گناہ ہے چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اوّل ص۳۰۸ پر ہے۔ وَاِنْ لَمْ یَکُنْ مُؤَوِّلًا وَلَا مُسْتَخِفًّا یَفْسُقُ لِخُرُوْجِہٖ عَنِ الطَّاعَۃِ بِتَرْکِ مَا وَجَبَ عَلَیْہِ۔ ترجمہ:۔ اگر کوئی شخص نہ تو واجب میں تاویل کرسکتا ہو نہ واجب کو بیکار اور ہلکا سمجھنے والا ہو صرف سُستی غفلت سے واجب کام چھوڑ دے تو وہ سخت گناہ گار ہوگا اس لیئے کہ وہ اطاعتِ شریعت سے نکل گیا واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے۔ یہی وجہ ہے کہ اندرونِ نماز سجدۂ تلاوت کی تاخیر متفقاً مکروہ تحریمی ہے۔ اور علاوہ نماز کا سجدۂ تلاوت بلا عذر دیر کرنا اکثر فقہاءِ کرام کے نزدیک مکروہ ہے۔ چنانچہ فتاویٰ بحرالرائق جلد دوم ص۱۱۹ پر اور طحطاوی شریف ص۲۶۱ پر ہے:۔

وَلٰکِنْ کُرِہَ تَاخِیْرُ السُّجُوْدِ عَنْ وَقْتِ التِّلَاوَۃِ فِی الْاَصَحِّ اِنْ لَمْ یَکُنْ مَکْرُوْھًا لِاَنَّہٗ بِطُوْلِ الزَّمَانِ قَدْ یَنْسَاھَا فَیُکْرَہُ تَاخِیْرُھَا

ترجمہ:۔ صحیح مذہب یہ ہے کہ اگر تلاوت مکروہ وقت نہ ہو تو تلاوت کرکے سجدے میں دیر لگانا سخت مکروہ ہے۔ اس لیئے کہ دیر لگنے سے وہ بھول بھی سکتا ہے۔ اور واجب کا بھول کر چھوڑ دینا سخت گناہ ہے خاص کر ان غفلتوں کے زمانے میں اور دین سے بے رغبتی کے دور میں لہٰذا یہ حکم لگانا اشد ضروری ہے کہ تلاوت کے بعد فوراً سجدے کرو۔ اور سجدوں کے بعد ایصالِ ثواب کرو۔ سجدوں سے پہلے ایصالِ ثواب جائز نہیں۔

جو ایصالِ ثواب کو سجدوں سے زیادہ اہمیت دے وہ فاسق اور گمراہ ہے غور تو کرو کہ جس نے ثواب عطا کرنا ہے اسی کے وجوبی حکم کی تم پرواہ نہیں کرتے تو ثواب پہنچے گا کس طرح۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ تاخیرِ سجدۂ تلاوت آخر عمر تک جائز ہے۔ مگر یہ قول غلط اور غیر مفتیٰ بہ ہے وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔
کتبہ

قریب قیامت قرآن مجید اٹھائے جانے کا بیان

سوال ۳۸: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل ذیل میں، کہ قرآن مجید کس طرح اٹھایا جائے گا۔ اور کیا کوئی حدیث اس بارے میں ہے تو اُس کے الفاظ نقل فرمادیں معہ حوالہ کتب۔ فقط والسلام

نور محمد سکنہ ٹنڈو الہیار حیدر آباد سندھ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

اَلْجَوَاب

قریب قیامت ملک شام کی طرف سے سرخ آندھی چلے گی، جہاں جہاں وہ ہوا پہنچے گی، وہاں وہاں قرآن مجید کے ورقوں سے الفاظ ختم ہو جائیں گے چنانچہ حدیث پاک میں ہے: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یُطْرَقُ النَّاسُ رِیْحٌ حَمْرَاءُ یَعْنِیْ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ مِنْ قِبَلِ الشَّامِ فَلَا یَبْقٰی فِیْ مُصْحَفِ رَجُلٍ وَلَا فِیْ قَلْبِہٖ اٰیَۃٌ"

محوّلہ از تفسیر ابن کثیر جلد سوم پارہ پندرہ ۱۵ زیر آیت ولئن شئنا لنذهبن بالذی اوحینا الیك صفحہ ۶۲ ط

اسی طرح اور بھی روایات ہیں جن میں واضح بیان ہے کہ کاغذ سے الفاظ اُڑ جائیں گے۔ واللہ ورسولہ اعلم

کتبہ

نماز میں قرآن مجید صحیح پڑھنے کا بیان

سوال ۳۹: کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس مسئلہ میں کہ الف اور عین میں تمام لوگ قرآن پاک پڑھنے میں فرق نہیں کرتے زمیں فرق نہیں کرتے ذ اور ظ میں فرق نہیں کرتے۔ ض کی جگہ د پڑھنا اگر سمجھایا اور بتایا جائے۔ تو وہ کہتے ہیں، کہ اسی طرح آتا ہے۔ خدا تعالیٰ قرأت کے متعلق کیا فرماتا ہے، حرف کے صحیح ادا ہونے پر۔ یعنی یہ پتہ نہ لگے کہ میں نے کیا پڑھا ہے۔ تو ایسے لوگوں کے لیے فرمائیں، کہ اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ قرآن مجید کے تلاوت کرنیکا کیا ثواب ہے۔ اور حرف کو اپنی جگہ پر کہنے کا کیا ثواب ہے۔ اور بعض مقامات جو کہ قرآن پاک میں ایسے ہیں، کہ جن کی شکل لکھنے میں اور ہے پڑھنے میں اور۔ مہربانی فرماکر آپ اس کی تشریح فرمائیں بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قرآن مجید پڑھنے کے متعلق شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر تلاوت کلام پاک کی نماز میں غلطی کرتا ہے حالانکہ صحیح پڑھ سکتا ہے تو اس کی نماز فوراً ٹوٹ جائے گی اور سخت گناہ گار بھی ہوگا۔ اگرچہ غلطی معمولی ہو۔ یا بڑی۔ اور اگر جان بوجھ کر غلطی نہیں کرتا۔ بلکہ دھوکے سے زبان سے نکل جائے۔ یا پڑھنے والے کی زبان پر ہی وہ لفظ صحیح نہ آتا ہو تو اس کے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ غلطی ایسی بڑی نہ ہو۔ جس سے کفر لازم آتا ہو یعنی صرف ادائیگی کی طریقہ پر غلطی معمولی ہو۔ تب فقہاء کرام کا فیصلہ یہ ہے۔ کہ نماز نہ ہوگی۔ اور اگر غلطی کفر کی حد تک پہنچ جائے تو نماز ٹوٹ جائے گی چنانچہ فتاوی قاضی خاں جلد اول میں ہے یذکر حرف مکان حرف فی کلمۃ ولم یتغیر المعنی بان قرأ ان المسلمون ان الظالمون وما اشبہ ذلک لم تفسد صلوتہ لانہ لا یغیر المعنی ط

یعنی اگر معنی آیت کے نہ بدلیں۔ تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ اور اگر معنی بدل جائیں اور بدلنے کا فرق سب کو معلوم ہوجاتا ہو تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ اسی طرح فتاوی عالمگیری جلد اول باب زلۃ قاری میں ہے۔ اور مجدد اعظم اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب الجام الصاد صہ ۱۹ پر ایسا ہی ہے۔ اور اگر ایک شخص نماز کی قرأت میں اس طرح غلطیاں کرتا ہے کہ ج کو ز اور ز کو ج یا ض کو ظ یا ظ کو ز یا ض کو د پڑھتا ہے اور الف کو ع یا ع کو الف پڑھتا ہے۔ تو اگر اس کا عقیدہ ہی ایسا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہاں وہی حرف ہے جو میں پڑھتا ہوں تو نماز فوراً ٹوٹ جائے گی۔ چنانچہ شامی جلد اول صفحہ نمبر صہ ۵۹۱ پر ہے:- وان علم ان القرآن کیف ھو الا انہ جری علی لسانہ لا تفسد وان اعتقد ان القرآن کذالک تفسد لھذا ہ اگر حروف کو ایسا کہے تو نماز بالکل ٹوٹ جائے گی۔ اور ایسے شخص کو امام بنانا بالکل ناجائز ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اور اگر حرف کو صحیح سمجھتا ہے۔ مگر ادا کے طریقے کو غلط کرتا ہے اور صحیح کرنے پر قادر نہیں ہے۔ تو اس کے لیے معافی ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ ایسے شخص کو امام نہ بنایا جائے اور جو شخص ض کو ظ یا ز کی آواز سے پڑھتا ہے۔ جیسا کہ آج کل کے وہابی ولا الضالین کو ولا الظالین پڑھتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں نماز بالکل فاسد ہوجائے گی۔ چنانچہ شامی جلد اول میں صفحہ نمبر صہ ۵۹۲ پر ہے۔ اور ایسا ہی فتاوی عالمگیری جلد اول صفحہ صہ ۸۰ پر ہے۔ اور فتاوی ہندیہ صفحہ نمبر صہ ۱۴۳ پر ہے ولو قرأ وغل طلعھا ھضیم قرأ بالظاء او بالذال تفسد صلوتہ : ض کا اصلی آواز دال کو پُر کرکے پڑھنا ہے۔ بغیر پُر کئے پڑھنے سے ض نہ ہوگا د ہوگا۔ اور ہر حرف کو اس کی اصلی آواز کے خلاف جان بوجھ کر پڑھنا بہت سخت گناہ ہے۔ اور نماز بھی فاسد ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم میں قرأت کی بہت احتیاط کرنی چاہئے۔ وہابی لوگ ض کو ذ کی طرح پڑھتے ہیں اور اس پر بضد ہیں۔ یہ ان کی جہالت ہے۔ حالانکہ تمام عرب اہل زبان ض کو پُر د کی طرح ہی پڑھتے ہیں۔ اہل لسان کا عمل شریعت میں مضبوط دلیل ہے۔ لہٰذا وہابیوں کے پیچھے نماز اس لیے بھی منع ہے۔

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں۔ کہ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ہر صدی پر میری امت کی درستی کے لیے ایک مجدّد آئے گا۔ لہٰذا عرض ہے۔ کہ آج تک کی صدیوں کے کون کون سے مجدّد کس کس زمانے میں تشریف لائے؟ اُن کے زمانے میں کن کن فتنوں کا ظہور تھا۔ کہ جن کو آکر ان بزرگوں نے بند کیا؟ اِن مجدّدِ کرام کے نام کیا ہیں۔ بعض نقشبندی لوگ کہتے ہیں کہ اب قیامت تک صرف مجدّد صاحب ہی مجدّد ہیں اور کوئی شخص مجدّد نہیں ہو سکتا۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔ مولوی شمس الدین الٰہ آبادی کراچی مورخہ ۱۳/۱/۱۹۶۱

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

قانونِ شریعت کے مطابق یہ بات حتماً مسلّم ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ اپنے پیارے حبیب رؤف و رحیم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے طفیل ان کی امت کو ضلالت سے بچانے کے لیے ہر سَو سال بعد آنے والی صدی کے بالکل ابتدا میں اپنے کسی کامل اکمل بندے کو مجدّدیت کا تاج پہنا کر امتِ نبی کریم کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ چنانچہ ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۵۸۹ کتاب الملاحم کے شروع میں پہلی حدیث ہے:۔

حَدَّثَنَا سُلَیْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ الْمَهْرِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ اَیُّوْبَ عَنْ شَرَاحِیْلَ بْنِ یَزِیْدَ الْمَهْرِیِّ عَنْ اَبِیْ عَلْقَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ فِیْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا (ترجمہ) سلیمان بن داؤد مہری نے ابو داؤد سے روایت کی ان سے ابن وہب نے ان کو خبر دی سعید بن ایوب نے انہوں نے شراحیل بن یزید مہدی سے روایت لی انہوں نے علقمہ سے انہوں نے ابو ہریرہ سے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ میری امت کے لیے ہر صدی کے شروع میں مبعوث فرماتا رہے گا۔ ایسے شخص کو جو دین پاک کو صاف ستھرا کرتا رہے (الخ) اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے بھی روایت کیا۔ جامع الصغیر نے جلد اول صفحہ ۷۴ پر اس کو صحیح کہا۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔ (۱) پہلی یہ کہ ہر مجدّد صرف ایک صدی کے لیے ہوگا نہ کم نہ زیادہ۔ بعض نقشبندی لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہزار سال کے مجدّد ہیں، بالکل غلط ہے۔ بلکہ آپ بھی دیگر مجددین کی طرح فقط ایک صدی کے مجدد ہیں۔ الف ثانی کا مطلب دوسرے ہزار کی ابتدا جو گیارہویں صدی ہے، نہ کہ پورے ہزار سال۔ کیونکہ پورے ہزار سال تو اب ہو ہی نہیں سکتے۔ قیامت قریب ہے۔ اور موجودہ نقشبندیوں کا یہ قول خود ساختہ اس حدیث منورہ کے بھی خلاف ہے۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی۔ کہ جس عالم کو مجدد بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنی بعثت کی صدی سے پہلی صدی میں پیدا ہو کر عالم و اکمل مشہور ہو جاتا ہے، اس لیے کہ لفظ یَبْعَثُ

بَعَثَ" سے بنا ہے اور بَعْثٌ" کے لغوی معنیٰ ہیں۔ کسی کام کے لیئے اُٹھ کھڑا ہونا۔ اور اس کام میں محمول و مشغول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لغات کشوری صفحہ ۵۷ پر اور منجد عربی صفحہ ۳۹ پر ہے۔ بَعَثَهٗ عَلَى الشَّيْءِ اَىْ حَمَلَهٗ عَلٰى فِعْلِهٖ فَاَقَامَهٗ (الخ) (ترجمہ): اس شخص کو مبعوث کیا۔ کسی چیز پر یعنی اس کے کرنے پر مشغول کیا اور قائم کیا۔ بَعْثٌ کا شرعی ترجمہ یہ ہے کہ پیغام خداوندی کی تبلیغ شروع کر دینا۔ اور جو خدمت دین اس کے سپرد ہوئی اس میں مشغول ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعثتِ انبیاءِ عظام، ولادت انبیاءِ کرام سے تقریباً چالیس سال بعد ہوتا ہے۔ اس روایت صحیحہ میں بھی لفظ بعثت مستعمل ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اپنی تبلیغی صدی سے پہلی صدی میں اس مجدد کی ولادت و تکمیل علوم معنوی و ظاہری ہو چکی ہو۔ اور دوسری صدی شروع ہوتے ہی اس کو مبعوث کر دیا جائے۔ کیونکہ روایت کے دوسرے لفظ ہیں:۔ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ ہر صدی کے راس پر۔ اور راس کے معنیٰ ہیں سر یعنی بالکل ابتدا۔ اور ابتداءِ تبلیغ یعنی بعثت تب ہی ہو سکتی ہے جب کہ اس کے پہلے صدی کا کثیر زمانہ بھی پایا ہو۔ اور علوم حقیقیہ سے بھی کما حقہٗ واقف ہو چکا ہو۔

تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ ہر عالم مجدّد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اُس عالم یا ولی اللہ یا مختار حاکم بادشاہ وغیرہ کو مجدّد کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس نے دو صدی کے انتہائی و ابتدائی زمانے کے پانے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے دینی فتنے کا خاتمہ یا زور توڑا ہو۔ کہ جس کے وجود سے امت مسلمہ کے شدید گمراہ ہونے کا خطرہ تھا۔ کیونکہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پاک میں ہے:۔ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا کہ وہ شخص اُمّتِ مسلمہ کیلیے اس کے دین کو ستھرا کرے گا۔ چوتھی بات یہ ثابت ہوئی کہ وہ مجدد فرد واحد ہو گا۔ نہ کہ جماعت کثیرہ اگرچہ دیگر علماء اس کے معاون بن جائیں مگر اصل مجدّد فقط ایک شخص ہی ہو گا۔ اس لیے کہ حدیث مذکورہ بالا میں مَن اسم موصول ہے۔ جو صرف وحدت کو چاہتا ہے۔ پانچویں بات یہ ثابت ہوئی کہ مجدد کا وہ زمانہ، صحابہ کرام کے زمانے کے بعد شروع ہوا ہے۔ کوئی صحابی مجدّد نہیں اس لیے کہ روایت طیبہ میں ہے:۔ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ یعنی وہ مجدّد ہر صدی کے بالکل شروع میں مبعوث ہو گا۔ جب کہ امت کی گمراہی کا سخت اندیشہ ہو تو تجدیدی کارنامے کر کے باطل فتنے کو فرو کرے۔ اکابرین صحابہ میں سے کسی نے بھی صدی کا ابتداء نہ پایا۔ اس لیے کہ پہلی صدی کی ابتدا میں خود آقائے کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوتے تھے۔ اور کسی کے گمراہ ہونے کا بھی اندیشہ نہ تھا۔ دوسری صدی کی ابتدا میں دورِ صحابہ تقریباً انتہائی مراحل میں پہنچ چکا تھا۔ خاص کر وہ چند صحابہ کرام جن کے افعالِ طیبہ اور حسین کردار کو تجدیدی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ سب اکابر وصال ربانی فرما چکے تھے۔ جیسے صدیق اکبر فتنۂ منع زکوٰۃ و فتنۂ مسیلمہ کذاب کو مٹانے والے اور فتوحات اسلامیہ کے بانی فاروق اعظم اور قرآن کریم کے مخلوط کرنے کے فتنے کو ختم کرنے والے عثمان غنی اور جیسے کہ علی المرتضیٰ جنہوں نے اپنے عدالتی

اور فقہی فیصلوں سے دین کو عجیب طرح سے روشن کیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجدد نہیں۔ اس لیے کہ مجدد کا درجہ صحابہ کرام سے کم درجے پر ہے۔ صحابی کو مجدد کا درجہ دینا ایسا ہی معیوب ہے جیسا کہ وزیر اعظم کو تھانیدار کا درجہ دیا جائے۔ اسی طرح یہ کہنا ایک لحاظ سے گناہ ہے کیونکہ صحابی کی گستاخی ہے۔ کہ مجدد کا درجہ مجتہد اربعہ کے بھی بعد ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس حدیث پاک نے جہاں مجدد آنے کی خبر دی۔ وہاں مجدد کی تعریف نوعیت اور شخصیت سے بھی آگاہ کر دیا۔ تاکہ ہر ایرہ غیرہ کو مجدد نہ کہہ دیا جائے۔ اس حدیث کی روشنی میں سابقہ چودہ صدیوں کے مجددین کرام اور ان کے دینی کارناموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) پہلی صدی کے مجدد (یعنی مجدد کی پہلی صدی نہ کہ اسلام کی) حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے خارجیوں کے فتنے کو توڑ کر تجدید اسلام فرمائی۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۹ھ میں اور وفات شریف ۱۱۲ھ میں ہوئی، اس طرح آپ نے اپنی صدی کے بارہ سال پائے۔

(۲) دوسری کے مجدد امام احمد بن حنبل ہیں۔ آپ کی عمر شریف ستر سال ہوئی اور ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ آپ نے معتزلہ فرقے کو ہلاک فرمایا۔ خلق قرآن کریم کے فتنے کی بڑھتی ہوئی آگ کو بجھا کر تجدید اسلام فرمائی۔ اس زمانے میں امام شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ ہوئے۔ مگر خدمت تجدید امام احمد کے مقدر میں ہوئی۔ اسی میں آپ کی شہادت ہوئی۔ (۳) تیسری صدی کے مجدد امام نسائی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ جہمیہ کے باطل عقائد کو فنا کر کے مجددیت کا خطاب پایا۔ آپ کی ولادت ۲۱۵ھ میں اور وفات ۳۰۳ھ میں ہوئی۔ فرقہ جہمیہ کے چند باطل عقیدے یہ تھے۔ (۱) کہ عذاب قبر کوئی نہیں (۲) اور معاذ اللہ خالق دو ہیں (۱) خالق خیر (۲) خالق شر ان کفریہ عقیدوں کے باوجود پھر بھی یہ خود کو مسلمان کہتے تھے۔ چوتھی صدی کے مجدد امام بیہقی یا امام ابو بکر باقلانی ہیں یہ دونوں بزرگ ہم زمانہ ہیں، انہوں نے تیسری صدی کے بیس ۲۰ سال اور چوبیس ۲۴ سال پائے۔ اور چوتھی صدی کے بیالیس ۴۲ اور چھپن سال پائے۔ اس لیے ان کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ امام بیہقی ہی مجدد ہیں انہوں نے فرقہ رافضیہ کا زور توڑا۔ اور مسلمانوں کو ان کے کفریہ عقیدوں سے بچایا اور طہران و لبنان میں تجدید اسلامی کا جھنڈا گاڑا پانچویں صدی کے مجدد امام محمد بن محمد غزالی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ قدریہ کے باطل عقیدوں سے مسلمانوں کو بچایا۔ ان کی ولادت ۴۵۰ھ میں اور وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ چھٹی صدی کے مجدد امام فخر الدین رازی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ جہمیہ اور فلاسفہ کے باطل عقیدوں کو اسلامی فلسفے کے ذریعے سے ہی ختم کیا اور عالم کے قدیم ہونے کے کفریہ عقیدے کا رد بلیغ فرمایا۔ انہوں نے پانچویں صدی اور چھٹی صدی کا زمانہ پایا۔ ساتویں صدی کے مجدد امام تقی الدین ابن دقیق عیدی ہیں۔ یہ ۶۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۰۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے ہندوستان کے بعض علاقوں میں اسلام پھیلایا اور آریہ مذہب کا زور توڑ کر ان کی غلط توحید سے جو مسلمانوں میں فتنہ پڑا تھا اس کا خاتمہ کیا۔ آپ شام سے

ہجرت کرکے ہند میں خدمت اسلام کے لیے تشریف لائے ٭ آٹھویں صدی کے مجدد حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ انہوں نے بہشت بریں بنانے والے بہائی مذہب کا زور توڑ دیا۔ ان کی عمر شریف ترسیٹھ سال ہوئی۔ اور ۸۱۵ھ میں وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنی صدی کے صرف پندرہ سال پائے ٭ نویں صدی کے مجدد امام جلال الدین سیوطی ہیں۔ انہوں نے بھی فلاسفہ کی پھیلی ہوئی بے دینی اور فلسفے کے گمراہ کن چکروں سے مسلمانوں کو بچایا۔ یہاں تک کی فہرست کتاب عون المعبود شرح ابوداؤد صفحہ ۱۸۱ پر موجود ہے ٭ دسویں صدی کے مجدد ملا علی قاری ہیں۔ جنھوں نے اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کا تختہ الٹایا ٭ گیارہویں صدی کے مجدد امام شیخ احمد سرہندی ہیں۔ جنھوں نے جہانگیر کے کفریہ قوانین سے مقابلہ کرکے مسلمانوں کو بچایا ٭ بارھویں کے مجدد امام محی الدین اورنگ زیب شہنشاہ ہند ہیں۔ ان کی ساری زندگی ملحدین سے مقابلہ کرتے گزری ٭ تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبد العزیز ہیں۔ جن کی وفات شریف ۱۲۳۹ھ میں ہوئی ٭ چودھویں صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ جن کے کارہائے نمایاں ان کی سوانح حیات میں موجود ہیں۔ آپ کی ولادت شریف ۱۲۷۲ھ میں ہے اور وفات شریف ۱۳۴۰ھ میں ہوئی ٭

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور مَافَوْقَ الْاَسْبَاب کے معنی

سوال ۴۰ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کا لفظ آتا ہے۔ وہاں انبیاء اور اولیاء مراد ہیں اور ان سے ہی مانگنا شرک ہے۔ جو لوگ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مراد بت لیتے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاف فرمادیا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ط لوگوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور راہبوں کو ارباباً اللہ کے سواء۔ زید کہتا ہے کہ بت کیسے مراد ہو سکتے ہیں۔ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پادریوں اور جوگیوں کو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ط فرمایا۔ ثابت ہوا کہ بت مراد نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور پادری اور جوگی تو ان کے زندہ لوگ ہوتے ہیں اور ان کو وہ اپنا ولی وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اور ان سے مرادیں، بخششیں مانگتے ہیں۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں برا فرمایا گیا پس اولیاء سے مانگنا بھی برا ہی ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ زید کہتا ہے۔ کہ مَافَوْقَ الْاَسْبَاب مدد مانگنا شرک ہے مَافَوْقَ الْاَسْبَاب مدد مانگنا نہ نبیوں سے جائز اور نہ ولیوں سے۔ اسی طرح مَافَوْقَ الْاَسْبَاب کسی نبی، ولی کو پکارنا بھی شرک ہے

لہٰذا فرمایا جائے کہ مِنْ دُوْنِ اللہِ اور مَافَوْقَ الْاَسْبَابِ کے کیا معنیٰ ہیں بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ط

سائل:۔ مولوی نورالدین خاں عرف کشمیری بادا راولپنڈی شہر۔ مورخہ ۷-۸-۲۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

سوال مذکورہ کی خشک عبارت بتا رہی ہے۔ کہ زید مسلکاً وہابی ہے۔ تقاضائے ادب یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ہو تو علیہ السلام کہنا لازم ہے۔ اللہ کریم جل مجدہٗ کا نام پاک لکھنا یا بولنا ہو تو لفظ تعالیٰ یا جل جلالہٗ وغیرہ ضرور کہنا چاہیئے۔ اولیاء اللہ کا ذکر ہو تو رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کہنا اچھا ہے۔ صحابہ کرام کے لیے رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنا ہی ادب ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جو لفظ عام انسانوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے لیے استعمال کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ یا نبی کریم کو اللہ میاں یا رسول میاں کہنا گناہ ہے۔ اسی طرح اللہ صاحب یا محمد صاحب کہنا یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے۔ ان سے وہابیوں نے بھی یہ طریقہ لے لیا۔ مگر مسلمانوں کو ایسا جائز نہیں۔ سوال مذکورہ میں لفظ انبیاء و اولیاء بغیر تعظیم کے لکھنا وہابیوں کی ہی نشانی ہے۔ سوال مذکورہ کا تحقیقی جواب سمجھنے کے لیے پہلے لفظ دُوْنَ اور مَافَوْقَ الْاَسْبَابِ کا معنیٰ سمجھنا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک یہ لفظ سمجھے نہ جائیں، اسی طرح غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ یہ بات اَظْهَرُ مِنَ الشَّمْسِ ط ہے کہ اگر تعصب اور عنادِ رسول علیہم السلام کی پٹی اتار کر قرآن کریم سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اور رب کریم کے کرم و مہربانی سے سچی سمجھ بھی نصیب ہو جائے۔ تو سوائے اہل سنت والجماعت بریلویہ کے کوئی اور مسلک باقی نہ رہے۔ یہ بدعقیدگیاں صرف اسی طرح سے پھیلتی ہیں۔ کہ قرآن کریم کے مطالعہ کرنے والوں کو نہ اصول کا پتہ نہ فروع کا، نہ علم صرف سے مطلب، نہ قواعد نحویہ سے نہ منطق کے ضابطوں کو جانا، نہ ادب عربی سے لگاؤ۔ نہ لغت کی گتھیاں سلجھائیں۔ نہ علم معانی میں غوطہ زن۔ حالانکہ ایک آیت سمجھنے کے لیے بھی اتنے علوم درکار ہیں۔ صاحب تفسیر بیضاوی جلد اول صفحہ نمبر ۹ پر فرماتے ہیں۔ قرآن کریم سمجھنے کے لیے پندرہ علوم میں مہارت ہونی لازم ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنے کے لیے اٹھارہ علم پڑھنے لازم ہیں۔ اسی لیے درس نظامی میں پہلے دیگر علوم پڑھا کر آخر میں دورۂ قرآن و حدیث کرایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں کہ اگر انسان بلا سوچے سمجھے ان کا ترجمہ و تفسیر شروع کر دے۔ تو بجز گمراہی و گمراہ گری کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انہی الفاظ میں سے ایک لفظ دُوْن ہے۔ یہ لفظ لغت اور اصول کے اعتبار سے کل پانچ معنیٰ میں مشترک ہے۔

عا:۔ دون کے معنی سوا، بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جلد اول ترمذی شریف صفحہ نمبر ۳۰۲ پر ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدًا مَامُوْرًا مَا اخْتَصَّنَا مِنْ دُوْنِ النَّاسِ بِشَيْءٍ اِلَّا بِثَلٰثٍ الخ ۃ (ترجمہ) روایت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ آقائے دو عالم حضور اقدس صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم صاحب امر اور صاحب اختیار بندے تھے۔ نہیں خاص کیا ہم اہلبیت کو لوگوں سے مگر تین چیزوں میں، یہاں دون کے معنیٰ سواء ہیں۔ اس لیے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ اس وجہ سے خصوصیت میں دون سواء کے معنیٰ میں ہُوا۔ یہاں بجز اس کے کوئی دوسرا ترجمہ نہیں بن سکتا۔ خیال رہے۔ کہ لفظِ مشترک کا معنیٰ معیّن کرنے کے لیے کوئی قرینہ شرط ہے۔ یہاں خصوصیت قرینہ ہے۔ دون کا دوسرا ترجمہ ہے حفاظت۔ جامع صغیر للسیوطی کے حاشیے پر کنوز الحقائق للمناوی رحمۃ اللہ علیہ نے صفحہ نمبر ۱۱۵ جلد دوم پر مسلم بخاری کی حدیث نقل فرمائی ہے۔ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ ۃ (ترجمہ) جو شخص اپنے حلال طیّب مال کی حفاظت کرتا ہُوا۔ قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے۔ یہ ہی روایت مجمع البحار جلد اول ۳۷۴ پر الکرمانی شرح قسطلانی کے حوالے سے بھی نقل فرمائی، یہاں دون کے معنیٰ حفاظت کے ہیں۔ اس لیے کہ مال کی حفاظت ہی کی جاتی۔ مال سے نہ لڑائی دشمنی اور مقابلہ ہوتا۔ نہ مال کے سواء کوئی قتل کیا جاتا ہے۔

ع۳: دون کا تیسرا معنیٰ مقابلہ ہے۔ چنانچہ ایک عربی شاعر سبعہ معلّقہ کی شرح میں اپنے محبوب و معشوق کی طاقت و شجاعت کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ دُوْنَهٗ مِثْلُ الرَّمَادِ ــــ اِنَّهَا مُتَحَيِّرٌ مِنْهَا عُجَابٌ

ترجمہ:۔ ہر چیز میرے اس محبوب کے مقابلے راکھ کے ڈھیر کی مثل ہے۔ بے شک دنیا حیران ہے۔ اس قوت سے تعجب ناک طریقہ پر۔ یہاں مقابلے کا معنیٰ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اظہار طاقت ہے

ع۴:۔ دون کا چوتھا معنیٰ ہے قریب۔ چنانچہ قرآن کریم سورۃ قصص پارہ نمبر ۲۰ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں کا ذکر فرمایا گیا۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدَانِ ۃ ترجمہ اور پایا حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان لوگوں کے پاس ایک طرف کو دو عورتوں کو جو اپنی بکریوں کو روکے ہوئے تھیں۔ یہاں لفظِ دون کا معنیٰ نزدیک کے سوا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قومیّت کے لحاظ سے جدا نہیں تھیں۔ اور فردیّت کے لحاظ سے ہر انسان ایک دوسرے کے سواء ہے۔ اور یہ سوائیت بدیہی چیزیں ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں مقابلے کا معنیٰ بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ مقابلہ بازی نہ تھی نہ یہاں حفاظت کے معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ کہ مقصد کے خلاف ہے

پانچویں معنیٰ ہیں۔ حقیر ذلیل۔ چنانچہ عربی مقولہ مشہور ہے اَلشَّهِيْقُ دُوْنَ اللَّيْثِ ۃ ترجمہ:

نالائق آدمی لائق شخص سے حقیر ہوتا ہے۔ بعض عرب کہتے ہیں:۔ اَلشَّہِیْقُ دُوْنَ الزَّفِیْرِ ط گدھے کی پہلی آواز آخری آواز سے گھٹیا ہوتی ہے۔ لفظ شہیق کا لغوی ترجمہ ہے فضول باتیں کرنے والا (منجد عربی صفحہ ۱۲۱۲) گدھے کے رینگنے کی ابتدائی آواز کو بھی شہیق کہتے ہیں۔ اور آخری موٹی آواز کو زفیر کہتے ہیں۔ کشوری صفحہ ۲۸۵ یہاں دون کے معنیٰ ذلیل اور گھٹیا ہیں۔ منجد عربی صفحہ نمبر ۲۲۹ پر ہے:۔ اَلدُّوْنُ اَیْضًا اَلْخَسِیْسُ اَلْحَقِیْرُ ط ترجمہ، دون کے معنیٰ ذلیل اور حقیر بھی ہیں۔ یہ پانچ معنیٰ عام مشہور ہیں۔ منجد نے چھٹا معنیٰ ایک اور بھی کیا ہے۔ کہ دون کے معنیٰ سامنے ہونا۔ چنانچہ صفحہ نمبر ۲۲۹ پر ہے:۔ وَبِمَعْنٰی اَمَامُ یُقَالُ مَشٰی دُوْنَہٗ اَیْ اَمَامَہٗ ط ترجمہ دون کے معنیٰ آگے ہونا کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص چلا۔ اُس کے دون یعنی اُس کے آگے۔ یہ تھی لفظ دُون کی اصطلاحی لغوی تحقیق۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بہت معنیٰ میں استعمال ہوا ہے: مختلف آیات میں مختلف قرینوں کے لحاظ سے معنیٰ ہوتا ہے۔ مگر یہ رموز و قرائن سمجھنا محققین علماء کا کام ہے۔ ہر کس و ناکس کے ترجمے محض خرابی کا باعث بنیں گے۔ اگر دُون کا ترجمہ ہر مقام پر ایک ہی کیا جائے تو پانچ نقصان شدید لازم آئیں گے:

۱:۔ مقصد قرآن مجید فاسد ہوگا۔ جس سے گمراہی پھیلے گی، ۲:۔ آیات کا تعارض و ٹکراؤ پیدا ہوگا۔ ۳:۔ بلکہ کبھی کفر لازم بھی آ سکتا ہے: ۴:۔ ترجمہ کرنے والے کی جہالت ظاہر ہوگی: ۵: اغیار کو قرآن پر اعتراض کا موقع ملے گا۔ اسی لیے علماء کرام نے لفظ دون کے معنیٰ کی اس طرح تفریق فرمائی ہے۔ کہ جب قرآن پاک میں یہ لفظ عبادت یا معبودیت کے لیے استعمال کیا جائے۔ تو ترجمہ ہوگا سواء، یا غیر اور جب لوگوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ تو معنیٰ مقابل۔ یہی وجہ ہے۔ کہ طریقت میں ولی دو قسم کے ہیں:

۱ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ ط ۲ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ط سوال مذکورہ کی پیش کردہ آیت کریمہ میں تین وجہ سے قطعاً اولیاء کرام و انبیاء عظام کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی یہ کہ لفظ دون کا معنیٰ یہاں مقابل ہے اور ترجمہ یہ کیا گیا۔ انہوں نے راہبوں یا پادریوں نے معبود بنالیا اللہ کے مقابل۔ کوئی مسلمان کسی ولی یا بزرگ، عالم، مفسر، محدث کو نہ رب سمجھتا ہے نہ الٰہ۔ بلکہ مومن مسلمان کے عقیدہ میں صرف یہ ہے کہ اولیاء اللہ اور انبیاء عظام، بزرگ، پیر، فقیر اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاجت روا مشکل کشا ہیں۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اسی طرح منتظم سپاہی ہیں۔ جس طرح ملائکہ منتظمین عالم سپاہ اور خدائی لشکری ہیں۔ حالانکہ اس آیت پاک میں حاجت روا، فریاد رسی کا ذکر نہیں۔ یہ تو بہت نیچا درجہ ہے۔ سابقہ کافروں نے اپنے بڑے لوگوں کو رب اور معبود کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی تردید میں یہ آیت آئی۔ دوسری وجہ۔ اس آیت پاک میں انبیاء و اولیاء کو شمار کرنا سراسر خدا تعالیٰ پر افترا اور جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ یہاں راہب اور پادری

کا لفظ ہے۔ اولیاء اللہ کو راہب کہنا سخت ترین گستاخی ہے۔ اسی طرح انبیاء عظام یا اولیاء کرام کو پادری وغیرہ کا لقب دینا سخت توہین اور بدتمیزی ہے۔ یہود و نصاریٰ اپنے پادریوں کو خدائی کرسی پر بٹھاتے تھے۔ بلکہ اب بھی ان کے عقیدے میں یہ بات کامل ہے۔ کہ ہمارے پوپ، پادری گناہ بخشنے کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے پیسے لے کر گناہ بخشنے کا دھندا کھول رکھا ہے۔ اس کا مفصل ثبوت "ازبلا" نامی کتاب میں دیکھو۔ بہرحال یہ فاسد عقیدہ صرف یہود و نصاریٰ کا تھا، اور ہے۔ بحمد اللہ کوئی سچا اہل سنت والجماعت مسلمان انبیاء کرام یا اولیاء اللہ کے لیے ایسا عقیدہ ہرگز نہیں رکھتا۔ صرف حاجت روا مشکل کشا فریاد رس مانتے ہیں۔ اگر یہودی اور عیسائی بھی اسی حد تک رہتے تو یقیناً ان کو کافر نہ کہا جاتا۔ ان بدنصیبوں نے تو رب کا درجہ دے دیا۔ اسی لیے یہ نہ فرمایا اِتَّخَذُوْا دَافِعَ الْبَلَاءِ ط کیونکہ اس حد تک جائز تھا، تردید اس بات کی ہے کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ خبیثا یہود و نصاریٰ نے تو اللہ کے مقابل رب بنا لیا۔ اور صرف لغوی طور پر رب نہ بنایا کہ جس کا معنیٰ مالک یا مربی ہوتا۔ اس میں پھر بھی کچھ تو یہ درجات کی گنجائش تھی۔ مگر انہوں نے تو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اللہ کے مقابل میں رب بنایا۔ جو سراسر کفر تھا۔ حاشا حاشا۔ کوئی مسلمان اس طرح کسی نبی علیہ السلام یا ولی اللہ کو نہ رب تسلیم کرتا ہے نہ معبود۔ بلکہ اولیاء اللہ کو با اختیار ذی شان عبد اللہ سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ عقیدہ عین ایمان اور منشاء الٰہی کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ عقیدہ بھی کفر یا شرک یا کم از گناہ ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں عالموں، پیروں، غوثوں، قطبوں، ولیوں سے مدد مانگنے کی تردید فرما دیتا۔ مگر زمانے بھر کے وہابی ایک آیت بھی اس طرح کی نہیں دکھا سکتے۔ پس ثابت ہوا کہ ولی اللہ اور پیر فقیر سے مدد مانگنا جائز ہے۔ اور یہ پیارے مشکل کشا ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام کا دور تھا۔ اور ساری کائنات میں مسلمان صرف صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہی تھے۔ کس صحابی نے کسی نبی علیہ السلام کو معبود کیا۔ یا کسی ولی اللہ کو خدا تعالیٰ کا درجہ دیا جو صحابہ کرام کے متعلق یہ باطل عقیدہ رکھے اس کے اپنے ایمان کی خیر نہیں۔ تو اس آیت میں اولیاء اللہ کیسے داخل ہوئے۔ لفظِ ولی اللہ صرف مسلمانوں میں مستعمل ہے۔ جیسے کہ لفظِ علماء محدث، مفسر وغیرہ مسلمان اکابر کے ہی القاب ہیں۔ یہود و نصاریٰ میں یہ الفاظ رائج نہیں۔ آج بھی کسی عیسائی نے اپنے بڑے مذہبی پیشوا کو محدث، مفسر یا ولی اللہ نہیں کہا۔ بلکہ پادری اور راہب کے الفاظ ہی مسموع ہیں۔ یہی القاب ان کے لیے قرآن پاک میں استعمال ہوئے۔ مگر افسوس ہے وہابیوں پر کہ اپنے پاس سے ایسی باتیں بنا لیتے ہیں۔ محض اس لیے کہ آیت میں توڑ مروڑ کا موقعہ مل سکے۔ اور اسی طرح کفار کی آیتوں کو مسلمان پر چسپاں کر کے شرک کی مشین کھولی جا سکے۔ اللہ ان کے شر سے سب مسلمانوں کو بچائے۔ دوسرا لفظ

جس سے عام طور پر بے سمجھی سے دھوکہ دیتے ہیں وہ ہے مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ اس کا لفظی ترجمہ ہے وہ چیز جو اسباب سے اوپر یعنی علیحدہ ہو۔ یہ لفظ نہ قرآن کریم میں ہے۔ نہ حدیث پاک میں۔ یہ وہابی دیوبندی لوگوں کی اپنی ایجاد ہے۔ جو انہوں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے اور انبیاء کرام و اولیاء کرام کے آستانوں سے دور کرنے کے لیے بنائے ہیں۔ یہی ایک لفظ نہیں۔ بلکہ اس طرح کے بے شمار لفظ ان کی شرک ساز مشینوں سے دیوبند فیکٹری میں تیار ہوتے ہیں۔ جن کو اگر ایک جگہ پر جمع کیا جائے تو واضح ہو جائے کہ دیوبندی دین۔ اسلام سے بالکل علیحدہ دین ہے۔ اب حال ہی میں ان لوگوں نے تقلید کے خلاف "شرک فی الرسالت" کا لفظ ایجاد کیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ وہابیوں کا عقیدہ ہے کہ کسی نبی، ولی سے مدد مانگنا کسی قسم کی بھی ہو شرک ہے۔ لیکن اپنے دیگر عقیدوں کی طرح جب یہ لوگ اس بات کو بھی قرآن و حدیث سے ثابت نہیں کر سکتے۔ تو گھبراہٹ میں "مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ" کی گھریلو قید لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ نبی، ولی سے وہ مدد مانگنی حرام ہے جو اسباب سے علاوہ ہو۔ پوچھو ان داناؤں سے کہ اگر یہ شرک ہے تو ہر طرح شرک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جو چیز شرک ہے وہ ہر طرح ہر وقت شرک ہی ہے۔ یہ کیا کہ صبح کو شرک نہیں رات کو شرک ہو۔ اس طرح شرک نہ ہو اور اس طرح شرک ہو جائے۔ دیکھو عبادت غیر اللہ کو شریعت نے شرک فرمایا۔ تو جس وقت جس طرح بھی کی جائے، شرک ہی ہوگا۔ یہ تو تھا ان پر الزامی جواب۔ لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ "مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ" کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اسباب ہی سے ہوتا ہے۔ ہاں البتہ لوگوں اور زمانے کے اختلاف اور تغیر سے اسباب بھی متفرق ہوتے ہیں۔ ایک طاقت والے کے لیے ایسے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ جو کمزور کے لیے نہیں۔ امیر، دولت مند کو وہ اسباب مل جاتے ہیں جو غریب کے پاس نہیں۔ پڑھا لکھا وہ کام کر دکھاتا ہے۔ جس کے اسباب جاہل، ان پڑھ کو میسر نہیں آتے۔ آج سائنسی ترقی سے وہ وہ اسباب موجود ہیں۔ جو چند سال پیشتر متصور بھی نہ تھے۔ سابقہ زمانوں میں دور کی بات سننا کم عقلوں کے نزدیک مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج ٹیلیفون، وائرلیس وغیرہ نے اس کو مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ سے نکال دیا دور سے امداد کے لیے پہنچنا وہابیوں کے نزدیک مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ ہے لیکن ہوائی جہاز اور راکٹ نے ثابت کر دیا کہ یہ کام بھی مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ نہیں۔ وہابی اپنے خود ساختہ قاعدے کی بنا پر اولیاء کرام کے لیے۔ دور کی آواز سننے اور دور کی امداد کے منکر ہیں۔ حالانکہ یہ کام تمدنی زمانہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کے پاس ٹیلیفون یا وائرلیس اور راکٹ یا ہوائی جہاز ہو۔ ایک دفعہ

۱۹۶۵ء کی جنگ میں۔ وائرلیس کے ذریعے پندرہ منٹ میں صدر ایوب صاحب کو گجرات میں بلا یا گیا۔
اور صدر ایوب صاحب نے اتنی دور سے مصیبت زدہ گھبرائے ہوئے فوجی دستے کی آواز بھی سن لی۔ اور
اپنے تیز رفتار طیارے کے ذریعے پہنچ بھی گئے۔ اس طرح کا دن رات مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر
کوئی وہابی اس کو شرک نہیں کہتا۔ پس ثابت ہوا کہ دنیا میں کوئی کام مَافَوْقُ الْاَسْبَاب نہیں جب
دنیا داروں میں اتنی طاقت اور حاجت روائی کی قوت ہے تو غور کرو۔ کہ اولیاء اللہ، پھر صحابہ، پھر انبیاء
کرام میں کتنی عظیم طاقت ہے اور ہوگی۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی طاقت شعور انسانی سے
بالاتر ہے۔ یہ راز کسی تھیوری سے سمجھا یا نہیں جاسکتا۔ راکٹ اور ہوائی جہاز کی مشینری کو بہت سوں
نے سمجھ لیا۔ مگر خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کھڑاؤں کی پرواز کا راز آج تک کوئی نہ
سمجھ سکا۔ ٹیلیفون اور وائرلیس کی گتھیاں ہزاروں نے سلجھا لیں۔ مگر یَاسَارِیَۃُ الْجَبَل کا فارمولا کسی نے نہ جانا
ٹیلیفون، ٹیلی ویژن بنانے والے تو بہت پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر مسجد قبا میں بیٹھ کر خانہ کعبہ کا نظارہ کرانے
والے کہاں سے لاؤ گے۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
صَلٰوۃً وَّسَلَامًا عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ لیکن یہ سب کچھ اسباب کے تحت ہی ہو رہا ہے۔ مَافَوْقُ الْاَسْبَاب کوئی
چیز نہیں۔ ہاں اپنے اپنے اسباب علیحدہ ہیں۔ کسی کے پاس رحمانی، کسی کے پاس شیطانی، کسی کے
پاس جسمانی، کسی کے پاس روحانی، کسی کے پاس مادی، کسی کے پاس ایمانی، کسی کے پاس فانی۔ کسی
کے پاس ابدالآباد تک باقی کسی کے پاس ظاہری دنیا دی زندگی میں کسی کے پاس بعد وفات بھی۔ یہ تو اپنی
اپنی پہنچ کی بات ہے۔ کہ کوئی دنیا کی طرف دوڑے۔ اور کسی کی دوڑ بحکم فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ اللہ رب
العزت کی طرف اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنِیْ اِلَی الْفِرَارِ اِلَیْکَ جس طرح دنیا دی محکموں کا آپس میں بذریعہ
ٹیلیفون وائرلیس وغیرہ رابطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح دفتر معرفت میں اولیاء کاملین کا ٹیلیفون
بھی لگا رہتا ہے، یہ مجذوب فقراء جو کسی موقع پر عجیب عجیب گفتگو اور حرکتیں کرتے ہیں۔ اور بیوقوف
لوگ ان کو دیوانہ سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ کسی روحانی محکمے سے رابطے میں مشغول ہوتے ہیں
بلاتشبیہ یوں سمجھ لو۔ ٹیلیفون پر گفتگو کرنے والا تو دونوں آوازیں سنتا ہے۔ مگر قریبی لوگ صرف اسی
ایک کی۔ ہاں اور بات سنتے ہیں۔ ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اسی طرح ولی کامل مجذوب یا سالک کے
رازوں سے بھی کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح حکومت کے ٹیلیفون پر بیٹھے ہوئے ملازم
شخص کو ستانا یا اس کے قریب جانا قانونی جرم کا باعث ہے اسی طرح اولیاء اللہ کو ستانا شرعی جرم
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ مجذوب فقیر کے پاس نہ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بد دعا دے

دے کیونکہ وہ اپنے عشق وارفتگی میں نہ معلوم کس سے رابطہ ہے۔ وائرلیس پر بات کرنے والے کو کوئی پاگل دیوانہ نہیں کہتا۔ کہ دنیاوی مشین کے ذریعے کسی سے تعلق مربوط ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کی عجیب وغریب باتوں کو سن کر بھی کچھ فیصلہ نہ کرو۔ کیونکہ یہ باتیں متشابہات قرآنیہ کے حکم میں ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد سوم مطلب حال شیخ اکبر صفحہ نمبر ۳۰۶ پر ہے :- وَقَالَ اَنَّهٗ شَبِيْهٌ بِالْمُتَشَابِهِ فِي الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ ؕ ترجمہ: امام غزالی نے فرمایا کہ ان مجذوب اولیاء اللہ کی باتیں قرآن وحدیث کے متشابہات کی طرح ہیں۔ یہ اپنی قلبی مشین کا تار عشق ومعرفت کے دار الحکومت سے جوڑے ہوتے ہیں۔

حمقاء کے نزدیک تو یہ کام "مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ ؕ" ہو سکتے ہیں۔ مگر عقلاء قلبی اس کو روحانی قوت واسباب سے تعبیر کرتے ہیں۔ انبیاءِ کرام کی امداد تو بڑی عظمت والی چیز ہے۔ اولیاء اللہ کی امداد کا بھی وہ ہی منکر ہو سکتا ہے جو عقل وخرد سے عاری ہو ہمارا ایمان ہے۔ اولیاء اللہ ہر وقت ہر آن مدد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ؕ ترجمہ: مگر تم بے عقلوں کو شعور نہیں۔ اور مدد کرنے والے سے مدد مانگنی جائز ہے مدد کرنے کی طاقت دی ہی اِس لیے جاتی ہے تاکہ ان سے مدد مانگی جائے۔ ورنہ کرامات کا عطیہ ربانی اور قرآنی تاریخی مشاہدات سب کو باطل کہنا پڑے گا حالانکہ یہ کفر ہے۔

حکومت دنیوی ڈپو والے کو راشن ذخیرہ کرنے اور سڑانے لگانے کے لیے نہیں دیتی بلکہ اس لیے کہ حاجتمندوں کو دیا جائے اور حاجتمند اکر اس سے مانگیں۔ حاجتمندوں کی جتنی بھیڑ مانگنے کے لیے ڈپو پر جمع ہو گی اتنا ہی حکومت کو خوشی ہو گی ڈپو سے روکنے والا حکومت کا دشمن ہے۔ بس بلا تشبیہ سمجھ لو کہ اولیاء اللہ کے آستانے قدرت الٰہی کے ڈپو ہیں۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتاب التاریخ

امام اعظم اور حضرت قتادہ تابعی کا مکالمہ

سوال نمبر ۲۱:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ امام اعظم اور حضرت قتادہ کا آیت سورت نمل میں لفظ نملۃ کی تذکیر یا تانیث کے بارے میں کچھ مکالمہ ہوا جس میں حضرت قتادہ لاجواب ہو گئے تھے اور امام اعظم نے فرمایا تھا کہ یہ نملۃ مونث نہ ہوتی تو قَالَ نَمْلٌ ہوتا۔ یہ واقعہ تفسیر خزائن العرفان میں صدر الافاضل نے بھی ذکر کیا ہے اور مولانا لاہوری صاحب اور گوجرانوالے کا فتویٰ اس بات کی تائید میں آچکا ہے کہ یہ مکالمہ بالکل درست ہے اور حضرت قتادہ کا لاجواب ہونا اور امام اعظم کا باوجود صغر سنی کے درست جواب دینا بالکل سچا واقعہ ہے۔ لیکن ہمارا مولوی خطیب اسبات کو غلط کہتا ہے لہٰذا صحیح اور حق بادلائل فیصلے کے لیے آپ کی خدمت میں استفتاء اور لاہور و گوجرانوالے کے فتوے حاضر ہیں۔ براہِ کرم جلد جواب دیا جائے۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا:۔

السائل:۔ بشارت احمد نورانی محلہ جادہ جہلم ناظم جامع مسجد نور ۱۶/۹/۷۷

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

سوالِ مذکورہ میں بطور تحقیق میں نے بحیثیت مفتی اسلام ہونے کے ہر دو فتاویٰ مذکورہ اور تفسیر خزائن العرفان کا مطالعہ کیا بعدہٗ محققانہ تحقیق سے یہ بات اظہر من الشمس ہوئی کہ مذکورہ فی السوال مکالمہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر۔ عقلاً۔ نقلاً۔ نحواً۔ صرفاً۔ علماً۔ ادباً۔ تاریخاً۔ تحقیقاً۔ ہر طرح غلط ہے اور محدثِ اسلام حضرت قتادہ وسراج الامہ کاشف الغمہ امام الائمہ امام اعظم کے درمیان اس قسم کا کبھی کوئی بصورت سوال جواب مکالمہ بالواسطہ یا بلاواسطہ نہ ہوا۔ کسی کم عقل نے اپنے پاس سے یہ مکالمہ گھڑ لیا ہے اور بعض مفسرین نے بلاسوچے سمجھے اس کی تشہیر کر دی۔ حالانکہ ایسا کرنا عقلاء کو زیب نہیں۔ گوجرانوالہ کا فتویٰ محض جذباتی ہے۔

جب کہ لاہوری فتوائے مفتی کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ ہر دو مفتی صاحبان نے غور و فکر و تحقیق کی زحمت گوارہ نہ کی تفسیر خزائن نے اس مکالمے کو لطیفے کے درجے میں رکھا ہے اسی لیئے اس کی ابتدا لطیفہ کے لفظ سے کی۔ ہماری اصطلاح میں لطیفہ ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جس میں مذاق۔ دلچسپی۔ دل لگی کا پہلو نکلتا ہو اگرچہ حقیقت کے خلاف ہو پس حضرت صدر الافاضل صاحب تفسیر خزائن العرفان علیہ الرحمۃ کا اس لطیفے کو نقل کرنے سے آپ کی تائید ضروری نہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے بعض مفسرین کے نقل کردہ اس واقعے کو لطیفہ بنا کر اس کی حقیقت کی تردید کر دی۔ اور صدر الافاضل کا مقصد یہ ہو کہ یہ مکالمہ حقیقت نہیں بلکہ نرا لطیفہ ہے اس توجیہ یا تاویل سے تفسیر خزائن پر مندرجہ ذیل ممنوعات سے کوئی حجت نہیں پڑتی۔ بہر حال یہ مکالمہ سرے سے بے بنیاد اور غلط ہے۔ اس کی چند وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ:۔ اس قسم کے واقعات و مکالمات سیر و تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس اگر یہ مکالمہ اور بات چیت ذرا بھی درست واقعہ ہوتی تو لازماً امام اعظم کی کسی تاریخ یا سوانح میں مذکور ہوتی۔ کیونکہ امر فطری کے مطابق ہر فن کی بات اسی فن کی کتب میں پائی جائیں تو قابلِ قبول ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس قابلِ تردید ہوے گی مثلاً علمِ طب۔ علم نحو۔ سائنس وغیرہ کی کوئی بات ان فنون کی کتب میں تو میسر نہ ہوں۔ دوسری کتاب میں اس کا تذکرہ موجود ہو تو ذی عقل حضرات کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگا۔ اگر دنیا کے لوگ اسی قاعدۂ کلیہ پہ کاربند ہو جائیں تو دنیا سے عملی تفرقے بازی اور فکری و نظری فساد ختم ہو جائے حضرت قتادہ کا یہ مکالمہ بعض تفسیر میں ملتا ہے۔ مگر تاریخ یا سوانحِ امام کی کسی کتاب میں نہیں ملتا اس لیئے جہلاء تو اس مکالمے کو درست کہہ سکتے ہیں مگر محققین علماء پر اس کی تردید اخلاقاً واجب ہے۔ ورنہ فسادِ عدیدہ کا باب کھل جائے گا۔ اور اس طرح کے بناوٹی واقعات سے کسی بھی بزرگ کی توہین کی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے لے کر شبلی نعمانی تک کسی مورخ نے بھی اس واقعے کا ذکر نہ کیا۔ حالانکہ بے شمار سوانحاتِ امام اس دوران مرتّب و شائع ہوئیں۔ بلکہ اکثر متقدمین و متاخرین نے لکھا کہ امام اعظم فنِ حدیث میں حضرت قتادہ کے شاگرد ہیں (دیکھو طبقات الحفاظ و تہذیب الکمال اور شبلی نعمانی کی امام اعظم) ایسے واقعات گھڑ کر امام اعظم کے استادِ محترم کی توہین کرنا مقصود ہو سکتی ہے۔ جو سراسر اکابر کی گستاخی کے مترادف ہے۔ **تیسری وجہ:۔** تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت قتادہ صرف ایک مرتبہ کوفہ تشریف لائے اور آپ کی طرف سے لوگوں کو بتانے مسائل پوچھنے کے لیئے۔ اعلان کرایا گیا تھا۔ اس وقت حضرت امام اعظم تقریباً سولہ سال کے نوجوان تھے اور فقہ اسلامی کے ادنیٰ طالب علم اور حضرت امام حماد کے بڑے شاگردوں میں تھے اس وقت امام اعظم

نے چند سوال کیئے تھے مگر ان سوالات میں مذکورہ سوال نہ تھا۔ ثابت ہوا کہ یہ واقعہ غلط اور بناوٹی ہے۔ اور پھر حضرت امام اعظم کی عمر کے بارے میں بعض مفسرین بھی اور لاہوری فتوے میں بھی صغر سنی اور غلامٌ حَدَثٌ لکھا ہے حالانکہ یہ عمر قریب بلوغ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ لغات کشوری ص ۲۹۲ پر صغر سنی کا ترجمہ کرتے ہیں لڑکپن اور مجمع البحار جلد اول ص ۲۲۴ پر غلامٌ حَدَثٌ کا ترجمہ کرتے ہیں اول عمر۔ یہ قریباً بارہ سال کی ہوتی ہے۔ اور اس عمر میں امام اعظم و حضرت قتادہ کی ملاقات کا کہیں تذکرہ نہیں ملا پس ثابت ہوا کہ یہ واقعہ محض بناوٹی ہے لہٰذا نا قابلِ قبول :۔ **چوتھی وجہ** :۔ اس واقعے میں صرف حضرت قتادہ ہی کی گستاخی نہیں امام اعظم کی بھی گستاخی ہے۔ اس لیئے کہ نحوی قاعدے کے اعتبار سے لفظ نملۃٌ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ لفظ مذکر ہے اور آخر کی ت وحدت کی ہے۔ اور قالت مؤنث کا صیغہ تاء وحدت کے لیئے لگایا گیا نہ کہ تاء تانیث کے لیئے۔ کیونکہ مؤنث کا صیغہ مؤنث حقیقیہ کے علاوہ بھی بہت جگہ استعمال ہو جاتا ہے۔ جس کی مثالیں قرآنِ کریم میں بہت جگہ ہیں۔ مثلاً ع۱ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ (ترجمہ) :۔ فرمایا ان کو ان کے رسولوں نے۔ دیکھو لفظ رُسُلٌ جمع ہے رسول کی اور رسول مذکر ہوتا ہے کہ مؤنث مگر قالت مؤنث کا صیغہ آیا ع۲ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ۔ ترجمہ :۔ اور ایک قافلہ آیا (کنز الایمان)۔ سَيَّارَةٌ میں ت وحدت کی ہے جس کا ترجمہ ہوا ایک قافلہ۔ تا فلہ مذکر ہے اسی لیئے اعلحضرت و دیگر مترجمین نے اس کا ترجمہ آیا کیا ہے نہ کہ آئی۔ لیکن سَيَّارَةٌ کے مذکر ہونے کے باوجود بھی صیغہ مؤنث جاءت فرمایا گیا۔ ثابت ہوا کہ وحدت کی ت کے لیئے بھی صیغہ مؤنث بولا جاتا ہے۔ اس قاعدے کے تحت امام اعظم کا وہ جواب غلط ہو جاتا ہے جو نملۃٌ کی تانیث کی دلیل میں دیا۔ بدیں وجہ بہت سے مفسرین نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔ کہ اس طرح خود امام اعظم کی گستاخی و توہین ہے کہ وہ ایسا جواب دیں جو نحو کے خلاف ہو ع۲ دوسرا احتمال لفظ نملۃٌ میں یہ ہے کہ یہ ت مؤنث کی ہو۔ اگر یہ احتمال درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال اتنا معمولی رہ جاتا ہے کہ اس کو ہر عربی دان بچہ یا چھوٹی کتب کا طالبِ علم بھی فوراً حل کر دیتا ہے۔ بلکہ یہ سوال و جواب چھوٹے طلباء کے ہی لائق ہیں۔ اکابر کے سامنے ایسے معمولی سوال کرنے ہی بیوقوفی ہے۔ بلکہ ایسے سوال اہلِ زبان کے سامنے کرنے مزید حماقت ہے اس کی مثال اپنی زبان میں اس طرح ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کسی سے سوال کرے کہ بتاؤ۔ اقبال آئی تھی "میں اقبال مذکر ہے یا مؤنث۔ ظاہر بات ہے کہ اردو دان بچہ اس کا فی البدیہہ صحیح جواب دے سکتا ہے۔ تو یہ سوال کسی بڑے عالم سے کرنا محض حماقت ہی ہو گی۔ اب کوئی کہے کہ: اقبال آئی تھی :۔ والا سوال کسی فلاں عالم سے کیا گیا مگر وہ جواب نہ دے سکا اس عالم کی سخت توہین ہے

لاہوری فتوے کا یہ فرمانا کہ حضرت قتادہ کی جواب سے خاموشی اس بنا پر ہے کہ نملۃ کا لفظ عربی میں مذکر مونث ہر دو کے لیے مستعمل ہے یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اس لیئے کہ اس اشتراک کی صورت میں فیصلہ قالت کی تانیث نے کرنا ہے نہ کہ نملۃ کی ت نے۔ اور قالت تو فقط مونث ہی ہے۔ جس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ پس اتنے بڑے عربی نسل زبان دان عالم حضرت قتادہ کا خاموشی اختیار کرنا تعجب ناک ہے۔ جیسے کہ لفظ اقبال ہماری اردو میں مذکر۔ مونث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ تو یہاں آئی تھی۔ نے فیصلہ کرنا ہے جس کو اردو زبان کا بچہ بچہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح قالت کی تانیث کو عربی دان بچہ بچہ سمجھتا ہے۔ پس یہ سوال نہ شانِ امام کے لائق نہ حضرت قتادہ کے۔ بلکہ اس قسم کی بحثوں میں پڑنا اور ایسے معمولی سوالات کا جواب دینا خود میں بھی وقار علماء کے خلاف سمجھتا ہوں۔ مگر چونکہ ایسے بناوٹی اور بیہودہ واقعات اور پھر ان میں کچھ بحث کرنے سے دو بزرگ ترین ہستیوں کی گستاخی لازم آتی تھی اس لیئے واجب عملی سمجھتے ہوئے اس کے جواب پر میں نے قلم اٹھایا۔ کیونکہ مسلکِ اہل سنت نہ تو شیعہ لوگوں کی طرح حماقت کی تعریف کرنا ہے اور بیوقوفی سے شان بیان کرنا۔ نہ ہی دیوبندیوں کی طرح ایک بزرگ کی شان گھٹا کر دوسرے کی عزت بڑھانا ہے۔ اہلِ سنت تو اسلام کے سب بزرگوں کی عزت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی غلط باتیں بنانا چھوٹی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اس بناوٹ سے صرف حضرت قتادہ ہی کی توہین نہ ہوتی تھی بلکہ ایسے کچے سوال وجواب سے خود حضرت امام اعظم کی علمی وجاہت پر حرف آتا تھا۔ اس لیئے اس کو غلط ثابت کرنا ہم جیسے نمک خواروں پر اخلاقی فرض ہے:۔

پانچویں وجہ! بجز چند مفسروں کے سب مفسرین نے اس مکالمے کی تردید کی ہے۔ اور اکثر نے اس مکالمے کا ذکر تک نہ کیا جنھوں نے کیا انہوں نے ساتھ ہی کہدیا کہ یہ واقعہ تاریخاً اور عقلاً غلط ہے۔ چنانچہ تفسیر جمل جلد سوم صـ ۳۶۸ للشیخ سلیمان جمل یہ ہے:۔ اِلَّا اَنَّ الشَّیْخَ قَدْ رَدَّ ھٰذَا۔ فَقَالَ وَلِحَاقُ التَّاءِ فِي قَالَتْ لَا یَدُلُّ اَنَّ النَّمْلَۃَ مُؤَنَّثَۃٌ بَلْ یَصِحُّ اَنْ یُّقَالَ فِي الْمُذَکَّرِ قَالَتْ نَمْلَۃٌ۔ (الخ):۔ (ترجمہ):۔ مگر شیخ نے اس مکالمے کی تردید کر دی پس فرمایا کہ ت کا قالت میں لگنا اس بات کو نہیں بتاتا کہ نملۃ مونث ہے بلکہ مذکر میں قالت نملۃ کہنا بھی صحیح ہے۔ تفسیر روح المعانی نے فرمایا۔ صفحہ نمبر ۱۷۸ پ ۱۹:۔

اِنَّ التَّاءَ فِي نَمْلَۃٍ لِلْوَحْدَۃِ (الخ) وَالْجَزْمُ الْقَوْلُ بِعَدَمِ صِحَّۃِ ھٰذِہِ الْحِکَایَۃِ (الخ) وَ قَتَادَۃُ بْنُ دُعَامَۃَ السَّدُوْسِیُّ بِاِجْمَاعِ الْعَارِفِیْنَ

بِالرِّجَالِ كَانَ بَصِيْرًا بِالْعَرَبِيَّةِ فَيَبْعُدُ كُلَّ الْبُعْدِ وُقُوْعُ مَا ذُكِرَ مِنْهُمَا۔

(ترجمہ):۔ نملۃ میں ت وحدت کی ہے (نہ کہ تانیث کی) اور حکایت مذکورہ کے غیر صحیح ہونے پر یہ قول یقینی ہے اور قتادہ بن دعامہ سدوسی تمام عارفین علماء کے اجماع کے مطابق عربی زبان اور قواعد سے بہت زیادہ واقف تھے لہٰذا ایسے مکالموں اور سوال جواب کا ان دونوں بزرگوں سے واقع ہونا عقل وفہم سے بہت دور ہے۔ (یعنی کسی احمق نے یہ واقعہ گھڑ لیا ہے):۔ تفسیر صاوی جلد دوم صـ ۱۵۷ پر ہے:۔ قَالَ بَعْضُهُمْ وَفِيْهِ نَظَرٌ لِاَنَّ لِحَاقَ التَّاءِ فِي قَالَتْ لَا يَدُلُّ عَلٰى اَنَّهَا مُؤَنَّثَةٌ لِاَنَّ تَاءَ لَا لِلْوَحْدَةِ لَا لِلتَّانِيْثِ وَمَا اسْتَدَلَّ بِهِ اَبُوْحَنِيْفَةَ يُفِيْدُ الظَّنَّ لَا التَّحْقِيْقَ۔ (ترجمہ):۔ بعض محققین نے فرمایا کہ اس مکالمے پر اعتراض ہے۔ اس لیئے کہ امام اعظم کی دلیل تحقیقی نہیں بلکہ وہمی ہے۔ کیونکہ قالت میں ت ہونا اس وجہ سے ہے کہ نملۃ کی ت وحدت کی ہے نہ کہ تانیث کی۔ علامہ صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اگرچہ اس واقعے کی تردید قال بعضھم جیسے صیغۂ تمریض سے کی مگر اس کے بعد اعتراض کا جواب نہ دینے سے ان کی اپنی تائید بھی اس تردید میں شامل ہو گئی۔ گویا کہ علامہ صاوی نے بھی اس مکالمے کی تردید کر دی۔ دیکھو معاذ اللہ اگر اس مکالمے کو درست مانا جائے تو امام اعظم جیسی ذی علم ہستی کو غلط کہنا پڑے گا اور ان کی باتوں کو کمزور اور ان کی دلیلوں کو ظنی وہمی اور حقیقت سے دور کہنا پڑے گا۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی غلط باتوں کا یکسر انکار کر کے اپنے اکابر کی خداداد عزت بچائی جائے۔ اور اغیار کے قلوب میں جہاں تک ممکن ہو بزرگانِ اسلام کا وقار قائم کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ اس قسم کا مکالمہ امام صاحب کی نسبت قطعاً غلط اور بناوٹی ہے ہاں البتہ ایک موقعہ پر شاگردی کرنے سے پہلے امام اعظم نے حضرتِ قتادہ سے بطور مستفتیانہ چند بڑے بڑے فقہی۔ تفسیری سوال کیئے تھے حضرت قتادہ کا جواب نہ دینے کو حقیقی طور پر تو وہ خود ہی جانتے ہیں مگر تاریخی طرز تحریر سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت قتادہ نے بطور احتیاط جلد بازی سے اجتناب کرتے ہوئے امام اعظم کے اُن سوالات کا جواب نہ دیا کیونکہ جلد بازی میں اسی طرح غلطیاں اور بے احتیاطیاں ہو جاتی ہیں جس طرح گوجرانوالے اور لاہور کے فتوے میں ہوئیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ایسے جلد باز مفتیوں کو فتوے نویسی سے روکنا چاہیئے ورنہ قوم کی گمراہی کا اندیشہ ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ﷺ

کتبہ

سن عیسوی اور سن ہجری کا بیان

سوال ۱۴۲ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق مروجہ سن عیسوی کا آغاز (نعوذ باللہ) نقل کفر کفر نہ باشد بقولِ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی وفات سے ہوا۔ ایسی صورت میں ہم مسلمانوں کو اس سن پر اعتماد کرنا چاہیئے یا نہ۔ اور اپنے افعال و اعمال کا اس پر دارومدار رکھنا چاہیئے یا کہ نہیں۔ نیز یہ سن اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اور اسلامی تاریخوں سے بیگانگی و نا واقفیت کہاں تک جائز ہے۔ اور صرف ہجری سن مبارک کی جنتری یا کیلنڈر چھپوانا جائز ہیں یا نہیں۔

سائل :۔ محمد ادریس کشمیری بازار لاہور۔ مورخہ = ۷۲ - ۵ - ۱۷

الجواب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَاَسْرَی الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَیْنِ لِحُسْبَانٍ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ الَّذِیْ خُلِقَ لَہُ الْاَرْضُ وَالسَّمٰوٰتُ وَالْجِنَانُ ۔ اَمَّا بَعْدُ،

جاننا چاہیئے کہ تمام دن رات، سال، مہینے اللہ کے ہی ہیں۔ وہی جس طرح چاہتا ہے پھیرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ۃ (ترجمہ) ہم ہی دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے ہیں: قانون فطرت کے مطابق زمین و آسمان میں دو قسم کے چکر ہیں۔ ان ہی دو چکروں کی بنا پر نظام کائنات کو اس صانعِ قدرت نے قائم فرمایا۔ ایک چکر رفتارِ شمسی سے متعلق ہے اور ایک چکر رفتارِ قمری سے۔ چاند کی رفتار سے قمری سال اور مہینے بنتے ہیں۔ سورج کی رفتار سے شمسی سال اور مہینے۔ رات دن سال مہینے قمری ہوں یا شمسی سب ہمارے رب العالمین کے ہیں۔ جب ہم مسلمان اپنے رب کے بندے تو اللہ کریم ہمارا۔ اور ہمارے رب کی چیز ہماری چیز۔ پس شمسی مہینے بھی ہمارے اور قمری بھی ہمارے۔ جس سن کو بھی مسلمان استعمال کریں بالکل جائز ہے۔ چاند و سورج کی گردش کا مقصد ہی کائنات کا حساب درست رکھنا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۙ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۃ ترجمہ: سورج اور چاند حساب کے لیے بنائے۔ اور تمام تارے اور درخت اس کو ہی سجدہ کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے :۔ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ۃ ترجمہ: وہی اللہ وہ ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا۔ اور منزلیں مقرر فرمائیں۔ تاکہ سالوں کی گنتی اور حساب کا علم لوگوں کو آجائے۔ اور حقیقت بھی ہے۔ اگر یہ گردش نہ ہوتی تو کائنات میں کسی انسان کو سال و ماہ کا حساب نہ آتا۔ ثابت ہوا کہ جس طرح چاند کی تاریخیں قرآن و حدیث سے بنی ہیں۔ اسی

طرح سورج کی تاریخیں بھی رب تعالیٰ کی ہی بنائی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شمسی تاریخوں اور حساب کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ سورۃ کہف پارہ ۱۵ میں ارشاد ہے:۔ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ (ترجمہ) اور ٹھہرے وہ اپنے غار میں تین سو سال اور نو سال اور زیادہ رہے۔ حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا کہ یہاں تین سو سال یعنی ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ سے مراد قمری مدت ہے اور وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ سے مراد شمسی سال ہیں۔ کیونکہ سورج کا چکر لمبا ہونے کی بنا پر شمسی سال قمری سال سے دراز ہوتا ہے۔ اصحاب کہف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت سے ہیں۔ اصحاب کہف کا یہ واقعہ جس کا ذکر قرآن کریم میں بیان ہوا۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے دو سو سال پہلے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ سن شمسی بھی قرآن کریم سے ثابت ہے اور قمری سن بھی بالکل معتبر ہے۔ اور اس کا استعمال بالکل جائز ہے۔ پیش کردہ پہلی آیت کریمہ میں قَدَّرَهٗ کی ہ ضمیر مفسرین عظام کے نزدیک شمس و قمر دونوں کی طرف مرجوع ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے حاشیہ پر تفسیر ابو السعودی جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۲۱ سورت یونس میں فرمایا وَقَدْ جُعِلَ الضَّمِيْرُ لِكُلٍّ مِّنْهُمَا دَهِيَ ثَمَانِيَةٌ وَّعِشْرُوْنَ ۝ (ترجمہ) اور بیشک قَدَّرَهٗ کی ضمیر کا مرجع چاند و سورج دونوں ہیں۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ سن عیسوی کو استعمال کرنا جائز ہے۔ قرآن کریم میں وَازْدَادُوْا تِسْعًا کا لفظ سن عیسوی کو ہی بیان فرما رہا ہے۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ سن عیسوی کب سے شروع ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی سے شروع ہوا۔ جس کو عیسائی اور مرزائی حضرت عیسیٰ کی موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحیات ظاہری جسدی آسمان کی طرف اُٹھائے گئے۔ مسلمانوں کے پاس عقلی ونقلی بے شمار دلائل ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے۔ آیت کریمہ میں ارشاد ہے:۔ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ۝ (ترجمہ) اے حضرت عیسیٰ میں تم کو پوری عمر عطا کروں گا۔ اور اپنی طرف تم کو اٹھانے والا ہوں۔ یہاں رَافِعُكَ میں لفظ کَ ہے جسے زندہ انسان کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی روح اور جسم دونوں۔ صرف روح کو کسی ذی عقل انسان نے آج تک لفظ کَ یا آپ جناب سے مراد نہ لیا۔ حیات مسیح کی دوسری دلیل یہ آیت ہے۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۝ (پارہ ۳ رکوع ۱۲) (ترجمہ) کلام کریں گے وہ بچپن، شیر خوارگی میں اور بڑھاپے میں۔ یہ خطاب حضرت مریم سے رب تعالیٰ نے فرمایا۔ اور حضرت مسیح کی شان بتائی۔ بڑھاپا پچاس سال کے بعد ہوتا ہے۔ حالانکہ رفع آسمانی بعمر تیس سال ہوئی۔ نصاریٰ کے علاوہ بعض مسلمان مورخین بھی اس چیز کے قائل ہیں۔ کہ یہ سن

عیسوی حضرت عیسیٰ کے رفع آسمانی سے شروع ہوئی۔ چنانچہ علم ریاضی کی مشہور کتاب تدریس ریاضی کے مصنف مسٹر معز الدین اپنی اس کتاب کے صفحہ نمبر ص۲ پر ایسا ہی لکھتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے۔ کہ موجودہ عیسوی سن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پاک سے شروع ہوا۔ اکثر عیسائی مورخین اور مسلمان محققین اسی چیز کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ عیسائی لوگ اپنے بڑے دن پر ولادتِ مسیح کی خوشی مناتے ہیں۔ سائل مذکور نے جو ابتداءِ سنِ عیسوی کا نظریہ پیش کیا۔ کہ یہ سن بقولِ نصاریٰ وفاتِ مسیح سے شروع ہوا۔ بجز چند لوگوں کے کسی کے نزدیک درست نہیں۔ غالباً یہ نظریہ سائل نے تدریسِ ریاضی سے اخذ کیا ہے۔ مگر یہ محققین کے نزدیک بطور حساب بھی ٹھیک نہیں۔ صحیح نظریہ ہے کہ عیسیٰ کی پیدائش سے یہ سن شروع ہوا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا جس کو عربی میں قاموس العلوم یا مجمع العلوم کہتے ہیں۔ اس کے صفحہ نمبر ص۳ پر بھی یہی لکھا ہے۔ کہ موجودہ مروجہ سن عیسوی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے شروع ہوا۔ اکثر عیسائی پادری بھی یہی کہتے سنے گئے۔ خیال رہے کہ شمسی تاریخوں کا رواج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پندرہ سو سال پہلے مروج تھا۔ اور موجودہ شمسی مہینوں کے نام جنوری، فروری، مارچ، اپریل وغیرہ ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے مقرر ہو چکے تھے۔ اور لیپ سال کی تاریخیں ولادت عیسیٰ علیہ السلام سے چھیالیس سال پہلے وجود میں آئیں۔ موجودہ شمسی مہینوں کے نام پرانے بادشاہوں کے نام پر ہیں۔ دورِ جاہلیت میں ایک بہت بڑا خاندان سیزر نامی کے بارہ فاتحین کے نام پر بارہ شمسی مہینوں کے نام رکھے گئے۔ جولیس سیزر کے نام پر جولائی رکھا گیا۔ اگسٹس سیزر کے نام پر اگست کا مہینہ مقرر ہوا وغیرہ وغیرہ۔ جن تاریخوں میں جس کو فتح نصیب ہوئی اسی مہینے کا نام تبدیل کر کے اسی فاتح کے نام پر رکھا گیا۔ اس خاندان کا جدِّ اعلیٰ سیزر نامی ایک بادشاہ تھا۔ لیپس کا سال بنانے والا برٹس سیزر ہے۔ یہ مشہور نام تو ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے بنے۔ لیکن اس سے پہلے بھی سوائے عرب کے باقی دنیا میں شمسی تاریخوں سے حساب کتاب کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مہینوں کے نام جنوری، فروری نہ تھے۔ بلکہ مختلف قوموں نے مختلف نام رکھے تھے۔ چنانچہ بعض نام شمسی مہینوں کے اب بھی مروّج ہیں۔ جیسے ساون، بھادوں، ماہ، پوس وغیرہ یہ بھی سورج کی تاریخوں سے چلتے ہیں۔ اور ان کی عمر آج سے چار ہزار سال پہلے کی ہے۔ ثابت ہوا کہ شمسی مہینے عیسائیت سے خاص نہیں۔ نہ ہی جنوری فروری انگریزوں کی ایجاد ہے۔ ہاں البتّہ عرب علاقوں میں صرف قمری تاریخوں سے حساب کیا جاتا تھا۔ اور عربی نجومیوں کو صرف قمری حساب سے واقفیت تھی۔ شمسی تاریخوں سے ان کو کوئی دلچسپی اور علمی واقفیت نہ تھی۔ لیکن چونکہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تا قیامت تمام کائنات کی ہر قوم کی طرف نبی بن کر تشریف لائے۔ اس لیے آپ کو رب تعالیٰ نے ہر قسم کے شمسی، قمری

مہینوں کے حسابات سکھا کر بھیجا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورتِ کہف کی وَازْدَادُوْا تِسْعًا ہ والی آیت نازل ہوئی۔ تو عرب یہودی بطور سائل نبی کریم سے پوچھنے لگے۔ تین سو سال تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ نو سال کی زیادتی کیونکر ہوئی۔ آقائے کل دانائے سبل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شمسی حساب کے فارمولے سمجھائے اور پوری طرح رفتار شمس کی چالیں بیان فرما کر بڑے بڑے یہود منجمین و حساب دان عرب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور بڑے بڑے فلسفیوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ یہ عرب کا اُمّی لقب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔ سب کائنات سے زیادہ حساب دان ہے۔ تب حقیقت بین لوگوں کو کہنا پڑا۔ شعر

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا

وہ راز اُس طیبہ والے نے سمجھا دیا چند اشاروں میں

دنیا کے وہ بدنصیب جو اپنی ضد اور تعصب کے بل بوتے پر کسی طور پر نبی کریم کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننے اور قرآن کریم کو کلام اللہ تسلیم کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکتے تھے۔ شمسی حساب دانی کی ان ہی گتھیوں کو سلجھا کر حقانیتِ قرآن اور نبی کریم کی علمی شان ماننے پر مجبور ہو گئے۔ آج کے دور کے منکرین کو ثابت ہو چکا۔ کہ ہر قمری سو سال پر شمسی تین سال زائد ہوتے ہیں۔ اس حساب سے تین سو سال پر نو سال کی زیادتی بالکل درست ہے۔ آج کے ریاضی دان و حساب دان پر یہ تحقیق شاید کچھ اثر انداز نہ ہو۔ مگر آج سے چودہ سو سال پیچھے لوٹ کر دیکھا جائے۔ تو سرزمین ریگستان میں علم و حساب کے ایسے غنچے کھلنے ایک معجزے سے کم نہیں۔ معلوم ہوا کہ حساب قمری ہو یا شمسی سب میرے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے شجرِ سدا بہار سے پھوٹے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام علوم انہیں کلیوں کی چٹک انہیں پھولوں کی مہک اور اسی آقا کی بکھیر ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں ارشاد ہوا:۔

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ ہ (ترجمہ) علم و حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ گم شدہ اس لیے کہ نبی کریم کی بکھیر ہے اور بکھیرنے پر کچھ تو مل جاتا ہے۔ کچھ گم شدہ رہتا ہے۔ جو بعد میں آنے والے راہ گزروں کو ملتا رہتا ہے۔ دنیا جہان کا قاعدہ ہے کہ ہر ذی عقل اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ پھر جہاں سے پاتا ہے، حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم رؤف و رحیم نے فرمایا:۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ ہ (جامع صغیر للسیوطی رح جلد دوم) ترجمہ اے میرے امتیو علم ڈھونڈتے رہو اگرچہ چین میں ہو۔ اس لیے کہ علم میری بکھیر ہے۔ اور تمہارے لیے بکھیر ہے۔ اب یہ قسمت کی بات ہے کہ اس کو اپنا اٹھائے یا پرایا۔ لہٰذا علم شمسی جنتری کا ہو یا قمری کا سب کچھ سیکھنا۔ جنتری، کیلنڈر رکھنا بالکل جائز ہے

امام اعظم کے نزدیک سنِ شمسی بالکل معتبر ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر صفحہ ۲۲۳ پر ہے۔
رَوَی الْحَسَنُ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَّہٗ تَعْتَبِرُ سَنَۃً شَمْسِیَّۃً وَھِیَ تَزِیْدُ عَلَی الْقَمَرِیَّۃِ بِاَیَّامٍ۔ (ترجمہ) امام حسن نے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ بے شک شمسی سال بھی شریعتِ اسلامیہ میں قابلِ قبول ہے۔ اور وہ قمری سن سے چند دن زیادہ ہوتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود صحابہ کرام، خلفاء راشدین اور سابقہ سلاطین اسلامیہ اور فی زمانہ عرب ممالک نے سن ہجری ہی کو اپنایا۔ اسی پر نظام حکومت کو ترویج دینے چلے آرہے ہیں اور کیوں؟ جنوری، فروری سے وہ بھی آشنا تھے۔ شمسی رفتاروں، تاریخوں کو وہ بھی جانتے تھے۔ دریائے علومِ ادوار کے وہ بھی شناور تھے۔ پاکستانی وہندی مسلمان کوئی زیادہ ترقی یافتہ تو نہیں۔ ازمنۂ سابقہ سے قطع نظر اب بھی عرب لوگ تہذیب اخلاق لین دین اور ایمان داری، تجارت، کاروبار، فراوانی دولت میں سب دنیا سے زیادہ ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سن ہجری کو ہی استعمال کیا۔ انہوں نے پاکستانیوں کی اوندھی عقل کی طرح کیوں نہ سمجھ لیا کہ سن عیسوی میں ہی ترقی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم مسلم کو سبق سکھایا۔ یعنی اے مسلمانو! تم ساری دنیا کے علوم حاصل کرو مگر وابستگی اُن ہی چیزوں سے رکھو۔ جن سے تمہارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو نسبت ہو۔ کیونکہ پناہ اپنے ہی آشیانے میں ملتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شمسی مہینے اور سال بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ مگر رسول اللہ کا پیار صحابہ کرام کی نسبت اور دین اسلام کی تمام عبادات وریاضات اسی سن ہجری سے ہی وابستہ ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے یہی بہتر ہے کہ سن ہجری کے مہینوں۔ محرم، صفر۲، ربیع الاول۳، ربیع الآخر۴، جمادی الاول۵، جمادی الآخر۶، رجب۷، شعبان، رمضان، شوال ذیقعد اور ذی الحج۱۲ سے تعلقِ دنیاو آخرت قائم کرے۔ یہ قمری اور سن ہجری کے مہینوں کے نام ہیں۔ یہ اسماء مشہور اگرچہ عرب میں پہلے ہی رائج تھے۔ اور نبی کریم کی تشریف آوری سے ایک ہزار سال پہلے ریگستان کے مختلف موسموں کی بنا پر یہ نام رکھے گئے۔ مگر موجودہ سن ہجری آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے فوراً بعد مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں رائج ہوئی۔ اور دورِ فاروقی سے اس پر قانونی طور پر عمل کیا گیا۔ فاروق اعظم ہی کے مشورے سے نبی کریم کی تاریخ ہجری سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اور اس کے مہینے وہی مقرر کیے گئے، جو پہلے سے عرب دنیا میں رائج ومشہور تھے۔ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ یہ مہینے حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لے کر تشریف لائے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر لگی تو محرم کی دس تاریخ تھی۔ اس سے واضح ہوا کہ نوح علیہ السلام کے وقت محرم کا مہینہ رائج تھا۔ ہماری اس تمام گفتگو اور دلائل سے ثابت ہوا کہ کوئی دن کوئی مہینہ کسی نام سے یا کسی موسم اور سیارے سے منسلک سب ہی اسلام میں معتبر ہیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

لیلیٰ مجنوں کے تاریخی حالات

سوال نمبر ۴۳ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مجنوں کون تھا۔ لیلیٰ مجنوں کے قصے میں جو مجنون قیس بن عامر مشہور ہے۔ کیا اُس کو رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز ہے۔ اور کیا اس کی ملاقات امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی۔ براہِ کرم وضاحت فرمائیں۔

دوسرا مسئلہ: یہ ہے کہ بواسیر کے چھلے جو تانبے یا لوہے کے بنے ہوتے ہیں۔ اور بیماری کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ مسلمان مرد و عورت کو جائز ہے یا نہیں؟ ایسے ہی جرمن کے بنے ہوئے ہیلتھی رِنگ جو بہت سی جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ تانبے یا پیتل کے بنے ہوئے مسلمان مرد اور عورت کو پہننے جائز ہیں یا نہیں؟ بَیِّنُوْا وَ تُوْجَرُوْا ۔

السائل:۔ حضرت قبلہ علامہ ابوالعلا محمد عبداللہ صاحب قادری اشرفی ناظم دارالعلوم جامعہ حنفیہ قصور ضلع لاہور۔ مورخہ ۲۰-۱۲-۱۹۶۸

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّاب

الجواب

قبلہ علامہ صاحب وعلیکم السلام ثم السلام علیکم۔ استفتاء گرامی تشریف لایا حضرت حکیم الامت حج کے ارادے سے ویزا لگوانے کے لیے علامہ شاہ احمد نورانی صاحب مدظلہ کی دعوت پر کراچی تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت قبلہ کے اوپر کے اسباق بھی اور صبح کا درس قرآن وحدیث طیبین بھی میرے سپرد ہو گئے۔ دارالافتاء کا کام بھی میری ذمہ داریوں میں شامل۔ بحمد اللہ تعالیٰ ان سے روزمرہ فراغت پاکر کتب خانے کا کام بھی سر انجام دیتا ہوں۔ عجب فرحت انگیز ذکر اللہ و ذکر رسول میں ایام حیات کو مراد دل آویزی نصیب ہے۔ کیا شان ہے مجالس درس و محافل تدریس کی اس لذتِ جنون کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو بادۂ عشق میسر ہو۔ تفکراتِ دنیا کی عقل بابیوں سے اکتا کر جب کوئی ذی عقل و خرد ہم جیسے مجنون کی محافلِ یگانہ کی جھلک ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔ تو کیفِ الہیانی و سکونِ قلبی کے ان گوشوں سے سرشار ہو کر سربسجود و دست بدعا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ملتجی دربارگاہ ہوتا ہے کہ۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

حسبِ سابق اسی جنون میں صبح سے لذتِ علم وفقہ حاصل کر رہا تھا کہ آپ کا استفتاءِ مجنون بدستِ غیر میسر ہوا۔ پس اسی حالت جنون میں حالاتِ مجنون کی طرف متوجہ ہوا۔ جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور

اور کانوں نے سنا۔ وہی ذہن میں سمایا۔ اور ذہن نے جو عطا کیا۔ وہی آپ کی خدمت میں قلم موشگاف نے پیش کیا۔ لہٰذا جوابِ سوال اس طرح ہے۔ کہ مجنون کے بارے میں ہمارے مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض تاریخی دنیا میں قدم رکھنے والوں نے تو سرے سے مجنون کے وجود کا انکار ہی کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک فرضی نام ہے۔ اس کے سب قصے عشق کے مثل الف لیلیٰ بناوٹی اور شاعرانہ خیالات و تصورات کی آماجگاہ ہے ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ چنانچہ کتاب الاغانی جلد دوم صفحہ نمبر ۳ پر ہے: اَخْبَرَنِیْ هَاشِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا الرِّيَاشِيُّ قَالَ سَمِعْتُ الْاَصْمَعِيَّ يَقُوْلُ رَجُلَانِ مَا عُرِفَا فِي الدُّنْيَا قَطُّ اِلَّا بِالْاِسْمِ اَحَدُهُمَا مَجْنُوْنٌ وَثَانِيْهِمَا ابْنُ الْقِرِّيَةِ اِنَّمَا وَضَعَهُمَا الرُّوَاةُ (ترجمہ) مجھ کو ہاشم بن محمد نے خبر دی۔ اس نے کہا ہم کو ریاشی نے بات بتائی۔ اس نے کہا میں نے اصمعی سے سنا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ دو مرد دنیا میں فقط نام کے مشہور رہیں۔ ان میں ایک مجنوں دوسرا ابن قریہ۔ یہ دونوں نام صرف ناول نویسوں کے خود ساختہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا وجود دنیا میں کبھی نہ تھا۔ اسی طرح آج کل ہیر رانجھا سسی پنوں، سیف الملوک وغیرہ کے بھی حقیقت کے منکر ہیں۔ مگر میں بلا تحقیق کسی چیز کے انکار کے خلاف ہوں۔ یہ کام کسل مندوں کا ہے۔

محقق حضرات مجنون کے وجود اور حقیقت کے قائل ہیں۔ ہاں زمانۂ وجود میں اختلاف ہے۔ چنانچہ سنایا مجھ کو مولانا مبارک محی الدین صاحب خطیب جامع مسجد بیگم پورہ گجرات نے۔ ان کو سنایا جناب صاحبزادہ پیر غلام محی الدین ابن حضرت اعلیٰ پیر سید مہر علی شاہ صاحب نے۔ ان کو فرمایا حضرت اعلیٰ پیر مہر علی شاہ صاحب قبلہ مدّ فیوضہم نے۔ کہ مجنون عاشقِ لیلیٰ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رضاعی بھائی تھا۔ اور امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہی اس کا نام مجنون رکھا تھا۔ اس روایت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مجنون کی ولادت قرنِ ثانیہ میں ہو۔ اور زیارت امام حسن سے تابعی یا تبع تابعی کا درجہ حاصل ہو۔ مگر مجھ کو اس روایت کی تواریخ سے تحقیق نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے یہ درست ہو۔ اس لیے کہ محقق اسلام قطب وقت پیر مہر علی شاہ صاحب کی طرف منسوب ہے ایک تحقیق یہ ہے کہ مجنوں جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہم زمانہ تھا۔ اور وہ زمانہ دورِ خلافت عباسیہ کا ہے۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب (منصور اور مجنون) کے صفحہ نمبر ۲۵ پر مجنوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ لکھا ہے۔ اگر اس قول کو صحیح تسلیم کیا جائے تو مجنون کا زمانہ تبع تابعین کے بھی بعد آتا ہے۔ کیونکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا زمانہ تیسری صدی ہجری میں ہے۔ آپ کی وفات شریف ۲۹۸ھ میں ہے۔ اور تبع تابعین کا زمانہ بعد میں آتا ہے کیونکہ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا زمانہ تیسری صدی ہجری میں ہے۔ آپ کی وفات شریف ۲۹۸ھ میں ہے اور تبع تابعین کا زمانہ ۲۲۰ھ تک ہے۔ اور تابعین کا زمانہ ۱۶۲ھ تک ہے۔ ان کڑیوں کو جوڑنے سے مجنون کا زمانہ تبع تابعین کے بعد ثابت ہوتا ہے۔ بعض مورخین نے لکھا کہ یہ مروان بن حکم کے زمانے میں پیدا ہوا۔ فارسی ادب کی کتاب (شعر و ادب) کے آخری صفحات پر مجنون کا وفات نامہ لکھا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۵۹۲ھ میں ہوئی۔ جس سے اس کا زمانہ اور پیچھے آجاتا ہے۔ اس کے زمانۂ حیات کی طرح اس کے سلسلۂ نسب میں بھی دو قول ہیں۔ بعض مؤرخین نے لکھا کہ یہ مجنون قیس بن خطیر ہے۔ مگر صحیح تر یہ ہے۔ کہ مجنوں کا اصل نام قیس ہے۔ اور اس کے والد کا نام ملوح بن مزاحم یمنی تھا۔ بہت خوبصورت دراز قد کا تھا۔

اس کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ قیس بن ملوح بن مزاحم بن عرس بن ربیعہ بن جعدہ بن عامر بن صعصعہ یمن کے مشہور قبیلے بنی عامر میں پیدا ہوا۔ اس کی جائے ولادت یمن کا ایک قریہ ریحان ہے چنانچہ ایسا ہی کتاب الاغانی جلد نمبر دوم صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے۔ عرب کے شاعروں کی طرح یہ بھی ایک عاشق مزاج شاعر تھا۔ بیماریِ عشق میں زمانۂ امردی سے مبتلا تھا۔ مگر چھوٹے عاشقوں کی طرح ہر در کا بھکاری نہ تھا بلکہ عاشق صادق تھا۔ اس لیے ایک ہی در سے وابستہ تھا۔ جہاں بھی ہوتا مدا اپنے ہی محبوب کی تھی عشق حقیقی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ عاشق صادق جس در پر بھی جائے۔ طلب اپنے ہی معشوق کی ہو۔ بلکہ عاشق کا دروازوں پر پھرنا ہی تلاشِ محبوب کے لیے ہو۔ آنکھیں اگرچہ کائنات کو دیکھیں۔ مگر قلبی تصورات اُسی سے معلق ہوں۔ مصرع تیرا ہی تصوّر رہے محفل ہو کہ تنہائی

قیس بن ملوح کا مطمع عشق فقط لیلیٰ بنت مہدی تھی۔ یہ ہی مجنون کی معشوقہ تھی۔ لیلیٰ بنت مہدی بھی قبیلہ بنی عامر سے تھی۔ مگر وطن ولادت نجد تھا۔ مجنون کے مرنے کے بعد اس کا نکاح بنی ثقیف قبیلے کے ایک اور مرد سے ہوا جس کے نطفے سے لیلیٰ کا لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام مالک رکھا گیا۔ اس بناء پر لیلیٰ کی کنیت اُمِ مالک ہوئی۔ بعض شعراء میں یہ مشہور ہے کہ لیلیٰ مجنوں بچپن میں ایک مکتب میں پڑھتے تھے۔ وہاں سے یہ قیس لیلیٰ کا عاشق ہوا۔ پھر عشق بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ہوا جو دنیا نے دیکھا۔ مگر یہ بات میری تحقیق سے باہر ہے۔

صحیح یہ ہے کہ عشق مجنوں کی ابتداء بلوغت سے ہوئی اور جب یہ لیلیٰ کا عاشق ہوا تو اس نے نماز روزہ وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ اور مجنونانہ کیفیات سے دربدر پھرنے لگا۔ چھوٹے بڑے پاگل دیوانہ سمجھ کر اس کو ستاتے۔ یہ خاموش رہتا۔ بجز لیلیٰ کے ذکر کے کسی کے ذکر سے اس کی زبان نہ کھلتی چنانچہ

کتاب الاغانی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۶ پر ہے۔ فَاِذَا ذُکِرَتْ لَہٗ لَیْلٰی اَنْشَاءَ یُحَدِّثُ عَنْھَا عَاقِلًا وَّلَا یُخْطِیُٔ حَرْفًا۔ وَتَرَکَ الصَّلٰوۃَ، فَاِذَا قِیْلَ لَہٗ مَالَکَ لَا تُصَلِّیْ۔ فَلَمْ یَرُدَّ حَرْفًا وَکُنَّا نَحْبِسُہٗ وَنُقَیِّدُہٗ فَیَعُضُّ لِسَانَہٗ وَشَفَتَہٗ۔ حَتّٰی خَشِیْنَا عَلَیْہِ۔ فَخَلَّیْنَا سَبِیْلَہٗ۔ (ترجمہ)

پس جب ذکر کیا جاتا اس کے سامنے لیلیٰ کا تو وہ بالکل سمجھداری کی باتیں لیلیٰ کے متعلق کرنے لگتا ایک حرف کی بھی غلطی نہ کرتا۔ اور نماز وغیرہ تو چھوڑ ہی چکا تھا۔ تو جب اس سے کہا جاتا کہ تیرا کیا حال ہے تو نماز نہیں پڑھتا تو بالکل خاموش ہو رہتا۔ کبھی کبھی ہم لڑکے اس کا راستہ روک لیتے اور اس کو کمرے میں قید کر دیتے۔ تو وہ اپنی زبان کاٹتا ہونٹ کاٹتا۔ یہاں تک کہ ہم آسی کے درد تکلیف اور خون نکلنے کے خیال سے ڈر جاتے۔ تو اس کا راستہ چھوڑ دیتے۔ قیس ایک مسلمان شاعر تھا۔ عشق لیلیٰ سے پہلے یا ظہور سے پہلے اپنے باپ ملوّح بن مزاحم کے ساتھ جا کر حج کیا۔ عشق لیلیٰ کی بناء پر لوگوں نے اس کا نام مجنون رکھ دیا۔ بعد میں اس نے خود اپنا تخلص مجنون رکھ لیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے۔ کہ یہ بچپن سے ہی عاشق ہو گیا تھا۔ اظہار عشق بعد بلوغت ہوا۔ خود اپنے ایک شعر میں کہتا ہے۔ شعر

اِنِّیْ لَمَجْنُوْنٌ بِلَیْلٰی مُؤَکَّلٌ
وَلَسْتُ عَزُوْقًا عَنْ ھَوَاھَا وَلَا جَلَدًا

بیشک میں ہی مجنون ہوں۔ لیلیٰ کے سپرد کیا ہوا۔ اور اپنی لیلیٰ کے عشق میں نہ میں جلد بازی کرنے والا ہوں نہ گھبرانے والا۔ ایسے تمام اشعار ذکر لیلیٰ ہی سے پر ہیں۔ عربی علاقوں میں دیوان قیس عام پڑھا جاتا ہے۔ یہ شعر کتاب الاغانی نے وہیں سے نقل کیا۔ جب کثرت جنون ہوا تو بستی کو چھوڑ کر وادیٔ عربی میں جبل نعمان کے پاس گوشۂ خلوت اختیار کیا۔ جغرافیائی اعتبار سے جبل نعمان نجد اور یمن کے درمیان دو پہاڑ ہیں۔ حضرت حکیم الامت نے یہ مقام دیکھا ہے۔ یہاں باد صبا کا رخ نجد کی طرف ہے۔ قیس کے والد ملوّح نے دو مرتبہ لیلیٰ کے باپ کو پیغام نکاح بھیجا۔ مگر مہدی نے اس غصے کی بناء پر کہ قیس نے میری بیٹی کو گلی گلی بدنام کر دیا۔ نکاح سے انکار کر دیا۔ مجنون نے زندگی کے آخری دن یہیں گزارے اور اسی ریگستانی علاقے میں فوت ہوا۔ قبیلے والوں کو پتہ لگا تو سب کو کف افسوس کے سوا کیا ہوتا البتہ لیلیٰ کا والد روتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ میں ہی اس کی اس حالت کا ذمے دار مجرم ہوں۔ مجنون بہت خوبصورت عربی النسل تھا۔ اور لیلیٰ سیاہی مائل گندمی رنگ کی تھی۔ غالباً اسی مناسبت سے اس کا نام لیلیٰ یعنی رات رکھا گیا۔ بہر حال اس کا وجود برحق ہے۔ مثنوی شریف میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ لغات کشوری صفحہ نمبر ۵۷۲ میں ہے۔ کہ قیس عاشق لیلیٰ کا نام ہے۔ مگر چونکہ وہ مجنون فی الدنیا ہے

نہ کہ مجذوب فی الآخرت۔ اس لیے اولیاء اللہ میں، نیز اس کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا رحمۃ اللہ علیہ کے لقب متبرکہ سے اس کو نہیں نوازا جا سکتا۔ کیونکہ جس طرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین سے خاص رہنا بہتر ہے۔ کہ امتیازی شان ظاہر ہو۔ اسی طرح رحمۃ اللہ علیہ اولیاء علماء سے خاص ہے۔ چنانچہ نووی شرح مسلم جلد اول مقدمہ صفحہ نمبر ۱۶ پر ہے۔ وَکَذٰلِکَ یَتَرَضّٰی وَیَتَرَحَّمُ عَلٰی سَائِرِ الْعُلَمَآءِ وَ الْاَخْیَارِ۔ (ترجمہ) اور اسی طرح رضی اللہ عنہ اور رحمۃ اللہ علیہ تمام علماء اور بزرگانِ دین پر بولا جائے۔ درمختار جلد پنجم صفحہ نمبر ۶۵۹ پر ہے۔ وَیُسْتَحَبُّ التَّرَضِّیْ لِلصَّحَابَۃِ وَالتَّرَحُّمُ لِلتَّابِعِیْنَ وَمَنْ بَعْدَھُمْ مِنَ الْعُلَمَآءِ وَالْعِبَادِ وَسَآئِرِ الْاَخْیَارِ وَکَذَا یَجُوْزُ عَکْسُہٗ۔
ترجمہ:۔ مستحب یہ ہے کہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب صرف صحابہ کرام کو دیا جائے اور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا لقب تابعین کرام اور بعد والے علماء اسلام متقی بندوں اور تمام دینی بزرگوں کیلئے استعمال کیا جائے۔ ان عباراتِ بالا و اعلیٰ و اولیٰ سے ثابت ہوا کہ یہ باوقار القاب صرف علماءِ امت، اور اولیاءِ ملت کے لیے کہے جا سکتے ہیں۔ دینی لحاظ سے غیر مشہور اشخاص کے لیے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے الفاظ استعمال کرنا جائز نہیں۔ ایسے ہی فاسق شرعی مسلمان کے لیے بھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لفظ نہیں استعمال کیے جا سکتے۔ اگرچہ معاشرہ کے لحاظ سے اس کا کتنا ہی اونچا مقام ہو جائے۔ بعض داڑھی منڈانے والے لوگ اصلاحِ معاشرہ یا خدمت خلق یا پیری مریدی کی بنا پر مسلمانوں میں اچھا مقام رکھتے ہیں۔ شرعاً اخلاقی طور پر ان کا احترام ٹھیک ہے۔ مگر رحمۃ اللہ تعالیٰ کا لقب ان کے لیے استعمال کرنا گناہ ہے۔ اور استعمال کرنے والا شرعی مجرم گناہ گار ہے۔

دوسرے سوال کا بالتفصیل جواب تو پہلے گھڑی کی چین والے فتوے میں دیا گیا ہے وہاں مطالعہ کرو۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اگر طبیبِ حاذق یہ کہہ دے کہ اس بیماری کا علاج ہیلیتھی رنگ کے سواء کسی اور چیز سے نہیں ہو سکتا۔ یا بواسیری چھلے کے بغیر ممکن نہیں اور یا اس بیمار نے بہت علاج کرائے مگر شفاء نہ ہوئی۔ تب بطورِ تجربہ و علاج، پیتل، تانبے کا چھلّہ اور ہیلیتھی رنگ پہننا جائز ہے ورنہ نہیں۔ ہمارے علاقے کے مشہور پیرِ طریقت حضرت قبلہ سید ملنگ شاہ صاحب جن کا اب وصال مبارک ہو چکا ہے۔ ان کا مزار مقدس ان کے آبائی وطن قریہ سوق کلاں متصل گجرات مرجع عوام ہے۔ ان کے ایک فرزند سید پیر صفدر شاہ صاحب نے از اول تا آخر مجھ سے ہی دینی علوم حاصل کیے ہیں۔ اس وقت مسند آرائے سوق کلاں ہیں۔ ان ہی سید ملنگ شاہ صاحب

نے مجھے فرمایا کہ ہیپنیٹی رنگ کے جواز کے بارے میں قبلہ ابوالبرکات سید احمد صاحب امیر حزب الاحناف لاہور دامت برکاتہم العالیہ نے بھی ارشاد فرمایا کہ حکیم حاذق کا حکم ضروری ہے۔ اور قانون شریعت کے مطابق حکیم حاذق وہ ہے۔ جو متقی مسلمان حرام، حلال کی اہمیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مسائلِ دینیہ سے بھی کچھ کچھ واقفیت رکھتا ہو۔ اور اپنی طب میں یا حکمت یا ڈاکٹری میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۹۸ پر ہے۔ یَجُوْزُ لِلْعَلِیْلِ لِلتَّدَاوِیْ اِذَا اَخْبَرَہٗ طَبِیْبٌ مُّسْلِمٌ اَنَّ فِیْہِ شِفَاءً وَّلَمْ یَجِدْ مِنَ الْمُبَاحِ مَا یَقُوْمُ مَقَامَہٗ ط **ترجمہ:**۔ بیمار کے لیے حرام چیز سے علاج کرنا اُس وقت جائز ہے جب مسلمان لائق حکیم یا ڈاکٹر خبر دے کہ اس چیز میں شفا ہے اور اس کے علاوہ کوئی حلال دوائی دستیاب نہ ہوتی ہو۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

سوال نمبر ۴۴

کِتَابُ الْفَرَائِض

علم میراث

میراث بانٹنے کا شرعی اسلامی طریقہ

تصنیف لطیف

پیر طریقت حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب قادری۔ نعیمی۔ بدایونی رَحْمَةُ اللّٰہِ عَلَیْہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عِلْمُ المِیْرَاث ——— حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اُولِی الصِّدْقِ وَالصَّفَاءِ **اَمَّا بَعْدُ** پس جاننا چاہیئے کہ علومِ دینیہ میں علم میراث نہایت اہم اور ضروری علم ہے۔ کیونکہ سارے دینی و دنیاوی علوم کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے۔ لیکن علم فرائض یعنی میراث کا تعلق انسان کی موت سے ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں اسے آدھا علم فرمایا گیا۔ یعنی سارے علوم علم کا ایک حصہ ہیں اور تنہا فرائض دوسرا حصہ۔ اسی علم سے میت کے وارثوں میں عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ساری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دے۔ مگر اپنے وارثوں پر ظلم کر کے مرے۔ کہ بعض کو ظلماً نقصان پہنچا دے۔ تو اس کی عبادات و ریاضات بیکار ہے۔ حدیث: حضرت نعمان ابن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ میری والدہ نے میرے والد سے عرض کیا۔ کہ: پنا فلاں باغ میرے بچہ نعمان کو ھبہ کر دو۔ اور اس پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی گواہی قائم کر لو۔ چنانچہ میرے والد مجھے بارگاہِ نبوی شریف میں لائے۔ اور عرض کرنے لگے۔ کہ میں فلاں باغ اپنے اس بیٹے نعمان کو دیتا ہوں۔ حضور گواہ رہیں۔ فرمایا کہ کیا تمہارے اور بھی فرزند ہیں۔ عرض کیا۔ ہاں۔ فرمایا۔ کیا ان سب کو اتنا اتنا ہی مال دیا ہے۔ عرض کیا۔ نہیں نعمان کو دیتا ہوں۔ فرمایا کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ جب تم چاہتے ہو۔ کہ تمہاری ساری اولاد تمہاری خدمت کرے۔ تو تم بھی ساری اولاد میں انصاف سے کام لو۔ نیز حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ قیامت کے قریب علم فرائض ایسا اٹھ جاوے گا۔ کہ دو مسلمان میراث کا مسئلہ لئے پھریں گے۔ کوئی حل کرنے والا نہ ملے گا۔

قرآن کریم نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام تو اجمالی طور پر بیان کئے مگر میراث کے مسائل بہت تفصیل سے ارشاد فرمائے۔ جس سے اس فن کی اہمیت کا پتہ لگا۔ موجودہ مسلمان جہاں دیگر دینی باتوں سے بے پرواہ ہو گئے۔ تقسیم میراث سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ آج کل عام پڑھے لکھے لوگ بھی علم اوقات اور علمِ میراث سے بے خبر ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عام مسلمان نہ نماز کے وقتوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ نہ میراث کی صحیح تقسیم کی۔ بعض جگہ تو مسلمانوں نے میراث میں اسلامی قانون چھوڑ کر مشرکین کا قانون قبول کر لیا۔ جس سے ان کی لڑکیاں میراث سے محروم ہو گئیں۔ گویا معاذ اللہ یہ لوگ جیتے جی تو مسلمان ہیں۔ مگر مرتے ہی بے ایمان۔ یقیناً یہ جرم قابلِ معافی نہیں۔ حقوق اللہ تو۔ توبہ وغیرہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ مگر حقوق العباد زبانی توبہ سے معاف نہیں۔ میراث تمام وارثوں کا حق ہے۔ اگر

اس میں کمی بیشی کر کے کسی کی حق تلفی کی گئی۔ تو اس کی معافی توبہ سے بھی نہ ہوگی۔ مسلمانو تم بیٹوں کی ناجائز محبت میں اپنی آخرت کیوں برباد کرتے ہو۔ نہ بیٹے تمہیں جنت دیں گے۔ نہ لڑکیاں تمہیں دوزخ میں دھکا دیں گی۔ دونوں تمہارے لختِ جگر ہیں اُن سب کو وہ حق دو جو اللہ تعالیٰ نے مقررہ فرمایا ہے۔ اس میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ یہ حالات دیکھتے ہوئے ۱۳۵۲ھ میں جب کہ میں مدرسہ مسکینیہ دھوراجی کاٹھیاواڑ میں مدرس تھا۔ علم فرائض میں یہ رسالہ لکھا۔ جس کا ترجمہ گجراتی زبان میں شائع ہوا۔ پھر اسی کا دوسرا ایڈیشن اُردو زبان میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن بھی ختم ہوگیا۔ اب جب کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے صدقے سے مسلمانوں کو حکومتِ اسلامیہ یعنی دولتِ خداداد پاکستان عطا فرمائی۔ (خدا اسے دائم قائم رکھے) تو اس میں میراث کا اسلامی قانون نافذ ہوا جس سے عام مسلمانوں کو عموماً اور وکلاء و حکام کو خصوصاً میراث کے مسائل سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور میراث کے مسائل بہت آنے لگے۔ ساتھ ہی اس کتاب کی مانگ بھی بڑھ گئی۔ تب حضرت مخدوم سید شاہ محمد معصوم صاحب قادری نوری دام فیوضہم نے اس رسالہ کو تیسری بار چھاپنے کا حکم دیا۔ اُن کے ارشاد کے مطابق رسالہ پر سہ بارہ نظر کر کے اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ رب تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے سے اُسے قبول فرمائے اور میرے لئے توشۂ آخرت و صدقہ جاریہ بنائے۔ اس رسالہ میں سراجی و شریفیہ سے مسائل لئے گئے اور کہیں کہیں ردّ المختار وغیرہ فقہ کی معتبر کتابوں سے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ زبان نہایت سہل اور عبارت خوب واضح رہے۔ اور ہر مسئلہ مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ مگر چونکہ فن ہے۔ اس لئے ناظرین کو چاہیئے کہ بار بار بغور اس کا مطالعہ کریں۔ اگر کوئی قانون یا مسئلہ سمجھ میں نہ آوے۔ تو کسی فرائض جاننے والے عالم سے حل کر لیں۔ جو کوئی اس رسالہ سے فائدہ اُٹھائے مجھ فقیر بے نوا کے لئے دعاءِ حسنِ خاتمہ کرے۔ رب تعالیٰ اسلام کا بول بالا کرے۔ مسلمانوں کو اپنی اطاعت کی توفیق بخشے اور مجھ بندۂ مسکین گنہگار کو شدتِ نزع وحشتِ قبر، دہشتِ حشر سے امن میں رکھے۔ آمین آمین یا رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیرِ خلقہٖ و نورِ عرشہٖ سیدنا محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ؂

احمد یار خاں نعیمی اشرفی بدایونی وارد حال گجرات پاکستان ۸ محرم الحرام ۱۳۶۹ھ یوم دوشنبہ مبارکہ۔

مالِ میت کے مصارف

جو مسلمان مر جاتا ہے۔ تو شرعاً اس کے مال[1] میں چار حق ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اُس کے مال سے اِس کے کفن[2] دفن میں خرچ کیا جاوے گا۔ اس طرح کہ نہ اِس میں زیادتی کی جاوے گی۔ نہ کمی۔ زیادتی مثلاً جتنا کفن سنّت تھا[3] اُس سے زیادہ کپڑے دے دے۔ یا اتنا قیمتی کفن دے۔ جس کو مرنے والا اپنی زندگی میں کسی وقت نہ پہنتا تھا۔ اور کمی یہ کہ جتنے کپڑے کفن میں سنّت ہیں۔ اُس سے کم دیئے جاویں۔ مثلاً مرد کو دو کپڑے یا عورت کو چار کپڑے دے۔ کہ یہ سنّت سے کم ہے۔ یا ایسی کم قیمت کا کپڑا کفن میں دیا جاوے۔ جو یہ مرنے والا اپنی زندگی میں نہ پہنتا تھا۔ کفن دفن سے جو مال بچے۔ اُس سے مرنے والے پر جو کسی کا قرض ہو۔ وُہ ادا کیا جائے۔ قرض ادا کرنے کے بعد جو مال بچا۔ اُس کے تہائی حصّہ سے میّت کی وصیّتیں پوری کی جائیں۔ اگر اُس نے وصیّت کی ہو۔ وصیّت کے پورا کرنے کے بعد جو مال بچے اُس کو مرنے والے کے وارثوں پر شریعت اسلامیہ کے مطابق تقسیم کیا جاوئے۔

وارثوں پر مال تقسیم کرنے کی ترتیب[5]

میّت کا جو مال اُوپر ذکر کی ہوئی چیزوں سے بچے اُس ترتیب سے وارثوں پر تقسیم کیا جاوے کہ سب سے پہلے ذی فرض لوگوں کو اُن کے حصّہ شرعی کی برابر دیا جاوے۔ ذی فرض وُہ وارث ہے جس کا

---

[1] یہ چار باتیں جو بیان کی گئی ہیں۔ میّت کے اپنے مال میں جاری ہوں گی۔ اگر کسی دوسرے کا مال میّت کے پاس امانت یا گرو رکھا ہے۔ یا کوئی مکان میّت کے پاس کرایہ پر تھا۔ تو یہ چیز مالک کو واپس کر دی جاویں گی کیونکہ یہ میّت کا مال نہیں۔ تاکہ اُس میں یہ کام کئے جاویں۔ ردّ المحتار۔ منہ۔

[2] کفن میں بہتر یہ ہے کہ ایسے کپڑے کا دیا جاوے۔ جیسے کپڑے پہن کر مرنے والا اپنے دوست احباب سے ملنے جایا کرتا تھا۔ کہ یہ کفن درمیانی ہے شریفیہ منہ [3] کفنِ سنّت مرد کے لئے تین کپڑے اور عورت کے لئے پانچ کپڑے ہیں۔ ۱ کرتہ ۲ تہبند ۳ لفافہ یعنی بڑی چادر یہ مشترک ہیں۔ مرد و عورت دونوں کے لیے ۴ دوپٹہ ۵ سینہ بند۔ یہ صرف عورت کے لیے [5] وارثوں پر مال تقسیم کرنے کی ترتیب کا حاشیہ صفحہ نمبر پر ہے۔

حصّہ قرآن شریف میں مقرر کر دیا گیا ہے۔ وُہ بارہ شخص ہیں۔ ۴ مرد اور آٹھ عورتیں جن کا پُورا پُورا ذکر آگے آتا ہے۔

ذی فرض سے جو بچے وُہ نسب والے عصبہ کو دیا جاوے۔ نسب والے عصبہ میّت کے کنبہ کے وہ لوگ ہیں جن کا حصّہ قرآن شریف میں مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ وُہ ذی فرض سے بچا ہُوا مال لیتے ہیں۔ اور اگر ذی فرض نہ ہوں تو پُورے مال کے وارث بنتے ہیں۔ اُن کا ذکر بھی آگے آوے گا:

اگر نسب والے عصبہ نہ ہوں تو سببی کو مال دیا جاوے۔ سببی عصبہ آزاد کرنے والے مالک یا آزاد شُدہ غلام کو کہتے ہیں۔ مثلاً ایک آزاد کیا ہوا غلام مرا۔ اس کا عصبہ نسبی کوئی نہیں۔ اور اس کے پاس مال ہے۔ تو اس کا آزاد کرنے والا مولا اس مال کو لے گا!

ف پھر آزاد کرنے والے کے عصبہ اسی ترتیب سے جو اُوپر گزری۔ یعنی اوّل تو مالک کے نسبی عصبہ اُور اگر یہ نہ ہوں۔ تو اِس مالک کے سببی عصبہ مگر اِس صُورت میں مالک کے اُن عصبات کو ملے گا۔ جو مرد کی قسم سے ہوں۔ عصبہ عورتوں کو نہ ملے گا۔ اسی طرح اگر مالک مرے۔ تو یہ آزاد شُدہ غلام اِس کے ترکہ کا وارث ہوگا:

صڈ ۔ پھر اگر میّت کے دونوں قسم کے عصبات نہ ہوں۔ تو ذی فرض لوگوں پر ہی بچا ہُوا مال دوبارہ تقسیم کر دیا جاوے۔ اور جتنا جتنا انہیں پہلے ملا تھا۔ اسی حساب سے اب بچا ہُوا۔ مال ان پر دوبارہ تقسیم کر دیا جاوے گا۔ اِس کا پُورا بیان آگے آوے گا:

صڈ ! پھر اگر میّت کے ذی فرض وارث بھی نہ ہوں۔ تو اس شخص کو میّت کا مال دیا جاوے گا۔ جو میّت کا رشتہ دار تو ہو۔ مگر ذی فرض یا عصبہ نہ ہو۔ اس کا نام ذی رحم ہے۔ اس کی جمع ذوی الارحام اس کا ذکر بھی انشاء اللہ آگے آوے گا!

ےھ (حاشیہ از سائقہ صفر نمبر ۔ میّت کے مال کا ورثہ اس کے مرنے کے بعد وارثوں کو ملنا ہے۔ میّت کے مرنے سے پہلے کوئی اس کے مال کا وارث نہیں۔ بلکہ وہ خود مالک ہے۔ کہ اپنی زندگی اور تندرستی میں جس کو جتنا چاہے دے۔ ہاں واجب یہ ہے۔ کہ زندگی میں اگر اپنے وارثوں کو مال تقسیم کرے۔ تو اُن کے حق نہ مارے۔ اگر کسی وارث کو نقصان پہنچانے کے لیے ایسا کیا۔ تو بہت گناہگار رہوا۔ واللہ اعلم۔ ردّ المختار کتاب الوقف۔ منہ !

ےھ ! اس بیان میں جتنی چیزیں ہیں جو ذکر کی جاویں گی۔ اُن میں بعض آج کل ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے غلام یا آزاد کرنے والا۔ یا بیت المال۔ لیکن بحث کی تکمیل کے لیے وُہ بھی لکھ دی گیئں۔ ۱۲!

ے پھر اگر یہ بھی نہ ہوں تو میّت کا مال مولیٰ موالات لے گا۔ مولیٰ موالات وُہ شخص ہے۔ جس سے میّت نے اپنی زندگی میں وعدہ کر لیا تھا۔ کہ اگر پہلے میں مروں تو میرا مال تو لینا۔ اور اگر پہلے تو مرے تو تیرا مال میں لُوں گا!

۸ : پھر اگر یہ بھی نہ ہو۔ تو وہ شخص مال کا وارث ہوگا۔ جس کے نسب کا مرنے والے نے اپنے مورث سے دعویٰ کیا تھا۔ مثلاً کہا تھا۔ کہ یہ میرا بھائی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ میّت کا بھائی وُہ ہی ہوگا۔ جو میّت کے باپ کا بیٹا ہو۔ گویا میّت اُسے اپنا بھائی کہہ کر اپنے باپ سے اس کا نسب ثابت کر چکا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے اس شخص کا یہ رشتہ اس مرنے والے سے ثابت نہ ہو۔ یعنی نہ تو خود اس مورث نے کہا۔ کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اور نہ کسی دوسرے شخص نے اس کی گواہی دی۔ اس کو عربی میں مُقَرٌّ لَہٗ بِالنَّسَبِ عَلَی الْغَیْر کہتے ہیں۔

۹ ! اگر یہ بھی موجود نہ ہو تو اُس شخص کو مال ملے گا۔ جس کو میّت نے تہائی مال سے زیادہ کی وصیّت کی ہو۔ اگر میّت کے وارث لوگ موجود ہیں۔ تو تہائی مال سے زیادہ کی وصیّت جائز نہیں۔ اگر میّت نے زیادہ وصیّت کر بھی دی۔ تو تہائی مال سے ہی جاری کی جاوے گی۔ اِسی طرح جو شخص وارث ہوتا ہو۔ اس کے لئے بھی وصیّت جائز نہیں۔ اگر کر دی۔ تو قبول نہیں ہاں اگر دوسرے وارث مان جاویں۔ تو جائز ہے۔

۱۰ پھر اگر یہ بھی نہ ہو تو بیت المال میں مال رکھا جاوے۔ کہ تمام مسلمانوں کے کام آوے۔ لیکن علامہ شامی نے فرمایا کہ چونکہ اب بیت المال ظالموں کے قبضے میں ہیں کہ وہاں کے مال صحیح مصرف شرعی طریقہ

لے اگر کوئی وارث ذی فرض اور عصبہ اور ذی رحم نہ ہو۔ تو اس شخص کو میّت کا سارا مال ملے گا۔ ہاں اگر خاوند مرا اور اس کا بیوی کے سوا کوئی اور وارث نہیں یا عورت مری اور اس کے خاوند کے سوا کوئی نہیں تو اس خاوند یا بیوی کے حصّہ کے بعد جو بچے اس شخص کو دیا جاوے گا۔ درِّمختار وغیرہ۔

جس قتل سے قصاص واجب ہوتا ہے۔ وہ قتل ہے جو ایسے دھار والے ہتھیار سے جان بوُجھ کر قتل کیا جاوے جس سے جسم کٹ سکے۔ جیسے لکڑی یا پتھر یا لوہے کی پتلی دھار والی چیز اس کے سِوا اگر اور کسی طرح قتل کیا جاوے۔ تو اس سے قصاص نہیں۔ اِسی طرح اگر کسی جانور کو شکار کر رہا تھا۔ اور گولی اِنسان کے لگ گئی۔ یا سوتے میں اس نے کروٹ لی اور دُوسرا آدمی اس پر گرا۔ اور اس سے مرگیا۔ لیکن اِن سب صُورتوں میں قاتل میّت کے مال سے حِصّہ نہ پاوے گا۔ کیونکہ ان صورتوں میں اگرچہ قصاص تو نہیں۔ مگر کفارہ واجب ہے۔ ہاں اگر ایسا ہوا کہ وارث نے کنواں کھدوایا۔ اور میّت اِس میں گر کر مر گیا۔ تو اس سے وہ محرُوم نہیں۔

ردّالمختار شریف۔

پر صرف نہیں ہوتے۔ لہٰذا اب حتی الامکان کسی میّت کا مال بیت المال میں نہ جانے دو۔ ایسے لاوارث کا مال فقرا پر تقسیم کردو!

ورثہ سے محروم کرنے والی چیزیں!

چار چیزیں وارث کو ورثہ سے محروم کردیتی ہیں۔ یعنی اگر ان چیزوں میں سے ایک بھی کسی وارث میں پائی جاوے تو اس کو اپنے رشتہ دار کے مال سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ غلام ہونا۔ یعنی جب کہ وارث کسی کا غلام ہو۔ تو اپنے کسی رشتہ دار کی میراث نہ پاوے گا۔

نمبر۲ سمجھدار بالغ وارث کا بلاوجہ اس طرح میّت کو قتل کرنا جس سے قصاص یا کفارہ واجب ہو۔ قصاص کے معنٰی ہیں۔ قتل کرنے والے کو بدلہ میں قتل کرنا۔ اگر نابالغ بچہ یا دیوانہ آدمی اپنی دیوانگی کی حالت میں کسی مورث کو قتل کردے۔ تو اس سے وہ ورثہ سے محروم نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر وارث نے اپنے قرابت دار کو حق[1] کی وجہ سے قتل کیا۔ تو بھی یہ قاتل ورثہ سے محروم نہ ہوگا!

نمبر۳ وارث اور میّت کا دین جدا ہونا یعنی وارث مسلمان ہے۔ اور میّت کافر تھا۔ یا میّت مسلمان تھا۔ اور وارث کافر ہے۔ یا اس طرح کہ وارث .... اسلام کے سوا اور دین میں داخل ہے۔ تو یہ ورثہ سے محروم ہے۔ نمبر۴ میّت[2] اور وارث کا وطن الگ الگ یا دشاہتوں[3] میں ہونا۔ لیکن یہ وطن الگ جب جانا جاوے گا

---

[1] حق کی وجہ یہ ہے۔ کہ مثلاً میّت اس کو قتل کرنے آیا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے اس کو قتل کردیا۔ یا باغی ہو کر آیا۔ اس نے بادشاہ برحق کی طرف سے قتل کیا۔ ردّ المختار ومنہ!

[2] وطن کا الگ الگ ہونا کافروں کے لئے محروم کرنے والا ہے۔ مسلمان خواہ کسی ملک میں ہو۔ اپنے قرابت دار مسلمان کا حصہ پاوے گا۔ ردّ المختار منہ ::

[3] وطن الگ الگ ہوتے کے لئے تین شرطیں ہیں۔ اوّل تو دونوں الگ الگ مالک ہوں۔ جیسے ایک ہندوستان میں رہتا ہے۔ اور دوسرا ترکستان میں دوسرے دونوں ملکوں کا بادشاہ الگ الگ ہو۔ تیسرے ان دونوں ملک والوں میں آپس میں لڑائی ہو۔ کہ اس ملک کا آدمی اگر اس ملک میں آوے۔ تو یہاں کے لوگ اس کو قتل کردیں اگر یہاں کا آدمی اس ملک میں جاوے۔ تو وہ لوگ قتل کردیں۔ ان تینوں باتوں میں سے اگر ایک بھی نہ ہو گی۔ تو اس کو الگ وطن نہ کہا جاوے گا۔ ردّ المختار و درّ مختار منہ ::

جب دونوں ملکوں کے بادشاہ مستقل اور الگ الگ ہوں۔ یکجا ایک ہوں۔ اور ان بادشاہوں کی فوج اور لشکر الگ ایک بادشاہت میں الگ الگ ریاستیں جن کے نواب رہے علیحدہ ہوں۔ مختلف وطن نہیں کہلائے جائیں گے۔

وارثوں اور اُن کے حِصّوں کا بیان

قرآن شریف میں وارثوں کے جو حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ وُہ کُل چھ[۶] ہیں۔ آدھا[۱] ½ = چوتھائی[۲] ¼ = آٹھواں[۳] حصہ ⅛ = دو تہائی ⅔ = ایک تہائی[۵] ⅓ = چھٹا[۶] حصہ ⅙۔

ان حصّوں کے پانے والے وارث کُل بارہ ہیں۔ جن میں چار[۴] مرد ہیں اور آٹھ[۸] عورتیں۔ چار[۴] مرد یہ ہیں! میّت کا باپ[۱]، میّت کا صحیح[ف۱] دادا[۲]، ماں[۳] شریکا بھائی یعنی میّت اور اس کے باپ الگ الگ ہوں۔ اور ماں ایک ہو۔ خاوند[۴]۔

آٹھ عورتیں یہ ہیں۔

میّت کی بیوی[۱]، بیٹی[۲]، پوتی[۳]، سگی بہن[۴] یعنی میّت اور اس کے ماں باپ ایک ہی ہو۔ باپ[۵] شریکی بہن یعنی میّت اور اس بہن کا باپ ایک ہی ہو مگر والدہ علیحدہ ہو۔ اس کو عربی میں علاتی بہن کہتے ہیں۔ اور اس کی ماں الگ ہو اور باپ ایک ہی ہو۔

باپ[۵] کے تین[۳] حال ہیں۔ اگر میّت نے بیٹا یا پوتا بھی چھوڑا ہے۔ تو باپ کو کُل مال کا چھٹا ملے گا۔ اور اگر میّت نے بیٹی یا پوتی چھوڑی ہے اور بیٹا یا پوتہ نہ چھوڑا۔ تو باپ کو کُل مال کا چھٹا حصّہ بھی ملے گا۔ اور باپ عصبہ بھی ہوگا یعنی اگر کچھ مال بچ رہے۔ تو وُہ بھی باپ لے گا۔ جیسے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا۔ اُس نے ایک باپ اور ایک بیٹی چھوڑی۔ تو کُل مال کے چھ[۶] حصّہ کرکے اوّل ایک حصّہ باپ کو دیا جاوے گا۔ اور آدھا یعنی تین لڑکی کو اب دو[۲] باقی بچے۔ وُہ بھی پھر باپ کو عصبہ ہونے کی وجہ سے دے دیئے جاویں گے تو لڑکی کو بھی تین ملیں گے۔ اور باپ کو بھی۔ مگر باپ کو ایک تو اُس کے فرضی حق کا اور دو[۲] عصبہ ہونے کی وجہ سے اس کی مثال یہ ہے۔

زید
باپ ۱ ———————— لڑکی ۶

ف۱: صحیح دادہ وُہ ہے۔ جس کا رشتہ میّت سے باپ کی طرف سے ہو۔ یعنی اس کے رشتہ میں ماں داخل نہ ہو جیسے باپ کا باپ یا باپ کا دادا اور فاسد دادا وُہ ہے۔ جس کے میّت کے ساتھ رشتہ میں ماں ہو۔ جیسے ماں کا باپ یعنی نانا یا ماں کا دادا۔ صحیح دادا تو ذی فرض ہے۔ اور فاسد دادا یعنی نانا نہ تو ذی فرض ہے۔ اور نہ عصبہ بلکہ ذوی الارحام میں سے ہے۔ شریفیہ منہ۔

اور اگر میّت نے اولاد یعنی بیٹا یا بیٹی یا پوتی نہ چھوڑی۔ تو باپ کو صرف عصبۃً ملے گا۔ یعنی جو باقی دوسرے ذی فرض وارثوں سے بچے گا۔ وُہ باپ لے گا۔ صحیح دادا کے چار حال اس طرح کہ!

صحیح[1] دادا باپ کی طرح ہے۔ یعنی جو تین حال باپ کے تھے۔ وُہی دادا کے ہیں۔ مگر باپ کے ہوتے ہوئے دادا محرُوم رہے گا۔ کیونکہ میّت سے باپ کا رشتہ قریب ہے۔ اور قریب کے ہوتے ہوئے دُور والے کو نہیں ملتا۔

ماں شریکی اولاد کے تین حال ہیں۔ اگر ایک ہے۔ تو تمام مال کا چھٹا حصّہ ملے گا۔ اور ایک سے زیادہ دُو یا تین ہیں۔ تو اُن کو کُل مال کا تیسرا حصّہ ⅓ ملے گا۔ اور اس میں ماں شریکی بہن اور ماں شریکی بھائی برابر ہو گا۔ یعنی جیسے اور جگہ ہوتا ہے۔ کہ بھائی کو بہن سے دُوگنا ملتا ہے۔ ایسا یہاں نہ ہو گا۔ بلکہ بہن بھائی کے برابر حصّہ پائے گی۔ جیسے مرنے والے کے ایک ماں شریکی بہن اور ایک ماں شریکا بھائی ہے اور اُن کے حصّہ میں چار آئے۔ تو دُو بھائی کو ملیں گے اور دُو بہن کو۔ اور یہ لوگ میّت کی اپنی اولاد یا میّت کے بیٹے کی اولاد یا باپ دادا کے ہوتے ہوئے محروم ہو جائیں گے۔ یعنی میّت نے بیٹا یا بیٹی یا پوتا پوتی یا باپ دادا یا ان میں سے ایک چھوڑا ہے تو اخیافی یعنی ماں شریکی بہن بھائی محروم۔

خاوند کے دُو حال ہیں۔ اگر اس کی بیوی نے اپنے پیٹ کی اولاد چھوڑی ہے۔ خواہ اُسی خاوند سے ہو۔ یا دُوسرے خاوند سے تو خاوند کو کُل مال کا چوتھائی حصّہ ملے گا۔ اور اگر اولاد نہیں چھوڑی۔ تو کُل مال کا آدھا حصّہ ملے گا۔

عورتوں کے حصّوں کا بیان

بیوی چاہے ایک ہو یا زیادہ اس کے دُو حال ہیں۔ اگر میّت نے اپنے نطفہ کی اولاد یا اولاد کی اولاد چھوڑی ہے۔ چاہے اُسی بیوی سے ہو۔ یا کسی دُوسری بیوی سے۔ تو بیوی کو کُل مال کا آٹھواں حصّہ ملے گا۔ اور اگر اولاد نہیں چھوڑی۔ تو کُل مال کا چوتھائی حصّہ ملے گا ::

بیٹی[2]۔ بیٹی کے تین حال ہیں۔ اگر بیٹی ایک ہے۔ تو کُل مال کا آدھا حصّہ ملے گا۔ اگر ایک سے زیادہ

---

[1] صحیح دادی وُہ ہے۔ جس کا رشتہ میّت سے فاسد دادا کے ذریعہ نہ ہو۔ یعنی اس کے اور میّت کے بیچ میں فاسد دادا نہ آتا ہو تو ماں اور باپ کی ماں اسی طرح ماں کی نانی پرنانی صحیح دادی ہے اور ماں کی دادی اور باپ کی ماں کی دادی فاسد دادی ہے۔ کیونکہ اس کے بیچ میں فاسد دادا آ گیا۔ پہلی میں تو نانا اور دُوسری میں باپ کا نانا۔ اور یہ دونوں فاسد دادا ہیں۔ اس کو خوب غور سے سمجھنا چاہیئے شریفیہ منہ ::

ہیں۔ تو کُل کا ۲/۳ دو تہائی حصّہ پاوے گی۔ اگر میّت نے بیٹی کے ساتھ بیٹا بھی چھوڑا ہے۔ تو یہ بیٹی اُسکے ساتھ مل کر عصبہ ہو جاوے گی۔ اور ذی فرض وارثوں سے جو مال باقی بچے گا۔ اس کو اُن پر اس طرح تقسیم کیا جاوے گا۔ کہ بیٹے کو دو حصّے اور بیٹی کو ایک حصّہ۔

پوتی کے کُل چھ حالات ہیں۔ اگر اکیلی ہے۔ تو کُل مال کا آدھا پاوے گی۔ اور اگر ایک سے زیادہ ہے۔ تو کُل مال کا دو تہائی ۲/۳۔ مگر یہ جب ہے۔ کہ میّت نے پوتی کے ساتھ کوئی بیٹی نہ چھوڑی ہو۔ اگر پوتی کے ساتھ ایک بیٹی بھی چھوڑی ہے۔ تو پوتی کو مال کا چھٹا حصّہ ملے گا۔ اور اگر دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ تو اب پوتی محروم۔ ہاں اگر دو بیٹیوں اور پوتی کے ساتھ کوئی پوتا یا پرپوتا بھی چھوڑا ہے۔ تو یہ پوتا یا پرپوتا اس پوتی کو عصبہ کر دے گا۔ کہ جو ذی فرض کے بعد باقی بچے گا۔ وہ اس طرح تقسیم کیا جاوے گا۔ کہ پوتی کو ایک حصّہ اور پوتے کو دو حصّے۔ اور اگر میّت نے اپنا بیٹا چھوڑا ہے۔ تو پوتی محروم۔

نمبر ۴ :- سگی بہنوں[1] کے پانچ حال ہیں۔

اگر ایک ہے۔ تو کُل مال کا آدھا۔ اور اگر ایک سے زیادہ ہیں۔ تو کُل مال کا دو تہائی حصّہ اور اگر بہن کے ساتھ سگا بھائی بھی ہے۔ تو بہن عصبہ ہے اور مال اس طرح تقسیم ہوگا کہ بھائی کو دو حصّے اور بہن کو ایک حصّہ، اور اگر میّت نے بہنوں کے ساتھ بیٹیاں یا پوتیاں بھی چھوڑی ہیں۔ تو اس صورت میں بہنیں عصبہ ہوں گی۔ اور اگر میّت نے بہن کے ساتھ بیٹا یا پوتا یا باپ یا دادا چھوڑا ہے۔ تو بہن محروم ::

نمبر ۵ باپ[2] شریکی بہن کے کُل سات حال ہیں۔ اگر ایک ہے۔ تو کُل ترکہ کا آدھا ملے گا۔ اور اگر ایک سے زیادہ ہیں۔ تو وہ دو تہائی ۲/۳ کی مستحق ہوں گی۔ مگر یہ جب ہے۔ کہ جب سگی بہن نہ ہو۔ اگر اُن کے ساتھ ایک سگی بہن بھی ہے۔ تو اس کو چھٹا حصّہ اور دو سگی بہنیں بھی ہیں۔ تو باپ شریکی بہن محروم۔ ہاں اگر کوئی باپ شریکا بھائی بھی ہو۔ تو یہ عصبہ ہو جاویں گی۔ اور اُن کے آپس میں مال اس طرح تقسیم کیا ہوگا کہ بھائی کو دو حصّے اور بہن کو ایک حصّہ اور باپ شریکی بہن اپنے بھائی اور میّت کی بیٹی یا پوتی کے ہوتے ہوئے عصبہ ہو جاویں گی۔ اور یہ بھی بیٹے اور پوتے اور باپ اور دادا کے ہوتے ہوئے محروم رہیں گے۔

---

[1] یعنی بہن کے ماں اور باپ دونوں ایک ہی ہوں۔ اس کو عربی زبان میں حقیقی کہتے ہیں۔

[2] یعنی جو باپ میں شریک ہوں۔ اور ماں دونوں کی الگ الگ ہوں۔ اس کو عربی میں عَلّاتی کہتے ہیں

نمبر ۲ ! ماں[1] کے تین حال ہیں۔ اگر میّت نے اپنی یا اپنے بیٹے کی اولاد چھوڑی ہے۔ تو ماں کو کُل مال کا چھٹا حصّہ ملے گا۔ اسی طرح اگر دو بھائی بہن کسی طرح کے ہوں۔ چاہے سگے ہوں یا ماں شریکے یا باپ شریکے۔ جب بھی ماں کو چھٹا حصّہ ملے گا۔ اگر اُن میں سے کوئی نہ ہو۔ تو ماں کو پورے مال کا تہائی حصّہ ملے گا۔ اور اگر بے اولاد یا بھائی بہن نہیں ہیں۔ اور خاوند یا بیوی اور باپ ماں کے ساتھ ہیں۔ تو خاوند یا بیوی سے بچے ہوئے مال کا تہائی حصّہ ملے گا۔ اس کی مثال یہ ہے:۔

۴		زید
ماں	باپ ۲	بیوی ۱

اس صورت میں بیوی کو چوتھائی اور ماں کو بچے ہوئے مال کا تہائی حصّہ ملا۔ اور باپ کو باقی بچا ہوا مال۔ یا جیسے مندرجہ ذیل نقشے میں خاوند کو آدھا اس کے بچے ہوئے سے ماں کو تہائی اور باقی دو باپ کو:۔

۶		ہندہ
خاوند	باپ ۲	ماں

نمبر ۳۔ دادی کو کُل مال کا چھٹا حصّہ ملے گا۔ مگر جب کہ دادی صحیحہ ہو۔ فاسدہ نہ ہو۔ دادی صحیحہ کی تعریف ہم پہلے کر چکے ہیں۔ خواہ ایک ہو۔ یا زیادہ۔ ماں کے ہوتے ہوئے دادی محروم ہوگی۔ اور باپ فقط اپنی طرف کی دادیوں کو محروم کرے گا۔ ماں کی طرف کی دادیاں باپ سے محروم نہ ہوں گی۔ اور قریب کی رشتہ کی دادی کے ہوتے ہوئے دُور کے رشتہ کی دادی محروم ہو جاوے گی۔ جیسے میّت کے قریب ایک تو باپ کی ماں ہے اور ایک ماں کی نانی ہے۔ تو باپ کی ماں کو تو ملے گا۔ کیونکہ یہ میّت سے رشتہ میں قریب ہے اور ماں کی ماں کی ماں یعنی ماں کی نانی کو نہ ملیگا۔ کیونکہ یہ میّت سے رشتہ میں دُور ہے۔ اسی طرح اگر میّت نے ماں کی ماں اور باپ کی نانی چھوڑی۔ تو ماں کی ماں یعنی نانی ...... کو حصّہ ملے گا۔ اور باپ کی ماں کی ماں محروم رہے گی۔ کیونکہ یہ اس رشتہ میں دُور ہے۔ اور جس دادی کو میّت سے دو طرف سے رشتہ حاصل ہو اس کے ہوتے ہوئے وہ دادی محروم نہ ہوگی۔ جس کو میّت سے ایک طرف سے رشتہ ہو۔ جیسے کہ ایک عورت نے اپنے پوتے کا نکاح اپنی نواسی سے کر دیا۔ تو اس سے جو اولاد ہوگی

[1] ماں سے مراد وہ عورت ہے جس کے پیٹ سے یہ میّت پیدا ہوا تھا۔ سوتیلی ماں اصل میں ماں ہی نہیں ہے وہ اس رشتہ سے حصّہ نہ پاوے گی۔ اسی طرح اگرچہ یہ بچّہ زنا کا تھا۔ تو اس کے مال سے اس کے مرنے کے بعد اس کی ماں حصّہ پاوے گی۔ مگر زانی باپ اس حرامی بچّے کی میراث نہ پاوے گا۔ ۱۲ منہ

اُس کی یہ عورت دادی بھی بنے گی۔ اور نانی بھی تو اس کے ہوتے ہوئے ایک رشتہ کی نانی محروم نہ ہوگی بلکہ بعض کے قول میں دو رشتہ والی دادی حصہ لے گی۔

عصبہ وارثوں کا بیان

نسبی[1] عصبہ تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ عصبہ ہیں۔ کوئی دوسرا اُن کو عصبہ نہ بنا دے اُنہیں عربی میں عصبہ بنفسہ کہتے ہیں۔ جیسے لڑکا!

دوسرے وہ جو اپنے آپ عصبہ نہ ہیں۔ بلکہ دوسرا وارث اُن کو عصبہ کر دے۔ اور جس نے اس کو عصبہ کیا ہو۔ وہ خود بھی عصبہ ہو۔ اس کو عصبہ بغیرہ کہتے ہیں۔ جیسے بیٹی۔ کہ اس کو بیٹا عصبہ کرتا ہے اور وہ خود بھی عصبہ ہے۔

تیسرے! وہ عصبہ جو اپنے آپ عصبہ نہ ہوں۔ بلکہ دوسرے وارث سے مل کر عصبہ بن جاویں۔ لیکن جس وارث نے اس کی عصبہ کیا ہو۔ وہ خود عصبہ نہ ہو۔ جیسے بہن جو کہ بیٹی کی وجہ سے عصبہ بن جاتی ہے مگر بیٹی خود عصبہ نہیں۔ بلکہ ذی فرض ہے۔ اس کو عصبہ مع غیرہ کہتے ہیں۔ پہلی قسم کے عصبہ وہ وارث ہیں جو مرد ہوں اور اُن کا رشتہ میت سے کسی عورت کے سبب سے نہ ہو۔ یعنی میت اور اس کے بیچ میں نسب میں عورت نہ آوے۔ یہ عصبہ چار طرح[2] کے ہوتے ہیں۔ ایک تو میت کی اولاد جیسے بیٹا، پوتا دوسرے وہ جن کی اولاد میت ہو۔ جیسے باپ دادا پر دادا تیسرے میت کے باپ کی اولاد جیسے بھائی بھائی کے لڑکے اور پوتے۔ چوتھے میت کے دادا کی مذکر اولاد جیسے میت کے چچا اور چچا کی مذکر

---

[1] : عصبہ وارث دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک نسبی اور سببی، نسبی عصبہ اُن کو کہتے ہیں۔ جن کو میت سے نسب کے طریقہ سے تعلق ہو۔ یعنی وہ میت کے کنبہ کے ہوں۔ جیسے اولاد، باپ، دادا، بھائی اور بھائی کے لڑکے، چچا چچا کے لڑکے۔ جن کو اس جگہ بیان کیا گیا۔ سببی عصبہ اُن کو کہتے ہیں۔ جو اپنی ملکیت سے غلام کو آزاد کر چکا ہو اسی طرح مالک کا آزاد کرنے والا مالک بھی سببی عصبہ ہے۔ کہ یہ لوگ بھی نسبی عصبہ موجود نہ ہونے پر اس میت کے وارث ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہندوستان میں چونکہ یہ لوگ موجود نہیں اس لئے اُن کے بیان کو چھوڑ دیا گیا۔ کہ یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ منہ۔

[2] جو ورثہ میت کی اولاد میں ہوں۔ اُن کو فروع میت کہتے ہیں۔ اور جن کی اولاد میں میت ہو اُسکو اُصول میت

اولاد۔ اُن میں سے جس کا رشتہ میّت سے قریب ہوگا۔ وُہ تو عصبہ بنے گا۔ اور حصّہ بقیہ[1] کا پالے گا۔ اور دور کے رشتہ والوں کو عصبہ نہ بننے دے گا۔ لہٰذا سب سے پہلے میّت کی اولاد عصبہ بنے گی۔ یعنی اُولاد کے ہوتے ہوئے باپ یا دادا عصبہ نہ بنیں گے۔ پھر اُولاد میں بھی جو میّت سے قریب رشتہ دار ہوگا۔ وُہ حصّہ پالے گا۔ اور دُور کا رشتہ والا محرُوم رہے گا۔

لہٰذا اگر میّت کے بیٹا اور پوتا ہے۔ تو بیٹے کو حصّہ ملے گا۔ اور پوتا محرُوم رہے گا۔ کیونکہ وُہ بیٹے سے دُور ہے۔ پھر جب اولاد نہ ہو۔ تو میّت کے باپ دادا وغیرہ عصبہ ہوں گے۔ مگر اُن میں بھی قریب کا رشتہ دار ہوتے ہوئے دُور کا رشتہ دار محرُوم رہے گا۔ اگر میّت کی اُولاد اور باپ وغیرہ بھی نہ ہوں۔ تو باپ کی اولاد عصبہ بنے گی۔ جیسے بھائی وغیرہ۔ اُن میں بھی جو قریب کا رشتہ دار ہوگا۔ وہ دُور والے کو محرُوم کردے گا۔ تو بھائی کے ہوتے ہوئے بھائی کی اُولاد محرُوم رہے گی۔ پھر میّت کے دادا کی اُولاد عصبہ بنے گی۔ جیسے چچا اُن میں بھی قریبی رشتہ دار دُور کے رشتہ والے کو محرُوم کردے گا تو چچا کے ہوتے ہوئے چچا کی اُولاد محرُوم رہے گی۔ جس طرح قریب رشتہ والا عصبہ، دُور رشتہ والے عصبہ کو محرُوم کر دیتا ہے۔ اِسی طرح جس عصبہ کا رشتہ میّت سے ایک طرف سے ہو۔ جیسے میّت کا سگا بھائی اور۔ تو باپ شریکے بھائی کو محروم کردے گا۔ کیونکہ اس کا رشتہ صرف باپ کی طرف سے اسی طرح باپ کا سگا بھائی باپ کے علاتی بھائی کو محروم کردے گا۔ تمام عصبہ وارثوں میں یہ بات رہے گی۔

دُوسری قسم کے عصبہ جو ایسے وارث سے عصبہ بنے۔ جو خود بھی عصبہ ہے۔ وہ چار عورتیں ہیں۔ جن کا ذکر ہو چکا۔ جن کا حصّہ آدھا اور دُو تہائی تھا۔ یہ سب عورتیں اپنے اپنے بھائیوں سے عصبہ ہو جاتی ہیں۔ جیسے بیٹی[1]، پوتی[2]، سگی بہن[3] اور باپ شریکی بہن[4]۔ یہ بھی خیال رہے۔ کہ جس عورت کا حصّہ مقرر نہیں ہے۔ اگر اس کا بھائی عصبہ بنے گا۔ تو یہ عورت عصبہ نہ بنے گی۔ جیسے میّت کے باپ کی بہن یعنی پھوپھی کہ اس کا بھائی یعنی میّت کا چچا عصبہ ہے۔ اور یہ عصبہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ پھوپھی ذی فرض نہ تھی۔ چونکہ سببی عصبہ یعنی غلام اور اس کا آزاد کرنے والا مولے وغیرہ ہندوستان میں نہیں پائے جاتے۔ اس لئے اُن کا بیان چھوڑ دیا گیا ہے۔

---

[1] بقیہ از صفحہ نمبر ۴۱۵) کہتے ہیں۔ یہ دونوں دُو طرح کے ہیں اصولِ قریبہ اصولِ بعیدہ۔ اسی طرح فروعِ قریبہ اور فروعِ بعیدہ۔ باپ اصولِ قریبہ میں سے ہے۔ اور دادا پردادا اصولِ بعیدہ میں سے ہیں۔ اور بیٹا فروعِ قریبہ میں سے ہے۔ اور پوتا پرپوتا فروعِ بعیدہ میں ہیں۔ واللہ اعلم منہ ::

حجب کا بیان

حجب[۱] کے معنیٰ یہ ہیں۔ کہ ایک وارث دُوسرے وارث کو نقصان پہنچا دے۔ یہ نقصان دو[۲] طرح کا ہوتا ہے۔

ایک تو یہ کہ ایک وارث دُوسرے وارث کا حصّہ کم کر دے۔ یعنی اگر یہ وارث نہ ہوتا۔ تو وُہ دوسرا وارث زیادہ حصّہ پاتا۔

اُب جب کہ یہ وارث ہے۔ تو اُس کو حصّہ کم ملا۔ دُوسرے[۲] یہ کہ ایک وارث دُوسرے وارث کو محرُوم کر دے۔ یعنی اگر وارث اوّل نہ ہوتا۔ تو دُوسرے وارث کو میّت کے مال سے حصّہ ملتا۔ اب جب کہ یہ وارث موجود ہے۔ تو دُوسرا وارث محرُوم ہو گیا۔ اوّل قسم کے اندر پانچ وارث ہیں۔

(۱) بیوی (۲) خاوند (۳) ماں (۴) باپ پوتی (۵) باپ شریک بہن۔ ان کا پُورا پُورا بیان اُوپر گزر چکا۔ وہاں دیکھو۔

دوسری قسم کے اندر حجبی کی محرومی یہ دو قسم کے اندر دو[۲] قسم کے وارث ہیں۔ ایک تو وُہ جو کسی طرح محرُوم نہیں ہوتے۔ اُن کی تعداد چھ ہے۔

(۱) بیٹا (۲) باپ (۳) خاوند (۴) بیٹی (۵) ماں (۶) بیوی۔

دُوسرے وُہ جو کبھی حصّہ پاتے ہیں۔ اور کبھی نہیں۔ اس کے محرُوم ہونے کے دو[۲] قاعدے ہیں پہلا تو یہ کہ جس وارث کا رشتہ میّت سے دُوسرے وارث کے ذریعہ سے ہو گا۔ جب وُہ وارث خود موجود ہو گا۔ تو یہ وارث محرُوم ہو جاوے گا۔

---

[۱] عربی میں حجب کے معنیٰ روکنا ہیں۔ یہاں بھی ایک وارث دوسرے وارث کو یا تو زیادہ مال لینے سے روکتا ہے یا بالکل مال لینے سے روکتا ہے۔ اِسی لئے اِس کو حجب کہتے ہیں۔ اگر زیادہ حصّہ لینے سے روکے تو اُس کے کو حجب نقصان کہتے ہیں۔ اور اگر بالکل محروم کر دے۔ تو اِس کو حجب حرمان کہتے ہیں۔ حجب اور منع میں یہ فرق ہے کہ منع میں تو خود وارث کی کوئی حالت اُس کو محرُوم کرتی ہے۔ جیسے کفر یا قتل یا غلام ہونا اور حجب میں وارث کا خود حال اِس کو محروم نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے وارث کی موجودگی اس کو محرُوم کر دیتی ہے واللہ اعلم ۱۲ منہ، غفرلہ،

جیسے باپ کے ہوتے ہوئے۔ پوتا محروم یا جس طرح بیٹا نہ ہو تو پوتا حق دار کر دادا محروم یا بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا محروم کر دادا اور پوتے کا رشتہ باپ اور بیٹے کی وجہ سے ہے۔ ہاں۔ ماں شریکے بھائی، بہن ماں کے ہوتے ہوئے محروم نہیں ہوتے ::

دوسرا قاعدہ یہ ہے۔ کہ قریب کے رشتہ دار ہوتے ہوئے دور کا راشتہ دار محروم ہو جاتا ہے۔ جو وارث ورثہ سے خود محروم ہو جاتا ہے۔ وہ دوسرے وارث کو نقصان نہیں پہونچا سکتا جیسے ایک شخص نے کافر بیٹا چھوڑا۔ تو یہ کافر بیٹا میت کی ماں۔ یا بیوی کا حصہ کم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح قاتل اور غلام کر کسی کے حصہ کو کم بھی نہیں کر سکتے۔ اور کسی کو ورثہ سے محروم بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن جس وارث کو دوسرے وارث نے ورثہ سے محروم کر دیا ہو۔ وہ دوسرے وارث کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جیسے میت کے دو بھائی اگر باپ کی وجہ سے محروم ہو جاویں۔ تو اگرچہ خود تو میت کے مال سے حصہ نہ پاویں گے لیکن میت کی ماں کا حصہ کم کر دیں گے۔ اس کی مثال۔

زید ۶

باپ ماں بھائی بھائی

اس صورت میں باپ کی وجہ سے اگرچہ دونوں بھائی محروم رہے۔ مگر ماں کا حصہ کم کر دیا گیا۔ اگر یہ دونوں بھائی نہ ہوتے۔ تو ماں کو کل مال کا تہائی ۱/۳ حصہ ملتا۔ اب ان کے ہونے سے چھٹا حصہ ملا۔

مال سے وارثوں کے حصے نکالنے کا بیان

قرآن شریف میں جو وارثوں کے حصے مقرر کئے گئے ہیں۔ دو طرح کے ہیں۔

ملا :۔ اول میں آدھا = ۱/۲ د چوتھائی = ۱/۴ د آٹھواں حصہ = ۱/۸ شامل ہیں۔

ع۲ :۔ دوسرے میں ۲/۳ یعنی دو تہائی و ۱/۳ یعنی ایک تہائی و ۱/۶ یعنی چھٹا حصہ شامل ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں ان حصوں میں سے کوئی ایک بھی حصہ ہو وے۔ تو وہ مسئلہ اس حصہ کے مخرج سے بنے گا۔ کسر کا

ؔ مطلب یہ ہے کہ ہر مسئلہ میں جیسی کسر کا حصہ آوے گا۔ اسی کسر کے مخرج سے مسئلہ کیا جاوے گا۔ مخرج کی تعریف آگے آوے گی۔ اور آدھے کے سوا، باقی ہر کسر کا مخرج اس کا ہم نام عدد ہے۔ جیسے چوتھائی

مخرج وُہ عدد ہے۔ جو اس حصّہ کی طرح نام رکھتا ہو۔ جیسے اگر کسی مسئلہ میں آدھا آوے تو مسئلہ دو سے بنے گا اور اگر مسئلہ میں تہائی ⅓ حصّہ آئے تو مسئلہ تین سے بنے گا اور اگر مسئلے میں چوتھائی آوے تو مسئلہ چار سے بنے گا اور اگر آٹھواں حصّہ آوے۔ تو مسئلہ آٹھ سے بنے گا۔ اور اگر چھٹا حصّہ آوے۔ تو چھ ۶ سے جیسے ایک آدمی مرا۔ اس نے ایک بیوی اور بیٹا چھوڑا۔ تو اس مسئلہ میں بیوی کا آٹھواں حصّہ ہے۔ اس لئے مسئلہ آٹھ سے ہوگا۔ اُن میں سے ایک بیوی کو اور سات بیٹے کو، اور اگر بیوی اور ایک بھائی چھوڑا ایسی بیوی کا حصّہ چوتھائی ہے۔ تو مسئلہ چار ۴ سے بنے گا۔ یعنی کل مال کے چار حصّہ کرکے ایک بیوی کو اور تین حصّہ بھائی کو دیئے جاویں گے۔ اسی طرح اور مسئلے بھی معلوم کرو۔ اور اگر کسی مسئلہ میں ان حصّوں میں سے دو تین حصّہ جمع ہو گئے تو یا ایک ہی قسم کے دو ۲ حصّہ ہوں گے۔ جیسے آدھا اور آٹھواں حصّہ جمع ہوگیا۔ یا آدھا و چوتھائی و آٹھواں جمع ہو گئے۔ یا کسی مسئلہ میں تہائی حصّہ و چھٹا جمع ہوئے۔ تو اُس صورت میں چھوٹی کسر کے مخرج سے مسئلہ کیا جاوے گا۔ کیونکہ جس عدد سے چھوٹا حصّہ نکلے گا۔ اسی عدد سے اس حصّہ کا دُگنا بھی بنے گا۔ جیسے ایک مسئلہ میں چوتھائی اور آٹھواں حصّہ جمع ہو گئے۔ تو مسئلہ آٹھ سے بنایا جاوے کیونکہ آٹھ میں

(حاشیہ بقیہ از صفحہ نمبر) کا مخرج چار۔ پانچویں حصّہ کا مخرج پانچ اسی طرح اوروں کو معلوم کرو۔ اور اگر کسی مسئلہ میں کئی کسروں کے حصّے آ گئے۔ تو ایسے عدد سے مسئلہ بناؤ جو ان دونوں کا مخرج بن سکے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جن دو کسروں کا مخرج مشترک معلوم کرنا ہو۔ تو پہلے ان دونوں کسروں کا الگ الگ مخرج معلوم کرلو۔ پھر ان دونوں مخرجوں میں نسبت معلوم کرو اگر ان دونوں مخرجوں میں تداخل ہے جب تو بڑا عدد ان دونوں کسروں کا مخرج ہے جیسے چوتھائی اور آٹھواں حصّہ ان کا مخرج معلوم کرنا ہے تو پہلے چار آٹھ کو الگ الگ معلوم کیا۔

پھر دیکھا کہ چار اور آٹھ میں تداخل ہے۔ تو سمجھ لیا۔ کہ آٹھ دونوں کا مخرج ہے۔

پھر ان دونوں مخرجوں میں نسبت معلوم کرو۔ اگر ان دونوں مخرجوں میں تداخل ہے۔ جب تو بڑا عدد ان دونوں کسروں کا مخرج ہے جیسے چوتھائی اور آٹھواں حصّہ اُن کا مخرج معلوم کرنا ہے۔ تو پہلے چار اور آٹھ کو الگ الگ معلوم کیا۔ پھر دیکھا۔ کہ چار اور آٹھ میں تداخل ہے۔ تو سمجھ لیا۔ کہ آٹھ دونوں کا مخرج ہے۔ اور اگر ان دونوں ہم مخرجوں میں توافق ہے۔ تو ایک مخرج کے وفق کو دوسرے مخرج سے ضرب دو جو حاصل ہو۔ وُہ اُن دونوں کسروں کا مخرج ہے۔ جیسے چوتھائی اور چھٹے حصّہ کا مخرج معلوم کرنا ہو تو پہلے چار اور چھ ۶ کو لیا۔ اُن میں آدھے کا توافق ہے۔ تو چھ کے آدھے یعنی تین کو چار میں ضرب دی۔ (بقیہ آگے دیکھیے)

سے آٹھواں حصّہ بھی بن سکتا ہے۔ اور اس کا دُوگنا چوتھائی بھی بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسئلہ میں چھٹا حصّہ اور تہائی حصّہ جمع ہو گئے۔ تو مسئلہ چھ سے بنے گا۔ اس سے چھٹا حصّہ۔ اور اس کا دُوگنا یعنی تہائی دونوں نکل سکتے ہیں اور اگر اِن دو قسموں میں سے کوئی حصّہ دُوسری قسم کے کسی حصّہ کے ساتھ جمع ہو کر آوے۔ تو اگر آدھا دُوسری قسم کے کسی حصّہ کے ساتھ یا سارے حصّوں سے جمع ہو کر آوے۔ تو مسئلہ چھ سے ہوگا۔ اور اگر چوتھائی دُوسری قسم کے کسی حصّہ یا تمام حصّوں سے مل کر آوے۔ تو مسئلہ بارہ سے بنے گا۔ اور اگر آٹھواں حصّہ دوسری قسم کے کسی حصّہ یا سارے حصّوں کے ساتھ جمع ہو کر جاوے۔ تو مسئلہ چوبیس سے بنے گا۔ اس قاعدہ کو خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

عول کا بیان

عول کے معنی یہ ہیں کہ وارثوں کے حصّے جب ملائے جاویں۔ تو اُس عدد سے بڑھ جاویں۔ جس سے مسئلہ بنا تھا۔ مثلاً مسئلہ چھ سے بنا تھا۔ اور وارثوں کے حصّے ملائے گئے۔ تو آٹھ ہو گئے۔ جیسے ایک عورت مری۔ اُس نے خاوند، ماں اور دو بہنیں چھوڑیں۔ تو مسئلہ چھ سے ہوا۔ اُن میں سے آدھا یعنی تین خاوند کو ملے۔ اور ایک ماں کو ملا۔ اور چار دونوں بہنوں کو ملے۔ تو کُل مسئلے کے آٹھ حصّے ہوئے۔ حالانکہ مسئلہ چھ سے بنا تھا۔ اس صورت میں مال کے آٹھ حصّے کر کے اسی طرح بانٹ دیا جاوے گا۔ جاننا چاہیے۔ کہ جن عددوں سے مسئلے بنتے ہیں۔ وُہ کُل سات عدد ہیں۔ جن میں سے چار عدد تو ایسے ہیں۔ جن کا کبھی عول نہیں ہوتا۔ دو۔ تین۔ چار۔ آٹھ اگر کوئی مسئلہ ان میں سے کسی عدد سے بنے گا۔ تو مسئلے کے حصّے اِن عددوں سے نہ بڑھیں گے۔ اور تین عدد ایسے ہیں۔ جن کا عول ہو جاتا ہے۔ جیسے چھ، بارہ، چوبیس۔ ان تینوں میں سے چھ کا دس تک عول ہو سکتا ہے۔ یعنی جس مسئلہ کو چھ بنایا گیا ہے۔ اُس کے حصّوں کی زیادتی سات، آٹھ، نو، دس تک ہو سکتی ہے

ے حاشیہ بقیہ از صفحہ نمبر ۴ اس سے بارہ حاصل ہوا۔ یہ بارہ چوتھائی اور چھٹے حصّے کا مخرج ہے اور اگر ان دونوں مخرجوں میں تباین ہے۔ تو ایک مخرج کو دوسرے میں ضرب دو۔ جو حاصل ہو۔ وُہ اِن دونوں کسروں کا مخرج جیسے چوتھائی اور پانچواں حصّہ کا مخرج معلوم کرنا ہے۔ تو چار اور پانچ کو لیا۔ اور چار کو پانچ میں ضرب دی جس سے بیس حاصل ہوا۔ یہ بیس چوتھائی اور پانچویں حصّہ کا مخرج ہے۔ واللہ اعلم۔ منہ۔

اور بارہ۱۲ کا سترہ۱۷ تک عول ہو سکتا ہے۔ یعنی جو مسئلہ بارہ۱۲ سے بنا ہو۔ اس کے حصے سترہ۱۷ تک بڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح کہ تمام حصے مل کر تیرہ۱۳ یا پندرہ۱۵ یا سترہ۱۷ ہو جاویں۔ چودہ۱۴ یا سولہ۱۶ نہیں ہو سکتے اور چوبیس۲۴ فقط ستائیس۲۷ تک بڑھ سکتا ہے۔ یعنی جو مسئلہ کہ چوبیس۲۴ سے بنا ہو۔ اس کا عول صرف ستائیس۲۷ ہوگا۔ پچیس۲۵ یا چھبیس۲۶ نہیں ہو سکتا

عددوں[1] کا حال معلوم کرنے کا بیان

اگر دو۲ عدد برابر ہوں۔ تو اُن کو مساوی کہتے ہیں۔ جیسے چار۴ روپیہ اور چار۴ آدمی اُن میں آدمیوں کا عدد یعنی چار۴ روپوں کے عدد یعنی چار کے برابر ہے۔ اور اگر دو۲ عدد آپس میں چھوٹے بڑے ہوں۔ تو وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ چھوٹا عدد بڑے کو مٹا دے۔ یعنی بڑا عدد چھوٹے پر برابر بٹ جاوے۔ اس کو تداخل کہتے ہیں۔ جیسے چار۴ اور آٹھ۸ کہ یہ دونوں چھوٹے بڑے عدد ہیں۔ لیکن بڑا عدد یعنی آٹھ۸ چھوٹے عدد یعنی چار۴ پر برابر بٹ جاتا ہے۔ اور اگر بڑا عدد چھوٹے عدد پر برابر نہ بٹ سکے تو یا تو کوئی تیسرا عدد اُن دونوں کو مٹا دے گا۔ یا نہیں یعنی یا تو کوئی تیسرا عدد ایسا نکلے گا۔ جس پر چھوٹا بڑا دونوں عدد برابر بٹ جاویں گے۔ اس کو توافق کہتے ہیں جیسے چھ۶ اور نو۹ کہ یہ دونوں عدد آپس میں چھوٹے بڑے تو ہیں۔ لیکن بڑا عدد چھوٹے عدد پر برابر

---

[1] جس سے چیزوں کی گنتی کی جاوے۔ اُس کی عدد کہتے ہیں۔ جیسے ۲۔۳۔۴۔۵ وغیرہ اور عدد کے ٹکڑوں کو کسر کہتے ہیں۔ جیسے آدھا، تہائی، چوتھائی، آٹھواں کہ یہ پورے عدد نہیں بلکہ عدد کے ٹکڑے ہیں اِن کسروں میں سے جو کسر جس عدد میں جا کر ایک بن جاوے۔ اس عدد کو اس کسر کا مخرج کہتے ہیں۔ جیسے آٹھ کہ اس کا آٹھواں حصہ ہے تو آٹھ وہ عدد ہے کہ جس سے آٹھواں حصہ ایک بن گیا۔ اگر اس سے چھوٹا عدد لیتے ہیں۔ جیسے سات یا چھ تو اس کا آٹھواں حصہ ایک نہ بنتا۔ تو کہا جاوے گا کہ آٹھ کا عدد آٹھویں حصہ کا مخرج ہے اسی طرح چار کہ چوتھائی حصہ چار میں ایک بن جاتا ہے اس طرح کے چار کا چوتھائی ایک ہے۔ اگر چار سے چھوٹا عدد لیں تو اس کا چوتھائی حصہ ایک نہ بنے گا۔ بلکہ ایک سے کم رہے گا۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ چار اپنے چوتھائی حصہ یعنی ۱/۴ کا مخرج ہے۔ یوں سمجھ لو کہ آدھے کے سوا ہر کسی کسر کا مخرج اس کا نام عدد ہوگا تہائی کا مخرج تین۔ چوتھائی کا مخرج چار آٹھویں حصہ کا مخرج آٹھ دسویں حصہ کا مخرج دس۔ بقیہ آگے صفحہ پر

بٹتا نہیں۔ مگر ہاں یہ دونوں عدد تین پر برابر بٹ جاتے ہیں۔ اِسی کو توافق کہتے ہیں۔ پھر وُہ تیسرا عدد جس پر یہ دونوں عدد برابر بٹ جاویں۔ جس کسر کا مخرج بنتا ہو۔ اُس توافق کو اُسی کسر کی طرف نسبت دیں گے۔ جیسے چار۴ اور چھ۶ کہ ان دونوں کو دو۲ کا عدد مٹا دیتا ہے۔ اور دو۲ آدھے کا مخرج ہے۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ چار۴ اور چھ۶ میں آدھے کا توافق ہے۔ اِسی طرح چھ۶ اور نو۹ کہ اس کو تین مٹا دیتا ہے۔ اور تین تہائی کا مخرج ہے تو کہا جاوے گا۔ کہ چھ۶ اور نو۹ میں تہائی کا توافق ہے۔ اور اگر یہ چھوٹے بڑے عدد ایسے ہوں کہ نہ تو اُن میں سے بڑا چھوٹے پر برابر بٹتا ہو۔ اور نہ ان دونوں کو تیسرا عدد مٹا سکتا ہے۔ تو اس کو تباین کہتے ہیں۔ جیسے سات اور نو یا گیارہ۱۱ اور پندرہ۱۵ کہ یہ چھوٹے اور بڑے ہیں۔ مگر نہ تو اُن میں سے چھوٹا بڑے کو مٹاتا ہے۔ اور نہ کوئی تیسرا عدد اُن دونوں کو مٹا سکتا ہے۔ اُس کی پہچان یہ ہے کہ بڑے عدد کو چھوٹے عدد پر بانٹ دو۔ اور جب بڑا بٹ کر چھوٹا رہ جاوے تو پھر اُن میں بڑے کو چھوٹے پر بانٹ دیا جاوے۔ اِسی طرح بار بار کرو۔ اگر آخر میں ایک بچا۔ تو سمجھو کہ ان دونوں میں تباین ہے۔ اور اگر ایک سے زیادہ بچا تو سمجھو کہ ان دونوں میں توافق ہے اب جو عدد بچ رہا۔ وُہ جس کسی کسر کا مخرج ہو۔ اُسی کسر کی طرف اُس توافق کی نسبت دے دو۔ جیسے چوبیس۲۴ کو نو۹ پر بانٹ دیا تو چوبیس۲۴ میں سے نو دوبارہ نکل گئے۔ دوبار نو۹ کے نکلنے سے چوبیس۲۴ میں سے چھ۶ بچے۔ اب چھ۶ چھوٹا عدد ہے۔ اور نو۹ بڑا عدد تو اب نو۹ کو چھ پر بانٹ دیا تو نو۹ میں چھ۶ ایک دفعہ نکلنے سے تین باقی بچے۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ نو۹ اور چوبیس۲۴ میں تہائی کا توافق ہے اس کو خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ آگے اس کا بہت کام پڑے گا

تصحیح[1] یعنی حصے برابر کرنے کا طریقہ اور اس کا بیان

حصّوں کو برابر برابر کرکے بانٹنے میں سات قاعدوں کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اُن میں سے تین قاعدوں میں تو صرف ایک ہی گروہ کے وارثوں کے عدد اور اُن کے حصّوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً دیکھو۔ کہ بیٹے

بقیہ حاشیہ! اسی طرح اوُروں کو اپنی عقل سے معلوم کرلو۔ ۱۲ منہ، غفرلہٗ ولوالدیہ ولاستاذہٖ ::

[1] جب کہ وارثوں کے کسی گروہ کا حصّہ اس گروہ پر برابر پورا نہ بٹ سکے۔ تو ضرب وغیرہ دے کر ایسی صورت کی جاتی ہے۔ جس سے وُہ حصّے برابر بٹ جاویں۔ اس کو عربی میں تصحیح کہتے ہیں۔ اس کے سات قاعدے ہیں۔ اگر ایک ہی گروہ کے وارثوں پر کسر پڑے۔ یعنی وارثوں کے ایک ہی گروہ کا حصّہ اُن پر

کتنے ہیں۔ اور اُن کو مال میں سے کتنے حصّے ملے ہیں۔ اور ان میں کیا نسبت ہے۔ اور چار قاعدوں میں ایک قسم کے وارثوں کے عدد کو دُوسری قسم کے وارثوں کے عدد کے طریقوں کے ساتھ دیکھنا پڑتا ہے۔ یعنی اِس طرح کہ بیٹے تین ہیں اور بیٹیاں پانچ ہیں۔ تو دیکھا جاوے۔ کہ تین کو پانچ سے کیسی نسبت ہے۔

پہلے تین قاعدے کہ جن میں وارثوں اور اُن کے حصّوں کو دیکھا جاتا ہے۔ اُن میں سے پہلا قاعدہ تو یہ ہے۔ کہ وارث کے حصّے برابر برابر وارثوں پر بٹ جاویں۔ جب تو ضرب وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ جیسے کہ:۔

مـ ـــــــــــــــ زید

ماں	باپ	بیٹی	بیٹی
۱	۱	۲	۲

اس صورت میں مال کے چھ۶ حصّے کر کے ایک تو ماں اور باپ کو دیا جاوے گا۔ اور کُل مال کا دو تہائی یعنی چار دونوں بیٹیوں کو دیئے جاویں۔ اس طرح کہ دو ایک بیٹی کو اور باقی دو دُوسری بیٹی کو:۔

دُوسرا قاعدہ یہ ہے کہ وارثوں کے صرف ایک گروہ پر اُن کے حصّے برابر نہ بٹ سکتے ہوں۔ تو اب اُن وارثوں کے اور اُن کے حصّوں کے عدد کو دیکھا جاوے۔ اگر اُن میں توافق ہے۔ تو وارثوں کے عدد کے وفق کو سے کہ اس عدد میں ضرب دے دی جاوے۔ جس سے مسئلہ ہوا ہے۔ اور اگر اس مسئلہ میں عول ہے۔ تو عول سے ضرب دے دی جاوے۔ یعنی اگر وارثوں کے عدد اور اُن کے حصّوں کے عدد میں توافق آدھے کا ہے۔ تو وارثوں کے عدد کا آدھا لے کر مسئلہ کے عدد سے ضرب دے دی جاوے۔ پھر جو عدد ضرب دینے سے بنے۔ اُس سے مسئلہ کر دیا جاوے۔ جیسے!

مـ ۲/۶ ـــــــــــــــ زید

ماں	باپ	بیٹی	
۱/۵	۱/۵	۴/۲۰	۱۰ عدد

اس صورت میں مال کے کل چھ۶ حصّے کئے جاویں گے۔ اس میں سے ایک حصّہ ماں کو اور ایک حصّہ باپ کو۔ چار۴ حصّے بیٹیوں کو لیکن بیٹیاں دس ہیں۔ اور اُن کے حصّے چار۴ تھے۔ چار۴ حصّے دس لڑکیوں

بقیہ حاشیہ) پُورا پُورا نہ بٹ سکے۔ اور باقی دوسروں کے حصّے برابر اور پُورے بٹتے ہوں۔ تو اس کے لئے پہلے تین قاعدے ہیں اور اگر ایک سے زیادہ گروہوں پر کسر ہو تو اس کے چار قاعدے ہیں۔ ۱۲ منہ؛؛

پر برابر نہیں بٹتے۔ تو اب چار۴ اور دس ہیں۔ نسبت دیکھی۔ معلوم ہوا۔ کہ دو۲ پر چار اور دس پورے پورے بٹ جاتے ہیں۔ اس لئے اُن میں آدھے کا توافق ہے۔ پس دس کے آدھے یعنی پانچ کو چھ۶ میں ضرب دی۔ تو تیس۳۰ ہوئے۔ اُن میں سے پورے پانچ پانچ ماں باپ کے کو دیئے گئے۔ اور بیس۲۰ دس لڑکیوں کو دیئے گئے۔ اب اُن میں سے ہر لڑکی کو پورے دو۲ دو آ گئے۔ اصل مسئلہ چھ۶ سے ہوکر تیس۳۰ سے صحیح کیا گیا۔

تیسرا۳ قاعدہ یہ ہے۔ کہ جن وارثوں کے گروہ پر حصّہ برابر نہیں بٹتا۔ اور اُن وارثوں کے عددوں اور حصّہ کے عددوں میں توافق نہیں ہے۔ تو اس صورت میں اُن وارثوں کے پورے عددوں کو اس عدد میں ضرب دیں گے۔ جس سے مسئلہ ہوا۔ اور اگر مسئلہ تباین ہے تو عول سے ضرب دیں گے۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ!

زید ۳۰/۶

مــــــــــــ

باپ ۱/۵ — ماں ۱/۵ — لڑکیاں ۴/۲۰ — ۵ عدد

اس صورت مسئلہ چھ۶ سے کرکے ایک ماں باپ کو دیا گیا۔ اور چار۔ پانچ لڑکیوں کو دیئے گئے مگر چار حصّے پانچ لڑکیوں پر پورے نہیں بٹ سکتے۔ اور چار پانچ میں تباین ہے۔ تو پورے پانچ کو چھ۶ میں ضرب دی۔ جس سے تیس۳۰ حاصل ہوئے اس لئے مسئلہ اس طرح کر دیا گیا۔ کہ پانچ پانچ ماں باپ کو اور بیس۲۰ ۵ لڑکیوں کو اب یہ بیس۲۰ ۵ لڑکیوں پر پورے بٹ گئے۔ کہ ہر لڑکی کو چار چار مل گئے۔ دوسرے چار۴ قاعدے جن میں ایک گروہ کے وارثوں کے عدد کو دوسرے گروہ کے عدد کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اُن میں سے پہلا۱ قاعدہ یہ ہے:۔

کہ وارثوں کے دو۲ یا زیادہ گروہ ہوں پر اُن کا ملا ہوا حصّہ برابر پورا نہیں بٹ سکتا۔ تو اگر اُن کے عددوں۲ میں آپس میں برابری ہے۔ مثلاً لڑکوں اور بیٹیوں پر اُن کا حصّہ پورا نہیں بٹتا۔

ف ان چار۴ قاعدوں میں بھی پہلے ہر گروہ کے وارثوں اور اُن کے حصّوں کے عددوں میں نسبت دیکھی جاوے گی۔ اگر حصّے کے عدد اور گروہ کے وارثوں کے عددوں میں بھی توافق ہوگا۔ تو وارثوں کے عددوں کے وفق کو رکھا جاوے۔ اور اگر تباین ہے۔ تو وارثوں کا عدد پورا رکھا جاوے۔ پھر اُن رکھے ہوئے عددوں میں نسبت دیکھی جاوے گی۔ جیسا کہ مثال سے ظاہر ہے۔ ۱۲ منہ۔

اور لڑکے بھی چار ہیں۔ اور بیٹیاں بھی چار۔ تو اس میں قاعدہ یہ ہے۔

کہ وارثوں میں سے ایک کے عدد کو مسئلہ کے مخرج سے ضرب دی جاوے۔ جس سے مسئلہ بنا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص مرا۔ اس نے چھ۶ لڑکیاں، تین۳ دادیاں اور تین۳ چچا چھوڑے۔ مسئلہ چھ۶ سے ہو کر چھٹا حصہ یعنی ایک تین دادیوں کو اور چار چھ لڑکیوں کو اور ایک باقی تین چچاؤں کو ملے گا۔ مثال:

مسئلہ ۶/۱۸ — زید

لڑکیاں ۶	دادی ۳	چچا ۳
۴/۱۲	۱/۳	۱/۳

یہاں وارثوں کے تین گروہ ہیں۔ ایک۱ لڑکیوں کا، دوسرا دادیوں کا، تیسرا۳ چچاؤں کا۔ ان تینوں گروہوں کو حصہ اتنا ملا۔ کہ ان پر برابر نہیں بٹتا۔ چھ۶ لڑکیوں کو چار۴ ملے۔ تین دادیوں کو ایک، اسی طرح تین چچاؤں کو بھی ایک ملا۔

اب چھ۶ لڑکیوں کو جو چار۴ ملے ہیں۔ ان چھ۶ اور چار۴ میں آدھے کا توافق ہے۔ تو ہم نے لڑکیوں کے عدد کا آدھا یعنی تین لیا۔ چچا اور دادیوں کے عددوں اور ان کے حصوں میں تباین ہے۔ تو ان کے پورے عدد یعنی تین تین لئے۔ اب گویا تین لڑکیاں، تین دادیاں اور تین چچا ہیں۔ ان سب میں آپس میں برابری ہے۔ تو ایک تین کو اصل مسئلہ یعنی چھ۶ میں ضرب دی۔ جس سے ۱۸ حاصل ہوئے۔ اس میں سے ۱۲ تو چھ۶ لڑکیوں کو اور ۳ تین دادیوں کو۔ ۳ تینوں چچاؤں کو دے دیئے گئے۔ جو ان پر برابر بٹ گئے لہٰذا مسئلہ چھ۶ سے ہوا اور ۱۸ سے صحیح کیا گیا۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ وارثوں کے چند گروہوں پر حصہ برابر نہیں بٹتا اور ان گروہوں کے عددوں میں آپس میں تداخل ہے۔ یعنی اس کا چھوٹا عدد بڑے کو مٹا دیتا ہے۔ تو اس میں یہ حکم ہے۔ کہ بڑے عدد کو اس مخرج سے ضرب دے دی جاوے۔ جس سے مسئلہ بنا ہے۔ جیسے:۔

مسئلہ ۱۲/۱۴۴ — زید

بیوی ۴	دادیاں ۳	چچا ۱۲
۳/۳۶	۲/۲۴	۷/۸۴

اِس صورت میں چار۴ بیویوں کو تین۳ ملے۔ اور ۴ و ۳ میں تباین ہے۔ لہٰذا بیویوں کا پورا عدد یعنی چار لیا گیا۔ اِسی طرح ۳ دادیوں کو دو۲ اور ۱۲ چچاؤں کو سات ملے۔ اور تین اور دو میں اور ۱۲ و ۷ میں تباین ہے۔ لہٰذا اُن کا پورا عدد لیا گیا۔ یعنی تین تو دادیوں کا، اور ۱۲ چچاؤں کا عدد۔ اب ہمارے پاس تین عدد ہیں۔ ۴ و ۳ و بارہ۱۲ اور بارہ کے عدد میں ۳ و ۴ دونوں داخل ہیں۔ یعنی ۳ و ۴ دونوں پر بارہ۱۲ تقسیم ہو جاتا ہے۔ تو بڑے عدد یعنی ۱۲ کو اصل مسئلہ یعنی ۱۲ میں ضرب دی۔ جس سے ۱۴۴ حاصل ہوگئے۔ اُن میں سے ۳۶ تو چار بیویوں کو دیئے گئے۔ ۲۴ تین دادیوں کو۔ اور ۸۴ بارہ۱۲ چچاؤں کو اب یہ سب حصّے سب وارثوں پر پورے پورے بٹ گئے۔

تیسرا۳ قاعدہ یہ ہے۔ کہ وارثوں کے جن گروہوں پر اُن کے حصّے برابر نہیں بٹتے۔ اُن کے بعض کے عدد دُوسروں کے عدد سے توافق رکھتے ہیں۔ اِس صورت میں قاعدہ ہے۔

کہ بعض کے عدد کے وفق کو لے کر دوسرے ورثہ کے عدد سے نسبت دی جاوے۔ اگر یہ حاصل ضرب دوسرے ورثہ کے عدد سے توافق رکھتا ہے۔ تو اِس مجموعہ کے وفق کو دوسرے ورثہ کے پورے عدد میں ضرب دی جاوے۔ اور اگر اُن دونوں میں تباین ہے۔ تو پورے کو دوسرے ورثہ کے پورے عدد میں ضرب دی جاوے۔ اِسی طرح جتنے ورثہ کے حصّے برابر نہ ہوں۔ اُن میں یہی معاملہ کیا جاوے جب تمام کام ختم ہو جاوے۔ تو مجموعہ کو مسئلہ کے مخرج میں ضرب دی جاوے۔ اِس کی مثال یہ ہے۔

زید

۴۳۲۰ / ۲۴

مسـ

بیوی ۴	لڑکیاں ۱۸	دادیاں ۱۵	چچا ۶
۳ / ۵۴۰	۱۶ / ۲۸۸۰	۴ / ۷۲۰	۱ / ۱۸۰

اِس صورت میں میّت کے مال کے پہلے چوبیس۲۴ حصّے کئے گئے۔ اُن میں سے آٹھواں حصّہ یعنی ۳ چاروں بیویوں کو دیا گیا۔ بیویاں چار ہیں۔ اور اُن کے حصّے تین۔ چار اور تین میں تباین ہے۔ تو ہم نے اس چار کو محفوظ رکھا۔ اور سولہ لڑکیوں کو ملے۔ اور لڑکیاں ۱۸ ہیں۔ اُن کے حصّے ۱۶ اور ۱۶، ۱۸ میں تداخل نہیں تو دیکھا کہ ۱۶ اور ۱۸ میں کیا نسبت ہے۔ معلوم ہوا کہ

اُن دونوں عددوں کو ۲ دو مٹا سکتا ہے۔ تو ۱۶ و ۱۸ ہیں۔ آدھے کا توافق ہے۔ لہٰذا لڑکیوں کا آدھا عدد یعنی نو ۹ لیئے دادیاں پندرہ ۱۵ ہیں۔ اُن کے حصے چار ۴ اور ۱۵ و ۴ میں تباین ہے۔ اسی طرح چچا چھ ۶ ہیں۔ اُن کا حصہ ایک اور چھ و ایک میں تباین ہے۔ تو دادیوں اور چچاؤں کے عدد پورے باقی رکھے گئے اب ہمارے پاس اتنے عدد حاصل ہو گئے۔ ۴ و ۶، ۱۵ و ۹، اب اُن عددوں کو آپس میں دیکھا کہ اُن میں کیا نسبت ہے۔ معلوم ہوا کہ ۴ و ۶ میں آدھے کا توافق ہے۔ تو چار کے آدھے یعنی ۲ دو کو چھ ۶ میں ضرب دیا ۱۲ حاصل ہوئے اب ۱۲ اور ۹ میں تہائی کا توافق ہے۔ کیونکہ ان دونوں کو ۳ مٹا دیتا ہے۔ پس ۱۲ کے تہائی یعنی ۴ کو ۹ میں ضرب دیا۔ جس سے ۳۶ حاصل ہوئے اور ۳۶ و ۱۵ میں دیکھا گیا تو وُہ ہی تہائی کا توافق تھا۔ کہ ۳ پر ۳۶ و ۱۵ دونوں برابر بٹ جاتے ہیں۔ تو ۱۵ کا تہائی ۵ لے کر ۳۶ میں ضرب دیا گیا۔ تو ۱۸۰ حاصل ہوئے۔ اب ۱۸۰ کو ۲۴ میں ضرب دیا گیا۔ تو ۴۳۲۰ حاصل ہوئے۔ جس سے مسئلہ صحیح کیا گیا۔ اس کو ان وارثوں پر اس طرح بانٹا گیا[۱]۔ کہ چاروں بیویوں کو ۵۴۰ دیئے گئے اور ۱۸ لڑکیوں کو ۲۸۸۰ دیئے گئے اور ۱۵ دادیوں کو ۷۲۰ دیئے گئے۔ اور ۱۸۰ چھ ۶ چچاؤں کو دیئے گئے۔ مسئلہ صحیح ہو گیا!

چوتھا قاعدہ یہ ہے۔ کہ جب وارثوں کی ایک سے زیادہ جماعتوں پر اُن کے حصے پُورے نہ بٹتے ہوں۔ اور وُہ وارثوں کے عدد آپس میں تباین کی نسبت رکھتے ہوں تو ایک گروہ کے عدد کو دوسرے گروہ کے پورے عدد میں ضرب دیں گے۔ اور اس سے جو عدد حاصل ہوگا۔ وہ بھی اگر تیسرے گروہ کے وارثوں کے عدد سے تباین رکھتا ہو۔ تو اس کو بھی تیسرے گروہ کے پورے عدد میں ضرب دیں گے۔ پھر جو عدد ان سب ضربوں سے حاصل ہوگا۔ اس کو مسئلہ کے عدد میں ضرب دیں گے اس کی مثال یہ ہے۔

زید

۲۴ / ۵۰۴۰	بیوی ۲	دادیاں ۶	لڑکیاں ۱۰	چچا ۷
	۳ / ۶۳۰	۴ / ۸۴۰	۱۶ / ۳۳۶۰	۱ / ۲۱۰

اس صورت میں میت کے مال کے چوبیس ۲۴ حصے کیئے گئے۔ دو ۲ بیویوں کو تین اور چھ دادیوں

---

[۱] تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چار فریقے سے زیادہ پر کسر نہیں پڑتی۔ ۱۲ منہ۔

کو ۴ اور دسٌں لڑکیوں کو ۱۱۹ اور سات چچاؤں کو ایک دیا گیا۔ اُن گروہوں میں سے کسی کا حصّہ اُس پر پورا نہیں تقسیم ہوتا۔ بیویوں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں تباین ہے۔ اور دادیوں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں آدھے کا توافق ہے۔ تو اس کا آدھا یعنی تین لیا گیا۔ اِسی طرح لڑکیوں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں آدھے کا توافق ہے۔ تو لڑکیوں کے عدد کا آدھا لیا گیا۔ یعنی ۵۔ اور چچاؤں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں تباین ہے۔ اس کو پورا رکھا گیا۔ اب ہمارے پاس اتنے عدد ہوئے ۲ و ۳ و ۵ و ۷ اُن سب میں آپس میں تباین ہے۔ تو ۲ دو کو تین میں ضرب دی چھ ۶ حاصل ہوئے۔ اور چھ ۶ اور پانچ میں تباین ہے۔ تو چھ ۶ اور پانچ میں ضرب سے ۳۰ حاصل ہوئے اسی طرح ۳۰ و ۷ میں تباین ہے۔ تو ۳۰ کو ۷ میں ضرب دینے سے کُل ۲۱۰ حاصل ہوئے۔ اس ۲۱۰ کو اصل مسئلہ کے مخرج یعنی ۲۴ میں ضرب دی۔ تو کُل ۵۰۴۰ حاصل ہوئے۔ اِس سے مسئلہ صحیح کیا گیا۔ اور پھر وارثوں پر اس طرح بانٹ دیا۔ کہ دونوں بیویوں کو ۶۳۰ چھ ۶ دادیوں کو ۸۴۰ دسٌں لڑکیوں کو ۳۳۶ اور ساتٌ چچاؤں کو ۲۱۰!

صحیح کیئے ہوئے مسئلہ سے ہر گروہ اور اس کے ہر وارث کو علیحدہ علیحدہ حصّہ دینے کا طریقہ اور اس کا بیان

مسئلہ کو بیان کئے ہوئے طریقوں سے صحیح کرنے کے بعد جب کہ وارثوں کے ہر گروہ کو اس سے

حاشیہ باقی۔ صحیح کئے ہوئے مسئلہ سے وارثوں کو بانٹنے کا قاعدہ یہ ہے کہ جس عدد کو اصل مسئلہ میں ضرب دی گئی تھی۔ اس عدد میں اس وارث کے اِس حصّہ کو ضرب دے دی جاوے۔ جو اصل مسئلہ سے ملا ہے۔ جیسے یہاں ۱۸ کو ۲۴ میں ضرب دیا گیا ہے۔ تو اب صحیح کئے ہوئے مسئلہ یعنی ۴۳۲۰ سے ہر وارث کو اس طرح دیں گے کہ جس کو ۲۴ میں سے جس قدر حصّے ملے ہوں گے۔ اُن حصّوں کو ۱۸۰ میں ضرب دیں گے۔ جو حاصل ہوگا وُہ اُس وارث کو دیا جائے گا۔ یہاں ۲۴ میں سے چار بیویوں کو تین ملے تھے۔ اُن تین کو ۱۸۰ میں ضرب دی۔ ۵۴۰ حاصل ہوئے۔ وُہ بیویوں کا حصّہ ہوا۔ اور لڑکیوں کو ۲۴ میں سے ۱۶ ملے تھے۔ اُن ۱۶ کو ۱۸۰ میں ضرب دیا۔ تو کُل ۲۸۸۰ ہوئے۔ یہ لڑکیوں کو دیئے گئے۔ اسی طرح عقل سے معلوم کر لو۔ انشاءاللہ اس کا بیان آگے بھی آوے گا ۱۲ منہ؛؛

حصہ دینا چاہیں۔ تو جس عدد کو اصل مسئلہ کے مخرج میں ضرب دی گئی تھی۔ اُس عدد میں ہر گروہ کے اُس حصّہ کو ضرب دی جاوے۔ جو اُس کو اصل مسئلہ سے ملا ہے۔ پھر جو حاصل ہو۔ وُہ ہی اس گروہ کا حصّہ ہے۔ جیسے مسئلہ نمبر ۴ ۲ سے ہُوا۔ اور ۲۱ کو ۲۴ میں ضرب دے کر مسئلہ کو صحیح کیا گیا۔ تو جس گروہ کو ۲۴ میں سے ۱۶ ملے تھے۔ اس کے حصّے ۱۶ کو ۲۱ میں ضرب دی جاوے۔ اس سے جو ۳۳۶ حاصل ہُوئے وُہ اس گروہ کا حصّہ ہے۔ اب اگر اس حصّہ کو اس گروہ کے وارثوں پر الگ الگ بانٹنا چاہو۔ تو اس ۳۳۶ کو گروہ کے وارثوں پر بانٹ دیں۔ جو حاصل ہُوا۔ وُہ اس کا حصّہ ہے۔ اسی طرح اوروں کو معلوم کرنا چاہیئے ؛

میت کا مال اس کے وارثوں اور قرض خواہوں پر بانٹنے کا بیان

جس عدد سے مسئلہ کو صحیح کیا گیا ہے۔ اس میں اور میّت کے چھوڑے[ا] ہُوئے مال میں اگر برابری ہے۔ تو ضرب وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ جیسے مسئلہ ۲۴ سے بنایا گیا۔ اور مرحوم نے ۲۴ روپیہ چھوڑے چوبیس[۲۴] روپیہ چھوڑے بٹ گئے۔ لیکن اگر میّت کے چھوڑے ہوئے مال اور مسئلہ کے عدد میں برابری نہیں۔ تو اگر دونوں میں تباین ہے۔ تو اصل مسئلہ سے ہر گروہ کو جتنا حصّہ پہونچا ہے۔ اُس کو چھوڑے ہُوئے مال میں ضرب دیا جاوے۔ پھر جو ضرب سے حاصل ہُوا ہے۔ اُس کو صحیح کئے ہوئے اصل مسئلہ کے عدد[۲]

[ا] : چھوڑے ہُوئے سے وُہ مال مُراد ہے۔ جو روپیہ یا اشرفی کی قسم سے ہو۔ یا مال منقول یا غیر منقول۔ کہ جس کی قیمت روپیہ یا اشرفی سے لگائی جاتی ہو ۱۲ منہ ؛

[۲] : اور اگر عول ہو۔ تو اس کے عدد پر بانٹا جاوے۔ اسی طرح اور جگہ بھی اگر عدد عول ہو۔ تو اس پر تقسیم کیا جاوے گا ۱۲ منہ ؛

پر بانٹ دیا جاوے۔ جو حاصل ہو۔ وہ اس گروہ کا حصہ ہے۔ جیسے کہ :-

مسئلہ ٦ — زید

ماں	باپ	بیٹی ٢
١	١	٤

اس صورت میں مسئلہ چھ سے بنا۔ ایک ایک ماں باپ کو دیا گیا۔ اور دو لڑکیوں کو چار مگر میت نے سات روپیہ چھوڑے ہیں۔ تو ماں باپ اور لڑکیوں کو جتنے حصے چھ میں سے ملے ہوں۔ ان کو سات میں الگ الگ ضرب دے کر چھ پر بانٹ دیا جاوے۔ جیسے لڑکیوں کو چار ملے ہیں۔ تو چار کو سات میں ضرب دی جاوے۔ ۲۸ حاصل ہوئے۔ ان ۲۸ کو ٦ پر بانٹ دیا جاوے۔ تو چار پورے اور ۲ تہائی ۴⅔ حصے ہوئے۔ یعنی چار روپیہ پورے اور باقی ۴ روپے کے ٦ حصے کرو۔ ان میں سے ایک یعنی دس آنہ آٹھ پائی لڑکیوں کا حصہ ہوا۔ اسی طرح اوروں کے حصے معلوم کر لو۔ اور اگر مسئلہ کے عدد اور چھوڑے ہوئے مال میں توافق ہو۔ تو ہر گروہ کے حصہ کے وفق کو چھوڑے ہوئے مال کے وفق میں ضرب دو۔ جو عدد ضرب سے حاصل ہو۔ اس کو مسئلہ کے مخرج کے وفق پر تقسیم کرو۔ جیسے :-

مسئلہ ٦ — زید ٨

ماں	باپ	لڑکی ٢
١	١	٤

اس صورت میں مسئلہ چھ سے بنا۔ اور مرنے والے نے آٹھ روپے چھوڑے ۸ و ٦ میں آدھے کا توافق ہے۔ یعنی دو چھ و آٹھ دونوں کو مٹا سکتا ہے۔ تو وارثوں میں سے ہر ایک گروہ کے حصے کو ۸ کے آدھے چار میں ضرب دی۔ جو حاصل ہوا۔ اس کو چھ کے آدھے یعنی تین پر بانٹ دیا۔ جو نکلا وہ ہر گروہ کا حصہ ہے۔ یہاں لڑکیوں کے حصے یعنی چار کو آٹھ کے آدھے یعنی چار میں ضرب دی۔ ١٦ حاصل ہوئے۔ اس ١٦ کو ٦ کے آدھے یعنی ٣ پر بانٹ دیا۔ تو ٥⅓ ملے۔ یعنی ٥ پورے اور باقی ایک کا تہائی ⅓ لڑکیوں کو ملا۔ اب جو حصہ اس طریقہ سے ہر گروہ کو ملا۔ اگر اس حصہ میں سے

ہر شخص کا الگ الگ حصّہ معلوم کرنا چاہیں۔ تو اِس کا قاعدہ یہ ہے:

کہ جو حصّہ وارث کو اصل مسئلہ سے ملا ہے۔ اس کو یا تو پورے چھوڑے ہوئے مال میں ضرب دیں۔ اگر مال اور اصل مسئلہ کے مخرج میں تباین ہو۔ یا چھوڑے ہوئے مال کے وفق میں ضرب دیں اگر چھوڑے ہوئے مال اور مسئلہ کے مخرج میں توافق ہے۔ پھر جو حاصل ہُوا۔ اِس کو پورے مسئلہ کے عدد پر دُوسری صُورت میں یعنی جب کہ مال واصل مسئلہ کے عددوں میں توافق ہو تقسیم کریں۔ جو حاصل ہو وُہ اِس وارث کا حِصّہ ہے۔ جیسے کُل لڑکیوں کو ۵ ۱/۲ ملا ہے۔ اب ہر ایک لڑکی کا الگ الگ حِصّہ معلُوم کرنا ہے۔ تو اصل مسئلہ یعنی چھ ۶ میں سے جو دو ۲ دو ہر ایک لڑکی کو ملے تھے۔ اِس دو ۲ سے متروکہ مال کے وفق چار کو ضرب دیا۔ ۸ حاصل ہُوئے۔ اِس کو اصل مسئلہ ۶ کے وفق یعنی ۳ پر تقسیم کیا۔ تو ۲ ۲/۳ نکلا۔ وہ ہر ایک لڑکی کا الگ حصّہ ہے۔ اسی طرح سب کو معلُوم کر لو۔ یہ تو وارثوں کے حِصّہ کا بیان ہُوا۔ اب اگر میّت پر چند لوگوں کا قرض تھا۔ تو ہر شخص کے قرض کو وارث کے حصّہ کی طرح مان کر وُہی کام کرو۔ جو میّت کے وارثوں کے حصّے کے ساتھ کیا گیا تھا۔ جیسے ایک آدمی مرا۔ اُس پر زید کے دو ۲ روپیہ محمد کے ۴ روپیہ اور احمد کے تین روپیہ قرض تھے۔ تو کُل قرضہ ۹ روپیہ ہُوا۔ اور اُس کے کفن دفن کے بعد کُل ۸ روپیہ بچے۔ تو اُن قرض خواہوں کے قرضوں کو حِصّہ کی طرح بنا دو۔ اس طرح:-

عبدالرحمٰن ۸

مسئلہ ۹

احمد	محمد	زید
۳	۴	۲

اِس صُورت میں ہر شخص کے قرض کو اِس کے نیچے رکھا۔ اور اُن تمام قرضوں کو ملا کر جو عدد بنا۔ اُس کو اصل مسئلہ بنا دیا۔ اب اِس عدد سے اور چھوڑے ہوئے مال سے نسبت دے کر اُسی قاعدہ سے بانٹو۔ جو اُوپر گزرا ۞

کسی وارث کے حصّہ سے نکل جانے کا بیان

وارثوں میں سے اگر کوئی وارث اپنا حصّہ میّت کے مال سے نہ لے۔ بلکہ معاف کر دے۔ تو مسئلہ کے عدد سے اس کا حصّہ نکال کر جو باقی بچے۔ اُسی کو دُوسرے وارثوں پر بانٹ دو۔ پھر جو حاصل ہو۔ وُہ ہر وارث کا حصّہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے:-

میت ۶ ــــــــــــ فاطمہ

خاوند	ماں	چچا
۳	۲	۱

اس صُورت میں چھ۶ سے مسئلہ بنایا گیا۔ جس میں سے تین خاوند کا حق ہے۔ اور ۲ ماں کا اور ایک چچا کا۔ خاوند نے اپنا حصّہ معاف کر دیا۔ تو اس تین کو چھ۶ سے نکال دیا۔ تین باقی بچے اسی تین سے مسئلہ بنایا۔ اب دیکھا کہ چھ۶ میں سے ماں کو دُو۲ سے ملے تھے۔ اور چچا کو ایک تو اُن تین میں سے دُو ماں کو دیئے گئے۔ اور ایک چچا کو مطلب یہ ہوا۔ کہ اگر خاوند اپنا حصّہ لیتا۔ تو مال کے چھ۶ حصّہ ہوتے اور اس میں سے ماں کو دُو۔ اور چچا کو ایک ملتا۔ اب جب خاوند نے اپنا حصّہ مُعاف کر دیا۔ تو میّت کے کُل مال کے تین حصّے کر دیئے۔ اور تین میں سے ماں کو دُو۔ اور چچا کو ایک دے دیا۔ یا اس طرح سمجھو:-

میت $\frac{۳۲}{۸}$ ــــــــــــ زید

بیوی	بیٹے ۴
$\frac{۱}{۴}$	$\frac{۷}{۲۸}$

اس صُورت میں ۸ سے مسئلہ بنا۔ اور ۳۲ سے تصحیح کیا گیا۔ کیونکہ ۸ میں سے ایک بیوی کو دیا گیا۔ تو باقی ۷ چار لڑکوں کے حصّے میں آئے۔ اور ۴ و ۷ میں تباین ہے۔ تو ۴ کو مسئلہ کے مخرج ۸ میں ضرب دی۔ ۳۲ حاصل ہوئے۔ اس ۳۲ میں سے ۴ بیوی کو دے دیئے۔ اور سات سات ۴ بیٹوں کو۔ اب اُن

میں سے اگر کوئی بیٹیا اپنا حصّہ معاف کر دے۔ تو ۳۲ میں ۷ نکال دو باقی ۲۵ رہے۔ اُس ۲۵ میں سے ۴ بیوی کو سات سات ۳ بیٹیوں کو دے دو ::

میت کا مال وارثوں پر دوبارہ بانٹنے کا بیان

جب کہ میّت کے ذی فرض وارثوں سے مال بچ رہے۔ اور اُس بچے مال کا لینے والا کوئی وارثوں میں سے نہ ہو۔ تو اِس بچے ہوئے مال کو اُن ہی ذی فرض وارثوں پر دوبارہ بانٹ دیں گے۔ جن کو پہلے دے چکے تھے۔ اور جتنا جتنا پہلے اُن ذی فرض وارثوں کو دیا گیا تھا۔ اتنا ہی دوبارہ دیا جاوے گا۔ جیسے پہلے لڑکیوں کو اگر دو تہائی دیا گیا تھا۔ تو اب بھی اتنا ہی دو۔ سوائے خاوند اور بیوی کے۔ کہ اُن کو بچا ہوا مال دوسری مرتبہ نہیں ملتا[1]۔ اب اُس مال کو دوبارہ بانٹنے کے چار[2] قاعدے ہیں۔ پہلا قاعدہ تو یہ ہے۔ کہ میّت کے ایک ہی طرح کے وارث ہوں۔ اور اُس کے ساتھ

---

[1] : مگر آج کل بیت المال نہیں ہے۔ اور اگر کسی جگہ ہے بھی تو وہاں کا بادشاہ یا دوسرے لوگ اُس کا ٹھیک انتظام نہیں کرتے۔ اور اُس کے مال کو مناسب جگہ خرچ نہیں کرتے۔ اِس لئے اگر بیوی یا خاوند کے سوا کوئی اور شخص اُس بچے ہوئے مال کا حق دار نہ ہو۔ یعنی نہ تو کوئی عصبہ ہو۔ نہ کوئی ذی فرض نہ ذی رحم نہ مولا موالات وغیرہ غرض کہ کوئی بھی ایسے کا حق نہ رکھتا ہو۔ تو یہ بچا ہوا مال پھر دوبارہ خاوند یا بیوی ہی کو دے دیں گے اور بیت المال میں نہ جانے دیں گے۔ بلکہ اگر میّت کے خاوند یا بیوی بھی نہ ہوں۔ تو دودھ شریکے بھائی بہن کو دے دیں گے۔ ہر طرح کوشش کریں گے۔ کہ بیت المال میں میّت کا مال نہ جاوے ۱۲ ردّ المختار منہ ::

[2] بیت المال سے مراد یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کا مال ایک جگہ اِس لئے رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے کاموں میں اُسے خرچ کیا جاوے۔ رہی بات یہ کہ بیت المال کتنی قسم کا ہے۔ اور اِس کا مال کہاں کہاں خرچ کیا جاوے۔ اُس کی بحث بڑی ہے۔ یہاں اِس کے بیان کا موقع نہیں اور یہ بات ظاہر ہے (باقی حاشیہ صفحہ آگے۔

خاوند یا بیوی نہ ہو۔ اس صورت میں وارثوں کے عدد سے مسئلہ بنا دیا جاوے۔ جیسے کوئی شخص مرا۔ اُسنے فقط ۲ دو لڑکیاں چھوڑیں۔ اس صورت میں بیوی موجود نہیں۔ اور وارث ایک ہی طرح کے ہیں۔ یعنی فقط لڑکیاں ہیں۔ تو اب مال کو ۲ دو حصہ کرکے ایک حصہ ایک لڑکی کو اور دوسرا حصہ دوسری لڑکی کو دے دیا جاوے ؛

دوسرا ۲ قاعدہ یہ ہے۔ کہ میت نے کئی طرح کے وارث چھوڑے۔ اور بیوی یا خاوند نہ چھوڑے تو اس صورت میں جتنے حصے اُن سب وارثوں کے ہوتے ہوں۔ اُن حصوں کے مجموعہ کے عدد سے مسئلہ بنا دیا جاوے۔ جیسے ایک آدمی مرا۔ اُس نے ایک ماں اور ۲ دو لڑکیاں چھوڑیں۔ اس صورت میں وارث ۲ دو طرح کے ہیں ؛

(۱) ایک ماں اور (۲) دوسری لڑکیاں ؛ ماں کا حق چھٹا حصہ ہے۔ اور لڑکیوں کا حق دو تہائی۔ تو مسئلہ چھ سے بنایا۔ اس میں سے ایک ماں کو اور چار ۲ دو لڑکیوں کو دے دیئے ایک باقی بچا۔ اس کا لینے والا کوئی نہیں۔ تو ان وارثوں کے حصوں کو ملا کر دیکھا۔ وہ کل پانچ تھے۔ لہذا پانچ سے مسئلہ بنا دیا گیا۔ اس پانچ میں سے ایک ماں کو اور چار دونوں لڑکیوں کو دے دیئے گئے۔

تیسرا قاعدہ یہ ہے۔ کہ وارث تو ایک ہی قسم کے ہوں۔ مگر اُن کے ساتھ بیوی یا خاوند بھی ہو۔ جن پر مال دوبارہ نہیں بٹتا۔ اس کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ بیوی یا خاوند کے حصہ کا جو مخرج ہو۔ اُس سے مسئلہ بنا دیا جاوے۔ اور اُس سے بیوی یا خاوند کا حق دے دیا جاوے۔ پھر جو باقی بچے۔ اگر دوسرے وارث پر برابر بٹ جاتا ہے۔ تو اچھا جیسے :۔

فاطمہ

مسئلہ ۴	
خاوند ۱	لڑکیاں ۳

البقیہ حاشیہ : کہ اس زمانہ میں ظلم بڑھا ہوا ہے۔ لوگوں میں امانت نہیں رہی بیت المال کے مال کے منتظمین اپنے گھر خرچ کریں گے۔ اس لئے یہ انتظام کیا گیا۔ کہ مسلمانوں کے مال کو وہاں نہ پہنچایا جاوے ۱۲ منہ ؛

اِس صورت میں خاوند کا حق چوتھائی حصّہ تھا۔ تو چوتھائی کے مخرج چار سے مسئلہ بنایا گیا۔ باقی جو تین بچے۔ وہ تین لڑکیوں پر پُورے پُورے بٹ گئے ؛

مسئلہ پُورا ہوگیا۔ اور اگر باقی بچا ہُوا مال دُوسرے وارث پر برابر نہیں بٹتا تو دیکھو۔ کہ وارثوں کے عدد اور باقی بچے ہُوئے عدد میں کیا نسبت ہے۔ اگر تباین ہو۔ جب تو پُورے وارثوں کے عدد کو پُورے مخرج میں ضرب دے دی جاوے۔ اور اگر توافق ہو۔ تو وارثوں کے عدد کے وفق کو مخرج میں ضرب دے دی جاوے۔ تباین کی مثال یہ ہے :۔

فاطمہ	مسئلہ $\frac{20}{4}$
لڑکیاں ۵	خاوند
$\frac{3}{15}$	$\frac{1}{5}$

اِس صورت میں چار سے مسئلہ ہُوا۔ ایک خاوند کو ملا۔ باقی تین ۵ لڑکیوں کے لئے بچے اور تین و پانچ میں تباین ہے۔ لہٰذا پُورے پانچ کو چار میں ضرب دی۔ تو بیس ۲۰ حاصل ہُوئے۔ اب ۲۰ میں سے ۵ خاوند کو اور باقی پندرہ پانچ لڑکیوں کو دیا ؛

چوتھا قاعدہ یہ ہے۔ کہ میّت کے کئی طرح کے وارث ہوں۔ اور اُن کے ساتھ بیوی یا خاوند بھی ہو۔ اِس صورت میں یہ کیا جاوے گا۔ کہ پہلے تو بیوی یا خاوند کے حق کے مخرج سے مسئلہ بناکر اُس بیوی یا خاوند کا حق اُس مال سے دے دیا جاوے گا۔ اب جو باقی بچیں۔ وہ اگر دُوسرے وارثوں پر پُورے پُورے بٹ جاتے ہوں۔ جب تو خیر جیسے۔ کہ

مسئلہ ۴

ماں شریکی بہن ۲	دادیاں ۴	بیوی
۲	۱	۱

اِس صورت میں دادیوں کا حق چھٹا یعنی چھ ۶ میں سے ایک ہے۔ اور ماں شریکی بہنوں کا حق تہائی یعنی

چھ میں سے دو ہی تو دادی اور بہنوں کے کل حصّہ تین ہوئے۔ اور جب کہ چار سے مسئلہ بنا کر اس میں سے ایک تو بیوی کو دے دیا گیا۔ تو تین ہی باقی بچے۔ جو دادی اور بہنوں کے حصّوں کے برابر ہیں۔ اور اگر باقی بچے ہوئے عدد دوسرے وارثوں کے حصّہ کے برابر نہ ہوتے ہوں۔ تو اس کا قاعدہ یہ ہے:۔

کہ بیوی یا خاوند کے حق کے مخرج سے مسئلہ کیا جاوے۔ اور دوسرے وارثوں کے حصّوں کو ملا کر مخرج میں ضرب دی جاوے۔ جو عدد ضرب سے حاصل ہو۔ اس سے مسئلہ بنایا جاوے۔ اب جو بیوی یا خاوند کو حصّہ ملا تھا۔ اس کو باقی وارثوں کے حصّوں کے مجموعہ میں ضرب دی جاوے۔

۔اور دوسرے وارثوں کے حصّوں کے مجموعہ

کو اس عدد میں ضرب دی جاوے۔ جو بیوی یا خاوند کو اس کا حصّہ دینے کے بعد مخرج سے بچا۔

جیسے:۔

مسـ	۸/۴۰	زید
بیوی ۵	لڑکیاں ۲۸	دادیاں ۷
۱/۸	۴/۶	۱/۶

اس صورت میں بیوی کا حق آٹھواں حصّہ ہے۔ یعنی آٹھ میں سے ایک اور لڑکیوں کا حصّہ دو تہائی یعنی چھ میں سے چار اور دادیوں کا حق چھٹا حصّہ یعنی چھ میں سے ایک ہے۔ لڑکیوں اور دادیوں کا حصّہ ملایا گیا تو کل پانچ ہوئے۔ ان پانچوں کو خیال میں رکھے۔ آٹھ سے مسئلہ بنا۔ اس میں سے ایک تو بیوی کو دیا جاوے، باقی بچے۔ اب پانچ کو

(جو لڑکیوں اور دادیوں کے حصّوں کا مجموعہ ہے) ۸ میں ضرب دی۔ تو ۴۰ حاصل ہوئے۔ اس سے مسئلہ بنایا گیا۔ بیوی کو جو ایک ملا تھا۔ اس کو ۵ میں ضرب دے کر بیوی کو دے دیا گیا۔ دادیوں کو جو چھ میں سے ایک ملا تھا۔ اس ایک کو ۷ میں ضرب دی۔ تو ۷ حاصل ہوئے۔ وہ ۷ دادیوں کو دے دیئے۔ اور لڑکیوں کو چھ میں سے چار ملے تھے۔ ان چار کو ۷ سے ضرب دی۔ تو ۲۸ حاصل ہوئے۔ وہ لڑکیوں کو دے دیئے گئے:۔

مناسخہ کا بیان

مناسخہ کے معنی یہ ہیں۔ کہ مال کے بعض حصے تقسیم سے پہلے میراث بن جاویں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ایک میت کا مال اس کے وارثوں میں ابھی تقسیم نہ ہوا تھا۔ کہ بعض وارث مر گئے۔ لہذا اب اس میت کا مال اس مردہ وارثوں کے وارثوں کو ملے گا۔ یہ مناسخہ ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو۔ کہ:۔

"شکل نمبر ۱"

مسـ فاطمہ

خاوند — بیٹی — ماں

"شکل نمبر ۲"

مسـ خاوند

بیوی — ماں — باپ

شکل نمبر ۳:۔

مسـ بیٹی

بیٹے ۲ — بیٹی ۱ — دادی

"شکل نمبر ۴"

مسـ دادی

خاوند — بھائی

اس فاطمہ کا مال اس کے وارثوں پر تقسیم نہ ہونے پایا تھا۔ کہ اس کے خاوند کا انتقال ہوگیا۔ اس خاوند نے شکل نمبر ۲ کے وارث چھوڑے۔ جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے۔ پھر فاطمہ کی بیٹی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس نے شکل نمبر ۳ والے وارث چھوڑے۔ پھر اس کی دادی کا انتقال ہوگیا۔ اس نے شکل نمبر ۴

کے وارث چھوڑے۔ مناسخہ کا قاعدہ یہ ہے :-
کہ اوّل پہلے مسئلہ کو جس کی میّت فاطمہ ہے۔ صحیح کر لو۔ اور اس سے اُس کے جتنے وارث[لہ] تھے۔ اُن کا حصّہ دیدو۔ پھر دُوسرے مسئلہ کو جس میں میّت خاوند ہے۔ صحیح کرو۔ اور اُس صحیح کئے ہُوئے عدد سے خاوند کے جتنے وارث تھے۔ اُن کو دے دو۔ اب دیکھو۔ کہ جو حصّہ خاوند کو پہلی میّت یعنی فاطمہ کے مال سے ملا ہے۔ اُس کے عدد اور اُس خاوند کے مسئلہ کے عدد میں کیا نسبت ہے۔ اگر خاوند کا حصّہ جو اُسے فاطمہ کے مال سے ملا ہے۔ اُس کے وارثوں پر برابر بٹ جاوے۔ تو بہت اچھا۔ اور اگر برابر نہ بٹے۔ تو دیکھو۔ اگر اس کی تصحیح اور اس کے پہلے ورثہ کے عدد میں توافق ہے۔ تو دُوسرے مسئلہ کے وفق کو پہلے مسئلہ کے صحیح کئے ہُوئے عدد میں ضرب دے دو۔ اور اگر دُوسرے مسئلہ کی تصحیح اور اُس کی میت کا جو مال ہے اُس میں تباین ہے۔ تو دُوسرے مسئلہ کے پُورے صحیح کئے ہُوئے عدد کو پہلے مسئلہ کے پُورے صحیح کئے ہُوئے عدد میں ضرب دے دو۔ اب جو عدد اس ضرب سے حاصل ہوا۔ یہ پہلے اور دُوسرے دونوں مسئلوں کا مخرج ہوا۔ اب پہلے مسئلہ کے وارثوں کو جو حصّہ پہلے مل چکا تھا۔ اُس حصّہ کو اُس عدد میں ضرب دو۔ جس کو پہلے مسئلہ کی تصحیح میں ضرب دیا گیا ہے۔ اور دُوسرے مسئلہ کے وارثوں کو جو دُوسرے مسئلہ سے حصّہ ملا ہے۔ اس عدد میں ضرب دو۔ جو میّت کے پاس ہے۔ اگر اس میّت کے پاس کے عدد اور اس مسئلہ کے صحیح کئے ہُوئے عدد میں تباین ہے۔ اور اگر توافق ہے۔ تو اس میت کے وارثوں کے حصّوں کو جو پہلی صحیح شدہ تقسیم سے حاصل ہو چکے ہیں۔ اُس میّت کے پاس کے عدد کے وفق میں ضرب دے دو۔ اب تیسرا اور چوتھا مسئلہ جو باقی رہا۔ اُس کے اندر بھی یہی کام کرو۔ جو دُوسرے مسئلہ میں

لہ :۔ پہلے مسئلہ کو صحیح کرتے وقت وہ تمام لوگ وارث شمار کر لئے جائیں گے۔ جو فاطمہ کے مرنے وقت موجود تھے۔ اگرچہ اب تو اُن میں سے بعض وارث مر چکے ہیں۔ ۱۲ منہ ؕ

کیا۔ یعنی دُوسرے مسئلہ کی تصحیح کو پہلے مسئلہ کی تصحیح میں ضرب دینے سے جو حاصل ہوا۔ اس پُورے مجموعہ میں تیسرے مسئلہ کے تصحیح کئے ہوئے عدد کو ضرب دے دی جاوے۔ اسی طرح آئندہ کام کیا جاوے۔ اُس کی مثال یہ ہے:۔ مدا:۔

۱۲۸ / ۳۲ / ۱۶ / ۴

مدا:۔ فاطمہ

خاوند	بیٹی	ماں
۱/۴	۹	۳/۶

مسئلہ نمبر ا:۔ میں ردّ ہوگا۔ یعنی وارثوں پر دوبارہ مال بانٹنا پڑیگا۔ کیونکہ مسئلہ ۱۲ سے ہوکر خاوند کو تین اور بیٹی کو چھ اور ماں کو ۲ ملتے ہیں۔ کُل ۱۱ ہوئے۔ ایک بچا۔ اب اس کو ردّ کرنا پڑا۔ اس طرح کر اوّل مسئلہ چار سے بنا کر خاوند کو ایک دے دیا۔ اور بیٹی اور ماں کے حصّے تھے۔ چار اور یہاں کُل ۳ باقی بچے۔ تو چار کو چار میں ضرب دی ۱۶ حاصل ہوئے۔ اس سولہ میں سے چار خاوند کو۔ اور ۹ بیٹی کو اور تین ماں کو دیئے۔ نمبر ا کے مسئلہ کا کام ختم ہوا:۔

نمبر ۲:۔ ۴ مُساوات خاوند ۴/۱۶

بیوی	ماں	باپ
۱/۴/۸	۱/۴/۸	۲/۴/۱۶

اب نمبر ۲ کا مسئلہ دیکھا۔ تو چار سے صحیح ہوتا ہے۔ اور خاوند کو پہلے مسئلہ سے چار ہی ملے ہیں۔ تو چار پر برابر بٹ گئے۔ اس میں ایک بیوی کو اور ایک ماں کو اور دو باپ کو دے دیا گیا۔ اس کا بھی کام پُورا ہوا۔ اب دیکھا مسئلہ نمبر ۳:۔

مسئلہ نمبر ۳۔ صفحہ نمبر ۔ پر دیکھئے:۔

مسئلہ نمبر ۳ :-

وفق ۲ — توافق بالثلث — وفق ۳

مـ ۶		بیٹی ۹
دادی	بیٹے ۲	بنت
۱/۶	۴	۱/۳
۳	۱۲	۱۲
	۴۸	

اس میں مسئلہ چھ۶ سے بنتا ہے۔ اور بیٹی کے پاس پہلے مسئلہ سے ملے ہوئے ۹ ہیں۔ اور ۹ و ۶ میں تہائی کا توافق ہے۔ کیونکہ ۹ و ۶ دونوں کو ۳ فنا کر دیتا ہے۔ تو چھ۶ کا تہائی دو۲ لے کر اس کو پہلے مسئلہ کے عدد یعنی ۱۶ میں ضرب دیا۔ ۳۲ حاصل ہوئے۔ اس ۳۲ میں سے پہلے مسئلہ میں مال کے حصے کو دو۲ سے ضرب دیا۔ تو چھ حاصل ہوئے۔ اسی مـ۲ کے مسئلہ میں بیوی اور ماں باپ کے حصوں کو دو میں ضرب دو۔ تو بیوی کو ۱۲، اور ماں کو ۲، اور باپ کو چار ملے :۔

اب نمبر ۳ کے مسئلہ کے وارثوں کے حصوں کو اس عدد کے تہائی میں ضرب دیا۔ جو میت کے پاس ہے۔ اور وہ ۹ ہیں۔ اس کی تہائی ۳ ہوئے۔ اس مـ۳ کے وارثوں کے حصوں کو جب ۳ میں ضرب دیا۔ تو دادی کو تین اور دو۲ لڑکوں کو ۱۲ اور لڑکی کو ۳ ملے۔ اب سب حصوں کو جمع کیا گیا۔ تو وہی ۳۲ ہو گئے۔ نمبر ۳ کے مسئلہ کا کام ختم ہوا :۔

(مندرجہ بالا مسئلہ کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے :-)

نمبر ۴ مـ ۴/۲	تباین	دادی سـ ۹
خاوند	بھائی دو۲ عدد	
۱/۲	۲	
۱۸	۱۸	

اب نمبر ۴ کے مسئلہ میں دادی میت ہے۔ اس کو پہلے ۹ مل چکے ہیں۔ نمبر ۱ کے مسئلہ میں چھ۶ اور نمبر ۳ کے مسئلہ میں نمبر ۳ اور نمبر ۴ کا مسئلہ نیا ہے۔ ۴ سے اور چار اور نو۹ میں تباین ہے۔ تو پورے چار کو

۳۲ میں ضرب دی۔ ۱۲۸ حاصل ہوئے ۳۲/۱۲۸ اب اُوپر کے تین مسئلوں کے وارثوں کے حصّوں کو تو چار میں ضرب دیں گے۔ اور نمبر ۴ کے وارثوں کے حِصّوں کو نو میں اِس سے اِس طرح حساب بنے گا۔ کہ نمبر ۱ کے وارث تو سب مر چکے۔ اور اُن ہی کے مال کے حِصّے بٹ رہے ہیں۔ نمبر ۲ میں بیوی اور ماں باپ کے حِصّوں کو ۴ میں ضرب دیں۔ تو بیوی کو ۴ اور ماں کو ۸ اور باپ کو ۱۶ ملے۔ نمبر ۳ کے مسئلہ میں دادی مر چکی۔ اُسی کا مال بٹ رہا ہے تو دو ۲ بیٹوں اور بیٹی کے حصّوں کو ۴ میں ضرب دی تو لڑکوں کو ۴۸ اور لڑکی کو ۱۲ ملے نمبر ۴ کے وارثوں کے حصّوں کو ۹ میں ضرب دی۔ تو خاوند کو ۱۸ اور دو ۲ بھائیوں کو ۱۸ ملے۔ اب کُل حِصّوں کو جب جمع کیا۔ تو وہی ۱۲۸ حاصل ہوئے مسئلہ ختم ہُوا۔ اُس کے بعد تمام زندہ لوگوں کے نام اُن کے حِصّوں کے ساتھ ایک جگہ "الاحیا" لکھ کر اُس کے نیچے لکھ دو۔ اور جتنے لوگ مرے ہوئے ہیں۔ اُن کے نام کے نیچے "ں" اِس طرح کا ہلالی خط لگا دو۔ تاکہ نشان رہے۔

المناسخہ

الاحیاء

خاوند	دو ۲ بھائی	دو ۲ بیٹے	بیٹی	باپ	ماں	بیوی	
۱۸	۱۸	۴۸	۱۲	۱۶	۸	۸	

۸
۸
۱۶
۴۸
۱۲
۱۸
۱۸
۱۲۸

ذی رحم وارثوں کا بیان

"ذی رحم" میّت کا وُہ رشتہ دار وارث ہے۔ جو ذی فرض اور عصبہ نہ ہو۔ یہ ذی رحم وارث بھی عصبہ

ؔ مناسخہ کا مسئلہ لکھنے کی ترکیب یہ ہے کہ لفظ میّت کو لمبا کر کے لکھے۔ اور اُس کے اُلٹی جانب میں میّت کا نام لکھا۔ اور سیدھے کنارے پر وُہ عدد لکھا۔ جس سے یہ مسئلہ بنے گا۔ پھر میّت کے نام کے اُلٹی طرف لکھ کر اُس مال کے عدد لکھے جو میّت کے پاس پہلے مسئلہ میں ملے ہوئے موجود ہیں اور میّت کے نام اور مسئلہ کے عدد کے بیچ میں میّت کے مال کے عدد اور مسئلہ کے عدد کے درمیان والی نسبت لکھیں۔ تاکہ اس میں آسانی رہے۔ اُس کی مثال وُہ ہے جو مسئلہ نمبر ۳ میں مخفی ۔ و ہ یہ ہے۔ مـــــــــ اگر سعد اور عدد کے درمیان کے مسئلہ میں — بیٹی سعد ۹ ثلث ۳ توافق بالثلث

کی طرح چار قسم کے ہیں۔ پہلی قسم جو میّت کی اُولاد میں ہوں۔ جیسے نواسی نواسے اور پوتی کی اولاد۔ دُوسری قسم وہ کہ میّت جن کی اولاد میں ہو جیسے فاسد دادی اور فاسد دادا جیسے ماں کا باپ، نانا اور ماں کی دادی۔ کہ یہ میّت کا فاسد دادا اور فاسد دادی ہیں۔

تیسری قسم وُہ جو میّت کے ماں باپ کی اولاد میں ہوں۔ جیسے میّت کے بھانجے، بھانجی یعنی میّت کی بہن کی اولاد چوتھی قسم وُہ جو میّت کے دادا، نانا کی اولاد ہوں۔ جیسے ماموں، خالہ پھوپھی اور باپ کا ماں شریکا بھائی۔ یہ لوگ اور اُن کے علاوہ جو شخص اُن کے ذریعہ سے میّت کا رشتہ دار ہو۔ وُہ سب ذی رحم ہیں۔ اُن میں بھی جو میّت سے قریب کا رشتہ رکھتا ہوگا۔ وہ دُور والے رشتہ دار کو محرُوم کر دے گا۔ اُن میں سے پہلے میّت کی اُولاد وارث ہے۔ اگر میّت کی اولاد نہ ہو۔ تو وُہ وارث ہے۔ جس کی اولاد میں۔ میّت ہو۔ اور اگر وُہ بھی نہ ہوں تو وہ وارث ہے جو میّت کے ماں باپ کی اولاد میں سے ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو۔ تو وُہ وارث ہے۔ جو کہ میّت کے دادا کی اُولاد میں ہوں۔

پہلی قسم کے ذی رحم وارثوں کا بیان

اس میں جس کا رشتہ میّت سے قریب ہو گا وُہ دُور کے رشتہ والے کو محرُوم کر دے گا جیسے نواسی کے ہوتے ہوئے پوتی کی بیٹی کو کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ پوتی کی بیٹی، نواسی کے اعتبار سے میّت سے دُور ہے اگر قریب ہونے میں سب برابر ہوں۔ تو اُن میں سے جو وارث[1] کی اولاد میں ہو۔ وُہ پہلے مستحق ہوگا۔ یعنی جو خود اپنے آپ تو ذی رحم ہے۔ مگر یہ جس کی اُولاد میں ہے۔ وُہ میّت کا وارث تھا۔ تو یہ ذی رحم

باقی حاشیہ! تو ناقص ہوا۔ تو سو کے عدد کے بعد لکھ دو۔ جیسا کہ ہم نے مثال میں دکھایا۔ واللہ اعلم منہ، نقلہ:۔

[2] ذی رحم وارث عصبہ کے ہوتے ہوئے محرُوم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح خاوند اور بیوی کے سوا دُوسرے ذی فرض وارثوں کے ہوتے ہوئے بھی محرُوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ خاوند بیوی پر بچا ہوا مال دوبارہ نہیں بٹتا۔ اور دوسرے ذی فرض وارثوں پر بچا ہوا مال دوبارہ بٹ جاتا ہے۔ تو جب اُن ذی فرض وارثوں پر دوبارہ مال بٹ گیا۔ تو اب ذی رحم کے لئے بچا ہوا ہی کیا کہ اُسے ملے۔ یہ مسئلہ شریفیہ سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ منہ:۔

[1] وارث کا لفظ ذی فرض و عصبہ دونوں کو شامل ہے۔ مگر یہاں مراد ذی فرض ہے۔ اس لئے کہ اس صنف میں عصبہ کی اولاد اور ذی فرض کی اولاد ایک ساتھ نہیں پائی جا سکتی ۱۲ منہ:۔

اِس ذی رحم پر مقدم ہوگا۔ جو خود بھی ذی رحم ہے۔ اور جس کی اولاد میں ہے۔ وُہ بھی ذی رحم ہے۔ جیسے ایک شخص نے اپنے پیچھے پوتی کی بیٹی اور نواسی کی لڑکی چھوڑی تو اگرچہ یہ دونوں ذی رحم ہیں۔ مگر پوتی کی لڑکی حصّہ پا دے گی اور نواسی کی لڑکی محروم رہے گی۔ کیونکہ یہ خود بھی ذی رحم ہے۔ اور اس کی ماں یعنی میّت کی نواسی بھی ذی رحم ہے۔ بخلاف پوتی کی بیٹی کے کہ وُہ اگرچہ خود تو ذی رحم ہے۔ مگر اُس کی ماں یعنی میّت کی پوتی ذی رحم نہیں۔ بلکہ کبھی ذی فرض ہوتی ہے۔ کبھی عصبہ اگر چند وارث ذی رحم جمع ہوگئے اور سب کا رشتہ میّت سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ یعنی سب قریب رشتہ کے ہیں۔ یا سب دُور رشتہ کے اور اُن میں سے کوئی وارث کی اولاد نہیں۔ یا سب وارث کی اولاد ہیں۔ غرض کہ اُن میں سے کوئی کسی دوسرے سے بڑھ کر نہیں۔ تو جو لڑکوں کی اولاد میں ہوگا۔ وُہ دوگنا پائے گا۔ اور جو لڑکیوں کی اولاد میں سے ہے۔ وُہ ایک حصّہ پا دے گا۔ خود یہ ذی رحم خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ جیسے کہ ایک شخص نے نواسے کی بیٹی اور نواسی کا بیٹا چھوڑا۔ تو مال کے تین حصّہ ہو کر نواسے کی بیٹی کو دو اور نواسی کے لڑکے کو ایک ملے گا۔ نواسے کی لڑکی اگرچہ خود عورت ہے۔ مگر دوگنا پا دے گی۔ کیونکہ وُہ مرد یعنی نواسے کی بیٹی ہے۔ اور نواسی کا لڑکا اگرچہ خود مرد ہے مگر ایک حصّہ پا دے گا۔ کیونکہ وُہ نواسی کا لڑکا ہے۔ اور نواسی عورت ہے۔ اور اگر یہ سب ذی رحم اِس بات میں بھی برابر ہیں۔ یعنی یا تو سب مرد کی اولاد ہوں۔ یا سب عورت کی اولاد تو اب اُن میں اِس طرح حصّہ بٹے گا۔ کہ لڑکے کو دو حصّہ اور لڑکی کو ایک حصّہ جیسے کسی نے نواسہ اور نواسی چھوڑی تو کل مال کے تین حصّہ ہو کر نواسے کو دو حصّے اور نواسی کو ایک حصّہ ملے گا۔

دوسری قسم کے ذی رحم وارث کا بیان

دُوسری قسم کے ذی رحم جن کی اولاد میں میّت ہے۔ جیسے نانا وغیرہ اُن میں بھی۔ جس کا رشتہ میّت سے قریب ہوگا۔ وُہ وارث ہوگا اور دُور کے رشتے والے کو محروم کر دے گا۔ جیسے ماں کا باپ اور ماں کا نانا اُن میں ماں کا باپ حصّہ پا دے گا۔ اور ماں کا نانا محرُوم۔ اگر اس قریب ہونے اور دُور ہونے میں سب برابر ہوں تو جس ذی رحم کا رشتہ وارث کے ذریعہ سے ہوگا۔ وُہ وارث ہوگا۔ اور جس کا رشتہ میّت سے ذی رحم کے ذریعہ سے ہوگا۔ اُس کو محرُوم کر دے گا۔ جیسے ایک شخص نے اپنی ماں کا دادا اور اپنی ماں کا نانا چھوڑا۔ تو ماں کے نانا کو حصّہ ملے گا۔ اور ماں کا دادا

محروم رہے گا۔ کیونکہ ماں کے دادا کا رشتہ میّت سے ماں کے باپ کے ذریعہ سے ہے اور وہ یعنی ماں کا باپ ذی رحم ہے تو ماں کا دادا خود بھی ذی رحم اور اُس کا رشتہ پیدا کرنے والا بھی ذی رحم اور ماں کا نانا کہ اس کا رشتہ میّت سے ماں کی ماں کے ذریعے سے ہے۔ اور ماں کی ماں صحیح دادی ہے اور وہ وارث ہوتی ہے۔ اُن کے تمام حکم پہلی قسم کے ذی رحم وارثوں کی طرح ہیں۔

تیسری قسم کے ذی رحم وارث کا بیان

اُن کے حکم بھی وُہی ہیں جو پہلی قسم کے ذی رحم لوگوں کے تھے۔ یعنی جس کا رشتہ میّت سے قریب ہوگا۔ وُہ دُور والے ذی رحم کو محروم کردے گا اسی طرح اس قسم میں بھی جو ذی رحم کو وارث کے ذریعہ سے میّت کا رشتہ دار ہوگا۔ وُہ اس ذی رحم کو محروم کر دے گا۔ جو ذی رحم کے ذریعے سے میّت سے رشتہ رکھتا ہو۔ جیسے بھائی کے بیٹے کی بیٹی اور بہن کی بیٹی کا بیٹا کہ اس صورت میں بھائی کے بیٹے کی بیٹی بہن کی لڑکی کے لڑکے کو محروم کردے گی۔ کیونکہ اس کا رشتہ بھانجی کے ذریعہ سے ہے۔ اور وہ عصبہ ہے۔ یہ تمام باتیں خیال رہیں۔ اور باقی تمام مسائل اس کے بھی پہلی قسم کے ذی رحم لوگوں کی طرح ہیں!

چوتھی قسم کے ذی رحم وارثوں کا بیان

چوتھی قسم کے ذی رحم وارثوں کا یہ حکم ہے۔ کہ اگر ان میں کا کوئی ایک ہی ذی رحم ہے۔ دوسرا نہیں تو یہ ہی پورا مال لے گا۔ کیونکہ کوئی اس کا مقابل موجود نہیں اور اگر اس قسم کے کئی ذی رحم ہیں تو دیکھا جاوے گا کہ ان سب ذی رحم وارثوں کا رشتہ میّت سے ایک ہی طرف سے ہے یا الگ الگ طرف سے ایک طرف سے رشتہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ سب کا رشتہ میّت کے باپ کی طرف سے ہو۔ جیسے میّت کی پھوپیاں اور اخیافی چچا۔ یا سب کا رشتہ ماں کی طرف سے ہو۔ جیسے میّت کی خالہ ماموں اگر کوئی ذی رحم ایک ہی طرف کے رشتہ والے یعنی فقط ماں یا فقط باپ کی طرف کے پائے گئے۔

لہ باپ کے ماں شریکی بھائی ذی رحم ہیں۔ اور باپ کے سگے بھائی اور باپ شریکی بھائی عصبہ ہیں۔ باپ کی بہن تو ذی رحم ہی ہے۔ چاہے کیسی ہی ہو ۱۲ منہ؎

تو اُن میں سے جس کا رشتہ میّت سے مضبوط ہوگا۔ وُہ میراث پائے گا اور کمزور رشتہ والا محرُوم ہوگا۔ مضبوط رشتہ سے مطلب یہ ہے کہ اُس کا رشتہ میّت سے دُو طرف سے ہو۔ اور کمزور سے مُراد یہ ہے۔ کہ اس کا رشتہ ایک ہی طرف سے ہو۔ جیسے میّت کی دُو پھوپیاں ہیں۔ ایک تو باپ کی سگی بہن اور دوسری باپ کی ماں شریکی بہن یا باپ شریکی۔ تو باپ کی سگی بہن حِصّہ پاوے گی اور باپ کی ماں شریکی بہن محروم ہوگی اس لئے کہ سگی کا رشتہ میّت کے باپ سے دو طرف سے ہے اور اس کا ایک طرف سے اِسی طرح اگر دُو پھوپیاں ہیں۔ ایک تو باپ کی شریکی بہن ہے اور دوسری ماں شریکی بہن تو یہ محروم رہے گی۔ کیونکہ باپ کا رشتہ ماں کے رشتہ سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اُن میں جب ایک ہی درجہ کے رشتہ دار ہوں تو مرد کو دُو حِصّہ اور عورت کو ایک حصّہ ملے گا۔ جیسے میّت نے پھوپھی اور اخیافی چچا چھوڑا تو پھوپھی کو ایک حصّہ اور اخیافی چچا کو دُو حصّہ ملیں گے اور اگر ان ذی رحم وارثوں کا رشتہ الگ الگ طرف سے ہے تو اس صورت میں ایک طرف کا مضبوط رشتہ والا ذی رحم دوسرے کمزور رشتہ والے ذی رحم کو محرُوم نہ کر سکے گا۔ جیسے ایک شخص کی ماں کی سگی بہن اور باپ کی ماں شریکی بہن ہے۔ تو دونوں میّت کے مال سے حِصّہ پائیں گی اگرچہ ماں کی بہن کا مضبوط رشتہ ہے۔ اور باپ کی بہن کا کمزور۔ مگر چونکہ اُن کا رشتہ الگ الگ طرف سے ہے اِس لئے ایک دوسرے کو محرُوم نہ کرے گی اور اس صُورت میں ماں کی بہن عورت کو ایک حصّہ اور باپ کی بہن کو دُو حِصّہ ملیں گے کہ ماں کی بہن عورت کے ذریعہ سے میّت کی رشتہ دار ہے اور باپ کی بہن مرد کے ذریعہ سے رشتہ رکھتی ہے۔ لہٰذا باپ کی طرف سے رشتہ والی دُو حِصّہ پاوے گی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اب اگر ہر طرف کے کئی کئی وارث ہوں۔ جیسے کہ تین خالہ ہیں۔ اور چار پھوپیاں تو پہلے ہر گروہ کو الگ الگ حِصّہ دے کہ جو ہر فریق کو ملے گا۔ وہ اُس کے شخصوں پر بانٹ دیا جاوے گا۔ تو تین خالاؤں کو اُن کا حصّہ دلا کر اُس حِصّہ کے تین حِصّہ کر کے ہر ایک کو ایک حِصّہ دے دیا جاوے گا۔ اِسی طرح پھوپیوں کا معاملہ ہے۔

ان کی اولاد کا بیان

چوتھی قسم کے ذی رحم وارثوں کی اولاد کا وُہی حکم ہے۔ جو پہلی قسم کے ذی رحم وارثوں کا تھا یعنی قریب کا رشتہ دار ہوتے ہوئے دُور کا رشتہ والا محرُوم ہوگا۔ تو پھوپھی کا بیٹا

ہوتے ہوئے پھوپھی کے پوتے کو کچھ نہ ملے گا۔ اگر قریب اور دُور ہونے میں سب اولاد برابر ہیں تو اگر میّت سے ایک رشتہ ہے۔ تو مضبوط رشتہ والا حصّہ پا دے گا۔ اور کمزور رشتہ[1] والا مضبوط کے ہوتے ہوئے محروم رہے گا۔ اگر اس میں بھی برابر ہوں۔ تو عصبہ کی اولاد ذی رحم کی اولاد کو محرُوم کر دے گی۔ جیسے میّت نے ایک چچا کی بیٹی اور ایک پھوپی کا بیٹا چھوڑا۔ تو چچا کی بیٹی پھوپی کے بیٹے کو محرُوم کر دے گی۔ کیونکہ لڑکی کا رشتہ عصبہ یعنی چچا کے ذریعہ سے ہے۔ اور لڑکے کا رشتہ ذی رحم یعنی پھوپھی کے ذریعے سے ہے۔ اگر چند طرف کے ذی رحم وارثوں کی اولاد ہو۔ جیسے ایک تو خالہ کی اولاد اور دُوسری پھوپھی کی اولاد، تو اب مضبوط رشتہ والا کمزور رشتہ والے کو محرُوم نہ کر سکے گا۔ جیسے باپ کی سگی بہن کی اور ماں کی باپ شریکی بہن کی اولاد ہے۔ تو اگرچہ پہلی کا رشتہ میّت سے مضبوط ہے اور دُوسری کا کمزور مگر چونکہ ایک ہی طرف کے یہ دونوں وارث نہیں ہیں۔ اس لئے یہ مضبُوط رشتہ والی کمزور رشتہ والی کو محرُوم نہ کر سکے گی۔

حمل کا بیان

عورت کے پیٹ میں بچّہ کم سے کم چھ[6] مہینے تک رہ سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دُو[2] سال تک تو اگر کسی عورت کے اُس کے خاوند کے مرنے سے دُو برس بعد بچّہ پیدا ہو۔ تو یہ اِس میّت خاوند کی میراث نہ پاوے گا۔ کیونکہ یہ بچّہ میّت کا نہیں کسی اور کا ہے۔ اور اگر میّت کے مرنے کے بعد دُو برس یا دُو برس سے کم مدّت میں پیدا ہوا اور بیوی نے اس سے پہلے[2] حمل کا انکار نہ کیا تھا تو اِس بچّہ کو اس میّت کے مال سے حصّہ ملے گا اور اگر میّت کے سوا دوسرے وارث کا ہے جیسے میّت کی ماں حاملہ ہے تو اس صورت میں یہ حمل اگر کم سے کم یعنی میّت کے مرنے کے بعد چھ[6] ماہ یا کم میں پیدا ہو

---

[1] اس کی مثال جیسے میّت کے باپ کی سگی بہن کی اُولاد ہوتے ہوئے میّت کے باپ کی علاتی بہن کی اولاد محرُوم رہے گی ۱۲ منہ

[2] حمل سے انکار کرنے کی صورت یہ ہے کہ عورت چار[4] ماہ دس دن کے بعد کہہ چکی ہو۔ کہ میری عدّت پُوری ہو چکی کیونکہ اگر یہ حمل میّت کا تھا۔ تو حمل کے باہر آنے سے پہلے اُس کی عدّت کیسے پُوری ہوگئی۔ اس لئے کہ جس کا خاوند مر جاوے۔ اور عورت حاملہ ہو۔ تو اس کی عدّت بچہ کے پیدا ہونے سے پُوری ہوتی ہے اور جب

تو اس میّت کے مال کا وارث ہو گا اور اگر اس سے زیادہ مدّت میں پیدا ہوا۔ تو نہیں اور اگر یہ بچہ[۱] زندہ پیدا ہو کر مر جاوے تو دوسرے لوگ اس بچّہ کے وارث ہوں گے۔ یہ جو کہا کہ بچّہ زندہ پیدا ہو تو بچّہ کو میّت کا مال ملے گا۔ اس سے مطلب یہ ہے۔ کہ پُورا بچّہ زندہ پیٹ سے باہر آجاوے اور اگر باہر آنے کی حالت میں مرگیا تو اگر بچّہ سیدھا آیا ہو۔ یعنی سر کی طرف سے پیدا ہوا ہو۔ اور سینہ تک زندہ نکلا۔ تو اس کو زندہ مانا جاوے گا۔ یعنی اُس کو میّت کے مال کا وارث کرکے مال اِس بچّے کے وارثوں کو دیدیا جاوے گا۔ اور اگر سینہ سے کم تک زندہ نکلا۔ تو اِس کو مُردہ مان کر میّت کے مال سے کچھ نہ ملے گا۔ اور اگر اُلٹا پیدا ہوا ہے۔ یعنی پاؤں کی طرف سے ہوا تو اُس میں ناف کا اعتبار ہے یعنی اگر ناف تک زندہ پیدا ہوا۔ اور بعد میں مرا تو اس کو زندہ مان کر میراث کا حق دار مانا جاوے گا۔ اب جب یہ معلوم ہو چکا تو اس کے مسائل یہ ہیں۔ کہ جس طرح زندہ وارث اپنے رشتہ دار میّت کے مال کا حصّہ پاتے ہیں۔ اُسی طرح جو وارث میّت کے مرتے وقت اپنی ماں[۲] کے پیٹ میں ہو۔ وُہ بھی وارث ہو گا۔ مگر اسی شرط سے کہ زندہ پیدا ہو۔ جیسے ایک شخص کا انتقال ہوا۔ اُس کے کچھ لڑکے موجود ہیں۔ اور اُس کی بیوی حاملہ ہے تو جیسے یہ موجود لڑکے اُس کے وارث ہیں۔ اُسی طرح یہ حمل کا بچّہ بھی اُس کا وارث[۳] ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا انتقال ہوا اور اس کے کچھ بھائی زندہ موجود ہیں

باقی حاشیہ ! اُس نے کہا کہ میری عدّت پوری ہو گئی اور بعد میں آٹھ دس ماہ بعد بچّہ پیدا ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ اس بچہ کا حمل بعد میّت ٹھہرا تھا۔

[۱] : اگر حمل سے مُردہ بچّہ پیدا ہوا تو اس کو میّت کے مال سے حصّہ نہ ملے گا۔ یہ حکم اُس صورت میں ہے جب بچّہ اپنے آپ مرا ہوا پیدا ہو۔ لیکن اگر حمل گرا دیا گیا تو وارث ہو گا اور دوسرے ورثاء اُس کے وارث ہوں گے ردّالمحتار منہ ۱۲ ::

[۲] اگر میّت کا مال بانٹتے وقت خبر نہ ہوئی کہ میّت کی بیوی میّت سے حاملہ ہے۔ اور بعد میں بچّہ میّت سے پیدا ہوا۔ تو اِسی تقسیم کئے ہوئے مال کو دوبارہ بانٹا جاوے گا۔ اسی طرح اگر میّت کی بیوی نے کہا کہ مجھے حمل ہے اور دوسرے وارثوں نے کہا۔ کہ تجھ کو حمل نہیں ہے تو کسی جاننے والی ہوشیار دیندار دائی کو دکھایا جاوے گا۔ اگر وُہ حمل بتاوے۔ تو حمل مان لیا جاوے گا ورنہ نہیں۔ ردّالمحتار منہ ۱۲ ۔

[۳] بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اگر عنقریب بچّہ پیدا ہونے کی اُمید ہے مثلاً ایک ماہ سے کم میں بچّہ پیدا ہو جاوے گا تو ابھی مال کو تقسیم نہ کیا جاوے۔ بلکہ بچہ پیدا ہونے کا انتظار کریں۔ کیونکہ خبر نہیں کہ ماں کے پیٹ

اور اُس کے مرتے وقت اس کی ماں حاملہ ہے۔ تو اگر اُس کے زندہ بھائی حصّہ پائیں گے۔ تو ضرور یہ حمل کا بچّہ بھی حصّہ کا حق دار ٹھہرے گا۔ اب جب کہ مال تقسیم کیا جاوے۔ تو ایک وارث کا حصّہ اُس مال سے حمل کے لیئے رکھ لیا جاوے گا۔ کیونکہ اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ماں کے پیٹ میں ایک سے زیادہ بچّے ہوں۔ مگر جب عام طور سے عورتوں کے ایک حمل میں ایک ہی بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک سے زیادہ بچّہ ہونا بہت کم ہے۔ اس لیئے ایک ہی بچّہ کا حصّہ بچا کر رکھا جاوے گا۔ اور باقی وارثوں سے ضامن لیا جاوے گا۔ کہ اگر ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوں۔ تو تم کو اپنے حصّوں میں سے اُس کے حصّہ کی برابر واپس کرنا پڑے گا۔ اب یہ حساب لگایا جاوے کہ اگر حمل لڑکی ہوگی۔ تو زیادہ حصّہ پاوے گی یا لڑکا ہوگا تو زیادہ حصّہ پاوے گا۔ جس صورت میں حمل لڑکی کو زیادہ حصّہ ملے۔ اُسی کا اعتبار کر کے اُس حمل کے لیئے حصّہ رکھا جاوے۔ جیسے کہ اگر یہ حمل لڑکی ہو۔ جب تو کل مال کا آدھا پائے گی اور اگر لڑکا ہو تو عصبہ ہو کر ذی فرض وارثوں سے بچا ہُوا مال رکھا جاوے اور بچا ہوا آدھے سے کم ہے تو اس حمل کو لڑکی مان کر اُس کے لیئے آدھا مال رکھا جاوے۔ اس مسئلہ کے بنانے کے قاعدے یہ ہیں۔ کہ حمل کو لڑکا اور لڑکی فرض کر کے دونوں صورتوں سے مسئلہ بناؤ۔ پھر جن عددوں سے یہ دونوں مسئلے بنے ہیں۔ ان دونوں عددوں کی آپس میں نسبت دیکھو۔ اگر ان دونوں عددوں میں توافق ہے تو ایک مسئلہ کے عدد کے وفق کو دُوسرے مسئلہ کے پورے عدد میں ضرب دو۔ اور اگر ان دونوں مسئلوں کے عدد میں تباین ہے۔ تو ایک مسئلہ کے پورے عدد کو دوسرے مسئلہ کے پورے عدد میں ضرب دو جو کچھ اس ضرب سے حاصل ہو اُس سے مسئلہ کو صحیح کر دیا جاوے۔

پھر وارثوں کے حصّوں پر نگاہ کرو۔ کہ حمل کے لڑکی ماننے کی صورت میں اُن کو جو حصّے ملے ہیں۔ اُن حصّوں کو لڑکے ہونے کی صورت والے مسئلہ کے مخرج میں ضرب دو۔ اور جو حصّے حمل کو

میں کتنے بچے ہیں۔ اور لڑکا ہے یا لڑکی۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ انتظار نہ کریں گے چاہے بچّہ جلد پیدا ہونے والا ہو یا دیر میں کیونکہ اگر آنے والے بچّے کا انتظار کیا تو ممکن ہے کہ جو وارث اب موجود ہیں۔ اُن میں سے جب تک کوئی مر جاوے تو آنے والے کے انتظار سے موجود وارثوں کو کیوں محروم کر دیا جاوے۔ ہاں اگر حمل ایسا ہے کہ اُس کے پیدا ہونے پر موجودہ وارثوں میں سے بعض محروم ہو جائیں گے تو اُن وارثوں کو نہ دیا جاوے گا جو محروم ہونے والے ہوں۔ واللہ اعلم۔ ردّ المحتار ۱۲ منہ

لڑکا ماننے کی صورت میں ملے ہیں۔ اُن کو لڑکی کے مسئلہ کے مخرج میں ضرب دو۔ اگر اُن دونوں مسئلوں کے عددوں میں تباین ہو تب ورنہ اگر توافق ہو۔ تو وارثوں کے حصّوں کو اُن مسئلوں کے مخرجوں کے وفق میں ضرب دیا جاوے اور دیکھا جاوے کہ کس ضرب سے حصّہ کم ملا۔ جس ضرب سے حصّہ کم ملے وہ اُس وارث کو دے دیا جاوے اور زیادتی حمل کے لئے رکھ لی جاوے۔ اگر حمل سے ایسا بچہ پیدا ہوا جو اُس بڑے حصّہ کو پانے کا حق دار ہے۔ جب تو اِس بچہ کو یہ ہی حصّہ دے دیا جاوے اور جتنا پہلے ان دوسرے وارثوں کے حصّوں میں سے کم کر لیا گیا تھا۔ وہ اُن وارثوں کو واپس[^1] کر دیا جاوے۔ اُس کی مثال یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص کا اِنتقال ہُوا اُس نے ایک بیٹی اور ماں باپ اور ایک حاملہ بیوی چھوڑی اس طرح!

لڑکی والی صورت

مسئلہ ۲۴ (عول ۲۷)	۱۱۶	احمد	
لڑکی	ماں	باپ	بیوی - حمل لڑکی
۱۶	۴	۴	۳

لڑکے والی صورت

مسئلہ ۲۴		احمد	
لڑکی	ماں	باپ	بیوی - حمل لڑکا
۱۳	۴	۴	۳

اس صورت میں اگر حمل کو لڑکی مانتے ہیں تو مسئلہ چوبیس (۲۴) سے ہو کر ۲۷ سے عول کیا جاوے گا۔ اس میں سے حمل و لڑکی کو ۱۶ باپ کو اور ماں کو چار، چار بیوی کو تین ملیں گے۔ اور اگر حمل کو لڑکا مانتے ہیں تو مسئلہ ۲۴ سے ہی صحیح ہوگا۔ اس چوبیس (۲۴) میں سے ماں کو چار (۴)، باپ کو چار (۴) اور بیوی کو تین حمل و لڑکے کو ۱۳ ملیں گے۔ ان مسئلوں کے مخرج ۲۴ و ۲۷ ہیں۔ جن سے دونوں مسئلے بنے ہیں۔ دیکھا

---

[^1]: یہ جو معاملہ کیا گیا ہے یہ جب ہے کہ حمل اس وارث کا حصّہ لڑکا یا لڑکی ہونے کی صورت میں کم کر دے۔ اور اگر وارث ایسا ہے۔ کہ اُس کا حصّہ کم ہو ہی نہیں سکتا۔ حمل چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ جیسے دادی کو چھٹا حصّہ ملے گا چاہے حمل سے لڑکا ہو یا لڑکی۔ تو اُس کا حصّہ پُورا دیا جاوے گا۔ اور جو وارث ایسا ہو۔ کہ حمل میں لڑکا ہے۔ جب تو وہ محروم ہو جاتا ہے اور اگر حمل میں لڑکی ہو۔ تو حصّہ پاتا ہے۔ جیسے بھائی تو اُس صورت میں ایسے وارث کو کچھ بھی نہ دیا جائے گا۔ بلکہ حمل کے پیدا ہونے کا انتظار ہوگا۔ حمل کے پیدا ہونے کے بعد اگر یہ وارث حصّہ کا حق دار ہو۔ تو حصّہ دے دیا جاوے۔ ورنہ نہیں اس سے معلوم ہوا کہ وارث تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا حصّہ سارا دے دیا جاوے۔ حمل کی پیدائش سے پہلے ہی دُوسرا وہ جن کو حمل کے پیدا ہونے سے

جاوے۔ کہ ۲۴ و ۲۷ میں کیا نسبت ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ ان دونوں میں تہائی کا توافق ہے کیونکہ تین دونوں کو مٹا دیتا ہے۔ تو ۲۴ کا تہائی لیا۔ (۸) اس ۸ کو ۲۷ میں ضرب دی۔ ۲۱۶ حاصل ہوئے۔ اب لڑکی اور ماں و باپ اور بیوی کے حصّوں کو ۲۴ و ۲۷ کے تہائی میں ضرب دی جاوے

لڑکی	ماں	باپ	بیوی
۶۴ و ۱۲۸	۳۲	۳۲	۲۴

اور اگر اُن وارثوں کے حصّوں کو ۲۷ کی تہائی یعنی ۹ میں ضرب دی۔ تو اُن کو یہ حصّے ملتے ہیں۔

ماں	لڑکی	باپ	بیوی
۳۶	۳۹	۳۶	۲۷

معلوم ہُوا کہ اگر حمل کو لڑکا مانیں تو لڑکی کو ۲۵ کم ملتے ہیں اور بیوی کو تین زیادہ ملتے ہیں اور ماں و باپ کو چار چار زیادہ ملتے ہیں اور اگر حمل کو لڑکی مانیں تو لڑکی کو ۲۵ زیادہ اور بیوی کو تین کم اور ماں باپ کو چار چار کم ملتے ہیں۔ لہٰذا حمل کو ماں باپ اور بیوی کے لئے لڑکا مانا جاویگا۔ اور بیوی کو ۲۴ دیئے جاویں گے۔ تین بچا لئے جاویں گے اور ماں باپ کو ۳۲، ۳۲ دیئے جاویں گے اور اُن کے حصّوں میں سے چار چار بچا لئے جاویں۔ اور لڑکی کو وُہ حصّہ ملے گا۔ جو حمل کے لڑکا ماننے پر اس کو ملا ہے کیونکہ یہ ہی کم ہے۔ یعنی ۱۳ کو ۹ میں ضرب دی۔ تو ۱۱۷ حاصل ہوئے اُس ایک سَو سترہ کا تہائی یعنی ۳۹ لڑکی کو دیا گیا۔ کیونکہ جب حمل کو لڑکا مانا گیا تو اب ۱۱۷ کے تین حصّے کئے جاویں گے۔ اُس میں سے دُو حصّہ لڑکے کے لیے ہیں۔ اور ایک حصّہ لڑکی کے لئے خلاصہ یہ ہوا کہ لڑکی کو وُہ حصّہ دیا جاوے گا جو حمل کو لڑکا مان کر ملتا ہے۔ اور باقی ماں باپ اور بیوی کو وہ حصّہ ملیگا جو حمل کو لڑکی مان کر ملتا ہے۔ کیونکہ لڑکی کے لیئے وُہ کم ہے ماں باپ اور بیوی کے لیے یہ کم ہیں۔ اور حمل کے لئے ۲۱۶ میں سے ۸۹ باقی رکھے جاویں گے۔ اُن موجودہ وارثوں کے حصّے سے حسبِ ذیل کمی کی گئی ۲۵ لڑکی کے حصّے سے ۳ بیوی کے حصّے سے ۴ ماں کے حصّے سے ۴ باپ کے حصّے سے:۔

۳

تو کُل اُٹھا کر رکھے ہوئے حصّہ ۳۶ ہیں۔ اب اگر حمل سے لڑکی پیدا ہوئی۔ تو فقط بیٹی کو ۲۵

باقی حاشیہ! پہلے بالکل نہیں دیا جاتا۔ اور تیسرا وُہ جن کو کم حصّہ دیا جاتا ہے۔ یہاں اسی تیسرے قسم کے وارث کا ذکر ہے۔ ردّ المحتار منہ ۱۲!

واپس کر دیئے جاویں گے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا حصّہ کم ہوا تھا۔ اور ماں باپ وغیرہ کو
کچھ واپس نہ ہوگا۔ اور اگر حمل سے لڑکا پیدا ہوا۔ تو ماں کو ۴۔ باپ کو چار بیوی کو ۳ ۱۲
واپس کئے جاویں گے اور لڑکی کو کچھ واپس نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں لڑکی کے حصّہ سے
کچھ کم نہ ہوا تھا۔ اور اگر یہ حمل کا بچہ مرا ہوا پیدا ہو۔ تب تو لڑکی کو ۶۹ اور دیئے جاویں گے
کہ یہ ۶۹ اُنتالیس ۳۹ سے مل کر ۱۰۸ ہو جاویں۔ جو ۲۱۶ کا آدھا ہے۔ اور بیوی کو تین اور دیئے
جاویں گے۔ تاکہ یہ تین اُن ۲۴ سے مل کر ۲۷ ہو جاویں۔ کیونکہ ۲۷، ۲۱۶ کا آٹھواں حصّہ ہے۔ اور ماں کو چار
تاکہ یہ چار مل کر ۲۱۶ کا چھٹا حصّہ یعنی ۳۶ ہو جاویں۔ اور باپ کو چار اُس کا چھٹا حصّہ پورا کرنے کے
لئے اور باقی ۹ عصبہ ہونے کی وجہ سے دیئے جاویں۔ اب اس طرح مسئلہ ہوا کہ مسئلہ کے عدد
۲۱۶ جن میں سے بیٹی کو، بیوی کو، ماں کو، باپ کو اِن کو جمع کیا۔ تو ۲۱۶ ہو گئے:

۱۰۸	۲۷	۳۶	۴۵

۱۰۸
۲۷
۳۶
۴۵
۲۱۶

مفقود یعنی گمے ہوئے وارث کا بیان

گمے ہوئے شخص سے وہ مراد ہے۔ جو اپنے وطن سے ایسا غائب ہو گیا ہو۔ کہ اُس کی خبر نہ رہی کہ
مر گیا یا زندہ ہے اور اگر زندہ ہے۔ تو کہاں ہے ایسے آدمی کا یہ حکم ہے۔ کہ اُس کے مال کے معاملہ
میں تو اُس کو زندہ مانا جاوے گا۔ یعنی اُس کے مال کا کوئی وارث نہ ہوگا۔ اور اس کے دوسرے
رشتہ داروں کے مال میں اُس کو مُردہ مانا جاوے گا۔ یعنی کسی کے مال کا وہ وارث نہیں یہ
تو دوسرے کے مال کا وارث نہ ہوگا۔ مگر دوسرے وارثین جو اس کی وجہ سے محروم ہوتے
ہوں۔ اُن کو اُس وقت نہ دیا جاوے گا۔ اسی طرح جس کا حصّہ اس کی وجہ سے کم ہوتا ہوگا اُس
کو کم کر دیا جاوے گا۔ اور اُس کا مال رکھا رہے گا۔ کسی کو ورثہ میں نہ دیا جاوے گا۔ جب تک کہ
اس کی موت کی خبر نہ مل جاوے۔ اگر کسی طریقہ سے معلوم ہو جاوے کہ وہ فلاں تاریخ میں
مر گیا۔ تو اس تاریخ میں جو اُس کے وارثین زندہ ہوں گے۔ اُن میں اُس کا مال بانٹ دیا جاوے
گا۔ اگر اس کی موت کی خبر نہ ملے۔ تو جب اُس کی زندگی کی مدّت ختم ہو جاوے۔ تب اس کی
موت کا حکم دیا جاوے گا۔ یہ مدّت ۹۰ سال ہے۔ یعنی جب اُس کی عمر ۹۰ سال ہو جاوے۔
جیسے ایک آدمی ۴۰ سال کی عمر میں غائب ہوا۔ تو پچاس سال اور انتظار کر کے موت کا حکم

دیا جاوے گا۔ کیونکہ ۴۰ سال کی عمر میں غائب ہوا اور ۵۰ سال غائب ہوئے ہو گئے اب اُس کی عمر ۹۰ سال کی ہو گئی ہے۔ جس وقت کہ اس کی موت کا حکم دیا گیا۔ اُس وقت جتنے وارث زندہ ہوں گے۔ اُن ہی میں مفقود کے مال کی میراث تقسیم کر دی جاوے۔ اسی طرح اس کی موت سے پہلے جن لوگوں کا مال تقسیم ہوا۔ اور اس کی وجہ سے اُس کے وارثوں کو آج دیا جاوے گا۔ یعنی جس وارث کا حصّہ اس گمے ہوئے کی وجہ سے نہ دیا گیا تھا۔ اُس کو آج دیا جاوے گا یا اُس کے حصّے کی کمی پوری کر دی جاوے گی۔ جیسے ایک آدمی کا انتقال ہوا۔ اُس نے ماں، بیوی، بھائی اور ایک گما ہوا بیٹا چھوڑا تو ماں اور بیوی نے اس کی وجہ سے کم پایا اور بھائی اس کی وجہ سے بالکل حصّہ نہ پا سکا۔ اب جب کہ اس کے مرنے کا حکم دیا گیا۔ تو ماں اور بیوی کا حصّہ پورا کر دیا گیا اور بھائی کو اُس کا حصّہ مل گیا۔ اس مسئلہ کے بنانے کا بھی وُہی قاعدہ ہے جو حمل کے بیان میں گزر چکا ہے۔ کہ اُس کے رشتہ داروں میں سے اگر کوئی شخص مرے۔ اور اُس کے وارثوں میں اس طرح کا مال تقسیم کیا جاوے تو دو طرح اُس کے مال کا مسئلہ بنایا جاوے۔ ایک تو اس گمے ہوئے کو زندہ مان کر دوسرے اس کو مُردہ مان کر اور اُن دونوں مسئلوں کے عددوں میں ایک دوسرے کو ضرب دے دو۔ اگر تباین ہو۔ اور اگر توافق ہو تو ایک کے وفق کو دوسرے میں ضرب دی جاوے۔ پھر اُسی طرح اُن کے وارثوں کو جس مسئلہ سے جتنے حصّے ملے ہوں۔ اُن کو دُوسرے مسئلہ کے پُورے مخرج یا وفق سے ضرب دے دی جاوے۔ اور جس میں حصّہ کم ملے۔ وُہ ہی حصّہ دے دیا جاوے۔ اور باقی زیادتی رکھ لی جاوے اور جو شخص اس گمے ہوئے شخص کو زندہ ماننے سے محروم ہوتا ہو۔ اس کو اُس وقت مال نہ دیا جاوے غرض کہ جو کچھ حمل کے بیان میں تفصیل سے گزرا۔ وہی یہاں کیا جاوے۔ پھر جب یہ گما ہُوا آدمی مُردہ ثابت ہو۔ تب اُن وارثوں کے رکھے ہوئے حصّے واپس کر دیئے جاویں۔

مرتد کا حکم

جو شخص مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جاوے۔ اس کو مُرتد کہتے ہیں۔ اگر مُرتد اپنے کفر پر ہی مر جائے۔ یا قتل کر دیا جاوے۔ تو مال جو اُس نے اپنے مسلمان ہونے کے زمانہ میں کمایا تھا۔ اُس میں سے اُس کا وُہ قرض جو مسلمان ہونے کے زمانہ کا ہوا ادا کیا جاوے گا۔ اُس سے جو مال بچے

وُہ اُن وارثوں میں بانٹ دیا جاوے۔ جو اس کے مرتے وقت یا قتل ہوتے وقت موجود ہیں اور جو مال مرتد ہونے کے بعد کمایا ہے۔ اُس سے مُرتد ہونے کے بعد جو اُس پر قرضہ ہوگیا ہو وُہ ادا کیا جاوے اور جو باقی بچے وُہ بیت المال میں رکھ دیا جاوے۔ کہ مسلمانوں کی ضرورتوں میں کام آوے۔ اور اگر عورت مرتدہ ہوگئی تو اس کے تمام مال سے اُس کے وارث ورثہ پائیں گے۔ چاہیے وہ اسلام کے زمانہ میں مال کمایا ہو یا کافر ہونے کے بعد جو شخص مُرتد ہوگیا وُہ اپنے کسی رشتہ دار کے مال سے ورثہ نہیں پا سکتا چاہے وُہ رشتہ دار مسلمان ہو یا وُہ بھی مُرتد ہوگیا ہو۔ اسی طرح مرتدہ عورت کسی کے مال سے ورثہ نہ پائے گی۔ ہاں اگر دو معاذاللہ، کسی شہر کے تمام لوگ مُرتد ہوگئے۔ تو اُن میں سے ایک دُوسرے کا مال ورثہ میں پائیں گے۔

قیدی وارث کا بیان

جس مسلمان شخص کو کافر قید کر کے اپنے ملک میں لے گئے۔ وُہ جب تک اسلام پر قائم رہے اُس وقت تک اور مسلمانوں کی طرح ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے مال سے ورثہ پاوے گا۔ اور اگر اس قیدی مسلمان نے نعوذ باللہ۔ اپنا مذہب بدل دیا۔ تو اس کے حکم اب مُرتد کی طرح ہو جائیں گے اور اگر اس کے رشتہ داروں کو خبر نہ رہی۔ کہ وُہ مسلمان ہے یا کافر ہوگیا تو اس کا حکم گمُے ہوئے شخص کی طرح ہے کہ اُس کے دوسرے رشتہ داروں کو اپنے مورثوں (مرنے والوں) کے مال سے کم حصّہ دیا جاوے گا۔ اور باقی بچا کر رکھا جاوے گا۔ جب پوری خبر مل جاوے۔ کہ وُہ مسلمان ہے تب تو خیر۔ اور اگر خبر ملے۔ کہ وہ کافر ہو چکا تو وارثوں کا مال جو بچا کر رکھا گیا۔ واپس کر دیا جائیگا۔

ؔلہ کافر یا تو اِس طرح ہو جائے کہ مذہبِ اسلام کو چھوڑ کر کسی دُوسرے مذہب سے جا ملے جیسے عیسائی یا یہودی یا ہندو ہو جائے۔ اور یا اس طرح کہ وُہ تو اپنے آپ کو مُسلمان ہی سمجھتا رہے۔ اور دعوٰی اسلام کا ہی کرتا رہے۔ مگر شریعت اس کو کافر کہتی ہو جیسے اس زمانے کے صرف وُہ وہابی جنہوں نے حضورِ اکرم صلّی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلّم کی شانِ مبارک میں بڑی باتیں لکھیں یا بکیں یا اس بکنے کو اچھا سمجھا۔ اِسی طرح قادیانی نیچری وغیرہ اور دُوسرے وُہ لوگ جو شرعاً کافر ہو چکے۔ مگر وُہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ۱۲ منہ۔ خیال رہے کہ بدمذہب فرقے شرعی کافر ہیں مگر میراث میں قانونی کافروں کا ذکر ہے

جو لوگ جل کر یا ڈوب کر یا دب کر مر جائیں انکا بیان

اگر ایک کنبے کے چند لوگ اچانک مر جائیں چاہیں ڈوب کر یا جل کر یا دب یا کسی اور طرح اور پتہ نہ چلے کہ ان میں پہلے کون مرا ہے اور بعد میں کون تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ سب ایک دم ہی مرے ہیں۔ لہٰذا ان مرنے والوں میں سے کسی کو کسی کا وارث نہ بنایا جائے گا۔ بلکہ انکے وہ وارث جو اب موجود ہیں۔ انکو ہی سب مال شرعی طریقہ سے بانٹ کر دے دیا جائے گا۔ جیسے باپ۔ بیٹا بھائی بہن۔ کسی مکان سے دب کر مر گئے تو نہ باپ کے مال سے اس اولاد کو کچھ ملے اور نہ ہی ان بیٹوں کے مال سے باپ مرحوم کو کچھ ملے۔ نہ بیٹی نہ بھائی بہن کے مال سے کچھ ملے۔ بلکہ جو لوگ ان ہلاک شدگان کے وارثین میں اب موجود زندہ ہیں ان میں ان میتوں کا مال بانٹ دیا جائے گا۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَم

ناچیز / احمد یار خان قادری بدایونی

صدر مدرس

مدرسہ مسکینیہ دھوراجی۔ کاٹھیاواڑ گجرات۔ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ

علم فرائض کے کچھ اصطلاحی الفاظ جن کو یاد کرنا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے تاکہ علم سیکھنا آسان ہو جائے

(۱) مورث : جو فوت ہوا اور اُس کا مال تقسیم کیا جائے۔

(۲) وارث : جس کو تقسیم شدہ مال دیا جائے۔

(۳) میراث : وہ مال جو مرنے والا چھوڑ جائے اور اس کو تقسیم کیا جائے۔

(۴) مصرف : میت کا مال کہاں خرچ کیا جائے۔

(۵) ذی فرض : وہ وارث جس کا حصہ قرآن مجید نے مقرر فرما دیا ہے۔

(۶) عصبہ : وہ وارث جن کا حصہ قرآن مجید نے بیان نہ کیا ہے۔ اور ذی فرض کی تقسیم کر کے جو مال بچے وہ اُن کو دیا جائے۔

(۷) ذی رحم : وہ وارث جو عصبہ نہ ہوں تو میراث پائیں۔

(۸) حجب : کوئی وارث دوسرے وارث کو محروم کر دے یا اُس کا حصہ میراث کا کم کر دے۔

(۹) عول : چھوٹے عدد سے تقسیم پوری نہ ہو تو وارثوں کے حصوں کے مطابق بڑے عدد سے تقسیم کی جائے۔ اس کو عول کہتے ہیں۔

(۱۰) مساوی : میراث کے عدد اور وارثوں کے عدد برابر ہوں۔

(۱۱) متداخل :۔ بڑا چھوٹا عدد ہو۔ اور بڑا عدد چھوٹے پر ——— برابر تقسیم ہو جائے

(۱۲) توافق : بڑا چھوٹا عدد ہو۔ اور چھوٹا بڑا عدد ۔آپس میں برابر نہ تقسیم ہوں مگر تیسرا عدد دونوں کو برابر بانٹ دے۔

(۱۳) تباین :۔ بڑا چھوٹا عدد نہ خود برابر بٹ سکے نہ تیسرا عدد ان کو برابر تقسیم ------ کرے۔

(۱۴) مناسخہ : ایک شخص کے مال ابھی تقسیم نہ ہوا تھا کہ اُس کے کچھ وارث مر گئے اور ان کا حصہ تقسیم سے پہلے میراث بن گیا۔

کتاب الآداب

فنِ تصنیف کی گہرائیاں اور ذمہ داریاں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سوال ۴۵

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ وَرَؤُوْفُ الرَّحِیْمِ ؕ **اَمَّا بَعْدُ** اس بات سے کون ذی عقل وفہم ناواقف ہے۔ کہ دنیائے علم وہنر میں فن تصنیف انتہائی مشکل اور اہم ذمے داری کا کام ہے اسی فن سے شخصی قسمتیں وابستہ ہیں۔ مصنفین کے قلم سے ہی اقوام عالم کے زوال وعروج ہوتے رہے۔ یہی وہ فن ہے، جس کے جادو سے تفکرات ومزاج بدلے جا سکتے ہیں۔ اس ہنر میں یہ ملکہ ہے۔ کہ اول کو آخر میں، ازل کو ابد میں منتقل کیا جا سکے۔ غرضکہ جس نے کائنات کے دھارے کو پھیرا۔ وہ یہی طاقت ہے۔ آج ہم کو دولت ایمانی وعرفانی کا میسر ہونا اسی محنتِ اکابر کا ثمرہ ہے۔ جَزَاھُمُ اللّٰہُ فِی الْجَنَّۃِ خَیْرَ الْجَزَاءِ ؕ تصورات رومی وغزالی اسی چاند کی بکھیر ہے۔ اور اسی سورج کی دھوپ ہے مگر اتنا ضرور خیال رہے۔ کہ تصنیف مثل **کشکول** ہے۔ اس میں جو بھرا جائے گا وہ ہی تقسیم ہوگا۔ دودھ اور شہد بھرنے سے دودھ اور شہد ہی ملے گا۔ اور اگر زہر قاتل ہوگا تو ہلاکت وتباہی سے ہی واسطہ پڑے گا۔ اس دنیاء دون میں جیسے جیسے مصنف پیدا ہوتے رہے ویسے ہی قوم کے مزاج میں تبدیلی آتی رہی۔ اور حق وباطل تصنیف ہی کے گہوارے پلتے بڑھتے رہے۔ بہر حال اس تسلیم کے سواء چارہ نہیں کہ تصنیف بہت ذمہ داری کا فریضہ ہے۔ اور ایک نازک ترین راہ گزر ہے۔ سابقہ عقلاء وحکماء بڑی احتیاط سے اس پگڈنڈی پر قدم رکھتے تھے۔ جتنا یہ نازک فن تھا۔ اتنا ہی فی زمانہ لوگوں نے اس کو معمولی کام سمجھ لیا۔ ہر ناسمجھ اہل قلم بن بیٹھا۔ اور لگا قوم کی قسمتوں کے فیصلے لکھنے۔ آج قوم کے تفرقوں اور نسل انسانی کی اخلاقی تباہی کی ذمہ داری انہی مصنفین کے سر ہے۔ فن تصنیف میں سب سے باریک پہلو یہ ہے۔ کہ مصنف کے نازک قلم سے کوئی ایسا نشتر نہ لگے جو صاحب تصنیف کے خود اپنے ہی مسلک کو مجروح کرتا چلا جائے۔ ورنہ مصنف اور اس کے ہم مشرب افراد

کی تباہی لازمی ہے۔ اس کچھار سے بچنے کے لیے لازم و اشد ضروری ہے۔ کہ تصنیف پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے مسلک کے صغریٰ، کبریٰ و اصغر و اکبر سے کما حقہٗ واقف اور مذہب کے اصول و فروع سے خبردار ہو۔ کامیاب مصنف کے لیے دوسری یہ چیز ضروری ہے کہ اپنے اکابر سے تصادم کا راستہ اختیار نہ کرے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو تطبیق کی صورت اختیار کرے۔ اگر کسی بزرگ سے تطبیق ممکن نظر نہ آئے تو بھی خلاف سے ہٹ کر راہ اختلاف پر گامزن ہو۔ بشرطیکہ کسی اور بزرگ کا تائیدی سہارا لے کر اور اس اختلاف میں بھی للّٰہیت و خلوص ہونا اہم ہے۔ مصنف کو اپنے مسلک کے حدود میں رہتے ہوئے فراخ دل ہونا لازم ہے۔ مصنف کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے۔ کہ تعصب و عناد کی پٹی کھول کر اس میدان میں قدم رکھے۔ مگر تصلّب لازم۔ ورنہ آغوشِ اغیار میں جانا مصنف کی اخلاقی بربادی اور فن کی ذلت ہے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ مقفہ مسجّع عبارات اور لفاظی فن کاری اور عجیب و غریب الفاظ کی بھرمار کا نام کامیاب تصنیف ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ کامیاب تصنیف وہ ہے۔ جس سے مقصدِ تصنیف اجاگر ہو۔ جن کے لیے لکھی گئی ہے۔ ان کی فہم سے بالاتر نہ ہو۔ بلکہ قارئین کی فہم و ادراک سے قریب تر ہو۔ جیسے کہ علماء کے لیے اعلیٰ حضرت کی تصنیف اور عوام و خواص کے لیے حضرت حکیم الامت کی تحاریر۔ بعض ناسمجھ مصنفین اپنے تصنیفی جوش میں ایسی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں کہ شریعت پاک کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ خالق، اللہ کریم کے لیے خاص۔ کسی انسان وغیرہ کو خالق کہنا حرام ہے۔ اسی طرح لفظ معجزہ انبیاء کرام کے افعال عجیبہ کے لیے خاص ہے۔ مگر بہت سے غیر ذمے دار، اسلامی تعلیم سے اجہل صحافی اور پاکستانی مصنف، قائدِ اعظم کے لیے لکھ دیتے ہیں۔ کہ پاکستان کا خالق (معاذ اللہ) کتنا بے ہودہ اور گناہ والا جملہ ہے۔ بعض کتابوں میں اس طرح لکھا دیکھا کہ معجزات ہومیو پیتھی وغیرہ وغیرہ یہ سب گناہ اور مسلمان کی شان تصنیف کے خلاف۔ ایسے ہی مسلک اہل سنت میں لفظ علیہ السلام، انبیاء و ملائکہ کے علاوہ کسی کے لیے لکھنا ناجائز۔ مگر غیر ذمے دار مقررِ صفت سنی اہل قلم علیہ السلام، صدیق علیہ السلام لکھ دیتے ہیں۔ جس سے مسلک کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

آداب المفتی: قانون شریعت میں کون شخص فتوای دے سکتا ہے کون نہیں:

یہ تو منزل تصنیف کے گوشوں کی تطہیر تھی۔ لیکن اصول افتاء اس سے بھی مشکل تر ہیں۔ اور ایک مفتی اسلام بننے کے لیے کہیں زیادہ کٹھن منزلیں ہیں۔ قانون شریعت کے مطابق لفظ مفتی ایک ذمہ دار عہدے کا نام ہے۔ جس طرح آجکل انگریزی قانون میں جج، جسٹس اور چیف جسٹس عدالتی ارکان کے نام رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح عدالت اسلامیہ کے اہم نام مفتی، قاضی اور قاضی القضاۃ ہیں۔ دنیاوی قانون میں بغیر ڈگری

اور بغیر منظوری حکومت کوئی شخص بھی حکومت وقت کے قانونی نام استعمال نہیں کر سکتا۔ ورنہ قانونی مجرم ہو کر مستوجب سزا ہوتا ہے۔ اسی طرح حکم اسلامی کی رو سے اسلامی سلطنت کے قانونی نام شرعاً کسی طرح استعمال کرنے جائز نہیں۔ ایک عام آدمی کو قانون اجازت نہیں دیتا کہ اپنا لقب یا تخلص کرنل یا جرنل یا ڈپٹی کمشنر یا مجسٹریٹ رکھے۔ ورنہ وہ توہین حکومت کا مرتکب گردانا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی حکومت کے ڈر سے ایسا کرتا ہے۔ تو شریعت پاک بھی کسی جاہل یا کم علم کو ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ کہ اپنا نام یا لقب یا تخلص، مفتی، محدث، مفسر رکھے۔ یہ الفاظ کوئی ذات پات نہیں۔ نہ ہی یہ بطور قافیہ ردیف ہے۔ کہ ہر نااہل آدمی اپنے نام سے پیوست کرتا پھرے۔ یہ الفاظ نااہل کے لیے استعمال کرنے سے عدالت اسلام کی توہین ہے۔ اور ایسا شخص میدان محشر میں ضرور سزایاب ہوگا۔ یہاں تک کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ایک شخص پورا عالم متبحر ہو مگر فتوے نہ دیتا ہو وہ بھی اپنے آپ کو مفتی نہیں لکھ سکتا۔ نہ ہی اس کو مفتی کہا جائے۔ کیونکہ کہلانے اور کہنے والا دونوں کذب بیانی کے مرتکب۔ لفظ مفتی، عدالت اسلامیہ کا عظیم ترین نام ہے۔

اس کے لیے وہی لائق ہے اور اہل ہے جس میں فقہاء کرام کی فرمودہ اٹھائیس ۲۸ صلاحیتیں ہوں۔ مندرجہ ذیل فرمودات حضرت حکیم الامت قبلۂ عالم مفتی اعظم اسلام مفتی احمد یار خاں صاحب علم الافتاء کے دوران اسباق افتاء کے ضمن میں تلامذۂ دار الافتاء کو سبقاً سبقاً تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ اور اس درس میں آپ کچھ زیادہ ہی اہتمام فرماتے۔ متقدمین و متاخرین فقہاء نے بھی اس علم فتوی پر بہت کتب تصنیف کیں۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے حقوق اللہ اور حقوق العباد ہر دو وابستہ ہیں۔ اس فن میں ذرا سی چوک بعض وقت خود مفتی کے دین و ایمان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ مفتی بننے میں پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اگرچہ غریب ہو۔ امیر ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ دولت مندی اسلام کی خدمت گزاری کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہی وجہ ہے۔ متبحر علماء اکثر سفید پوش اور حالت مفلسی میں ہی رہے۔ جیسا کہ تاریخ اسلام اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا سے واضح ہے۔ ادب اخلاق اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا جو پہلو اعلیٰ خاندانی میں ہے وہ نیچ قوم میں نہیں۔

اور ایک مفتی اسلام کے لیے اخلاق و تہذیب اور سلیقۂ گفتگو نہایت ضروری ہے۔

دوسری شرط مفتی بننے کے لیے ضروری ہے کہ بیشۂ علم معرفت میں مثل ہرن ہو۔ کہ ہر چیز سے چوکنا رہے۔ اور وادی عشق و مستی میں مثل شیر ہو۔ کہ دل کا مستغنی اور راضی بہ رضا رہے۔

(از فتاوی عالمگیری) **تیسری شرط** جتنے علاقوں میں اس کا فتوی جاری ہوتا ہو ان علاقوں کے

لغت اور رواج و رسومات سے واقف ہو۔ علامہ شامی عقود رسم المفتی کے صفحہ نمبر ۱۴۱ پر فرماتے ہیں۔ جو اپنے زمانے کے رواج سے ناواقف ہو وہ علماء فتویٰ کے نزدیک جاہل ہے۔ چوتھی شرط، قرآن وحدیث اور قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے اٹھارہ علوم کا ماہر ہو۔ (فتاویٰ عالمگیری وفتح القدیر)

پانچویں شرط امراء اغنیاء، دولت والوں سے دور رہے۔ کثرت محافل سے پرہیز کرے۔ بلکہ گوشہ نشینی اختیار کرے۔ اور بقول اعلیٰ حضرت۔ ع۔ منم و کنج خیال و دواتے قلمے خلوت میں ہو۔ علماء کرام کی گوشہ نشینی یہ ہے۔ کہ ہر وقت تحقیق وعلمی جستجو میں لگا رہے۔ اگرچہ بازاروں میں پھرتا ہو۔ یا بظاہر دریاؤں، پہاڑوں کی سیر میں مشغول ہو۔ اور بقول حضرت سعدی علیہ الرحمتہ۔ مصرعہ

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار کا مظہر اتم ہو۔

چھٹی شرط اس میں عقل وخرد پوری بلکہ اتنی زیادہ ہو کہ ملکۂ اجتہاد فروعی پیدا ہو سکے۔ (عالمگیری جلد سوم صفحہ نمبر ۳۰۸) ساتویں شرط اپنے ہر اجتہاد پر اپنے امام کی باحوالہ تائید حاصل کرتا جائے آٹھویں شرط مفتی کے لیے لازم ہے کہ نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز ہو۔ نرم اور میٹھی زبان حلیم اور باوقار طبیعت ہو۔ نویں شرط، مسلمان، متقی، پرہیزگار ہو۔ فاسق یا گھناؤنی طبیعت اور بدخصائل یا رذیل عادات والا نہ ہو۔ دسویں شرط عدل وانصاف والا ہو۔ ظالم ترشرو امراء کی دلجوئی یا ان سے مرعوب، خوف زدہ ہونے والا بزدل نہ ہو، حق بات میں جابر بادشاہ سے بھی نہ ڈرے۔ گیارہویں شرط مفتی کیلئے ضروری ہے تحمل مزاجی سے مستفتی کی بات سنے۔ اور اس کو سوال وجواب اور بحث کرنے کی پوری آزادی دے۔ اور استفتاء کی تحریر بغور پڑھے۔ اچھی طرح سمجھے۔ ایک ایک نقطے پر غور کرے، صرف سنانے اور لکھنے کا ہی عادی نہ ہو۔ بلکہ حق سننے اور حق کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالے۔ غلطی کے اعتراف میں شرمندگی محسوس نہ کرے۔ کیونکہ غلطی پر اڑجانا تکبر اور غرور کی نشانی ہے۔ ایسا شخص مفتیٔ اسلام ہونے کے لائق نہیں۔ بلکہ بقول حدیث پاک گمراہ اور گمراہ گر ہے۔ بارھویں شرط جس کا استفتاء پہلے ہو اس کو پہلے جواب دے۔ کسی امیر کی رعایت سے یہ ترتیب نہ توڑے۔ اگر امراء دباؤ ڈالیں۔ بشرطیکہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔ ہاں علماء کرام، صوفیاء عظام یا اپنے قریبی احباب کے لیے یا آسان اور مشکل فتاویٰ کے اعتبار سے ترتیب توڑنا جائز ہے۔ جب کہ سابق مستفتی کو نقصان نہ ہو۔ تیرھویں شرط حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے۔ کہ فی زمانہ اگر مگر کرکے فتویٰ نہ لکھا جائے۔ بلکہ اگر کسی دوسرے فرد کا بھی استفتاء سے تعلق ہے۔ تو اس کو حاضر کرکے دو طرفہ مع شہادت حلفیہ بیان لے کر اور پوری تشفی کرکے تب فتویٰ لکھے۔ اگرچہ کچھ دن لگ جائیں

فتویٰ پر اعتماد طریقے سے لکھا جائے۔ اوّل سے ہی رجوع کا ارادہ نہ ہو۔ ورنہ مفتی میں کبھی بھی خود اعتمادی پیدا نہ ہوگی۔ دلائل مضبوط پیش کرے محوّلہ کتب کا باب اور صفحہ بھی نوٹ کر دیا جائے۔ نادر و نایاب کتب کے ایسے حوالوں سے پرہیز کیا جائے۔ جن کی تائید دوسری کتب مشہورہ سے میسّر نہ ہو (از عالمگیری) **چودھویں شرط** مفتی کے لیے ضروری ہے کہ تمام دینی تعلیم کسی بڑے متبحّر عالم دین سے پڑھی ہو۔ اور سند یافتہ ہو۔ جو شخص خود بخود عربی کتب کا مطالعہ کرے۔ کتنا ہی بڑا عالم بن جائے۔ مگر فتوے دینے کا اہل نہ ہوگا (عقود رسم المفتی لعلامہ شامی صفحہ نمبر ۵) **پندرھویں شرط** حضرت حکیم الامت نے فرمایا بچوں اور عورتوں سے استفتاء کا کاغذ نہ پکڑے۔ بلکہ درمیان میں مردوں کا واسطہ رکھے۔ نہ ہی بچوں یا عورتوں کی مجلسوں میں بیٹھ کر فتویٰ لکھے۔ **سولہویں شرط** جب حوالے کے لیے کتب کا مطالعہ کرے تو بہتر ہے کہ با وضو ہو اور عزت و احترام سے کتب کا مطالعہ کرے۔ ادب سے رکھے۔ نیچے زمین پر یا چٹائی پر نہ رکھے۔ ورنہ ادب ختم ہونے سے ملکۂ تفقّہ فی الدّین ختم ہو جائے گا۔ کتب فقہ پر اپنی تسبیح یا قلم دوات بھی نہ رکھے کہ سوءِ ادبی ہے **ستارھویں شرط** فتووں یا سوالوں سے ردّی کاغذ پھاڑ کر زمین پر نہ پھینکیں کہ یہ بدخصلتی کا نمونہ ہے۔ نفسیاتی طور پر طبیعت کی نفاست پسندی جو ایک مفتیٔ وقت کے لیے بہت ضروری ہے ختم ہو جاتی ہے۔ لکھے ہوئے یا سادے کاغذ سے استنجا کرنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ یہ یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی میں ایجاد کردہ رسم ہے۔ کاغذ سے کسی قسم کا استنجا کرنے کی حرمت کا حکم سب مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ کاغذ ذریعہ ہے اشاعت قرآن و حدیث و تبلیغ دین کا۔ **اٹھارویں شرط** مفتی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ فوراً بعد بلوغت باعتبار اہلیت منصب افتاء پر فائز ہونا جائز ہے (عالمگیری) چنانچہ اعلیٰ حضرت کے اساتذہ نے اعلیٰ حضرت قبلۂ عالم کو بلوغت کے ایک سال بعد بعمر تیرہ سال ہی تحریر فتوے کے لائق بنا دیا تھا۔ اور آپ نے تیرہ سال کی مختصر عمر میں بکمال ذہنیت اپنے رب کریم کے فضل و کرم سے پہلا جامع مانع فتویٰ لکھا خود مجھ کو حضرت حکیم الامت کی محنت شاقہ و نگاہ داشت نے اٹھارہ سالہ عمر ۱۹۵۹ء میں پہلا فتویٰ لکھنے کا شرف بخشا۔ جبکہ میری پیدائش بقول بڑی پھوپھی صاحبہ بدایونی مدّ فیوضہا۔ ماہ اپریل بروز جمعہ بوقت اشراق وطن اوجھیانی ۱۹۴۲ء میں یعنی پاکستان بننے سے چھ سال پیشتر۔ اس حساب سے اس وقت میری عمر چھتیس ۳۶ سال بنتی ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِكَ **انیسویں شرط** کتاب پر لکھے ہوئے مسئلے کو پہلے بار بار پڑھ کر اچھی طرح سمجھے پھر بیان کرے۔ **بیسویں شرط** مفتی کیلیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ زبانی یا تحریری فتویٰ دیتے وقت نہ زیادہ بھوکا ہو نہ پیاسا، نہ زیادہ پیٹ

بھرا ہُوا ہو۔ اس لیے کہ بھوک، پیاس میں جلدی غصہ آجاتا ہے۔ جو ایک مفتی کی شان کے خلاف ہے کہ بلاوجہ غصہ اور بے موقع طیش جہلا کا کام ہے۔ اور پیٹ بھرا ہو تو سستی پیدا ہوتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ قوت فتویٰ نویسی اور معاملہ فہمی کے لیے بہت ضروری ہے۔ **اکیسویں شرط** زبانی یا تحریری فتوے میں اشارے کنائے والے الفاظ و جملوں سے اجتناب لازم ہے۔ صاف صاف عام فہم پوری عبارت اور شستہ گفتگو اور تحریر ہو۔ اس لیے کہ مستفتی اکثر گنوار ہوتے ہیں۔ ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو ہونی چاہیئے۔ (از نبراس علی شرح عقائد صفحہ نمبر ۱۱۹)

بائیسویں شرط فتویٰ لکھنے سے پہلے اپنے رب کریم کے حضور گناہوں کی معافی اور بخشش و کرم کی طلب ہو۔ اور خطا و نسیان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ بلکہ اپنے ہاتھ اور قلم کو سمت قبلہ بطریقہ دعا دراز کرکے یہ عرض کرے۔ کہ یا اللہ مجھ کو ان کے فتنے سے بچا۔ اور ان کے فیوضات سے نواز پھر لفظ الجواب کی ب خاص دراز کرے۔ اس کے اوپر استعانت باللہ کے دعائیہ الفاظ لکھے۔ پھر نیچے فتوے کی عبارت شروع کرے اور سطور کو ب سے زیادہ درازی نہ دے۔ تاکہ خوبصورتی رہے۔ جواب مکمل ہونے پر وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَم پھر کتبہٗ کا لفظ دراز کرکے لکھے۔ نیچے اپنا نام مع مکمل پتہ درج کرے اس کے نیچے تاریخ اور مہر لگائے۔ اسی طرح حضرت حکیم الامت ہم کو مشق کرواتے تھے۔ اسی طرح کچھ تغیر سے عالمگیری صفحہ نمبر ۳۰۹ پر ہے۔ لھذا ان قیود و شرائط علم مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مسلک کے اصول و فروع پر پورا عبور ہو اور مہارت رکھتا ہو۔ دیگر مذاہب کے ضروریات سے سدھ بدھ ہو۔ ضوابط و قوانین کے تمام قواعد کی بھی پہچان رکھتا ہو۔ حدیث و قرآن کے ناسخ و منسوخ سے خبردار ہو۔ تعداد اور وجوہ بھی جانتا ہو ویسے تو ہر فتوے کے لیے علم کثیر و تجارب شدید کی ضرورت ہے۔ مگر خصوصاً فتوئے کفر کے لیے بہت ہی زیادہ علم کی ضرورت ہے۔ کفر کا فتویٰ لگانا ہر مفتی کا کام نہیں۔ بلکہ اس کے لیے مفتی اعظم ہی کا علم و مقام مناسب ہے۔

فتوے پر اجرت لینے کے متعلق فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب فتویٰ نماز، روزے یا یتیموں کی میراث سے متعلق ہو تو اجرت نہ لے۔ لیکن جب مدعی اور مدعی علیہ کی شکل میں ہو۔ تو اپنی محنت کے حساب سے اجرت لے۔ یہ اس شخص سے لے سکتا ہے۔ جس کے حق میں فتویٰ ہو۔ بشرطیکہ مفتی کو اس کام پر نہ کسی ادارے سے تنخواہ ملتی ہو۔ نہ حکومت کی جانب سے۔ لیکن اگر حکومت یا ادارے کی طرف سے فقط فتویٰ نویسی کی تنخواہ مل رہی ہو۔ تو فتویٰ لکھنے کی اجرت مستفتی سے لینا حرام ہوگا۔ کہ یہ رشوت ہے۔

چھبیسویں شرط: مفتی کو چاہیے کہ فتوے لکھنے پر حریص نہ ہو۔ بلکہ اسی طرح فتویٰ لکھنے پر جلد بازی نہ کرے، جہاں تک ہو سکے اجتناب کرے۔ پہلے مستفتی کو زبانی جواب سمجھا دے۔ اور کہے کہ لکھوانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب مدعی یا مدعیٰ علیہ لکھنے ہی کا مطالبہ کرے۔ تو پھر بالکل کمزوری نہ دکھائے۔ پوری قوت کے ساتھ مضبوط فتویٰ لکھے۔ ستائیسویں شرط: غیر مفتا بہ کتب پر فتویٰ جاری نہ کرے۔ ہمیشہ معتبر کتب اور محقق کتب سے فتویٰ جاری کرے۔ ہاں غیر مفتا بہ کتب کے حوالے تائید میں پیش کر سکتا ہے۔ بصورت تقابل مفتا بہ کو ترجیح دے۔ جیسے کہ آج کل فتاویٰ شامی، بحر الرائق، فتح القدیر، ہدایہ وغیرہ تقابل میں شامی قابل ترجیح ہے۔ اٹھائیسویں شرط: مفتی اسلام کے لیے ضروری ہے کہ فتویٰ لکھتے وقت صرف مدعی مدعیٰ علیہ اور گواہوں کے بیان پر نظر ہو۔ نہ تو ذاتی معلومات پر فتویٰ دے اور نہ ہی مسلک یا مشرب یا دینی تعصب یا لگاوٹ باقی رکھے۔ حق فتویٰ دے اگرچہ اپنوں کے خلاف ہو۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

یہ تھے وہ آداب جو ہر مفتی کے لیے سیکھنے لازم و ضروری ہیں۔ تاکہ دنیا و آخرت کی عزت حاصل ہو۔

سوال: تمام آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کا کلام اور صفاتِ باری تعالیٰ ہیں نہ کہ مخلوق

کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر کے ایک جلسے میں ایک مولوی صاحب جو بہت مشہور مقرر ہیں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ توریت اور زبور اور انجیل جو حضرت موسیٰ اور داؤد اور عیسیٰ علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ وہ کلام الٰہی نہیں ہیں۔ ان کو وحی الٰہی تو کہا جا سکتا ہے مگر کلام الٰہی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان صاحب کتاب انبیاء کرام نے اصل منزل کتاب قوم کے سامنے پیش نہیں کی بلکہ اپنی قوم کی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کیا اور ترجمہ کو کلام الٰہی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب کتابیں عربی میں نازل ہوئی تھیں۔ اپنی تقریر کے ان الفاظ پر انہوں نے جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب الاتقان کا حوالہ پیش کیا۔ تقریر اور جلسے کے بعد علما نے ان سے توبہ کرنے

گو کہا۔ تو وہ توبہ کی طرف مائل نہیں ہوئے بلکہ ابھی تک اپنی بات پر اَڑے ہوئے ہیں لہٰذا آپ کی خدمتِ عالیہ میں گزارش ہے۔ کہ آپ مکمل و مدلّل فتویٰ عطا فرمائیں۔ اور فرمائیں کہ کیا ان خطیب صاحب کو توبہ کرنی چاہیئے یا نہیں۔ اور کیا یہ بات غلط ہے یا صحیح خدمتِ عالیہ میں گواہ بھی حاضر ہیں اور ان خطیب صاحب کی کیسٹ بھی حاضر ہے۔ ہمارے علاقے میں اس تقریر پر بہت باتیں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی شہرت یافتہ شخصیت کی بنا پر کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے مگر اکثریت کہتی ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ بیّنوا توجروا۔

سائل محمد اعظم میرپوری (آزاد کشمیر) حال ساکن برطانیہ 3/1/84

بعون العلّام الوہّاب

الجواب

صورتِ مسئولہ میں گواہوں کے بیان اور سائل کے تحریری استفتاء پر غور و خوض کرنے کے علاوہ مولانا کی تقریر کا ٹیپ شدہ شریطہ (کیسٹ) کئی دفعہ بغور سنا۔ بعد تامّلِ بسیار یہ فتویٰ جاری کیا جا رہا ہے۔ قانونِ شریعت کے مطابق مولوی صاحب کی یہ بات سخت غلط اور گمراہ کن ہے ان کو فوراً اپنے اس غلط عقیدے سے توبہ کرنی چاہیئے۔ دراصل یہ بات پرانے زمانے کے ایک بڑے مشہور فرقۂ باطلہ معتزلہ کے عقائدِ ضالّہ سے ہے۔ یہ ان لوگوں کا ہی عقیدہ تھا اور یہ عقیدہ اس لئے بنایا تھا کہ قرآن مجید، توریت، زبور اور انجیل کو کلام الٰہی نہ مانا جائے بلکہ مخلوقِ الٰہی مانا جائے۔ اسی باطل نظریے کو اس زمانے کے خبیث طینت بادشاہوں کا ظالمانہ جابرانہ سہارا مل گیا۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے مناظروں میں جب بڑے بڑے معتزلیوں نے شکست کھائی تو باطل اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آیا۔ اور امام حنبل جیسی پاکیزہ شخصیت کو کوڑوں سے زخمی کیا گیا۔ اسی باطل نظریئے کے مقابل اہل سنّت کے عظیم امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سینہ سپر ہوئے۔ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس فتنے نے ابھی سر نہیں ابھارا تھا مگر کچھ دبے لفظوں میں ظاہر ہو رہا تھا جس کو امام اعظم اور آپ کے تلامذہ نے سختی سے کچلا اور اپنے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ قرآن مجید اور توریت و زبور و انجیل سب ہی کلام الٰہی اور اللہ کا کلام ہے۔ اور کلام متکلّم کی صفت ہوتی ہے نہ کہ مخلوق۔ صفاتِ باری تعالیٰ عینِ ذات ہیں نہ کہ غیرِ ذات۔ یہ ضابطہ کلّیہ متفقہ ہے کہ صفتِ موصوف کبھی بھی اپنے موصوف کی مخلوق نہیں ہو سکتی۔ اب معتزلہ فرقہ دنیا سے مفقود ہو چکا ہے۔ کیونکہ باطل فنا ہونے کے ہی لائق ہے۔ مگر اہل سنّت کے تاجدار امام حنبل کا چراغ تا ابد روشن ہے۔ معتزلہ کا تھوڑا سا روپ اب وہابیت کے نقشے میں ہے اور باقی سب فرقے اسی جھاڑی کے کانٹے ہیں۔ یہاں تک کہ منکرینِ حدیث اور مرزائیت بھی اولاً اسی فرقے سے تھے۔ آپس میں سب ایک دوسرے کے مدح خواں ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنی کتاب "دو اسلام" کے دوسرے ایڈیشن میں وہابی علماء کی نام بنام تعریف کرتا ہے اور اہل سنّت علماء کی توہین و گستاخی کرتا ہے اسی طرح ڈاکٹر اقبال جو خفیہ انکارِ حدیث مسلک سے محبت رکھتے ہیں خانقاہی علماء صوفیا کی برائی کرتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے یہ مذہب اور عقیدہ معتزلہ کا ہے مسلکِ اہل سنّت کے بالکل خلاف ہے جن مولانا صاحب نے اپنی تقریر میں ایسی لغو بات کر دی وہ ان کی تقریری جذبات کا نتیجہ ہے ان کو توبہ پر مجبور کیا جائے اگر توبہ نہ کریں تو ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی

جائے نہ ان کو آیندہ تقریر کے لئے بلاؤ۔ شاعرانہ لغزشیں شعراء اور نعت خوانوں سے تو شروع سے مشہور رہیں مگر اب ہمارے مقررین حضرات بھی کافی کم علمی کا شکار ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی نے اگرچہ یہ بات لکھی ہے مگر وہ ان کا اپنا مسلک نہیں بلکہ کسی کا قول نقل کیا ہے۔ اور یہ قول روایۃً درایۃً عقلاً نقلاً۔ اور حدیث و قرآن پاک کی آیات کے خلاف اور ہر طرح لغو اور باطل ہے مسلک اہل سنت کے خلاف ہے۔ جلال الدین تو قرآن مجید کے متعلق بھی اسی طرح نقل کر رہے ہیں۔ چنانچہ الاتقان صفحہ ۴۳ پر ہے اِنَّ جِبْرَائِیْلَ اِنَّمَا نَزَلَ بِالْمَعَانِیْ خَاصَّۃً وَاَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلِمَ تِلْکَ الْمَعَانِیْ وَعَبَّرَ عَنْہَا بِلُغَۃِ الْعَرَبِ (الخ) ترجمہ: بے شک جبریل علیہ السلام قرآن مجید کو خاص معانی میں لے کر آئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان معانی کو جانتے تھے اور اپنے ان معانی کو عربی لغت میں ڈھالا (عبارت بنایا)۔ معاذ اللہ معاذ اللہ کتنا کفریہ مسلک ہے اس سے تو قرآن مجید کی آیتوں کا ہی صاف انکار ہو رہا ہے۔ ایسی بیہودہ باتیں تو معتزلہ کی ہی ہو سکتی ہیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں کہہ سکتا۔ یہ باتیں معتزلہ نے کیوں کیں؟ صرف اس لئے کہ مسلکِ حق اہلسنت کے خلاف اور اپنے باطل نظریے کو بچایا جائے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ کتب سماوی کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کیا جائے۔ اور مخلوق ثابت کیا جائے صفت باری تعالیٰ عز اسمہٗ نہ مانا جائے۔ حالانکہ مسلک اہل سنت یہ ہے کہ تمام کتب الٰہیہ کلام الٰہی اور صفتِ الٰہیہ ہیں نہ کہ خلق الٰہیہ۔ اور ہر کتاب اپنی اپنی قومی وعلاقائی زبان میں نازل ہوئی۔ عربی زبان میں صرف قرآن مجید نازل ہوا مسلک اہل سنت پر کثیر دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: قرآن مجید سورہ بقرہ پارہ ۱ آیت ۷۵ پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ ترجمہ: اور بے شک ان یہودیوں عیسائیوں میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں۔ پھر تحریف کر دیتے ہیں اُس کو اس کے بعد کہ عقل رکھتے ہیں اس کی حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ اس آیت میں صاف صاف توریت وانجیل کو کلام الٰہی فرمایا گیا۔ تمام مفسرین اس کی یہی تفسیر فرماتے ہیں۔ کہ اس جگہ توریت کا ذکر ہے۔ رب تعالیٰ تو آج تک توریت وانجیل کلام سماوی کو کلام الٰہی فرما رہا ہے اور یہ مولوی صاحب اس کے کلام الٰہی ہونے کے منکر ہیں۔ بھلا کیونکر ان کو درست کہا جا سکتا ہے بجز گمراہی اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید سورۃ توبہ پارہ ۱۰ میں ارشادِ باری ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ (الخ)

ترجمہ: اور اگر کوئی مشرک یارسول اللہ آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دیدو تاکہ اللہ کا کلام سنے۔ اس آیت میں قرآن مجید کو اللہ کا کلام کہا گیا۔ اس میں بھی معتزلہ کا رد ہے۔ **دُوسری دلیل:** صرف قرآن پاک عربی زبان میں آیا۔ پہلی تین کتابیں اور جملہ صحائف اپنی زبانوں میں نازل ہوئے۔ کسی نبی اکرم نے ذرہ بھر تبدیلی نہیں کی اسی طرح قوم کے سامنے پیش فرما دی۔ مولوی مذکور کی کتنی بڑی نادانی ہے کہ قرآن مجید کی صریحی آیات پر غور نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے سورت ابراہیم پارہ ۱۳ آیت ۴۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ اور نہیں بھیجا ہم نے اپنے کسی پیغام والے کو مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ یہ پیغام بیان فرمادے ان کے لئے۔ اس آیت کریمہ کی اقتضاء النص سے

ثابت ہو رہا ہے کہ یہاں پیغامِ الٰہی کی زبان مراد ہے۔ اس لئے کہ حرفِ اِلّا نفی ما سابق کو توڑ کر لسان کا حصر پیدا کر رہا ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایک ہی زبان میں ہو۔ حالانکہ رسولانِ عظام بہت سی زبانیں جانتے ہیں جیسا کہ تفاسیر سے ثابت ہے حضرت آدم علیہ السلام اسّی ہزار زبانیں جانتے تھے حضرت یوسف علیہ السلام کو چالیس زبانیں آتی تھیں اسی طرح دیگر انبیاء کرام بھی علومِ کائنات کے بحرِ ذخّار ہوتے ہیں ان کی اپنی معلوماتی زبان ایک نہیں ہوتی بلکہ قومی زبان کے علاوہ بہت سی ایسی زبانیں ہوتی ہیں جن کو کائنات کے لوگ نہیں جانتے۔ یہاں ایک زبان سے مراد پیغام اور کلامِ الٰہی کی زبان ہے جس کیلئے نبی علیہ السلام مبعوث ہوئے اور وہ ایک قومی زبان کتاب اور صحیفے کی زبان ہے اسی لئے آگے ارشاد ہے لِیُبَیِّنَ تاکہ وہ نبی علیہ السلام پیغامِ الٰہی قوم کے سامنے بیان کرے۔ پس ثابت ہوا کہ انبیاء کرام کی کتابی اور قومی زبان تبلیغ کے لئے ایک ہے اور معلوماتی زبانیں کثیر ہیں۔ یہاں کتاب کی زبان مراد ہے کیونکہ مقصودِ رسالت یہی ہے لِیُبَیِّنَ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہر رسول بعینہٖ اپنی کتاب کا کلام پڑھ کر سناتے ہیں نہ کہ ترجمہ کتاب۔ اس لئے اتقان کی یہ عبارت قرآن کریم کی رُو سے لغو ہے۔ دوسری جگہ ارشادِ قرآنی ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ ترجمہ: بے شک ہم نے نازل کیا قرآن کو عَرَبِیًّا عربی بنا کر یا عربی زبان میں۔ اس آیت کے اشارۃ النص سے ثابت ہوا کہ صرف قرآن مجید ہی عربی زبان میں نازل ہوا۔ مشکوٰۃ شریف باب مناقب قریش صفحہ ۵۵۳ فصل ثالث کی آخری حدیث میں ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ۔ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ: ترجمہ: روایت ہے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا انہوں نے کہ فرمایا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ محبت کرو تم عربیوں سے کیونکہ میں قومی لحاظ سے عربی ہوں اور اللہ کا قرآن الفاظ و لغت کے لحاظ سے عربی ہے اور جنتیوں کی زبان عربی ہو گی۔ اس حدیث پاک سے تو ظاہر ظہور ثابت ہو گیا کہ صرف قرآن مجید ہی عربی زبان میں آیا۔ اگر کوئی اور کلامِ الٰہی بھی عربی میں ہوتا تو یہ خصوصیتِ قرآن مذکور نہ ہوتی۔ ان تمام دلائل سے یہی ثابت ہوا کہ توریت و زبور و انجیل عربی میں نہیں اتریں بلکہ اپنے علاقے کی زبان میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان پارہ ۱۳ جلد چہارم سورت ابراھیم صفحہ ۳۹۶ پر ہے۔ اُنْزِلَ التَّوْرَاةُ فِی الْعِبْرَانِیِّ وَالْاِنْجِیْلُ فِی السُّرْیَانِیِّ۔ ترجمہ: توریت عبرانی زبان اور انجیل سُریانی میں نازل ہوئی۔ اور ہمارے عظیم مفسّر پیر محمد کرم شاہ صاحب نے ضیاء القرآن پ ۱۳ سورۃ ابراہیم میں لکھا کہ ہر نبی علیہ السلام کی وحی ان کی قومی زبان میں آئی۔ اسی طرح تفسیر ابن کثیر جلد دوم صفحہ ۵۲۲ پر ہے کہ ہر نبی اپنی قومی زبان میں مبعوث ہوئے اور بعثت کا معنیٰ ہے کلامِ الٰہی لانا۔ جب قرآن مجید حدیث پاک فقہا علماء مفسّرین کرام سب ہی سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ توریت و زبور انجیل اپنی علاقائی زبانوں میں آئی اور سب ہی کلامِ الٰہی ہے تو جلال الدین سیوطی کا یہ ایک قول یا موجودہ خطیب کی لغویات ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہے۔ موجودہ دور کے مقرّرین کرام کو صرف جذباتی نعرے لگوانے کا شوق ہے۔ تدبّر و تفکر اور مسائلِ شرعیہ و آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مبارکہ میں غور و خوض و تحقیق و تفتیش سے

دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے بدیں وجہ اکثر نعت خواں قسم کے خطباء فتوئ شرعی کی زد میں آجاتے ہیں جس سے امتِ مسلمہ کی سبکی ہوتی ہے ۔ اگر ذرا غور فرمالیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ محققین واھلِ تدبر کے ارشادات کیا ہیں ۔ چنانچہ توریت کے بارے میں ارشادات اس طرح ہیں (۱) مشکوٰۃ شریف باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء تیسری فصل آخری حدیث پاک ص۵۰۶ پر حدیث پاک نے فرمایا کہ توریت مقدس تختیوں پر لکھی ہوئی نازل ہوئی اور حضرت موسٰی ان ہی تختیوں کو اٹھا کر بنی اسرائیل میں تشریف لائے ۔ اور جب قوم کو بچھڑے کی پرستش کرتے دیکھا تو بحالتِ غصہ و غضبِ شدید تختیوں کو زمین پر رکھ دیا جس کی وجہ سے کچھ تختیاں اُٹھالی گئیں اور غائب ہوگئیں حدیث پاک میں تو اس طرح ہی ہے ۔ مگر ہمارے مقرر صاحب بحوالہ اتقان ایسی لایعنی بات کر رہے ہیں جس کا اس حدیث پاک سے کوئی تعلق نہیں ۔ بھلا غور کرو کہ اگر موسٰی علیہ السلام نے ترجمہ کر کے پیش کیا تو تختیوں میں رب تعالٰی نے کیوں لکھا ! ور وہ تختیوں کو قوم کے پاس کیوں لائے ۔ (۲) اسی باب کی دوسری فصل میں ہے ، کہ حضرت داؤد علیہ السلام زبور شریف کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور تلاوت تو رب کے کلام کی ہوتی ہے اگر زبور کا بھی ترجمہ ہی تھا تو تلاوت کس کی (۳) تفسیر روح البیان جلد پنجم ص۱۳۱ پر ہے آتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ ۔ اَیِ التَّوْرَاۃَ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً ترجمہ : اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ ہم نے موسٰی کو کتاب دی یعنی تورات شریف ایک دم عطا فرمائی (۴) تورات کی تختیاں زبرجد یا لکڑی کی تھیں (تفسیر روح المعانی جلد پنجم پ۹ ص۵۱) تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن جلد دوم میں ہے توریت پہلی ذلقعد کو نازل ہوئی اسی طرح تفسیر نعیمی پارہ نہم اور ضیاء القرآن میں ہے (۵) تفسیر روح المعانی نے فرمایا پارہ ۳ ص۱۰۲ پر کہ توریت اور انجیل کا درمیانی زمانے کا فاصلہ ایک ہزار تو سو پچیس سال کا ہے اور بزرگانِ دین فرماتے ہیں حضرت آدم سے لے کر نبی کریم رؤف ورحیم تک کا کل زمانہ دو ارب ساٹھ کروڑ ننانوے لاکھ سال ہے ۔ ایک بزرگ نے فرمایا یہ زمین کی ابتداء اور پیدائش کا زمانہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ۔ کسی بزرگ کا شعر اس طرح ہے ؎

دو ارب دو سی کروڑ و نود نو لک سالھا !
ابتداءِ دورِ عالم تا زمانہ مصطفٰے !

تفسیر روح المعانی پ۹ ص۵۱ اور تفسیر خازن جلد دوم ص۲۸۷ پر ہے کہ توریت کی تختیوں کی تعداد دس تھی اور سائز پہلے زمانہ کا اٹھارہ انچ (ڈیڑھ فٹ) کے حساب سے بارہ گز کی ایک تختی تھی ۔ اور تفسیر روح المعانی جلد پنجم پ۱۵ ص۱۴۱ پر ہے توریت کوہ طور پر عطا ہوئی تفسیر روح المعانی پ۹ ص۵۱ پر ہے کہ توریت رب تعالٰی نے اپنے دستِ قدرت سے تحریر فرمائی ۔ الاتقان ص۱۴۲ پر ہے کہ سابقہ کتابیں اور صحیفے ایک دم نازل ہوئے اپنے اپنے وقت میں تفسیر نعیمی جلد سوم ص۸۴ اور تفسیر روح البیان جلد دوم پ۴ ص۳۹۶ ۔ روح المعانی جلد سوم پ۶ ص۱۵ پر ہے کہ زبور کی سورتیں ایک سو پچاس تھیں ۔ لفظ زبور بمعنی مذبور ہے اس کا معنی لکھی کتاب یعنی مکتوب تفسیر نعیمی نور العرفان اور تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ زبور کاغذ پر لکھی ہوئی تھوڑی تھوڑی نازل ہوئی ۔ ابن کثیر جلد دوم ص۲۱۶ پر ہے کہ زبور رمضان پاک کی بارہ تاریخ دن میں نازل ہوئی ۔ خازن جلد چہارم ص۱۶۴ پر ہے کہ زبور مقدس میں شرعی احکام نہ تھے صرف حمد و

ثنا اور دعائیں اور نعتِ پاک تھی۔ تفسیر روح المعانی پ۱۶ جلد ششم صـ۸۲ پر ہے عَنْ اَنَسٍ اَنَّ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ دَرَسَ الْاِنْجِیْلَ وَالْحِکْمَةَ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ۔ تفسیر خازن جلد چہارم صـ۲۴۵ وَعَنِ الْحَسَنِ اَنَّهٗ قَالَ اُلْهِمَ التَّوْرَاةَ وَهُوَ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ۔ وَاُدْلِیَ الْاِنْجِیْلَ وَهُوَ صَغِیْرٌ طِفْلٌ۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول صـ۳۶۴ پر ہے وَقَدْ کَانَ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ یَحْفَظُ هٰذَا وَهٰذَا یَعْنِی التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِیْلَ سب کا ترجمہ: روایت ہے حضرت انس سے کہ بے شک عیسیٰ علیہ السلام نے والدہ کے پیٹ میں ہی انجیل پڑھی تھی اور رب تعالیٰ نے ان کو وہیں سب احکام سکھا دیئے تھے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بے شک انہوں نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو والدہ کے پیٹ میں ہی توراۃ کا الہام کر دیا گیا تھا اور انجیل بھی دیدی گئی تھی حالانکہ ابھی آپ صغیر یعنی شیر خوار بچے تھے۔ بے شک عیسیٰ علیہ السلام ابتدائی وقت میں توریت اور انجیل کے حافظ تھے اس پوری گفتگو سے ثابت ہوا کہ توریت تختیوں پر لکھی ہوئی نازل ہوئی اور زبور شریف کاغذ پر اور انجیل شریف حفظ ہو کر آئی۔ یہ کہیں ثابت نہیں کہ کسی نبی علیہم السلام نے کسی کتاب کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کیا۔ تفسیر بیضاوی پ۲ میں ہے کہ انجیل و توریت دونوں عبرانی زبان میں نازل ہوئیں۔ سب اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے اور حدیث و قرآن مجید میں بھی ظاہر ہے۔ فقط فرقۂ معتزلہ اس حقیقت اور حق مسلک کا صرف اس لئے منکر ہوا تا کہ اس کا باطل اور بنیادی عقیدہ خلق قرآن والا بچ جائے۔ مذکور مولوی صاحب نے بھی بلا سوچے سمجھے معتزلہ کا مذہب بیان کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے تا کہ ایسی نادانی کی تقریروں سے باز آ جائیں۔ معتزلہ کے پاس اپنے باطل نظریے پر قرآن مجید سے صرف چھ دلیلیں ملتی ہیں جس کے سہارے پر وہ اتنی لغویات کہتے ہیں یہ رب تعالیٰ کا ہی کرم ہے جس نے اول ہی سے اسلام کی حفاظت کے لئے جماعت اہل سنت کو پیدا فرمایا اور پھر اس کو مٹنے نہ دیا۔ ورنہ باطل کے ہزاروں فرقے پیدا ہوئے اور مٹ گئے۔ اور پھر حیرانی اس بات کی ہے کہ جو فرقہ بھی اٹھتا ہے اپنے باطل نظریات کے لئے قرآنِ پاک ہی سے استدلال کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی سچی سمجھ اور تدبر و تفکر غور و خوض انتہائی تحقیق و تفتیش بحمد اللہ تعالیٰ علماءِ اہل سنت ہی کے مقدر و نصیب میں ہے۔ جب بھی کسی نے قرآن مجید کو بغیر تدبر پڑھا تو ایک باطل فرقے نے جنم لیا۔ چنانچہ یہی وطیرہ فرقۂ ضالہ معتزلہ کا رہا کہ استدلال ان کا بھی آیاتِ قرآنیہ سے ہوتا ہے۔ مگر سوچ اور تدبر نہیں۔ چنانچہ فرقہ معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْکِتٰبَ۔ سورت حدید ۵۷ آیت ۲۶۔ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ سورت اسراء ۱۷ آیت ۲۔ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ سورہ سجدہ ۳۲ آیت ۲۳۔ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے: وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ سورہ زخرف ۴۳ آیت ۳۔

ان تمام آیتوں سے استدلال علی خلقِ قرآن اس بنا پر ہے کہ لفظ جَعَلْنَا کا ترجمہ معتزلہ نے خَلَقْنَا کیا اور مطلب یہ لیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنٰهُ هُدًی یعنی ہم نے پیدا کیا اس قرآن کو ہدایت یا جَعَلْنٰهُ نُوْرًا ہم نے پیدا کیا اس قرآن کو نور حالانکہ ان مذکورہ بالا آیات کریمہ میں جَعَلْنَا کا معنی خَلَقْنَا (ہم نے پیدا کیا) کرنا انتہائی جہالت اور کم علمی

اور خودی کا مسئلہ بنا لیتے ہیں حالانکہ اسی غلط روئیے سے باطل فرقے جنم لیتے رہے ہیں جس نے قوم میں ناسورِ تفریق پیدا کر کے اتحادِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا۔ لیکن بہر حال و بہر طور مصلحین اپنی ذمّے داری نبھاتے ہی رہے ہیں۔ ان ہی پاکباز ہستیوں کی مساعیِ جمیلہ سے آج چمنِ اسلام میں حقائق کی کلیاں چٹک رہی ہیں۔ اور باطلین کے منصوبے مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ بعض معتزلہ الزامی اعتراض کے طریقے پر کہا کرتے تھے کہ اگر انجیل و توریت اور قرآن مجید وغیرہ کتب آسمانی اللہ کا کلام ہوتا اور کلام صفتِ الٰہی ہوتی اور صفتِ الٰہیہ غیر مخلوق ہوتی تو اللہ فرماتا ہے اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ سورۃ نساء آیت ۱۷۱ پ۶ ترجمہ حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں۔ کلمہ اور کلام ایک چیز ہے۔ جب کلام غیر مخلوق تو کلمہ بھی غیر مخلوق لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام غیر مخلوق ہوئے۔ اور اور عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت اور الوہیت مسیح کا درست ماننا پڑے گا۔ اور اہل سنّت فقہا کا عقیدہ عیسائیت سے مشابہ ہو جائے گا۔ جواب یہ اعتراض معتزلہ کے نزدیک تو بہت مضبوط ہوگا اور وہ تو اپنے اس اعتراض پر بہت خوش ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض انتہائی جہالت کی بنا پر ہے اس لئے کہ اس اعتراض کا دارو مدار اس ہی بنا پر ہے کہ کلمہ اور کلام کو ایک درجے میں رکھا جائے حالانکہ حقیقتاً کلمہ اور کلام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ کہنا بہت مناسب ہے کہ ان دونوں میں نسبتِ تباین ہے تین وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ کلمہ مشترک المعانی ہے اور کلام متحد المعانی چنانچہ کتب لغت میں کلمے کے آٹھ معنیٰ ہیں ۱۔ زخم ۲۔ بات ۳۔ لفظ ۴۔ جملہ ۵۔ قانون ۶۔ فیصلہ ۷۔ کاریگری ۸۔ حکم۔ اور اس کی جمع ہے کَلِمَاتٌ یا کَلِمٌ۔ مگر کلام کا معنیٰ صرف ایک ہی ہے یعنی فرمودہ قول (بولا ہوا) لہٰذا کوئی کلمہ کلام نہیں ہو سکتا اور کوئی کلام کلمہ نہیں۔ اگرچہ ایک معنیٰ میں کلمہ جزء ہے کلام کی۔ لفظ کَلِمَةٌ اپنے ہر ترجمہ کے لحاظ سے علیحدہ خاصیت رکھتا ہے اس کا اصلی لغوی ترجمہ ہے زخم۔ اس معنیٰ سے اس کی جمع ہے كُلُوْمٌ جب ترجمہ ہو بات تو جمع ہے کلمات جب ترجمہ ہو قانون تو جمع ہے کَلِمٌ جب ترجمہ ہو کاریگری صنعت تو جمع ہے کِلَامٌ جب مراد ہو حکم تو جمع کَلِمَۃٌ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے مفرد اور جمع کے ساتھ بہت جگہ استعمال ہوا ہے۔ مگر جب بھی کلمہ کا ترجمہ بات یا جملہ ہو تو اس کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ لفظ کلمہ بمعنیٰ بات۔ ناقص کلام یعنی جزء کے درجے میں ہے اور اللہ کی بات کو ناقص کے درجے میں رکھنا گستاخی ہے۔ لہٰذا کلمۃ اللہ یا کلمات اللہ کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یا قانون یا حکم یا صنعت کیا جائے گا۔ اس ضابطۂ کلیہ متفقہ کے تحت حضرت مسیح کو بھی کَلِمَتُهٗ کہنے کا مطلب ہوگا اللہ کا نشانِ قدرت یا کلمۂ کُن سے پیدا ہونا یعنی حضرت مسیح نطفہ سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ حکم الٰہی سے پیدا ہوئے اور خود حکم یعنی نشانِ قدرت ہو گئے۔ یہی تمام مفسرین اور علماء و ائمہ عظام فرماتے ہیں۔ جس سے واضح ہو گیا کہ کوئی کلمہ کلام کے درجے میں نہیں اور کوئی کلام کلمے کے درجے میں نہیں۔ معتزلہ کا دونوں کو ایک درجے میں سمجھنا ان کی حماقت و کم فکری ہے لہٰذا کَلِمَتُهٗ کے لقب سے مسیح نہ ابنیت پر عقیدہ بنایا جا سکتا ہے نہ غیر مخلوق ہونے پر نہ الوہیت پر اور فرقہ ضالّہ معتزلہ کا یہ استدلال نہایت ہی غلط ہے

ہے اس لئے کہ یہاں عقلاً۔ نقلاً اور اصلاً۔ لغتاً۔ نحواً جَعَلْنَا کا معنی خَلَقْنَا کرنا غلط ہے۔ لفظ جَعَلْنَا کا مادّہ اشتقاق ہے جَعْلٌ اور یہ سات معنی میں مشترک ہے (۱) جعلٌ کے معنی صنعت کاریگری (۲) جَعْلٌ کے معنی پھیرنا بدلنا۔ جیسے جَعَلَ الْحَسَنَ قَبِیْحًا یعنی اچھے کو برا کردیا۔ (۳) گمان کرنا جیسے جَعَلَ الْحَقَّ بَاطِلاً یعنی حق کو باطل گمان کیا (۴) قائم کرنا مقرر کرنا جیسے جَعَلَہٗ حَاکِمًا اس کو حاکم مقرر کردیا۔ (۵) لینا شروع کرنا جیسے جَعَلَ یَکْتُبُ یعنی لکھنے لگ گیا شروع ہوگیا۔ (۶) عطا کرنا۔ دینا بنانا۔ جیسے اِجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ یعنی عطا فرما مجھ کو سچی زبان۔ بنا میری زبان سچی۔ (۷) پیدا کرنا جیسے جَعَلَ اللّٰہُ الظُّلُمٰتِ اللہ تعالیٰ نے ظلمتوں کو پیدا کیا (المنجد عربی ص۹۹) ان معانی میں اصل اور لغوی ترجمہ ہے بنانا۔ باقی تراجم اصطلاحی ہیں اور نحو کا یہ قاعدہ مشہور اور متفق علیہ ہے کہ جب کوئی مصدر یا مادہ اشتقاق اپنے اصل معنیٰ سے ہٹ کر دوسرے مصدر کے معنیٰ میں مستعمل ہو تو وہ مادہ اپنی ذاتی صلیت میں خواہ کچھ بھی ہو لازم یا متعدّی بیک مفعول یا بدو مفعول۔ لیکن دوسرے مصدر کے معنی میں آکر اسی دوسرے کے مشابہ اور درجے میں ہوگا۔ اگر وہ لازم تو یہ لازم وہ متعدّی تو یہ متعدّی۔ اگر وہ مقیّد تو یہ مقیّد وہ مطلق تو یہ مطلق۔ بقاعدۂ نحو لفظ خَلْقٌ متعدی بیک مفعول ہے اور مطلق ہے۔ اس لئے جب جَعْلٌ بمعنی خَلْقٌ ہوگا تو مطلق اور متعدّی بیک مفعول ہوگا۔ اگر ان میں سے ایک بات بھی نہ ہوگی تو اس معنیٰ میں نہ ہوگا اس لئے اس قاعدۂ نحویہ کے تحت جب ان آیات میں غور و تدبّر کیا گیا۔ تو پتہ لگا کہ پہلی آیت میں فِیْ ذُرِّیَّتِہِمَا کی قید ہے اس لئے وہاں بھی جَعَلْنَا خَلَقْنَا کے معنیٰ میں نہیں ہوسکتا بلکہ وہاں بمعنی عطا ہے اور ترجمہ اس طرح ہے ہم نے عطا کی ان کی اولاد میں نبوّت اور کتاب۔ باقی تین آیات میں جَعَلْنَا متعدّی بدو مفعول ہے (۱) جَعَلْنٰہُ ھُدًی (۲) وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی (۳) وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا۔ مفعولِ اوّل ہٗ ضمیر ہے مفعولِ دوم ھُدًی اور نورًا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی بمعنیٰ خَلَقْنَا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خَلَقْنَا ہمیشہ متعدّی بیک مفعول ہوتا ہے۔ اسی طرح پانچویں آیت جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا بھی متعدّی بدو مفعول ہے مفعولِ اوّل ہٗ قُرْاٰنًا مفعول دوم عَرَبِیًّا پس ثابت ہوا کہ ان میں سے کسی جگہ بھی خَلَقَ کے معنیٰ نہیں ہوسکتے بلکہ ان چار آیات میں جَعَلْنَا کا معنیٰ ہے قائم کردیا بنا دیا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ استاد نے شاگرد کو عالم بنا دیا جب یہاں بنانے کا مطلب پیدا کرنا نہیں ہوسکتا تو ان آیات میں بھی جَعَلْنَا کا معنیٰ پیدا کیا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے خلقِ قرآن و توریت وغیرہ کا عقیدہ باطل ہوگیا۔ یہی وہ ضابطۂ اخلاق اور تدبّر و تفکّر کے دلائل ہیں جن کے سامنے معتزلہ اپنے دور میں ہمیشہ خائب و خاسر ہوتے رہے۔ اور عجز و مغلوبیت سے شکست کھاتے رہے مگر بجائے قبولیت حق کے حسد و عناد کی آگ میں ہی انتقام پر آمادہ رہے۔ بجز اس کے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے کرم سے توفیقِ حق عطا فرمائی۔ یہی حال ہر دور میں ہوتا چلا آیا ہے۔ آج بھی کم علم خطبائے تحقیق مقرّرین۔ داعیانِ ہمہ دانی قسم کے شیوخ۔ مصلحین کی گرفت اور محاسبے کو انا

اللہ تعالیٰ کی صفت کلام اللہ ہے نہ کہ کلمۃ اللہ۔ بدیں وجہ انجیل زبور توریت قرآن مجید کو رب تعالیٰ نے کلام اللہ تو فرمایا مگر کلمۃ اللہ نہ فرمایا۔ قرآن مجید میں انتیس ۲۹ جگہ لفظ کلمۃ استعمال ہوا ہے اور چودہ جگہ کلمات استعمال ہوا ہے مگر کہیں بھی اس کا معنیٰ اللہ کی بات یا اللہ کا قول یا فرمان مراد نہیں۔ اسی لئے اس کا تعلق سننے سنانے سے نہیں کیا گیا۔ جبکہ قول اور بات کا تعلق سننے سنانے سے ہے۔ بخلاف کلام اللہ کے کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں چار جگہ ہوا اور ہر جگہ سننے سنانے سے متعلق ہے جس سے ظاہر ہو گیا کہ کلام اور کلمہ میں بہت فرق ہے اور معتزلہ کا دونوں کو ایک درجہ دینا غلط ہے۔ حضرت مسیح کلمۃ اللہ تو ہیں مگر کلام اللہ نہیں اور کتب الٰہیہ صحفِ آسمانی کلام اللہ ہیں کلمۃ اللہ نہیں ہیں۔ جب اس جواب سے معتزلہ گھبراتے تو بعض معتزلہ کہہ دیتے کہ کلام اللہ تو ہیں لیکن صفت الٰہیہ نہیں۔ مگر یہ بات بھی بہت کمزور ہے کیونکہ جس طرح رحم کرم صفت ہے اور رازقیت خالقیت صفاتِ ربانیہ میں شامل ہے اسی طرح کلام فرمانا بھی صفت ہے۔ مگر کلام الٰہی متفقہ طور پر کلام مفید اور کلام نفسی ہے اور جس طرح رازقیت کا مظہر مرزوق ہے اسی طرح کلام نفسی کا مظہر کلام لفظی ہے رازقیت قدیم صفت ہے اور مرزوق حادثات ہیں۔ اس طور کلام نفسی قدیم مگر کلام لفظی حادثات۔ بعض معتزلہ یہ بھی کہتے رہے کہ قرآن مجید وغیرہ کتب الٰہیہ کلام اللہ تو ہیں اور صفتِ الٰہی بھی ہیں مگر صفتِ الٰہی قدیم نہیں ہوتی اس طرح بہت سی چیزیں قدیم ماننا پڑیں گی۔ حالانکہ قدیم ہونا صرف ذاتِ باری تعالیٰ کی شان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کتنا احمقانہ نظریہ ہے اس بات سے کون منکر ہو سکتا ہے کہ صفت سے موصوف کی تکمیل ہے اگر صفاتِ الٰہیہ کو قدیم نہ مانا جائے تو کہنا لازم آئے گا بعد میں صفت پیدا ہوئیں اور بعد میں رب کی تکمیل ہوئی حالانکہ یہ عقیدہ عین کفر ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام کتب آسمانی اللہ کا کلام ہے اور کلام صفتِ الٰہی ہے اور صفاتِ الٰہیہ بھی قدیم ہیں اسلئے غیر مخلوق غیر حادث ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ باطل اور لغو ہے۔ مولوی مذکور کو اس باطل عقیدے سے جلد از جلد توبہ کرنی چاہیئے اور آئندہ سوچ سمجھ کر تقریر کرنی چاہیئے۔ اس قسم کے ناکارہ اعتراضات کا سہارا لے کر یہ معتزلہ وغیرہ باطل فرقے ہمیشہ علماء حق کی گستاخیاں کرتے رہے۔ اور آج بھی نادان لوگ اہلِ حق مصلحین و مفکرین کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے ہیں۔ مگر رب تعالیٰ حق کا حامی و ناصر ہے۔ چراغ ہمیشہ اہلِ حق علماء کا ہی روشن ہے۔ واللہ و رسولہٗ اعلم

سوال ۴۳

اسلام میں تا قیامت ہر صدی کے ابتدا میں ایک مجدد آتا رہے گا۔ چودہ سابقہ صدیوں کے مجددین کرام کے اسماء گرامی۔ ہزار سالہ مجدد کوئی نہیں ہو سکتا۔ (بعض حضرات کے غلط اقوال کا مدلل جواب)

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں۔ کہ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ہر صدی پر میری امت کی درستی کے لیے ایک مجدد آئے گا۔ لہٰذا عرض ہے۔ کہ آج تک کی صدیوں کے کون کون سے مجدد کس کس زمانے میں تشریف لائے؟ اُن کے زمانے میں کن کن فتنوں کا ظہور تھا۔ کہ جن کو آکر ان بزرگوں نے بند کیا؟ اِن مجدد کرام کے نام کیا ہیں۔ بعض نقشبندی لوگ کہتے ہیں کہ اب قیامت تک صرف مجدد صاحب ہی مجدد ہیں اور کوئی شخص مجدد نہیں ہوسکتا۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ۵ السائل :۔ مولوی شمس الدین الہ آبادی کراچی مورخہ ۱۳ ۱/ ۱۹۶۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ۵

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق یہ بات حتماً مسلّم ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ اپنے پیارے حبیب رؤف و رحیم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ان کی امت کو ضلالت سے بچانے کے لیے ہر سو سال بعد آنے والی صدی کے بالکل ابتداء میں اپنے کسی کامل اکمل بندے کو مجددیت کا تاج پہنا کر اُمتِ نبی کریم کے لیے مبعوث فرماتا ہے چنانچہ ابوداؤد جلد دوم صفحہ نمبر ۵۸۹ کتاب الملاحم کے شروع میں پہلی حدیث ہے : حَدَّثَنَا سُلَیْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ الْمَهْرِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ اَیُّوْبَ عَنْ شَرَاحِیْلَ بْنِ یَزِیْدَ الْمَعَافِرِیِّ عَنْ اَبِیْ عَلْقَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ فِیْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا (ترجمہ) سلیمان بن داؤد مہری نے ابوداؤد سے روائیت کی ان سے ابن وھب نے ان کو خبر دی سعید بن ایوب نے انہوں نے شراحیل بن یزید معافری سے روایت لی۔ انہوں نے علقمہ سے انہوں نے ابوہریرہ سے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لیے ہر صدی کے شروع میں مبعوث فرماتا رہے گا۔ ایسے شخص کو جو دینِ پاک کو صاف ستھرا کرتا رہے۔ (الخ) اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے بھی روایت کیا۔ جامع الصغیر نے جلد اول صفحہ نمبر ۶۰ پر اس کو صحیح کہا۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔

(۱) پہلی یہ کہ ہر مجدد صرف ایک صدی کے لیے ہوگا نہ کم نہ زیادہ۔ بعض نقشبندی لوگ جو یہ کہتے کہ مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہزار سال کے مجدد ہیں اور ان کے بعد کوئی مجدد نہیں ہوسکتا بس ایک یہ ہی قیامت تک مجدد ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ بلکہ آپ بھی دیگر مجددین کی طرح فقط ایک صدی کے مجدد ہیں۔ الف ثانی کا مطلب دوسرے ہزار کی ابتداء جو گیارھویں صدی ہے۔ نہ کہ پورے ہزار سال۔ کیونکہ پورے ہزار سال تو اب ہوہی نہیں سکتے۔ قیامت قریب ہے اور موجودہ نقشبندیوں کا یہ قول خود ساختہ اس حدیثِ منورہ کے

بھی خلاف ہے۔ مگر حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مکتوبات حصہ دوم مکتوب چہارم صـ۱۹ میں مجدد کی دو قسمیں فرمائی ہیں ۱۔ مجدد مائۃ ۲۔ مجدد الف۔ یعنی ہر صدی کا مجدد اور ایک ہزار سال کا مجدد اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجدد صاحب کے نزدیک بھی ہر صدی کا علیحدہ ایک مجدد ہونا ثابت ہے۔ اور نقشبندی حضرات کی یہ بات غلط ہو جاتی ہے کہ مجدد صاحب کے بعد کوئی مجدد نہ ہوگا۔ ہاں مجدد علیہ الرحمۃ کا یہ فرمان کہ مجدد الف بھی کوئی ہوتا ہے۔ یہ بات انتہائی قابل غور اور دلائل سے دور اور دو وجہ سے خلافِ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ احادیثِ مطہرات میں ہزار سالہ مجدد یعنی مجدد الف کا کہیں ذکر نہیں۔ نہ ہی کسی اور امام یا فقیہ یا غوث و قطب نے اس کا ذکر فرمایا صرف مجدد صاحب کا اس طرح دو قسمیں فرمانا اہل تحقیق کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اگر بقولِ مجدد صاحب کوئی شخص مجدد ایں الف ہے یعنی الف ثانی تو مجددِ الف اوّل بھی ہونا لازم ہے۔ حالانکہ اس کا وجود تک نہیں۔ نیز یہ بات اظہر ہے کہ کسی بھی مجدد نے خود کو مجدد نہ فرمایا۔ بلکہ رب تعالیٰ کی طرف اقوام کی زبان و قلب پر جاری ہو گیا۔ خود مجدد علیہ الرحمۃ نے بھی۔ الفِ ثانی کا تذکرہ کیا لیکن یہ نہ کہا کہ میں الف ثانی مجدد ہوں۔ اب اس دور کے نقشبندی بزرگ صرف اسی مکتوب شریف کے سہارے پر الفِ ثانی کا لقب۔ مجدد صاحب کو دینے لگے۔ اس لیے یہ لقب عقیدت میں تو صحیح ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی ہزار اول کا مجدد ہے۔ نہ ہزار ثانی کا اسی بنا پر نہ کسی کو مجدد الفِ اول کہا گیا اور نہ ہی مجدد الف ثانی کہنا چاہیے۔ صرف جوشِ محبت میں احادیث کی خلاف ورزی اور مطلب برآری کے لیے اصول کی توڑ پھوڑ اچھا کام نہیں۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ جس عالم کو مجدد بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنی بعثت کی صدی سے پہلی صدی میں پیدا ہو کر عالمِ و اکمل مشہور ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ لفظ یَبْعَثُ، بَعَثَ سے بنا ہے اور بَعْثٌ کے لغوی معنیٰ ہیں۔ کسی کام کے لیے اٹھ کھڑا ہونا۔ اور اس کام میں محمول و مشغول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لغاتِ کشوری صفحہ نمبر صـ۷۰ پر اور منجد عربی صفحہ نمبر صـ۳۹ پر ہے۔ بَعَثَہٗ عَلَی الشَّیْءِ ای حَمَلَہٗ عَلٰی فِعْلِہٖ وَ اَقَامَہٗ (الخ) ترجمہ: اس شخص کو مبعوث کیا۔ کسی چیز پر یعنی اس کے کرنے پر مشغول کیا۔ اور قائم کیا۔ بَعْثٌ کا شرعی ترجمہ یہ ہے کہ پیغامِ خداوندی کی تبلیغ شروع کر دینا۔ اور جو خدمتِ دین اس کے سپرد ہوئی۔ اس میں مشغول ہو جائے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعثتِ انبیاءِ عظام و لادتِ انبیاء کرام سے تقریباً چالیس سال بعد ہوتا ہے۔ اس روایتِ صحیح میں بھی لفظ بعثت مستعمل ہے جس سے ثابت ہوا کہ اپنی تبلیغی صدی سے پہلی صدی میں اس مجدد کی ولادت و تکمیل علوم معنوی و ظاہری ہو چکی ہو۔ اور دوسری صدی شروع ہوتے ہیں۔ اس کو مبعوث کر دیا جائے۔ کیونکہ روایت کے دوسرے لفظ ہیں: عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ ۵ ہر صدی کے راس پر۔ اور لفظ راس کے معنیٰ ہیں سر یعنی بالکل ابتدا اور ابتداءِ تبلیغ یعنی بعثت

تب ہی ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے صدی کا کثیر زمانہ بھی پایا ہو اور علوم حقیقیہ سے بھی کما حقہ، واقف ہو چکا ہو تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ ہر عالم مجدد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس عالم، یا ولی اللہ یا مختار حاکم بادشاہ وغیرہ کو مجدد کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس نے دو صدی کے انتہائی و ابتدائی زمانے کے پانے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے دینی فتنے کا خاتمہ یا زور توڑا ہو۔ کہ جس کے وجود سے اُمتِ مسلمہ کے شدید گمراہ ہونے کا خطرہ تھا۔ کیونکہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پاک میں ہے۔ من یجدد لها دینها کہ وہ شخص اُمتِ مسلمہ کے لیے اس کے دین کو ستھرا کرے گا۔ چوتھی بات یہ ثابت ہوئی کہ وہ مجدد فردِ واحد ہو گا۔ نہ کہ جماعتِ کثیرہ اگرچہ دیگر علماء اس کے معاون بن جائیں۔ مگر اصل مجدد فقط ایک شخص ہی ہو گا۔ اس لیے کہ حدیثِ مذکورہ بالا میں مَنْ اسم موصول ہے۔ جو صرف وحدت کو چاہتا ہے۔ پانچویں بات یہ ثابت ہوئی۔ کہ مجدد کا وہ زمانہ، صحابہ کرام کے زمانے کے بعد شروع ہوا ہے۔ کوئی صحابی مجدد نہیں۔ اس لیے کہ روایتِ طیبہ میں ہے۔ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ (ترجمہ): یعنی وہ مجدد ہر صدی کے بالکل شروع میں مبعوث ہو گا۔ جب کہ امت کی گمراہی کا سخت اندیشہ ہو تو تجدیدی کارنامے کر کے باطل فتنے کو فرد کرے۔ اکابرین صحابہ میں سے کسی نے بھی صدی کا ابتداء نہ پایا۔ اس لیے کہ پہلی صدی کی ابتداء میں خود آقائے کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوئے تھے۔ اور کسی کے گمراہ ہونے کا بھی اندیشہ نہ تھا۔ دوسری صدی کی ابتداء میں دورِ صحابہ تقریباً انتہائی مراحل میں پہنچ چکا تھا۔ خاص کر وہ چند صحابہ کرام جن کے افعالِ طیبہ اور حسین کردار کو تجدیدی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ سب اکابر وصالِ ربانی فرما چکے تھے۔ جیسے صدیق اکبر فتنۂ منعِ زکوٰۃ و فتنۂ مسیلمہ کذاب کو مٹانے والے اور فتوحاتِ اسلامیہ کے بانی فاروق اعظم وغیرہ اور قرآنِ کریم کے مخلوط کرنے کے فتنے کو ختم کرنے والے عثمانِ غنی اور جیسے کہ علی المرتضیٰ جنھوں نے اپنے عدالتی اور فقہی فیصلوں سے دین کو عجیب طرح سے روشن کیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجدد نہیں۔ اس لیے کہ مجدد کا درجہ صحابہ کرام سے کم درجے پر ہے۔ صحابی کو مجدد کا درجہ دینا ایسا ہی معیوب ہے۔ جیسا کہ وزیرِ اعظم کو تھانے دار کا درجہ دیا جائے۔ اسی طرح یہ کہنا ایک لحاظ سے گناہ ہے کیونکہ صحابہ کی گستاخی ہے کہ مجدد کا درجہ مجتہد اربعہ کے بھی بعد ہے خلاصہ یہ کہ اس حدیثِ پاک نے جہاں مجدد آنے کی خبر دی۔ وہاں مجدد کی تعریف نوعیت اور شخصیت سے بھی آگاہ کر دیا۔ تاکہ ہر ایرہ غیرہ کو مجدد نہ کہہ دیا جائے۔ اس حدیث کی روشنی میں سابقہ چودہ صدیوں کے مجددین کرام اور ان کے دینی کارناموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔ (۱) پہلی صدی کے مجدد (یعنی مجدد کی پہلی صدی نہ کہ اسلام کی) حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنھوں نے خارجیوں کے فتنے کو توڑ کر تجدیدِ اسلام فرمائی۔ آپ کی ولادت باسعادت ۶۱ھ میں اور وفات شریف ۱۰۱ھ میں ہوئی۔ اس طرح آپ نے اپنی صدی کے بارہ سال پائے۔ (۲): دوسری صدی کے مجدد امام احمد بن حنبل ہیں۔ آپ کی عمر شریف ستر سال ہوئی اور

۲۲۳ھ میں وفات پائی۔ آپ نے معتزلہ فرقے کو ہلاک فرمایا۔ اور خلقِ قرآن کریم کے فتنے کی بڑھتی ہوئی آگ کو بجھا کر تجدید اسلام فرمائی۔ اس زمانے میں امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوئے۔ مگر خدمتِ تجدید امام احمد کے مقدر میں ہوئی۔ اسی میں آپ کی شہادت ہوئی۔ ۳۔ تیسری صدی کے مجدد امام احمد نسائی جنہوں نے فرقہ جہمیہ کے باطل عقائد کو فنا کر کے مجددیت کا خطاب پایا۔ آپ کی ولادت ۲۱۷ھ میں اور وفات ۳۰۴ھ میں ہوئی۔ فرقہ جہمیہ کے چند باطل عقیدے یہ تھے:۔ (۱) کہ عذابِ قبر کوئی نہیں (۲) اور معاذ اللہ خالق دو ہیں (۱): خالقِ خیر، (۲): خالقِ شر۔ ان کفریہ عقیدوں کے باوجود پھر بھی یہ خود کو مسلمان کہتے تھے۔ چوتھی صدی کے مجدد امام بیہقی یا امام ابوبکر قلانی ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ہم زمانہ ہیں۔ انہوں نے تیسری صدی کے بیس[۲۰] سال اور چوبیس[۲۴] سال پائے اور چوتھی صدی کے بیالیس[۴۲] اور پچپن[۵۵] سال پائے۔ انہوں نے فرقہ رافضیہ کا زور توڑا۔ اور مسلمانوں کو ان کے کفریہ عقیدوں سے بچایا۔ اور طہران دلہنان میں تجدید اسلامی کا جھنڈا گاڑھا۔ پانچویں صدی کے مجدد امام محمد بن محمد غزالی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ قدریہ کے باطل عقیدوں سے مسلمانوں کو بچایا۔ ان کی ولادت ۴۵۰ھ میں اور وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ چھٹی صدی کے مجدد امام فخر الدین رازی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ جہمیہ اور فلاسفہ کے باطل عقیدوں کو اسلامی فلسفے کے ذریعے سے ہی ختم کیا اور عالم کے قدیم ہونے کے کفریہ عقیدے کا ردِ بلیغ فرمایا۔ انہوں نے پانچویں صدی اور چھٹی صدی کا زمانہ پایا۔ ساتویں صدی کے مجدد امام تقی الدین ابن دقیق عبدی ہیں۔ یہ ۶۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۷۰۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے ہندوستان کے بعض علاقوں میں اسلام پھیلایا اور آریہ مذہب کا زور توڑ کر ان کی غلط توحید سے جو مسلمانوں میں فتنہ پڑتا تھا۔ اس کا خاتمہ کیا۔ آپ شام سے ہجرت کر کے ہند میں خدمتِ اسلام کے لیے تشریف لائے۔ آٹھویں صدی کے مجدد حافظ ابن حجر عسقلانی انہوں نے بہشت بریں بنانے والے بہائی مذہب کا زور توڑ دیا۔ ان کی عمر شریف تریسٹھ سال ہوئی اور ۸۱۵ھ میں وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنی صدی کے صرف پندرہ سال پائے۔ نویں صدی کے مجدد امام جلال الدین سیوطی ہیں۔ انہوں نے بھی فلاسفہ کی پھیلتی ہوئی بے دینی اور فلسفے کے گمراہ کن چکروں سے مسلمانوں کو بچایا۔ یہاں تک کی فہرست کتاب عون المعبود شرح ابوداؤد ص۸۱ پر موجود ہے۔ دسویں صدی کے مجدد مُلّا علی قاری جنہوں نے اکبر بادشاہ کے دینِ الٰہی کا تختہ الٹایا۔ گیارھویں صدی کے مجدد امام شیخ احمد سرھندی۔ جنہوں نے جہانگیر کے کفریہ قوانین سے مقابلہ کر کے مسلمانوں کو بچایا۔ بارھویں صدی کے مجدد امام محی الدین اورنگ زیب شہنشاہ ہند اُن کی ساری زندگی ملحدین سے مقابلہ کرتے گزری۔ تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز جن کی وفات شریف ۱۲۳۹ھ میں ہوئی۔ چودھویں صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن کے کارہائے نمایاں ان کی سوانحات میں موجود ہیں۔ آپ کی ولادت شریف ۱۲۷۲ھ میں ہے۔ اور وفات شریف ۱۳۴۰ھ میں ہوئی۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا وَّ شُکْرًا جَزِیْلًا کہ آج مورخہ بتاریخ شمسی ۲۶ ۳/۸۴ بروز پیر مبارک دوسری بار فتاوٰی العطایا جلد دوم جس کی مکمل کتابت تقریباً دو سال بیشتر ہو چکی تھی اس پر نظر ثانی اور مزید چند مضامین شامل کر کے طباعت کے لئے پریس میں دیدیا۔ مولی تعالیٰ قبول فرمائے اور عوام مسلمانوں کو اس سے دینی ایمانی فائدہ اور ہدایت نصیب ہو۔ میری اس محنت سے زیادہ فائدہ طلباء کو حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ان کی دعاؤں سے میرے گناہ ولغزشیں معاف ہوں۔ اے میرے عزیز طالب علم! دین کی تعلیم حاصل کر کے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والو! یہ دنیا چند روزہ ہے اللہ اور رسول صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی محبت حاصل کرنے کا یہی زمانہ ہے۔ سب ساتھ ٹوٹنے والے ہیں۔ سچا ساتھ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی مسند کو سنبھالا مگر حق ادا نہ ہوا۔ تم ہماری کمیوں کو پورا کردو۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَاِلَیْہِ الْبَلَاغُ میرا کلام نصیحت کرنا تھا۔ سو میں نے کردیا۔ عمل کے لئے دست بدعا ہوں۔

رُباعی ترمیمی

۱۳۹۶ھ

دراں مدت کہ مارا وقتِ خوش بود — زہجرت سیزدہ صد نود و شش بود

مرادِ ما نصیحت بود و کردیم — حوالت با خدا کردیم و رفتیم

یہ فتاوٰی مطابق ماہِ شعبان بروز جمعۃ المبارک بعد جمعہ۔ سوا ایک بجے رات آج مورخہ شمسی ۲۰ ۸/۷۶ مکمل تصنیف ہوا اور اب ۲۶ ۳/۸۴ بزرگوں کی خبر مصدّقہ کے مطابق ۱۹۴۵ء میں ولادت کے حساب سے اپنی عمر کی سالانہ انتالیسویں ۳۹ ایمانی بہار دیکھ رہا ہوں۔ اور اپنے بزرگوں، پیارے دوستوں کی دعاؤں کے طفیل جن میں استاد محترم برادر بزرگ حضرت قبلہ مفتی مختار احمد صاحب ہم زلف حضرت والا مرتبت مولانا احمد حسن نوری صاحب لاہور۔ حضرت فاضل ذی شان قاری علی اکبر صاحب کوٹلہ ضلع گجرات حضرت علّامہ قاری ہدایت اللہ صاحب سرفہرست ہیں میں اس وقت تفسیر نعیمی کا تیرھواں چودھواں پندرھواں سیپارہ بیک وقت لکھ رہا ہوں اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق اور قبولیت کا شرف عطا فرمائے جبکہ گیارھواں پارہ چھپ چکا ہے اور بارھواں پارہ چھپ رہا ہے۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَنُوْرِ عَرْشِہٖ وَزِیْنَتِ فَرْشِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا وَمَلْجَانَا وَمَاوَانَا وَکَرِیْمِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَنَاتِہٖ وَاٰبَائِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

اقتدار احمد خان نعیمی بدایونی حال بریڈفورڈ انگلینڈ